مدیر مسئول
پرویز شاہدی
مدیر اعزازی
ایم ظہور احسن قاضی

جدید اردو

جنوری ۱۹۴۲ء

چندہ سالانہ عـ۸ر
" ششماہی ۱۲ر
فی پرچہ ۳ر
غیر ممالک کیلئے ۵ شلنگ
برما کیلئے ےے ر

جلد ۵ | نمبر ۱

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر سید عبدالعلیم نے مطبع سید برقی پریس میں چھپوا کر ۲۷ مارسڈن اسٹریٹ کلکتہ سے شائع کیا۔

شذرات

موجودہ جنگ:۔

ایں چہ شوریست کہ در دور قمری بینم
ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر می بینم

حافظ کا یہ شعر یوں تو ہر دور اور ہر عہد کی آئینہ داری کرتا ہے لیکن اس زمانے میں اس کی صداقت اور بھی واضح نظر آرہی ہے. جہاں دیکھئے شور و ہنگامہ، جدھر نظر اٹھائیے فتنہ و شر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیکی کا خدا شیطنت کی رسّی دراز کر کے انسانیت کی تباہی کا عبرت انگیز منظر دکھانا چاہتا ہے۔ افق تخلیق پر انسانیت کی جو صبح طلوع ہوئی تھی وہ اندنوں حیوانیت کی بھیانک تاریکیوں میں گھر رہی جارہی ہے۔ تزکیۂ نفس و اخلاق کے وہ نقوش پا جو انسانیت کا کارواں صدیوں کی مصیبت سفر کے بعد راہ ارتقا میں دوسروں کی رہنمائی کے لیے چھوڑ گیا تھا وہی آج خود اس کے لئے منزل بعید کا تصور بنے جارہے ہیں تہذیب و تمدن کا وہ قصر بلند جو فلک بوسی کی طرف مائل نظر آتا تھا آج خود اپنی اونچی چھت کے بوجھ سے جھکا جارہاہے۔ حیوانیت اور بربریت کی تیز آندھیوں میں انسانی زندگیاں خس و خاشاک کی طرح اڑتی ہیں۔

جنگ کے آغاز نامبارک کو یوں تو ڈھائی سال گذر چکے اور اس درمیان میں کتنے لہو کے دریا بہہ چکے، کتنے چھوٹے چھوٹے آزاد ممالک نہنگان ملک گیری کا لقمہ بن چکے، لاکھوں عورتیں بیوہ، بچے یتیم اور بوڑھے بے سہارے ہوگئے نہ کھانے پہننے کا سامان نہ رہنے کو مکان مختصر یہ کہ جو کچھ نہ ہونا تھا وہ ہو چکا لیکن سات دسمبر ۱۹۴۱ء سے پہلے تک ایشیا اور بالخصوص ہندوستان میں کوئی فوری زندہ خطرہ نہ تھا مگر خدا سمجھے اقوام زرد کے ارباب حل و عقد سے جاپان کو بھی میدان جنگ میں ڈھکیل دیا۔ وہ جاپان جس کو کبھی ہم لوگ "فخر ایشیا" کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ جاپان جس کا نام سن کر ہم لوگ کل تک کلاہ فخر کج کرتے تھے. آج دنیا کی نگاہوں میں ننگ انسانیت نظر آرہا ہے۔ امریکہ میں اور برطانوی مقبوضات پر اچانک حملہ اور وہ بھی طوفانی شدت کے ساتھ دیدہ و دانستہ اعلان کی نگاہ مذہبی میں بہتر ہو تو کسی شریف انسان کی نظر میں جبری ملک گیری کی ہوس شرمناک سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا. جاپان نے اپنے "آقائے المانی" کی تقلید میں جس بزدلانہ اور شرمناک اقدام سے کام لیا ہے وہ تاریخ کے صفحوں پر اس کے دامن کا داغ بن کر ہمیشہ روشن رہے گا۔ آنے والی نسلیں جب اس جنگ کے حالات پڑھینگی تو ان کی زبانوں پر جاپان کے لیے صرف کلمہ ہائے نفریں ہی مچلینگے۔ ان کو بھی ہماری طرح بلکہ ہم لوگوں سے کچھ زیادہ ہی حیرت ہوگی کہ کیونکر ایشیا کی سرزمین مبارک سے جس کو تمام ممتاز انبیاء، پیشواؤں اور روحانی رہنماؤں کی جائے پیدائش ہونے کا فخر حاصل ہے ایک ایسی قوم ہلاکت پھیلاتی ہوئی اور مغربی درندوں کی غلامانہ تقلید کرتی ہوئی میدان جنگ میں بغیر کسی اعلان کے کود پڑی۔ مذہبی پیشواؤں اور روحانی راہنماؤں کی صدائے لعنت آج بھی گوش حق شنو کو سنائی دے رہی ہے۔ ممکن ہے کہ قدرت نظام عالم کی اس ابتری کو دیکھ کر جلد کسی مہدی صداقت کو دنیا میں بھیجے

سنگاپور اور ملایا کے ساتھ ساتھ رنگون بھی جاپان ہلاکت کی جھپیٹ میں آگیا، ہوائی جہازوں کے بادل گھر کر آئے اور طوفانی شدت کے ساتھ بم برسا کر چلے گئے۔ جنگ کی خونیں برسات میں موت کی گھٹاؤں سے لہو کی موسلادھار بارش شروع ہوگئی ہے ہندوستان تک اڑ اڑ کے چھینٹیں آرہی ہیں۔ کون جانتا ہے کہ کب بادل کے چند ٹکڑے یہاں بھی پہنچ کر ہلاکت شروع کردیں۔ صوبۂ بنگال جاپانی ہوائی اڈوں سے بہت دور نہیں۔ کلکتہ، چاٹگام اور دوسرے دوسرے شہرہائے بنگال ہوائی حملے کی زد میں ہیں۔ مدافعت اور کی مسلسل کوششیں کی جارہی ہیں۔ شہریوں کے بیٹھنے جانے پناہ اور دوسری سہولتوں کا بھی انتظام ممکن العمل سرعت کے ساتھ کیا جارہاہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن خطرے کی نزدیکی اور نوعیت نے سارے بنگال اور بالخصوص کلکتہ کو پریشان کردیاہے۔ لاکھوں لاکھ لوگ اپنی بیویوں بچوں کو لیکر کلکتہ سے چلے گئے اور جارہے ہیں۔ بہتیرے شادی بیاہ بدحواسی سے ہل گئی ہیں، لیکن اس نمائش پر اس سے

صورت حال پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑ سکتا لیکن مزید ابتری کا اندیشہ ہے یہ ہندوستان کے تحمل، دلیری اور قوت عمل کا وقت ہے۔ ہمارا غیر مسلح ہونا مسلّم، ہماری ناواقفیت آلات جنگ لاریب، پھر بھی ہم دنیا کے سامنے اپنے ایثار و قربانی، جفاکشی و بردباری، ضبط و تحمل وغیرہ سے ایک ایسی نظیر پیش کر سکتے ہیں جو ہمارے آقایان کوتاہ بیں کو ہمارے استحقاق آزادی کا یقین دلا دے۔ ہم سرکار برطانیہ کی کوتاہ نظری کی بدولت ہر چند ابھی مسلح اور آزمودہ کار سپاہیوں کا کام نہیں دے سکتے پھر بھی اپنے جوشِ عمل اور سوز دل دے کر اتنا تو ضرور کر سکتے ہیں کہ اپنی آخری سانس تک اپنے وطن میں دوسرے دوسرے دشمنوں کو گھسنے نہ دیں۔ مادر وطن کی عزت و عظمت کی قسم کھا کر ہم اپنے اپنے گھروں کی حفاظت مجروحوں کی دیکھ بھال، بے خانماؤں اور بھوکوں کی خدمت، مفسدوں کی روک تھام وغیرہ جیسے کار ہائے مستحسن کے لیے زندگی وقف کر دیں۔ کانگرس ہو کہ مسلم لیگ۔ ہندو مہاسبھا ہو یا فورورڈ بلاک مختصر یہ کہ اس وقت جو بھی قومی ادارہ ہندوستان میں کام کر رہا ہے اس کا فرض ہے کہ ہندوستان کی اندرونی حفاظت کے لیے ملک کے ہر گوشے میں ایثار کرنے والے رضاکاروں کی جماعتیں قائم کرے اور یہ ثابت کر دے کہ ہندوستان موجودہ مشترک خطرے کے سامنے شاطران فرنگ کی سیاست تقسیم و تفریق سے شکست نہیں کھا سکتا، وہ متحد ہے اور مکمل طور پر متحد۔ آزادی نہ دینے کا عذر نامعقول اگر اب بھی پیش کیا گیا تو اس کو مدبران برطانیہ کی ناداری ذہانت اور افلاس صداقت کا ثبوت سمجھا جائیگا۔ حکومت ہند کی مخالفتی پالیسی سے اتفاق ہو یا نہ ہو، اس وقت تعاون کار کی خوشگواری یا ناخوشگواری کے سیاسی اور نفسی تجزیہ کا موقع نہیں ہم ایک کی غلامی سے نجات پا کر دوسرے کے غلام نہیں ہو سکتے ہم زندہ قوم ہیں آزادی ہمارا فطری حق ہے، اس کو کسی قیمت پر بھی ہو، لے کے رہیں گے۔

ناظرین جدید اردو سے :-

جنگ حاضرہ کی تباہ کاریاں اپنے مہلک نتائج کے ساتھ آنکھوں کو دکھائی دے رہی ہیں۔ چیزوں کی غیر متوقع اور ناگوار گرانی حوصلہ شکن ہوتی جا رہی ہے۔ جب کھانے پہننے کا مسئلہ ہی ناقابل حل نظر آ رہا ہے تو ایسی صورت میں ذوق ادب کی حیات کا سوال کیا ہو سکتا ہے۔ کلکتہ جس انتشار اور ابتری کے دور سے گذر رہا ہے وہ لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ ہر وقت ایک دھڑکا لگا ہوا ہے۔ خدا جانے ایک گھنٹے کے بعد کیا واقعہ پیش آ جائے۔ ان تمام حالات ناسازگار کے باوجود جدید اردو نکل رہا ہے اور انشاء اللہ اس وقت تک نکلتا رہیگا جب تک بازار میں کسی قیمت پر بھی کاغذ ملتے رہے۔ صورت حال تو ایسی ہے کہ اسی وقت رسالے کی زندگی خطرے میں نظر آتی ہے اور یہ کچھ اسی رسالے پر موقوف نہیں یہاں کے روزناموں اور دوسرے دوسرے جریدوں کا بھی یہی حال ہے لیکن جو بھی ہو ہمارا تو عزم ہے کہ قلعہ اردو کی حفاظت میں حالات ناموافق کے ہر حملے کا ہمت کے ساتھ مقابلہ کریں۔ اس جنگ کا اثر جو زبان و ادب پر پڑے گا وہ اہل نظر کے تصور میں ضرور موجود ہوگا۔ اردو زبان و ادب کے ساتھ ہماری تہذیب بلکہ ہماری زندگی وابستہ ہے جس طرح اپنی زندگی کی حفاظت ہمارا فرض ہے اسی طرح زبان و ادب کو زندہ رکھنا بھی ضروری ہے۔ ارباب ذوق یہ خیال نہ کرلیں کہ ان حالتوں میں جدید اردو زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں اپنے عزم کے متعلق سطور بالا ہی میں لکھ چکا ہوں۔ خدا کا فضل ہے کہ ابھی تک جدید اردو کے زندہ رہنے کا سامان موجود ہے۔ یہ نامناسب نہ ہوگا اگر میں عرض کردوں کہ اس وقت جدید اردو کے ساتھ ہمدردی اور کشادہ دلی سے کام لینا ہر صاحب ذوق کا ادبی اور اخلاقی فرض ہے۔ جدید اردو نے بنگال کے مقتل اردو میں اپنی سخت جانی سے ایک مثال قائم کر دی ہے۔ جہاں بڑے سے بڑے اردو رسالے شہید ہو گئے ہیں۔ وہاں اس نحیف الجثہ ماہنامے کا اتنے دنوں تک سربلند رہنا صرف تائید ایزدی ہے۔

ناظرین باقتدار کو چاہئے کہ حکومت بنگال کو سرپرستی اردو کی طرف متوجہ کریں اور وہ بھی بالخصوص اس وقت جبکہ جنگ کی تباہیاں تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہیں۔ کلکتے کے روزناموں کو زندہ رکھنا بھی ہمارا فرض ہے۔ حکومت نے اگر ہند اور عصر جدید جیسے روزناموں کے بھی زندہ رہنے میں مدد نہ کی تو ہمارے غریب اردو داں بھائی روز کی خبروں سے محروم ہو جائیں گے۔ اور اس کا جو مہلک نتیجہ برآمد ہوگا وہ شاید کافی حد تک خطرناک ہوگا۔ ناواقفیت اور بے خبری سے شکوک اور غلط قیاس آرائیوں کے دروازے کھل جائینگے اور لازمی طور پر زبردست انتشار پھیل جائے گا۔

آل انڈیا ریڈیو سے :-

آل انڈیا ریڈیو (کلکتہ) کے اراکین با اقتدار نے شاید قسم کھائی ہے کہ کبھی بھی اردو جیسی ملیچھ زبان کو اپنے پروگرام میں کوئی مستقل جگہ نہیں دینگے۔ اس مسئلہ کی طرف بارہا توجہ مبذول کرائی گئی لیکن کسی کے کان پر جوں بھی نہیں رینگی۔ ریڈیو کی پالیسی بھی اگر صوبائیت کا چھوت بن کر رہ گئی تو پھر اس کی کامیابی معلوم۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ بنگال میں بنگلہ زبان کا حق پہلے ہے لیکن ہرگز اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ دوسری مقبول اور عام پسند زبان کو یہاں سے "صوبہ بدر" کر دیا جائے۔ کلکتہ کا پروگرام صرف بنگال ہی والے نہیں سنتے۔ دوسرے مقاموں کے لوگ بھی گوش برآواز رہتے ہیں بیچاروں کو سخت مایوسی ہوتی ہے۔ جب ایک آدھ اردو گانے کے سوا ہر وقت بنگلہ ہی بنگلہ کی آواز گونجتی ہے۔ خود کلکتے میں اردو بولنے والے کلکتے کے پروگرام سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ حیرت ہے کہ کیونکر بخاری صاحب جیسا ادیب برسر اقتدار ہو کر اردو کو اب ناقابل اعتنا سمجھنے لگا ہے۔ وہ کنٹرولر ہیں اُن کو محبت بنگالہ سے غلط طور پر خائف نہیں ہونا چاہیئے۔

جاپان کی شرکت جنگ کے بعد یہ اور بھی ضروری ہو گیا ہے کہ اردو کو ایک مستقل جگہ کلکتہ کے پروگرام میں مل جائے۔ اہل کلکتہ ہی نہیں بلکہ سارا ہندوستان منتظر ہے کہ کب سے اردو میں خبریں نشر کی جانے لگیں۔ صورت حال متقاضی ہے کہ روز یہاں سے اردو میں بھی خبریں نشر کی جائیں، ورنہ باہر اور خود یہاں ایک ایسی بے اطمینانی اور ابتری پھیل جانے کا اندیشہ ہے جو ہر حالت میں ناخوشگوار ہوگی۔

اس وقت میں نے صرف مجملاً عرض کیا ہے اگر آل انڈیا ریڈیو نے اس کا خیال نہ کیا تو آئندہ تفصیل کے ساتھ لکھنا پڑیگا ممکن ہے وہ تفصیل اپنی صداقت کی وجہ سے تلخ ہو اور ناخوشگوار ہو۔

پرویز شاہدی

سانحہ

خان بہادر شمس العلماء ڈاکٹر ہدایت حسین مرحوم کی ناگہانی موت پر جتنا بھی غم کیا جائے کم ہے۔ آپ علوم مغربیہ و مشرقیہ کے ایک بہت بڑے عالم و فاضل تھے۔ آپ صوبہ بنگال میں ایک [illegible] مقام رکھتے تھے، اور اب آپ کے انتقال پر ملال سے یہاں کی علمی و ادبی دنیا میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے، وہ مستقبل قریب میں پُر ہوتا نظر نہیں آتا۔ آپ کو خاص طور سے عربی و فارسی ادبیات میں غیر معمولی دستگاہ حاصل تھا۔ آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ درس تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزرا ہے۔ آپ کی متعدد قیمتی اور مفید تصنیفات یادگار کے طور پر موجود ہیں۔ آپکے قلم بلاغت رقم سے بیسیوں تحقیقی مقالے نکل کر نہ صرف ہندوستان بلکہ یورپ میں بھی از حد مقبول ہوئے اور انہیں اصحاب علم و ذوق نے وقعت اور احترام کی نظر سے دیکھا۔ یہ حقیقت تبحر علمی کا ایک روشن ثبوت ہے۔ میں ادارہ جدید اردو کی طرف سے غیر متوقع سانحہ فاجعہ میں شمس العلما مرحوم کے غمزدہ پسماندوں کے ساتھ اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں اور بارگاہ مجیب الدعوات میں دست بدعا ہوں کہ مرحوم کی مقدس روح پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے آمین ثم آمین

قارئین "جدید اردو" اور شمس العلماء مرحوم کے ارادتمندوں کو یہ معلوم کرکے اطمینان ہوگا کہ ہمارے دوست پروفیسر طاہر رضوی صاحب شمس العلماء مرحوم کی سوانح حیات ضبط تحریر فرما رہے ہیں جو جدید اردو کے آئندہ شمارہ میں اشاعت پذیر ہونگے۔

دوسرا اچانک سانحہ اشرف علی چودھری بارایٹ لا دزمینداز [illegible] کا ہے۔ مرحوم صوبہ بنگال کے کامیاب بیرسٹر تھے آپ اپنے علاقہ [illegible] کی طرف سے بنگال لیجسلیٹو اسمبلی میں نمائندہ کی حیثیت سے تھے اور بنگال اسمبلی میں ڈپٹی اسپیکر کے عہدہ جلیلہ پر فائز تھے۔ آپکے دل میں قوم کی ہمدردی کا شدید جذبہ تھا۔ آپ بہت ہی با مروت اور خلیق انسان تھے۔ آپ ہر وقت ہر خاص و عام کے درد دکھ میں شریک رہتے تھے۔ ایسے کامل انسان کی اچانک موت سے مسلمانان بنگال کو جو نقصان اٹھانا پڑا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ ہماری دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور انکے پسماندوں کو صبر جمیل عطا کرے

ظہور احسن [illegible]

نغمۂ آرزو

ناگوار آپ کے غصے کی ادا کیا ہو گی
ہر جفا میں ہے وہ لذت کہ وفا کیا ہو گی

ساتھ ہے دل سی امانت جو عذابِ جاں ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ بلا کیا ہو گی

زخمِ دل چھیڑنے والے کو یہ معلوم نہیں
لطف بڑھ جائے گا تکلیف بھلا کیا ہو گی

میں ہی اپنے لیے تجویز سزا بھی کر دوں
تم اگر پہلے بتا دو کہ خطا کیا ہو گی

رکھنا اندازۂ تابِ نظرِ جلوۂ حسن
ہو کوئی چیز ضرورت سے سوا کیا ہو گی

سعیٔ بے سودِ ہوس لائق الزام نہیں
جُرم خود ایک سزا ہے تو سزا کیا ہو گی

ہے تڑپنے میں وہ لذت کہ خدا لاکھ سکوں
بن گیا دردہی سب کچھ تو دوا کیا ہو گی

دلِ ناکام تمنا میں تمنا کیسی
اور اگر ہو گی تو مرنے کے سوا کیا ہو گی

کچھ کے کچھ ہو گئے وہ اور یہی کہتے رہے ہم
ان سے بدعہدیٔ پیمانِ وفا کیا ہو گی

آرزو عشق گنہ ہے تو غم ہجر عذاب
اک سزا یافتہ کو اور سزا کیا ہو گی

کمال سخن

بوالہوس افسردہ اور رنگ کہاں سے آیا
امن بے شائبۂ جنگ کہاں سے آیا

جا کے منہ پر مرے پھر رنگ کہاں سے آیا
ذوق مائل بہ مۓ و چنگ کہاں سے آیا

طبعِ نازک کی کدورت سے ہوا گرد آلود
دل مرا آئینہ تھا زنگ کہاں سے آیا

رو بکعبہ جو ہیں پیشانی میں سجدے بیچین
تیری چوکھٹ کا وہاں سنگ کہاں سے آیا

ذوقِ نظارہ کہاں جلوہ گہِ طور کہاں
میں تو موسیٰ نہیں پھر دنگ کہاں سے آیا

نالۂ مرغِ خوش الحاں سے چمن بول اٹھا
سوز کا میرے اسے ڈھنگ کہاں سے آیا

شیخ نے آتے ہی ہجوِ قدح و مۓ چھیڑی
پی کے یہ بادہ کشو بھنگ کہاں سے آیا

پوچھ لے کوئی ستمگر سے الٰہی سرِ حشر
دامنِ ناز میں یہ رنگ کہاں سے آیا

کھینچ دیں کلکِ تصور نے عجب تصویریں
منظرِ سادہ پر ارژنگ کہاں سے آیا

سینۂ چمن چمن کے ہوا نالوں سے گلزار ارم
دلکشا ہر نفس تنگ کہاں سے آیا

قہر ہے گردشِ ایام کمالی ہشیار
کیا خبر پیش یہ نیرنگ کہاں سے آیا

رفتار وقت

جاڑا شدت کے ساتھ پڑ رہا ہے، برفباری بھی شروع ہے پھر روس کی سردی مشہور ہے، لیکن اتنے کڑاکے کی سردی اور برفباری بھی جنگ کے شعلہ کو بجھانے میں ناکام ثابت ہوئی

روس و جرمن :۔ ۱۸۔ اکتوبر جنوبی روس بحر اسود کے ساحل پر روسی فوجوں نے بندرگاہ اڈیسہ کا تخلیہ شروع کر دیا ہے اور اس شہر میں رومانوی فوجیں داخل ہونے لگیں، ماسکو کے مغرب میں جرمن فوجوں نے "کالوگا" اور کالینن پر قبضہ کر لیا۔ اجنبی ممالک کے باشندوں نے ماسکو کا تخلیہ شروع کر دیا۔ ۲۲۔ اکتوبر تک تمام غیر ملکیوں نے ماسکو خالی کر دیا۔ برطانوی سفارت خانہ شہر کیوبی شف میں منتقل کر دیا گیا۔ بلکہ دار الحکومت روس کے بارے میں قبل خیال تھا کہ دریائے والگا کے کنارے شہر قازان کو منتقل کیا جائیگا۔ اس شہر کا سابق نام سمارا تھا جو دریائے والگا کے کنارے قازان سے دکھن ہٹ کر ہے جنوب میں جرمن فوجوں کی پیشقدمی دریائے ڈون کے کنارے شہر روستوف کی طرف شروع ہوگئی ۲۳۔ اکتوبر کو جرمنی نے دعوی کیا کہ اس کی فوجیں ماسکو کی بیرونی مدافعت کو توڑ کر دارالحکومت سے ۶۰ میٹر کے قریب پہنچ گئیں لیکن روسی فوجیں مردانہ وار مدافعت کر رہی ہیں اور ابھی تک لینن گراڈ بھی محفوظ ہے۔ روستوف میں جرمنی فوجیں داخل ہونے لگی تھیں، لیکن روسی فوجوں نے اس پر دوبارہ قبضہ کر کے جرمنی فوجوں کو بہت دور تک پسپا کر دیا۔

جزیرہ نما کریمیا میں جرمنی فوجوں کو زیادہ کامیابی ہوئی ہے۔ ۲۹۔ اکتوبر کو کئی دنوں کی گھمسان جنگ کے بعد جرمن فوجیں خاکنائے کو عبور کر کے کریمیا میں داخل ہوگئیں، اور ۱۷۔ نومبر کو انھوں نے اس کے ایک اہم مشرقی شہر اور بندرگاہ کرچ پر قبضہ کر لیا اور ماہ نومبر کے آخر میں ایک اہم شہر سیواستاپول کو محاصرہ میں کر لیا۔

ماہ دسمبر میں جرمنی کو روس میں شکست پر شکست ہو رہی ہے۔ روسیوں نے ہر مقام پر فضائی فوقیت حاصل کر لی ہے اور طاس ڈونٹز میں روسیوں نے جرمنی فوجوں کو پسپا کر کے پیچھے ڈھکیل دیا۔ ۱۰ دسمبر کو "ملخوں" پر روسیوں نے دوبارہ قبضہ جما لیا۔ ماسکو کے محاذ پر بھی روسیوں کا پلہ بھاری ہو رہا ہے، اور جرمن فوجیں "موجیسک"، کالینن اور دوسرے اہم مقامات سے بری طرح پسپا ہو رہی ہیں جس کی وجہ سے روسی فوجوں کو بہت سارے مال غنیمت بھی ہاتھ آئے ہیں۔

شمالی افریقہ :۔ روسیوں کو کچھ دنوں سے یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ جرمنوں کے خلاف کسی دوسرے مقام پر بھی محاذ قائم کیا جائے تو ۔۔ اسی وجہ کر برطانیہ نے لیبیا کے علاقہ میں جنرل کننگھم کی ماتحتی میں جرمنوں کے خلاف معرکہ آرائی شروع کر دی ہے، اور محوری فوجیں جو مصر کے شہر سلّم اور حلیفہ تک پہنچ کر رکی ہوئی تھیں اور طبروق میں خشکی کی طرف سے برطانوی دستے محصور پڑے تھے لیکن سمندر کھلا ہوا تھا۔ ۲۵۔ اکتوبر سے برطانیہ نے اپنی فوجی طاقت کو بڑھا کر شدت سے حملہ شروع کر دیا، اور ۱۸ نومبر کو مصر کی برطانوی فوجوں نے طبروق کی طرف سے جارحانہ پیشقدمی شروع کر دی اور ۲۳۔ نومبر تک برطانوی فوجوں نے مشرقی لیبیا کے شہر "فی جو ستقرات" قلعہ کاپوزو، سیدی عمر اور سیدی عزیز پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ طبروق کی بیرونی مدافعت سے دس میل آگے کی طرف بڑھیں اور اس مقام پر برطانوی فوجوں کو نمایاں کامیابی ہو رہی ہے۔ ۹۔ دسمبر تک برطانوی فوجوں نے سید زریغ پر دوبارہ قبضہ کر لیا ہے اور بیر الغوبی تک پہنچ گئیں اور پھر ۱۰ دسمبر کو العدم پر دوبارہ قبضہ کر کے طبروق کو محاصرے سے نکال لیا۔ اور ۱۲۔ دسمبر تک وہاں سے چالیس میل آگے بڑھ کر مقام غزالہ تک پہنچ گئیں اور اس وقت ہر جگہ سے اطالوی اور جرمنی فوجیں بری طرح پسپا ہو رہی ہیں

جاپان :۔ ۱۶۔ اکتوبر کو پرنس "کونوئے" کی وزارت مستعفی ہوگئی

اور منسٹ ہیڈکی کی قیادت میں دوسری وزارت مرتب ہوئی، اس وزارت کے مرتب ہوتے ہی امریکہ اور جاپان کے درمیان گفت و شنید شروع ہوگئی، امریکہ نے چین کی بندرگاہوں سے اپنے جہازات واپس بلا لیے۔ ۱۸، نومبر کو جاپانی مجلس نمائندگان نے ایک تحریک منظور کی جس میں اس نے جاپان کی موجودہ مشکلات کا ذمہ دار امریکہ کو قرار دیا۔ جاپان نے حال ہی میں اپنا ایک سفیر خاص مسٹر کروسیو کو پریسیڈنٹ روزولٹ اور ان کے وزیر خارجہ مسٹر کارڈل ہل سے بات چیت کرنے کے لیے بھیجا تھا، مگر نومبر ماہ کے اختتام تک اس کے متعلق جو خبریں موصول ہوئی ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امریکہ جاپان کی خواہش پوری کرنے کو تیار نہیں ہے، چنانچہ ۲۹۔ نومبر کی اطلاع ہے کہ امریکہ اور جاپان کے درمیان سمجھوتہ کی گفت و شنید ناکامیابی پر ختم ہوگئی؛ امریکہ کا اصرار تھا کہ جاپان چین، فرانسیسی ہند چینی سے دستبردار ہو جائے اور آئندہ متشددانہ کاروائیوں سے باز آئے۔ جس کو جاپان نے منظور نہیں کیا

۷، دسمبر کو جاپانی طیاروں نے اچانک بغیر کسی اعلان جنگ کے امریکہ کے جزیرہ ہوائی اور پرل ہاربر پر خوفناک حملہ کر دیا جس سے امریکہ کے متعدد جنگی جہاز طیارے اور دوسرا سامان جنگ کثیر تعداد میں برباد ہوگئے، اور تقریباً ۳ ہزار آدمی ہلاک ہوگئے، اس کے بعد جاپانیوں نے امریکہ کے اور بھی متعدد مقبوضات پر فضائی و بحری حملے کر دیے۔ یہ حملہ جاپان کا اس قدر اچانک اور غیر متوقع تھا کہ امریکی فوجیں دیکھتے ہی دیکھتے رہ گئیں اور جاپانی فوجوں نے جزیرہ ویک پر قبضہ جما لیا، اور جزیرہ "گوام" کو محاصرہ میں لے لیا پھر اس کے دوسرے دن ۸۔ دسمبر کو جاپان نے برطانیہ و امریکہ کے جو خلاف اعلان جنگ کر دیا جو فوراً قبول کر لیا گیا؛ اور ۹۔ دسمبر کو جاپانی فوجیں غیر جانبدار ریاست تھیلینڈ میں بالجبر داخل ہوگئیں۔ ۱۰ دسمبر کو جاپانی طیاروں نے برطانیہ کے دو مشہور نامی جنگی جہازوں "پرنس آف ویلس"[1] اور "ریپلس" کو بم برسا کر غرق کر دیا جس سے کثیر جانی و مالی نقصان کا اندیشہ کیا جاتا ہے۔ بحرالکاہل میں برطانوی بحری طاقت کو اس سے ایسا نقصان پہنچا ہے کہ مستقبل قریب میں اس کا ازالہ دشوار ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اتحادیوں نے جاپان کی فضائی طاقت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا تھا۔ آج ہی جاپانی فوجیں ملایا کی بندرگاہ "کوٹابہرو" میں داخل ہوگئیں اور وہاں برطانوی فوجی دستوں کو پسپا ہونا پڑا، جزائر فلپائن کے علاقہ لوزن میں بھی جاپانی فوجیں داخل ہوگئیں۔ چین کی برطانوی نوآبادی ہانگ کانگ پر جاپانی فوجوں نے شدت سے حملہ شروع کر دیا ہے۔ چینی فوجوں نے برطانیہ کی حمایت میں کینٹن پر حملہ کر دیا ہے تاکہ جاپانیوں کا رخ ہانگ کانگ سے پھیرا جا سکے

۱۴۔ دسمبر کو جزیرہ نمائے ملایا کے شمالی علاقہ "کیڈا" میں گھمسان کی جنگ ہوئی اور اسی تاریخ کو جاپانی فوجیں تھیلینڈ سے گزر کر برما کے انتہائی جنوبی مقام "وکٹوریہ پوائنٹ" تک پہنچ گئیں

۱۵۔ دسمبر کو جاپانی فوجوں نے وکٹوریہ پوائنٹ پر قبضہ کر لیا اور ہانگ کانگ کا بھی محاصرہ شروع کر دیا ہے۔ لندن سے آئی ہوئی خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑائی چھڑتے وقت جاپان کے سمندری بیڑے کی کیا طاقت تھی یعنی پہلا اور دوسرا بیڑہ دس بڑے جنگی جہازوں، ہوائی جہاز لے جانے والے ۹ جہاز ۲۸۔ کروزر ۱۲۶ حملہ آور جہاز اور ۷۰ ڈبکی کشتیاں پر مشتمل تھیں۔ لیکن اب جاپانیوں کی تیز رفتاری میں کمی ہوتی جا رہی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ آہستہ آہستہ اتحادیوں کی طاقت بڑھتی جائیگی جاپان کمزور ہوتا جائیگا۔ امریکی و برطانوی امدادی دستے اور سامان محاذ جنگ پر بھیجے جا رہے ہیں

۱۸۔ دسمبر ۱۹۴۱ء کی اطلاعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جزیرہ نمائے ملایا میں جاپانی فوجیں "کیڈا" سے پیشقدمی کرتی ہوئی صوبہ ٹیلی کی [illegible] تک پہنچ گئی ہیں۔ برطانوی امدادی دستے بھی کیڈا کے محاذ پر پہنچ گئے ہیں جاپانی ریڈیو نے رنگون شہر پر بمباری کی خبر نشر کی تھی وہ غلط ثابت ہوئی ہانگ کانگ کے مدافعین کامیابی کے ساتھ جاپانی فوجوں کا مقابلہ کر رہے ہیں اور وہاں پھر سلسلہ رسل و رسائل قائم ہوگیا ہے۔ جزائر دیکیا اور منڈوے پر ابھی تک جاپانیوں کا پورا تسلط نہیں

---

[1] یہ جنگی جہاز سنہ ۱۹۳۹ء میں تیار ہوا تھا اس کا وزن ۳۵ ہزار ٹن تھا اسی جہاز پر مسٹر چرچل اور مسٹر روزولٹ سے بحر اوقیانوس میں ملاقات ہوئی تھی۔

جاتا ہے۔ ہوائی اور فلپائن میں مزید امریکی طیارے آگئے، جو مدافعانہ اور جارحانہ دونوں قسم کی جنگوں میں حصہ لے رہے ہیں۔ امریکہ کے جنگی جہاز بھی جاپانی جہازوں کا کامیاب مقابلہ کر رہے ہیں اور امریکہ میں بڑے بڑے پیمانے پر فوجی تیاریاں ہو رہی ہیں، جس سے امید ہے کہ وہاں عنقریب فوجوں کی تعداد ۷۰ لاکھ تک پہنچ جائیگی

۲۵۔ دسمبر کی خبر ہے کہ برطانوی فوجوں نے ہانگ کانگ خالی کر دیا۔

ہندوستان:۔ یکم مارچ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس وقت ہندوستان کی آبادی ۳۸ کرور ۸۰ لاکھ ہے جن میں ۴ کرور ۳۷ لاکھ ۲۲ ہزار تعلیم یافتہ ہیں اور باقی ناخواندہ ہیں یکم مارچ ۱۹۳۱ء کے مردم شماری کے حساب سے ۳۳ کرور ۱۸ لاکھ کی آبادی تھی۔

صوبہ بنگال کی آبادی ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۶ کرور ۳ لاکھ ۴۱ ہزار ہے جن میں ۷۰ لاکھ ۲۰ ہزار ۴ سو تعلیم یافتہ ہیں ۱۹۳۱ء کے حساب سے یہاں کی آبادی ۵ کرور ایک لاکھ ۱۴ ہزار تھی، خاص کر بڑے بڑے شہروں کی آبادی میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے، کلکتہ کی آبادی قریب ۲۰ لاکھ کے ہوگئی ہے صوبہ بہار کی آبادی ۳،۶۳،۴۰،۰۰۰ - یوپی ۵،۵۰،۲۱،۰۰۰ صوبہ پنجاب ۲،۸۴،۱۹،۰۰۰ صوبہ مدراس ۴،۹۳،۴۲،۰۰۰ صوبہ بمبئی ۲،۰۸،۵۰،۰۰۰ سی پی ۱،۶۸،۲۲،۰۰۰ صوبہ آسام ۱،۰۲،۰۵،۰۰۰ - صوبہ سندھ ۴۵،۳۷،۰۰۰ - اڑیسہ ۸۷،۲۹،۰۰۰ - دہلی ۹،۱۷،۰۰۰ - ریاست نظام حیدرآباد دکن ۱،۶۳،۴۴،۰۰۰ میسور ۷۳،۲۹،۰۰۰ کشمیر ۴۰،۲۱،۰۰۰ - راجپوتانہ ۱،۳۶،۷۰،۰۰۰

ہندوستان کے دفاعی اخراجات جنگ سے پہلے ۱۳ لاکھ کا روزانہ تھا۔ لیکن اس وقت ۱۹ ر نومبر ۱۹۴۱ء سے ۲۵ لاکھ روزانہ ہے۔ نصف ماہ نومبر تک وائسرائے کے ہنگامی کمیشن میں ۵۷ فی صدی یورپین ۴۲½ فی صدی ہندوستانی اور ½ فیصدی اینگلو انڈین۔ ایک لاکھ سے زیادہ ہندوستانی سپاہی ہندوستان سے باہر جا چکے ہیں، اس وقت ہندوستان میں ہر ماہ ۵۰ ہزار رنگروٹ بھرتی ہو رہے ہیں۔ امید ہے کہ عنقریب ہندوستان کی فوجی طاقت دس لاکھ سے زیادہ ہو جائے گی۔

صوبہ اڑیسہ کی نئی وزارت ۲۳۔ نومبر کو مرتب ہوگئی یہ وزارت مہاراجہ کسمنڈی کی قیادت میں پنڈت گوداوری

اور مولوی عبدالسبحان کو لیکر بنی ہے۔

صوبہ بنگال۔ یکم دسمبر ۱۹۴۱ء کو جملہ اراکین وزارت نے ہز اکسیلنسی گورنر بنگال کے سامنے استعفا دیدیا۔ لیکن ہز اکسیلنسی گورنر نے فوراً استعفیٰ منظور نہیں کیا۔ یہ وزارت مسلم لیگ کی اکثریت سے بنائی گئی تھی اور ۴½ سال سے قائم تھی اتنے زمانہ تک ان اراکین وزارت نے نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے فرائض کو انجام دیتے رہے، خاص کر آنریبل مسٹر حسین شہید سہروردی اور آنریبل سر خواجہ ناظم الدین نے اپنے اپنے صیغہ میں بڑی حسن خوبی سے ترقی کی جس سے کہ عوام میں بھی ان لوگوں کو ہر دلعزیزی حاصل ہے لیکن آنریبل مولوی فضل الحق وزیر اعظم بنگال، اور مسلم لیگ کے درمیان تعلقات کی کشیدگی نے اس وزارت کو ختم کر دیا۔ اور ۴۔ دسمبر کو آنریبل مولوی فضل الحق وزیر اعظم بنگال نے پروگریسو کولیشن پارٹی کی قیادت قبول کرلی۔ جس پارٹی میں اکثریت اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی ہے، اس میں ہندو مہاسبھا اور بوس گروپ پارٹی بھی شامل ہے۔ اسی بنا پر مسٹر محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ نے آنریبل مولوی فضل الحق اور ان کا ساتھ دینے والے نواب بہادر ڈھاکہ کو ہمیشہ کے لیے مسلم لیگ سے الگ کر دیا۔

۸ر دسمبر ۱۹۴۱ء کو ہز اکسیلنسی گورنر بنگال نے وزراء کا استعفیٰ منظور کرلیا اور چند روز تک غور و فکر کرکے اختلافات کو دور کرنے کی سعی بھی کی، لیکن بعد میں ہز اکسیلنسی نے ۱۱ر دسمبر کو پھر آنریبل مولوی فضل الحق کو وزارت مرتب کرنے کا حکم دے دیا۔ ۱۸۔ دسمبر کو آنریبل مولوی فضل الحق وزیر اعظم بنگال نے ۹ جدید وزراء کا کابینہ مرتب کر لیا جس میں ۵ مسلمان اور ۴ ہندو شامل ہیں۔ جدید مسلم وزراء کے نام یہ ہیں (۱) آنریبل مولوی ابوالقاسم فضل الحق (۲) آنریبل نواب بہادر ڈھاکہ (۳) آنریبل خان بہادر مولوی عبدالکریم (۴) آنریبل خان بہادر مولوی ہاشم علی خان (۵) آنریبل مسٹر شمس الدین احمد

جدید ہندو وزراء کے نام یہ ہیں (۱) آنریبل ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی (صدر ہندو مہاسبھا بنگال) (۲) آنریبل مسٹر سنتوش کمار باسو

(۳) آنریبل مسٹر پرسنتا ناتھ ٹکری (۴) مسٹر اپندر ناتھ برمن۔ جدید کابینہ میں مختلف الخیال اشخاص ہیں ان میں سے ہر ایک کا سیاسی رجحان الگ رہا ہے۔

آسام :۔ ۱۳۔ دسمبر کو آنریبل سر سعد اللہ وزیر اعظم آسام کے خلاف مسٹر نا بکما ردت نے عدم اعتماد کی تحریک پیش کی اور وہ بلا مخالفت پاس ہوگئی

موجودہ جنگ عظیم کی ابتدا پہلی ستمبر سنہ ۱۹۳۹ء کو سرزمین پولینڈ سے ہوئی اور تھوڑی ہی مدت میں شعلہ جنگ بھڑکتا ہوا اپنی پوری قوت کے ساتھ تباہی اور بربادی پھیلاتا ہوا دنیا کے ہر خطہ میں پھیل گیا۔ یہانتک کہ اب اس کا شعلہ ہندوستان سے بالکل قریب یعنے دروازہ پر پہنچ گیا ہے

جاپان کے جنگ میں کود پڑنے کے بعد سے ہندوستان میں حملے کا خطرہ بہت قریب آگیا ہے۔ خصوصاً بنگال وآسام

سام میں تو فضائی حملوں کا خطرہ ہر وقت محسوس کیا جارہا ہے

کلکتہ اور مضافات کلکتہ کے بہت سے لوگ احتیاطاً اپنے اہل وعیال کو دور دراز مقاموں میں منتقل کر رہے ہیں۔ اور حکومت و دوسرے اداروں کی طرف سے احتیاطی کارروائیاں بھی عمل میں لائی جارہی ہیں۔ لوگوں کو فضائی حملوں سے محافظت کے طریقوں سے مانوس کیا جارہا ہے۔ ۲۴۔ دسمبر کی شام سے صوبہ بنگال کو ایمرجنسی ایریا قرار دے دیا گیا، اس وقت باشندگان آسام وبنگال خصوصاً کلکتہ کو چاہیے کہ گورنمنٹ کے شائع کردہ اعلانات کو ذہن نشین کریں اور وقت ضرورت اس پر عمل پیرا ہوں، اس میں خود عوام کی بھلائی ہے۔ اس وقت جو لوگ کلکتہ چھوڑ کر جارہے ہیں جائیں، اور جنہیں جرأت اور استقلال ہے وہ رہیں، اور اسطرح سے کہ سرمایہ دار اپنے اپنے کاروبار کو جاری رکھیں، مزدور طبقہ اپنے فرائض کو مستعدی سے انجام دیتا رہے۔ اس لیے کہ شہر کلکتہ ہندوستان کا ایسا تجارتی مرکز ہے جہاں سے کروروں انسان اپنی اپنی روزی حاصل کرتے رہتے ہیں

عبدالجلیل

صفحات میں کمی

جنوری ۴۲ء سے رسالہ جدید اردو کل ۳۲ صفحوں پر شائع ہو رہا ہے۔ ہم مجبوراً ایسا کر رہے ہیں۔ جب کاغذ بازار میں ملتا ہی نہیں ہے تو ایسی بے بسی میں چارہ ہی کیا ہے جب کاغذ ملنے لگے گا تو پھر اس کے صفحات بھی بڑھا دیئے جائیں گے۔ اس وقت تو ہمیں صرف رسالہ کو زندہ رکھنا ہے

پھر اس وقت شہر کلکتہ جس خطرے سے دوچار ہو رہا ہے، وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں، ہر وقت ہوائی حملے کا خوف لوگوں کے دلوں میں دھڑکن پیدا کیئے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض کرم فرما اس رسالہ کی طرف سے مایوس ہو رہے ہیں۔ یہ اپنا اپنا خیال ہے، لیکن ہم لوگوں نے اس کا فیصلہ کر لیا ہے کہ رسالہ شائع ہوتا رہے گا چاہے جس طرح کے آفات کا سامنا کرنا پڑے برداشت کرتا رہونگا۔ میرے اس عزم میں ہرگز فرق نہیں آسکتا جب تک کہ میرے سر پر کوئی بم آکر نہ پھٹ پڑے یا اسی طرح کی کوئی آفت ناگہانی سے یہ رسالہ بند نہ ہوجائے۔

عبدالجلیل

غزل

دیکھا کیا ہے مری مے خواریاں
بخت خفتہ کی ہیں یہ بیداریاں

بے نیازی یہ تری دلداریاں
کام آئی ہیں مری سرشاریاں

حشر میں سامان بخشائش ہوئیں
فرد میں لکھی تھیں جو ناداریاں

اب کہاں وہ لذت سوز دروں
بجھ گئیں سب عشق کی چنگاریاں

دل جھکیگا تو حرم بھی جائیں گے
ہیں ابھی اس میں بڑی دشواریاں

خاص جلوے ہو گئے ہیں عام کیوں
میں کہوں گا عشق کی ناداریاں

جور پیہم ہی ہیں کچھ وجہ سکوں
اور مضطر کرتی ہیں غم خواریاں

سینہ داغوں سے مرقع بن گیا
ہجر نے کی ہیں عجب گلکاریاں

سوز جائز پر دھواں ممنوع ہے
چاہتا ہے حسن بس چنگاریاں

فکر سے الجھاؤ رہتا ہے سلیم
کام آتی ہیں بہت بیکاریاں

سلیم فہد

غزل

شب فرقت ہے کوئی پوچھنے والا بھی نہیں
ہاں مگر فیض تصور سے میں تنہا بھی نہیں

یوں تو ہر درد کی دنیا میں دوا ہوتی ہے
درد الفت کا مگر کوئی مداوا بھی نہیں

یاد ایام کہ ارمانوں سے معمور تھا دل
ایسا اجڑا ہے کہ اب کوئی تمنا بھی نہیں

مہرباں تم تھے تو ہمدرد زمانہ تھا مرا
حال دل سنئے فقط اب کوئی اتنا بھی نہیں

جس کے دیدار کی حسرت میں ہے جینا دشوار
چشم مشتاق نے اب تک اسے دیکھا بھی نہیں

میں کروں ان سے تغافل کی شکایت تو ہے
دل کو پندار جنوں ہے مگر اتنا بھی نہیں

بحر امید میں وہ یاس کا طوفان اٹھا
ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا بھی نہیں

رسم دنیا ہے مریضوں کی عیادت کرنا
میں نے مانا کہ تمہیں پاس وفا کا بھی نہیں

پرسش حال سے بھڑکا تو نہ بجھتی ہوئی آگ
اب تو خاکستر دل میں کوئی شعلہ بھی نہیں

مدعا جس کا ہے خونریزی و جمہوری کشی
ایسی تہذیب مٹا دے کوئی ایسا بھی نہیں

مہرباں احسن مضطر پہ ستمگر کیوں ہو
اب اسے ناز اٹھانے کی تمنا بھی نہیں

احسن طبا طبائی لکھنوی

برج نرائن چکبست لکھنوی

قومیں بن رہی ہیں اور بگڑ رہی ہیں اور قوموں کے اس تغیر حیات میں وہ کل قوتیں کام کر رہی ہیں جن پر انسان کو قدرت ہے، بچے، جوان بوڑھے، مرد اور عورتیں غیر ارادی اور لاشعوری طور پر کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں، کسی نہ کسی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ اور اسی کشمکش کے درمیان کوئی قوم بن رہی ہے، کوئی بگڑ رہی ہے۔

ہندوستانیوں کی حالت پر خدا رحم کرے۔ انہیں نہ بننے کا احساس ہے نہ بگڑنے کا غم! وہ زندگی کی منزلوں سے گذرتے جا رہے ہیں لیکن منزل کی حقیقت سے ناواقف ہیں! وہ منزل کی جانب جا رہے ہیں لیکن رہرو اور راہبر کی تمیز سے عاری ہیں ــــ زندگی کی ہر منزل اور منزل کی ہر راہ میں ان کی یہی حالت ہے۔

شاعر کے سریلے نغمے بے سود ہیں ان کے لیے جو بہرے ہوں رہبر کی فکر منزل بیکار ہے اس کاروان کے لئے جو مزاج کو ابھر سے ناواقف ہو اور ماضی کی تابانیاں تاریک ہیں ان کے لیے جو ماضی کی تہذیب کو فراموش کر چکے ہوں!

زندگی، کتنی درخشاں، کتنی امید افزا، کتنی پرعزیمت ہے ان قوموں کے لیے جو اپنی آن پر قائم ہیں اور اپنی خود اعتمادی پر چاند اور سورج تک کو حقیر سمجھتی ہیں۔ کتنی خوفناک اور یاس انگیز ہے ان کے لیے جو دوسروں کے آگے جھک چکی ہیں، جن کا ماضی فراموش ہو چکا اور مستقبل کا پتہ نہیں۔ خوددار قوم میں زندہ دلی ہے زندگی ہے۔ غلاموں میں یاس و حسرت ہے، موت ہے ــــ اپنی قوم کی موت پر ماتم کرنے والوں میں ایک نام چکبست کا بھی ہے

۱۸۸۲ء میں فیض آباد، جیسے راجہ رام چندر کے مولد ہونے کا فخر حاصل ہے، چکبست کی جائے پیدائش بنا۔ لیکن ابھی عقل و ہوش کی دنیا سے بیگانہ ہی تھے کہ ان کے والدین اپنے آبائی وطن لکھنؤ چلے آئے اور لکھنؤ قدیم شاعری کو ایک نئے رنگ میں رنگنے والا علم و ادب کے اسی گہوارے میں پروان چڑھنے لگا۔ زمانہ گذرتا رہا، اسکول کی زندگی سے کالج کی زندگی شروع ہوئی پھر اس کے اختتام کا وقت بھی آگیا اور ۱۹۰۵ء میں چکبست نے کیننگ (Canning College) سے بی اے پاس کر لیا۔ طبیعت سیر نہ ہوئی، قانون پڑھنے کا ارادہ کیا۔ عظیم ہستیوں کے ارادے عمل سے زیادہ ٹھوس ہوتے ہیں، چکبست کو قانون کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ــــ اب دنیوی کشمکش میں حصہ لینے کا وقت آگیا تھا۔

قسمت کی نیرنگیوں سے کسی کو انکار نہیں لیکن صرف قسمت کے نام پر جینے والا اس فقیر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا جس کے ٹھیکرے میں راہگیر اپنی مرضی سے دو پیسے ڈال جاتے ہیں۔ چکبست قسمت کا قائل ہوتے ہوئے بھی عقلی کوشش و عملی جدوجہد کا پابند تھا۔ کالت میں بھی دیکھتے ہی دیکھتے اپنے پیش روؤں سے بازی لے گیا۔ لوگ اسے ایک کامیاب اور کامران قانون داں سمجھتے تھے۔

ادبی ذوق

لیکن قدرت نے اسے وکالت سے زیادہ اہم کام کے لیے اس دنیا میں بھیجا تھا۔

بارہ برس کی عمر تھی، اسکول کا زمانہ، خبر ملی کہ ایک قومی جلسہ ہونے والا ہے۔ تمنائیں بے چین ہوگئیں اور خوابیدہ قوتیں بیدار، اور اسی جلسہ میں جہاں رتن ناتھ سرشار مصنف "فسانہ آزاد" اور بشن نرائن ابر کے معرکۃ الآرا قصیدے فضا میں گونجے، ایک کم سن لڑکا بشکل شاعر اپنی ابتدائی نظم سنا رہا تھا:

حب قومی کا زباں پر ان دنوں افسانہ ہے
بادۂ الفت سے پر دل کا مرے پیمانہ ہے
جس جگہ دیکھو محبت کا وہاں افسانہ ہے
عشق میں اپنے وطن کے ہر بشر دیوانہ ہے
ہے جو روشن بزم میں قومی ترقی کا چراغ
دل فدا ہر اک کا اس پر صورت پروانہ ہے
نقش الفت جن کی کوشش سے اٹھا ہے قوم میں
قابل تعریف ان کی ہمت مردانہ ہے
دُر فشاں ہے ہر زباں حب وطن کے وصف میں
جوش زن ہر سمت بحر ہمت مردانہ ہے

جمع ہیں اِنہی ترقی کے لیئے اربابِ قوم
رشکِ فردوس انکے کاموں سے شادی خانہ ہے؟ وغیرہ

نظم ختم ہوگئی، حاضرین پر تعجب انگیز خاموشی طاری تھی۔ یکایک پنڈت بشن نارائن ابر اٹھے اور چکبست کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے ——— "تو قوم کا نام روشن کریگا!"

یہ تو خیر ایک بچپن کا واقعہ تھا جس سے سوائے اس کے اور کچھ اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ چکبست ایک فطری ذوقِ ادبی کا مالک تھا اور جس کا مظاہرہ خود بخود ہوجایا کرتا تھا

چکبست صرف شاعر ہی نہ تھا بلکہ ایک بلند پایہ ادیب اور ایک بےلاگ ناقد بھی! اس کی تنقید حقیقی معنوں میں تنقید ہوتی تھی۔ ذاتیات و متعصبانہ خیالات سے بالکل پاک اس کا مقصد اصلاح ہوتا تھا عیب جوئی نہیں۔ مثال کے لیے وہ تاریخی واقعہ کافی ہے جو اس کے اور ہندوستان کے مایہ ناز ناول نویس مولانا عبدالحلیم شرر کے درمیان پیش آیا اور جس پر قلم اٹھانے سے پہلے ہی چکبست نے کہا تھا:

"میرے قلم سے کسی بندۂ خدا کی توہین نہ ہوگی"

ادب آموز ہے ہر ایک ذرہ اپنی وادی کا
نہیں ممکن کہ گرد اڑ کر پڑے رہرو کے دامن پر

جناب آسی جالسی، اپنے "تذکرہ سرکۂ سخن" (مطبوعہ نگار بکڈپو) میں اس واقعہ کا یوں ذکر کرتے ہیں ؎

"یعنی سنہ ۱۹۰۶ء میں پنڈت برج نرائن چکبست نے مثنوی گلزار نسیم کو نہایت تصحیح کے ساتھ چھاپا تھا اور اسی زمانہ میں انھوں نے وہ مثنوی مولانا شرر (مدیر دلگداز) کے پاس ریویو کے لیے بھیجی، مولانا کو نہ معلوم اس وقت کیا ترنگ آئی کہ زمانہ سازی سے کام نہیں لیا اور مثنوی گلزار نسیم کی تعریف کے ساتھ اس کے عیوب بھی پبلک کے سامنے لائے چکبست مرحوم کو یہ بات قدرتاً ناگوار ہونا چاہئے تھی اور ہوئی۔ انھوں نے اس کی شکایت منشی سجاد حسین (مدیر اودھ پنچ) سے کی سجاد حسین نے شرر کے اعتراضات کے جواب دیئے۔" الخ وغیرہ

قصہ مختصر اس معمولی سے واقعہ نے وہ طول کھینچا کہ طرفین میں اودھ کے کل نامور شعرا اور ادیب شامل ہوگئے۔ وہ طوفان اٹھا کہ خدا کی پناہ! ——— لیکن سنہ ۱۹۰۵ء میں بی اے کا امتحان سر پر ہوتے ہوئے بھی چکبست نے مولانا جیسے کہنہ مشق ادیب کے مقابلہ میں جس خوبصورتی سے کامیابی حاصل کی وہ تاریخ اردو میں ہمیشہ کے لیئے ایک دلچسپ مگر کسی قدر بھیانک اور گھناؤنی یادگار ہے۔ میرے خیال میں پنڈت چکبست و مولانا شرر اس ناگوار بحث کے بجائے اگر کسی اور مفید کام میں اپنا اپنا زورِ قلم صرف کرتے تو زیادہ انسب تھا انجام کار مرزا محمد شفیع شیرازی نے ایک طویل دیباچہ لکھ کر اس مباحثہ کو کتابی صورت میں شائع کیا اور اس کا نام "معرکۂ چکبست و شرر" رکھا۔

چکبست کی شاعری صرف اس مباحثہ تک محدود نہ تھی بلکہ اس کے قلم سے وہ گہربار مضامین نکلے جو بعد کو "مضامینِ چکبست" کے نام سے پبلک کے سامنے آئے۔

بطور شاعر

چکبست کو دورِ حاضر کے ان باکمال شعرا میں تسلیم کیا جاسکتا ہے جنہوں نے اپنی کل قوتیں ملک و قوم کے بیدار کرنے میں صرف کردیں

شاعری کا اصل مقصد کیا ہے؟ ——— گل و بلبل کی فرسودہ حکایات کو نظم کرنا؟ قبروں سے بولنا؟ قیس و فرہاد کو جھنجھوڑنا؟ یا اس سے پیامِ سربلندی و نغمۂ قومی بھی مراد ہے؟ اگر نہیں تو چکبست یقیناً عام شعرا کے معیار سے پیچھے تھا۔

شاعر صحیح معنوں میں قومی کشتی کا ناخدا ہے اور اس کا رتبہ اس سپہ سالار سے کسی طرح کم نہیں جو میدانِ جنگ میں اپنی ہستی کو مٹا کر اپنے وطن و قوم کی عزت کو سرنگوں ہونے سے بچا لیتا ہے۔ مثال کے لیئے قوموں کی تاریخ کافی ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے انقلاب اکثر کسی ادیب کی جنبشِ قلم کا نتیجہ تھے۔ عرب کی مشہور اور عظیم لڑائیوں میں شاعروں کے قصیدے سپہ سالار کی تلوار سے زیادہ کاٹ کر گئے ہیں ——— چکبست کی شاعری کا مقصد بھی قوم کو بیدار کرنا تھا۔

چکبست کی زبان دراصل لکھنؤ کی ستھری اور رواں اردو تھی اس کے کلام میں وہی سلاست، وہی روانی وہی کشش پائی جاتی ہے جو حضرت تصیح کی غزلوں اور انیس کے مراثی میں ملتی ہے چکبست کو آتش کے کلام سے عشق تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس کی غزلوں میں آتش کا رنگ صاف جھلکتا نظر آتا ہے۔ اکثر وہ فخریہ کہتا تھا "آتش میرا روحانی استاد ہے"

اس کے بعد جگیبت کا کلام آپ کے سامنے ہے، خود انصاف کیجئے۔

رنگ تغزل

نہ کوئی دوست نہ دشمن جو شریک درد و غم میرا
سلامت میری گردن پر رہے بار الم میرا
بہار آئی ترقی پہ ہے سودا دم بدم میرا
بڑھا جاتا ہے خود زنجیر کی جانب قدم میرا
کشاکش ہے، امید و یاس کی یہ زندگی کیا ہے
الٰہی ایسی ہستی سے تو اچھا تھا عدم میرا
لکھا یہ داور محشر نے میری فرد عصیاں پر
یہ وہ بندہ ہے جس پہ ناز کرتا ہے کرم میرا
کھڑی تھیں راستہ روکے ہوئے لاکھوں تمنائیں
شہید یاس ہوں، نکلا ہے کس مشکل سے دم میرا

جو ظہور عالم ذات ہے، یہ فقط ہجوم صفات ہے
ہے جہاں کا اور وجود کیا، جو طلسم وہم و گماں نہیں!
یہ حیات عالم خواب ہے، نہ عذاب ہے نہ ثواب ہے
وہی کفر و دیں میں خراب ہے، جسے علم راز جہاں نہیں!
وہ ہے سب جگہ جو کرو نظر، وہ کہیں نہیں جو ہوئے بصر
مجھے آج تک نہ ہوئی خبر وہ کہاں ہے اور کہاں نہیں!

دل ہی بجھا ہوا ہو تو لطف بہار کیا
ساقی ہے کیا، شراب ہے کیا، سبزہ زار کیا
یہ دل کی تازگی ہے، وہ دل کی فسردگی
اس گلشن جہاں کی خزاں کیا بہار کیا
کیا ہوا و حرص میں برباد ہے بشر
سمجھا ہے زندگی کو یہ مشت غبار کیا

مصیبت میں بشر کے جوہر مردانہ کھلتے ہیں

مبارک دشمنوں کو گردش قسمت سے ڈر جانا
گدا نے سلطنت کی شکر حق سے اور قناعت سے
زباں کو تیغ اور نان شبینہ کو سپر جانا
اجل کی نیند میں بھی خواب ہستی گر نظر آیا
تو پھر بیکار ہے تنگ آکے اس دنیا سے مر جانا
وہ طبع یاس پرور نے مجھے چشم عقیدت دی
کہ شام غم کی تاریکی کو بھی نور سحر جانا

رہ گئی بازار محشر میں گنہگاروں کی ساکھ
رحمت باری کے سکے داغ عصیاں بن گئے

کلام کا جوش اور بندش کی چستی دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے گویا خواجہ آتش شرر بارگی کر رہے ہیں۔ دوسرا رنگ ملاحظہ ہو:

شورش دیر و حرم سے جب پریشاں ہو گئے
کچھ سمجھ کر ہم شریک بزم رنداں ہو گئے!
دیکھنا نیرنگ سازی طلسم نو بہار
پیرہن کلیوں کے، پھولوں کے گریباں ہو گئے
حسن کی دولت سے تھے گلہائے رنگیں بے خبر
دیکھ کر رنگ چمن کانٹے نگہباں ہو گئے

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے؟ انہیں اجزا کا پریشاں ہونا!
چاک ہو کر کفن غنچہ بنا جامۂ گل
کھل گیا رنج سے شادی کا نمایاں ہونا
دل اسیری میں بھی آزاد ہے آزادوں کا
ولولوں کے لیے ممکن نہیں زنداں ہونا

فنا کا ہوش آنا، زندگی کا درد سر جانا
اجل کیا ہے خمار بادۂ ہستی اتر جانا!

کس کے فسونِ حسن کا دنیا طلسم ہے؟
ہیں لوحِ آسماں پہ یہ نقش و نگار کیا؟

دیکھا سرورِ بادۂ ہستی کا خاتمہ
اب دیکھیں رنگ لائے اجل کا خمار کیا؟

راحت طلب کو درد کی لذت نہیں نصیب
تلوؤں میں آبلے جو نہیں، لطفِ خار کیا؟

ہو بہو مرزا غالب بول رہے ہیں۔ وہی انداز، وہی تیور وہی تجسس! —— اب ذرا ذاتی رنگ بھی دیکھئے۔ ؎

دردِ الفت زندگی کے واسطے اکسیر ہے
خاک کے پتلے اسی جوہر سے انساں ہو گئے!

اور غالب کہتا ہے

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے:

غالب دنیاوی محبت سے گھبرا گیا تھا۔ دنیا کی بے وفائی اور زمانے کی پرفریب روش نے اسے قابل ہی نہ رکھا کہ وہ محبت کی بلندیوں کا ذکر کرتا۔ لیکن چکبست کو دنیا کی پروا نہیں، دوستوں سے امید نہیں، اس کا مذہب محبت ہے اور وہ صرف اتنا جانتا ہے کہ دنیا محبت پر قائم ہے جس کے خاکستر میں محبت کی چنگاریاں نہیں، وہ انسانیت کا اہل نہیں!

جام سے خم تک شراب آنے میں ہو جاتی ہے دیر
ہم تو ساقی کے تکلف سے پریشان ہو گئے

انتظار کی گھڑیاں کتنی کٹھن ہوتی ہیں! پھر ایک جوان دل، بے چین طبیعت۔ شاعر کا انتظار، اس وقت جبکہ حاصلِ انتظار نگاہ کے سامنے ہو! —— ساقی ہے، شراب ہے، پینا ہے، پھر تکلف کیوں، کسی غیر کی تو محفل نہیں۔ کیوں نہ خم ہی میں منہ لگا دیا جائے، جب پینا ہی ہے تو پھر جام و مینا کی درد سری کیوں کی جائے؟

اور ڈاکٹر سر اقبال کہتا ہے

جوانی آہ کہاں تک امیدوار رہے
وہ عیش عیش نہیں جس کا انتظار رہے

مرے احباب پیش آتے ہیں مجھ سے بے وفائی سے
وفاداری میں شاید لے رہے ہیں امتحاں میرا!

پہلے میرے دوست مجھ سے خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے لیکن اب رفتہ رفتہ مجھ سے کھنچنے لگے ہیں؛ شاید یہ دیکھنے کے لیے کہ میرے دل میں ان کی کتنی قدر و محبت ہے۔ اس لیے انکی یہ بے وفائی سطحی ہے، بہت جلد میری وفا انہیں ہمیشہ کے لیے میرا بنا دے گی کیونکہ جس وفاداری کا وہ امتحان لینا چاہتے ہیں، مجھے اس میں اپنی کامیابی کا یقین ہے! —— لیکن چکبست نے "وفاداریٔ احباب" کے بارہ میں جس رعایت پسندی کا اظہار اس شعر میں کیا ہے وہ ممکن ہے چکبست کے زمانہ تک کسی قدر صحیح ہو لیکن آج تو مغربی تہذیب کے "درخشاں اخلاق" نے اسے غیر ضروری سمجھ کر ہمیشہ کیلیے مٹا دیا ہے!

ہجومِ بےکسی ہے شامِ تنہائی ہے اور میں ہوں
صدائے چارہ گر برہم نہ کر دے یہ سماں میرا!

دنیا کی کشمکش سے دور، تاریک شام کی آغوش میں، مجھ بےکس کو لذتِ درد حاصل کرنے کا موقعہ مل گیا ہے، میری حسرتیں میری تمنائیں، میرے ارمان سب میرے سامنے ہیں۔ اور میں ان سے کھیل رہا ہوں، ان کے تاریک مستقبل کو اپنی نگاہوں سے دیکھ رہا ہوں ایسا نہ ہو کوئی ہمدرد اس موقعہ پر آ جائے اور میری آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ کر مجھے تسلی دینے کی کوشش کرے اور میری یہ خاموش دنیا درہم برہم ہو جائے!

اور اقبال اپنے مخصوص رنگ میں کہتا ہے ؎

اے دردِ عشق! ہے گہرِ آبدار تو
نامحرموں میں دیکھ! نہ ہو آشکار تو!

سفر میں زندگی کے سو گیا ہوں تھک کے منزل پہ

اجل کے نام سے بدنام ہے خواب گراں میرا:
مسافر سفر کی ہیم تکلیف سے چور ہوکر سر منزل پہنچ سو ہی جاتا ہے۔ میں بھی زندگی کے کٹھن اور دشوار سفر سے تھک کر اپنی منزل پہ سو گیا ہوں۔ لیکن یہ دنیا کہتی ہے کہ میں مرگیا اور مفت میں موت کو بدنام کرتی ہے! بالکل اچھوتا خیال ہے۔ اگرچہ ناسخ کہتا ہے:۔

"ہمارا ہر نفس اک بادباں ہے،
روانہ کشتیٔ عمر رواں ہے!"

لیکن دونوں میں جو لطیف معنوی فرق ہے وہ اہل ذوق سے پوشیدہ نہیں

یہ ہے چکبست کے رنگ تغزل کا نمونہ۔ جگہ نہیں جو کچھ وضاحت سے لکھا جائے۔ حالانکہ اس کو غزل گوئی سے کوئی خاص شغف نہ تھا پھر بھی جو لکھ گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے:

نظمیں

لیکن چکبست کا فطری رنگ اگر کہیں نظر آتا ہے تو اسکی وہ بے پناہ نظمیں ہیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اپنی نظموں میں زیادہ تر اس نے ملک کے نوجوانوں ہی سے خطاب کیا ہے۔ اس کا قول ہے

نئے اڑے دل کو طبیعت کی روانی وہ ہے
یہ ہے نشہ رہے جس میں جوانی وہ ہے

لیکن قبل اس کے کہ میں چکبست کی نظموں کو آپ کے سامنے پیش کرتے ہوئے ان کے بارہ میں کچھ لکھوں میں یہ کہدینا چاہتا ہوں کہ میں صرف نمونہ پر اکتفا کرونگا۔ کیونکہ جگہ کی تنگی اتنی اجازت نہیں دیتی کہ انہیں وضاحت سے پیش کیا جائے اور ان پر اپنی و دیگر اہل علم کی رائیں سامنے لائی جائیں۔

سب سے پہلے میں چکبست کی پہلی نظم کے چند بند پیش کرتا ہوں جس کا نام ہے "خاک ہند"

پہلا بند

اے خاک ہند! تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیض قدرت تیرے لیے رواں ہے
تیری جبیں سے نور حسن ازل عیاں ہے
اللہ رے زیب و زینت کیا اوج عز و شاں ہے
ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی

ہند کی عظمت ثابت کرنے کے لیے پہلی نظر کوہ ہمالیہ ہی پر پڑتی ہے۔ اور ہمالہ کی عظمت کے لیے یہی کافی ہے کہ دنیا کا روشن کرنیوالا سیارہ روزانہ صبح کو اپنی کرنوں سے ہمالیہ کو چومتا ہے تو چوٹی گوندھنا لکھنؤ کے دیگر شعراء نے اور خصوصاً امانت نے اپنے اپنے کلام میں اکثر باندھا ہے لیکن جس خوبصورتی سے چکبست نے اسے اپنے بند میں نبھایا ہے اس کی مثال بمشکل کسی دوسری جگہ ملے گی۔ اسی نظم میں آگے بڑھ کر کہتا ہے:

گوتم نے آبرو دی اس معبد کہن کو
سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جام الفت بخشا اس انجمن کو
سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو
سب سورما اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں

پہلے چار مصرعے ہندوستان کی مذہبی و اخلاقی عظمت کے حامل ہیں "معبد کہن" اپنی جگہ پر کس قدر جامع ہے اس کی تعریف محال ہے۔ کون نہیں جانتا کہ جب پوری دنیا علم کی روشنی سے دور جہالت کی تاریکی میں پڑی ہوئی تھی، ہندوستان اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ چمک رہا تھا، چکبست صرف "معبد کہن" کہکر خاموش نہیں ہو جاتا بلکہ آئندہ تین مصرعوں میں وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ہر مذہب و ملت کی عظیم شخصیتوں نے اسے اپنایا اور اس کے لیے اپنے آبائی وطن کو ترک کر ڈالا، گوتم، سرمد، شہید، اکبر و رانا دو مختلف مذہب و ملت کے افراد کو ایک ہی جگہ میں مناسب موقع پر رکھا اور اس طرح کہ یہ نہ معلوم ہو کہ شاعر کا مقصد ہندو مسلم کو ایک ساتھ دکھانا ہے، چکبست کا کمال ہے۔ بہت بہت طبیعت سے اور اس کا مصرعہ ثانی "ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں"

ایک جہانِ عبرت کا عالم ہے

دیوار و در سے اب تک ان کا اثر عیاں ہے
اپنی رگوں میں اب تک ان کا لہو رواں ہے
اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے
فردوس گوش اب تک کیفیت اذاں ہے
کشمیر سے عیاں ہے جنت کا رنگ اب تک
شوکت سے بہہ رہا ہے دریائے گنگ اب تک

اس بند کی روانی دریائے گنگ کی روانی سے کہیں زیادہ ہے! چکبست کے کمال شاعری میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا تیسرے مصرعہ میں "فردوس گوش" کی ترکیب کس قدر دلکش ہے اور کتنی رواں! چکبست کا مقصد شاعری کچھ بھی کیوں نہ ہو لیکن ہندو مسلم اتحاد کا وہ زبردست حامی تھا اور ہر ممکن طریقہ سے اس نے کوشش کی دونوں ایک دوسرے کو اپنا سمجھنے لگیں، اسی طرح جس طرح وہ مغربی تہذیب کی نمود سے پہلے ایک دوسرے کو سمجھتے تھے۔ چنانچہ پہلے بند میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ اس نے گوتم کے ساتھ سرمد شہید؟ کا اور اکبر کے ساتھ رانا کا نام لیا ہے اس بند میں بھی اگر ایک طرف وہ صدائے ناقوس کا ذکر کرتا ہے تو دوسری طرف اس سے کہیں زیادہ رنگین پیرائے میں "کیفیت اذاں" کو پیش کرتا ہے۔ ایسی مثالیں اس کے کلام میں ہر جگہ موجود ہے

۱۹۱۴ء جب غریب الوطن ہندوستانی جنوبی افریقہ میں ٹرانسوال (Transvaal) کے ظالم حاکموں کے رحم پر زندگی کے دن گن رہے تھے، چکبست نے ایک انتہائی پرجوش لیکن انتہائی دردانگیز نظم "فریاد قوم" لکھی، چند بند آپ کے سامنے ہیں۔

پہلا بند

ہے آج اور ہی کچھ صورت بیاں میری
تڑپ رہی ہے دہن میں مرے زباں میری
چھدے گئے قلب و جگر، تیر ہے فغاں میری!
لہو کے رنگ میں ڈوبی ہے داستاں میری

مبالغہ نہیں تمہید شاعرانہ نہیں
غریب قوم کا ہے مرثیہ، فسانہ نہیں
وطن سے دور تباہی میں ہے وطن کا جہاز
ہوا ہے ظلم کے پردے میں حشر کا آغاز
سنیں تو ملک کے ہمدرد، قوم کے دمساز
ہوا کے ساتھ یہ آتی ہے دکھ بھری آواز
وطن سے دور ہیں ہم پر نگاہ کر لینا
ادھر بھی آگ لگی ہے، ذرا خبر لینا
لٹے ہیں یوں کہ کسی کی گرہ میں دام نہیں
نصیب رات کو پڑ رہنے کا مقام نہیں
یتیم بچوں کے کھانے کا انتظام نہیں
جو صبح خیر سے گذری امید شام نہیں
اگر جئے بھی تو کپڑا نہیں بدن کے لیے
مرے تو لاش پڑی رہ گئی کفن کے لیے

اسی نظم میں آگے چل کر ہندو اور مسلمانوں کی یکساں مصیبت کا بیان اس طرح ہے:-

وطن سے دور بھی ہیں اور خانہ ویراں بھی
اسیر یاس بھی ہیں اور اسیر زنداں بھی
ہوئے ہیں نذر مصیبت کے دین و ایماں بھی
تباہ حال ہیں ہندو بھی اور مسلماں بھی
پڑھی نماز تو اجڑے گھروں کے صحرا میں
اگر نہائے تو اپنے لہو کی گنگا میں

"اجڑے گھروں کے صحرا میں" نماز پڑھنا اور "اپنے لہو کی گنگا میں" نہانا بالکل اچھوتا خیال ہے لیکن کتنا دردناک، کتنا یاس انگیز شعر نہیں، متحرک تصویریں ہیں جو ایک بے بس دبے ہوئے قوم کی ناچاری و بےکسی کا نقشہ پیش کر رہی ہیں۔

کہاں ہیں ملک کے سرتاج قوم کے سردار
پکارتے ہیں مدد کے لیے در و دیوار!
وطن کی خاک سے پیدا ہیں جوش کے آثار

زمیں ہل رہی ہے، اڑتا ہے خون بن کے غبار
ملے اپنی ہے چتوڑ کی زمین سر کی!
لرز رہی ہے کئی دن سے قبر اکبر کی!

خدا کی پناہ! یہ کیسا شور ہے؟ یہ کیا قیامت ہے؟ کون آواز دے رہا ہے، کون پکار رہا ہے؟ یہ مظلوموں کی آہیں اور زخمیوں کی چیخیں ہیں، یہ بیکسوں کی فریادیں اور یتیموں کے نالے ہیں! کہاں ہیں ہمارے تاجدار؟ ذرا اپنے خواب پارینہ سے آنکھیں کھول کر اس قوم کی ذلت دیکھیں جو اکبر و عالمگیر، امر سنگھ و درا شکوہ کی یادگار ہے۔ یہ وہ نام ہیں جن کی حکومت کے بارہ میں ہمارا مورخ کہتا ہے:۔

"کبھی ہم نے بھی کی تھی حکمرانی ان ممالک پر!
مگر وہ حکمرانی جس کا سکہ جان و دل پر تھا" (شبلی)

اسی نظم میں آگے بڑھ کر چکبست ہندوؤں سے خطاب کرتا ہے ؎

بھنور میں قوم کا بیڑا ہے ہندوؤں ہشیار
اندھیری رات ہے، کالی گھٹا ہے اور منجدھار
اگر پڑے رہے غفلت کی نیند میں سرشار
تو زیر موج فنا ہوگا آبرو کا مزار
مٹے گی قوم، یہ بیڑہ تمام ڈوبے گا!
جہاں میں بھیشم و ارجن کا نام ڈوبے گا

مسلمانوں کو ان کا فرض یاد دلایا جاتا ہے۔ ؎

دکھا دو جوہر اسلام اے مسلمانو
وقار قوم گیا قوم کے نگہبانو!
ستون ملک کے ہو قدر قومیت جانو
جفا وطن پہ ہے فرض وفا کو پہچانو
نبی کے خلق و مروت کے ورثہ دار ہو تم
عرب کی شان حمیت کی یادگار ہو تم
کرو خیال کچھ اسلاف کی حمیت کا
دیا تھا دشمن قاتل کو جام شربت کا
معاملہ ہے یہاں بھائیوں کی عزت کا
یہ فرض عین ہے سودا نہیں مروت کا

اگر نہ اب بھی ہوا اسلام کا جگر پانی
ہزار خندہ کفر است بر مسلمانی

سبحان اللہ! سبحان اللہ! یہ ایک برہمن کا کلام ہے "ہزار خندہ کفر است بر مسلمانی" کو حسن خوبصورتی سے نبایا ہے اور اس سے طنز کا جو لطیف نکتہ پیدا کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے ظاہر ہے کہ اسلام کے لیے اس سے زیادہ شرم کی بات کیا ہوگی کہ حب قومی میں کفر اس سے بڑھ جائے یعنی ہندو بڑھ جائیں اور مسلمان پیچھے رہ جائیں۔

اہل ہنود میں بیوہ کی شادی جائز نہیں اور جو لوگ اس نیم مذہبی قانون کو نہیں مانتے وہ کچھ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے چکبست بھی اس اصول کے بالکل خلاف تھا اور دل سے چاہتا تھا کہ یہ ظالم رسم قوم سے دور ہو جائے۔ سوئے اتفاق چکبست کے ایک دوست نے اپنی نوجوان بیوہ لڑکی کا نکاح ثانی کر دیا۔ چکبست کو گویا دولت مل گئی، فوراً ایک نظم لکھ ڈالی:۔

ملگئے خاک میں کتنے ہی غریبوں کے شباب!
ان گناہوں کا ہے اس قوم کی گردن پہ عذاب
جو پرانی روشوں کے لیے رہتے ہیں خراب
ان کی صورت سے اب آتا ہے زمانہ کو حجاب!
شان اخلاق نہیں جبر کی تدبیروں میں!
بے گناہوں کو جکڑتے نہیں زنجیروں میں!
آج اس ظلم کی بنیاد ہلی جاتی ہے
خاک میں محبت دیرینہ ملی جاتی ہے
رحم کا راج ہے اب سنگدلی جاتی ہے
اور کلی دل کی محبت سے کھلی جاتی ہے
مرد قوموں کو سبق یونہیں پڑھا دیتے ہیں
دل میں جو ٹھانتے ہیں کر کے دکھا دیتے ہیں

۱۹۱۹ء کا زمانہ اور پنجاب کی فضا! خدا کی پناہ! وطن کا نام لینا جرم تھا، قوم کی محبت جرم تھی —— جنگ عظیم ہی تھی

ختم ہوئی تھی، معاہدہ درسیلز کے دستخط کی روشنائی بھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ امرتسر میں ہندوستانیوں کی وفا کا انعام جلیان والا باغ میں بانٹ دیا گیا۔ شاعر کا دل تڑپ اٹھا ۔

"انہیں یہ فکر ہے ہر دم نئی طرز جفا کیا ہے
ہمیں یہ شوق ہے دیکھیں ستم کی انتہا کیا ہے!
گنہگاروں میں شامل ہیں گناہوں سے نہیں واقف
سزا کو جانتے ہیں ہم خدا جانے خطا کیا ہے!
یہ رنگ بے کسی رنگ جنوں بن جائیگا غافل
سمجھ لے یاس و حرماں کے مرض کی انتہا کیا ہے
امیدیں مل گئی مٹی میں، دور ضبط آخر ہے
صدائے غیب بتلا دے ہمیں حکم خدا کیا ہے؟"

۱۹۱۷ء میں لکھنؤ کے ایک ہائی اسکول کا سالانہ جلسہ ہوا۔ چکبست کو صدر بنایا گیا۔ جب صدارتی تقریر کا وقت آیا تو بجائے تقریر کے ایک نظم پڑھ ڈالی چند شعر حاضر ہیں۔

فنا نہیں ہے محبت کی رنگ و بو کے لیے
بہار عالم فانی رہے رہے نہ رہے
جنون حب وطن کا مزا شباب میں ہے
لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے
جو دل میں زخم لگے ہیں وہ خود پکاریں گے
زبان کی سیف بیانی رہے رہے نہ رہے
جو مانگتا ہے، ابھی مانگ لو وطن کے لیے
یہ آرزو کی جوانی رہے رہے نہ رہے

وہ قوم کبھی ترقی نہیں کر سکتی جس کی عورتیں جاہل، کم نظر و باطل پرست ہوں۔ مثال کے لیے پوری دنیا ہمارے سامنے ہے۔ آج سورج کی روشنی میں وہی قومیں سورج سے زیادہ روشن ہیں جنکی ماؤں نے اپنے بچوں کو آزادی کی لوریاں سنا سنا کر جوان کیا ہے ماں کا زانو بچہ کا پہلا اسکول ہوتا ہے اور جو تعلیم اس اسکول میں ملحاق ہے وہ [illegible] کا [illegible] ہوتی۔

چکبست نے ہندوستانی لڑکیوں سے یوں خطاب کیا ہے

روش خام پہ مردوں کی نہ جانا ہرگز
داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز
نام رکھا ہے نمائش کا ترقی و ریفارم
تم اس انداز کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز
نقش یورپ کی مناسب ہے مگر یاد رہے
خاک میں غیرت قومی نہ ملانا ہرگز
رخ سے پردے کو اٹھایا تو بہت خوب کیا
پردۂ شرم کو دل سے نہ اٹھانا ہرگز
اپنے بچوں کی خبر قوم کے مردوں کو نہیں
یہ ہیں معصوم، انہیں بھول نہ جانا ہرگز
کاغذی پھول ولایت کے دکھا کر ان کو
دیس کے باغ سے نفرت نہ دلانا ہرگز
پرورش قوم کی دامن میں تمہارے ہوگی
یاد اس فرض کی دل سے نہ بھلانا ہرگز
گو بزرگوں میں تمہارے نہ ہو اس وقت کا رنگ
ان ضعیفوں کو ہنس ہنس کے رلانا ہرگز

چکبست نے جو نظمیں بچوں کے لیے لکھی ہیں، وہ یقیناً اس قابل ہیں کہ گھر گھر گائی جائیں۔ ایک نظم کے چند شعر حاضر ہیں۔

یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن! محبت کی آنکھوں کا تارا وطن
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن
وہ اس کے درختوں کی تیاریاں وہ پھل پھول پودے وہ پھلواریاں
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن
وہ ساون میں کالی گھٹا کی بہار وہ برسات کی ہلکی ہلکی پھوار
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن
وہ باغوں میں کوئل، وہ جنگل کے مور وہ گنگا کی لہریں، وہ جمنا کا زور
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن
اسی سے ہے اس زندگی کی بہار وطن کی محبت ہو یا ماں کا پیار
ہمارا وطن [illegible] وطن

ظریفانہ کلام ـــــ چکبست کبھی کبھی تفریح طبع کے لیے

ظریفانہ شعر یا نظم بھی کہہ ڈالتا تھا۔ اسے ظریفانہ رنگ میں اکبر الہ آبادی بہت پسند تھے اور خود اسی کے بقول ـــ ہمارا بہترین معلم اکبر اس قابل تھا کہ جہاں تک ہو سکے شعراء ظرافت میں اکبر کی تقلید کریں۔ لیکن اکبر کے رنگ میں کہنا آسان تو کیا، ناممکن ہے، اور بڑے بڑے شعراء کرام باوجود کوشش کے اس رنگ کو نہ نباہ سکے۔ اقبال بیسویں صدی کا سب سے بڑا ایشیائی شاعر، جب اکبر کے رنگ میں کچھ کہنا چاہتا ہے تو ناکام رہتا ہے۔ بھلا چکبست کو کامیابی کیونکر ہوتی۔ پھر بھی اس کے ظرافت آمیز چند شعر لکھتا ہوں

جہاں میں آنکھ جو کھولی، فنا کو بھول گئے۔
کچھ ابتدا ہی میں ہم انتہا کو بھول گئے!
نفاق گبر و مسلماں کا یوں مٹا آخر
وہ بت کو بھول گئے۔ یہ خدا کو بھول گئے
ہوا مزاج کا عالم یہ سیر یورپ سے
کہ اپنے ملک کی آب و ہوا کو بھول گئے

کیا کہیں، کس سے کہیں، دنیا میں کیا کرتے رہے
بدعتیں ہوتی رہیں، شکر خدا کرتے رہے!

اذاں سے نعرۂ ناقوس پیدا ہو نہیں سکتا
ابھی کچھ روز کعبہ کلیسا ہو نہیں سکتا!
زباں سے جوش قومی دل میں پیدا ہو نہیں سکتا
ابلنے سے کنواں دست میں دریا ہو نہیں سکتا
گراں ہے جنس اور نیت خریداروں کی ابتر ہے
اب اس بازار میں الفت کا سودا ہو نہیں سکتا

ملک میں دولت نہیں باقی دوا کے واسطے
ہاتھ خالی رہ گئے ہیں اب دعا کے واسطے
آب و آتش کی غلامی پر بشر قانع نہیں
ہو رہی ہے فکر تسخیر ہوا کے واسطے

آخر کہاں تک لکھا جائے اور کس کس پر لکھا جائے "صبح وطن" (مجموعہ کلام) ہاتھ میں ہے۔ جدھر نگاہ پڑتی ہے جھمکے رہتی ہے۔ ایک باغ ہے جو آزادی کے پھولوں سے مالا مال لہلہا رہا ہے۔ وطن کا راگ، فریاد قوم، الوداع، پیارا وطن، برق اصلاح، رامائن کا ایک سین، آصف الدولہ کا امام باڑہ، ماتم یاس نشتر یاس، ایک نظم ہو تو خیر، یہاں اول تو جگہ نہیں دوسرے فرصت نہیں جو سب پیش کی جائیں۔

قبل اس کے کہ یہ مضمون ختم ہو یہ بتا دینا ضروری ہے کہ چکبست کوئی تخلص نہ تھا بلکہ قومی لقب تھا۔ کشمیری برہمنوں میں خاص خاص کنیتیں ہوتی ہیں مثلاً ملّا، ودر، نہرو، چکبست وغیرہ۔ چنانچہ برج نرائن چکبست تھے ـــ اپنے ایک شعر میں کہا ہے۔

نام کیوں آئیگا بزم شعرا میں اپنا
میں تخلص کا بھی دنیا میں گنہگار نہیں!

اسی کا ایک شعر ہے

کرشمہ یہ بھی ہے اُو۔ بے خبر افلاس قومی کا
تلاش رزق میں اہل ہنر کا در بدر جانا

اور اسی در بدر پھرنے کا نتیجہ تھا کہ ایک مقدمہ کے سلسلے میں بریلی جانا پڑا۔ ۱۲۔ فروری سنہ ۱۹۲۶ء کا دن تھا۔ چکبست لکھنو آنے کے لیے اسٹیشن پر کھڑے تھے کہ فالج کا شدید حملہ ہوا۔ لینے کے دینے پڑ گئے۔ بڑے بھائی پنڈت مہاراج نرائن کو تار دیا گیا۔ وہ فوراً موٹر پر سوار ہو بریلی روانہ ہوئے۔ ادھر حالت غیر ہو گئی اور قبل اس کے کہ محبت کرنے والا بھائی بریلی پہنچے، چکبست نے دنیا سے منہ موڑ لیا، وہ زبان خاموش ہوگئی جو آتش بداماں تھی، اس دل کی حرکت رک گئی جس میں قوم کا درد تھا، وہ نگاہیں بند ہو گئیں جو وطن کے لیے نمناک رہا کرتی تھیں۔ قوم کو بیدار کرنے والا خود غفلت کی نیند سو رہا تھا!

لاش لکھنو لائی گئی۔ خبر آگ کی طرح پھیلی اور گھر گھر چکبست کا ماتم ہونے لگا۔ سر لوئی اسٹوارٹ چیف جج اور مسٹر کینڈل ایڈیشنل جج نے اظہار غم میں عدالتیں بند کر دیں اور دوکانداروں نے اپنی اپنی دکانیں۔

حضرت کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی نے تاریخ نکالی :۔

انکے ہی مصرعہ سے تاریخ ہے ہمراہ عزا

موت کیا ہے، انہیں اجزا کا پریشاں ہونا! ۱۳۴۴ھ

چکبست کی داستان ختم ہوگئی، لکھنو میں چکبست روڈ اب تک موجود ہے اور اس کا مختصر مجموعۂ کلام "صبح وطن" بطور یادگار؛ اور خدا معلوم کتنے ہی ایسے اہل کمال اس خاک میں پوشیدہ ہیں جو اپنی زندگی میں وطن کی سربلندی نہ دیکھ سکے ۔۔۔ آہ! مظلوم ہندوستان! تجھ میں کتنی حسرتیں پوشیدہ ہیں!

زبان حال سے یہ لکھنو کی خاک کہتی ہے

مٹایا گردش افلاک نے جاہ و حشم میرا

سالک لکھنوی

عیدیاں!

ہے ہلال عید زیب آسماں
بہر جشن و شوکت اسلامیاں!
مسلم ہندی ہے تہی دست و غلام!
اب کہاں وہ حوصلے، وہ دل کہاں

کس لیے سجدوں میں ہے انکی جبیں
دل ہیں جنکے بے حضور و بے یقیں
یہ غلامی اور غلاموں کی یہ عید
یہ خدا کی شان کے شایاں نہیں

آہ قربانی کا مفہوم بلند
کچھ نہ سمجھا مسلم ہندوستاں!
حریت اسلام کا منشائے خاص
منتظر ہے تاکہ ہو قربانیاں!

عید کیا ہے اور نوید عید کیا؟
اے ہلال عید اب امید کیا؟
بندگی میں چھن گیا ذوق نظر
کور آنکھیں ہوں تو لطف دید کیا؟

مسلم ہندی غلام و بے نوا!
بے جنوں زندگی، بے آرزو!
گفتگو محکوم، دل محکوم تر
بے نگاہ و بے خبر، بے جستجو

سالک لکھنوی

غزل

جلوہ گر گلشن میں جو وہ رشکِ خوباں ہو گیا
دیکھ کر ہر پھول اُس کو چاک داماں ہو گیا

دیکھ لی مرغانِ گلشن نے جو اُس گل کی جھلک
کوئی نالہ کش ہوا، کوئی غزلخواں ہو گیا

دیکھ کر تیرا خرامِ حشر خیز اے شعلہ رو
عاشقِ دلباختہ محشر بداماں ہو گیا

موسمِ گل میں جنونِ عشق پھر تازہ ہوا
پھر مری بربادیٔ عشرت کا ساماں ہو گیا

تم گئے کیا ہو گئے سب اہلِ محفل بد حواس
چھائی زردی شمع پر، شعلہ پریشاں ہو گیا

آہ وہ دیوانگی بھی ضعف سے جاتی رہی
عیب جو کل تک چھپا تھا آج عریاں ہو گیا

وہ پری پیکر جو آیا سوئے مسجد مے پیے
دم بخود واعظ ہوا، زاہد پریشاں ہو گیا

ہو گیا میں پیرِ میخانہ کے ہاتھوں پر مرید
نذرِ ساغر آج میرا دین و ایماں ہو گیا

آپکی چینِ جبیں کو دیکھ کر مظہر تھا چپ
خندہ بر لب دیکھتے ہی پھر غزلخواں ہو گیا

سید مظہر حسین مظہر مونگیری

داستاں میری

اُمنڈ آیا ہے اب رک نہیں سکتی زباں میری
بہائے جاؤ آنسو سنتے جاؤ داستاں میری

الٰہی پر اثر اتنی تو ہو جائے زباں میری
میں مٹ جاؤں مگر مٹنے نہ پائے داستاں میری

وہ دزدیدہ نظر سے دیکھ کر کچھ مسکرائے تھے
ذرا سی بات تھی ان کی بنی جو داستاں میری

حقیقت میں یوں مشتِ خاک لیکن سب سے افضل ہوں
الٰہی مختلف کتنی ہے مجھ سے داستاں میری

کسی کو کیا خبر کیوں گرتے ہیں آآ کے پروانے
تمہاری شمعِ محفل کہہ رہی ہے داستاں میری

اسیری کا مری قصہ عجب پُردرد قصہ ہے
کھڑکتی بیڑیاں ساکت ہیں سنکر داستاں میری

میں تڑپے جا رہا ہوں پیٹھ تربت میں نہیں لگتی
وہ مجھکو ڈھونڈھنے نکلے ہیں سنکر داستاں مری

مرا قصہ ازل ہی سے بڑا دلچسپ قصہ تھا
مرتب مجھ سے پہلے ہو گئی تھی داستاں میری

کوئی بعد فنا حسرت سے مجھ کو یاد کرتا ہے
بہت کچھ مجھ سے آگے بڑھ گئی ہے داستاں میری

دمِ آخر تو آکر دیکھ جاؤ مرنے والے کو
ابھی تک میں ہوں اس کے بعد ہوگی داستاں میری

تغیر شمس کی ہستی کا تم نے کھیل سمجھا ہے
گھٹاؤ گے مجھے جتنا بڑھیگی داستاں میری

محمد احمد شمس، عظیم آبادی

بہار کی ادب نواز خواتین

موجودہ دور کے اردوداں طبقہ نے اردو ادب میں ترقی پسندی کو صحیح معنی میں سمجھا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج اردو ادب کافی ترقی پر ہے۔ اور یہ ایک امر مسلّمہ ہے کہ جس چیز میں ترقی کا خیال پیدا ہوا وہ چیز آگے بڑھ کے رہی۔ فی زمانہ شعر و شاعری، افسانہ نویسی، مقالہ نگاری کو خاص اہمیت دی جا رہی ہے۔ پہلے اردو ادب سے ذوق رکھنے والے صرف مرد ہوتے تھے۔ مگر ہمیں مسرت ہوئی ہے کہ میدانِ ادب میں اب خواتین بھی مردوں سے پیچھے نہیں۔ اور ان کے کارنامے بھی ہم سے کچھ کم نہیں ہیں۔ اور حق تو یہ ہے کہ زندگی کے کسی شعبے میں عورتیں مردوں سے پیچھے رہیں بھی نہیں۔ دورِ حاضر میں اگر حضرات ایم۔ اسلم۔ ل۔ احمد، احمد شجاع شفق عماد پوری، جگر مرادآبادی، سیماب اکبرآبادی کے اسمائے گرامی اردو ادب کے تذکرہ میں فخر کے ساتھ لیے جا سکتے ہیں تو محترمات حجاب امتیاز علی، خاتون اکرم، مسز عبدالقادر، خورشید اقبال حیا، نذر سجاد حیدر کے نام نامی بھی ہرگز فراموش نہیں کیے جا سکتے کہ اردو ادب پر ان کے احسانات بھی بے شمار ہیں۔

آج کی فرصت میں میں صرف بہاری خواتین کی خدمات ادب پر روشنی ڈالونگا۔ اور ان کا بہ اختصار تعارف کرانے پر اکتفا کرونگا کہ اس صوبہ میں اردو ادب کے سر سب سے پہلے انھوں نے ہی احسان دھرے ہیں۔ اور آئندہ بھی ان کی ذات سے ہماری بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ بہاری خواتین کی تصانیف اور افسانوں کے مجموعے بھی متذکرہ بالا مستورات ادیبوں کی تصانیف کے پہلو بہ پہلو رکھے جا سکیں گے۔ ضرورت ہے کہ ان کی ادبی خدمات کو زیادہ سے زیادہ سراہا جائے تاکہ یہ اپنی ادبی عمر خاطر خواہ بڑھا سکیں اور وہ خواتین جو تعلیم یافتہ ہیں انہیں اس کا ذوق دلاکر ان میں ادبی زندگی پیدا کریں۔

شکیلہ اختر

یہ تقریباً دس سال سے مضامین اور افسانے لکھ رہی ہیں جو بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے پلاٹ جتنے اچھے ہوتے ہیں کسی اور بہاری خاتون کے نہیں ہوتے۔ یہ افسانہ نویسی میں نمایاں درجہ رکھتی ہیں۔ آپ کا ہر افسانہ جدت و ندرت کے لحاظ سے عدیم النظیر ہے۔ آپ کا کوئی افسانہ ختم کیے بغیر چھوڑنے کا جی نہیں چاہتا۔ اپنے خیالات کو سلجھے ہوئے اور دلنشین پیرائے میں ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ آپ کے ہر افسانہ میں عشق و محبت کا لطیف جذبات ضرور شامل ہیں۔ آپ اپنے افسانہ "وہ سیاہ عبا" میں لکھتی ہیں۔

"یکایک وہ گھبرا کر کرے سے بھاگا۔ جاتے ہوئے گون کے دامن سے الجھ کر میز پر رکھی ہوئی تصویر گر کر لوٹ گئی۔ گرنے کی آواز سے ضیا رکا۔ وہ ریحانہ کی تصویر کو دیکھ کر نے خود سا ہو گیا۔ پریشانیاں اب اس سے دور تھیں۔ اس نے آہستہ آہستہ ٹوٹے ہوئے شیشوں کو دور کر کے ریحانہ کی تصویر کو اپنے قمیص کی جیب میں بالکل اپنے دھڑکتے ہوئے دل کے قریب رکھ لیا۔ اب اسے کچھ سکون سا معلوم ہو رہا تھا!"

آپ کا ہر افسانہ بلا مبالغہ گھنٹوں محویت میں رکھنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

محترمہ مضمون نگاری اور افسانہ نویسی کے علاوہ شاعری بھی کرتی ہیں اور شاعری کی حیثیت سے بھی آپ ایک ممتاز شخصیت کی مالکہ ہیں۔ آپ کی شاعری کی خصوصیات رنگین تخیل اور پرحسرت جذبات ہیں۔ آپ کی ایک نظم "زندگی" کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

زندگی نام ہے گھٹ گھٹ کے جیے جانے کا
زندگی نام ہے پامال کیے جانے کا
زندگی نام ہے ارماں پہ مٹے جانے کا
روح کا قید میں بس آہ کیے جانے کا

زندگی اس کی بگڑی ہوئی صورت کہیے
سانس چلتی ہوئی بے جان سی مورت کہیے
خون مزدور سے لیکے ہیں ہی چمن میں لالے
آہ دہقاں سے دہکتے ہیں فلک پہ تارے

بخت انساں کے فرشتوں کو یہ حیرانی ہے
جس کی تخلیق تھی احسن وہ یہی فانی ہے

نثار کبیری

آپ ایک کامیاب افسانہ نویس ہیں اور آپ کے افسانے زیادہ تر اصلاحی پہلو لیے ہوتے ہیں۔ آپ کو اپنی قوم کے سدھار نے کی فکر بہت زیادہ ہے۔ عرصہ سے آپ کا نام رسائل میں نظر نہیں آتا۔ آپ کا انداز بیان اور طرز تحریر نہایت سادہ اور عام فہم ہوتا ہے۔ آپ کی سادہ زبان میں افسانہ نویسی کا نمونہ ملاحظہ ہو ایک افسانہ "شریعت کی آڑ میں زر کی تلاش" میں لکھتی ہیں

"میرے پاس سیکڑوں خطوط عقد ثانی کے آرہے ہیں۔ کوئی لکھتا ہے کہ میں زمیندار رئیس عالی نسب ہوں۔ کوئی لکھتا ہے کہ میں وکیل ہوں بیرسٹر ہوں۔ کوئی لکھتا ہے کہ میں بی۔ اے، ایم۔ اے ہوں۔ کوئی لکھتا ہے کہ میں اعلیٰ عہدہ دار ہوں۔ کوئی لکھتا ہے کہ میں عالم باعمل ہوں۔

اگر سچ پوچھئے تو یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ فقط شریعت کی آڑ میں ہماری دولت پر لوگ ڈاکہ مارنا چاہتے ہیں۔ حد درجہ کے یہ لوگ حریص ہیں۔ یہ دولت جو ہمارے پاس ہے میری نہیں ہے بلکہ اس یتیم لڑکے کی ہے (جو سامنے کھڑا ہے) لاکھ روپے سال کا وقف اسٹیٹ ہے وہ اس لڑکے کی امانت ہے۔ اس کے بالغ ہونے پر اس کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔ مجھے امانت میں خیانت نہیں کرنی چاہیئے کل پانسو روپے ماہانہ بطور وظیفہ میرا اسٹیٹ سے مقرر ہے ——"

نسیمہ سوز

آپ ایک روشن خیال خاتون ہیں اور افسانہ نویسی میں خاصی دسترس رکھتی ہے۔ آپ کے افسانے ہمارے پرچوں میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جن میں زبان کی شستگی اور صفائی کی خوبی نمایاں رہتی ہے۔ انداز بیان میں شیرینی اور مکالمے بے ساختہ اور رواں ہوتے ہیں۔ آپ کے افسانہ "سرگوشی" کا وہ ٹکڑا ملاحظہ ہو جس میں افسانے کے ہیرو اور ہیروئن ایک دوسرے سے اپنی محبت کا سرگوشی میں اظہار کررہے ہیں۔ اُس وقت جب دنیا کی ساری چیزیں محو سرگوشی ہیں۔

"تم ——— تم ہی میرے خوابوں کی حسین تعبیر ہو مجھے تم سے شدید محبت ہے ریحانہ! اتنی ہلکی آواز آئی جیسے موجیں آپس میں ٹکرا گئیں۔

اور مجھے بھی تم سے اُنس ہے نجی! ——— اس قدر مدھم آواز تھی جو بمشکل میں سن سکی۔

دور شیشم پر فاختہ کا جوڑا آپس میں "سرگوشی" کر رہا تھا ——— سیاہ بھونرا گلاب کے نوشگفتہ پھولوں کے قریب "سرگوشی" کے انداز میں نغمہ محبت الاپ رہا تھا حسین تتریاں اب تک رقص کر رہی تھیں ——— دور تالاب کی طرف سے بانسری کی مدھم لیکن دلکش صدا آرہی تھی۔

آفتاب غروب ہو چکا تھا ——— اور دن رات باہم مل کر شاید "سرگوشی" کر رہے تھے ———"

محترمہ سوز کو شاعری سے بھی ذوق ہے۔ آپ شعر آسان زبان میں کہتی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار اکثر یاد ہو جاتے ہیں آپ کے اشعار جذبات اور تاثیر سے پُر ہوتے ہیں۔ آپ کی ایک نظم "نذر دوست" کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

حسرت و یاس و غم و رنج کا شکوہ بھیجوں
قلب مایوس کی برباد تمنا بھیجوں
یاد ایام کے گذرے ہوئے رنگیں لمحے
یا کہ دیدار کی امید کا تحفہ بھیجوں
اپنے جذبات کا طوفان دکھانے کے لیے
چشم خونبار کا اُمڈا ہوا دریا بھیجوں
یا کہ کچھ توڑ کے لے آؤں فلک سے تارے
گوندھ کر ایک تیرے واسطے مالا بھیجوں
منتخب کچھ نہ کیا رہ گئی حسرت باقی
دل کو بھیجوں کہ فقط اس کی تمنا بھیجوں

ایک دوسری نظم کے دو شعر اور ملاحظہ ہوں۔

سما کے دل میں تو دل کا قرار لیتا جا
یہ دل بھی تجھ کو پسند ہو تو یار لیتا جا
بندھے ہیں اشک محبت کے تار آنکھوں سے
یہ میرے اشک محبت کا ہار لیتا جا

صالحہ خاتون

آپ ہمارے صوبہ کی ادبی ذوق رکھنے والی خواتین میں ممتاز درجہ رکھتی تھیں۔ چند سال ہوئے کہ آپ کا انتقال ہوگیا۔ آپ کو شاعری سے بہت زیادہ ذوق تھا۔ افسوس کہ آپ کی ادبی خدمتیں منظر عام پر زیادہ نہیں ورنہ وہ شہرت کی محتاج نہ ہوتیں بلکہ خود شہرت انہیں تلاش کرتی۔

آپ کی شاعری درد و اثر میں ڈوبی اور وعظ و پند سے بھری ہوتی تھی۔ کاش خاتون مرحومہ کچھ دیر اور زندہ رہ سکتیں تو اردو ادب ان کی قیمتی خدمات سے زیادہ مستفید ہو سکتا۔ راقم الحروف کو ایک بار مرحومہ کے دولتکدہ پر جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ انھوں نے مجھ سے پردہ نہ رکھا تھا۔ انہیں لکھتے پڑھتے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان کی شاعری انہی کی زبان سے سننے کا موقع نصیب ہوا تھا۔ آپ کی ایک دعائیہ نظم ملاحظہ ہو۔

علم مجھ کو کچھ نہیں یا ربنا ۔ ہاں مگر اتنا ہی ما علمتنا
بس اسی پر ختم کرتی ہوں دعا ۔ ربنا اتمم لنا ہذا الرجا

رضیہ رعنا

آپ کے افسانے پلاٹ کی دلآویزی کے اعتبار سے بے حد مقبولیت اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ رسالہ سہیل لکھتا ہے "آپ کے افسانے اچھوتے پلاٹ اور نسوانی طرز نگارش کیلئے خاص طور پر مشہور ہیں اور اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ آپ کا افسانہ امریکن مصنفہ جین آسٹن کے خیالات کا ہوبہو نمونہ ہوتا ہے" بہار کی افسانہ نویس خواتین میں آپ ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔ آپ کے دلآویز افسانوں میں آپ کا انداز تحریر ایک گراں بہا اضافہ ہوتا ہے۔ محترمہ کے ایک رومان پرور افسانہ کا یہ ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

"رادھا کو آج پہلی بار کسی رسیلے سپنے کا احساس ہوا تھا ورنہ وہ ہمیشہ ایک ہی "سپنا" دیکھنے اور سننے کی عادی ہو چکی تھی جس میں کسی قسم کی کوئی "مدہوشی" کبھی نہیں پائی گئی۔ اور نہ ہی کسی کوئل کی کوک نے اس کے نینوں کے پٹ کھولے۔ وہ صرف ایک گاؤں کی کنواری تھی اور بس جسے صرف ہنسنے اور کھیلنے کے اور کچھ نہیں آتا تھا۔

ایک رسیلا سپنا دیکھوں :: مدہوشی سی من پر چھائے۔

یہ چیز اسے بہت سندر اور بھلی معلوم ہوئی۔ وہ سوچنے لگی میں اپنے آنگن میں نیم کے سایوں میں بے خبر سو رہی ہوں نٹھو دادا شہزادے شہزادیوں والی کہانی سنا کر جا چکے ہیں اور ماں وہیں پر بیٹھی ہوئی کچھ سوچ رہی ہے۔ ایسا سوچ جس کی گہرائی تک رادھا پہنچ چکی تھی "میری رادھا کا بھی کوئی سندر سا دولہا آتا" یہ آواز اس کی دل کی دھڑکنوں میں گونج رہے تھے۔ وہ مسکرانے لگی۔ بہت کیسی بات ہے یہ "سندر سا دولہا ــــ"!

محترمہ رضیہ رعنا ایک اچھی افسانہ نویس ہونے کے علاوہ ایک اچھی شاعرہ بھی ہیں۔ آپ کی ایک نظم "شوق ناکام" کے یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

پیغام جنوں دیکر خود رہبر صحرا بن
مایوس محبت کا اک زندہ سہارا بن
پیدا دل مضطر میں اک جوشش طوفاں کر
اس قلب فسردہ کی بیتاب تمنا بن
اے وحشت دل لے چل اب اور کہیں لے چل

چل آہ خدارا چل اس یاس کی محفل سے
گہوارہ کلفت سے آفات کی منزل سے
آلام کے قلزم میں اب کشتی قسمت کو
چل آہ بچائے چل ٹکرائے نہ ساحل سے
اے وحشت دل لے چل اب اور کہیں لے چل

سیدہ صابرہ بانو

شمالی بہار کی ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں آپ کے افسانے روز مرہ اور سلیس عام فہم زبان میں بڑے اصلاحی ہوتے ہیں۔ آپ کے افسانے زیادہ تر صنف نازک سے متعلق ہوتے ہیں افسانہ کے پیرایہ میں ان کے تعلیمی و اخلاقی نقائص کی اصلاح فرماتی ہیں اور انہیں ازدواجی زندگی کو خوشگوار رکھنے اور عقلمندی و بلندی اخلاق سے گھر کو جنت بنانے کا طریقہ بتاتی ہیں۔ بہاری خواتین کی تاریخ ادب میں آپ کا نام نامی بھی جلی حرفوں میں لکھا جائیگا۔ آپ کے افسانے کا ایک اصلاحی ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

صبا بیگم گھر کی کیفیت دیکھ دیکھ کر روز بروز گھلے جاتے یہاں تک کر بخار نے ایسا پیچھا کیا کہ ہلنے کی سکت نہ رہی۔ روتے روتے

ماں بہن کی آنکھیں لہو کی بوٹیاں ہوگئیں۔ مگر نہ بسیجا تو لاڈلی کا دل۔ ادھر میاں کی نبض دیکھی جاتی اور ادھر وہ سہیلیوں کے ساتھ ہنستی کھیلتی گاتی بجاتی۔ ایک طرف کہرام اور دوسری طرف گانا بجانا۔ جو دیکھتا اس کا چہرہ فق ہو جاتا۔

میاں جاوید کا بخار تھا کہ اترنے کا نام نہیں لیتا تھا !۔ ڈاکٹر سب علاج کرتے کرتے ہار گئے۔ آخر میسوری لیجانے کو کہا۔ تیاریاں ہونے لگیں۔ لاڈلی مچل گئی۔ اور کوئی جائے تو جائے میں خوش میرا خدا خوش۔ مگر میں نہیں جاتی اور سنئے! جہاں جہاں یہ لوگ خاک چھانتے پھریں وہاں وہاں میں بھی صدقے ہوتی پھروں۔ واہ جیسے میرا کہیں ٹھور ٹھکانا ہی نہیں ——"

نصیرہ راز

آپ ایک کامیاب شاعرہ ہیں۔ اور شاید صرف شعر و شاعری سے ذوق ہے۔ تغزل میں طبع آزمائی فرماتی ہیں اور نظمیں بھی لکھتی ہیں۔ مگر آپ کی نظمیں زیادہ پسند کی جاتی ہیں۔ پنجاب اور بہار کے پرچوں میں آپ کی غزلیں و نظمیں برابر شائع ہوتی رہتی ہیں۔ محترمہ کی ایک نظم "کشتی تمنا" ملاحظہ فرمایئے

اے کشتی تمنا! یہ راہ پرخطر ہے ساحل سے چل چکی تو منزل سے بےخبر ہے
یاں تند خو ہوا ہے ہر موج تیز تر ہے تاریکیاں ہیں ہر سو ہر گام پر بھنور ہے
برق بلا کا خدشہ اللہ یہ جوش طوفاں
اے آرزو کی کشتی! تیرا خدا نگہباں

اے کشتی تمنا! تو پیک صد خوشی ہے آغاز غم بھی تو ہے تو موج بےخودی ہے
ارمان بھرے دلوں کا عنوان زندگی ہے تو خواب عاشقی کی تعبیر بیکسی ہے
رہبر کوئی نہیں ہے تنہا ہے تو سفر میں
بربادیاں ہیں پنہاں ہر موج کی لہر میں

کف در دہاں یہ دریا اور تیز رو یہ دھارا تیرے لیے مقدر ہے نہ کچھ کنارا
تو بحر زندگی میں تنکے کا ہے سہارا ہے تیرے دم سے لیکن سیلاب غم گوارا
بڑھتا ہی چل اے سفینہ مجھ کو یہی لگن ہے
وہ سامنے افق پر امید کی کرن ہے

جہاں آرا

تھوڑے دنوں سے آپ کا نام رسائل میں نظر آنے لگا ہے آپ ایک شاعرہ ہیں اور نو مشق۔ تغزل میں طبع آزمائی فرماتی ہیں ممکن ہے آپ کو نثر سے بھی دلچسپی ہو۔ مگر ابھی تک ان کا کوئی مضمون یا افسانہ میری نظر سے نہیں گذرا۔ آپ کا کلام ابھی متبذل ہوتا ہے

امید ہے آپ آگے چل کر بہار میں اردو کی نامور شاعرہ ہونگی۔ نمونۂ کلام یہ ہے

یاس نے امید کا ہر نقش دھندلا کر دیا
دل کی دنیا اس قدر جاگی کہ اب خاموش ہے
آرزو بھی خامشی میں اب مری گم ہو گئی
میں فریب عاشقی کھاؤں مجھے کب ہوش ہے
اے جہان شعلہ خواب چھیڑ دے الفت کا ساز
سوز میں ہوں نے میری اک سرت خاموش ہے

فہمیدہ احمد

آپ کا نام بھی ابھی صرف ایک دو بار ہی نظر سے گذرا ہے۔ آپکو شاید صرف نثر سے ہی دلچسپی ہے۔ آپ کی تحریر سادہ اور انداز بیان میں شیرینی ہے۔ امید ہے آپ بھی ایک نامور مضمون نگار ہونگی۔ آپ کو بچپن کی یاد ستا رہی ہے لکھتی ہیں۔

"آہ وہ بچپن کے دن اور بےفکری کی راتیں —— چاندنی میں بیٹھ کر "الف لیلہ" کے افسانوں سے بھی زیادہ دلچسپ ہوائی قلعے تعمیر کرنے اب بھی کبھی یاد آکر تڑپا جاتے ہیں —— اُف! ننھے سے دماغ میں کتنے ارمان تھے۔ معصوم دل میں کتنی تمنائیں تھیں لیکن افسوس ——! نجانے قسمت کہاں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ غالباً اُسے معلوم تھا کہ میری یہ "خیالی جنت" جو میں نے مہینوں اور سالوں کی کاوش اور جدوجہد سے تیار کی تھی۔ منٹوں میں حوادث روزگار کے ایک تیز و تند جھونکے سے مسمار ہو جائے گی اور پھر —— میں ہونگی اور وہی نامرادی و حرماں نصیبی —— ہاں کبھی کبھی ان دنوں کی یاد آ آکر ضرور بیتاب کر جایا کریگی ——"

سیدہ ن۔ ف

پہلے آپ کا نام رسائل میں اکثر نظر آتا تھا۔ ادھر بہت دنوں سے آپ کی کوئی تحریر نظر سے نہیں گذری۔ آپ کے جو مضامین نظر سے گذرے ہیں ان سے اندازہ ہوا ہے کہ آپ میں مضمون نگاری کی خاصی صلاحیت ہے۔ آپ کے خیالات نہایت پاکیزہ اور جذبات بڑے پرحسرت ہوتے ہیں۔ تحریر کا نمونہ یہ ہے

وہ بھونرے نے کنکھیوں سے دیکھا ــــ حسن سوز، عصمت شکن اہرمنی جذبات ابھر گئے ــــ غریب بلبل کی طرف حقارت کی نگاہ ڈالی ــــ فاتحانہ انداز سے گل کی جانب بڑھا...... بھونرے نے وہ سرگوشیاں کیں کہ گل نے آغوش محبت پھیلا دیئے۔ عصمت کی دنیا تباہ ہوگئی ــــ حسن کا شیرازہ بکھر گیا۔ گلاب کی پنکھڑیاں منتشر ہوگئیں ــــ بھونرا مسکراتا ہوا چمن سے باہر نکل گیا ــــ کائنات حسن وعشق میں تہلکہ مچ گیا ــــ حرماں نصیب بلبل نے دیکھا...... دیکھا اور حسرت سے دیکھا، نغمہ خاموش ہو چکا تھا گلاب کی سوکھی ہوئی پنکھڑیوں کے پاس بلبل حزیں کی لاش پڑی تھی۔"

ایس۔ کے عظیم آبادی

آپ کے مضامین بہت کم پڑھنے میں آئے ہیں۔ شاید آپ بہت کم لکھتی بھی ہیں مگر جو کچھ آپ کے قلم سے نکلتا ہے وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہوتا ہے۔ آپ "گذری ہوئی مسرتوں سے" مخاطب ہیں

"ہاں سچ بتا وہ میری زندگی کے مسرور کن رنگین لمحے جسے "حیات فردوس" کہوں یا "فردوس حیات" کیا ہوگئے! ــــ جب میرا دوست میرے پاس تھا ــــ اور میں اس کی شراب آگیں نرگس شہلا سے مسحور، اور زلف عنبریں کی نکہت سے مخمور تھی ــــ اور میری ناکام زندگی پیکر موسیقی تھی اور یکسر شعر ونغمہ

آہ!...... اے میری گذری ہوئی مسرت ...... تیری ہاں! تیری مفارقت کے بعد ــــ میں محزون دل ایک حسرتوں کا مدفن ہوں ــــ اور بیکسی کا مزار لیکن آہ! میں ہر وقت تجھے تلاش کرتی ہوں ــــ اور رہونگی ــــ لیکن آہ! ...... کیا واقعی تو ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئی۔"

مس ش۔ ق۔ آستانہ بانی

آپ کا مضمون نگاری اور شعر گوئی دونوں سے ہی ذوق ہے

اور دونوں میں خاصی استعداد رکھتی ہیں۔ آپ ایک تعلیمیافتہ اور روشن خیال خاتون ہیں کبھی کبھی افسانے اور زیادہ تر غزلیں ونظمیں لکھتی ہیں۔ ہندی سے افسانے اور مضامین اردو میں ترجمہ بھی کرتی ہیں۔ افسوس کہ آپ کو اپنی ادبی خدمتوں کو منظر عام پر لانے کا ذوق نہیں۔ یہی وجہ ہے جو آپ کا نام ناظرین کی نظروں سے نہیں گذرا ہو۔ یا گذرا ہو تو بہت کم۔ میری گذارش ہے کہ محترمہ اپنی ادبی خدمات منظر عام پر لائیں اور دوسرے ادیبوں کے درمیان خود کو روشناس فرمائیں آپ کا نمونہ کلام یہ ہے۔

لکھنے جب بیٹھا فسانہ میں دل ناشاد کا
"خون کے آنسو" داستان غم کا عنواں کر دیا
بام پر کس نے اٹھائی رخ سے پھر اپنے نقاب
پھر مرے درد نہاں کا کس نے درماں کر دیا

ایک غزل کے دو شعر اور ملاحظہ ہوں۔

کر کے مردہ پھر جلانا یہ غضب کا ہے ستم
تیر تو لگ ہی چکا تھا آگ نے، تن من میں کیوں
جل نہیں جاتا اگر تیرے حسد کی آگ سے
داغ رہ جاتا قیامت تک یہ روشن میں کیوں

نمونۂ تحریر یہ ہے: ایک دوست سے قطع تعلق کے بعد لکھتی ہیں

"آہ! اے میرے پروردگار کیا یہ ممکن تھا کہ ایک ڈگر پر چلنے والے دو دوست کبھی یوں بچھڑ جینگے کہ پھر وہ قیامت تک نہ مل سکیں گے؟ اور اے میرے معبود! کیا یہ بھی ممکن تھا کہ دو گھرانے جو ایک خاندان کی صورت اختیار کر رہے تھے کبھی یوں تباہ ہونگے کہ پھر ایک گھر بھی اپنی اصلی حالت پر باقی نہ رہیگا؟ اور اے دونوں جہاں کے مالک! کیا یہ بھی ممکن تھا کہ دو شخصوں کی بے پناہ محبت پر رشک کرنے والی دنیا کبھی اُن کے نفاق پر مسرت کا قہقہہ لگائیگی؟ اے میرے اللہ! جب یہ سب ممکن تھا تو کیا یہ ممکن نہ تھا کہ اس قیامت کے بعد مجھے موت آئی ہوتی۔

آہ! یہ میرے پیروں تلے زمین کیوں باقی ہے؟ یہ آسمان مجھ پر کیوں نہیں ٹوٹ پڑتا۔ خدایا! مجھے موت دے۔ خدا کے لئے موت دے کہ میں ہر روز گھل گھل کر مرنے سے ایک مرتبہ کا مرجانا اچھا سمجھتا ہوں۔"

سعیدہ پیکر

آپ بھی ہمارے صوبہ کی ایک باکمال افسانہ نگار اور مقالہ نگار خاتون ہیں۔ افسانہ نویسی میں آپ خاص شہرت رکھتی ہیں۔ آپ کے افسانوں کے پلاٹ بالکل نرالے اور طرز نگارش بالکل اچھوتی ہوتی ہے۔ زبان شستہ اور شیریں لکھتی ہیں۔ افسانہ "خالہ جان کی شادی" کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو جس میں زبان کی پاکیزگی داد طلب ہے

"یوں تو ہماری خالہ جان بہت ہی شرمیلی ہیں مگر ان کی شادی ہونے والی تھی اس بات نے شرم میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ اور یہ ان کی ہمجولیوں کے لیے مستقل مصیبت تھی۔ چنانچہ جب ایک روز میں کمرے میں بیٹھی تھی تو سائبان میں ابلتی ہوئی بکھیریں زندگی کے قہقہے سنے۔ چند لڑکیاں گھنگھر کی طرح ایک دوسری سے الجھی ہوئی نغمہ آفریں تھیں۔ کچھ پیاری جھڑکیاں تھیں، کچھ طنز آمیز منت و سماجت، کچھ حسین مسکراہٹ اور کچھ ایسی ادائیں جن میں رقص و نغمہ کا جمال ملا جلا پایا جاتا تھا۔

"بجو" مجھے مخاطب کرتے ہوئے رشیدہ نے پکار کر کہا "یہ ہے تمہاری خالہ۔ تم دوڑ کر آجاؤ نا!" میں یہ سن کر دوڑی دوڑی آئی دیکھا تو خالہ جان نخرے کر رہی تھیں ——— "اوں۔ اوں مجھے چھوڑ دو۔ میں بگڑ جاؤں گی"

"چل بڑی بگڑنے والی آئی ہے۔ ہر گھڑی کوٹھری میں، جیسے کسی کی یاد میں پڑی رہتی ہے" رشیدہ نے شوخ لہجے میں کہا۔

"اری مجھے چھوڑو میری چوڑیاں گئیں" خالہ جان نے تنک کر کہا۔ اور ہاتھ چھڑا کر بھاگ کھڑی ہوئیں لڑکیاں عقد ثریا سے کہکشاں بن گئیں۔ اور میں ایک ——— شہاب ثاقب کی طرح خالہ جان کے تعاقب میں دوڑ پڑی۔ ہم لوگوں نے خالہ جان کو کوٹھری میں پکڑ لیا اور سب نے مل کر انہیں خوب سزائیں دیں۔ ان کے بھرے بھرے رخساروں کا ہلکا گلابی رنگ سرخی میں تبدیل ہو گیا۔ اور شفاف آنکھیں ننھے ننھے کٹوروں کی طرح چھلکی پڑتی تھیں ———"

جن خواتین کا میں نے ذکر کیا ہے انکے علاوہ محترمات شکیلہ خاتون، قامنہ خاتون، طلعت بانو، شہر بانو، نورجہاں خاتون، مسز مسلم، مسز جوزف، حلیم النسا، اور خدیجہ اختر وغیرہ بھی ہمارے صوبہ کی روشناس مستورات ادیب ہیں جن کا ذکر میں انشاء اللہ کبھی اور فرصت میں تفصیل سے کروں گا۔ چونکہ بہار میں اہل قلم خواتین کی تعداد زیادہ نہیں اور جو ہیں بھی انہیں ادبی ذوق بہت تھوڑے عرصے سے پیدا ہوا ہے تاہم انکی ادبی خدمات کافی نظر آنے لگی ہیں۔ ضرورت ہے کہ وہ خواتین جو غیر زبان سے ترجمہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں زیادہ سے زیادہ اس طرف متوجہ ہوں۔

شفیق قادری، سونبرساوی

فلمستان

پڑوسی ——— ایک نقاد کی نظر میں

شانتارام کی تازہ پیشکش "پڑوسی" کی نمائش مقامی سینما "پیراڈائیز" میں پچھلے چند ہفتوں سے ہو رہی ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس فلم کمپنی نے اکثر سوشل اور سماجی فلم تیار کر کے خراج تحسین حاصل کیا ہے، لیکن جہاں تک زبان کا تعلق ہے، اس لحاظ سے اردو زبان کے ساتھ تعصب کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پربھات فلم کمپنی کے تیار کردہ فلم دیکھنے کا شوق میرے دل میں کم پیدا ہوتا ہے۔ "پڑوسی" پر متعدد اخبارات و رسائل نے نہایت حوصلہ افزا خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرے دل میں بھی اس فلم کے دیکھنے کا شوق پیدا ہوا، اور اپنی پہلی فرصت میں اس فلم کو دیکھا۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میں اپنے جس جذبات کو دل میں لیکر فلم دیکھنے گیا تھا ایک حد تک مایوس ہونا پڑا اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ مسموم فضا میں جبکہ ہندو مسلمان کے درمیان کشیدگی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے ایک فرقہ دوسرے کو اپنا دشمن سمجھ رہا ہے۔ آئے دن جگہ جگہ آپس میں سر پھٹول ہوتا رہتا ہے۔ مذہب کے نام پر انسانوں کا بھینٹ چڑھایا جاتا ہے۔ ایسے زمانہ میں "پربھات فلم کمپنی" ایسے موضوع پر فلم بنانا جس سے کہ دونوں فرقوں میں محبت و یگانگت اور صلح آشتی کا پرچار ہو، اخلاقی جسارت کا بہترین اور قابل تقلید نمونہ ہے۔ پربھات کمپنی کے اس اصلاحی جذبہ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے بلکہ نہایت مناسب ہوگا کہ اس فلم کی نمائش ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ فلم ایک ایسے پیغام کی حامل ہے جو ہندو مسلم تعلقات کو بہت کچھ خوشگوار بنا سکتا ہے۔

جہاں تک اس فلم کے نتیجہ کا تعلق ہے بہت خوشگوار ہے۔ لیکن جب ہم اس کو آرٹ اور فن کی کسوٹی پر جانچتے ہیں تو اس کے کھوکھلے پن پر سخت افسوس ہوتا ہے، اس کی آدھی کہانی تو صرف سطرنج ہی کی نذر ہو جاتی ہے۔ ٹھاکر اور مرزا کا بار بار دیر تک سطرنج کھیلتے رہنا سوائے اس کے کہ وقت ضائع کیا گیا ہے اور کچھ نہیں ہے

وقفہ کے بعد جب فلم شروع ہوتا ہے تو اتنے حصہ فلم کی کہانی تو بالکل گنجلک ہو کر رہ جاتی ہے اور واقعات یوں الجھ جاتے ہیں کہ تماشائیوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اس فلم کے مکالمے بھی بالکل بھونڈے ہیں

کہانی کی دوسری خامی یہ ہے کہ ہندو مسلم میل ملاپ کی اٹھان جس خوش اسلوبی سے ہوئی ہے، اس کا اختتام اس خوش اسلوبی سے نہیں ہوا ہے۔ مرزا اور ٹھاکر میں نفاق کی بیج بونے والا ڈائرکٹر صاحب کا ملازم ہے۔ وہ ڈائرکٹر صاحب کے کان یوں بھرتا ہے کہ وہ ٹھاکر کو اس کی ملازمت سے برخواست کر دیتا ہے۔ وہی ملازم ٹھاکر کو یقین دلا دیتا ہے کہ مرزا نے چغلی کھا کر اسے چھٹی دلا دی ہے۔ چونکہ ٹھاکر اور مرزا میں حد سے زیادہ خلوص تھا، لہذا اس بات کا ٹھاکر کو بہت صدمہ ہوا اور مرزا کی طرف سے اس کے دل میں میل بیٹھ گیا۔ ٹھاکر مرزا کو اپنا بدخواہ سمجھنے لگتا ہے۔ مرزا اور ٹھاکر کی ناچاقی کا چرچا گاؤں میں بھی ہونے لگتا ہے۔ مگر یہ بات کہیں واضح نہیں کی گئی ہے کہ واقعی مرزا نے ڈائرکٹر صاحب سے چغلی کھا کر ٹھاکر کو ملازمت سے برطرف کرایا تھا یا ان میں پھوٹ ڈالنے کے لیے ڈائرکٹر کا ملازم ایک خطرناک سازش کا جال بن رہا ہے۔ یہاں تک کہ مرزا اور ٹھاکر موت سے تھوڑی دیر پہلے بند پر ایک بار پھر ملتے ہیں۔ دونوں کا دل صاف ہو جاتا ہے۔ ٹھاکر کچھ فلسفیانہ انداز میں بولتا ہے۔ مگر بات یہاں بھی صاف صاف نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ بارود "بند" کو الٹ پلٹ کر ہوا میں اڑانے لگتا ہے اور اسی حادثہ میں ٹھاکر اور مرزا دونوں جان بحق ہو جاتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اصل بات کسی عنوان سے ظاہر کر دی جاتی تاکہ مرزا کے متعلق جو غلط فہمی لوگوں میں پھیل گئی تھی، اس کا ازالہ ہو جاتا۔ ساتھ ہی ڈائرکٹر صاحب کے ملازم کو بھی عبرت انگیز سزا دی جاتی۔

دوسری کمزوریوں کو مختصراً ذیل میں بیان کرتا ہوں۔

گرجا ایک متمول خاندان کی چشم و چراغ ہے۔ مگر اس کی پرورش دیہاتی ہی ماحول میں ہوئی ہے۔ مگر گرجا کی بے باکی کا یہ عالم ہے کہ کبھی تو وہ درختوں کی اونچی اونچی ٹہنیوں پر جھولے جھولتی ہے۔ آزادانہ گاتی پھرتی ہے اور کبھی تالاب کے کنارے اچھلتی کودتی گاتی اور چہلیں کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایک طرف باپ مچھلی پکڑنے کے لیے

بھینس والے تالاب کے کنارے ڈالے تالاب کے کنارے بیٹھا ہے دوسری طرف بنی گانوں اور قہقہوں میں مدہوش ہے۔ دیہات میں ایسی حرکتیں ایک بے شرم لڑکی سے بھی سرزد ہونا مشکل ہے چہ جائیکہ ایک امیر گھر کی لڑکی

ڈاکٹر صاحب کے مکان کے سامنے گاؤں والے آپس میں لاٹھیاں چلا رہے ہیں۔ مگر اس کا ذکر گاؤں میں کہیں نہیں ہوتا۔ یہی پتہ نہیں چلتا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں لڑائی ہو رہی ہے کہ گاؤں کے فروخت کرنے کے موافقین و مخالفین میں۔ بات کچھ بھی ہو، مگر اس قسم کا واقعہ گاؤں میں ایک کہرام مچا دیتا ہے۔ لیکن یہاں حالت بالکل برعکس ہے۔

گرجا کے لیے رمیش کا انتخاب بالکل بھونڈا رہا۔ رمیش گا سکتی ہے مگر اداکاری ہرگز نہیں کر سکتی۔ وہ اپنے جذبات کے اظہار میں سو فیصدی ناکام رہی۔ وہ ایک لفظ کو بھی حقیقی رنگ میں ادا نہ کر سکی ہے۔ اس کے ہر انداز سے تصنع ٹپکتا ہے۔

شادی کا منظر نظر افروز ضرور ہے، مگر مبہم اور بے ربط۔ بعض لوگ تو سمجھ ہی نہ سکے۔ سب کچھ کیا ہوا۔

صدا بندی بھی معمولی ہے بعض باتیں صاف سنائی نہیں پڑتیں۔ آواز کے صاف نہ ہونے کی وجہ سے کہانی کا ابہام اور زیادہ ہو گیا ہے۔

میں ہندو مسلم بھائیوں سے پرزور اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس فلم کو ضرور دیکھیں، اس لیے کہ اس میں ایک ایسا سبق موجود ہے کہ جس سے دونوں کے دل کی کدورت دھل کر صاف ہو جا سکتی ہے کاش دوسری دوسری بھی فلم کمپنیاں اگر اس موضوع پر فلمیں تیار کر کے اپنے ملک والوں کے سامنے پیش کریں تو یقین ہے کہ بہت جلد ہندو مسلم اتحاد میں کامیابی حاصل ہو؟

ا۔ م

ہندوستانی فلم کارپوریشن

کی

پہلی پیشکش

پردہ نشین

اداکار:- حبیبہ۔ عزیزہ بانو۔ بیگم۔ رشیدا۔ مترا۔ گنیش۔ نرگس۔ نیلا۔ ترشن آگیرہ و صاری وغیرہ

بہت جلد

آپکے محبوب سینما ہال میں

دکھائی جانیوالی ہے

انتظار کیجئے

بہت جلد

آپکے محبوب سینما ہال میں

دکھائی جانیوالی ہے

انتظار کیجئے

ناچ — ہنومان پرشاد شرما

افسانہ ۔ ایم۔ ایم۔ سیّد

مکالمے و گانے ۔ رازی

موسیقی — رشید احمد

آئی۔ اے۔ حافظ جی پروڈکشن

ہندوستانی فلم کارپوریشن۔ ۱۹۔ گنیش چندر ایونیو

کلکتہ

تار کا پتہ "جان سن" — ٹیلیفون۔ کلکتہ ۶۲۵۱

ریحانہ اور معصوم

دونوں بچپن کے ساتھی ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار تھے، درپردہ
عمر کے ساتھ ساتھ ان کی محبت میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور آخر

ایک دن

قدرت نے ان دونوں کو شادی کے پاک رشتہ میں جوڑ دینے کا فیصلہ کرلیا

لیکن

یکایک دولت کا زبردست ہاتھ بیچ میں آجاتا ہے اپنی پوری طاقت کے ساتھ!

پھر کیا ہوتا ہے ؟

اس کی تفصیل کیلئے دیکھئے — !

معصوم

ہدایات
ڈاکٹر ایس ایف حسنین
(سفیدی کے خالق)

منظر نامہ و مکالمہ
سید فضل احمد کریم
بی لٹ (آکسن)
آئی سی ایس

اداکاران خصوصی

مظہر خاں۔ رمولا۔ انیس۔ امجد۔ مہتاب۔ مزمل۔ خواجہ صابر

مشرقی ہندوستان کا علمی ادبی ماہنامہ

جدید اردو



مدیر مسئول

پرویز شاہدی

مدیر اعزازی

ایم ظہور احسن قاضی

جدید اردو

فروری سنہ ۱۹۴۲ء

چندہ سالانہ [illegible]

ششماہی [illegible]

فی پرچہ [illegible]

غیر ممالک کے لیئے ۵ شلنگ

برما کے لیے [illegible]

جلد ۵ — نمبر ۲

فہرست مضامین

335 [illegible]

لمعات ثاقب

حضرت ثاقب صاحب لکھنوی کی ادب نوازی ہے کہ آپ نے باوجود اپنی سخت علالت کے ادارہ جدید اردو کی فرمائش پر یہ غزل ارسال فرمائی۔ جو کہ ریاست بھوپال کے مشاعرہ کے لیے کہی گئی تھی۔ یہ مشاعرہ ہر سال بتقریب جشن سالگرہ اعلیٰ حضرت نواب صاحب دام اقبالہ کے ہوا کرتا ہے ہم لوگوں کی دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ حضرت ثاقب کو جلد صحت کلی عطا کرے، اور آپ جیسے سرپرستان اردو کا سایہ قائم رکھے! آمین — ادارہ

اب اس کا ذکر ہی کیا جب دلِ تپاں نہ رہا ۔۔۔ میں اور اس کے سوا کیا کہوں کہ ہاں نہ رہا

متاعِ عشق کے سودے میں کچھ زیاں نہ رہا ۔۔۔ کہ دل کے بدلے یہ مالِ گراں گراں نہ رہا

نویدِ سال گرہ دلکشائے عالم تھی ۔۔۔ نشاطِ جشن کا چرچا کہاں کہاں نہ رہا

کمالِ مشقِ تصور نے راہ پیدا کی ۔۔۔ کوئی حجاب مرے اُنکے درمیاں نہ رہا

سمجھ کے بات کرائے ہم نوا خدا نہ کرے ۔۔۔ قفس میں رہ کے سنوں میں کہ آشیاں نہ رہا

لحد میں بھی نہیں راحت نصیب فتنوں سے ۔۔۔ مقامِ امن کہیں زیرِ آسماں نہ رہا

مرے بیان کا انداز جانِ محفل تھا ۔۔۔ کہ میرے اٹھتے ہی وہ رنگِ داستاں نہ رہا

چمن میں برق کی تمثال تھا ورودِ خزاں ۔۔۔ گلوں کے ساتھ ہی اپنا بھی آشیاں نہ رہا

وجودِ غم سے جہاں میں ہے زندگی کا مزہ ۔۔۔ وہ دل کی موت ہے جس دم یہ میہماں نہ رہا

میں ایسے وقت میں چونکا ہوں خوابِ غفلت سے ۔۔۔ علاقہ جب کوئی مابینِ جسم و جاں نہ رہا

ریاضِ دہر کی کایا پلٹ معاذ اللہ ۔۔۔ وہ گلزمیں نہ رہی یا وہ آسماں نہ رہا

مصائبِ دلِ خوں گشتہ پوچھے کیا ہو ۔۔۔ فسانہ ختم ہے اب قابلِ بیاں نہ رہا

یہ آفت آگئی اردو زبان پر ثاقب
کوئی کمالِ ہنر کا بھی قدرداں نہ رہا

ثاقب لکھنوی

رفتار وقت

۲۔ جنوری ۱۹۴۲ء کو جاپانی فوجیں فلپائن کے دارالسلطنت منیلا پر قابض ہوگئیں۔ اس وقت جاپانیوں کی پیش قدمی ملایا کی طرف بھی تیز رفتاری کے ساتھ جاری ہے۔ اور ٹیپو جو ایک معدنی علاقہ ہے اس پر بھی جاپانی فوجیں قابض ہوگئی ہیں۔ لیکن برما کی طرف ان کی پیشقدمی کی رفتار بہت سست ہوگئی ہے، اسی تاریخ کو جاپانی فوجیں چھوٹے چھوٹے اسٹیمروں اور بارجوں میں بیٹھ کر ملایا کے زیریں علاقہ پیرک پر اترنے میں کامیاب ہوگئیں۔ ان کی یہ کامیابی سخت نقصان اٹھانے کے بعد ہوئی ہے۔ سنگاپور پر بھی جاپانیوں نے فضائی حملے شروع کردیئے اور ملایا کے مشرقی وسطی ساحلی شہر انشن کو جاپانیوں نے محاصرہ میں لے لیا ہے، یہ مقام ایک اہم مقام تھا اور اس لحاظ سے بھی اہم تھا کہ یہاں فضائی اور بحری مستقر تھا۔ اس وقت مشرق بعید کے محاذ کی قیادت ہندستان کے سابق تجربہ کار سپہ سالار جنرل ویول کے سپرد کی گئی ہے اور ان کی ماتحت میں امریکہ کے دو مشہور نامی گرامی فوجی افسر جنرل برٹ اور ایڈمرل ہارٹ دیئے گئے ہیں لیکن اسٹریلیا اور ہندستان اس قیادت سے الگ ہے۔

اس دوران میں چین نے اپنے حریف پر شاندار فتح حاصل کی ہے۔ اس نے صوبہ ہونن کے دارالحکومت چنگیشا میں جاپانی فوجوں کو کچل کر رکھ دیا۔ کچھ تو جان لے کر بھاگے مگر بھاگتے بھاگتے بھی ہزاروں کی تعداد میں لاشیں چھوڑ کر بھاگے۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ۔ برطانیہ۔ روس۔ چین۔ ڈچ نوآبادیات جزائر ہند۔ اور ۲۱۔ دوسری دوسری حکومتوں نے ایک معاہدہ پر دستخط کردیئے ہیں کہ ہم سب محوری طاقتوں کے خلاف اپنے تمام ذرائع اور طاقت صرف کرنے کے پابند ہیں اور اس کی بھی پابندی کرینگے کہ ہم میں سے کوئی تنہا غنیم سے صلح نہ کرے

۱۱۔ جنوری کو جاپانیوں نے جزائر شرقی ہند پر حملہ شروع کردیا اور بورنیو کے قریب جزیرہ تاکان میں شمالی سلیبیس پر مینا باسا کے قریب ان کی فوجیں داخل ہوگئیں۔ ۱۲۔ جنوری کو انھوں نے ملایا کے دارالحکومت کوالالمپور پر قبضہ کرلیا۔ اس وقت کثیر تعداد میں چین کی امدادی فوجیں برما میں پہنچ گئی ہیں۔ ۱۴۔ جنوری تک اتحادیوں نے بحرالکاہل میں جاپان کے ایک لاکھ ۲۱ ہزار ٹن کے جہازات برباد کردیئے

۱۶۔ جنوری کو جنرل ویول جاوا پہنچ گئے ہیں۔

۱۷۔ جنوری تک جاپانی فوجیں سنگاپور سے سو میل کے فاصلہ پر پہنچ گئیں۔ ۲۴۔ جنوری کی خبر ہے کہ سنگاپور سے ستر میل کے فاصلے پر جاپانی فوجیں پہنچ گئیں۔ ۲۸۔ جنوری کی خبر ہے کہ سنگاپور سے صرف ۵۰ میل کے فاصلے پر جاپانی فوجیں پہنچ گئیں۔ ۳۰ جنوری کی خبر ہے کہ محاذ جنگ ملایا کے مرکزی حصہ میں جاپانی فوجیں جزیرہ سنگاپور سے ۱۸ میل پر ہیں۔ سنگاپور کے مغربی حصہ میں تقریباً ۴۵ میل کے فاصلہ پر اور جوہور سے تقریباً ۳۰ میل کے فاصلے پر ہے۔

جزائر شرقی ہند کے متعدد ڈچ اور برطانوی جزیروں پر جاپانی فوجوں کا تسلط ہوگیا ہے، لیکن جاوا اور سماترا محفوظ ہے ــــــ اب اسٹریلیا پر بھی حملہ کا خطرہ قریب تر ہوتا جارہا ہے۔ وہاں کے وزیراعظم نے برطانیا اور امریکہ سے اپیل کی ہے کہ فوراً طیاروں اور دوسرے سامان جنگ سے ہماری مدد کی جائے۔

برما میں جاپان اور تھائیلینڈ کی متحدہ فوجیں جنوب و مشرق کی طرف سے مولمین تک پہنچ گئی ہیں۔ مولمین رنگون سے تقریباً دوسو پچاس میل کے فاصلہ پر ہے اس وقت برطانیہ اور امریکہ سے فضائی امداد پہنچنے لگی ہے۔ حال میں ایک درجن ہریکین نامی زبردست جنگی طیارے آئے ہیں جنہوں نے آتے ہی بہت سارے جاپانی طیارے مار گرادیئے اور فضائی جنگ کا نقشہ بدل دیا۔ امید ہے کہ سنگاپور اور رنگون کی پوری مدافعت کی جائے گی۔ رنگون سے بہت سارے زخمی کلکتہ لائے گئے ہیں۔ اور وہاں سے بوڑھے بچے اور عورتوں کو بھی بہت سارے جہازات لیکر کلکتہ آچکے ہیں، پھر ساٹھ ہندستانی رنگون سے پیدل چل کر پہاڑوں، ندیوں اور خوفناک جنگلوں کو پار کرکے ڈھاکہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔

مغرب:۔ میں محوری طاقتیں بہت کمزور ہورہی ہیں وہاں روسی، جرمنی کو پے درپے شکست دے رہے ہیں۔ صرف دس

دنوں کے اندر سترہ ہزار جرمن فوجیں ہلاک ہو چکی ہیں اور زخمیوں کا تو کوئی حساب نہیں ہے، علاوہ بریں سردی سے ٹھٹھر کر اور ٹائیفڈ میں مبتلا ہو کر مرنے والوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ ماسکو خطرے سے نکل گیا ہے اور عنقریب لینن گراڈ بھی خطرہ سے نکلنے والا ہے ۲۴ جنوری تک شمالی محاذ میں روسی فوجیں لوٹیا تک پہنچ گئی ہیں اور ابتک روسیوں نے جرمنوں کے قبضہ سے تقریباً دو ہزار شہر و قصبے واپس لے لیے ہیں۔

افریقہ:- میں برطانوی فوجیں بن غازی سے سو میل دکھن جدابیہ تک پہنچ کر رکی ہوئی تھیں، اور وہاں استحکامات میں مشغول تھیں کے اطالوی اور جرمنی فوجوں نے دوسرا جوابی حملہ کر کے جدآبیہ کو اپنے قبضہ میں کر لیا لیکن یہ ان سے آگے نہیں بڑھ سکے ہیں۔ اس وقت وہاں برطانوی امدادی دستے پہنچ گئے ہیں اور ٹینکوں کی زبردست مڈبھیڑ ہو رہی ہے۔ بعض بعض مقامات پر جو محوری فوجیں محصور ہو کر رہ گئی تھیں اب انھوں نے ہتیار ڈالدیئے ہیں۔ بردیہ سلم۔ اور حلفیہ میں تقریباً چودہ ہزار جرمنی اور اطالوی فوجیں گرفتار ہوئیں، گویا اس وقت لیبیا کا پورا مشرقی علاقہ بن غازی تک اتحادیوں کے ہاتھ میں ہے۔

لندن ۲۷ جنوری کو مسٹر چرچل وزیراعظم برطانیہ دارالعلوم میں تقریر کرتے ہوئے کہا ہے جس کا خلاصہ درج ذیل ہے

مسٹر چرچل نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مجھے یہ درخواست کرنا پڑی ہے کہ ہاؤس مجھ پر اعتماد کا اظہار کرے۔ اغلب قرینہ یہ ہے کہ مشرق بعید کے بارے میں ہمیں مزید خراب اور پریشان کن خبریں سننا پڑیں گی کیونکہ حالات کی رفتار بہت ہی خراب ہو رہی ہے اور چونکہ ابھی اور بھی خراب تر حالات پیدا ہونگے۔ اس لیے میں اعتماد کا ووٹ طلب کرتا ہوں۔

ملایا میں برطانوی سپاہ کی مزید کمک پہنچ چکی ہے۔ حکومت پر اعتماد کے ووٹ کے سلسلے میں یہ سوال نمایاں طور پر سامنے ہیں کہ جب مشرق بعید میں امن امان تھا تو کیا حکومت برطانیہ روس کو امداد دینے کا وعدہ کرنے اور لیبیا اور لیورنٹ (شام) کو کمک روانہ کرنے میں حق بجانب تھی یا نہیں۔ قوم اور پارلیمنٹ اگر کوئی الزام عائد کرنا چاہے تو یہ الزام مجھ پر عائد کیا جائے۔ میں اس مطالبہ کو ہرگز تسلیم نہیں کر سکتا کہ مسٹر ڈف کوپر کابینہ سے خارج کر دیا جائے

مسٹر چرچل نے ہرہس (نازی لیڈر) کی آمد انگلینڈ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہرہس انگلینڈ میں اس لیے آیا تھا کہ وہ خاص حلقوں کے ساتھ تعلق پیدا کر کے چرچل کی رکاوٹوں کو دور کر دے۔ تاکہ ہٹلر انگلینڈ کے سر پر صلح منڈھ سکے۔

موسم کی خرابی کی وجہ سے روس کو سپلائی روانہ کرنے کے سلسلے میں رکاوٹ واقع ہو گئی ہے، مگر ماہ فروری کے شروع میں یہ رکاوٹ بیدا ہو جائے گی۔ محاذ لیبیا پر جرمن جنرل رومل کی دو تہائی سپاہ ہلاک یا گرفتار کر لیا گیا ہے۔ محاذ لیبیا پر اگرچہ جرمن سپاہ کو برطانوی فوج کی نسبت تین گنا زیادہ نقصان برداشت کرنا پڑے ہیں، مگر ہم نے جرمن جنرل رومل کو بہت ہی معمولی فرق سے شکست دی ہے۔ گذشتہ دو سال کی جنگ میں بمشکل اپنے سر کو پانی سے باہر رکھ سکے ہیں۔ مگر اب حالات بہتر ہیں اور پہلے کی نسبت آج ہمیں اپنی فتح صاف نظر آ رہی ہے۔

ہندوستان:- صوبہ بنگال میں، کلکتہ۔ چوبیس پرگنہ۔ ہوڑہ اور ہوگلی وغیرہ مقام پر اے۔ آر۔ پی کا ایک ایک مرکز قائم کر دیا گیا ہے اور حفاظتی تدابیر سرعت کے ساتھ انجام پا رہی ہیں جائے پناہ ہر جگہ بن رہا ہے، اور حکومت نے بالو کے تھیلوں کا انتظام بھی عام باشندوں کے لیئے کیا ہے جس کی قیمت فی تھیلہ ۲۰ مقرر کر دی ہے، کلکتہ کارپوریشن نے ۴۵ عمارتیں جائے پناہ کے استعمال کے لیے وقف کر دیئے ہیں، اور دوسرے دوسرے مقامات مثلاً ڈھاکہ۔ چاٹگام جمشید پور وغیرہ وغیرہ میں بھی دفاعی انتظامات کیئے جا رہے ہیں۔ حکومت نے سول کاموں کے لیے جبری بھرتی کا قانون بھی پاس کر دیا ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی اور کارپوریشن نے کچھ مدت کے لیئے تعلیمی ادارہ کو بند کر دینے کا حکم جاری کر دیا ہے

حکومت ہند نے دو نئے آرڈیننس بنائے ہیں جن کی رو سے صوبوں کو بہت وسیع اختیارات دیئے گئے ہیں۔ ایک آرڈیننس جس کی رو سے لوٹ مار آتشزدگی۔ ضرب شدید۔ زنا بالجبر یا کارخانوں کی مشین خراب کرنا، ریل کی پٹری کو برباد کرنا وغیرہ ان سب کی سزا موت رکھی گئی ہے، بلوا کرنا یا پبلک ملازم کی مزاحمت کرنے کی سزا بید لگانا رکھا گیا ہے، دوسرے آرڈیننس کی رو سے صوبوں کی حکومتوں کو اسپیشل عدالتیں قائم کرنے کی اجازت

دی گئی ہے۔ اسپیشل ججوں کو بصورت خاص، سرسری سماعت کے بعد پھانسی تک کا حکم دینے کے اختیارات ہونگے۔ یہ سب قوانین جنگ کی مجبوریوں کی وجہ کر بنائے گئے ہیں

حکومت بنگالہ نے ان لوگوں کے لیے جو فضائی حملوں میں زخمی یا ہلاک ہونگے ان کے اہل وعیال کے لیے وظائف دینے کا وعدہ کیا ہے۔ بشرطیکہ وہ کسی مفید کام میں مشغول ہوں، اور گھریلو نوکر مثلاً باورچی خدمتگار۔ موٹر ڈرائیور بھی خاص طور پر اس حکم سے فائدہ اٹھائیں گے۔

شادی:۔ یہ خبر نہایت مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ کلکتہ کے نوجوان شاعر وادیب جناب ابراہیم ہوشں صاحب کی شادی خانہ آبادی ہوگئی جس پر ادارہ جدید اظہار مسرت کا اظہار کرتا ہے۔

لیکن اب ہوش صاحب کو بھی چاہیئے کہ وہ اب اپنی ذمہ داری کو سمجھیں اور اپنے ہوش وحواس کو درست کر کے اپنی زندگی کو کامیاب بنائیں۔

سانحہ رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری سابق صدر اعظم نظام حیدرآباد دکن، حال رکن ممبر انچارج آف انفارمیشن وبراڈ کاسٹنگ گورنمنٹ آف انڈیا ۱۰۔ دن کی علالت کے بعد ۸ جنوری پونے چھ بجے شام کو دہلی میں انتقال کرگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون آپ حیدرآباد میں سپرد خاک کیے گئے۔

مرحوم کی گذشتہ سال نومبر میں ۲۰ ویں سالگرہ ہوئی تھی۔ آپ کی موت یقیناً ایک ناقابل تلافی نقصان ہے، خداوند تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائے۔

عبدالجلیل

گلہائے عقیدت

۱

راہ حق میں گھر لٹا کر کام ایسا کر دیا
فرق کو حق اور باطل کے ہویدا کر دیا

اے حسین ابن علی سبط پیمبر مرحبا
جان دیکر آپنے اسلام زندہ کر دیا

۲

بھولینگے نہ ہم کبھی کہانی تیری
تفسیر حیات جانفشانی تیری

اے فدیۂ راہ حق مسیح اسلام
بالا ہے فنا سے زندگانی تیری

۳

رہ تیغ پر بے خطر جانے والے
مبارک تجھے یہ سفر جانے والے

لہو سے ترے سرخرو ہے محبت
کہا تھا جو منہ سے وہ کر جانے والے

احسن طباطبائی لکھنوی

غزل

مجھی تک ان کی جفا نہ سمجھو یہ امتحاں ہے وہ امتحاں ہے
وہیں قیامت کا سامنا ہے وفا کی منزل جہاں جہاں ہے

فریب الفت کی داستاں میں اثر کی امید ہی کہاں ہے
ابھی تو مجھکو اسی میں شک ہے یقین یقیں ہے گماں گماں ہے

فسردہ سمجھو چراغ ہستی، کہاں ہے شعلہ فقط دھواں ہے
نفس کی رفتار کہہ رہی ہے قریب منزل کے کارواں ہے

نصاب الفت سے بے خبر ہے سند نہیں بوالہوس کا دعویٰ
جو لفظ میری زباں سے نکلے وہی محبت کی داستاں ہے

تمہاری غفلت شعاریوں نے وہ گل کھلائے کہ رنگ بدلا
قفس کی بنیاد رکھنے والو خزاں کے قبضے میں آشیاں ہے

کہاں پہونچنے کی آرزو ہے تمہارے نقش قدم پر چل کر
تم اپنے دل سے پتا لگاؤ مری تمنا کی حد کہاں ہے

اِدھر امنگوں کی لہر دل میں اُدھر جوانی کی خودنمائی
پڑے ہیں اک کشمکش میں دونوں مذاقِ فطرت کا امتحاں ہے

فریب بن کر نشاط دل کا رہے گا کب تک یہ عیش رفتہ
بدل چکا کروٹیں زمانہ مری نظر میں وہی سماں ہے

یقین دل کہہ رہا ہے مجھ سے کہ رنگ بیڈھب ہے جرم شاید
بہار آئے نہ بعد جس کے چمن میں وہ محشر خزاں ہے

جرم محمد آبادی

غزل

وہ دن بھی تھے کہ بیگانہ غم کونین سے دل تھا
جدائی کی مصیبت کا خیال آنا بھی مشکل تھا

دل بیتاب کو دم بھر سکوں ملتا یہ مشکل تھا
سر منزل بھی وہ بیگانۂ احساس منزل تھا

میں اس لمحہ پہ کر دوں زندگی بھر کی خوشی صدقے
مرے پہلو میں وہ تھے میں غم ہستی سے غافل تھا

وہ وقت آیا کہ اب منزل کو میں جادہ سمجھتا ہوں
وہ دن بھی کٹ گئے ہر راہ ہر قدم جب ایک منزل تھا

عروج دار پر اب اس کو آزادی ہوئی حاصل
وہ دیوانہ جو اک مدت سے پابند سلاسل تھا

غم حاصل سے بیگانہ جو ہیں کیا ان کو سمجھاؤں
دل پرشوق کیوں وارفتۂ تحصیل حاصل تھا

ہجوم غم میں یاد عیش رفتہ مٹتی جاتی ہے
فسانہ ہیں وہ دن لطف سکوں جب دل کو حاصل تھا

قدم پیچھے ہٹانے سے ہے بہتر غرق ہو جانا
میں گرداب فنا میں بے نیاز قرب ساحل تھا

مرے دست جنوں نے رخت ہستی چاک کر ڈالا
تقاضا جوش وحشت کا علاج وحشت دل تھا

کہاں کی داد خواہی اک نیا محشر ہوا برپا
ترے بسمل کو جس نے اک نظر دیکھا وہ بسمل تھا

وہ آئے اور مشکل زندگی کی حل ہوئی احسن
وگرنہ انتظار دید میں مرنا بھی مشکل تھا

سید محمد حسن احسن طباطبائی لکھنوی

سرِ شہادت

خلاقِ عالم نے انسان کو اشرف المخلوقات۔ خلعتِ خلافت الٰہی فی الارض سے سرفراز فرمایا۔ پھر اُسے حکم دیا کہ تم میرے سوا کسی غیر کے آگے اپنا سرِ تعظیم خم نہ کرو۔ عبادت کرو تو اسی کی کرو۔ مدد مانگو تو اسی سے مانگو۔ ڈرو تو اسی سے ڈرو۔ بھروسہ کرو تو اسی پر کرو۔ اطاعت اسی کی فرض ہے۔ اور انسانوں میں اُسی انسان کی اطاعت فرض ہے جو خداوند تعالیٰ کی طرف سے اُس کے اوامر و نواہی کے اجرا کے لیے مامور ہو۔ بچوں پر والدین کی اطاعت اسی وقت تک فرض ہے جب تک کہ وہ اپنے بچوں کے علم کے مطابق خداوند تعالیٰ کے حکم کے خلاف انہیں حکم نہ دیں۔ امیر کی اطاعت بھی اُسی وقت تک فرض ہے جب تک کہ وہ بدی اور ظلم کی اشاعت نہ کرے۔ یہ امور مسلمہ ہیں اہلِ اسلام اور تمام ذی عقلِ سلیم کے نزدیک۔

انسان حرکت۔ عمل۔ سعی۔ غور و فکر۔ تدبّر اور جد و جہد کے لیے پیدا کیا گیا ہے نہ کہ جمود۔ بے عملی۔ بے حسی۔ تقلیدِ کورانہ اور قناعتِ بزدلانہ کے لیے۔

انسان فطرتاً بہت متساہل اور راحت طلب واقع ہوا ہے۔ جب اس کی معیشت عیش و راحت سے۔ اس کے خطرات سلامتی و طمانیت سے۔ اس کی مشکلات آسائش و سہولت سے، اور اس کی مجبوریاں اقتدار و قوت سے بدل جاتی ہیں، تو ماضی کی روح فرسا یاد اس کے دل سے محو ہو جاتی ہے، اور ماضی کے ساتھ ساتھ وہ مستقبل کو بھی فراموش کر جاتا ہے۔ اُس کے سامنے صرف حال کا سوال باقی رہ جاتا ہے۔ اسے صرف یہی دھن باقی رہ جاتی ہے کہ حال کی ان برق رفتار گھڑیوں کو جس طرح سے ہو اور جس قیمت پر ہو عیش و راحت کے ساتھ بسر کر دے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جماعت انسانی ایک معینہ حد تک پہنچ جانے کے بعد بہت تیزی سے شروع کر دیتی ہے۔ اُس کے قوائے عملیہ بیکار اور قوائے دماغیہ مضمحل ہونے لگتے ہیں۔ اگر اسی حالت پر انہیں کچھ عرصے تک چھوڑ دیا جائے تو اس کی جسمانی۔ دماغی۔ اخلاقی اور روحانی حالت چوپایوں سے زیادہ بدتر ہو جاتی ہے۔ اس وقت خدا کا کوئی بندہ کھڑا ہوتا ہے اور انہیں خوابِ غفلت سے بیدار کرنا چاہتا ہے تو وہ بہرے اور گونگے ہو جاتے ہیں۔ انہیں جھنجھوڑتا ہے تو جھنجھلاتے ہیں۔ انہیں کوڑے مار کر جگانا چاہتا ہے تو وہ باؤلے کتوں کی طرح کاٹنے دوڑتے ہیں۔

یہی کیفیت ہوئی ربع مسکون کی، حضرت نوح علیہ السلام کے وقت یہی حالت ہوئی عالم کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت۔ یہی منظر نظر آیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت۔ یہی حالت دنیا والوں نے دیکھ لی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت۔ یہی رنگ تھا صفحۂ عالم پر چھایا ہوا سیدِ کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت

یہ سب مقدس ہستیاں دنیا میں اس لیے آئی تھیں کہ انسان کو انسان بنا کر چھوڑیں۔ خوابِ خرگوش سے غفلت شعاروں کو جگا کر چھوڑیں یہ نفوسِ قدسیہ خلقتِ انسانی کے بہترین نمونہ تھے۔ انھوں نے اپنے فرائض کی ادائگی میں نہ ڈھیل دی، نہ سستی کی اور نہ کسی قسم کے خوف ہراس کو راہ دی۔ ان مردانِ خدا کا بھروسہ مادہ اسباب پر نہ تھا بلکہ خداوند مسبب الاسباب پر تھا۔ اس شہنشاہِ مطلق نے اپنی تائیدِ غیبی سے انہیں کامیاب و فائز المرام کیا۔ لیکن انھیں بھی اپنی اہلیت کا ثبوت بیّن اور برہانِ قاطع دینا پڑا۔ انہیں دنیا والوں پر ثابت کر دینا پڑا کہ وہ اپنے جسم۔ اپنی جان۔ اپنے مال و اسباب۔ اپنے فرزند و زن غرض کل کائنات کو خلاقِ کائنات کا دیا ہوا سمجھتے ہیں۔ اور ضرورت پڑے تو اپنی پیاری سے پیاری چیزوں کی بھی قربانی کرنے کو تیار ہیں۔ تاکہ اندھوں کی آنکھیں روشن ہو جائیں۔ بہرے سننے لگیں۔ گونگے بولنے لگیں اور غفلت شعاروں کو ہوش آ جائے۔

جب حضرت نوح علیہ السلام کو اپنے قوی ہیکل فرزند کنعان کی قربانی دینی پڑی۔ خداوند قادر و قیوم کا طوفانی عذاب موجیں مارنے لگا اس وقت حضرت نوح اپنے اہل و عیال و رفقا کے ساتھ ایک حقیر کشتی میں تائیدِ الٰہی کی بدولت محفوظ و مطمئن بیٹھے ہوئے طوفان تیز و تند کو ٹھکراتے چلے جا رہے تھے۔ زمین سے پانی اُبل رہا تھا۔ اور آسمان بھی پانی انڈیل رہا تھا۔ لہلہاتے ہوئے کھیت و باغات کے بعد سر بفلک عمارتیں پانی میں غرق ہوتی جا رہی تھیں۔ لکھو کھا جانور اور جانور نما انسان غرق و ہلاک ہوتے جا رہے تھے۔ اسی وقت حضرت

نوح کو اپنا شوریدہ سر بیٹا کنعان نظر آتا ہے۔ پکارتے ہیں کہ "اے بیٹا میری کشتی میں سلامتی سے آکر بیٹھ جا۔" بیٹا جواب دیتا ہے "ابا جان آپ میرے لیے نہ گھبرائیں۔ میں ابھی پہاڑ پر چڑھ جاتا ہوں" سمجھتا ہے کہ پہاڑ اُسے عذاب الٰہی سے نجات دلا دے گا۔ حضرت نوح پکار کر کہتے ہیں "اے بیٹے! آج اللہ کے عذاب سے تجھے کوئی چیز نجات دینے والی نہیں۔ سوائے اس کی رحمت کے۔ آ۔ ایمان لا۔ اور خدا کی لازوال رحمتوں کا حقدار بن جا۔" مگر شوریدہ سر بیٹا باپ کی بات کو یک تمسخر سمجھتا ہے۔ اور قدرت اس پر کھلکھلا کر ہنستی ہے۔ عنقریب عذاب طوفانی پہاڑ کی چوٹی کو غرق کرنیوالا ہے۔ کنعان گمراہ و بدکار سہی۔ آخر بیٹا ہی تو ہے۔ شفقت پدری زور کرتی ہے بے ساختہ اُن کی زبان سے نکلتا ہے "اے اللہ یہ میرا بیٹا ہے۔ میرے اہل سے ہے" مطلب یہ ہے کہ تو نے میرے اہل کو بچانے کا وعدہ کیا ہے۔ یہ بھی تو میرے اہل سے ہے کیونکہ میرا ہی بیٹا ہے۔ حکم قہاری آتا ہے "یہ ہرگز تیرا اہل نہیں، کیونکہ اس کے اعمال برے ہیں۔ دیکھنا پھر کبھی ظالموں کے لیے مجھ سے سفارش نہ کرنا" نوح امتحان میں پورے اترتے ہیں۔ ایک موج آتی ہے اور کنعان کو اپنے لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ آپ دم بخود رہ جاتے ہیں۔ ایک بیٹا گیا۔ لیکن انہیں کے دوسرے بیٹوں سے پھر ساری خلقت پیدا ہوتی ہے اور حضرت نوح آدم ثانی کے لقب سے ملقب ہوتے ہیں۔ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام

اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے۔ حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام یکہ و تنہا نمرود شاہ ہفت اقلیم کی ہدایت پر مامور ہوتے ہیں۔ وہ آپ کو آگ میں پھینکتا ہے۔ آپ نہایت اطمینان کے ساتھ دہکتی ہوئی آگ پر گرتے ہیں جس طرح آپ اللہ کے تابع ہیں اسی طرح آگ بھی۔ آگ گلزار ہو جاتی ہے۔ مگر شقیان ازلی کو ایمان نصیب نہیں ہوتا۔ صرف آپ کی بیوی سارہ اور بھانجا حضرت لوط آپ پر ایمان لاتے ہیں۔ پھر خدا کی راہ میں ہجرت کرتے ہیں۔ گوناگوں آزمائشوں میں ثابت قدم نکلتے ہیں۔ آخر حکیم مطلق کی نگاہ و انتخاب آپ پر پڑتی ہے۔ وہ آپ کو سارے جہاں کا پیشوا بنانا چاہتا ہے آئندہ نسلوں کی امامت و رہبری کے لیے آپ کے خاندان کو مخصوص کرنا چاہتا ہے۔ لیکن آزمائش شرط ہے۔ اپنی اور اپنے خاندان کی اہلیت و استعداد کا ثبوت بیّن اور برہان قاطع دینا لازمی ہے۔ بڑھاپے میں ایک بیٹا عنایت ہوتا ہے۔ لیکن بیٹا ابھی گود ہی میں پل رہا ہے کہ حکم ربانی آتا ہے۔ اپنی پہلی بیوی سارہ کی خوشنودی کے لیے اور اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ ظاہر کرنے کے لیے "تم اپنی دوسری پیاری بیوی ہاجرہ اور اُس کے اور اپنے اکلوتے شیرخوار فرزند اسمٰعیل کو ایک دور دراز مقام پر وادی بے آب و گیاہ میں ڈال آؤ" حکم اللہ کا ہے جو سب کا پالنے والا اور نگہبان ہے۔ لیکن اسباب نابود و مفقود ہیں تسلیم و رضا کا دوسرا زبردست امتحان ہے۔ خدا کا یہ مخلص بندہ امتحان میں پورا اترتا ہے اور وادی مکہ میں اپنے دل کے ٹکڑے کو چھوڑ آتا ہے۔ وہ قادر مطلق بھی ثابت کر دیتا ہے کہ اسباب پر بھروسہ حماقت و نادانی ہے۔ اسباب کا فقدان ادائگی فرض کے لیے ہرگز مانع نہیں کیونکہ وہی مسبب الاسباب ہے جو اس پر بھروسہ کرتا ہے وہ نامراد نہیں ہوتا۔ حضرت اسمٰعیل کی نگہبانی کرتا ہے۔ پرورش کرتا ہے۔ بچپن ہی میں صاحب حکومت بناتا ہے اور اپنا برگزیدہ کر لیتا ہے۔ اب تیسرا زبردست اور محیر العقول امتحان ہونیوالا ہے۔ حضرت ابراہیم کو تاج خلعت سرفراز کر کے تخت امامت پر بٹھایا جانے کو ہو۔ پھر اپنی اور اپنے خاندان کی اہلیت و استعداد کا ثبوت دینا ہے۔ حکم ربانی ہوتا ہے کہ اپنی ساری امیدوں کے آماجگاہ۔ اپنی پیری کے سہارا۔ اپنی آنکھوں کے نور اور اپنے لخت جگر کو۔ کیسے لخت جگر کو۔ کنعان کی طرح نافرمان لخت جگر کو نہیں بلکہ اسمٰعیل کے ایسے فرمانبردار نکوکار اور ہونہار لخت جگر کو جس کے سوا دنیا میں تمہارا کوئی فرزند نہیں اور نہ ہونے کی بظاہر کوئی امید ہے۔ اپنے محبوب مطلق کی راہ میں قربان کر دو۔ حکم کی دیر تھی۔ امانتدار تھے۔ امانت سونپنے کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ بیٹے سے پوچھتے ہیں۔ بیٹا کہتا ہے "ابا جان! جو آپ کو حکم دیا جاتا ہے بلا تامل کر گزریئے۔ مجھے انشاء اللہ صابر پائیں گے" آپ نے اور آپ کے بیٹے نے اپنا اپنا فرض ادا کر دیا۔ لیکن در نہائے مطلق کو اپنے برگزیدوں کا امتحان منظور تھا نہ کہ اسمٰعیل کی جان۔ اولین و آخرین کا امام تو آپ کے صُلب میں جلوہ گر تھا چھری حلقوم معصوم پر چلتی تو کیونکر۔ ایک دنبہ ملکوتی فدیہ دیا گیا اور قربانی نسل آئندہ کے لیے ملتوی رکھی گئی۔ یادگار سنت کی گئی۔ حضرت خلیل اللہ اور آپ کے خاندان کی اہلیت و استعداد کا اظہار کون و مکان اور اولین و آخرین میں کر دیا گیا علیہم التحیۃ والسلام

امام اولین و آخرین، سید المرسلین، خاتم النبین، رحمۃ اللعالمین سیدنا و سید العالمین حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم

کو بھی اپنے کمال اہلیت و استعداد کے ثبوت بیّن اور براہین قاطعہ مسلسل و متواتر دینے پڑے۔ چونکہ وحی منقطع ہونیوالی تھی اور نبوت ختم ہونیوالی تھی۔ چونکہ مشیت ایزدی ہوچکی تھی کہ معجزات کی جگہ عقل و تدبر کو۔ اکراہ کی جگہ موعظۂ حسنہ کو۔ آمریت کی جگہ شوریٰ کو۔ تقلید کی جگہ اجتہاد کو اور انفرادیت کی جگہ ہیئت اجتماعی کو ملے اور چونکہ فیصلۂ ربانی ہوچکا تھا کہ قرآن اور دین محمدی قیامت تک زندہ و برقرار رکھا جائے اسی لیے اس کی ضرورت تھی کہ اپنی اہلیت کا ثبوت نہ صرف رہبر اعظم دے۔ بلکہ اُس کے رفقائے کار اور اہل بیت بھی سارے عالم پر یہ ثابت کر دیں کہ خلعت زیبائے خلافت ربانی کے حقدار وہ بھی اور ان کے تابعین اور تبع تابعین بھی۔ جب تک آفتاب روشن ہے اور زمین گردش میں ہے، وہ انسان کو انسانیت کا سبق دیتے رہیں گے اور خود نمونہ بن کر دنیا پر یہ ثابت کر دینگے کہ انسان صرف اللہ کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اُسی کی طرف پھر لوٹ کر جاتا ہے۔ ہمارا جسم ہماری جان۔ ہماری عادتیں۔ ہماری قربانیاں۔ ہماری زندگی۔ ہماری موت۔ ہماری دولت و ثروت۔ ہماری قوت و طاقت۔ ہمارے اہل و عیال۔ ہمارے فرزند و زن۔ ہماری مصیبتیں اور راحتیں۔ ہماری حرکت۔ ہمارا سکون، غرض سب کچھ اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے لیے ہے اور صرف اُسی کے لیے ہے اور کسی کے لیے نہیں۔ اگر ایک نہیں ہزار جانیں ہوں تو اُس کی راہ میں فدا کر دینا کوئی بڑی بات نہیں اگر قارون کا خزانہ بھی ہو تو اُس کی راہ میں لُٹا دینا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے سب اُسی کے لیے۔ اسی کا کام کرنے کے لیے ہے۔ اور اسی پر لٹانے کے لیے ہے۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے عہد و فرض منصبی کو کما حقہٗ پورا کر دیا اور کفر و شرک و طغیان کی کمر توڑ کر شیطان کو ہمیشہ کے لیے مایوس کر دیا۔ حضرت ابوبکر صدیق نے اسامہ کا لشکر شام کی طرف بھیجکر اور مرتدین کا بے سر و سامانی کی حالت میں مردانہ وار مقابلہ کر کے حضرت عمر فاروق نے خالد اعظم کو عین جنگ کی حالت میں معزول کر کے حضرت عثمان ذوالنورین نے بلوائیوں پر بغیر تلوار اٹھائے ہوئے اپنی جان دیدینا قبول کر کے اور حضرت علی مرتضےٰ نے باوجود قدرت و استحقاق قرابت و خدمات عالیہ خلافت ثلاثہ پر صبر کر کے اور باوجود ہجوم فتن و بلیات و فقدان اسباب تاویل قرآن پر جہاد کر کے سارے عالم پر ثابت کر دیا کہ دائمی فرائض منصبی کے لیے کوئی چیز مانع نہیں ہوسکتی۔ رضی اللہ عنہم۔ خدا پر بھروسہ رکھنے والے مادّہ و اسباب پر ہرگز بھروسہ نہیں کرتے اور بغیر قربانیوں کے بنی نوع انسان کی فوقیت و عزت باقی نہیں رہ سکتی۔

یہ انہیں نفوس قدسیہ کی قربانیاں و جانفشانیاں تھیں کہ ایک مدت قلیل میں قیصر و کسریٰ کے ایوان متزلزل ہوکر زمین بوس ہوگئے۔ عرب کے خانہ بدوش بحیرہ اخضر سے بحر او قیانوس تک اور بحیرہ روم سے بحر سند تک اپنی سلطنت و شہنشاہیت کا ڈنکہ بجانے لگے۔ اور سارے عالم پر ثابت ہوگیا کہ اسلام کمال انسانیت کا دوسرا نام ہے

لیکن ہر عمل کا ایک ردعمل ہوتا ہے۔ تعداد کی کثرت۔ اقتدار کی زیادتی مدمقابل کے فقدان اور دولت و ثروت کی فراوانی نے انہیں متاثر کرنا شروع کر دیا۔ وہ تلواریں جو ظالموں اور سرکشوں کی گردنیں کاٹتی تھیں اپنے بھائیوں کے سروں پر پڑنے لگیں۔ رضائے ربانی کے بدلے امارت و حکمرانی کی جد و جہد شروع ہوگئی۔ عیش و عشرت کے چسکے نے قناعت بزدلانہ کی تبلیغ شروع کر دی۔ فتنوں کا وہ ہجوم ہوا کہ اہل بصیرت کی عقلیں زائل ہوگئیں اور وہ دروازے بند کر کے اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ رہے۔ امر حق کا فیصلہ مکر و خدعت سے ہونے لگا۔ استحقاق امامت و خلافت کے لیے صلاح و تقویٰ۔ علم و بصیرت اور خدمات و قربانیوں کے بدلے دولت و اقتدار اور مکر و خدعت لازمی سمجھی جانے لگی۔ اسلام کی روح فنا ہونے والی تھی۔ انسانیت کا جنازہ نکلنے کو تھا۔ لیکن خدائے تعالیٰ کا وعدہ غلط نہ ہوسکتا تھا۔ اسلام زندہ رہنے والا تھا اور قیامت تک شرف انسانیت کی علمبرداری کرنے والا تھا شیطان پھر مایوس و ذلیل ہونے والا تھا۔ اب وقت آگیا تھا کہ سنت خلیل پھر تازہ کی جائے۔ لیکن منا کی سنسان وادی میں نہیں بلکہ کربلا کے لق و دق میدان میں دریائے فرات کے کنارے ہزاروں گواہوں کے حضور میں۔ اسمٰعیل کی قربانی جو نسل آئندہ کے لیے ملتوی رکھی گئی تھی اس کی ادائگی کا وقت آگیا۔ لیکن اس طرح نہیں کہ ماں کی نگاہوں سے اوجھل ہو اور باپ اپنی آنکھوں میں پٹی باندھے۔ بلکہ ضرورت اس کی تھی کہ خاندان مصطفوی و اسمٰعیلی و ابراہیمی کا چشم و چراغ اور آخری چشم و چراغ پہلے تین روز اپنے رفقاء و عزیز و اقارب کے ساتھ ایک صحرائے بے آب و گیاہ میں، دریائے فرات کے کنارے مگر اُس کے آب شیریں سے محروم، ہزاروں دشمنوں کے

زغے میں۔ کیسے دشمن جو خود اس کے نانا کا کلمہ پڑھتے ہوں اور قیامت میں اس کی شفاعت کے امیدوار ہوں بھوک اور پیاس کی شدت ومصیبت اٹھا کر پہلے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے رفقا کو قربان کرے پھر اپنے عزیز وا قارب کو خاک وخون میں غلطیدہ دیکھے۔ پھر اپنے شیرخوار بچے کو اپنی گود میں لے کر اس کی ماں کی آنکھوں کے سامنے قربان کرے۔ اپنے نوجوان خوب سیرت وخوبرو۔ عاقل۔ عالم۔ ذہین پارسا۔ دلیر اور ہر دلعزیز فرزند سعادتمند کو خدا کی راہ میں خود اپنی اور تمام عزیز وا قارب کی نگاہوں کے سامنے ہزاروں تیروں، نیزوں اور تلواروں سے زخمی ہو جانے کے بعد ریگزار کربلا میں تڑپ تڑپ کر جان دیتے ہوئے دیکھے۔

خاندان نبوت میں اب سوائے عورتوں۔ چھوٹے چھوٹے بچوں اور بیمار ہا جار عابد کے کوئی باقی نہیں رہ جاتا۔ یہ آخری نام لیوا بھی راہ حق میں اپنی قربانی پیش کرنے کو نیزہ ہاتھ میں لے کر خیمہ کے باہر نکلتا ہے لیکن امام اولی الامر کا حکم ہوتا ہے کہ حجت تمام ہو چکی اب صرف میری قربانی کی ضرورت ہے۔ تم بیمار ہو۔ کمزور ہو۔ ناتواں ہو۔ فرض سے سبکدوش کیے جاتے ہو۔ قربانیوں کا مقصد اللہ کی حجت پوری کرنی ہے وہ ہو چکی۔ تمہاری قربانی سے میری قربانی رک نہیں سکتی خدا کی مصلحت ومشیت یہی ہے کہ تم آئندہ نسلوں میں قربانی کا جذبہ بیدار رکھنے کے لیے دنیا کی مصیبتیں کچھ روز جھیلو۔ اور صبر وشکیب کا دوسرا نظارہ دکھا کر میرے پاس آجاؤ۔ الامر فوق الادب بیمار لڑکھڑاتے ہوئے خیمہ کو واپس جاتا ہے اور پھر صاحب فراش ہو جاتا ہے۔

وہ شیر بیشۂ شجاعت وحق پرستی یعنی رحمۃ اللعالمین کے نور نظر خاتون جنت کے لال، شیر خدا کے لخت جگر۔ آخری رکن اہلبیت۔ سردار جوانان اہل جنت۔ امام برحق سیدنا حضرت حسین بن علی علی جدہم الصلوۃ والسلام اتمام حجت کے لیے مجمع شقیان ازلی وبدبختان ابدی کے سامنے ایک پر اثر تقریر کرتے ہیں۔ انہیں اپنے فرائض منصبی سے آگاہ کر دینے کے بعد اپنی آخری ملکیت یعنی جان عزیز کو راہ حق میں قربان کر دیتے ہیں اور ترکنا علیہ فی الآخرین کی تفسیر واضح فرما دیتے ہیں۔ علیہ التحیۃ والسلام وعلی آلہ ورفقائہ واہل بیتہ وتوابعہ واحبائہ الی یوم القیام

یہ کیا قربانی تھی؟ کیسی قربانی تھی؟ اس کی تشریح حضرت خواجہ چشتی رحمۃ اللہ علیہ اس طرح کرتے ہیں۔

شاہ است حسین بادشاہ است حسین ۔ دین است حسین دین پناہ است حسین
سر داد نہ داد دست در دست یزید ۔ حقا کہ بنائے لا الہ است حسین

یہ عظیم الشان قربانی خدائے تعالی کے دربار میں مقبول ہو گئی سونے والے جاگ اٹھے۔ مخبوط الحواس اہل بصیرت کی آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹ گئے۔ حق پرستی کا بول بالا ہو گیا۔ ظالمین کیفر کردار کو پہنچ گئے۔ خلافت کا وہ پردہ جس کی آڑ میں ذلیل وناپاک ملوکیت واستبدادیت اپنا شکار کھیلنا چاہتی تھی۔ چاک چاک ہو گیا۔ اسلام کی روح تازہ ہو گئی اور خدا کا وعدہ پورا ہو گیا لا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔ سچ ہے

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

سید مظہر حسین مظہر
مدرس، ہوڑہ مسلم ہائی اسکول

خلوت

ہم لوگ ابھی ابھی کھانے سے فارغ ہوئے تھے۔ میرے چاہنے والے احباب میں سے ایک نے کہا "آؤ ذرا کرزن گارڈن تک سیر کر آئیں"۔

چنانچہ میں اس کے ہمراہ ہوگیا۔ تھوڑی دیر میں ہم دونوں تنآور درختوں کے گھنے سائے میں چلنے لگے۔ ہر طرف خاموشی پھیلی ہوئی تھی مگر کبھی کبھی کلکتہ کی مخصوص ہنگامہ خیزی سے نظام سکوت میں ایک خفیف سی تھرتھری پیدا ہو جاتی تھی۔ برودت خیز ہوائیں ہولے ہولے چل رہی تھیں اور آسمان کی تاریک گہرائی میں ہزاروں ننھے ننھے درخشاں ستارے جواہرات کی مانند جگر مگر کر رہے تھے۔

میرے دوست نے کہا "مجھے یہاں رات کو دوسری جگہوں کے مقابلہ میں زیادہ سکون ملتا ہے —— نہ جانے کیوں! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے دماغ میں کشادگی پیدا ہو رہی ہے۔ کبھی کبھی تو ایک لمحہ کے لئے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کے سارے راز ہائے سربستہ دفعتاً میری نظروں کے سامنے آکر برہنہ ہوگئے —— لیکن چشم زدن میں یہ کیفیت مفقود ہو جاتی ہے اور پھر وہی عالم طاری ہو جاتا ہے"۔

درختوں کے کنارے دور جھاڑیاں متحرک نظر آرہی تھیں۔ اسی اثناء میں ہم ایک بنچ کے سامنے سے گذرے۔ بنچ پر ایک عورت اور ایک مرد بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں تیرگی بہت زیادہ گہری ہوگئی تھی۔

میرا دوست بڑبڑایا —— "لاچار انسان! میں ان سے متنفر نہیں ہوں۔ مجھے ان پر ترس آتا ہے۔ میں نے حیات انسانی کے تمام پہلوؤں کا مطالعہ کرنے میں اپنی زندگی کا کافی حصہ صرف کیا ہے۔ مگر تاحال میں صرف ایک حقیقت معلوم کرنے میں کامیاب ہوا ہوں۔ یعنی ہماری تخلیق کی سب سے تلخ حقیقت اس واقعہ میں مضمر ہے کہ ہم ابدی طور پر تنہا رہتے ہیں اور ہماری تمام کدوکاوش جدوجہد اسی ابدی تنہائی کو دور کرنے کیلئے ہوتی ہے۔ مگر ہمیں ہر قدم پر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ یہ دونوں محبوب اور محبوبہ بھی دوسری جاندار مخلوق کی طرح اس کھلی ہوا میں اپنی خلوت کو جلوت میں عارضی طور پر تبدیل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ تنہا رہے ہیں اور ہمیشہ تنہا رہیں گے —— اسی طرح جس طرح میں اور تم!

"کسی کو تنہائی زیادہ محسوس ہوتی ہے اور کسی کو کم۔ مگر اس احساس سے کوئی چیز مبرا نہیں ہے"۔

"ایک عرصہ تک میں ایک شدید اور جانگسل کشمکش میں مبتلا رہا۔ کیونکہ میں اس خلوت سے واقف ہوگیا تھا جس میں میں ہمیشہ رہتا ہوں اور اپنی معلومات کی بنا پر میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ اس تنہائی کو دنیا کی کوئی شئے دور نہیں کر سکتی —— کوئی شئے نہیں! سمجھے؟"

"یہ صحیح ہے کہ ہم ہنستے اور بولتے ہیں۔ ہمارے دل میں روزانہ نت نئی تمنائیں پیدا ہوتی ہیں اور ہمارے بازو تگ و دو کرتے رہتے ہیں لیکن خلوت ہمارا ایک ثانیہ کے لیے بھی پیچھا نہیں چھوڑتی۔

"میں تمہیں اپنے ساتھ اس لیے لایا ہوں کہ ابھی مجھے گھر جانا نہ پڑے۔ کیونکہ میں اپنے کمرہ کی تنہائی سے بہت ڈرتا ہوں۔ تنہائی مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ میں تم سے باتیں کر رہا ہوں اور تم میری باتوں کو سن رہے ہو۔ مگر ہم دونوں تنہا ہیں —— ایک دوسرے کے بالکل قریب ہیں لیکن بالکل تنہا۔ کیا تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو؟

"وہ روحیں خوش نصیب ہیں جو دنیوی بندشوں سے آزاد ہیں" یہ الفاظ توریت میں درج ہیں اور میرا ان پر ایمان ہے۔ دراصل لوگ مسرت کے فریب میں مبتلا رہتے ہیں۔ انہیں وہ تنہائی محسوس نہیں ہوتی جو ہم محسوس کرتے ہیں۔ وہ لوگ زندگی کی حقیقت سے ناآشنا ہیں۔ وہ لوگ چلتے پھرتے، ہنستے بولتے اور کھاتے پیتے ہیں مگر وہ زندگی کی لامتناہی تنہائی سے ناواقف ہیں۔ وہ فریب خوردہ اور زندگی سے بے بہرہ ہیں۔

"شاید تم مجھے مجنوں اور پاگل سمجھتے ہو؟ سنو! میں نے مسلسل ایک سال تک زندگی کی "تنہائی" محسوس کی اور ہر روز مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں ایک تاریک غار میں لحظہ بہ لحظہ دھنستا جا رہا ہوں —— ایسے غار میں جس کے نہ کنارے میں پکڑ سکتا اور نہ تہہ کو پاؤں سے چھو سکتا تھا۔ میں اس اندھیرے غار میں تنہا تھا۔ میرے

نزدیک کوئی بھی نہ تھا۔ کوئی شخص اس تیرہ و تار راستہ پر سفر کرنے کی جرات نہیں کرتا۔ یہ غار "زندگی" ہے۔ بعض اوقات ایک ہنگامہ سنتا ہوں مگر مجھے معلوم نہیں کہ یہ آوازیں کہاں سے آتی ہیں۔ اس غار کی اندھیاری میں کوئی نورانی ہاتھ اشارے کرتا دکھائی نہیں دیتا ـــ سب ہے!

"بعض لوگ اس خلوت کو محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ مسٹ نے اپنی ایک نظم میں اپنے خیالات یوں ظاہر کیے ہیں ـــ

"کون آتا ہے؟ کون مجھے پکارتا ہے؟ کوئی نہیں! میں تنہا ہوں۔ وہ گھڑی آگئی ہے! کیا تنہائی ہے! کیسی بدبختی ہے!!

لیکن مسٹ کے نزدیک یہ تنہائی ایک مبہم سی چیز ہے اور وہ تیقن کے ساتھ کسی خاص نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔ میرا خیال اس کے برعکس ہے۔ وہ شاعر تھا۔ اس کی زندگی تصورات و تخیلات سے لبریز تھی۔ اس لیے وہ صحیح معنوں میں تنہا نہیں تھا۔ لیکن میرے ساتھ معاملہ الٹا ہے!

"گستاؤ فلاؤبرٹ کے تدبر و تفکر میں کسی کو کلام نہیں۔ لیکن وہ دنیوی جھمیلوں سے تنگ آگیا تھا۔ اس سلسلہ میں اس نے اپنے ایک دوست کو یہ چند یاس انگیز الفاظ لکھے۔

"ہم لوگ ایک لق و دق صحرا میں بھٹک رہے ہیں ـــ ہم میں سے ہر ایک گمراہ ہے ـــ اور ہم ایک دوسرے سے اجنبی ہیں ـــ"

"یہ سچ ہے کہ ہم لوگ آپس میں اگرچہ بولتے، سمجھتے اور کوشش کرتے ہیں۔ مگر ایک دوسرے سے بالکل ناآشنا ہیں۔ کیا زمین کو معلوم ہے کہ آسمان میں شراروں کی مانند بکھرے ہوئے ستاروں پر کیا بیت رہی ہے؟ بعض ستارے اتنی بلندی پر ہیں کہ ان کی دھیمی دھیمی روشنی نظر آتی ہے اور بعض اتنی بلندی پر ہیں کہ انہیں دیکھنے سے ہماری آنکھیں قاصر ہیں۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ آپس میں اس قدر قریب ہوں جتنے جسم کے ذرات!

"دیکھو! عموماً لوگ اپنے ہمسایوں سے بھی کما حقہ واقف نہیں ہوتے۔ حالانکہ وہ بالکل نزدیک نزدیک رہتے ہیں۔ پس ہم لوگ بھی ایک دوسرے سے اسی قدر الگ ہیں جس قدر آپس میں ستارے۔

تمہیں یہ سن کر اور بھی حیرت ہوگی کہ ہم ان لوگوں کو بھی پہچاننے سے عاجز ہیں جن کے ساتھ ہم ہر وقت بولتے اور ہنستے ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں ـــ وہ بھی اس طرح گویا جانے ہاتھ محبت کی زنجیروں میں قید ہیں۔ لیکن ہم ایک دوسرے کے پاس نہیں پہنچ سکتے۔ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے پاس آنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ہماری کوشش بارآور نہیں ہوتی۔ ہمارا غصہ، ہماری خوشی، ہماری آزادی اور ہماری آرزوئیں محض بے معنی، مہمل، بے نتیجہ اور بیکار ہیں۔ جب ہم یہ خواہش کرتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے میں جذب ہو جائیں تو ہماری یہ خواہش ہمیں ایک دوسرے سے متصادم کر دیتی ہے ـــ اور بس!

"سب سے زیادہ میں اس وقت اپنے کو تنہا محسوس کرتا ہوں جب کسی دوست سے اپنے دل کی باتیں کہتا ہوں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میرے اور اس کے درمیان ایک ناقابل عبور خلیج پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں تو نظر آتی ہیں مگر اس کی روح جو ان پتلیوں کی روح رواں ہے نظر نہیں آتی۔ وہ میری باتیں بغور سنتا ہے۔ مگر وہ کیا سمجھتا ہے؟ ہاں وہ کیا سمجھتا ہے؟ کیا تم اس کے دل کی باتیں معلوم کر سکتے ہو؟ شاید وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے؟ شاید وہ مجھ پر دل ہی دل میں ہنستا ہے؟ شاید وہ میری باتوں کو سمجھتا ہے؟ میں کیسے سمجھوں کہ وہ مجھے کیا سمجھتا ہے؟ میں کیسے سمجھوں کہ وہ بھی مجھے اتنا ہی چاہتا ہے جتنا میں اسے؟ میں کیسے سمجھوں کہ اس کے دماغ میں کیا ہلچل مچی ہوئی ہے؟ یہ کتنا گہرا راز ہے انسانی زندگی کا! نہ ہم کسی کے تاثرات معلوم کر سکتے ہیں اور نہ ہم ان پر قابو پا سکتے ہیں ـــ اف! کیسا اندھیرا!

میں نے خود کو روشناس کرنے کے لیے اپنی روح کے تمام دروازے کھولنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ پھر بھی میرے دل کی گہرائی میں ایک ایسا راز پوشیدہ ہے جسے کوئی معلوم نہیں کر سکتا! کوئی اسے معلوم کر سکتا ہے اور نہ پہچان سکتا ہے۔ کیونکہ کوئی بھی میری طرح نہیں ہے۔ اس لیے کہ کوئی بھی کسی کو اچھی طرح نہیں سمجھتا ہے!

کیا تم مجھے ابھی پہچان رہے ہو؟ یقیناً نہیں۔ تم مجھے سمجھتے ہو کہ میں سٹری ہوں۔ تم میرا امتحان لے رہے ہو۔ تم میری ہفوات سے گھبرا رہے ہو؟ تم سوچتے ہو "آج اسے کیا ہوگیا ہے؟" لیکن ایک روز تم مجھے پہچان لوگے اور سمجھو گے کہ میں کس روحانی تکلیف میں گرفتار ہوں مگر ابھی آؤ اور کہو "میں نے تمہیں پہچان لیا" اس طرح تم مجھے ایک تحفہ

کے لیے مسرور کر سکو گے۔

"سچ پوچھو تو مجھے عورتوں نے اس تنہائی کا احساس دلایا۔ انھوں نے مجھے کتنی اذیتیں پہنچائی ہیں: ۔۔۔ روح کانپ جاتی ہے۔ انھوں نے ثابت کر دیا ہے کہ میں یکہ و تنہا ہوں۔

"جب کوئی دام محبت میں اسیر ہو جاتا ہے تو اس کے دل و دماغ میں غیر معمولی وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ فردوسی نشاط میں گم ہو جاتا ہے جانتے ہو کیوں؟ نہیں معلوم ہے یہ نشاط کہاں سے آئی ہے؟ بات یہ ہے کہ وہ یقین کر لیتا ہے کہ اب وہ دنیا میں تنہا نہیں رہا اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس "ابدی تنہائی" کا خاتمہ ہو گیا ۔۔۔ کتنی بڑی غلطی!۔۔۔

"ہم محبت کرنے کے لیے بیقرار رہتے ہیں اور ہمارے قلوب میں ایک خلش موجود رہتی ہے۔ مگر ہمارے اس رنگین خواب کو عورت پراگندہ کر دیتی ہے۔

"تمہیں معلوم ہے کہ وہ کیف بار لمحات جو حسن و شباب کی ملکہ کے ساتھ جس کے بال سنہرے اور خط و خال نازک و دلکش ہوں گزرے ہوں ان کی یاد ہی ہمیں دیوانہ بنانے کے لیے کافی ہے۔ ہم پر ایک بحرانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے ۔۔۔ لیکن ہمارے دل و دماغ کو کون سی قوت معطل کر دیتی ہے؟ ہم کیوں فریب میں گرفتار ہو جاتے ہیں؟

"محض یہ خیال ہوتا ہے کہ محبت ہمارے دلوں کو یکجا کر دے گی اور ہماری تنہائی فنا ہو جائے گی۔ مگر افسوس! وہ لمحہ کبھی آتا ہی نہیں ہم سالہا سال تک انتظار کرتے ہیں، امید و بیم کی کشمکش میں مبتلا رہتے ہیں اور ایک سراب کی توقع پر جیتے رہتے ہیں۔ لیکن دفعتہً ہم اپنے کو پہلے سے بھی زیادہ تنہا اور اکیلا پاتے ہیں۔ ہر بوسہ اور ہم آغوشی کے بعد ہمارے مابین تنہائی کی خلیج زیادہ سے زیادہ وسیع ہوتی جاتی ہے۔ یہ کس قدر دلکش اور تلخ حقیقت ہے!

"میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تم اس عورت کے خیال بھی معلوم نہیں کر سکتے ہو جو ہر وقت تمہارے ساتھ رہتی ہے ایک دفعہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم دونوں ایک غیر مرئی قوت کے ذریعہ سے ایک دوسرے کی روح کی گہرائی میں اتر گئے ہو۔ مگر ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے جب ایک معمولی واقعہ بھی اس فریب کا پردہ چاک کر دیتا ہے ۔۔۔ ٹھیک اسی طرح گویا اندھیرے گھپ میں ایک بجلی کوندی اور دیوار صاف نظر آگئی جو تمہارے آگے حائل ہے۔

"ہاں بے شک دنیا میں وہ گھڑیاں بڑی قیمتی ہیں جو ایک محبوبہ کی ہم جلیسی میں گزری ہوں ۔۔۔ اور وہ بھی اس طرح کہ محبوبہ خاموش بیٹھی ہو اور محب اس کے سحر آگیں وجود کی دید سے لذت اندوز ہو رہا ہو لیکن ہمیں یقین کر لینا چاہیے کہ دو چیزیں ایک دوسرے میں ہرگز مدغم نہیں ہو سکتیں۔

"کم از کم میں اپنے متعلق اتنا کہنے کی جرأت ضرور کروں گا کہ میں نے اپنی روح قید کر دی ہے۔ اب میں کسی سے نہیں کہتا کہ میں کیا سوچتا ہوں کس پر عقیدہ رکھتا ہوں اور کس سے محبت کرتا ہوں۔ چونکہ میں جانتا ہوں کہ "ابدی تنہائی" سے مجھے کبھی نجات نہیں مل سکتی۔ اس لیے میں کسی کو کوئی مشورہ نہیں دیتا۔ میں کسی کے عقیدے، خیالات اور رجحانات سے بھی واقف ہونا نہیں چاہتا۔ میرے مخفی خیالات ابدی راز کی طرح رہیں گے۔ میرے پاس تمام سوالات کا ایک ہی جواب ہے ۔۔۔ یعنی جب مجھ سے کوئی سوال کرتا ہے تو میں جواب میں مسکرا دیتا ہوں جس کے معنی "ہاں" ہوتے ہیں۔ میں لوگوں کے تمام سوالوں کا جواب دینا پسند نہیں کرتا۔"

ہم ٹہلتے ٹہلتے کرزن گارڈن کی روشوں پر چل رہے تھے۔ جب ہمیں اس کا احساس ہوا کہ کافی رات بھیگ چکی ہے تو ہم فوراً لوٹے۔ میرا دوست زندگی کے ہر پہلو پر شرح و بسط سے روشنی ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ فی الحال میں اس کی بہت سی باتیں بھول گیا ہوں۔

وہ ایک جگہ اچانک رک گیا اور مونومنٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"دیکھو! ہماری حالت اسی بے جان مینارہ کی طرح ہے۔"

اس کے بعد وہ ایک طرف بھاگنے لگا۔ میں ششدر کھڑا رہا یہاں تک کہ وہ تاریکی میں غائب ہو گیا۔

وہ دیوانہ تھا یا فرزانہ؟ میں اب تک اس سوال کو حل نہ کر سکا ہوں۔ کبھی خیال ہوتا ہے کہ وہ ایک بہت بڑا فلسفی تھا اور کبھی خیال ہوتا ہے کہ وہ پاگل تھا ۔۔۔ کون جانتا ہے کہ وہ کیا تھا۔

(موپساں) ترجمہ۔ اختر ماہ پوری

آتش پارے

(از شاعرِ بنگال قاضی نذر الاسلام)

آگ کی چنگاریاں فضائے بسیط میں بلند ہو رہی ہیں،
شعلے برف آلود نبض میں حرارت بن کر بچار رہے ہیں!!
یا پھاگن کے گلہائے رنگا رنگ میں بالیدگی آگئی ہے —؟
یا غنچوں کی سوئی ہوئی آنکھیں جاگ گئی ہیں؟
دیکھو! دیکھو!!
آگ کا بھیانک شعلہ اپنی سرخ زبان نکالے پیش قدمی کر رہا ہے!
آدھی رات کے عمیق سناٹے میں — قبرستان کی سی سنسان بستی
میں ——
کون ہے جو اپنے شرربار قلم سے شعلہ انگیز حروف بکھیر رہا ہے؟
یا آسمان کی پھیلی ہوئی اندھیری چھائی میں — حضرت علی کی
آگ کے دلدل کی سواری چلی آرہی ہے؟
آگ کی لامتناہی بارش کا سلسلہ شروع ہوگیا — شروع
ہوگیا سرد جذبات میں گرم لہو دوڑانے کا موسم!
چھوٹی چھوٹی چنگاریاں جو ہوا کے بار سے دبکر مرچکی تھیں پھر آگ کے
ڈھیر میں واپس آرہی ہیں — اُن کی سانسوں میں طوفان کی
رفتار اور رفتار میں برق کی تیزی آگئی ہے —!
آسمان کے یاقوت، گوناگوں رنگ کے موتی، روشن نیلم،
ہماری اُمیدوں کے چراغ ہیں، آنکھوں کے تارے ہیں!
پتھر کی سخت چٹانوں کا خواب ٹوٹ گیا — اُن میں زندگی
کی لہر دوڑ گئی، روح کا کنول پھوٹ گیا — منڈیر پر ڈیرا ڈالنے
والا کبوتر — فضا کی بلند و بالا چوٹی پر پرواز کرنے لگا!
کس کا رتھ ہوا کے دوش پر آرہا ہے؟
کون عربی اونٹ کی پشت پر سوار ہو کر حریت کا پیام سنا
رہا ہے؟
سنسان، تاریک اور اُداس رات کا خواب توڑ کر،
مسافروں کے تھکے ماندے جسم جھنجھوڑ کر،
بڈھوں کی کمزور آنکھوں کے سامنے — یکایک
صبح کے مترنم طیور — خواب کے حسین محل کو چکنا چور کرکے
صبح اُٹھتے ہیں:
یہ سب کیا ہیں؟ باغِ حیات کی نئی کلیاں، نازک شگوفے
یہ سب کیا ہیں؟ صبح کے جھلملانے والے تارے!
کیا انہی کی نازک اور شیریں آوازوں کی لہروں میں مل کر
بلبل اپنا راگ چھیڑتی ہے؟
آگ کے بھیانک —— لال لال شعلے پھیل رہے ہیں!
بلند ہو رہی ہیں فضا کی دھندلی، کہر بار راہوں میں چنگاریوں
کی گرم گرم سانسیں!!
خوش و خرم بچے، باغِ حیات کی نئی کلیاں انقلاب کے
نغمے الاپ رہے ہیں!
صبح کی شعاع نو کے ساتھ ساتھ جھینگروں کے عقب میں
انہیں ناچتے دیکھ رہا ہوں اور شہد کی مکھیوں کی سریلی لے میں گھاس
اپنا راگ بھی الاپ لیتے ہیں۔
ان کے نازک جسم میں نئی زندگی کی لہر دوڑ گئی ہے، آنکھوں
کی پتلیوں میں چنگاریوں نے گھر بنا لیا ہے:
آؤ انقلاب کے شیدائیو، آزادی کے متوالو!
دیکھو پاگل ہوا کے جھونکے طوفان میں تبدیل ہو رہے
ہیں! ٹوٹی پھوٹی کشتیاں سمندر کے تھپیڑے کا مقابلہ
کر رہی ہیں —— اور مایوس نگاہوں میں
امید کی شعاع پھوٹ پڑی ہے۔ تکالیف و مصائب میں
گلہائے رنگا رنگ کی کلیاں نظر آرہی ہیں —— دیکھو
اب کہاں کہاں خوشی و مسرت کے چشمے پھوٹتے ہیں؟
انجیر کی نازک شاخوں میں جھولے کی پینگیں بڑھنے
والی ہیں! اب آگ کا چراغ روشن ہوگیا۔ پھاگن کی
دلکش فضائیں چنگاریاں بن گئیں —— آؤ،
آؤ ان بھڑکتے شعلوں میں سماکر آزادی کے گیت گائیں —!!

ترجمہ محمد یونس اختر کلکتہ

افسانہ

انصاف یا محبت؟

سلطنت مغلیہ اپنے عروج پر تھی۔ شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کا عہد تھا۔ ایک دن شاہی محافظوں نے شہنشاہ کے سامنے ایک تین سالہ بچی کو پیش کیا۔ شہنشاہ نے دریافت کیا "یہ لڑکی تمہیں کہاں سے ملی"؟

"جہاں پناہ! چند ڈاکو اسے لے کر بھاگے جا رہے تھے۔ ہم نے اِسے اُن کے ہاتھ سے چھینا ہے" شاہی محافظوں نے جواب دیا۔ لڑکی کی معصوم صورت دیکھتے ہی اکبر کو رحم آگیا۔ اُس نے اُسے فی الفور گود لے کر اس کا نام 'انارکلی' رکھا۔ اِس لیے کہ لڑکی کے سرخ ہونٹ اور گلابی رخسار انارکلی کو مات کر رہے تھے۔ بعد ازاں شہنشاہ نے حکم دیا کہ اس لڑکی کو شاہی محل میں رکھا جائے۔

انارکلی کو گود لے کر شہنشاہ اکبر نے اپنی فیاضی اور دریادلی کو غیر فانی بنا دیا۔ اُسے شاہی محل کی رنگین فضا میں رکھ کر ہر قسم کی تعلیم دلائی۔ جوان ہوتے ہی انارکلی نے اپنے مسحور کن شباب اور ملکوتی حسن سے محل کی دیواروں تک میں زندگی ڈال دی۔ اُس کی غیر معمولی ذہانت اور قدرتی فہم و فراست نے، اُس کی خوبیوں میں چار چاند لگا دیئے۔ درباری آداب سے واقف ہوتے ہی، شاہی محل کی تمام عورتوں کو اُس نے مات کر ڈالا۔ اور شہنشاہ کی نظروں میں حد سے زیادہ محبوب و مقبول بن گئی۔ وہ اپنی فطری ذہانت اور حسن تدبیر کے ذریعہ شہنشاہ کا ہر کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا کرتی تھی۔ اکبر کو اپنی اِس زندہ دل اور بھولی بھالی کنیز پر کتنا اعتماد تھا۔ اس کا اندازہ ذیل کی باتوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ انارکلی کو اُس وقت بھی، جبکہ شہنشاہ سلطنت سے متعلق بہت ہی اہم اور پوشیدہ امور پر گفتگو کیا کرتا تھا، تخت کے پیچھے کھڑا رہنے کی اجازت تھی، ساتھ ہی وہ اس موقع پر بھی شہنشاہ کے ساتھ رہا کرتی تھی جب وہ اپنے وزیر اعظم بیرم خاں سے خفیہ ملاقاتیں کیا کرتا تھا۔

انارکلی پر مغل شہنشاہ کا اعتماد دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ جسے دیکھ کر افغانی وزیر بیرم خاں کو تشویش پیدا ہوئی اور وہ اُس درباری کنیز سے جلنے لگا۔ اُس نے سوچا "اگر بادشاہ کی محبت کا یہی حال رہا تو ممکن ہے یہ کنیز ہمارے اثر و رسوخ کو اکبر کے دل سے نکال دے اور میں شاہی عنایات سے محروم کر دیا جاؤں"۔ بیرم خاں کی نفرت نے دھیرے دھیرے نہایت ہی خوفناک صورت اختیار کرلی۔ یہاں تک کہ وہ انارکلی کو دربار سے نکلوا کر اپنا راستہ ہمیشہ کے لیے صاف کرنے کی فکر کرنے لگا۔

ادھر شہنشاہ اکبر، انارکلی کے بے پناہ حسن اور خداداد صنفی قابلیت سے دھیرے دھیرے مغلوب ہوتا جا رہا تھا۔ باوجودیکہ اکبر کو اپنی اِس حبشی کنیز کے خاندان کا کوئی علم نہ تھا۔ نہ ہی انارکلی اپنے والدین کے متعلق کچھ جانتی تھی تاہم شاہی محل میں اُس کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا تھا جو صرف شاہی خاندان کے لیے مخصوص تھا۔ انارکلی کو شاہی رقاصہ کا مرتبہ بھی حاصل تھا۔ اُس کے رقص نے شہنشاہ کے ساتھ ساتھ تمام درباریوں کو بھی اُس کا پرستار بنا دیا تھا۔ وہ اپنے اِس فن کے ذریعہ ہر شخص کے دل کی گہرائی میں اُتر چکی تھی۔

شہنشاہ اکبر کا لڑکا شہزادہ "سلیم" بھی جوان ہو چکا تھا۔ انارکلی کے فسوں ساز و ہنگامہ خیز حسن نے شہزادہ پر بھی اپنا جادو کر دیا جو ایک فطری امر تھا۔ شہزادہ سلیم اور انارکلی کی رومانی ملاقاتوں کے متعلق ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔ لیکن اِس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انارکلی بھی شہزادہ کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ وہ دونوں اکثر شاہی باغ میں حسن و عشق کے زریں لمحات بِتایا کرتے تھے۔

شہزادہ اور انارکلی کی باہمی محبت کا راز بیرم خاں نے بہت جلد معلوم کرلیا۔ اور اُسی دن اُس ظالم و سفاک وزیر نے دونوں کی محبت بھری زندگیوں کو تباہ کرنے کی ٹھان لی اور اس واقعہ کو مغل بادشاہ کے گوش گذار کر دیا۔ یہی نہیں۔ اِس کے دوسرے دن، جبکہ شام کے وقت سلیم اور انارکلی دونوں باغ میں ٹہل رہے تھے اُس نے کھڑکی کی راہ سے اکبر کو سب کچھ دکھا دیا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا "جہاں پناہ! یہ لڑکی کسی طرح بھی شہزادہ کو زیب نہیں دیتی اور مغل خاندان کی روایتی شان کو خاک میں ملانے پر تلی ہوئی ہے۔ شہزادہ کو اُس نے اِس بری طرح پھانسا ہے کہ وہ کسی اور سے شادی کرنا بھی نہیں چاہتا۔"

شہنشاہ اکبر کو اپنے لڑکے سلیم سے غایت درجہ محبت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ سلیم کی شادی شاہی وقار کو برقرار رکھتے ہوئے کی جائے۔ دوسری طرف وہ انارکلی کو بھی بہت زیادہ پیار کرتا تھا۔ اُسے بھی اپنی ہی اولاد سمجھتا تھا۔ چنانچہ سلیم کو اُس خوشنما پھول "انارکلی" کے گرد چکر کاٹتے ہوئے دیکھ کر وہ بہت زیادہ متاثر ہوا۔ گو وہ بڑی آسانی کے ساتھ سلیم اور انارکلی کا بیاہ رچا سکتا تھا لیکن اُس غلام لڑکی کا درباری مرتبہ آڑے آ رہا تھا۔ اُس نے سوچا "ہو سکتا ہے کہ شادی کے بعد یہ لڑکی شاہی خاندان کی رسوائی اور تباہی کا باعث بن جائے۔" اتنا کچھ سوچنے کے باوجود بھی اکبر کا دل انارکلی کی طرف سے میلا نہ ہوا۔ وہ سب کچھ بھول بھال کر انارکلی سے پہلے ہی کی طرح محبت کرتا جا رہا تھا۔ اُس نے اپنے سلوک اور مہربانیوں میں کوئی کمی نہ آنے دی۔ بیرم خاں اپنی ناکامیابی دیکھ کر جل اٹھا۔ اس ناکامی نے اُسے اور زیادہ غلط فہمی میں مبتلا کر دیا۔ اُسے سچ مچ یقین ہونے لگ گیا کہ شاہی دربار سے اُس کا اثر و رسوخ دھیرے دھیرے فنا ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ وہ بڑی بے چینی کے ساتھ کسی اچھے موقع کی تاک میں رہنے لگا۔

سلیم اور انارکلی دونوں بیرم خاں کی خوفناک سازش سے بے خبر تھے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ وزیر اعظم کی خونی اور خوفناک آنکھیں اُن کی ہر حرکت کو بھانپ رہی ہیں۔ اُن کی معصوم روحیں آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے قریب ہوتی جا رہی تھیں اور وہ تیزی کے ساتھ محبت کی رنگین منزلیں طے کرتے جا رہے تھے۔ اسی اثنا میں شہزادہ سلیم کے سامنے شادی کا مسئلہ پیش ہوا۔ لیکن اس نے شادی کرنے سے صاف صاف انکار کر دیا۔ سلیم کے اس انکار نے اکبر کی پریشانیوں میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ سلیم نے اتنی جرأت کیوں کی؟ اس کی وجہ انارکلی کی محبت تھی جس نے شہزادہ کو عجیب کشمکش و پیچ میں ڈال رکھا تھا۔ ایک طرف محبت تھی اور دوسری طرف والدین کا احترام تھا۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کو ٹھکرا دینا شہزادہ کے قابو سے باہر تھا۔ چار و ناچار سلیم نے اُس وقت تک انتظار کرنا مناسب سمجھا جب تک کہ وہ خود اپنی خواہشات کو پورا کرنے میں آزاد نہ ہو۔

اسی درمیان میں ایک دن شہنشاہ نے، دربار کے اندر رقص و سرود کی محفل رچائے جانے کا حکم دیا۔ عہد مغلیہ میں درباری رقص عام تھا۔ لیکن خاص خاص موقعوں پر تمام وزراء، امراء اور سرداروں کو بھی دعوت دی جاتی تھی۔ رقص و سرود کی محفلوں کے لیے مخصوص ناچ گھر بنائے گئے تھے۔ جن میں بعض اب بھی لاہور، دہلی، آگرہ اور فتح پور سیکری کے کھنڈروں میں موجود ہیں۔ حاضرین کے لیے ناچ گھر کے اندر شاہی ادب و تعظیم کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری تھا۔ معمولی بے ادبی اور بدتہذیبی بھی معاف نہیں کی جاتی تھی۔ اس لیے کہ ایسی تمام حرکتیں شہنشاہ اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔ کمرے کے اندر ایک سرے پر بادشاہ مع اپنے درباریوں کے رونق افروز ہوتا تھا اور دوسری طرف ٹھیک اس کے سامنے ولی عہد دل کی نشست ہوتی تھی۔ ان نشستوں کی پشت پر قد آدم آئینے لگے ہوتے تھے۔ جن کے ذریعہ ناچنے والی کی ہر حرکت کو دیکھا جاتا تھا۔ یہ آئینے کچھ اس حساب سے لگائے جاتے تھے کہ ان میں ناچنے والی کا چہرہ اُس وقت بھی نظر آتا تھا جب کہ اُس کی پشت سامنے ہوتی تھی۔ دوران رقص میں، بادشاہ کے علاوہ کسی اور کے سامنے رقاصہ کا ہنسنا یا مسکرانا سخت جرم تھا

وقت مقررہ پر شہنشاہ، شہزادہ اور دیگر درباری اشخاص تشریف لائے اور حسب مراتب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ ناچنے والیاں یکے بعد دیگرے آئیں اور ناچ کر چلی گئیں۔ انارکلی کا رقص سب سے آخر میں رکھا گیا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ دربار میں متعدد بار رقص کر چکی تھی۔ اور سوائے بیرم خاں کے ہر شخص نے اس کی تعریف کی تھی۔ اس بار بھی وہ اپنا فنی کمال دکھا کر خراج تحسین وصول کر رہی تھی ہر شخص بت بنا ہوا دل ہی دل میں اُس کے شاندار مستقبل پر غور کر رہا تھا۔ لیکن تقدیر کچھ اور ہی بندوبست کیے ہوئے تھی۔ دوران رقص میں ایک بار جب شہزادہ سلیم کے سامنے آئی اُس کے سرخ ہونٹ غیر ارادی طور پر کانپ اٹھے۔ جب شہزادہ سلیم نے اُن آنکھوں سے دیکھا جن میں حسن و محبت کا ایک بے پایاں دریا موجیں مار رہا تھا۔ اس منظر نے انارکلی کو بے خود بنا دیا۔ اُس کے تھرتھراتے ہوئے دل سے محبت کے معصوم جذبات اُٹھے اور تبسم بن کر اُس کے سرخ سرخ ہونٹوں پر چھا گئے۔ جسے شہنشاہ نے بآسانی آئینے کے اندر دیکھ لیا محبت کے پاک ولولوں سے کھیلتے ہوئے معصوم انارکلی کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ شاہی احکام کی خلاف ورزی کر رہی تھی۔

رقص و سرود کی محفل ختم ہو گئی۔ اکبر اپنی خوابگاہ میں چلا گیا لیکن کہا جاتا ہے کہ اُسے رات بھر نیند نہ آئی۔ بیرم خاں نے جب یہ خبر سنی تو مارے خوشی کے اچھل پڑا۔ اُسے اپنی مراد پوری ہوتی ہوئی نظر آئی۔ صبح تڑکے اُس نے بادشاہ کے پاس پہنچ کر عرض کیا: "جہاں پناہ

ایک معمولی کنیز نے شاہی حکم کی خلاف ورزی کر کے حضور والا کی بہت بڑی بےعزتی کی ہے۔ میں جانتا ہوں۔ جہاں پناہ کو وہ اپنی اولاد سے زیادہ پیاری تھی لیکن ایسی حالت میں اگر اسے سزا نہ دی گئی تو دارکین سلطنت آپ کے متعلق کیا خیال کرینگے۔ عالی جاہا! کیا آپ چاہتے ہیں کہ خاندان مغلیہ کے زرین تخت وتاج پر ایک درباری کنیز قابض ہو شہنشاہ کے ہوتے ہوئے اُس غلام لڑکی کی یہ مجال کہ ولیعہد کے سامنے مسکرائے!!!" اتنا کہہ کر بیرم خاں نے وہ حکم نامہ پیش کیا جس پر انارکلی کے لیے سزا تجویز کی گئی تھی۔ اکبر نے، مجبور ہو کر کانپتی ہوئی انگلیوں سے اُس حکمنامہ پر دستخط کر دیا۔ دستخط کرتے وقت اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ اس لئے کہ جن ہاتھوں نے انارکلی کو اتنے نازونعم سے پالا تھا۔ آج وہی ہاتھ اُس کی موت کا حکم صادر کر رہے تھے۔ محبت اور قانون کی اس بھیانک جنگ نے اکبر کو بہت دنوں تک پریشان رکھا۔

بیرم خاں نے تمام انتظامات پہلے ہی سے مکمل کر لیے تھے۔ اُسے ڈر تھا کہ دیر ہونے میں شاید شہنشاہ اپنا ارادہ بدل دے چنانچہ اُس نے محض ایک گھنٹہ کے اندر ہی اندر انارکلی کو محل سے باہر نکال لیا۔ انارکلی آنے والے حادثہ سے بالکل بے خبر تھی۔ وہ خوشی خوشی بیرم خاں کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ اُسے ایک پالکی کے اندر وہی کہار لیے جا رہے تھے جنہوں نے ایک دن اُسے ڈاکوؤں کے ہاتھ سے چھینا تھا۔ انارکلی کے تعجب کی انتہا نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ اُس کے سامنے دیوار سے لگ کر شاہی گورکن کھڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر بے گناہ کنیز گھبرا اٹھی اور بیرم خاں سے اپنے یہاں لائے جانے کا سبب پوچھا۔

"اے غلام لڑکی! درباری علماء نے تمہارے لیے موت کی سزا تجویز کی ہے۔ قدم آگے بڑھا۔ وہ دیکھ سامنے بھنگ کا ایک پیالہ رکھا ہے اُسے اٹھا اور پی جا تاکہ تجھے نیند آ جائے۔ جلدی کر یہ شاہی حکم ہے" ظالم وسفاک بیرم خاں نے گرجتے ہوئے آگے بڑھ کر حکم نامہ دکھایا۔

مجبور و ناچار انارکلی نے، جو شہنشاہ کا حکم سر اور آنکھوں پر رکھنے کی عادی تھی۔ قدم آگے بڑھا کر بھنگ سے لبریز پیالہ (جو دراصل افیون تھی) اٹھایا اور غٹاغٹ پی گئی۔ پینے کے دوسرے ہی لمحہ اُس کے چہرے اور ہونٹوں کی تمام دلکشی کافور ہوگئی۔ گدرایا ہوا سرخ جسم سیاہ پڑ گیا۔ حسن وجوانی کا وہ خوبصورت مجسمہ، جس نے اکبر، شہزادہ سلیم اور تمام درباریوں کو دیوانہ بنا رکھا تھا، بیرم خاں کے ہاتھوں مٹی کے ڈھیر میں چھپا دیا گیا۔

حسن نجمی (سکندرپوری) گھوڑگیور

غزل

یہ بدلہ ملا ہے دورِ وزہ ہنسی کا کہ تا عمر آنسو بہاتا رہوں گا
نہ مٹنے کا دل میں یقیں لیکے پیہم نقوشِ محبت مٹاتا رہوں گا

یہ معراج ہے جذبۂ بندگی کی گوارا ہے تلخی مئے زندگی کی
غمِ دورِ فانی فراموش کرکے میں ہر جام پر مسکراتا رہوں گا

محبت کی ناقدردانی پہ ہمدم یہ قدرت سے ہم کو سزائیں ملی ہیں
دعاؤں سے بیگانے بنتے رہیں گے میں غیروں کو اپنا بناتا رہوں گا

وہ ہنسنے کی کوشش میں روتے رہینگے مرا خون دامن سے دھوتے رہینگے
میں ہنستا رہونگا ہنساتا رہونگا غمِ زندگانی چھپاتا رہوں گا

وہ تجدیدِ الفت کا ارمان لیکر مسلسل میری جستجو میں رہیں گے
میں قصرِ وفا سے ابھرنے کی خاطر ہمیشہ نگاہیں چراتا رہوں گا

وہ میری محبت کا دعویٰ کرینگے میری دوستی کا وہ جب دم بھرینگے
تو ماضی کے زخموں کو بھرنے کی خاطر انہیں اجنبیت جتاتا رہونگا

مگین آنکھوں میں کچھ التجائیں وہ رنگین ہونٹوں پہ خاموش آہیں
مرے دل میں کتنی ہی ہلچل مچائیں مگر ان سے دامن بچاتا رہوں گا

مرے درد کی ترجمانی کریں گی مرے حال پر خوں فشانی کریگی
وہ آنکھیں بہت مہربانی کریگی مگر ہاتھ سے جب میں جاتا رہوں گا

اندیشہ ہے گا کہ وہ بے وفا ہیں مگر دل سمجھتا ہے راحت وہ کیا ہیں
اس عقیدت سے مجبور ہو کر اسی نام پر سر جھکاتا رہوں گا۔

رضیہ بیگم راحت

غزل

ہر لحظہ آہ آہ کیے جا رہا ہوں میں
یہ عشق میں گناہ کیے جا رہا ہوں میں

اُن کی طرف نگاہ کیے جا رہا ہوں میں
اک جرم بے پناہ کیے جا رہا ہوں میں

آتا ہے بار بار زباں پر کسی کا نام
پر لطف یہ گناہ کیے جا رہا ہوں میں

ہر انقلاب سرگرمیاں ترے حضور
غم سے ترے نباہ کیے جا رہا ہوں میں

تو نے نگاہ پھیر کے بخشے جو تھے مجھے
وہ داغِ مہر و ماہ کیے جا رہا ہوں میں

از فرش تا بعرش تری جستجو بجز
ہر شے کو گردِ راہ کیے جا رہا ہوں میں

شکرِ غمِ فراق اگر جرم ہے تو ہو
یہ جرم گاہ گاہ کیے جا رہا ہوں میں

کیا حسنِ ماسوا سے مجھے واسطہ، مگر
تیرے لیے نگاہ کیے جا رہا ہوں میں

کونین بھی قبول نہیں ہے ترے بغیر
کونین کو گواہ کیے جا رہا ہوں میں

بت خانۂ حیات کے ہر گوشے میں عزیز
دیدارِ لا الٰہ کیے جا رہا ہوں میں

عزیز اللہ عزیز

سیمابی اسلوب نقد کی قلعی کھل گئی

از جناب مولوی سید محمد منظور الحق ابوالجود حسینی الواسطی جود رویائی جمشید پور

قسط (۱)

پچھلے دنوں یاد رہا اطلاعات عامہ کے سلسلے میں آگرہ قصر الادب سے ادبی فضائے استعلا پر خود جناب مدیر رسالہ نے اپنی ذمہ دارانہ حیثیت کے زیر اثر بزعم خویش ایک خطر انگیز خبر کا نشر (براڈ کاسٹ) کیا تھا جو کسی زمانۂ انقلاب کی واہی افواہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھی۔ بعین وقت پر واقف اس سے ہم بھی ہو چکے تھے یعنی متوج ہوا کے طوفان بدتمیزی کے جو طرد تھپیڑے کھائی ہوئی زیر عنوان شعاعات نوبر کی شکل میں آدارہ اکناف ملک ہوئی تو ہماری نظر سے بھی گذری تھی مفہوم اس کا یہ تھا کہ ان کے (سیمابیوں کے) کسی مزعومہ فتنہ کا راستہ راندیر سے بجنور تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کی ایک شاخ جمشید پور بھی گئی ہے جہاں بے علمی اور بے کمالی کی سرحدیں آپس میں ملجاتی ہیں۔ لیکن باور فرمائیے کہ طیارہ تحقیق و تصحیح سے نکلا ہوا ایک ہی بم اس تمام محاذ کو درہم برہم کر دے گا۔ شک نہیں ان کے ہمخیالوں کے لئے بات بڑی دل خوش کن حوصلہ بالا اور امید افزا تھی ضرور باور کی گئی ہوگی لیکن ادہر بھی اسے اگر کوئی اہمیت دی جاتی تو خواہ مخواہ ہماری مرعوبیت اور سراسیمگی پر قیمتی کردار کا حمل کیا جاتا چنانچہ کوئی پرداعمل میں نہیں لائی گئی اور صبر و قرار کیساتھ صرف انتظار کیا گیا اور دفعتاً استغنا ہی کو مناسب فیصلہ قرار دیا۔ کوئی منظم حلقہ یہ خیال نہ کرے کہ تنظیم کی رازدارانہ کارفرمائیوں سے دوسرے بوجہ بے تعلقی آگاہ نہیں ہوتے۔ نہیں بلکہ سب جانتے اور ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

کا خیال رکھتے ہیں۔ چونکہ عام اخبار دں کی کیفیت بطور اشاعتی روزمرہ کے ہمیشہ احتمال صدق و کذب رکھتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جیسے وہ تمام تر راست و درست نہیں ہوتیں قطعاً سبکی سب غلط اور بے بنیاد بھی نہیں (ہوا کرتیں) چنانچہ مدیر شاعر کے شہرت و نمود طلب نشر و بلند آہنگی کے مطابق قصر الادب آگرہ کے اڈے سے بشکل شاعر دسمبر اس تحقیق و تصحیح کے ایک خیالی طیارے نے پرواز کی اور حسب مثل مشہور یک شد دو شد ایک کی جگہ اس سے دو بم گرے ایک متھرا کے کارخانے کا بنا ہوا دوسرا خاص آگرہ ادب امپیریل ورکشاپ کا تیار کیا ہوا مگر ان اصحاب کے حق میں اظہار تاسف کیے بغیر ہم نہیں رہ سکتے کہ دونوں کے دونوں رنگین دھوکے اور فریب آرزو کے سوا کچھ نہ تھے خصوصاً تحقیق تصحیح کی روشنی جس بم کا لقب تھا وہ دوسرے کی نسبت بھی بودا اور پھُس پھُسا ثابت ہوا

کاغذی خول میں تھی بند ہوا تھوڑی سی جس کو بم تم نے کہا تھا وہ پٹاخا نکلا

قارئین کرام گھبرائیں نہیں صبا صاحب کے ہوا بازانہ مشق کی آگے چل کر ابھی گرد اڑی جاتی ہے۔

اجمال بالا کی تفصیل یہ ہے کہ رسالہ شاعر مجریہ دسمبر میں بزیر عنوان کمالات کمالی تحقیق و تصحیح کی روشنی میں شائع ہوا ہے جو صبا نامی کسی صاحب متھراوی کی دماغی کاوش اور اپج کا نتیجہ ہے۔ قبل ازیں کہ یہ بتایا جائے اس روشن عنوان کے پردے میں موصوف نے اپنی کوردماغی و تاریک نگاہی کی کیا کیا درخشانیاں پیش کی ہیں۔ یہ ظاہر کر دینا بھی خالی از لطف نہ ہوگا کہ بفضل ایزدی آپ اپنے نام کے ساتھ لفظ مولوی کا بھی دم چھلا رکھتے ہیں یعنی آپ شاعر ہی نہیں بلکہ مولوی بھی ہیں اور چونکہ بزعم خود بڑی قابلیت اور تبحر علمی کے مالک ہیں۔ اسی لئے اپنی ذمہ داری کی اہمیت محسوس کرتے ہوئے جناب نے نظم موحل اعظم کے ناظم کی دکالت میں یہ تنقیدی مقالہ لکھ کر فریضۂ منصبی سے سبکدوشی حاصل کی ہے

سہولت فہم کے لئے مضموں کا یوں تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ جزو اول تمہید ۔ ۔ ۔ جزو دوم۔ تنقید۔ حصہ تمہید میں ہندوستان

کی بدذوقی اور ادبی انحطاط کا ماتم فرماتے ہوئے انضباط ادب کے معقول انتظام کی عدم موجودگی سے فطری و غیر فطری شعرا و ادبا کے درمیان حد امتیاز قائم نہ ہو سکنے کا رونا رویا ہے جو ایک حد تک صحیح بھی ہے۔ اب کوئی نقاد سے پوچھے کہ جب آپ کے نزدیک ہندوستان کی بدذوقی اور ادبی انحطاط مسلم ہے اور ساتھ ہی آپ کو یہ بھی تسلیم ہے کہ یہاں انضباط ادب کا کوئی معقول انتظام نہیں تو پھر فطری و غیر فطری شاعر یا ادیب کے معلوم کرنے کا معیار خود رائی اور خود پسندی کے سوا آپ کے پاس کیا باقی رہتا ہے جس کی زد سے خود جناب عالی بھی محفوظ نہیں رہتے۔ علاوہ ازیں ادبی قادر انداز دست و بازو سے جناب نے یہاں ایک تیر اور چلایا ہے کہ "ان ہرزہ سرایان ادب میں زیادہ تر وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی ادبی بے مائیگی اور ذہنی پستی کا پردہ رکھنے کے لیے نقد و تنقید کی آڑ لے لیتے ہیں۔ . . ." اب اپنے اس بیان کو ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ اس صورت میں آپ کی تنقید کی کیا حیثیت رہتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر صبا صاحب کی تنقید کو جنون شہرت اور خبط نام و نمود سے انہیں کی تشخیص و تجویز کے مطابق تعبیر کیا جائے تو کیا بیجا ہے۔ جبکہ خود ان کی تنقید ان کی علمی و فنی بے بضاعتی اور ادبی بے سرمائیگی کا آئینہ ہے جس کو تفصیل کے ساتھ ہم حصۂ تنقید میں واضح کریں گے اور یہ دکھائیں گے کہ موصوف نے اپنی ادبی و تنقیدی ہرزہ سرائی سے اپنی ذہنی بے سرمائیگی کو تنقید کی آڑ میں کیونکر چھپایا ہے اور اپنے دماغی زائیدہ گندے افکار سے دنیا کو کس طرح ناپاک اور آلودہ کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ نہ صرف اس قدر بلکہ اپنے ہی پھینکے ہوئے تیر کا آپ خود نشانہ بنے ہیں۔

رہا آپ کا تجزیہ تو یہ محض بے سود اور سراسر غیر مفید ہے کیونکہ چند نفوس جو آپ کے نزدیک صحیح معنوں میں خوشگوار اور بہترین شعرا و ادبا کہلائے جانے کے قابل ہو سکتے اور ان کے کارنامے سرمایۂ علم و ادب کے لیے موجب فخر و ناز قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ ممکن ہے دیگر حضرات و دیگر صاحبان علم و فن اور اہل دانش کے تجزیہ و انتخاب میں غلط گو اور بدترین شعرا و ادبا کہے جائیں اور آپ ہی کے مجوزہ و محررہ خطابات خود ساختہ۔ بندگان شہرت فراعنہ ادب اور داعیان نقد سے نوازے جانے بلکہ مستحق خیال کیے جائیں۔

اس کے بعد جناب سیماب صاحب کی نظم موحد اعظم کی تعریف و تعارف میں بہت کچھ فرماتے ہوئے اس سے اختلاف رکھنے والوں کی جانب تک بنائے تنقیص فرمائی ہے۔ بخوف طوالت عبارت کا وہ حصہ نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ہمارے آئندہ جوابی فقرے میں خط کشیدہ الفاظ جناب نقاد ہی کے خاص ہونگے جو تعریف اور تنقیص کے مواقع میں استعمال فرمائے گئے ہیں

اس میں شک نہیں کہ نظم موحد اعظم کی جلوہ گستری آپ اور تمام شاگردان مولانا سیماب کے لیے باعث فخر و ناز ہے اور ضرور ہونی بھی چاہیئے۔ رہا اس نظم کا اصلاحی اعتبار اور گرانقدر حیثیت اس کی لطافتیں اور ان کی دل روشن کن حقیقت نما آئینہ داری تو حضرت مولانا کمالی مدظلہ العالی کی نظم روشن نے آسمان حق و صداقت پر مہر نیمروز کی طرح تاباں و درخشاں ہو کر اپنی لازوال ضیا پاشیوں سے آفاق عالم کو وہ معمورۂ نور بنا دیا کہ باونی تامل باطل سے حق ممیز ہو گیا اور موحد اعظم کے کل پہلو سطح عام پر بالکل بے پردہ نظر آنے لگے اور ان کا ہر مفہوم اپنی اصلی ہیئت اور حقیقی حیثیت کے ساتھ پدیدار و عالم آشکار ہو گیا۔ طلسم لفاظی کی اس شکست سے خود صدائے اعتراف یوں بلند ہوئی کہ ع برعکس نہند نام زنگی کافور۔ بایں ہمہ ہمارا یہ امید کرنا بیجا ہوگا کہ آپ یا آپ کے ہمخیال اپنی بات کی پچ کرنے سے ایک لمحہ کے لیے بھی باز رہیں۔ کیونکہ جن کے دل و دماغ میں الحاد و زندقہ کا خبیث مادہ مجتمع ہو وہ ایسی ہی لایعنی باتوں کو پسند کیا کرتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ روز اول سے آج تک ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور شاید تاقیام قیامت یہی ہوتا رہے کیونکہ جن طبائع میں باطل پسندی اور جن دماغوں میں غلبۂ شیطنت سے بے حسی پیدا ہو جاتی ہے وہ ہمیشہ اپنی کور چشمی سے نور کو ظلمت، ظلمت کو نور، دن کو رات اور رات کو دن ہی بتانے اور حقیقت کی ضو باریوں کے مقابلہ میں شپرہ چشمی سے کام لیتے رہے ہیں۔ پھر اس عام اصول کے ہوتے ہوئے آپ کس طرح قائل در معقولات سے رکتے۔ آپ تو حضرت مولانا کمالی مدظلہ العالی یا ان کے ہمنوا علمائے حق ہی کو کچھ کہہ رہے ہیں آپ کے قبلہ استاد مولانا سیماب صاحب نے تو خدائے قدوس کی شان میں بھی شیطان کی وکالت کرتے ہوئے یہ فرما دیا

یہ کہا محبوب دی قدرت نے اس پر گر ہی — وہ یہ کہتا ہی رہا رب لما اغویتنی

بنا بریں آپ نے اپنے بیچارے ادب کا احیائے سنت کیلئے جل بھن کر یہ کہدیا تو کیا مضائقہ ہے کہ "لعض کر ذوقوں کو شعلہ زیر پا بنا کر خاکستر بھی کر دیا ہے نظم کا اس میں کوئی قصور نہیں ہو بجا ہے۔ نظم کا اس میں کیا قصور ہوتا بلکہ ناظم کا۔ کیونکہ نظم بیچاری خود تو نظم ہوئی نہیں گئی۔ رہی کر ذوقی کی نسبت تو وہ ابھی تنقید میں آئی جاتی ہے خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ اس کا اہل کون ہے

"قرینہ ہے کہ ۳۱ اکتوبر سنہ کے اخبار مدینہ میں جو ایک نظم حضرت مولانا کمالی مدظلہ العالی کی "احترام حضرت آدم اور شاعر کا موحد اعظم" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی اس کے متعلق جناب صبا فرماتے ہیں کہ آپ کا یہ منظوم تبصرہ سراپا گونگے بہرے کا خواب ہے" بیشک مگر کن لوگوں کیلئے، جن کے حق میں خدائی فیصلہ ہے کہ ختم اللہ علی قلوبھم وعلی سمعھم وعلی ابصارھم غشاوۃ۔ جو حق بات کو سمجھنا تو کجا سننا بھی نہیں چاہتے۔ پھر آپ جیسے لوگوں کے لیے ایسی نظم جس کے مضامین عین قرآن و حدیث کے مطابق ہوں ضرور بار سماعت و بصارت ہو سکتی ہے لیکن صبا صاحب کی یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ جب یہ نظم گونگے بہرے کا خواب ہے تو پھر اس کو منظوم تبصرہ کیسے کہدیا اور جو شعر مذہبی تعبیری نہیں تو آپ تنقید کیا کرنے بیٹھے ہیں۔ کیا اسی کو بدحواسی یا بددماغی نہیں کہا جاتا؟

جس خوش فہم کو اتنی بھی خبر نہیں کہ مولانا سیماب صاحب کی نظم حضرت مولانا کمالی کی نظم کے ساتھ کس مصلحت سے منظم کی گئی ہے اور کس نے کی ہے وہ مدیر مدینہ پر سفارش دعا کا طنز اختیار نہ کرے تو اور کیا کرے۔ ٹاٹ اور مخمل کی تمثیل بے محل نہیں کہی جا سکتی کیونکہ اظہار فضیلت کے لیے جناب کے حق میں طغرائے امتیاز ہے

یہ نظم جناب سیماب کی نظم کے بالمقابل بغرض اصلاح اعتقاد تھی لہذا جوابی نظم کے ساتھ مناسبت ملحوظ رکھتے ہوئے اولین اطراف صفحات پر جناب سیماب صاحب کی نظم رکھی گئی تاکہ قارئین کرام اس مقابلے سے بآسانی دونوں نظموں کے مفاہیم کو خوب سمجھ کر کوئی صحیح نتیجہ قائم کر سکیں۔ چنانچہ رسالہ جدید اردو میں بھی اس کی اشاعت اسی طرح ہوئی ہے اور اور جتنے رسائل و اخبارات کو یہ نظم بھیجی گئی تھی اسی صورت میں ارسال کی گئی تھی۔ اس جگہ اس امر کا ذکر کر دینا بھی کچھ کم باعث تفنن طبائع نہ ہوگا کہ مدینہ کے جس مختصر نوٹ کا صبا صاحب نے اس سفارشی فقرہ میں اشارہ کیا ہے مقام صد تشکر ہے کہ اسے گونگے بہرے کا خواب نہیں فرمایا تاہم اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی آرزوئے خام لیکانے میں انتہائے خوش فہمی کا ثبوت دیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے "وہ تو عادی مدیر مدینہ کو جنہوں نے علامہ سیماب کی نظم کو ساتھ میں شائع کر کے کمالی صاحب کے ٹاٹ میں مخمل کا پیوند لگا دیا ہے" حالانکہ اس مختصر نوٹ میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو اس بات پر دلالت کرتا ہو کہ نظر بمصلحت سیماب صاحب کی نظم کو خود ادارے نے پہلو بہ پہلو درج کیا ہے۔ جب ایک اردو اخبار کے کسی کالم کا یکسطرہ فقرہ سمجھنے میں جناب نے یہ قلابازیاں کھائی ہوں تو نظم احترام حضرت آدم کا طولانی مضمون دریافت کرنے میں دیکھنا ہے آپ کو ذہن رسا کی عشق انتقالی اور خداداد ذکاوت کے تنوع کمال کی کیا کیا داد نہ دینی پڑے۔

اور سنئے آپ فرماتے ہیں "کمالی صاحب کی اس چیستان کا بوجھنا تو ویسے بھی بہت مشکل ہے لیکن اگر علامہ سیماب کی نظم ساتھ میں نہ ہوتی تو پھر تو دنیا کی تمام عقلیں مل کر بھی اس ادب کے کوہ خشک سے پانی کی ایک بوند بھی پیدا نہیں کر سکتی تھیں"

شاید اس سے آپ کی وہ سیمابی دنیا مراد ہو جو متعارف دنیا کے جغرافیائی نقشہ سے بالکل علیحدہ کر لی گئی ہے اور جسے جناب شاعر آگرہ (ماہنامہ) کی نیم برہنہ رفیقۂ حیات (تصویر سر ورق) الصدر عنائی کچھ دنوں سے کیفر کردار کی خیارہ کشانہ ادا کے ساتھ مدبہ بالا دونوں ہاتھوں کے سہارے سر سے اونچا اٹھائے ہوئے دم چھلے کیطرح بیچارے شاعر کے پیچھے پیچھے اطراف ملک میں پھرا کرتی ہیں کیونکہ اس ہماری تمہاری دنیا میں کسی نے نظم مذکور کے سمجھ میں نہ آسکنے کی اب تک کوئی شکایت نہیں کی اور تاہنوز اس کے متعذر الفہم ہونے کا ادنی سے شبہ تک پیش نہیں کیا گیا۔ ہاں اس کے برخلاف ادارہ زمزم لاہور کے ذی رائے زباندان ارکان موقر جریدہ صدق لکھنؤ کے فاضل فضیلت مآب مدیر و مالک نیز حضرت مولانا تمنا عمادی مجیبی مدظلہ جیسے ہوشمندوں اور صاحبان عقل و دانش نے اپنے مکاتیب عالیہ میں نظم مذکور اور اس کے ہر ہر لفظی اور معنوی پہلو سے اپنا متفق ہونا ظاہر فرمایا ہے۔ سلاست اور تاثیر کے لحاظ سے اسے ایک بلند پایہ نظم اور نظم گرامی وغیرہ القاب سے مشرف اندوز کیا ہے

آپ نے دیکھا یہ ہیں سیمابی دنیا کی عقلیں اور صبا صاحب کی نقادی حیثیت یا مجنونانہ بکواس۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ صبا صاحب کو جنون دوری کا عارضہ ہے۔ ورنہ حضرت کمالی مدظلہ العالی کی نظم کو کبھی منظوم تبصرہ کبھی گونگے بہرے کا خواب کبھی چیستاں اور کبھی کوہ خشک کہنا

کیا معنی رکھتا ہے۔ ان کی بہکی بہکی باتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بدحواسی کی بڑ ہے اور خود جناب نقاد اس مشہور شعر کے مصداق ہے

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ — کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

رہا صبا صاحب یا کل سیمابی دنیا کی عقلوں کا ملکہ بھی نظم مذکور کے سمجھنے سے قاصر رہنا تو یہ عقلوں کا قصور ہے کسی کے نہ سمجھنے سے خواہ مخواہ کوئی نظم یا نثر بے معنی یا مہمل کیوں ہو سکتی ہے۔ سخت تعجب تو اس بات کا ہے کہ آپ نظم کو سمجھے بھی نہیں اور تنقید بھی فرمانے بیٹھ گئے کہیں نہ ہوا غرض بنا ہی جو ٹھہرے — باد ہوائی باتوں سے بھی رہے؟

آپ فرماتے ہیں "میں ان حضرات کے ہذیان موزوں کو درخور اعتنا تو نہیں سمجھتا لیکن سوچتا ہوں کہ سہ نکوئی با بداں کردن چناں است کہ بد کردن بجائے نیک مرداں"۔۔۔ سبحان اللہ کیا ہوشمندانہ طرز نگارش ہے۔ معلوم نہیں 'ان حضرات' سے آپ کے نزدیک کون لوگ مراد ہیں سچ فرمائیگا اور ذرا ہوش میں آکر جواب دیجئے گا کہ حضرت کمالی مدظلہ العالی کے اوسی تبصرے کی تنقید کی غرض سے جناب نے قلم اٹھایا ہے۔ یا اس زمانے کے اپنے مزعومہ تمام ہرزہ سرایان ادب کا عین عالم بیداری میں خواب دیکھ کر مالیخولیائے مراقی کے غلبے میں یکمشت سبکی تردید کا ارادہ کیا ہے؟ میں تو کہتا ہوں تنقید کی ابتدا ہی میں ٹھوکر کھانا آپ کی روانی طبع کے لیے ایک مبارک فال اور امید افزا شگون ہے۔ اور بتا ہے کہ ہم ایچ میرزوں کو جناب کی ہمہ دانی میں کوئی شبہ ہو لیکن حق یہ ہے کہ تنقید شروع ہوئی ہے نہایت دلچسپ اور مناسب ادا کے ساتھ۔

بیشک کسی کے ہذیان موزوں کے بالمقابل اگر اتنے بھی ہذیان ناموزوں کی مثال پیش نہ کی جائے تو ادب دوست زمانے کو فضیلت وقابلیت کا یقین کیونکر دلایا جا سکتا ہے؟ لاریب کسی نظم کی بابت اظہار خیال کرنے والے میں نثر نویسی کی استعداد و صلاحیت کم از کم اس حد تک ہونی ضروری ہے کہ اپنے ہر فقرے کو باعتبار الفاظ و معانی ایسا پیوستہ سلیس و دلکش اور ذوق افزا بنا سکے آپ بے تکلف ہر کہداں و ہمہ داں کے نزدیک بقول جناب شرمندہ سماعت و بصارت کہا جا سکے۔ ایسے معنوی فقروں کا نمونہ قارئین کرام نے ابھی کچھ پیشتر ملاحظہ فرمایا ایک نمونہ حسن لفظی کا لگے ہاتھوں پڑھ لینے کی سفارش کیے بغیر نہیں رہا جاتا۔

اوپر کہیں لکھا جا چکا ہے کہ حضرت مولانا کی نظم مذکور کے باب میں جناب فرماتے ہیں "کمالی صاحب کی اس چیستان کا بوجھنا تو اب بھی بہت مشکل ہے لیکن اگر علامہ سیماب کی نظم ساتھ ہی نہ ہوتی تو پھر تو دنیا کی تمام عقلیں مل کر بھی اس ادب کے کرہ خشک نہ پانی کی ایک بوند بھی پیدا نہیں کر سکتی تھیں" اس چھوٹے سے فقرے میں بھی کی تکرار حسن خوبی سے اندراج یاب ہوئی ہے اس کی تعریف نہیں کی جاسکتی یہ کیا کم ہے کہ اس تکرار نے مذکورہ فقرے کو۔ بھی۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔ چوچو کا مربہ بنا رکھا ہے۔ اس سے جناب کی پوری تنقید تنی مزیدار ہو گئی ہے کہ شرمندۂ سماعت و بصارت ہونے سے ترقی کر کے منت کش قوت ذائقہ ہونے کا بھی مرتبہ حاصل کر لیا ہے جسے قارئین کرام اپنے کام و زبان کی چاشنی سے محسوس فرما سکیں گے سہ

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا — لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

گذارش ہے کہ جناب نقاد کا یہ سوچنا کہ

نکوئی با بداں کردن چناں است — کہ بد کردن بجائے نیک مرداں

سراسر مہمل ہے۔ مردان آخر میں ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ہم جناب نقاد کی اس دور اندیشی پر احسانمندانہ ہدیہ مبارکباد پیش کرتے ہوئے مطلع کیے دیتے ہیں کہ غفلت شعاری کے زیر اثر ہم نے تا ہنوز کچھ سوچنے کا قصد تک نہیں کیا تھا۔ آپ کی حساس دماغی نے ہمیں بھی چونکا دیا۔ اب اطمینان بہ یہاں بھی بقول سعدی سوچ کر طے کر لیا گیا ہے کہ "کلوخ انداز را پاداش سنگ است"۔ مبادا آپ اور وں کا منہ بند کرنے والے اپنی بے لذ باتوں کو سوغات اور منقراضی پائیں۔ بہرحال ہم خدمت کے لیے تیار ہیں۔ جس کا کھانا اور کھلوانا تو اپنے وقت پر خود ہی ظاہر ہو جائے گا۔ دیکھئے کس کس ذات شریف تک یہ نوبت شرفیاب پہنچتی ہے۔ ضرور اس منظوم تبصرے کو آج ہی آپ نہ صرف اپنی تحقیق و تصحیح کی روشنی میں بلکہ کدو کاوش کی خوردبین سے بھی وقت نظر کو کام فرما کر دیکھ لیجئے پھر ملاحظہ فرمائیے کہ آج ہی کے جناب میں ابھی اطلاع۔۔۔ ہو جاتا ہے کہ جناب بار بار تحقیق و تصحیح کی روشنی فرماتے ہیں حقیقت میں وہ اس زمانہ جنگ و جدال کی (کمپلیٹ بلیک آؤٹ) مکمل تاریکی کا نمونہ ہے

اب اصل جواب کا دوسرا حصہ تنقید کا یہاں سے آغاز ہوتا ہے اور جناب صبا صاحب اس منظوم تبصرے کا ترتیب وار ایک ایک شعر نقل کر کے حسب عادت کچھ چینوں کو بے روز گار مظاہرہ کرتے ہیں۔

بند اول

بہوش اے آنکہ بدمستئ پندار تخیلی — بشعر اندر گمانداری خداوندی کہ جبریلی
بیا کردی چہ ایں ہنگامہ زیر گنبد نیلی — مسلمانی و مدحت گستر دیو عزازیلی

فرماتے ہیں "آپ یہ نہ سوچتے کہ شاعر نے پہلے مصرعہ میں بدمست کہہ کر دوسرے میں گمانداری کا لفظ کیوں استعمال کیا جو ہوش کا ثبوت ہے یہ تو گھری بات ہے کمالی صاحب کا موتا ان "بشعر اندر" کی ترکیب اور خداوندی کے بعد "جبریلی" کہنے سے ظاہر ہو رہا ہے تیسرے مصرعہ کی سستی پر تبسم نہ فرمائیے ملہ بطور ہمدردی اصلاح کر دیجیے ع چہ ہنگامہ بیا کردی بزیر گنبد نیلی۔ اب مصرعہ خوب چست ہو گیا لیکن کمالی صاحب شاید نہ مانیں۔ چوتھے مصرعہ میں "دیو عزازیلی" لیلۃ القدر کی رات کا جواب ہے"

جناب صبا صاحب کو اس کا جواب سننے سے پہلے معروضہ ذیل بتوجہ پڑھ لینا اور یاد رکھنا چاہیئے کہ حضرت مولانا کمالی مدظلہ العالی کی نظم احترام حضرت آدم، خاکسار ہی نے مختلف اداروں کو روانہ کی تھی۔ مدینہ میں آغاز نظم سے پہلے عنوان ہذا کے ماتحت مختصر نوٹ بھی جناب نے ضرور پڑھا ہوگا وہ خادم ہی کا ناچیز نامہ ہے جس کا سب سے آخری فقرہ جو اصل عبارت خط سے بالکل علیحدہ محض اطلاع عام کی غرض سے اور سیماب صاحب کی نظم موحد اعظم کے تعارف کے لئے پیش کیا گیا ہے۔ بالکل اخیر میں لفظ مدینہ، دیکھ کر آپ نے اسے ادارہ ہی کا نوٹ خیال کر لیا۔ اس چھوٹے سے فقرے کا سرخی (اشارہ) کتابتی مسامحات میں سے ہے جو قلمبند نہیں ہوئی۔ اگر آپ اس تحریر کے مرسل یعنی عاجز کا نام بھی پڑھنے کی ذرا سی تکلیف فرما لیتے اور مستحضر فی الذہن رکھتے تو اس فروگذاشت پر بے تامل مطلع ہو سکتے تھے مگر آپ کی قوت دماغیہ پر تو کوئی نگے بہر کیا خواب طاری تھا آپ ایسا کیوں کر سکتے تھے۔ اب دیکھنا ہے کہ نظم کے باقی قطعات کی موشگافیوں میں کیا کیا داد فراست دی جائے گی کیونکہ بسوء اتفاق کاتب مدینہ سے مصالحت و تصحیف بہت وقوع میں آگئی ہے جسے مستقل جدول کی شکل میں لکھ کر بتاریخ ۲۶ راکتوبر ادارہ مدینہ کو اشاعت تصحیح کے لیے روانہ کر دیا گیا تھا افسوس ہے وہ جدول چھپا نہیں حالانکہ اس سے کوئی نقصان نہیں کیونکہ وہ نظم مدینہ کے علاوہ معزز ماہنامہ جدید اردو کلکتہ مجریہ ماہ نومبر میں بھی شائع ہو چکی ہے

ہاں تو محولہ عریضہ میں ہم نے جناب سیماب کو ایک کہنہ مشق شاعر کہا ہے۔ اگرچہ نظم موحد اعظم میں اعتقادی خرابیوں سے گذر کر چند فنی خامیاں اور ادبی بے ضابطگیاں بھی ملتی ہیں کسی کے کہنہ مشق مضمون آفریں خلاق معانی نازک خیال مان لینے کا یہ منشا نہیں ہوتا کہ اس سے اغلاط کا صدور اتفاقی ممتنع ہو یا اسے جمیع مکارم اخلاق و محامد اوصاف میں بے ضرورت وحید العصر مان لیا جائے۔ لیجئے اب اپنی تنقید کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔

یہاں بدمست سے مراد حد درجہ کا مغرور و متکبر شخص ہے جو مئے پندار تخیلی سے ظاہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر باکمال نے اپنے دوسرے مصرعہ میں گمانداری فرمایا چونکہ گمان متکبرانہ خیال کو بھی کہتے ہیں۔ یقین نہ ہو تو اشعار ذیل ملاحظہ فرمائیں۔

ہر کس کہ بخویش گمانے دارد — چوں در نگری عیب نہانے دارد (غنی)
تو خود را گماں بردہ پر خود — انائے کہ پر شد دگر چوں برد (سعدی)
کیا اک آن میں تیغ قضانے اس کے دو ٹکڑے — گماں ہی رہ گیا دشمن کو آتش اپنے جوشن کا (آتش)

ان تینوں شعروں میں گمان متکبرانہ خیال کے معنی میں آیا ہے۔ حضرت کمالی نے جناب سیماب کے حسب وصف جمیل کو تخیل کی بدمستی پندار سے تعبیر فرمایا ہے وہ موصوف کی ذات میں تحقق بھی ہے اور اس کا اعتراف خود جناب موصوف کے بعض تعلی آمیز اشعار سے بھی دریافت ہوتا ہے ملاحظہ ارشاد ہے ؎

خودی و بیخودی سیماب کچھ مجھ میں نہیں لیکن — مرے پندار میں کوئی جھلکتا ہے خدا ہو کر

یقینی امر ہے کہ سفر گاہ طلب میں سرگردانی کے وقت ایسی جگہ سے بھی گذر نا پڑتا ہے جہاں حیرت کی فراوانی راہرو کو خودی و بیخودی اور کل تعینات سے ابلہ محض کر دیتی ہے۔ یہی وہ مقام تحیر ہے جہاں سے بہت سی پر پیچ و تاب رہگذریں راست و چپ کو پھوٹ نکلی ہیں جو کسی نہ کسی منزل مقصود تک پہنچتی ہیں۔ اگر کوئی ان سب سے بچ بچا کر آگے بڑھا بھی تو ناگزیر اس دو راہے سے دو چار ہونا پڑتا ہے جو سب سے زیادہ نمودار اور سب سے بڑھ کر سخت آزمائشوں کی جگہ ہے۔ اس کی ایک شاخ شاہراہ عرفان و حقیقت کہلاتی ہے یہ انکسار، بے نفسی، خودداری کی منزلوں سے گذر کر خدا تک پہنچا دیتی ہے۔ دوسری شاخ جادہ حرماں و غفلت ہے جو تکبر، پندار، اور خدا فراموشی تک

مراحل سے ہوتا ہوا وہاں پہنچتا ہے جہاں کوئی غلط حقیقت جدا ہو کر نظر آتی ہے۔

ع مرے پندار میں کوئی جھلکتا ہے خدا ہو کر

مجھے سخت حیرت ہے کہ صبا صاحب جو ماشاءاللہ مولوی بھی ہیں شاعر بھی جب اتنی موٹی سی بات نہ سمجھ سکے تو اور کیا سمجھینگے۔ متکبر و مغرور کیلئے فقدان ہوش کوئی لازمی چیز نہیں ہے ظاہر ہے کہ شراب نخوت کے بدمست میں شیطانی و فرعونی خودسری و خودنمائی کا ہوش ضرور رہتا ہے۔ مگر ایسے ہوش کا ہونا نہ ہونا برابر ہے ؎

از خودی فرعون خود بیں گشت ناری الحذر خودسری و خودنمائی خوش نمی آید ترا (تراب)

بشعر اندر کی ترکیب پر اعتراض مظہر ہے کہ آپ فارسی محاوروں اور ترکیبوں سے بالکل ناواقف ہیں۔ جب قابلیت کا یہ عالم ہے تو پھر حضرت کسی کے کمال کو کیا جانچ سکتے ہیں۔ سنئے۔۔۔۔۔ بشعر اندر کی ترکیب بالکل صحیح ہے۔ اس کی صحت میں اسی کو کلام ہو سکتا ہے جو اساتذۂ فارس کے کلام سے بے بہرہ ہے۔ لفظ اندر کے متعلق مشہور تحقیق ہے کہ "شعرائے متقدمین آنرا ردیف قصائد کردہ اند داز شعرائطا ایں لغت لزوم با است قبل از اندر چنانکہ مؤلف ناصری گفتہ ؎

لالہ بشگفتہ بیں بعنبرش اندر لولو ناسفتہ بیں بشکرش اندر

فردوسی کہتا ہے۔ ؎

گرازندہ آہو بہ راغ اندروں سرائندہ بلبل بباغ اندروں

اور لیجئے ایک مشہور غزل کا مطلع ہے کہ ؎

بیکارم و با کارم چوں مد بحساب اندر گویانم و خاموشم چوں خط بکتاب اندر

پھر اسی غزل کے تمام اشعار میں یہی ترکیب ردیف ہے۔ خیال کرنے کا مقام ہے کہ مثالہائے بالا میں بعنبرش اندر، بشکرش اندر، براغ اندر، بباغ اندر، بکتاب اندر بحساب اندر کی ترکیبیں درست ہیں تو بشعر اندر کا مضحکہ خود اپنی ہنسی اڑوانا ہے یا نہیں۔ خداوند و جبریل کی تقدیم و تاخیر کے حسن کو سمجھنا ان کا کام نہیں جو تحقیق وجود کے مراتب کا کماحقہ علم نہیں رکھتے بقول جامی ؎

اے بردہ گماں کہ صاحب تحقیق وانذر صفت صدق و یقیں صدیقی
ہر مرتبہ وجود حکمے دارد گر فرق مراتب نکنی زندیقی

اصل یہ ہے کہ خداوندی کہ جبریلی کی تقدیم و تاخیر میں جو لطافت ہے اس سے صرف اصحاب فہم سلیم ہی لطف اندوز ہو سکتے ہیں تیسرے مصرعہ کے متعلق یہ فرمانا کہ سست ہے تو درحقیقت مصرعہ ہرگز سست نہیں البتہ اس کے سمجھنے کے وقت جناب کی قوت مدرکہ نے سستی کو کام فرمایا ہے ورنہ ضرور آپ کوئی وجہ بتاتے جبکہ یہ بھی نقاد کا ایک فریضہ ہے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کو اتنی بھی تمیز نہ ہو کہ معمولی معمولی ترکیبوں کو سمجھ سکے وہ بیچارہ کسی مصرعہ کی سستی و چستی کو کیا سمجھ سکتا ہے۔ نکتہ شناس جانتے ہیں کہ سفارش تبسم کی یہ تبسمانہ ادائے خاص بھی منہ چوم لینے کے قابل ہے کیونکہ اس کا مقتضے تمنائے داد در حصول آفریں کی ہوس کے سوا کچھ نہیں سچ ہے کہ ؎

کلیوں نے مسکرا کے کیا ہے سخنے نہال حسن طلب ہے اور یہاں کیا ہے عندلیب

ہمدردی کا شکریہ۔ اصلاح محتاج تعریف نہیں۔ الفاظ وہی ہیں جو پیشتر تھے باستثنائے ایک حرف اشارہ تو عرض ہے کہ جناب نے اسے حذف کر کے کلام میں نقص ضعف پیدا کر دیا۔ اسکا مشار الیہ وہی جناب سیماب کی نظم موجود اعظم ہے۔ تو ضیح ہنگامہ کے لیے اس کا رہنا ضروری تھا۔ دوسرے جناب کی اصلاح میں ہنگامہ کی ہائے مختفی کے ساتھ وزن شعر درست رکھنے کے لیے بے ضرورت حاجت اشباع لازم آتی ہے جو ضابطۂ فن کی رو سے لزوم مالایلزم ہے لیکن آپ کو تو نقاد بننے کی حاجت ہے ضوابط کی نگہداشت سے کیا غرض۔

مصرعہ چہارم میں دیو غزالی کی ترکیب پر لیلۃ القدر کی رات کا مذاق خود جناب کی تاریک دماغی سیاہ باطنی علمی بے بصری اور فہمی کوتاہ اندیشی کی روشن دلیل ہے۔ دیو غزالی میں اضافت توصیفی ہے۔ چونکہ لفظ دیو عام ہے اس کی وضاحت کے لیے لفظ غزالی کو لایا گیا ہے جیسے دیو سپید۔ دیو کالا۔ دیو اسپست دیو یا ذیما۔ دیو کوہ۔ دیو آتش وغیرہ۔ دیو باد وغیرہ کی ترکیبوں سے لفظ دیو کا عام ہونا ظاہر

بند دوم ذرا اسے نظم کی ہیجنری کا کے ہیکا حسن لے تو اپنی کر چکا جی بھر کے اب قند مصری کا حسن لے

بھلے مانس پتے کی بات اگر ہے آدمی اس نے ۔۔۔۔۔۔ نہ رکھ دین الہی سے روا یہ دل لگی اس نے

دوسرے بند کو یوں نوازا جاتا ہے " اے سبحان اللہ ان چاروں مصرعوں کی کون کمبخت داد نہ دیگا پہلے مصرعہ میں کی ۔ کے ، دوسرے میں "اب قدرے مری" قادر الکلامی کا بہترین ثبوت ہیں" جواباً عرض ہے وہ تو وہی کمبخت و بدنصیب نہیں دے گا جو علم و فن کی دولت سے تہی دست اور فہم و فراست سے کوسوں کیا منزلوں دور ہوگا۔ کی ۔ کے اور "اب قدرے میری" اگر قادر الکلامی کا بہترین ثبوت ہے تو فہو المراد مضائقہ کیا ہے ع چشم ما روشن دل ما شاد۔ شعر گوئی کی اتنی بھی قدرت نہ ہو تو کوئی شعر کیوں لکھے لیکن اگر جناب نے اپنی جبلی سفاہت سے یہ بات محل طنز میں فرمائی ہو تو مراد الاعتراض المعنی فی بطن الشاعر کا مرادف ہے ۔ واضح نہیں ہوتا کہ جناب کے نزدیک کی ۔ کے " اب قدرے مری " فرداً فرداً غلط غیر فصیح متروکات فصحا کی فہرست میں محسوب ہیں یا آپ کی یہ غرض ہے کہ پہلے مصرعہ میں کی ۔ کے کا قرب اور دوسرے مصرعہ میں قدرے مری کی ترکیب تنافر یا غرابت وغیرہ عیوب ناروا کا موجب ہے اگر مفہوم آپ کے اعتراض کا یہی ہو تو معاف فرمائیگا ۔ جناب کی فصاحت دانی کا افشائے راز ہوتا ہے ۔ اس صورت کو قادر الکلامی کے منافی خیال کرنا آپ ہی جیسے قابل لوگوں کا کام ہے ۔ ذیل کے اشعار پڑھ کر اپنی تنقید کا مقام متعین کیجئے

۱ ۔ رہ گیا حیرت کے مارے بنکے پتلی دم بخود ۔۔۔۔۔۔ سامنے اس شوخ کی آنکھوں کے جو ساحر گیا ۔ (شوق قدوائی)

۲ ۔ پڑے ہوئے تھے ہزاروں پردے کلیم دیکھو تو جب بھی غش تھے ۔۔۔۔۔۔ ہم اسکی آنکھوں کے صدقے جس نے یہ جلوہ یوں بے حجاب دیکھا (استاد داغ مرحوم)

۳ ۔ آثار نمایاں ہوئے بربادی کے ۔۔۔۔۔۔ کیا کہنے ہیں تقدیر کی صیادی کے (سیماب اکبر آبادی)

مولانا کے پہلے مصرعہ میں کی اور کے میں ہفت حرفی لفظ کا فاصلہ ہے مگر حضرت شوق قدوائی اور استاد داغ مرحوم کے شعر میں چھ اور سیماب صاحب کے شعر میں صرف پانچ حرفوں کا فصل ہے تو گویا آپ کے نزدیک شوق ، داغ اور سیماب بھی غیر قادر الکلام شاعر ہیں

دوسرے مصرعہ میں اب قدرے اور مری تینوں لفظ فصیح ہیں ۔ پہلا تیسرا تو بلا اختلاف سب کے یہاں مستعمل ہیں اور دوسرا بھی عموماً تحریر و تقریر میں کثرت سے لایا جاتا ہے ۔ اب یہ لفظ مہندات میں شامل ہے ۔ کوئی وجہ نہیں کہ اسے نامانوس یا غریب قرار دیا جائے اس جگہ ہم ایک نثر سے شاہد بھی پیش کرتے ہیں ۔ جو ہمارے قول کی صداقت کا کفیل ہے ملاحظہ ہو

عالمگیر ۱۹۲۲ء کے تاریخ نمبر مجریہ اپریل میں بزیر عنوان (ولی عہد کا انتخاب) صفحہ ۱۲۸ کا یہ فقرہ " میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میں اپنے لڑکوں کی طرف سے قدرے بے فکر ہوں " اطمینان رہے مضمون نگار جناب ابو مسلم صدیقی ایم اے ایل ایل بی علیگ مجہول الحال معمولی اور کمنام شخص نہیں نہ خارج از ہندوستان کسی مقام کے باشندے ۔ اردو آپ کی اپنی زبان ہے اور اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ ایک غیر معمولی ماہر ادب ہیں ۔ آپ کو شک ہو تو رسالہ شاعر کے مارچ اپریل اور مئی سن رواں کے صفحات تجزیہ ملاحظہ ہوں جہاں ادارہ شاعر نے خود اسی نمود ارہستی کو ایک اچھا لکھنے والا ادیب فاضل مقالہ نگار کے القاب سے یاد کیا ہے ۔

تیسرے مصرعہ کے متعلق آپ اپنے انداز خاص میں یوں رقمطراز ہیں کہ اس مصرعہ میں تعقید لفظی ہے اور بھلے مانس کے ہوتے ہوئے آدمی کہنے کی کیا ضرورت تھی ۔ سنئے اول تو تعقید لفظی ہر جگہ معیوب نہیں ہوتی دیکھئے مولانا حسرت موہانی حضرت شوق نیموی کی ایضاح سے لکھتے ہیں کہ "اگر لفظ اپنی اصلی جگہ پر نہ ہو تو اس کو تعقید لفظی کہتے ہیں ۔ اردو میں فاعل کو فعل و مفعول سے پہلے اور فعل کو سب سے آخر لانا چاہئے اور نون نافیہ فعل سے پہلے ہونا چاہئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن نظم میں اگر پورے پورے طور پر اس کا برتاؤ کیا جاتا تو شعر کہنا دشوار ہو جاتا ۔ اس سبب سے اکثر جگہ لفظی تعقید معیوب نہیں ٹھہرائی گئی البتہ جبکہ لفظوں کے الٹ پھیر سے ترکیب درست ہو جائے اور نظم میں کچھ خلل نہ ہو تو بے شک معیوب ہے" اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ لفظی تعقید کو ہر جگہ عیب نہیں مانا جاتا ۔ لیکن اگر آپ کے نزدیک لفظی تعقید کوئی ایسی خطا ہے جو قادر الکلام شاعر کو قادر الکلام نہیں رہنے دیتی تو پھر اس کے یہ معنی ہونگے کہ ولی دکنی سے لیکر آج تک کوئی قادر الکلام شاعر ہوا ہی نہیں کیونکہ کسی شاعر کا ایسا کلام نہیں کہ جس میں یہ عیب نہ پایا جاتا ہو ۔ دور کیوں جائیے دیکھئے عزیز دہلوی کا شعر ہے

نور ظلمت کو وہ دانتوں میں لگا کر مِسّی — صورت مردمک دیدہ بہم کرتے ہیں

یہ تعقید لفظی ہے اور زبردست تعقید ہے اور سنئے استاد داغ فرماتے ہیں۔

زمین کے حال پہ اب آسمان روتا ہے — ہراک فراق مکیں میں مکان روتا ہے

اس شعر میں تعقید ہے کیونکہ ہراک کے بعد مکین کو ہونا چاہیئے تھا۔ آپ کی تشفی کے لیے خود جناب سیماب کا کلام بھی حاضر ہے جو باوجود پیغمبر سخن ہونے کے اس سے نہ بچ سکے اور یہ جو آپ کے نزدیک ناقابل عفو جرم ہے سنئے کہتے ہیں

(۱) وہاں اک ترک سجدہ سے ہوئی یہ برہمی پیدا — قضا کتنے ہوئے ہیں تیرے سجدے کر حساب ان کا

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں بجائے ترک یک سجدہ اک ترک سجدہ کہا ہے یہ تعقید ہے اور اسی طرح اس شعر میں

بشر سمجھا نہ اب تک مرتبہ دنیا میں ٹھیک اس کا — کہ ترک شرک و بدعت میں نہیں کوئی شریک اس کا

نہ سمجھا کی جگہ سمجھا نہ لائے ہیں جس کے تعقید ہونے میں شک نہیں بلکہ یہ تعقید ناجائز ہے کیونکہ یہ معمولی الٹ پھیر سے نکل جاتی ہے اور کوئی خرابی بھی نہیں پیدا ہوتی۔

اس تمام تر بیان کا یہ مطلب ہے کہ حضرت کمالی کے مصرعہ مذکور میں جو تعقید ہے وہ معیوب نہیں ہے بلکہ اگر بنظر غور دیکھا جائے تو یہ تعقید ایک خوبی کی حامل ہے۔ رہا یہ کہنا کہ بھلے مانس کے ساتھ آدمی کیوں کہا گیا ہے اس کی وجہ ظاہر ہے کہ شاعر نے پیغمبری نظم کے مدعی کو طنز کی راہ سے بھلے مانس کہہ کر خطاب کیا ہے اور بتایا ہے کہ آدمی کے لیے کیا لازم ہے۔ اس بند کے چوتھے مصرعہ میں درحقیقت پتے کی بات تھی ناصل نقاد سے کوئی بات بنائے نہ بنی تو تنقید کے نام سے بے تکی اڑانے لگے جس کا لاجواب یعنی سرے سے ناقابل التفات ہونا ہمیں بھی تسلیم ہے۔ ناظم کا ارشاد ہوتا ہے ع "نہ کر تکلیف غور و فکر میری بے تکی سن لے"۔ کیا کہنے ہیں صبا صاحب! بے تکی پر داد حاضر ہے۔ شاباش! این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

بند سوم:- یہ دہر آشوب میں مرحیۂ شیطاں کی تشبیہیں — سیہ کاری کی تصحیحیں گنہگاری کی تصویریں

مفاہیم غلط کی پر تکلف طرفہ تہذیبیں — برنگ فلسفہ الحاد پھیلانے کی ترکیبیں

تیسرے بند کی تنقید میں تو جناب نقاد نے اظہار فضیلت کی حد ہی کردی۔ واہ۔ واہ!!! کیا کہی ہے آخر اگرہ اسکول کے مشتے نمونہ از خروارے کہے جانے کے قابل لوگوں میں سے معلوم ہوتے ہیں۔ حکم ہوتا ہے "اس بند میں دہر آشوب کی اضافت مقلوب تصویروں کی عمومیت اور مفاہیم غلط کی طرفہ تہذیبیں وہ بھی پر تکلف کمال نکتہ دانی کی بہترین مثالیں"، گویا دہر آشوب کی ترکیب مقلوب تصویروں کی عمومیت۔ مفاہیم غلط کی طرفہ تہذیبیں وہ بھی پر تکلف آپ کے نزدیک اس بند میں یہی مخصوص لفظی معنوی نقائص ہیں خدا کا شکر ہے پہلے دو مصرعوں کے آدھے آدھے سے زیادہ باقی حصے اور چوتھا مصرعہ کل جناب کی نظر عنایت سے محفوظ رہے ع رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔ مدعا اینکہ موحدانہ نظم میں جناب کو مرحیۂ شیطاں کی تشبیہوں سیاہکاری کی تصحیحوں گناہگاری اور برنگ فلسفہ الحاد پھیلانے کی ترکیبوں کا اعتراف ہے اور ان سب امور کی صداقت میں آپ کو کوئی کلام نہیں البتہ دہر آشوب کی ترکیب مقلوب کے صحیح ماننے میں عذر ہے۔ اس باب میں ہم یقین دلانے کے سوا اور کیا کرسکتے ہیں کہ یہ ترکیب مقلوب ویسے ہی صحیح ہے جیسے جامی علیہ الرحمۃ کے اس شعر میں ع دید جامی ناگہاں آں شکل شہر آشوب رفت — آنکہ روزے چند از سودائے خوباں رستہ بود

شہر آشوب کی ترکیب مقلوب۔ اب ہم حیران ہیں کہ شہر آشوب کے قیاس پر اگر دہر آشوب کی ترکیب مقلوب کو صحیح مان لیں تو یہ بات سمجھنے کی زحمت کون اٹھائے گا کہ دہر آشوب ہے کیا چیز؟ اگر اتنی تکلیف گوارا کرنے پر جناب مستعد ہو گئے تو توقع کی جاسکے گی کہ مصرعہ اولی کا باقی ماندہ حصہ چوتھے مسلم مصرعہ کی طرح بقول حواشتائید بکار مصرف میں آجائے۔ باقی رہا آپ کا تصویروں کی عمومیت اور مفاہیم غلط کی طرفہ تہذیبیں اور وہ پر تکلف کہہ کر ان سب باتوں کو کمال نکتہ دانی کی بہترین مثالیں قرار دینا ہم اسے تنقید تو کیا تعریض بھی سمجھنے کو تیار نہیں ممکن ہے کہ نقادانہ جدت طرازیوں کے جوش و خروش میں کوئی نئی تصنیف فرمایا گیا ہے اگر یہی ہے تو ترشا اگر ملک کی کسی آئندہ اشاعت میں شائع کرا دیجئے تاکہ آپ کی اس دنیا کے نکتہ فہم اصحاب بھی یہ حیثیات اعلیٰ کر کے تحسین و آفرین کے تحفے پیش کر سکیں کیونکہ اس کا سمجھنا ہم جیسے لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے

انکھیں کو دام خواب میں منظر ملے نہ آئنے کا کچھ ہاتھ — مدعا عنقا ہے لیکن ان کی ہر تحریر کا (غالب با تصرف)

(باقی آئندہ)

جدید اردو

اقلیم صحافت کا نیّر ہے جدید اردو
دریائے لطافت کا گوہر ہے جدید اردو

کاشانۂ اردو کا روشن ہے چراغ اس سے
تخئیل کی دنیا میں رہبر ہے جدید اردو

ارباب فصاحت میں کیوں قدر نہ ہو اسکی
گنجینۂ معنے کا گوہر ہے جدید اردو

ہو نوک و پلک ایسی ہوں نقش و نگار ایسے
ہاں شاہد مضموں کا زیور ہے جدید اردو

اللہ رے رنگینی گلہائے مضامین کی
لعل لب خوباں کا ہمسر ہے جدید اردو

اوراق مصوّر ہیں جو اس میں فسانے ہیں
ظاہر ہے کمالوں کا مظہر ہے جدید اردو

ہر نقش اچھوتا ہے ہر رنگ نرالا ہے
کس حسن کی دنیا کا منظر ہے جدید اردو

جو شعر ہے روشن ہے جو نظم ہے تاباں ہے
ہر وصف میں کہتے ہیں بہتر ہے جدید اردو

ہر لفظ میں پنہاں اک خوبی کا خزانہ ہے
پاکیزہ خیالوں کا محضر ہے جدید اردو

جو صفحۂ رنگیں ہے اک کیف کی بستی ہے
ہاں شعر و ادب کا اک دفتر ہے جدید اردو

محمود بنا میکش پرویز بنے ساقی
صہبائے سخن کا اک ساغر ہے جدید اردو

(محی الدین آغر بنگالی)

فلمستان

"معصوم" ——— ایک "نقاد" کی نظر میں!

فضلی برادران لمیٹیڈ کلکتہ کی پہلی فلم "معصوم" کلکتہ میں ریلیز ہوئی اور پہلے ہی روز وہ سب لوگ "گلوب سینما" کی تلاش میں نکل پڑے جو "قیدی" کے ڈائرکٹر کے "نقشِ ثانی" کا انتظار اُسی روز سے کر رہے تھے جس روز اس کا اعلان ہوا تھا۔

"معصوم" کے شائقین میں، میں بھی شامل تھا اور میرے شوق کی وجہ یہ تھی کہ میرے خیال میں جہاں "قیدی" کی کہانی جذباتی اور پُر اثر تھی وہاں ڈائرکشن بھی خوب تھی اس لیے میں "قیدی" کے مصنف کے بڑے بھائی کی کہانی اور مسٹر حسنین کی ڈائرکشن دیکھ کر کسی قطعی نتیجے پر پہنچنا چاہتا تھا۔

لیکن پہلے ایک خاص بات عرض کر لوں۔ اس کے بعد کہانی پر ایک نظر ڈال کر اپنے خیالات کا اظہار کروں گا۔

میں نے پہلے روز، یہ فلم ضرور دیکھی مگر اُس روز اس میں اتنی زیادہ خامیاں تھیں کہ لکھنا بھی مشکل ہے اور شکر ہے کہ کمپنی کے ارباب حل و عقد نے احباب کے مخلصانہ مشوروں پر عمل کیا اور اکثر خامیاں دور ہو گئیں۔ چنانچہ ایک بار اور میں نے اِسے دیکھا اور میرے اخلاص کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے روز کی خامیوں سے قطع نظر کر کے اس فلم پر تنقید کروں جو آجکل دکھائی جا رہی ہے ———

"خان بہادر نور علی کے لڑکے معصوم کو معصوم چھوڑ کر اُس کی ماں سفرِ آخرت اختیار کرتی ہے۔ خان بہادر صاحب دوسری شادی کرتے ہیں، نئی بیگم شروع میں تو معصوم کو بالکل اپنے لڑکے کی طرح رکھتی ہے مگر جب اُس کا اپنا لڑکا (جمیل) ہو جاتا ہے تو لازمی طور پر جو ہونا چاہیئے، ہوتا ہے: پھر دونوں لڑکے جوان ہو جاتے ہیں اور نئی بیگم مختلف طریقوں سے خان بہادر پر اثر ڈال کر اپنے بیٹے جمیل کو ساری جائداد کا متولی بنوا دیتی ہے۔

معصوم کی نسبت اس کی بچپن کی ساتھی ریحانہ سے طے پا چکی ہے مگر ٹھیک شادی کے روز نکاح ہوتے وقت سب کو معلوم ہو جاتا ہے کہ معصوم اپنے باپ کی جائداد کا حصہ دار نہیں ہے بلکہ اُسے صرف گزارہ ملے گا۔ اور ریحانہ کا دنیا دار باپ محض اتنی سی بات پر معصوم سے ریحانہ کی شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے ——— شادی کی محفل دائمی پھوٹ نفاق اور نفرت کی خلیج بن جاتی ہے!

دوسری طرف معصوم اپنی ساری حسرتوں اور تمناؤں کا خون ہوتا دیکھ کر انتقام لینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اور اپنے سوتیلے بھائی جمیل کو اُس کی "بیوی" شاہدہ سے بدظن کر کے ایسی حالت پیدا کر دیتا ہے کہ جمیل، شاہدہ کو قتل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر اپنے دوست حامد کو شاہدہ کا قاتل قرار دے کر عدالت میں اس کے خلاف گواہی دینے جاتا ہے مگر گواہی دیتے وقت اُس کی سوئی ہوئی روح جاگ اٹھتی ہے اور وہ اقبالِ جرم کر لیتا ہے ——— یہ سب دیکھ کر معصوم کی آنکھیں بھی کھل جاتی ہیں اور وہ، اپنے والد کی ساری جائداد ٹھکرا کر ——— جو وہ اب اُسے دے رہے تھے ——— اپنی بیوی ریحانہ کے ساتھ اپنے زورِ بازو سے کمانے کا ارادہ کر کے پردیس کی راہ لیتا ہے ——— بس!"

فلم یہیں ختم ہو جاتی ہے اور دیکھنے والے محسوس کرتے ہیں کہ شاید فلم کٹ جانے کی وجہ سے ایسا ہوا ہے حتٰی کہ ہال روشن ہو جاتا ہے

اب آیئے ایک ایک چیز پر نظر ڈالیے ——— تنقیدی نظر:

کہانی ——— کہانی کا پلاٹ اچھا ہے اور مقصد بھی خوب ہے مگر واقعات الجھے ہوئے، مبہم اور کچھ بے ربط سے بھی ہیں۔ دیکھنے والوں کو بہت سی چیزوں کے بارے میں کچھ بھی بتایا نہیں گیا۔ مصنف نے اس کی پروا کی ہے نہ ڈائرکٹر نے ضرورت سمجھی ہے۔

(۱) دو بھائیوں، معصوم اور جمیل میں سے کسی کا کیرکٹر بھی نمایاں نہیں کیا گیا پوری فلم دیکھنے کے بعد بھی یہ کہنا مشکل ہے کہ معصوم شریف

اور نیک دل تھا یا خود غرض اور بد باطن؟

اگر مصنف کے خیال میں دنیا نے اُسے بُرا بننے پر مجبور کر دیا تھا تو مصنف نے دنیا کی اِس بے انصافی سے پہلے اسے اچھا کیوں نہیں دکھایا؟ اُس کے گھر میں، گھر سے باہر کہیں بھی تو اس کے خیالات، اُس کی فطرت، اُس کے قول و عمل کو نمایاں نہیں کیا گیا۔ پھر دیکھنے والوں کو کیسے یقین آئے کہ دنیا نے اُسے بُرا بننے پر مجبور کیا؟

اِسی طرح جمیل بھی دھندلکے میں چھپا ہوا ہے۔ یہ سمجھنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ جمیل، ذاتی طور پر کیسا آدمی ہے، اگر بُرا ہے تو باپ کے فیصلے پر اسے خوش ہونا چاہیئے اور اگر اچھا ہے تو مخالفت کرنی چاہیئے، مگر اس نے کچھ بھی نہیں کیا ـــــ آخر کیوں؟

(۲) "معصوم" کا پہلا سین جس میں معصوم کی ماں کی موت، اور قبرستان وغیرہ دکھایا گیا ہے، اپنی طوالت اور واقعات کی تیزی کی وجہ سے اپنا اثر و کشش کھو بیٹھا ہے، واقعات اِسی تیزی سے چلے دکھاتے ہیں کہ یہ سین غیر ضروری معلوم ہونے لگتا ہے۔ میرے خیال میں فلم کا ابتدا، اس سین سے ہونی چاہئے تھی جس میں معصوم اپنی سوتیلی ماں کو دیکھ کر کہتا ہے "یہ تو دوسری اماں ہیں" ـــــ ان الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ معصوم کی ماں مر گئی ہے اور اس کے والد نے دوسری شادی کی ہے۔ اس طرح جہاں غیر ضروری طوالت نہ ہوتی وہاں مطلب بھی پورا ہو جاتا ـــــ اور دیکھنے والے بھی بد دل نہ ہوتے!

(۳) ہیجڑوں کا گانا اور بد تمیزی سے تھرکنا مٹکنا کچھ اچھا نہیں لگتا بلکہ عجب طرح کی کراہیت اور نفرت سی ہوتی ہے۔ یہ سین شاید ہی کسی کو پسند آیا ہو!

مکالمے ـــــ مکالمے کچھ زیادہ زوردار نہیں ہیں نہ اُن میں اثر اور کشش ہی ہے، بعض جگہ ذو معنی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں مگر اُن کے دوسرے مطلب پر غور نہیں کیا گیا۔ مثلاً جمیل معصوم سے کہتا ہے کہ "بھیا تم نے تو مجھے آدمی بنا دیا ہے" معصوم جواب دیتا ہے "نہیں، ہم نے مجھے بنایا ہے" ـــــ مگر کیا بے وقوف؟ ـــــ یا آدمی؟

یا ایک جگہ ریحانہ کی ماں، ریحانہ سے کہتی ہے "بیٹی، میری بھی کہیں جگہ تھی، مگر جہاں قسمت میں تھا وہیں ہوا" ـــــ

ـــــ "یہ تھی" ذرا خطرناک لفظ ہے "نسبت" کے علاوہ ایک دوسری چیز کیلئے بھی کہا جاتا ہے!

اور ایک جگہ تو مکالمہ نگار کی غلطی حیرت انگیز اور ناقابل معافی ہے۔ ایک مسلم ہندوستانی عورت کا اپنے ہونے والے داماد کو اپنی لڑکی کے بارے میں یہ کہنا کہ "آخر تمہاری ہی تو ہے" کسی طرح بھی جائز، مناسب، اور رائج نہیں ہے ـــــ اسلامی تہذیب اور کلچر کے نام لیواؤں اور اسلامی معاشرت کے نقاشوں کو اس پر پھر ایک بار غور کرنا چاہیئے!

گانے ـــــ گانے سب کے سب معنوی لحاظ سے بہت اچھے اور باموقعہ ہیں مگر گانے کے غلط طریقے اور بھدّی بے جان موسیقی نے ایک گانے کو بھی فلمی گانا "بننے" نہیں دیا بلکہ سارے گانوں کی معنویت، اثر، دلکشی اور فنی خوبیوں پر پانی پھیر دیا ہے۔

میوزک ڈائرکٹر یقیناً اپنے فرائض کی ادائگی میں ناکام رہا ہے

فوٹو گرافی ـــــ یقیناً یہ فوٹو گرافی کا ہی تصور ہے کہ اچھے بھلے اداکاروں کی "فلم ہوتی" غائب ہے۔ امجد اور انیس سے تو جیسے کیمرے کو خاص دشمنی تھی! اداکاروں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑتی ہوئیں، اور گھبرائے گھبرائے سے تیور ـــــ فوٹو گرافی کی نمایاں خامیاں ہیں۔ حیرت تو اس پر ہے کہ انیس اتنی بدل کیسے گئی؟ "پڑوسی" کی انیس اور اِس انیس میں زمین اسمان کا فرق ہے ـــــ آخر کیوں یہ تبدیلی آب و ہوا، اس کا باعث ہے یا ہمارے دوستوں کا خیال صحیح ہے؟)

ریکارڈنگ ـــــ اس فلم کی ریکارڈنگ بھی بہت خراب ہے سب سے نمایاں خامی یہ ہے کہ اداکار کے ہونٹ دوسری طرح ہلتے ہیں اور آواز دوسری قسم کی آتی ہے، معلوم ہوتا ہے فلم کے سامنے کردار بولنے کی "ریہرسل" دمشق کر رہے ہیں اور ساؤنڈ ڈائرکٹر صاحب ریکارڈنگ کا طریقہ سیکھ رہے ہیں!

اِس کے علاوہ ایک موقعہ پر تو اور بھی عجیب نظارہ نظر آتا ہے معصوم موٹر پر "دل آپ نشانہ بنتا ہے وہ تیر تو ناکیا جانے" گاتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ موٹر کا پیچھے سے فوٹو لیا گیا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ وہ تقریباً ایک میل آگے نکل گئی ہے مگر آواز میں ذرا فرق نہیں آیا۔ معصوم کی آواز بالکل اسی طرح سنائی دے رہی ہے دور ہوتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی! ـــــ فنی لحاظ سے یہ بہت بڑی

بانی ہے!

اداکاری ــــ اداکاروں میں مسٹر مظہر خاں ہمیشہ کی طرح بے حد کامیاب رہے ہیں مگر ہمیں افسوس ہے کہ کہانی کی اکثر اور ڈائرکشن کی لغزشوں خامیوں نے ان کی محنت پر پانی پھیر دیا ہے ـــ جب فلم ہی کامیاب نہ ہو تو اچھی اداکاری اپنی پوری قیمت کیسے پاسکتی ہے؟

مظہر خاں کے بعد رتولا، مہتاب، نہار، اور مزمّل کے علاوہ چھوٹے بچے بھی ایکٹنگ کے لحاظ سے بہت اچھے رہے ہیں۔

ڈاکٹر حامد کا کام جن صاحب نے کیا ہے، خوب کیا ہے مگر حیرت ہے کہ ان کا نام نہ تعارفی بورڈ پر موجود ہے نہ کتاب میں ـــ اس کی وجہ اگر اداکار کی اخلاقی کمزوری نہیں ہے تو کمپنی نے واقعی ظلم کیا ہے۔

انیس کے بارے میں بھی ہمیں شکایت ہے۔ نہ خود اس میں زندگی ہے، نہ اس کی اداکاری میں ـــ معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی زندہ لاش، دوسرے کرداروں کے سہارے گھسٹتی ہوئی اپنی منزل تک پہنچنے کی جدوجہد کررہی ہو!

ڈائرکشن ــــ ڈائرکٹر حسنین سے ہندوستانی فلمی صنعت کی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں مگر معصوم نے نہ صرف فلمی صنعت کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے بلکہ فارسی کی مانی ہوئی ضرب المثل "نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول" کو بھی غلط ثابت کردیا ہے ـــ یقیناً فلم قیدی کے مقابلے میں نہیں رکھی جاسکتی۔

چند خامیاں ملاحظہ ہوں:-

(۱) شروع سے آخر تک، ہر موقعہ پر گھر میں روشنی کے لیے مومی شمع دکھائی گئی حالانکہ آج کل بجلی، گیس اور لیمپ کا زمانہ ہے۔ ہندوستان کے کسی بھی شہر میں روشنی کے لیے موم بتی استعمال نہیں کی جاتی بجز خاص ضرورتوں کے!

مزا یہ ہے کہ فلم میں مختلف موقعوں پر بجلی، گیس اور لیمپ تینوں چیزیں دکھائی گئی ہیں اس لیے یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ یہ فلم ان ایجادوں سے پہلے کی ہے۔

مانا کہ کسی خاص موقعہ پر مومی شمع کی ضرورت تھی مثلاً جب ریحانہ شمع سے باتیں کرتی ہے مگر ہر جگہ تو یہ "ضرورت" موجود نہ تھی ـــــ پھر؟ ـــ کہیں یہ دکھانا تو مقصود نہیں کہ آج کل "ٹیلیک آؤٹ" کا زمانہ ہے ۶۶۹

(۲) فلم کے کرداروں میں جمیل معصوم سے چھ سال چھوٹا ہے مگر فلم میں اور بھی نکلے کہ دو بھائی دکھائے گئے ہیں (جو غالباً ڈائرکٹر حسنین کے لڑکے ہیں) یہ انتخاب معنوی لحاظ سے غلط ہے۔

(۳) جمیل ایک اپ ٹو ڈیٹ، یورپ زدہ نوجوان دکھایا گیا ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ایک خاص موقعہ پر وہ جیسے ہی اپنی میز کی دراز کھولتا ہے ایک بھیانک چھرا اُس کے ہاتھ میں آجاتا ہے ـــ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ پہلے سے جانتا تھا کہ ایسا ہوگا اس لیے اُس نے انتظام کررکھا تھا؟ اگر نہیں تو اس طرح کا چھرا وہاں کیوں موجود تھا؟ سوال ہوسکتا ہے کہ پھر وہ پستول کہاں سے لاتا؟ تو ہمارا جواب یہ ہے کہ چاقو پر ابھی تک پابندی عاید نہیں ہوئی!

(۴) پوری فلم دیکھنے کے بعد یہ سوچ کر افسوس ہوتا ہے کہ بے گناہ جمیل کو جیل کی کڑیاں جھیلنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ قانون کی نظر میں وہ مجرم تھا کیونکہ اُس نے شاہدہ کو قتل کرنا چاہا، مگر مصنف اور ڈائرکٹر نے تو خود اُسے غلط فہمی کا شکار بنایا تھا ـــ اگر دولت کے لالچ اور انتقامی جذبات میں اندھے معصوم کو مجرم بنانا ضروری نہیں سمجھا گیا تو بے گناہ جمیل کو سزا کیوں دی گئی، کیا اس کی رہائی کی صورت ممکن نہ تھی جبکہ ڈرامے کے کامیاب اختتام کیلئے اس کا رہا ہونا ضروری بھی تھا؟

(۵) فلم کا اختتامی سین ہر فلم کی جان ہوتی ہے ـــ کامیاب ڈائرکٹر وہی ہے جو آخری سین میں دیکھنے والوں کو ہنسنے یا رونے پر مجبور کردے۔ مگر معصوم کا آخری سین ڈائرکٹر اور مصنف کا اعتراف شکست ہے ـــ بھونڈا اعتراف!

روشن پہلو ــــ ان خامیوں کے ساتھ ہی ڈائرکشن میں بعض خوبیاں بھی ہیں اور سب سے بڑی خوبی اس کی حقیقت NATURALITY ہے شروع سے آخر تک تقریباً پوری فلم میں بجز ایک دو مناظر کے حقیقت جھلکتی ہوئی ہے کوئی چیز نہ خلاف فطرت ہے نہ خلاف حقیقت!

معاشرتی رسوم کا کھوکھلا پن معلوم ہے اور ہمیں ان سے کوئی دلچسپی نہیں مگر یہ بات ضرور قابل تعریف ہے کہ ان سب کاموں کو بالکل اسی طرح پردے پر لایا گیا ہے جس طرح کہ وہ رائج ہے۔

ریحانہ کے نکاح کے وقت ایجاب و قبول کا سین اتنا جیتا جاگتا اور پُر اثر ہے کہ ماننا پڑتا ہے ڈائرکٹر نے ہماری سماجی معاشرت کے ان لطیف پہلوؤں پر بھی گہری نظر ڈالی اور ان کا بہت [illegible]

REG. No. C. 2535

JADID URDU

قواعد و ضوابط

۱۔ رسالہ ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوا کرے گا۔ خریداروں کو چاہیے کہ رسالہ ۱۵ تاریخ تک نہ ملنے پر دفتر سے طلب کریں۔

۲۔ اہل قلم حضرات سے درخواست ہے کہ وہ مضامین مہینے کی ۱۵ تاریخ تک اڈیٹر کے نام بھیجدیں۔

۳۔ مضامین صاف اور شستہ تحریر ہوں۔

۴۔ وہی مضمون پرچہ میں شائع ہو سکتا ہے جو معیار ادب و اخلاق سے گرا نہ ہو۔

۵ دل آزار فرقہ وارانہ مضامین نیز سیاسی مضامین شائع کرنا پرچہ کی پالیسی کے خلاف ہے

۶ نمونہ کا پرچہ مفت نہیں بلکہ ۳ کا ٹکٹ آنے پر بھیجا جائیگا۔

۷ جواب کیلئے جوابی کارڈ یا اسٹامپ آنا ضروری ہے

۸۔ خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ۔ منیجر جدید اردو نمبر ۳۶ مارسڈن اسٹریٹ۔ کلکتہ

۹۔ کاروباری حضرات اشتہار کیلئے منیجر سے خط و کتابت کریں۔

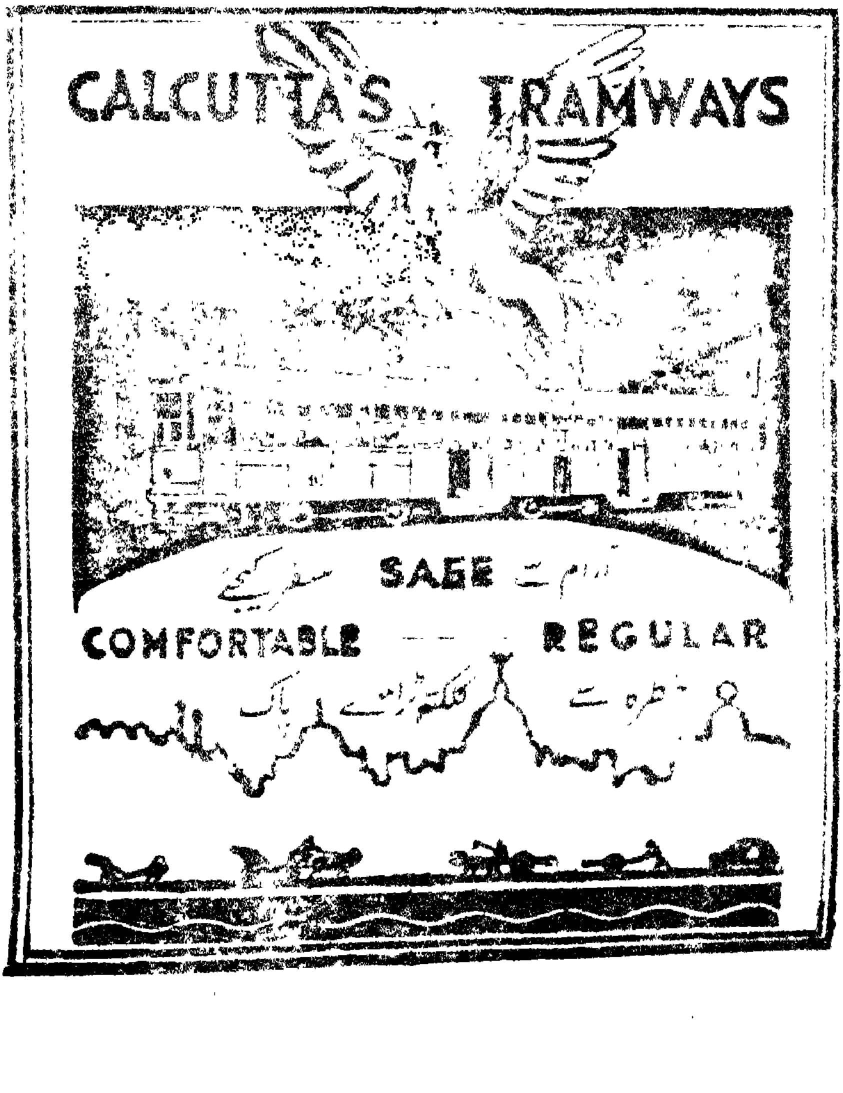
۱۰۔ سالانہ چندہ صرف دو روپیہ (عہ) غیر ممالک کیلئے ۵ شلنگ۔ رنگون اور برما کیلئے تین روپے (سے)

ا ے جلیل منیجر جدید اردو نمبر ۳۶۔ مارسڈن اسٹریٹ۔ کلکتہ

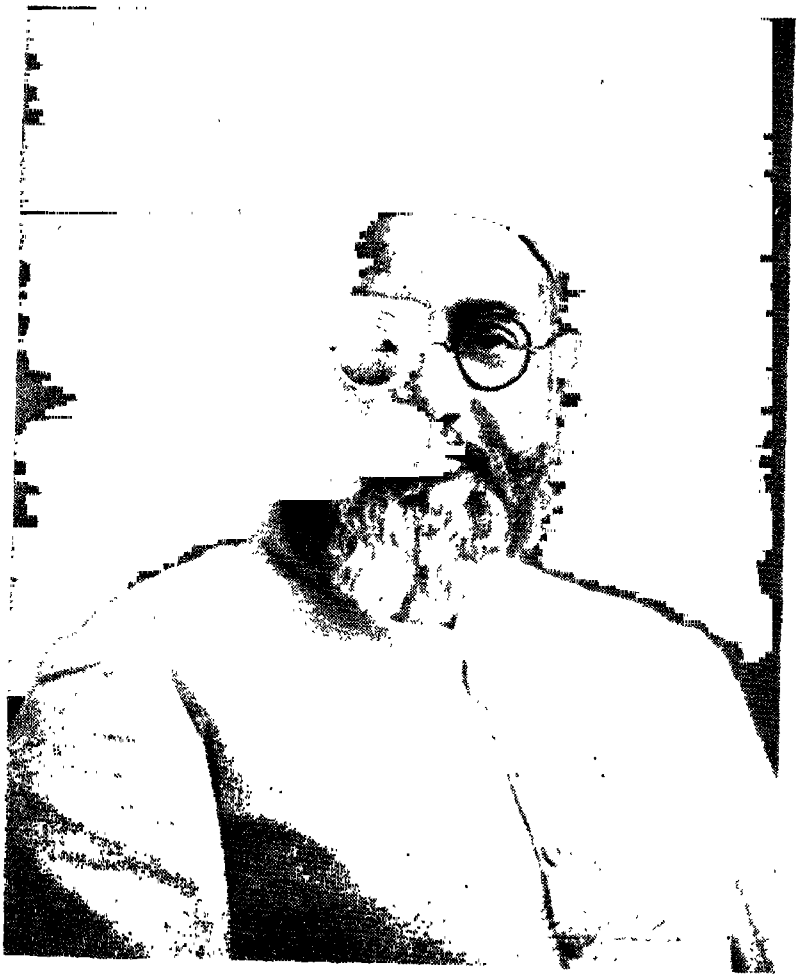
مشرقی ہندوستان کا علمی ادبی ماہنامہ

جدید اردو

قیمت فی پرچہ
تین آنہ
/۳



CALCUTTA'S TRAMWAYS
آرام سے SAFE سفر کیجیے
COMFORTABLE — REGULAR
خطرہ سے
کلکتہ ٹرام سے
پاک



شمس العلما خان بہادر ڈاکٹر محمد ہدایت حسین مرحوم

مدیر مسئول
پرویز شاہدی
مدیر اعزازی
ایم ظہور احسن قاضی

جدید اردو کلکتہ

مئی ۴۲ء

چندہ سالانہ دو روپیہ عہ
" ششماہی ایک روپیہ چار آنہ
غیر ممالک کے لیے ۵ شلنگ

جلد ۵ — نمبر ۵

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر عبدالجلیل نے مطبع سندھ میں چھپوا کر ۳۶۔ مارسڈن اسٹریٹ کلکتہ سے شائع کیا

نکٹائی مارکہ زردہ

ہندوستان بھر میں اپنی خصوصیت کے اعتبار سے بے نظیر ہے اعلیٰ درجے کے تمباکو سے ماہرین کیمیا اور خود مالک کارخانہ کی نگرانی میں یہ زردہ تیار کیا جاتا ہے جس محنت اور احتیاط سے یہ زردہ تیار کیا جاتا ہے ان کی صحت وکامیابی تجربہ سے ثابت ہو چکی ہے۔ یہ زردہ تمام مضر اجزا سے پاک ہے۔ جس صفائی اور ستھرائی سے یہ زردہ تیار کیا جاتا ہے اس کی بنا پر مالک کارخانہ کی طرف سے اس بات کی ضمانت پیش کی جاتی ہے۔ بوتلوں اور خوبصورت ڈبوں اور بکسوں میں آپ کے لیے حاضر ہے

نکٹائی مارکہ زردہ

نکٹائی مارکہ کارخانے کی بے مثل وبے نظیر دیگر چیزوں کی طرح نکٹائی مارکہ مشکی قوام بھی اپنی آپ نظیر ہے اس قوام میں بہترین اور مفید ترین اجزا کے علاوہ مشک خالص اور زعفران کا حصہ غالب ہے۔ گلاب اور کیوڑہ کے عرق میں اس کا قوام تیار کیا جاتا ہے نہایت خوش ذائقہ اور خوشبودار دل ودماغ کو فرحت بخشتا ہے۔ پان کھانے والوں کو خصوصیت سے سے فائدہ پہنچاتا ہے نفاست پسند طبیعتوں کے لیے بہترین تحفہ ہے۔ یہ قوام دراصل ایک طرح کا ایک معجون ہے۔ ایک بار آزمائش کیجیے اس کی تمام خوبیاں آپ پر روشن ہو جائیں گی۔ پھر یہ معجون برابر آپ کا ہمدم ودمساز بنا رہیگا اور لطف یہ کہ کم خرچ بالانشیں۔ ولایتی شیشیوں میں جدید ترین مشینری کے ذریعہ بند کیا جاتا ہے ممکن نہیں کہ خرابی آجائے۔ جن اجزا سے یہ قوام تیار کیا جاتا ہے وہ تمام پاک اور صاف چیزیں ہیں اس لیے ہر مذہب وملت کا آدمی نکٹائی مارکہ قوام بے تکلف استعمال کر سکتا ہے۔

کیسر بلاس

پان کی نہایت خوشبودار، خوش رنگ بے انتہا لذیذ بے حد مزیدار مسالہ ہے۔ ہمارے کارخانہ کی خاص ایجاد ہے جو علم سائنس کے ذریعہ اور ان کے اصولوں کو مد نظر رکھ کر تیار کیا جاتا ہے کیسر بلاس معدہ کی تمام شکایتوں کو دور کرتا ہے دل اور دماغ کو فرحت بخشتا ہے۔ آپ پان کھاتے ہوں تو کیسر بلاس ضرور استعمال کریں۔ اس لیے کہ بازار کا کوئی مسالہ ہمارے کیسر بلاس کی لذت اور خوشبودار ذائقہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسے نہایت عمدہ شیشیوں میں خوبصورت لیبل سے آراستہ کرکے اس طرح پیک کیا جاتا ہے کہ کوئی جز ہاتھ سے مس نہیں ہوتا۔ یہ وہ مسالہ ہے جس نے قلیل عرصہ میں دنیا کے تمام مسالوں میں ہلچل ڈال دیا ہے۔ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اس کی مانگ بجلی کی رفتار کی طرح بڑھتی جا رہی ہے۔ اس مسالہ میں اتنی خوبیاں ہیں جو بیان نہیں ہو سکتیں۔

محمد مصطفےٰ حسین مالک کارخانہ نکٹائی مارکہ زردہ نمبر ۱۴۱ ہوڑہ روڈ ہوڑہ کلکتہ

شاخیں

نمبر ۷، ۵ کلائیو اسٹریٹ کلکتہ۔ نمبر ۱۱ آرسکن روڈ بمبئی۔ نمبر ۱، ۵ کیننگ اسٹریٹ کلکتہ

شذرات

موجودہ جنگ اور ہندوستان :- ہر چند بھوکا اور ننگا ہندوستان چالیس کروڑ سانس لیتی لاشوں کو اپنے کمزور کاندھوں پر ڈھوئے ڈھوئے پھر رہا ہے، ہر چند اس ملک کی غیر مسلح آبادی دنیا کی موجودہ بربادی کو براہ راست نہیں روک سکتی، پھر بھی یہ غلاموں کی بستی بساط سیاست پر ایک اہم مہرے کی حیثیت رکھتی ہے۔ شاطران سیاست کی انگلیاں بار بار اٹھ رہی ہیں لیکن اب تک کوئی ایسی چال ذہن میں نہیں آئی ہے جس سے بازی کسی فیصلہ کن انجام تک پہنچ جائے۔ اگر ایک طرف یورپ کے محافظ پیغمبر فتنہ وشر ہٹلر کی اہرمنی نگاہیں اسی کو تاک رہی ہیں تو دوسری طرف ٹوجو جیسے محسن ایشیا اور پیشوائے ہلاکت کے منہ میں پانی آرہا ہے ان گرگان باراں دیدہ" کے دلوں میں ایک خاص قسم کا جذبہ پرستی انگڑائی لے رہا ہے۔ خونخوار شیرنیاں اس بلکتے بچے کو دودھ پلانا چاہتی ہیں، ایسا دودھ جو ان کی بے رحم چھاتیوں سے اپنے تمام زہر کے ساتھ ابلا پڑتا ہے، ایسا دودھ جو دوسرے دوسرے بچوں کے حلق میں پہنچ کر ان کے گلے گھونٹ چکا ہے۔

اب ادھر دیکھئے چین ہو یا روس، برطانیہ ہو یا امریکہ، اسٹریلیا ہو یا نیوزیلینڈ، مصر ہو یا افریقہ مختصر یہ کہ جو طاقت بھی اب تک غنیموں سے لڑ رہی ہے ہندوستان سے اخلاقی اور عملی ہمدردی کی التجا کرنے پر مجبور ہے۔ مختلف پلاٹ فارموں سے ہندوستان کو اشتراک عمل کی دعوت دی جا رہی ہے بلا پس وپیش خطرات سے آگاہ ہو کر میدان مبارزت میں کود پڑنے کی نصیحتوں سے کام لیا جا رہا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ مزید برآں اس کی آزادی کا مسئلہ بھی اتحادیوں کے غور وفکر کا مستقل موضوع بن گیا ہے۔ ہر اتحادی طاقت خواہ وہ کسی نظریہ سے بھی ہو اس گدائے بے نوا کے ساتھ ہمدردی کرنے پر مجبور نظر آرہی ہے۔ مارشل چیانگ کائی شیک کی تشریف آوری نے ہندوستان کو دنیا کے سیاسی جغرافیہ میں اور بھی اہم مقام کا مالک بنا دیا امریکہ کے مدبرین سیاست کی تقریروں میں بھی ہندوستان کی اہمیت کا رنگ جھلک رہا ہے اُن کی آنکھیں بھی اس وقت ہندوستانیوں کے کالے چہروں میں ملاحت کے ساتھ صباحت دیکھ رہی ہیں۔ مصر و عراق کے ماہرین سیاست ہندوستان کے خانگی مسائل کو سلجھا ہوا دیکھنے کے لیے بے قرار ہیں۔

یہاں تک تو ہوا صرف زبانی ہمدردی کا ذکر اب برطانیہ کے عملی اقدام پر غور فرمائیے۔ برطانیہ کا موجودہ لیڈر چرچل ہے۔ کون چرچل؟ وہی چرچل جو ہندوستان کی آزادی کا ذکر تک سننا گوارا نہیں کرتا تھا۔ وہی چرچل جس کو ہم لوگ شہنشاہیت کا مجسمہ اور سامراجیت کا بت تصور کرتے تھے۔ وہی چرچل جس کی آتش زبانی ہمیشہ ہندوستان کی تمنائے آزادی اور امید رہائی پر پانی پھیرا کرتی تھی۔ جی ہاں آج وہی چرچل برطانیہ کی عنان حکومت اپنے ہاتھوں میں لیئے میدان سیاست میں اپنی شہسواری کا جوہر دکھا رہا ہے۔ لیکن اب وہ سامراجی چرچل زندہ نہیں آج کل کا چرچل جمہوریت کا علمبردار، حقیقتوں کی تلخی اور شیرینی کو پرکھنے والا، بدلتے ہوئے وقت کا ساتھ دینے والا اور ہندوستان کے باب آزادی کے لیے تعبیریں ڈھونڈنے والا چرچل ہے۔ ان اسباب پہ نہ جائیے جن سے یہ قلب ماہیت ظہور میں آئی بلکہ صرف اُن نتیجوں کو دیکھئے جو دنیا کی آنکھوں کو دعوت حیرت دے رہے ہیں۔ سر اسٹافورڈ کرپس جنگی وزارت کی ہدایت کے مطابق جو تجویزیں لے کر ہندوستان تشریف لائے وہ ہر چند اپنی ناتمامیوں کی وجہ سے کسی سیاسی جماعت کی پیاس نہ بجھا سکیں اور اُن کو یہاں سے ناکام لوٹ جانا پڑا پھر بھی اس کا اعتراف تو ضرور ہوا کہ ہندوستان کے وہ مسائل جو اب تک خدایان مغرب کے لیے کوئی جاذبیت نہیں رکھتے تھے آج دلچسپ مسئلے کی حیثیت سے دماغوں کے سامنے ناچ رہے ہیں۔ یہ ناچ ہزار غیر دلکش سہی مگر بھی ارباب سیاست کی نگاہیں یہاں سے ہٹ نہیں سکتیں اسکی

ہر جنبش کو دماغ کی آنکھوں سے دیکھنے پر مجبور ہیں، صرف یہی نہیں بلکہ کوشش کی اس گرتی دیوار میں ایک ایسی اینٹ بھی نظر آئے جس کو برطانیہ اور ہندوستان کے باہمی تعلقات کی تعمیر نو کا سنگ بنیاد سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک نئے سیاسی اصول کی بنا ڈالی جا چکی ہے اب بدلتے ہوئے حالات خود عمارت بنالیں گے کیسی عمارت؟ شیشوں کی نہیں بلکہ اُن سخت پتھروں کی عمارت جس کو سخت سے سخت سیاسی زلزلے بھی لرزہ براندام نہ کرسکیں۔

ایسا کیوں ہوا اور کیوں ہو رہا ہے؟ اس کا جواب دینا تحصیل حاصل ہے۔ کیا ہندوستان کے مادی وسایل اس کی کثیر آبادی اور جغرافیائی اہمیت خود اس سوال کا جواب نہیں؟ لوگ معترض ہونگے کہ وسائل اور آبادی دونوں کا عالم اپنی ابتری کی وجہ سے مایوس کن ہے ایسی صورت میں یہ غریب ملک غیر تو غیر خود اپنے کام نہیں آسکتا۔ لیکن اگر وہ یہ غور کرلیں کہ تسبیح کے بکھرے ہوئے دانے ادھر چُنے ہی نہیں جاسکتے بلکہ اُن کو زناربیں پروکر اُن سے ایک نئی تسبیح بھی بنائی جاسکتی ہے تو یہ سوال خود حل ہو جاتا ہے۔

ہندوستان کو چاہیئے کہ خدائے جنگ کی اِن بخشی ہوئی نعمتوں سے فائدہ اٹھائے اور دشمنوں کی ہنگامی کامیابیوں سے مرعوب نہ ہو جائے۔

تعزیت

آسمان زندگی سے ہمیشہ ہی چمکتے ہوئے ستارے ٹوٹتے رہے ہیں لیکن مقام افسوس ہے کہ اُن میں اکثر ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی شدید تابانی کے باوجود بھی اپنے عہد درخشانی میں سطح بیں آنکھوں کو نظر نہیں آتے۔ مگر وہ آنکھیں جو کارروان نجوم کے ہر اٹھتے قدم کے ساتھ حرکت کرتی رہتی ہیں ایسے ستاروں کو فراز چرخ سے گر کر فضا کی گہرائی میں مدفون ہوتے دیکھ کر خشک نہیں رہ سکتیں۔ یہی چیز مجھے اپنے عزیز جناب غلام پیر نشاط القادری کی پھوپھی محترمہ آمنہ خاتون کی جانکاہ موت میں نظر آتی ہے ۲۳۔ اپریل ۱۹۴۲ء دوپہر کے وقت مرحومہ کا گل حیات مرض اجل کے بے رحمانہ حملے سے مرجھا کر ہمیشہ کے لیے افسردگی کی گود میں دفن ہو گیا۔ مرحومہ کی کشادہ دلی، محبت اور اس کے ساتھ ساتھ اُن کی خوش اخلاقی دلوں میں پتھر کی لکیر بن کر رہیگی۔ مجھے چونکہ مرحومہ کے محاسن اخلاق و روحانی کا ذاتی علم ہے اس لیے میں عوام کی اجنبیت کے باوجود بھی اس تحریری ماتم سے کام لینے پر مجبور ہوں۔

مجھے افسوس ہے کہ میرے الفاظ تسلی ابھی تک نشاط صاحب کے غم میں کوئی کمی پیدا نہیں کرسکے۔ شاید وقت کا پھاہا اس زخم کو مندمل کردے۔ والدین کا سایہ اٹھ جانے کے بعد اُن کے لیے جو کچھ تھا انہیں کی ہستی تھی۔ مرحومہ کے دو کم عمر معصوم بچے ابھی تک بھولے پن سے ماں ہی کی تلاش کررہے ہیں اور یہ معصوم ماتم بھی غم کو تازگی بخشتا رہتا ہے۔

خدا مرحومہ کی روح کو ابدی شگفتگی عطا کرے اور اُن کے عزاداروں کو توفیق صبر۔

یادگار کی ضرورت :- شمس العلماء ڈاکٹر ہدایت حسین صاحب مرحوم کی شخصیت کسی تعلیمی تعارف کی محتاج نہیں مستشرقین کی دنیائے تحقیق میں مرحوم جس ممتاز مقام کے مالک تھے اس سے صرف مشرق نہیں بلکہ کافی حد تک مغرب بھی واقف ہے۔ مرحوم کے تحقیقی کارنامے ارباب نظر سے خراج تحسین وصول کرچکے ہیں۔ یہ انہیں کمالات کا اعتراف تھا جس نے حکومت برطانیہ کو شمس العلماء کا تمغۂ شرف دینے پر مجبور کیا۔ کاش فطرت کا قانون اپنی گرفت ڈھیلی کر کے کچھ دن اور ان کو خدمت علم کرنے کا موقع دیتا

اب ضرورت ہے کہ ان کی یاد زندہ رکھنے کے لیئے کوئی یادگار قائم کردی جائے۔ کلکتہ میونسپل کارپوریشن اس کی بہتر صورت نکال سکتی ہے۔

کلام ناطق

کبھی دامانِ دل پر داغِ مایوسی نہیں آیا ۔۔۔ ادہر وعدہ کیا اس نے ادہر مجھکو یقیں آیا
تصور ان کا آیا اور دل واپس نہیں آیا ۔۔۔ تعجب ہے مجھے یہ نقش کیونکر بے نگیں آیا
دو عالم سے گذر کر بھی دل عاشق ہے آوارہ ۔۔۔ ابھی تک یہ مسافر اپنی منزل پر نہیں آیا
تجلی آشنا دل مذہب و ملت کو کیا جانے ۔۔۔ ہوئی روشن جہاں بھی شمع پروانہ نہیں آیا
خبر جو کوئی لایا دل سے سوزِ عشق کی لایا ۔۔۔ نفس جو لب پہ آیا بن کے آہ آتشیں آیا
مری جانب سے ان کے دل میں اس شکوے پہ کینہ ہے ۔۔۔ کہ جو شکوہ زبان پر کیا ابھی دل میں نہیں آیا

حیات بیخودی کچھ ایسی نامحسوس تھی ناطق
اجل آئی تو مجھ کو اپنی ہستی کا یقین آیا

حکیم ناطق لکھنوی

قطعات

منزل ہستی کی جانب ہوں رواں! ۔۔۔ جب ملی منزل تو میں کھو جاؤنگا!
زندگانی ہیں قضا کی لوریاں، ۔۔۔ سنتے سنتے ایک دن سو جاؤنگا!

۔۔۔ ۲ ۔۔۔

آرزو ہے زندگیٔ ما و تو، ۔۔۔ آرزو کیا ہے، فریب جستجو!
یہ سحر ٹوٹا تو پھر کچھ بھی نہیں، ۔۔۔ سازمن نے جنبش مضراب تو!

۔۔۔ ۳ ۔۔۔

سن رہا ہوں آج کس کی گفتگو؟ ۔۔۔ کون پردے میں سراپا راز ہے؟
آہ! کچھ کچھ یاد آتا ہے مجھے، ۔۔۔ یہ تو کوئی آشنا آواز ہے!

سالک لکھنوی

شمع ہدایت

یعنی

جنت آرامگاہ حضرت شمس العلماء مولانا سید محمد ہدایت حسین صاحب قبلہ کے سوانح حیات پر

ایک مختصر تبصرہ

سعدیا مردِ نکو نام نمیرد ہرگز
مُردہ آنست کہ نامش بہ نکوئی نبرند

ہماری اس دنیا میں چند ہی شخصیتیں ایسی ہوا کرتی ہیں جو اپنی زندگی کے ایام عزت اور نمود کے ساتھ گذار کر اپنے بعد بھی اپنی نیکنامی کا اثر صفحہ ہستی پر چھوڑ جاتی ہیں۔ یہ دنیا فانی ہے اور اس کی ہر چیز فانی مگر اس حقیقت کے باوجود انسان کی بقا کے لیئے ایسے اسباب بھی یہاں ضرور موجود ہیں جن سے کوئی چاہے تو بخوبی کام لے سکتا ہے اور ابد الاباد تک اپنی یادگار آپ ہی قائم رکھنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ مادر گیتی نے ایک سے ایک اعلیٰ و افضل فرزند پیدا کیئے۔ نامی گرامی سلاطین اور شاہان اولوالعزم، بڑے سے بڑے بہادر اور سورما، ایک سے ایک مالدار اور اہل دَول یہاں وجود میں آئے اور اپنی چند روزہ زندگی کے رنگین کرشمے دکھا کر چلے گئے۔ لیکن اُن کے مرتے ہی اُن کے سارے کارنامے لوگوں کے دلوں سے کچھ اِس طرح محو ہوئے کہ گویا ان میں سے کسی کا کبھی کوئی وجود ہی نہ ہوا تھا۔ ہاں دنیا نے اُن لوگوں کو ضرور یاد رکھا جو اپنی نیکی اور خوش خوئی، اپنے اخلاق اور اعمال کا اچھا اثر اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے ؎

قارون ہلاک شد کہ چہل خانہ گنج داشت
نوشیرواں نمرد کہ نامِ نکو گذاشت

عزت و شہرت کی پائیداری نہ تو سلطانی و حکمرانی پر منحصر ہے نہ کشورستانی پر، نہ امارت پر نہ دولتمندی پر، نہ جنگ جوئی پر نہ سپہ سالاری پر، بلکہ حقیقی اور غیر فانی اعزاز کا انحصار سراسر خوش اخلاقی، انکساری نیک طینتی اور خدمت خلق پر ہے۔ خدائے بزرگ و برتر کے نزدیک وہی انسان معزز اور موقر ہے جو صاحبِ فضل و کمال اور بلند مرتبہ ہونے کے باوجود اپنے آئینۂ دل کو غرور و تکبر کی گرد و آلایش سے قطعی طور پر پاک رکھے۔ اپنی حقیقت کو کبھی فراموش نہ کرے اور اپنے ہم جنس سے جھک کر ملے۔ بلکہ جس قدر اُسے بزرگی اور رفعت حاصل ہوتی جائے اُسیقدر اُس کی خوش خلقی اور منکسر مزاجی میں زیادتی ہو۔ چنانچہ جس شخص میں یہ مادّہ جو حقیقی انسانیت کی دلیل ہے، موجود ہوگا وہی صحیح معنوں میں اشرف المخلوقات کہلانیکا مستحق ہو سکتا ہے۔ اور اُسی کے تئیں بقائے نام اور زندگی دوام حاصل ہوسکیگی۔

اس وقت ہم ایک ایسے ہی فقید المثال، عالی منش اور بلند مرتبہ بزرگ سے اپنے قارئین کو روشناس کرانا چاہتے ہیں، جنہوں نے اپنی ذات والا صفات سے بنی نوع انسان کی خدمات کے سبب اور اپنے اخلاق و انکسار کے ذریعہ ہمارے قلوب پر ایک پائیدار اثر چھوڑا ہے۔ موصوف کے نام نامی اور کارہائے گرامی سے نہ فقط یہ کہ اہل بنگالہ خصوصاً اور اہل ہند عموماً واقف ہیں۔ بلکہ یہ کہ

اُنکی علمی و ادبی کاوشوں کا لوہا یورپ و امریکہ والے بھی مانے ہوئے ہیں۔ آج گو وہ ہمارے سامنے اپنی جسمانی حیثیت میں موجود نہیں اور ہماری ظاہر بیں آنکھوں سے ہمیشہ کے لیئے پوشیدہ ہو چکے ہیں لیکن اُنکے پاکیزہ عادات و خصائص، اُن کی خوش خلقی و انکساری، اُن کے فضل و کمال اور اُن کے نیک اعمال کا اثر کچھ اس طرح برقرار ہے کہ اُن کی مادّی زندگی میں اُن سے مستفید ہونیوالے لوگ اس وقت بھی اُن کے روحانی فیوض کی برکت حاصل کر سکتے ہیں۔

حضرت استاذ الاساتذہ شمس العلماء خان بہادر مولانا سید محمد ہدایت حسین صاحب قبلہ پی۔ ایچ۔ ڈی، اعلی اللہ مقامہٗ کی ذاتِ خجستہ صفات بتاریخ ۳۔ جون ۱۸۸۷ء عالمِ وجود میں آئی تھی۔ آپ کے والد بزرگوار شمس العلماء مولانا سید محمد ولایت حسین صاحب مرحوم و مغفور، مدرسہ عالیہ کلکتہ کے مدرس اول اور اپنے زمانے کے ایک بہت بڑے عالم اور مشہور و معروف صوفی منش بزرگ تھے۔ اُن کی گرانقدر تصنیفات اس وقت بھی کتب خانوں کی زینت بنی ہوئی ہیں[۱]۔ حضرت استاذ علیہ الرحمتہ نے ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد بزرگوار ہی کے ظلِ عاطفت میں حاصل فرمائی تھی۔ پھر مدرسہ عالیہ کلکتہ میں داخل ہو کر عربی و فارسی کی تکمیل کے علاوہ انگریزی نصاب کی بھی تحصیل سے فارغ ہوئے۔ ذہین اور محنتی ایسے تھے کہ دورانِ تعلیم میں مدرسے کے اندر بمقابلہ دیگر طلباء آپ کا نمبر ہر ابر اول رہا۔ فارغ التحصیل ہونے کے ساتھ ہی مدرسہ عالیہ میں آپ کو ملازمت ملگئی اور اس طور پر درس و تدریس کی مبارک زندگی کا آغاز ہو گیا کہ جس سے اُنہیں ایک فطری لگاؤ ابتدا ہی سے تھا۔ چنانچہ ایک طرف تو محکمۂ تعلیمات میں ملازمت دوسری جانب بڑے بڑے صاحبانِ علم و فضل کی صحبت، کہ جو حضرت ممدوح کے والد ماجد سے فیض حاصل کرنے کیلیئے دولتکدہ پر جمع رہتے تھے، اور ان سب پر بالا، خود ایک عالم باعمل اور شفیق باپ کے سایہ کی برکت، غرض ان سارے باتوں کا پورا اثر زندگی کی آئندہ نشو و نما پر پڑا۔ اور شروع ہی سے حلقۂ علم و ادب اور میدانِ تحقیق و تدقیق میں سرگرمی دکھلانیکا شوق جاگزیں رہا۔ کتب خانوں کی سیر کرنے اور اہلِ فضل و کمال کی تصنیفات کا بغور مطالعہ فرمانے سے مطلق نہ گھبراتے بلکہ دن و رات اسی شغلہ میں اپنے اوقات صرف کیا کرتے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں آپ کی شادی کلکتہ کے ایک مشہور رئیس خان بہادر مولوی فضل الرحمٰن صاحب مرحوم مترجم سرکاری کلکتہ ہائیکورٹ کی دختر نیک اختر محترمہ قمر النساء بیگم صاحبہ سے ہوئی۔ اور باوجودیکہ متاہلانہ زندگی نے ایک نیا اور گراں بوجھ آپ کے کاندھوں پر ڈالدیا، تاہم اس کے سبب آپ کے علمی مشاغل میں کسیطور بھی کوئی خلل نہ آنے پایا۔ اس خصوص میں مرحوم و مغفور اپنے اصول کے ایسے سخت پابند تھے کہ آخر عمر تک آفاتِ ارضی و سماوی میں سے کوئی بھی آفت یا مصیبت اُنہیں اپنے روزانہ کے معمولی فرائض اور اشغال سے برطرف نہ ہونے دیتی تھی۔ ۱۹۲۳ء کا ذکر ہے کہ ایک ہفتہ کے دوران میں آپ کی دو جوان سال صاحبزادیاں بعارضۂ تپ میعادی موت سے ہمکنار ہوئیں۔ مگر دیکھنے والوں نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ مولانا فردوس آرامگاہ نے اپنے انتہائی ضبط و تحمل سے کام لیکر اور "مرضیِ مولیٰ از ہمہ اولیٰ" پر کامل عقیدہ رکھتے ہوئے پوری طرح صبر اختیار فرمایا۔ اور ایسے صدمۂ جانکاہ کے باوجود اپنا علمی و ادبی مشغلہ حسبِ دستور سابق جاری رکھا۔ یہ نہیں ہوا کہ رنجیدہ خاطر اور ملول و محزون ہو کر کچھ عرصہ کے لیئے خانہ نشین ہو جائیں[۲]

۱۹۰۸ء میں حضرت مولانا کو پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں عربی و فارسی کی لکچرار ی ملی، اور پھر کچھ عرصہ بعد ہی یہاں کے پروفیسر اعلیٰ مقرر ہو گئے۔ چنانچہ پریسیڈنسی کالج میں اس عہدہ جلیلہ پر ۱۹۱۴ء سے لیکر ۱۹۲۲ء تک فائز رہے۔ آپ کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف حکومت کی جانب سے یوں ہوا کہ ۱۹۱۹ء میں آپ کے تئیں "شمس العلماء" کا خطاب ملا۔ اور اس کے تین سال بعد ہی ۱۹۲۲ء ہوتے خان بہادری کا بھی شرف

[۱] موصوف کی وفات عین حج کے موقعہ پر میدانِ عرفات کے اندر ظہور میں آئی۔ آپ کے کئی صاحبزادے اور صاحبزادیاں ہوئیں جن میں حضرت استاذ مغفور فرزند اکبر تھے۔ اسوقت سب سے چھوٹے صاحبزادے مسٹر سید شرافت حسین کسٹم آفیسر اور تین صاحبزادیاں موجود ہیں۔

[۲] وفات سے دو سال پیشتر بھی حضرت استاذ رحمتہ اللہ علیہ کو محض چند یوم کے اندر یکے بعد دیگرے اپنے دو نوجوان اور ہونہار فرزندوں کا داغ اٹھانا پڑا تھا۔ مرحوم سید رشادت حسین کا ہونا یہی تعزیت بہت جبکہ وہ بی۔ اے پاس کرکے سرکاری ملازمت پا چکے تھے اور عنایت حسین مرحوم مسٹر کولیشن کا امتحان میں شریک ہونے والے ہی تھی کہ داعیٔ اجل کو لبیک کہنا پڑا۔

بخش گئیا۔

پریسیڈنسی کالج میں شمس العلماء جنت آرامگاہ کا وجود مسلم طلبا کے لیئے ایک نعمت غیر مترقبہ تھا۔ سب کے ساتھ بلا امتیاز دلی شفقت رکھتے اور چھوٹی سی معمولی باتوں میں بھی تائید کے لیئے بہ نفس نفیس خود مستعد ہو جایا کرتے تھے۔ اُن کے کمرے کا دروازہ دیسی اور بدیسی طلبا کی مشکلات حل کرنے کے واسطے ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ درس وتدریس کے گھنٹوں کے علاوہ بھی اپنے زیادہ اوقات کالج کے اندر ہی صرف فرمایا کرتے۔ نادار طلباء کی ایک کثیر تعداد کے لیے کتابیں خریدنے اور کالج کی فیس ادا کرنے کے سلسلہ میں ایک معتدبہ رقم حضرت موصوف کی جیب خاص سے برابر خرچ ہو جایا کرتی تھی۔ لوگوں کی اعانت اس طور پر کیا کرتے کہ مطلق کسی کو خبر نہ ہونے پاتی تھی۔ طلبا کے علاوہ دیگر مغلوک الحال اشخاص کی امداد کے لیئے بھی اُن کا دست کرم ہمیشہ کھلا رہتا تھا کسی کے تئیں اگر موصوف مغفور کے ذریعہ کوئی سفارش بہم پہنچانے کی ضرورت لاحق ہوتی تو فوراً ہی اس کا کام انجام دینے کے واسطے تیار ہو جاتے اور حتی الوسع اُسے دوبارہ التجا کرنے کا موقع نہیں دیتے تھے۔ اُن کے شاگردوں کی تعداد بے انتہا رہی۔ اور سب پر اُن کی عنایتیں آخر وقت تک جاری رہیں۔ فارغ التحصیل ہو جانے کے بعد بھی اُن کا شاگرد اُن کی ذات مجموعہ صفات پر کامل بھروسہ کر سکتا تھا اور جس وقت بھی ضرورت ہوتی، موصوف علیہ الرحمۃ کو زحمت دیکر اپنی مطلب براری کی کوششیں اُن کے ذریعہ کر سکتا تھا۔ بڑے سے بڑے اشخاص کے پاس خود جا کر کسی کے لیے سفارش کرنے میں اُنہیں مطلق پس و پیش نہیں ہوتا تھا۔ اور اس قدر خلوص و مستعدی کے ساتھ غیروں کا کام انجام دینے میں منہمک ہو جایا کرتے تھے کہ بالعموم لوگوں کو یہی گمان ہوتا کہ اپنے کسی خاص عزیز کے لیئے دوڑ دھوپ کر رہے ہیں۔ اور چونکہ ہندو مسلمان عیسائی وغیرہ ہر طبقہ اور ہر جماعت کے لوگوں میں بلا امتیاز مذہب و ملت یکساں طور پر ممدوح تھے اس لیے اُن کی کوششیں بھی بار آور ہو جاتی تھیں، اور پر خلوص، بے غرض، اور بغیر دکھلاوے کی زحمتوں کا صلہ بارگاہ ایزدی سے ملجایا کرتا تھا۔ مرحوم نے ایسا دردمند دل پایا تھا کہ اس کی مثال کم از کم موجودہ زمانے کے مسلمانوں میں تو یقیناً مشکل سے نظر آئیگی۔ اپنے نام و نمود کا احساس یا اپنے فضل و کمال اور بلندیٔ مرتبہ کا خیال اُنہیں کبھی ہوا ہی نہیں۔ انکسار و اخلاق کا یہ عالم تھا کہ چھوٹے بڑے سب سے جھک کر ملتے تھے۔ اُن کے شاگردوں کے شاگرد بھی برابر اسی تمنا میں رہے کہ راہ چلتے سلام ہی کسی طرح موصوف علیہ الرحمۃ کی طرف سے سبقت نہ ہونے پائے۔ مگر واقعہ یہی ہوا کرتا کہ ابھی آپ کی نگاہ اُن سے اچھی طرح ملی بھی نہیں اور ادھر استاذ الاساتذہ کے شفقت بھرے مخصوص الفاظ کانوں میں گونجنے لگے کہ "السلام علیکم۔ حضرت" یا "آداب عرض ہے جناب" کے ساتھ ہی مزاج پرسی اور دریافت حال فرما رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مرحوم و مغفور حسن اخلاق کے ایک ایسے مجسمہ تھے جس کی نظیر ملنی آج مشکل ہے۔

اُن کی مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ ایک طرف درس تدریس کا سلسلہ، پریسیڈنسی کالج کے فرائض کی انجام دہی، کلکتہ یونیورسٹی کی لکچراری وغیرہ، اور دوسری جانب تصنیف وتالیف کا شبانہ روز مشغلہ، رائل ایشیاٹک سوسائٹی اور امپیریل لائبریری سے گہرا تعلق، ہند اور بیرونجات کے انگریزی و اردو جریدوں اور رسالوں میں مضمون نگاری، پھر ان کے ساتھ ساتھ شہر کلکتہ کے تقریباً کل بڑے بڑے علمی و ادبی و اصلاحی و معاشرتی اداروں اور انجمنوں کے عملی کارکن اور سرگرم ممبر تھے۔ چنانچہ کسی انجمن کا کوئی بھی جلسہ معمولی ہو یا غیر معمولی، ایسا نہ ہوتا کہ جس میں موصوف خود بہ نفس نفیس شریک نہ رہا کرتے ہوں اور اُس میں کوئی عملی حصہ نہ لیتے ہوں ۱۹۲۶ء میں جبکہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے افسر اعلیٰ (پرنسپل) مقرر ہوئے تو موصوف کے لیئے فرصت کے لمحے اور بھی مفقود ہو گئے۔ مگر باوجود ایسی مصروف زندگی کے اُن کی وضعداری میں کبھی بھی مطلق فرق نہ آیا۔ اور اپنے عزیزوں دوستوں سے برابر حسب دستور سابق ملتے جلتے رہے اُن کے رنج و خوشی کے موقعوں پر ہمیشہ شریک حال رہے اور اُنکے ہر کام کو اپنا خاص کام سمجھکر اُن کی عملی تائید سے کبھی باز نہ آئے۔ مرحوم اگرچہ مدرسہ عالیہ کی پرنسپل شپ سے ۱۹۳۵ء میں پنشن پاکر علیحدہ ہو چکے تھے لیکن اُن کا علمی مشغلہ اور مفاد عامہ کے متعلق اُن کی

کوششوں کا سلسلہ آخر عمر تک جاری رہا۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا تعلق تو برقرار تھا ہی، اور موت سے کچھ عرصہ پیشتر حکومت بنگالہ نے انہیں خاص طور پر لیڈی برابورن کالج میں عربی و فارسی کی پروفیسری کا عہدہ عنایت کر دیا تھا، نیز کلکتہ یونیورسٹی کے بھی لکچرار مقرر ہوئے تھے۔ مگر افسوس ہزار افسوس کہ زندگی نے وفا نہ کی اور پنجشنبہ، ۲۰۔ نومبر سنہ ۱۹۴۱ء کو بوقت ساڑھے چار بجے شام، سفر آخرت اختیار فرمایا۔ رحمۃ اللہ علیہ

استاذ مغفور کی وفات کا سانحہ بھی اُن کی مصروفیت پسند زندگی کے سلسلہ میں ایک عجیب واقعہ تھا۔ بلا شبہ اس طرف کچھ عرصہ سے مرحوم کی صحت قابل اطمینان نہ تھی، اور اکثر و بیشتر اختلاج قلب کی شکایت رہا کرتی تھی۔ دوائیں استعمال میں تھیں اور بظاہر مرض میں شدت کا مطلق پتہ نہ تھا۔ البتہ آرام لینے کی انہیں قطعی طور پر فرصت نہیں ملتی تھی تعطیل کے دنوں میں اور بالعموم شب کے وقت بھی اپنے تصنیف و تالیف کا شغل نہیں چھوڑتے تھے۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مجھے کام کرتے رہنے ہی میں لطف ملتا ہے۔ خاموش بیٹھا نہیں جاتا۔ طبیعت گھبرانے لگتی ہے میرا یہ شغل میری طبیعت ثانیہ بنکر ساتھ ہو گیا ہے۔ انتقال سے مہینہ ڈیڑھ مہینہ پیشتر، ماہ اکتوبر میں، بغرض تبدیل آب و ہوا، مدھو پور تشریف لیگئے تو اپنے ساتھ کتابوں اور مسودوں کا بقچہ بھی لیتے گئے۔ اور دو ہفتوں کے بعد ہی یہ فرماتے ہوئے کلکتہ واپس چلے آئے کہ بہتیرے کام انجام دینے کے لئے پڑے ہیں۔ یہاں آکر پھر وہی مصروفیت جاری ہو گئی۔ انتقال کے دن اچھے خاصے، تندرست تھے حسب معمول غسل وغیرہ سے فراغت فرماکر گیارہ بجے دن کو لیڈی برابورن کالج تشریف لے گئے اور وہاں سے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے دفتر کی جانب روانہ ہوئے۔ سوسائٹی میں اپنی آخری تالیف "یادداشت بایزید بیات (MEMOIRS OF BAYAZID BYAT) کے لئے جس کی تکمیل ہو چکی تھی، دیباچہ اور سرورق وغیرہ تحریر فرمایا اور طباعت کے متعلق آخری ہدایات دفتر والوں کو دیکر گھر واپس آئے، یہاں سب کے ساتھ کھانا نوش فرمانے کے بعد کلکتہ یونیورسٹی کی جانب تشریف لے گئے۔ یونیورسٹی کے لیکچر سے فراغت فرما کر وہیں پر بورڈ کی ایک میٹنگ میں چار بجے تک شریک رہے۔ میٹنگ ختم ہو جانے کے بعد گھر واپس تشریف لا رہے تھے کہ ایک راستہ ہی میں قلب کی حالت خراب ہونے لگی۔ ڈرائیور تیز رفتاری سے گاڑی لیے ہوئے گھر پہنچا مگر اس وقت تک بیہوشی طاری ہو چکی تھی۔ ہاتھوں ہاتھ اٹھا کر اندر لائے گئے۔ بغل ہی کے مکان میں ڈاکٹر موجود تھا، وہ آیا اور ابھی علاج کی تدبیریں سوچ ہی رہا تھا کہ پانچ منٹ کے اندر اندر مقدس روح نے قفس عنصری چھوڑ کر عالم بالا کا راستہ اختیار کیا۔ اس طرح یہ سرزمین بنگالہ کی یہ شمع ہدایت، جو ستّر سال تک اپنی ضو فشانی کر چکنے کے بعد یکایک خاموش ہو گئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

انتقال پر ملال کی سنسنی خیز خبر اسی وقت پنجشنبہ کی شام کو نماز مغرب سے پہلے پہلے تمام شہر کلکتہ میں پھیل گئی اور عزیز و اقارب دوست و احباب، معتقدین اور شاگردان، سب کے سب مغموم و محزون جوق در جوق دولتکدہ پر جمع ہونے لگے۔ سب کو حیرت تھی کہ یکایک یہ کیا ہوا۔ اور سب ہی افسردہ تھے کہ ایسے شفیق اور مخلص بزرگ کا سایہ اس قدر جلد اُٹھ گیا۔ کل لوگوں کی متفقہ رائے سے تجہیز و تکفین کے لئے صبح، نماز جمعہ سے پیشتر کا وقت مقرر ہوا، اور ساری رات تلاوت قرآن مجید میں گذاری گئی جسد مبارک کے چاروں طرف اپنے اور بیگانے اسی طرح جمع تھے کہ جیسے شمع کے گرد پروانے ہوں، صبح ہوتے ہوتے خبر اور بھی زیادہ منتشر ہو گئی۔ اخبارات کے ذریعہ اطلاع عام ہو چکی تھی۔ تقریباً دس بجے دن کو نماز کے لیے جنازہ مدرسہ عالیہ کلکتہ سے ملحق ویلزلی اسکوائر میں لایا گیا۔ مجمع کی کثرت ناقابل بیان تھی، ہر مذہب و ملت کے لوگ شریک جنازہ تھے، یونیورسٹی اور کالجوں کے پروفیسر اور طلبا۔ مدرسہ عالیہ اور دیگر اسکولوں کے اساتذہ اور طلباء۔ سرکاری دفاتر کے بڑے چھوٹے ملازمین، علی الخصوص محکمہ تعلیمات کے کل معزز افسران، ججان ہائیکورٹ۔ ممبران رائل ایشیاٹک سوسائٹی، شہر کی مختلف انجمنوں کے اراکین۔ عمائدین شہر کلکتہ۔ غرض خاص و عام کی کثیر تعداد موجود تھی۔ شہر سے باہر قبرستان تک جنازے کے ساتھ ساتھ لوگوں کا ایسا ہجوم تھا کہ کم ہی مشاہدہ میں آتا ہے، پیکر اقدس کو جس وقت قبر کے اندر اُتارا گیا اور رُوئے انور پر سے چادر ہٹائی گئی تو حاضرین کی کیفیت قابل دید تھی۔ اس خلق مجسم ممدوح خلائق ہستی کی آخری زیارت کا فخر حاصل کرنے کیلئے

گئے شہر ہے تھے اور قوم وملت کے ایک حقیقی بہی خواہ، اور
علم وادب کے ایک سچے پرستار کو الوداع کہہ کر اپنی روتی ہوئی
آنکھوں سے اپنے دلی جذباتِ ملال والم کا اظہار کرتے نظر آ رہے تھے
افسوس صد ہزار افسوس سہ

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

شمس العلماء حضرت ارامگاہ کی علمی وادبی کاوشوں کا بالتفصیل ذکر کرنا اس وقت ممکن نظر نہیں آتا۔ اُن کے گراں بہا تحقیقاتی مضامین اور مقالے، ایک دو نہیں بلکہ سیکڑوں کی تعداد میں انگریزی، اردو کے مختلف رسالوں اور ماہناموں وغیرہ کے اندر منتشر صورت میں موجود ہیں۔ بنگال رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے ماہانہ جرنل میں شاید ہی کبھی اتفاق سے استاذ مغفور کا کوئی علمی مقالہ شائع نہ ہوسکا ہو۔ جرنل مذکور کے مخصوص طور پر مستقل مضمون نگار تھے۔ اسی طرح اسلامک کلچر (حیدرآباد دکن) میں اُن کے مسلسل مقالے برابر نکلا کرتے تھے۔ فرنگستان میں [illegible] دائرۃ المعارف اسلامیہ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM) کی تدوین ہونے لگی تو مستشرقین یورپ کی نگاہِ انتخاب مقالہ نگاروں کے سلسلہ میں حضرت استاذ پر بھی پڑی۔ چنانچہ دائرۃ المعارف اسلامیہ کی مجلدات میں آپ کے چھوٹے بڑے متعدد مضامین بکھرے پڑے ہیں اور غالباً ہندوستان کے ادباء اور محققین کے دائرے میں محض مولانا مرحوم کی ذات گرامی تنہا اس قابل سمجھی گئی کہ جو اس عظیم الشان بین الاقوامی خدمت میں حصہ لے سکتی تھی۔ امپیریل لائبریری کلکتہ کی شاخ، بوہار لائبریری اور کتب خانہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے عربی و فارسی مخطوطات کی تفصیل وار مکمل فہرستیں آپ کی ادبی زحمتوں کی شاہد ہیں۔ نیز مآثر رحیمی، کشف المحجوب (الاستار)، تاریخ شاہی، تذکرہ خوشنویسان، تاریخ شوستر، طبقات اکبری، تاریخ مبارک شاہی، ہدایت الآداب، شمایل ترمذی، ہدایت العربیہ، یادداشت بایزید بیات، وغیرہ وغیرہ کی ضخیم ضخیم جلدیں ہیں کہ جنہیں حضرت مغفور نے شب و روز زحمتوں کا ر

رکھا ہے، قابل قدر تحقیقاتی نکات، فاضلانہ تنقیدی حاشیے، یا انگریزی ترجمے کے ساتھ شائع فرمایا، اُن کے استقلال اور اُن کے گہرے علمی ذوق کے متعلق کھلے ثبوت پیش کرتی ہیں اور دیکھنے والوں کو حیرت زدہ بنا دیتی ہیں کہ ایک ایسا معروف انسان اتنی بڑی بڑی ادبی خدمات کامیابی کے ساتھ انجام دینے پر کیونکر اور کس طرح قادر ہوسکتا ہے۔

بلاشبہ حضرت فردوس مکاں کی قابل تقلید مقدس اور معروف زندگی کا ایک ایک لمحہ سالکین علم وادب اور صاحبانِ ذوق کی راہ تحقیق میں مشعل ہدایت کا کام کرتا تھا۔ اُن کی سعی دیکھ کر حوصلے بڑھتے تھے اور اُن کی کاوشوں کا خیال کر کے ہمت افزائی ہوتی تھی۔ جناب مغفور علمی وادبی نکات کی تحقیق و تدقیق کے سلسلہ میں مشرقی و مغربی دونوں طریقوں سے بدرجۂ اتم واقف تھے اور اس خصوص میں اپنے نو خیز شاگردوں کو بھی برابر مطلع اور باخبر فرمایا کرتے تھے۔ اُن کے ساتھ کام کرنے میں ایک خاص لطف محسوس ہوتا تھا۔ اور کچھ ہی دنوں کے اندر اپنی صلاحیتوں میں کافی اضافہ معلوم ہونے لگتا تھا۔ کتابوں کی چھان بین کرنے اور اُن کے اندر سے باریکیاں ڈھونڈ نکالنے میں اُنہیں خاص ملکہ حاصل تھا اور مشرق و مغرب کے مشاہیر کی ساری اہم تصنیفات و تالیفات سے اس طرح باخبر تھے کہ جب بھی کبھی موقع آن پڑتا اور کسی خاص موضوع کے متعلق کوئی حوالہ دریافت کیا جاتا، فوراً آگاہ فرما دیا کرتے تھے۔ موصوف مرحوم کی ذات مجموعۂ کمالات، تحقیق علم وادب کے سلسلہ میں ایک زندہ دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) کا حکم رکھتی تھی۔ اور پھر لطف یہ کہ دوسروں کے تئیں اپنا خاص انداز کار اور تلاش و جستجو کرنے کا ڈھنگ بتلا دینے میں مطلق انکار نہیں فرماتے تھے۔ اسی لیے جس نے بھی اپنی خوش نصیبی کی بدولت استاذ مرحوم سے فیض حاصل کرنے اور اُن کی زیر سرپرستی معروف کار ہونے کا موقع حاصل کر لیا وہ جلد ہی اس خصوص میں کافی طور پر ماہر ہو گیا اُن کے شاگردوں کی ایک کافی تعداد آج یا تو کالجوں اور اسکولوں میں پروفیسر کی حیثیت رکھتی ہے یا پھر دفاتر سرکاری میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہے

حضرت مولانا مغفور ایک بڑے راسخ العقیدہ اور پاک باطن بزرگ تھے۔ انہیں اولیاء اللہ اور صوفیائے کرام کے حالات زندگی مطالعہ کرنے کا خاص ذوق تھا اور اہل بیت رسول علیہم الصلوٰۃ والسلام سے گہری عقیدت تھی۔ خانقاہ قادریہ، کلکتہ کے مخصوص ارادتمندوں میں تھے اور اپنے مذہبی عقائد کا اظہار اور دینی مراسم کی پابندی علی الاعلان فرمایا کرتے تھے۔ واقعۂ شہادت حضرت سیدنا امام حسین علیہ السلام کی سیزدہ صد سالہ یادگار منانے کے سلسلہ میں شہر کلکتہ کے اندر جب انجمن یادگار حسینی قائم ہوئی تو مولانا مرحوم اس کے نائب صدر مقرر ہوئے تھے۔ انجمن مذکور کے متعلق کاموں میں موصوف مغفور نے جس سرگرمی اور جوش خروش کا اظہار فرمایا وہ فی زمانہ کم ہی دیکھا جاتا ہے۔ اکثر و بیشتر خود اپنے دولتکدہ پر اراکین انجمن کو مدعو فرماتے اور ان کی خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے تھے۔ عمایدین شہر کی ایک کافی تعداد محض مولانا کی دلچسپی دیکھ کر انجمن یادگار حسینی کی شریک حال تھی۔ چنانچہ ان کی رحلت کے بعد اراکین انجمن پر کچھ ایسا جمود طاری ہوا کہ حصول مقاصد کے سلسلہ میں جس کامیابی کی امید کی جاتی تھی وہ کم از کم صوبہ بنگال اور شہر کلکتہ میں پوری نہ ہو سکی۔ اور انجمن کا کام ایک حد تک ادھورا ہی رہ گیا۔ یہ محض ایک ادارے کا حال بیان کیا گیا۔ اور ایسے ایسے معلوم نہیں کتنے انجمنوں کے کام ہونگے جن میں حضرت مولانا کی بے وقت وفات کے سبب خلل آپڑا ہوگا۔ بنگال رائل ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ کے ایک غیر معمولی جلسے میں سکریٹری نے اپنی تعزیتی تقریر کے دوران میں یہ کہکر کہ "آج شمس العلماء کی موت نے سوسائٹی کو صحیح معنوں میں مفلس بنادیا اور یہی حال بہتیرے دیگر علمی و ادبی اداروں کا ہوا ہوگا" پبلک کے جذبات کی نہایت خوب ترجمانی کی تھی۔

حضرت مولانا نے اپنی اولاد میں ماشاء اللہ تین صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں چھوڑی ہیں۔ فرزند اکبر مسٹر سید وجاہت حسین ایم۔ اے، بی۔ ٹی، اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز، پریسیڈنسی ڈویزن بنگال ہیں اور دوسرے فرزند مسٹر سید عنایت حسین، بی اے گورنمنٹ اسکول کلکتہ میں ملازم ہیں۔ چھوٹے صاحبزادے حافظ حسین سلمہ کا سلسلہ تعلیم ہنوز جاری ہے۔ صاحبزادیاں بھی ماشاء اللہ زیور علم سے ہر طرح آراستہ ہیں۔ عزیز محترم سید وجاہت حسین صاحب کو اپنے خاندان کی دیرینہ روایات کے مطابق کافی علمی ذوق ہے۔ چنانچہ اب تک متعدد کتابیں اور رسالے تالیف کر چکے ہیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:۔

(۱) کتابیہ الاسخیا (جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی سنہ ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی)

(۲) تذکرۂ محمود گاوان (جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی سنہ ۱۹۳۵ء میں چھپا۔

(۳) تاریخ گوروپنڈوا (مطبوعہ سعیدی پریس کانپور)

(۴) اردو ترجمہ "پارسیان اہل کتابند"۔ (ماہنامہ "نگار" لکھنؤ سنہ ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا)

(۵) تذکرۂ آزاد بلگرامی۔ (جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی سنہ ۱۹۳۶ء میں طبع ہوا)

عزیز موصوف الصدر کے علمی و ادبی رجحان کو دیکھتے ہوئے یہ امید کیجا سکتی ہے کہ اپنے والد ماجد مغفور کے گرانبہا مسودات کے ذخیرے کی جانب بھی پوری توجہ فرمائیںگے اور انہیں ضائع نہ ہونے دیںگے۔ حضرت مولانا مرحوم کے بہتیرے نادر مقالے اور متعدد تالیفات کے مسودے تقریباً مکمل صورت میں موجود ہیں۔ اگر کوشش کیجائے تو یہ سارے بیش قیمت جواہر پارے رفتہ رفتہ منظر عام پر آکر شائقین علم و ادب کو استفادہ پہنچا سکتے ہیں۔

طاہر رضوی

نقش سلیمانی

رسالہ نگار رباب دسمبر ۱۹۷۰ء میں نقوش سلیمانی، مؤلفہ مولانا سید سلیمان ندوی پر پچاس سے زیادہ شبہات اور اعتراضات کیے گئے تھے۔ یہی تبصرہ بعض ترمیمات کے ساتھ بنگال کے رسالہ جدید اردو نے شائع کیا۔ اس مضمون میں اس بات کا اظہار کر دیا گیا تھا کہ یہ شبہات ہم نے اپنے موجودہ معلومات کی بنا پر کیے ہیں۔ اگر خود مولانائے موصوف یا اُن کے کوئی ذمہ دار شاگرد ہمارے شبہات کا ازالہ کر دیں تو ہمیں اپنی رائے بدلنے میں قطعاً تامل نہ ہوگا۔ چھ مہینے کے بعد سید صاحب نے تو نہیں لیکن اُن کے ایک شاگرد اور دار المصنفین کے رفیق نے ندیم جولائی ۱۹۷۱ء میں ہمارے بعض اعتراضات کے جواب کی کوشش کی اور بقیہ کی طرف سے خوشی اختیار کی۔ دو تین ماہ تک اس بات کا انتظار رہا کہ بقیہ اعتراضات کے جواب بھی شاید دیئے جائیں لیکن جب مایوسی ہوئی تو یہ مضمون سپرد قلم کیا گیا جس میں اُن کے جوابات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۱) مخدوم الملک کی طرف جو دوہے سید صاحب قبلہ نے منسوب کیے تھے ہم نے انہیں قابل قبول نہیں سمجھا تھا یہ جانتے ہوئے بھی کہ شفاء الامراض حکیم محمدی میں موجود ہیں اس لیے کہ حکیم محمدی کی سند ہمارے نزدیک معتبر نہ تھی وہ مخدوم الملک کے معاصر یا اس زمانہ کے بھی نہیں بلکہ بہت بعد کے ہیں۔ پھر اس قسم کے دوہے یا اشعار جو اکابرین اور بزرگوں کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں وہ یوں بھی زیادہ قابل اطمینان نہیں ہوتے۔ لوگ عموماً تبرکاً ان کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ آج کون نہیں جانتا کہ فارسی کا وہ دیوان جو غوث الاعظمؒ کی طرف منسوب ہے ان کا نہیں۔ تزک تیمور شہنشاہ تیموری کی نہیں بلکہ شاہ جہاں کے عہد کی لکھی ہوئی جعلی کتاب ہے۔ ہمایوں نورجہاں۔ عالمگیر سراج الدولہ (اور محمد شاہ کے بعض) اردو اشعار جو ان کی طرف منسوب ہیں حقیقت میں اُن کے نہیں۔ یہ اشعار یوں بھی مشکوک معلوم ہوتے ہیں جب ہم انہیں آب حیات میں امیر خسرو کے نام پر دیکھتے ہیں۔ اس سے کم از کم اتنا تو معلوم ہو گیا کہ یہ اشعار دوسروں کی طرف بھی منسوب ہیں۔ اب آزاد کا یہ بیان کہاں تک صحیح ہے اس کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے۔ بخوبی ممکن ہے کہ یہ دوہے ان دو بزرگوں میں سے کسی کے بھی نہ ہوں

(۲) مندرج اشعار کے متعلق ہم نے لکھا تھا کہ صحیح درج نہیں ہوئے ہیں اور پھر اُن کی تصحیح درج کی تھی۔ اس بات پر تنقید نگار کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے "کتاب ہذا میں بہت سی جگہوں پر مرکز اور نقطے چھوٹ گئے ہیں" ان کا خیال ہے کہ ہم نے بہت ناجائز خردہ گری سے کام لیا ہے ذیل میں ہندستان کے سب سے اونچے معیاری رسالے رسالہ اردو، اورنٹیل کالج میگزین اور خود رسالہ معارف کی بعض تنقیدوں کے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔ براہ کرام بتایا جائے کہ کیا عبدالحق، پروفیسر شفیع، محمد سلیمان ندوی بھی ناجائز خردہ گریوں سے کام لیتے ہیں اور بے کار وقت ضائع کرتے ہیں

(الف) جس کلام کا انتخاب کیا گیا ہے اس کے پڑھنے میں محنت سے کام نہیں لیا گیا ہے اور جیسا غلط سلط لکھا ہوا تھا ویسا ہی نقل کر دیا گیا ہے مثال کے طور پر ع جیوں پھول تازہ اس منے جیوں پوتلی بوجن ہے، میں لفظ 'بوجن' نہیں 'موچن' ہے 'پوتلی' نہیں 'پتلی' ہے اسی طرح 'بور ہے' نہیں 'بوٹے' ہیں (تنقیدات عبدالحق ص۱۱۱)

(ب) اس کتاب میں متعدد لفظی اور معنوی مسامحات اور فروگزاشتیں نظر آتی ہیں۔ املا کی غلطیاں بکثرت ہیں ہم بعض کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

مصر کے شہر اسیوط کو 'اسیوت' لکھا ہے۔ شام کے شہر کا املا 'تدمر' ہے 'تدمور' نہیں، 'دمن ہور' کا صحیح 'دمنہور' ہے، 'زامسس' [illegible] ہے 'بندوقدار' نہیں، 'بندقدار' ہے، 'قاید القواد' نہیں 'قاید القواد' ہے، خلیفہ کا نام 'ہوالعصر' نہیں 'المعتضد' ہے، 'دمیاط' کو 'دمیات'

لکھ دیا ہے۔ ملکہ کا نام قمر النداء نہیں قمر الندیٰ ہے۔ اسی طرح طوطا چشمی کے بجائے طوطا چشمی، "دل ربا" کو "ذلہ ربا"، "تحت الثریٰ" کو "تحت السری" "ذوی القربیٰ" کو ذوی القربا لکھ دیا ہے "سنگ شانہ" کو سنگ سانہ لکھنا سخت بے دردی ہے، مسرف کو ہر جگہ مصرف لکھا ہے۔ والی الابل کیف خلقت قران میں کہیں نہیں الی الابل کیف خلقت ہے (معارف ستمبر ۲۸ء صفحہ ۳۲۴)

(ج) "عیا نیش" کی جگہ "عنانیش" ہوگا، پہلے مصرع میں بجائے "برہ" "پرہ" ہوگا۔ "ازہ" نہیں "ارہ" ہونا چاہئے، "بیا نے" نہیں "بیایے" "بے گزہ" کی جگہ "لرہ" ہے "برادت" کے بجائے "زایت" صحیح ہے "دپرجاش" نہیں "پرخاش" صحیح ہے "راخبرہا" غلط ہے "باچترہا" یا "ازچترہا" ہونا چاہئے
(اورینٹل کالج میگزین نومبر ۳۴ء مرتبہ پروفیسر شفیع)

اگر کوئی صاحب خان بہادر ضمیر الدین احمد کی کتاب سیرت الشرف کو سب سے زیادہ مستند تذکرہ سمجھتے ہیں تو اُن سے ہمیں شکایت نہیں یہ اپنی اپنی "بصیرت" اور "علم کی بضاعت" پر منحصر ہے

(۳) دواوین مصحفی سے متعلق ہمارا اصل اعتراض یہ ہے کہ ان کا لکھنو سے چھپ کر شائع ہونا صحیح نہیں ہے جیسا کہ سید صاحب کا خیال ہے "مصحفی کا تقریباً سارا کلام اب تک غیر مطبوعہ پڑا ہوا ہے۔ صرف اردو کے چار دواوین کا انتخاب رام پور سے شائع ہوا اور وہ بھی اس صورت میں کہ نہ شائع ہونا بہتر تھا۔ وہ دواوین مصحفی کے تو نہیں ہاں امیر مینائی مرحوم کے کہے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ انہیں کا ذوق انتخاب ان میں پایا جاتا ہے۔"

(۴) ایک جگہ حوالے میں کاتب نگار کی غلطی سے صفحہ ۵۰۴ کے بجائے ۴۰۵ لکھا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے "خدا جانے کس نقوش سلیمانی کا ذکر ہے۔ کتاب تو ۴۹۱ صفحہ پر ختم ہو جاتی ہے۔" ایسی معمولی غلطیاں اکثر ہو جاتی ہیں۔ نقوش سلیمانی صفحہ ۵۰۴ پر "بادشاہ نامہ" کے حوالے سے ایک عبارت درج ہے اور صفحہ ۴۰۵ لکھا ہے حالانکہ صفحہ ۵۰۴ کا کیا ذکر صفحہ ۵ ملکہ .. اصفحہ پر بھی یہ عبارت آپ کو مل جائے تو اپنی خوش قسمتی سمجھئے۔

(۵) ولی کا گجراتی ہونا زیادہ قرین قیاس ہے اس لیے ہم نے اس کے دکنی ہونے سے اختلاف کیا تھا۔ جواب میں کہا گیا ہے کہ عبدالحق احسن مارہروی مرتب کلیات ولی محی الدین قادری اور خود ولی اپنے کو دکنی کہتا ہے۔ ولی کی وطنیت کے متعلق عبدالحق صاحب کا بیان درج کیا جاتا ہے ناظرین فیصلہ کرلیں کہ کیا وہ اسے دکنی سمجھتے ہیں:-

"سب سے پہلے میر نے اسے اورنگ آبادی لکھا ہے۔ یہ نہیں کھلا کہ ان کی اس اطلاع کا ماخذ کیا ہے۔ خواجہ حمید اورنگ آبادی اُسے گجرات ہی کا بتاتے ہیں۔ قائم نے اپنے تذکرہ مخزن نکات میں اس کا مولد گجرات لکھا ہے۔ گلزار ابراہیم میں بھی اسے گجرات ہی سے منسوب کیا ہے۔ آزاد نے بھی اس کا وطن گجرات قرار دیا ہے۔ جو لوگ ولی کو دکن کا کہتے ہیں وہ اس کا یہ شعر سند میں پیش کرتے ہیں

ولی ایران و توران میں ہے مشہور اگرچہ شاعر ملک دکن ہے۔

لیکن مولف کی رائے میں ملک دکن سے وہ خاص خطہ مراد نہیں ہے جو گجرات سے الگ نربدا کے جنوب میں واقع ہے۔ نیز (اس تذکرہ کا مولف) کہتا ہے کہ بلدۂ احمد آباد کے ثقات سے بھی یہی سننے میں آیا ہے کہ ولی گجرات کا باشندہ تھا۔ چونکہ ولی کا زیادہ زمانہ احمد آباد میں بسر ہوا اور تعلیم بھی وہیں ہوئی۔ سورت کی مدح میں ایک مثنوی تصنیف کی اور گجرات کے فراق میں کچھ شعر لکھے۔ اس کا مدفن بھی احمد آباد میں ہے اس لیے اکثر لوگوں نے اسے گجراتی ہی قرار دیا ہے اور اس کا وطن بجائے اورنگ آباد گجرات مشہور ہو گیا" (مقدمہ تذکرہ شعرائے گجرات صفحہ ۸)

رہا کلیات ولی کا مقدمہ۔ اس کے لیے کلیات کی دوسری اشاعت کا انتظار کیجئے جو انجمن کے زیر طبع ہے۔ خود گجرات کے مشہور محقق ندوہ کے مایہ ناز فرزند اور ہمارے محترم پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی کی تحقیق یہی ہے کہ ولی دکنی نہیں بلکہ گجراتی ہے۔ بعض قدیم کاغذات کے مطالعہ کے بعد انھوں نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے اور اب وہ مجلد کتاب کی صورت میں منظر عام پر لانے والے ہیں۔

(۶) سال وفات ولی کے سلسلہ میں مضمون نگار نے سارا قصور عبدالحق اور انجمن ترقی اردو پر تھوپ دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ قصور سید صاحب کا نہیں بلکہ عبدالحق اور انجمن ترقی اردو کا ہے جس نے کلیات ولی میں ۱۱۵۵ھ سال وفات درج کیا ہے۔ حالانکہ مولانا عبدالحق نے اپنی تحقیق رسالہ اردو میں شائع کردی ہے جس کا عنوان ہے "ولی کا سال وفات" جس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ صحیح ۱۱۱۹ھ ہی ہے اسلیے اس کا الزام ان پر عائد کرنا درست نہیں معلوم ہوتا۔

(۷) سید صاحب قبلہ نے یہ ارقام فرمایا تھا کہ "تیرھویں صدی کے اوائل سے کثرت استعمال کے سبب یہ اضافت لغوی جاتی رہتی ہے اور خود زبان کا نام اردو ہو جاتا ہے (نقوش ص ۵۵) اور اس کے ثبوت میں مخزن الغرائب (۱۲۱۸ھ) سے ایک اقتباس پیش کیا تھا جس میں اردو کا لفظ موجود ہے۔ ہم نے لکھا تھا کہ یہ لفظ زبان کے معنوں میں تیرھویں صدی سے نہیں بلکہ بارھویں صدی ہی سے مستعمل ہے چنانچہ ہم نے مصحفی کے تذکروں سے ثابت کیا تھا کہ ۱۲۰۰ھ کے لگ بھگ مصحفی نے اپنے تذکروں میں یہ لفظ زبان کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ابھی حال میں کلیات تپش کا ایک قلمی نسخہ دیکھ رہا تھا "گلزار مضامین" میں جس کا سال تالیف ۱۱۹۶ھ ہے یہ لفظ بیسوں جگہ موجود پایا "دازاں جاکہ ایں نسخہ در زبان اردو است و زبان اردو مرکب است ....."

لیکن اردو کا لفظ زبان کے معنوں میں جہاں تک ہمارے موجودہ معلومات کا تعلق ہے سب سے پہلے خان آرزو کے یہاں ملتا ہے۔ خان آرزو نے عبدالواسع ہانسوی کے لغت غرائب اللغات کی تصحیح میں مستقل ایک کتاب لکھی جس کا نام "نوادر الالفاظ" ہے (بیلی کا اس کا نام نوادر الغرائب بتانا صحت سے دور ہے) اس کتاب میں دو جگہ اردو کا لفظ زبان کے معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔

(۱) رجوارا :- در رسالہ تحفہ عاجز کے فواحش دراں سکونت دارند لیکن رجوارا بدیں معنی اصطلاح اہل اردو است — والا در اصل رجوارا محل بودن راجا با است ص ۲؎ A

(۲) نکنھورا :- در عرف اردو وغیرہ بمعنی صرف ناز و غرور است ص ۸ B

(نوادر الالفاظ مصنفہ سراج الدین علیخاں آرزو نسخہ خدا بخش ۱۱۶۵ھ) (نوادر الالفاظ کا سال تالیف ۱۱۶۵ھ ہے

راقم نے تبصرہ میں اپنا خیال ظاہر کیا تھا کہ یہ لفظ مصحفی کے ابتدائی دواوین میں بھی کہیں نظر سے گذرا ہے۔ ہمیں دواوین کے مطالعے کا اس وقت موقع نہ تھا۔ ابھی حال میں مطالعے کا اتفاق ہوا۔ ان کا ایک شعر ہے ؎

البتہ مصحفی کو ہے ریختہ میں دعویٰ ۔۔۔ یعنی کہ ہے زباں داں اردو کی وہ زباں کا

یہ غزل اس دیوان میں ہے جو ۱۲۰۰ھ کے پہلے مرتب ہوا ہے اور اس میں کل وہ غزلیں اور مثنویاں شامل ہیں جو مصحفی نے دہلی میں لکھی تھیں۔ اس دیوان میں مثنوی "جذبۂ عشق" اور "طفل حجام" بھی ہے۔ جذبۂ عشق ۱۱۹۵ھ کے لگ بھگ لکھی گئی۔ طفل حجام کے بعض اشعار تذکرہ میر حسن میں بھی موجود ہیں جو ۱۱۸۶ھ اور ۱۱۹۲ھ کے درمیان میں مرتب ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مثنوی ترتیب تذکرہ سے پہلے لکھی گئی تھی۔ ایک دوسرا شعر ہے

خدا رکھے زباں ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی ۔۔۔ کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے

شعر کی اندرونی شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ شعر اس وقت لکھا گیا تھا جب میر اور سودا زندہ تھے۔ اس لحاظ سے یہ شعر ۱۱۹۵ھ سے پہلے لکھا گیا ہے۔ انہیں کا ایک اور شعر ہے ؎

اے مصحفی قسم ہے کہ اردو کے شعر میں ۔۔۔ نت جو چٹکلے نکالے تیری زباں نئے

اگر ۱۲۱۸ھ سے پہلے ۱۱۹۵ھ، ۱۱۷۵ھ یا اس سے بھی پہلے کی تحریروں سے ہم ثابت کرنا چاہیں کہ اس لفظ کا استعمال زبان کے معنوں میں قدیم ہے تو اس میں ہمارا قصور کیا ہے؟ اور خفگی کی کیا بات ہے؟

(۸) سید صاحب کا خیال ہے کہ دریائے لطافت ۱۲۲۲ھ میں لکھی گئی۔ تنقید نگار نے اعتراض کیا تھا کہ ۱۲۲۲ھ سال تصنیف نہیں سال تکمیل ہے کتاب کی ابتدا شاہ عالم کے زمانے میں ہی ہو چکی تھی جن کا سال وفات ۱۲۲۱ھ ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس کی ابتدا ۱۲۲۱ھ سے پہلے ہی ہو چکی تھی اصل یہ ہے کہ جب کوئی کتاب زیادہ مدت میں لکھی جاتی ہے تو اس کا سن تالیف کوئی مخصوص سال نہیں بتایا جاتا ہے بلکہ کہا جاتا ہے کہ فلاں سنہ سے شروع ہو کر فلاں سنہ میں کتاب ختم ہوئی۔ یا سن تکمیل لکھدیا جاتا ہے کہ کس سال کتاب ختم ہوئی۔

کاتب نگار نے ایک جگہ ۱۲۲۲ھ کے بجائے ۱۱۲۲ھ لکھدیا ہے صاحب مضمون کا خیال ہے کہ ہم نے سید صاحب پر خواہ مخواہ اعتراض کیا ہے اور کذب و افترا سے کام لیا ہے۔ ہمارا اعتراض صرف ۲۱ اور ۲۲ اور سال تالیف و تکمیل سے متعلق ہے۔ گیارہ سو اکیس ۱۱۲۱ھ کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے کہ سید صاحب قبلہ لکھ سکتے ہیں۔ ہاں ہمارے کرمفرما سید ریاست علی صاحب نے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے ہر جگہ ۱۱۲۱ھ اور ۱۱۲۲ھ لکھا ہے حالانکہ ۱۱۲۱ھ میں نہ تو شاہ عالم پیدا ہوئے تھے اور نہ سید انشا، عالم وجود میں آئے تھے یہ نہ کہدیا جائے کہ یہ کاتب ندیم کی غلطی ہے اس لیے کہ یہ غلطی ایک جگہ نہیں ۴ سطروں میں پانچ جگہ ہوئی ہے۔ ہمارا تبصرہ نقوش سلیمانی پر جو رسالہ جدید اردو (بنگال) میں شائع ہوا ہے۔ اس میں ۱۲۲۲ھ ہی ہے اور پھر ہم نے تو نگار بابت مارچ ۴۲ء میں اس کی تصحیح شائع کردی تھی کہ سید صاحب نے ۱۱۱۲ھ نہیں ۱۲۲۲ھ لکھا ہے۔

ایسی معمولی غلطیاں تو کتابت کی ہو ہی جاتی ہیں نقوش سلیمانی صفحہ ۱۸۹ میں ہے "قواعد کی حسب ذیل کتابیں ہماری زبان میں موجود ہیں (۱) صرف اردو از شیدا (۲) دریائے لطافت از سید انشا ۱۸۰۲ء" حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ دریائے لطافت اردو زبان میں نہیں فارسی زبان میں لکھی گئی ہے پھر ۱۸۰۲ء اُن کے قول ۱۲۲۲ھ کے مطابق نہیں۔ ان دونوں تاریخوں میں تضاد ہے ایک شخص حیران ہو سکتا ہے کہ ایک محقق کے دو اقوال میں کسے مانے اور کسے چھوڑے۔

سید صاحب نے اثر کا نام محمد میر کے بجائے میر محمد لکھدیا تھا۔ تنقید نگار کے اعتراض پر اس کا مضحکہ اڑایا گیا ہے وہ اسے نہایت معمولی سی چیز سمجھتے ہیں۔ ہم انہیں کس طرح سمجھائیں کہ ہم مثلاً کسی کے نام صباح الدین کو صبیح الدین۔ یا عبدالرحمٰن کو عبدالرحیم لکھدیں تو بھی یہی نہیں کہ یہ واقعیت کے خلاف ہو بلکہ بہت حد تک نامناسب اور ناروا بھی ہے

(۹) عظیم آبادی شعرا کی بحث کے متعلق مضمون نگار نے عجیب غلط بحث سے کام لیا ہے مضمون نگار نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سید صاحب نے ان شعرا کو عظیم آبادی یا بہاری نہیں کہا ہے بلکہ دہلی سے آکر عظیم آباد بسنے والوں میں شمار کیا ہے۔ اس لیے اعتراض بے موقع ہے۔ سید صاحب قبلہ کلام شاد کے مقدمے میں تحریر فرماتے ہیں:-

"اس علمی مرکز کے قدیم سخن وروں میں ایسے بزرگوں کے نام ملتے ہیں جو ولی دکنی میر و سودا اور مرزا مظہر اور خواجہ میر درد کے ہم پہلو تھے۔ عبدالقادر بیدل۔ اشرف خاں فغاں۔ سید محمد شاکر ناجی ہیبت علی خاں حسرت وغیرہ ایسے سخن ور گزرے ہیں جن کی محنتوں اور کاوشوں سے اردو زبان نے ترقی پائی ہے" (نقوش سلیمانی صفحہ ۳۹)

مندرجہ بالا سطور سے تو قطعاً ان کے دعویٰ کی تصدیق نہیں ہوتی۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سید صاحب ان تمام شعرا کو عظیم آبادی سمجھتے ہیں۔ اور پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر وہ انہیں عظیم آبادی نہیں سمجھتے ہیں تو ماثر الکرام گلشن ہند اور گلزار ابراہیم کے حوالوں سے بیدل۔ فغاں۔ عشق وغیرہ کو عظیم آبادی ثابت کرنے کی کیوں کوشش کی جاتی ہے۔

سید صاحب قبلہ اور ان کے لائق شاگرد شعر کے کسی جگہ قیام کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ فغاں عشق حزیں

ف ۱ "تاریخ فرشتہ کی تصنیف کا زمانہ ۱۰۱۵ھ سے ۱۰۳۳ھ تک ہے" نقوش سلیمانی۔

کا کچھ دنوں قیام عظیم آباد میں رہا۔ یہی کافی ثبوت اس امر کے ماننے کے لیے ہے کہ وہ عظیم آبادی تھے۔ لیکن وہ لکھتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ عشق اور فغاں وغیرہ کی شاعری کی ابتدا غیر عظیم آباد میں ہوئی اور وہیں پروان چڑھی۔

عشق اور فغاں اس عمر میں یہاں آئے تھے جب وہ معمر ہو چکے تھے اور صاحب دواوین اور تلامذہ تھے۔ ایسے وقت عظیم آباد کی شعری فضا اور ماحول سے متاثر ہونا قطعاً مشتبہ ہے۔ ہم عشق اور فغاں کے دواوین کے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بہار کی شاعری کا ان پر مطلق اثر نہیں ہے۔ اور نہ وہ اس عمر میں یہاں آئے تھے کہ ان کی شاعری میں کسی رنگ سے متاثر ہو سکتی۔ عشق اور فغاں کے دواوین کے ایک ہزار صفحات میں اگر کوئی صاحب زیادہ نہیں تو دو چار ٹھیٹ بہاری محاورے نکال دیں تو ہم اپنی رائے بدلنے کو آج تیار ہو جائیں۔

اس فہرست میں سب سے دلچسپ نام شاکر ناجی کا ہے۔ سید صاحب نے اس کا ذکر کئی جگہ کیا ہے (نقوش ص ۳۹۶ و ص ۴۰۶) انہیں اس پر اصرار ہے کہ وہ عظیم آباد کا تھا۔ شاکر ناجی نہ تو عظیم آباد کا تھا۔ نہ اس کا تعلق "عظیم آباد کے علمی مرکز" سے تھا اور نہ وہ دہلی سے آکر یہاں بسنے والے شعرا میں تھا۔ بلکہ ہم تو یقین کے ساتھ یہ کہنے کو تیار ہیں کہ سید صاحب قبلہ ایک گھنٹے کے لیے بھی اس کا قیام عظیم آباد میں نہیں ثابت کر سکتے۔ ہم حیرت میں ہیں کہ وہ ایسی صورت میں اسے عظیم آبادی کہنے پر کیوں مصر ہیں۔ اسے تو عظیم آباد سے دور کا بھی تعلق نہیں

بیدل کو عظیم آبادی ہونے کے متعلق "صاحب مضمون" کا ارشاد ہے کہ "بیدل کو عام مستند تذکرہ نگاروں نے عظیم آبادی ہی لکھا ہے" ہم اپنی ذمہ داری کے پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہنے کو تیار ہیں کہ اسے کسی مستند قدیم تذکرہ نگار نے عظیم آبادی نہیں بتلایا ہے۔ ظاہر نے لاہور قاسم نے بخارا۔ اور خوشگو نے اس کا وطن اکبر آباد بتلایا ہے۔ عظیم آبادی تذکرہ نگاروں میں وجیہ الدین عشق اور علی ابراہیم خاں خلیل بھی اسے اکبر آبادی ہی کہتے ہیں۔ اس کے عظیم آبادی ہونے کا ثبوت قدما کی معتبر کتابوں سے دینا چاہیئے۔ ہم یہاں پر اس غلط فہمی کا ازالہ کر دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ ہمارا یہ دعویٰ نہیں کہ بیدل عظیم آبادی نہیں ہے۔ مدعا صرف یہ ہے کہ تذکرہ اور تاریخ کا کوئی مستند بیان ہمیں ایسا نہیں ملتا ہے جس سے یہ ہم ماننے پر مجبور ہو جائیں کہ وہ عظیم آباد کا تھا

آزاد کے تذکرے کے بارے میں مضمون نگار نے لکھا ہے کہ "اس سے زیادہ مستند تذکرہ اور کوئی نہیں" ہم اس کی داد صرف لکھنے والے اور چھاپنے والے دونوں بزرگوں کو دیتے ہیں

اسی طرح اشرف علی خاں فغاں کو مصحفی، گویا، انداس، علی ابراہیم، شفیق، حسین قلی خاں عظیم آبادی اور بعض دوسرے تذکرہ نگاروں نے دہلوی لکھا ہے۔ رکن الدین عشق کو لطف نے شاہ جہاں آبادی، میر حسن نے "اصلش از شاہ جہاں آباد" علی ابراہیم نے "از عمدہ مشائخ شاہ جہان آباد" لکھا ہے۔ اس طرح فدوی کو "از شاہ جہاں آباد" صاحب "مسرت افزا" "وطن اصل وے دہلی است" لطف اور علی ابراہیم دونوں اسے دہلوی لکھتے ہیں۔ خود عظیم آبادی تذکرہ نگار شورش "از صاحب طبعان شاہ جہاں آباد" لکھتا ہے۔ یہی حال حزیں کا ہے جس اور قائم نے اسے "از سادات اکبر آباد" اور گردیزی نے اکبر آبادی لکھا ہے۔

(۳) شیخ فرید شکر گنج کے سال وصال میں اختلاف ہے۔ اخبار الاخیار میں ۶۶۴ھ فرشتہ میں ۶۶۰ھ۔ سفینۃ الاولیا میں ۶۶۴ھ سیر الاقطاب میں ۶۹۰ھ مراۃ الاسرار میں ۶۶۶ھ اخبار الاصفیا میں ۶۶۴ھ اور ایک تذکرے میں ۶۶۹ھ لکھا ہے۔ سید صاحب نے یقین کے ساتھ ۶۶۶ھ لکھ دیا تھا۔ اس پر اگر ہم نے اس کی قطعیت سے انکار کیا اور اپنا شبہ ظاہر کیا تو کیا قصور کیا؟

صاحب مضمون کی دو باتیں صحیح معلوم ہوتی ہیں: (۱) ایک تو یہ کہ نقوش ص ۸ میں شکر گنج کے ذکر میں "ولایت" کتابت کی غلطی ہے۔ دراصل "ولادت" ہے (۲) سید صاحب قبلہ نے سید انشاء کا ذکر کئی جگہ اس انداز میں کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انہیں لکھنوی سمجھتے ہیں، ایک جگہ تو صاف لکھتے ہیں "لکھنؤ کے شعرا میں سید انشا" (نقوش ص ۳۹۳) اس بنا پر ہم نے اعتراض کیا تھا کہ سید انشاء کو لکھنوی سمجھنا درست نہیں

لیکن مضمون نگار کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کا یہ خیال نہیں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ وہ انہیں لکھنوی نہیں مانتے تو ہم بڑی خوشی سے اپنا اعتراض واپس لے لیتے ہیں۔

اس مضمون میں ناظرین کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ بعض جگہ مضمون نگار نے جعل و تحریف سے بھی کام لیا ہے یعنی ہماری طرف وہ باتیں منسوب کر دی ہیں جو ہم نے قطعاً نہیں لکھی ہیں۔ جواب دینے کا یہ نیا انداز ہر شخص کو حیرت میں ڈال دے گا۔ ہم ثبوت کے لیے بعض کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱) ہم نے لکھا تھا کہ "اس کا کوئی معتبر ثبوت نہیں کہ یہ دوہے مخدوم کے ہیں" (نگار ص۹) صاحب مضمون لکھتے ہیں "مخدوم الملک کے دوہوں کے متعلق مضمون نگار کا بیان ہے کہ کسی سند اور ثبوت کے بغیر لکھ دیئے گئے ہیں" اور اس کے بعد ہی "ہم روشن آنکھیں رکھنے والے سہی لیکن پھر بھی سید صاحب کی کتاب میں بطور اسناد (؟) یہ لکھا ہوا پاتے ہیں "شفاء الامراض" "حکیم محمدی" (ندیم ص۹) اس کا مطلب تو یہ ہو گیا کہ شفاء الامراض کی سند کی ہیں؛ اطلاع نہیں ۔۔۔۔ ناظرین فیصلہ کریں کہ "کوئی معتبر ثبوت نہیں" اور "کسی سند اور ثبوت کے بغیر لکھ دیئے گئے ہیں" میں کتنا فرق ہے۔

(۲) ہم نے لکھا تھا کہ ع جی لگن میں ہے کہ آئی ہے سہانی رتیاں، یہ زبان برہان کی عہد کی نہیں (نگار ص۱۱) مضمون نگار نے اسے یوں بنا دیا ہے: "مضمون نگار نے یہ گوہر افشانی کی ہے کہ دوہے کی زبان مخدوم الملک کے عہد کے بجائے امیر خسرو کی زمانے کی ہے (ندیم ص۹) اور اس کے بعد ہی ہم پہ یہ خود ساختہ اعتراض جڑ دیا ہے کہ "جاہل ... بھی جانتے ہیں کہ امیر خسرو اور مخدوم صاحب ہمعصر تھے" (ندیم ص۹)

ع اب تمہیں بتلاؤ ہم بتلائیں کیا؟

(۳) راقم نے محمد علی فدوی کے متعلق لکھا تھا کہ وہ ایک آوارہ مزاج شخص تھے، کبھی مرشد آباد رہے کبھی فیض آباد رہے اور کبھی عظیم آباد۔ یہ تقریباً ترجمہ تھا میر حسن کے بیان کا۔ لائق مضمون نگار نے "فدوی بہت آوارہ تھے" لکھ کر میری طرف منسوب کر دیا ہے جس کا مطلب یہ ہو گیا کہ ہم ان کے اخلاقی حالت پر حرف رکھ رہے ہیں۔ حالانکہ یہ میرے مدعا سے کوسوں دور ہے۔

(۴) مضمون نگار نے میری طرف یہ بیان منسوب کر دیا ہے کہ "شاکر ناجی عظیم آباد میں آ کر رہے" اور پھر لطف یہ کہ نگار کے ص۱ کا حوالہ بھی دیدیا ہے ان کی یہ جرأت قابل داد ہے۔ یہ تو سید صاحب کا بیان ہے۔ میں تو اس کا منکر ہوں اور اسی پر اعتراض کر رہا ہوں کہ شاکر ناجی کو ایک تذکرہ نگار نے بھی عظیم آبادی نہیں لکھا۔ پھر سید صاحب قبلہ کس سند سے اُسے عظیم آبادی کہتے ہیں

ہم حیرت میں ہیں کہ مضمون نگار نے اس جعل و تحریف کی ضرورت کیوں سمجھی اگر وہ میرے مقالہ کا عمیق مطالعہ کرتے تو انہیں نکتہ چینی کیلئے مواد مل سکتا تھا مثلاً

(۱) دیباچۂ لطافت کے لکھنؤ میں لکھے جانے پر ہم نے پہلا شبہ ظاہر کیا تھا صحیح یہ ہے کہ یہ کتاب پوری لکھنؤ ہی میں لکھی گئی۔

(۲) ہم نے اثر کے نام کے لیئے نکات الشعرا۔ مخزن نکات کا حوالہ دیا تھا یہ ہماری نظر کی چوک تھی ان دو کتابوں میں ان کا پتا تک نہیں۔

(۳) نگار ص۱ پر چھپ گیا ہے: "لطف استرآباد کے رہنے والے تھے۔ نادر شاہ کے ساتھ ہندوستان آئے" یہ قطعاً غلط ہے۔ اصل عبارت یہ ہے: "لطف کے والد ہجری استرآباد کے رہنے والے تھے اور نادر شاہ کے ساتھ ہندوستان آئے تھے" یہ قطعاً غلط ہے۔ اصل عبارت یہ ہے:

"لطف کے والد ہجری استرآباد کے رہنے والے تھے اور نادر شاہ کے ساتھ ہندوستان آئے تھے"

(۴) اسی طرح ولی اور تحقیق کی معاصرت کی بحث میں گفتگو کی کافی گنجائش تھی

یہ ہے حال سولہ صفحات کے مضمون "سطحیات نگار" کا جو کئی ماہ کی محنت کے بعد جناب "ذیا عنوس بہارشی" نے لکھا اور دارالمصنفین کے بڑوں اور بوڑھوں کی نظر ثانی اور مشورہ و اصلاح کے بعد جناب سید ریاست علی ندوی نے ندیم میں شائع کیا۔ ناظرین میں سے کوئی صاحب اگر اس بات کے متوقع ہوں کہ میں بھی اسی لب و لہجہ میں جواب دوں جو دوسروں کا مخصوص طرز ہے تو انہیں نا امیدی ہوگی۔ میں اس

سلسلے میں ان سے معذرت خواہ ہوں گا اس لئے کہ میں اس پستی اخلاق کی سطح تک کبھی نہیں اتر سکتا جہاں ہمارے احباب کی منزل ہے

آخر میں صرف یہ کہنا ہے کہ اگر آپ جاننا چاہتے ہیں کہ علمی مضامین لکھنے کی نئی طرح ندوۃ العلما اور "دارالمصنفین" نے کس طرح ڈالی ہے تو ذیل کی سطریں دیکھئے۔

(ا) مدیر نگار، تو خود اب قوت لایموت کا محتاج ہونے والا ہے۔ پبلک اور تعلیمی انسٹی ٹیوشن سے جلا وطن کئے جانے کے بعد حکومت کے اسلامی مطبوعات کی لسٹ میں نگار کا نام داخل کرایا اور خود حکومت کے دروازے پر کاسۂ گدائی لیکر پہنچا۔

(ب) ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مقالہ نگار کا مقصد واقعی اپنے حسن و جمال کا مظاہرہ کرنا اور ناز و ادا کا جلوہ دکھانا تھا لیکن اپنے حسن و جمال اور حسن و جمال کی جلوہ آرائی ہی مقصود تھی تو پھر ایک رسوائے زمانہ اور ننگِ ملت رسالہ کے چکلے پر اور شہوانیات کے مصنف کے سامنے اس کا مظاہرہ کیوں کیا گیا

(ج) ہم یہ سطور لکھ رہے ہیں اور اپنی چشم بینا سے دیکھ رہے ہیں کہ یونانی خرافات کی وہی "یاسیفی" اس تحقیق و تدقیق کے نمونے کو دیکھ کر پہلے تو سرشار اور مخمور ہو جاتی ہے، پھر غایت مسرت میں داہنے ہاتھ کی ایک انگلی ناک پر اور بایاں ہاتھ کمر پر رکھ کر رقص کرنے لگتی ہے اور بلند آواز کے ساتھ مضمون نگار کی طرف دیکھ کر ایک خاص جذب و کیفیت کی حالت میں گاتی ہے

چھوٹا سا بالم مورا آنگنا میں گلی کھیلے

اور یہ وہی تھرک تھرک کر مدیر نگار سے پاس پہنچتی ہے اور مذکورہ بالا تحقیقات کے عجیب و غریب نمونے کو شایع کرنے کی داد یوں دے رہی ہے

سیاں توری گودی میں گیند بن جاؤں گی (ندیم جولائی سنہ ۴۱ء)

قابل مبارکباد ہیں وہ اصحاب جو "ندوۃ العلما" اور "دارالمصنفین" میں ایسی پاکیزہ اور بلند معیار تعلیم پا رہے ہیں اور آفریں ہے ان "نفوس قدسیہ" پر جن کے زیر سایہ ان کے اعزا و تلامذہ اس قدر ادبی ستھری اور خالص اسلامی تربیت حاصل کر رہے ہیں۔

مختار الدین احمد

غفلت یا ہوش؟

سُن، او مُسافر سُن!

مسافر، او مسافر، تُو گھر سے نکل تو چکا ہے، مگر جانتا بھی ہے، تجھے جانا کہاں ہے؟ اور تیرا راستہ کیا ہے؟؟

سُن، او مسافر، یہ سنسار، لوبھ سے بھرا ہوا ہے۔ قدم قدم پر پھندے لگے ہیں۔ جال بچھے ہیں، ذرا سنبھل کے پاؤں اٹھانا۔

سمجھ لے اس سنسار میں دو ہی رستے ہیں:

ایک رستے میں سونے چاندی کی گنگا جمنا بہتی ہے۔ ہر طرف پھول ہی پھول دکھائی دیتے ہیں۔ اس رستے کی ہر چیز دل موہ لینے والی ہے۔ ذرّے ذرّے میں کشش ہے۔ پتّے پتّے میں من موہن بُلاوا ہے۔ سکھ ہی سکھ ہے۔ دکھ کا نام ہی نہیں

دوسرے رستے میں کانٹے بچھے ہیں۔ تکلیفیں ہیں مصیبتیں ہیں۔ کٹھنائیاں ہیں۔ بپتائیں ہیں۔ موت کی پرچھائیاں ہیں

لیکن سُن او مسافر سُن، پہلا رستہ، انسانیت کی موت کا رستہ ہے، اور دوسرا رستہ وہاں پہنچتا ہے، جہاں انسانیت کیلئے زندگی اور کمال ہے۔

بتا او مسافر، تُو کس رستے پر چلنا چاہتا ہے؟ پہلے رستے پر تُو جائے گا، تو تیری دنیا سنور جائے گی۔ دولت تیرے پاؤں چومیگی۔ عیش تیرا خیر مقدم کرے گا۔ پھولوں کی سیج پر تُو سوئے گا۔ تیرے سب ارمان پورے ہو جائیں گے۔

مسافر، تو کہے گا، یہ تو بڑا ہی اچھا رستہ ہے، اور میں اسی رستے پر چلوں گا، کیونکہ یہ سکھ کا عیش کا، لطف کا رستہ ہے، لیکن سمجھ لے ——— اچھی طرح سمجھ لے، تُو اِس رستے پر چلے گا، تو تیری روح مر جائے گی، اور جس کی روح مر جائے، وہ مُردوں سے بھی بدتر ہے۔ اِس رستے پر تو چلے گا تو آدمیت ہی سے نکل جائیگا، اور خود تیرا دل تجھ سے ہر وقت کہتا رہے گا تو انسان نہیں ہے، کوئی بہت بڑا حیوان ہے!

اور دوسرا رستہ؟ ——— تو بے شک یہ دوسرا رستہ بہت ہی کٹھن رستہ ہے۔ اِس رستے میں بلائیں ہی بلائیں ہیں لیکن او مسافر، تُو اِس رستے پر چلے گا، تو سُن لے اور سمجھ لے، تو کیا ہو جائے گا؟

کپڑا صاف نہیں ہوتا جب تک بھٹّی میں ڈالا نہ جائے، اور سونا، کھرا نہیں ہوتا، جب تک آگ میں پگھلا کے کسوٹی پر کسا نہ جائے۔ گھوڑا تک بیکار رہتا ہے، جب تک چابک سوار کے ہاتھوں نکالا نہیں جاتا۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی، آدمی ہو ہی نہیں سکتا جب تک مصیبتوں، تکلیفوں، دکھوں، بپتاؤں کی بھٹّی میں پڑے نہیں۔

او مسافر سن، تو اگر جانور بن کر پھولوں کی سیج پر پڑے پڑے جانوروں کی سی موت مرنا چاہتا ہے، تو اِس سے کہیں اچھا یہ ہے کہ تو اپنے رستے ہی میں کہیں خودکشی کرلے، کیونکہ یہ موت، اُس ذلت کی موت سے کہیں اچھی ہوگی، جو جانور بن کر پھولوں کی سیج پر تو چکھے گا۔

سُن او مسافر سُن

پہلا رستہ، جھوٹ کا، مکر کا، دھوکے کا، غلامی کا رستہ ہے۔

اور دوسرا رستہ، سچائی کا، بھلائی کا، نیکی کا، آزادی کا رستہ ہے۔

اب او مسافر، سوچ لے، تو کس رستے پر جانا چاہتا ہے؟

منّان حیرت آرٹسٹ

"سادہ زندگی اور بلند خیالی"

سادہ زندگی اور بلند خیالی نے، بطور نمونہ معاشرت کا ایک اخلاقی معیار دیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دولت سے دست بردار ہو کر، زہد و ریاضت کی زندگی گذاری جائے۔ نہیں، اس معیار نے، جہاں تجارتی آدمی قبول کی ہے۔ وہاں اس کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ دولت کو اس کی غلاظت سے پاک کیا جائے۔ اور اس سے پیدا ہونیوالی تمام سہولتوں کو روک کر رکھا جائے تاکہ اس سے صرف ایک خاص طبقہ ہی لطف اندوز نہ ہو سکے بلکہ ایک غریب آدمی جو بھوک اور غربت کا شکار ہے اور محنت و مشقت کرنے کے باوجود پشکل جی رہا ہے۔ معاشرت کے اس پیش کردہ معیار پر شکل ہی سے غور کر سکتا ہے۔ ہاں اگر عمدہ کھانا ملے، اچھے کپڑے ملیں۔ آرام دہ مکان ہو عیش و عشرت کے سامان میسر ہوں، ایسی تعلیم ملی ہو جس کی بنیاد اخلاقی ضرورت پر ہو اور اتنی فرصت ملے کہ نتیجہ خیز دماغی کام کیئے جا سکیں تو پھر زندگی کا اخلاقی معیار اچھی طرح سمجھا اور پرکھا جا سکتا ہے

اس معاشرتی معیار کا مقصد یہ ہے کہ دولت مساویانہ طور پر تقسیم کی جائے یہ تقسیم کسی سیاسی قانون کے دباؤ پر نہ ہو بلکہ ایک اخلاقی ماحول کے بدولت لوگوں کی رضامندی پر ہو۔ یہ معیار زندگی کے اس عظیم الشان طور طریقہ کو بار بار دلنشین کراتا ہے جو ایک طاقتور کمانے اور پیدا کرنے والے کو اس بات پر برانگیختہ کر دے کہ وہ اپنی کمائی اور پیداوار کو اپنے ان کمزور ہمسایوں میں، جو بیمار اور مفلس ہونے کی وجہ سے اپنی ضروریات زندگی بھی نہیں کر سکتے، بانٹ کر کھائے۔ الفریڈ مارشل کا کہنا ہے "اس معیار کے مطابق اس آدمی کے لیے، جو کھانے، پینے اور مزے اڑانے کے سوائے کسی اور چیز سے تعلق نہیں رکھتا۔ سوسائٹی میں کوئی جگہ نہیں ہے ——— یہ معیار، انسان کو بھائی چارگی اور عقل کو پاکیزہ رکھنے کی تعلیم دیتا ہے ——— یہی وہ عظیم الشان پیغام ہے، جو مشرق کی روحانیت مغرب کی مادیت کو پہنچا سکتی ہے۔

لیکن مشرق اور خاص کر ہندوستان میں، اس نظریہ کا مطلب غلط سمجھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے اسی ہندوستان نے، ایسے ایسے سیکڑوں نظریوں کو جنم دے کر اپنی آغوش میں پالا پوسا۔ لیکن آج وہی ہندوستان، جس کا معیار وجود کچھ ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو اسے معیار نہیں کہا جا سکتا، اس لیے کہ اس معیار میں، تباہیوں اور بربادیوں کے سوا اور کچھ نہیں، بڑے معصومانہ انداز میں اس نظریہ کا مطلب یوں بیان کرتا ہے "سادہ زندگی بسر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تک کم کھا سکو، کھاؤ اور اپنی ضروریات کو گھٹاؤ" بلند خیالی سے ہم ہندوستانیوں کو کوئی مطلب نہیں اور اگر ہے تو صرف اتنا کہ جو کچھ ملتا ہے اس پر قانع رہیں اس لیے کہ اتنا ہی ہماری تقدیر میں ہے اس سے زیادہ نہ تو ہم پا سکتے ہیں اور نہ ہمیں پانے کی ترکیب سوچنے اور ہاتھ پیر مارنے کی ضرورت ہے۔ انگلینڈ میں باوجودیکہ مادیت کا بھوت حکمران ہے، بلند خیالی عام ہے۔ انگلینڈ نے صنعتی انقلاب کے بعد، مفت ابتدائی تعلیم، جبریہ قرار دی ہے۔ یورپ کے اکثر اسکول، کالج اور یونیورسیٹیاں، وہاں کے امیروں کی مرہون منت ہیں ان تعلیمی اداروں کو صنعت جدید کی پیداوار کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ انگلینڈ میں بھی بھوک اور مصیبت کا وجود ہے۔ وہاں بھی بے روزگار ہیں، لیکن ہندوستان میں ایک معمولی قحط سے مرنے والوں کا تناسب، وہاں کے بے روزگاروں کے تناسب سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ انگلینڈ میں ایک بیکار آدمی، اپنے حصے کی خیرات لینے، ٹیکسی میں بیٹھ کر اور سگریٹ پیتے ہوئے جاتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں کروڑوں کام کرنے والے ایسے ہیں جن کی زندگی انسانی زندگی کے معیار پر پوری اتر ہی نہیں سکتی۔ اُن کے لیے سگریٹ پینا اور موٹر میں بیٹھنا تو ایک غیر معمولی بات ہے۔

مغربی ممالک ہندوستان کے مقابلہ میں کہیں بہتر ہیں، لہذا وہ سادہ زندگی اور بلند خیالی کی کسوٹی پر پورے اتر سکتے ہیں۔ ہندوستان کے لیے تو مندرجہ ذیل جملے زیادہ موزوں ہونگے۔ ایک ایسا ملک جو صنعتی ترقی سے محروم ہے۔ ایک ایسا ملک جو بعض لوگوں کی عقلی سستی کی بنا پر تباہی کی طرف جا رہا ہے۔ ایک ایسا ملک، جس میں نوع و اقسام کی لاتعلقی

مى قابليت ركھنے والے معدوم ہيں، ـــــ قديم ہندوستانيوں كيلئے
كى عمريں طويل اور ضرورتيں كم اور سادہ تھيں، يہ بات ممكن تھى كہ وہ اس
رھک، اگر قدر نہيں كرتے تو اسے محسوس ضرور كرسكتے تھے۔ اس ليے كہ انہيں
سے زيادہ معاشرتى آزادى نصيب تھى۔ آبادى گنجان نہ تھى اور قدرت
فياضياں كم محنت ميں كافى سامان خورد و نوش مہيا كرديتى تھيں
غير ممالک كے سياح جنہوں نے قديم ہندوستان كو ديكھا ہے حتٰى
ہ سياح بھى جو عہد مغليہ ميں يہاں آئے تھے، اُن كا بيان ہے كہ ہندوستان ميں
ودھ اور شہد كى نہريں جارى تھيں۔ لنچوٹن (ايک ڈچ سياح، جس نے
۱۵۸۳ء اور ۱۵۸۹ء كے درميان ہندوستان كى سياحت كى تھى) كا بيان
ل كے متعلق حيرت انگيز ہے۔ اس كے لكھنے كے مطابق اُس وقت بنگال
ايک بيل يا گائے كى قيمت، سكہ رائج الوقت كے مطابق ساڑھے سات
نے تھى۔ بھيڑ، چڑياں، اور ديگر ضروريات كى چيزوں كا دام بھى اسى تناسب سے
ا۔ چاول روپيہ كا چھ من ملتا تھا۔ پيداوار كا يہ حال تھا كہ مختلف قسم كے
، دوسرے ممالک كو بھيجے جاتے تھے۔ ايک انگريز سياح كورياٹ، كا بيان
كہ وہ دو پنس روزانہ خرچ كركے، كپڑے، شراب اور گوشت پر بڑے
م سے گذارہ كرسكتا تھا۔

جب ايک انگريز دو پنس روزانہ خرچ كركے اپنى ضروريات زندگى
اكر سكتا تھا۔ تو اس بات كا پتہ لگانا خالى از دلچسپى نہ ہوگا كہ اُس وقت
مزدوروں كى كيا حالت تھى؟ اور اُن كى روزانہ آمدنى كتنى تھى؟ اُس
ت ايک مزدور ۲½ پنس روزانہ كماتا تھا، يعنى ضروريات كے روزانہ
چ سے ½ پنس زيادہ ـــــ نتيجہ ظاہر ہے۔ اُس وقت، ہندوستانى
مزدوروں كا معيار زندگى، برطانيہ كے معيار زندگى سے بلند تھا۔ كوئى
ب كى بات نہيں۔ اگر اُس وقت ہندوستانى مزدور "سادہ زندگى
، بلند خيالى"، كا مطلب سمجھتا ہو۔

اس بات ميں شبہ كى گنجائش نہيں كہ عہد مغليہ سے پہلے، ہندوؤں
، ابتدائى دور ميں، سامان خورد و نوش كافى سے زيادہ ہونے كى وجہ
ے، ہندوستانيوں ميں عام بے فكرى اور سكون تھا۔ اس پُر امن دور
ا گوتم بدھ اور شنكر اچاريا جيسى عظيم شخصيتوں نے جنم ليا، جن كا
صديہ تھا كہ وہ لوگوں ميں سادہ زندگى اور بلند خيالى كے جذبات پيدا

كركے، انسانيت كو گناہ آلود ہونے سے بچائيں۔ قدرت كى فياضى اور خوراک
كى فراوانيوں نے ہى اُن سے يہ كارہائے بلند انجام دلوائے ورنہ ممكن تھا
كہ ان كے عظيم الشان خيالات اور بلند ارادے، فكر معاش كى بھينٹ
چڑھ جاتے۔

ليكن جيسے جيسے ميں ماضى سے حال كى طرف لوٹتا ہوں، مجھے بھوک
اور غربت بڑھتى ہوئى دكھائى ديتى ہے جس كى مختلف وجوہات ہيں

(۱) برطانوى حكومت نے بيمارى، زندگيوں اور جائدادوں كى حفاظت
كى جس كى وجہ سے ہمارى آبادى بڑھنے لگى يہاں تک كہ آج ہم چاليس كروڑ
كے لگ بھگ ہيں ليكن آبادى كے اِس اضافہ اور ہندوستان كى زراعتى
اور صنعتى پيداوار ميں مساوات قائم نہ رہ سكى۔ مسٹر اسپير كا تخمينہ ہے كہ
كاشتكارى كرنے والے ايک كنبہ كى پرورش كے ليے سات ايكڑ زمين
اور ۲۵ ايكڑ خشک زمين چاہيے۔ اگر اس تخمينہ كے مطابق بٹوارہ كيا جائے
تو ہمارى آدھى سے زيادہ آبادى كو كچھ نہيں مليگا۔ اضافہ آبادى، دو سرے
قوانين جاگيردارى نے، زمين كا تناسب فى كس ۳ سے ۴ ايكڑ تک ركھا
ہے۔ ہمارے يہاں نئے طرز پر كھيتى كرنا تقريباً ناممكن ہے۔ ہم كھيتى كا وہ
پرانا طريقہ اختيار كيے ہوئے ہيں جس كا نتيجہ يہ ہو رہا ہے كہ ہمارى زراعتى
آمدنى، دن بدن گرتى چلى جارہى ہے۔ لارڈ كرزن نے ۱۹۰۱ء ميں اس
معاملے پر اچھى طرح روشنى ڈالى تھى "ہر اُس ملک ميں جس كى زندگى كا
انحصار زراعت پر ہو، ايک وقت ايسا آتا ہے جب كہ زراعتى آمدنى
فى كس بڑھنا ختم ہو جاتى ہے۔ ايسى حالت ميں گورنمنٹ كو لازم ہے كہ
آمدنى كے ديگر ذرائع كو بڑھانے كا بندوبست كرے" لارڈ كرزن نے
جو كچھ كہا۔ وہ ہمارے ليے بالكل سچ ثابت ہوا۔ اس مسئلہ كا حل
صنعت كو بڑھانا اور ترقى دينا ہے، ليكن ہمارى صنعتى ترقى كى رفتار
بہت سست ہے ہمارے يہاں كى، بڑے پيمانوں پر ہونے والى صنعتيں
انگليوں پر گنى جاسكتى ہيں۔ ايک طرف آلہ جاتى صنعتوں نے، ہمارى گھريلو
صنعتوں كو تباہ كرديا ہے، اور دوسرى طرف ہمارے ملک كے صنعتى ادارے
ہمارى ضروريات كو پورى نہيں كرسكتے لہٰذا ہم ہر وقت غير ممالک كے محتاج
رہتے ہيں جس كا نتيجہ يہ ہو رہا ہے كہ زراعت پر گذر بسر كرنے والوں كى تعداد
بڑھتى جارہى ہے اور صنعت پر جينے والے كم ہوتے جارہے ہيں۔ ايسى حالت

میں جبکہ دولت حاصل کرنے کے صحیح ذرائع ہاتھ نہ آئیں اور آبادی بڑھتی جائے۔ زندگی کا معیار قائم رکھنا تو دور رہا، جینا مشکل ہوتا ہے۔

۲۔ ریلوے اور دیگر ذرائع انتقال نے، ہندوستانی بازاروں کو غیر ملکی اشیا سے بھر دیا ہے۔ ساتھ ہی ہمارے ملک سے باہر جانے والی اشیاء خوردنی کی برآمد میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے لیکن پیداوار بڑھانے کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ ایک ہندوستانی ہندوستان میں اسی قیمت پر چاول خریدتا ہے جس قیمت پر ایک انگریز، انگلینڈ میں —— لیکن موخر الذکر کے لیئے ادا کردہ قیمت میں سے محصول، کم کر دیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ہندوستان میں شرح مزدوری اتنی نہیں ہے جتنی انگلینڈ میں —— ایسی حالت میں ہندوستانیوں کے لیے گذر بسر کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے۔ عیش و آرام کر کے اپنی ضروریات زندگی پوری کریں اور وہ ایسا بآسانی کر سکتے ہیں اگر ان پر 'سادہ زندگی اور بلند خیالی' کے فلسفہ کے مطابق حکومت کی جائے۔

۳۔ اشیاء خوردنی کے علاوہ، دیگر اشیاء کا دام، دیگر ممالک کے مقابلہ میں، ہندوستان میں ہمیشہ زیادہ رہا۔ انگلینڈ میں اشیاء کی قیمتوں کے اضافہ اضافہ کے ساتھ ساتھ شرح مزدوری میں بھی اضافہ ہوتا رہا لیکن ہندوستان میں ایسا نہیں ہوا۔ قیمت اور مزدوری کے درمیاں ایک خلیج حائل ہو گئی جو صرف زندگی کا معیار گھٹانے سے ہی پٹ سکتی ہے قیمتوں کے اس اضافہ نے، بلاشبہ، چند بڑے بڑے زمینداروں کو ضرور فائدہ پہنچایا۔ لیکن چھوٹے چھوٹے کسان کچھ نہ پا سکے اور ہندوستان اسی قسم کے معمولی کسانوں ہی کا مسکن ہے

۴۔ مغربی تہذیب اور تمدن نے جو کہ خود بھی نامکمل ہیں ہندستانیوں کو جہاں تک ان کا تعلق، ماتحت رہنے اور غلام رہنے کے سوا اور کچھ نہیں سکھایا۔ اس میں جو کچھ کمی رہ گئی تھی اُسے مغربی طرز تعلیم نے پورا کر دیا نیز اسی طرز تعلیم نے اُس معیار زندگی کو بھی جو مغربی صنعت کی پیداوار تھا، ہندستانیوں تک پہنچایا۔ ہندستانیوں نے اس نئے صنعتی معیار زندگی کو لبیک کہا۔ اُسے اچھا سمجھنے لگے اور اپنے پرانے معیار زندگی سے، جس کی ضرورتیں سادہ اور کم تھیں، نفرت کرنے لگے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہندوستانیوں کی آمدنی کا اوسط اتنا ہے کہ وہ سادہ زندگی اور بلند خیالی' کے فلسفہ کے مطابق جی سکیں؟ کیا ہر ہندوستانی، اتنا کما لیتا ہے کہ وہ اُس ذلت آمیز مفلسی سے، جو اُس کے عقل و دماغ کو ٹھٹھرا دیتی ہے، گلا چھڑا کر بلند خیال بن سکے؟

مختلف اوقات میں، ہماری، قومی آمدنی کا تخمینہ لگا کر اوسط نکالا گیا ہے۔ سنہ ۱۸۷۰ء میں دادا بھائی نوروجی کے حساب سے، یہ آمدنی فی کس بیس روپیے سالانہ تھی سنہ ۱۸۸۰ء میں قحط کمیٹی نے فی کس ستائیس روپیے سالانہ کی آمدنی بتائی تھی۔ لارڈ کرزن نے مبلغ تیس روپیہ کا اور فنڈلے سیراس نے مبلغ ایک سو روپیہ کا اوسط سنہ ۱۹۲۲ء میں نکالا تھا۔ اس آخری اوسط کو تسلیم کرنے پر بھی ہر ہندوستانی کی ماہانہ آمدنی مبلغ ۹۔ روپیہ ۱۲۔ آنہ ہوتی ہے۔ لیکن امریکہ میں ماہانہ آمدنی فی کس چھ پونڈ یعنی ایک سو روپیہ سے بھی زیادہ ہے۔ یوکیرائن میں ۴ پونڈ ۴ شلنگ ہے۔ فرانس میں ۳ پونڈ ۴ شلنگ ۷ پنس اور جرمنی میں ۲۔ پونڈ، ۱ شلنگ ہے۔

ہندستان کے مقابلہ میں غیر ممالک کی آمدنی کا تخمینہ کتنا حیرت انگیز ہے!!! اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مغرب کے مہذب ممالک کے سامنے ہندوستانیوں کی مالی حیثیت کیا ہے؟

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان ایک سو سولہ روپیوں سے ہماری زندگی کی ضروریات پوری ہوتی ہیں؟ کرنل جے۔ پی کیرن نے بتایا ہے کہ جیل کے قیدیوں کی سالانہ خوراک کا خرچ مبلغ ۹۷ روپیہ ۱۳۔ آنہ ۱۰۔ پائی ہوتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ قیدیوں کو صرف اتنی خوراک دی جاتی ہے کہ ان کے جسم و روح کا تناسب قائم رہے اس رقم کے ساتھ جب پہننے کے کپڑوں کا خرچ، گھر کی مرمت کا خرچ دھوبی اور نائی کا خرچ اور دیگر اخراجات کو جوڑا جاتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح ایک آدمی ۱۱۶ روپیے میں گذر بسر کر سکتا ہے جبکہ ۹۸ روپے صرف خوراک کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ خوراک بھی کیسی؟ — جو قیدیوں کو جیل میں ملتی ہے۔

ہاں —— ہم اپنی اوسط آمدنی کے ذریعہ دن کاٹ سکتے ہیں بشرطیکہ ننگے رہیں۔ درختوں کے نیچے زمین پر سوئیں میوے توڑ کر کھائیں

تماشے اور اس قسم کی تمام دلچسپیوں سے بے نیاز ہو جائیں۔ بس تیسرے درجہ کی خوراک کھا کر زندہ رہیں اور کام کریں۔

خیال فرمائیے۔ جو ملک قدرتی دولت سے مالا مال ہو۔ جہاں بیشمار کانیں ہوں۔ اس کا معیار زندگی اتنا پست اور گھٹیا ہو؟ کیا قدرت کی فیاضیوں اور انسان کی بدقسمتیوں کا اس سے بہتر نمونہ، بیسویں صدی میں کہیں اور مل سکتا ہو؟

وہ انسان، جس کا معیار زندگی اتنا پست ہو، جو جیل کے قیدیوں سے بھی بدتر زندگی گذارتا ہو۔ سادہ زندگی اور بلند خیالی، کے فلسفہ کو سراہ سکتا ہے؟

میرا جواب ہے —— نہیں،

قومی آمدنی کا تخمینہ لگا کر، اوسط نکالنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اگر ہندوستانی کپڑوں اور مکانات سے بے نیاز ہو جائیں تو گذر بسر کر سکتے ہیں لیکن یہ نتیجہ، ہمارے ملک کی اصل حالت پر پوری روشنی نہیں ڈالتا

عمل و حقیقت کی دنیا میں تو کچھ اور ہی ہو رہا ہے۔ لوگ بھوک سے تڑپتے ہیں۔ ماؤں کے پاس، بلبلاتے ہوئے بچوں کو چپ کرانے کیلئے آنسو تک نہیں ہوتے۔ بدقسمت انسان فٹ پاتھوں پر اس طرح پڑے رہتے ہیں کہ بدن پر ایک چیتھڑا تک نہیں ہوتا۔ روٹی کے ایک ٹکڑے کے لیے گلیوں میں چیختے، چلاتے اور ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ پھر بھی پیٹ کی آگ نہیں بجھتی —— ویرا آنستے، نے لکھا ہے "بمبئی کو دیکھئے بیدل چلنے والوں اور گھسٹتی ہوئی بیل گاڑیوں کے درمیان، کسی پارسی لیڈی کی چمکتی ہوئی موٹر کو دیکھئے۔ ایسٹرن بازار کی خوبصورت اور چوڑی سڑکوں کو دیکھئے، جہاں جوانیاں ناچتی ہیں۔ پھر اُن تنگ و تاریک گلیوں کو دیکھئے جہاں زندہ انسانوں کی لاشیں، کراہتی، بڑبڑاتی اور بھنبھناتی اندھیرے میں پڑی رہتی ہیں۔ اُس شاندار تاج محل ہوٹل کو دیکھئے جو سمندر کی لہروں میں جگمگاتا رہتا ہے۔ پھر اُن بھک منگوں اور لنگڑے، لولوں کو دیکھئے جو ادھر ادھر گڑگڑا کر روٹی کی تلاش میں گھومتے پھرتے ہیں" بمبئی کا یہ صحیح نقشہ جو ویرا آنستے نے کھینچا ہے۔ تقریباً ہر شہر میں موجود ہے۔ کیوں نہ ہو جبکہ ہماری قومی دولت کچھ اس طرح تقسیم ہو کر رہ گئی ہے کہ ایک طبقہ عیش و عشرت اور لہو و لعب میں گذارتا ہے اور دوسرا زندگی کی تمام دلچسپیوں سے محروم ہو کر صرف اپنا وجود قائم رکھنے پر مجبور ہے۔ ہماری آمدنی ہم میں کس طرح تقسیم ہوتی ہے اس کا اندازہ لگانے کے لیے آمدنی سے متعلق ذیل کا نقشہ ملاحظہ فرمائیے

(۱) ۲ لاکھ تیس ہزار افراد کی فی کس سالانہ آمدنی۔ ایک لاکھ روپے ہے
(۲) ۱۱ لاکھ ۷۰ ،، ،، ،، پانچ ہزار ،، ،،
(۳) ۲۵ لاکھ ،، ،، ایکہزار ،، ،،
(۴) تین کروڑ پچاس لاکھ ،، ،، دوسو ،، ،،
(۵) اس کے بعد باقی لوگوں کی آمدنی پچاس روپیہ سالانہ فی کس ہے۔

اس نقشہ سے یہ بات بخوبی معلوم ہو جاتی ہے کہ ہندوستان میں دو فیصدی آدمی نہایت عیش و عشرت کے ساتھ رہتے ہیں۔ دس فیصدی آدمی ایسے ہیں جو اپنے کنبے کے ساتھ کسی قدر آرام سے رہ سکتے ہیں اور باقی ۸۸ فیصدی ایسے لوگ ہیں جو خود اپنی ضروریات پوری نہیں کر سکتے۔ کنبے کا پالنا پوسنا تو در کنار رہا

اب ذرا انسانوں کی اُس لاتعداد جماعت پر غور کیجیے جو مفلسی اور بیکاری کی زندگی بسر کرتی ہے جسے بھوک کا دیوتا، اپنے خونی چنگل میں بری طرح جکڑے ہوئے ہے۔ بھلا ایسی جماعت اور "سادہ زندگی اور بلند خیالی" جیسے اعلیٰ اصول زندگی کا تذکرہ کرے اُسے تو چاہیے کہ بدقسمتی کا فلسفہ اور فلسفہ کی بدقسمتی کی مالا پھیرا کرے۔ مارشل نے ٹھیک ہی کہا ہے "انسان جسے خدا نے، اشرف المخلوقات بنایا ہے اس وقت تک اعلیٰ انسان، نہیں بن سکتا، جب تک کہ وہ مادی دولت کا محتاج ہے"

ہمارا معیار زندگی کیا ہے اور ہم سادہ زندگی اور بلند خیالی کے معیار پر ہم کہاں تک پورے اتر سکتے ہیں۔ اسے معلوم کرنے کے لیے ہم نے کسانوں اور مزدوروں کے طبقہ کو چنا ہے اس لیے کہ ہندوستان میں اسی فیصدی یہی آباد ہیں اور انہیں کے صحیح معیار زندگی پر غور کرنے سے ہم کسی اچھے نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔

زراعتی طبقہ کے معیار زندگی کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے بہتر ہو گا کہ ایک ایسے کاشت کرنے والے کے بجٹ آمد و خرچ، پیداوار

اور رہنے سہنے کے طریقوں کا مطالعہ کیا جائے جس کے پاس فی ۲ ایکڑ اراضی ہو، ہندوستان کے مختلف صوبوں کاشتکاروں کی مختلف حالت ہے بہرحال میں بنگال کے ایک سر کی اراضی رکھنے والے کنبے کو لیتا ہوں دوسرے صوبوں کے کاشتکاروں کی حالت بھی کم و بیش یہی ہوگی۔

مسٹر مومین نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے۔ بنگال میں ایک کسان کا سالانہ خرچ جس کے پاس عدہ کھانے والے آدمی اور ۲،۱ و ۵ ایکڑ زمین ہو، مبلغ ۱۹۷ روپیہ ۱۰ آنہ ہوتا ہے"۔ دوسری طرف چار قیدیوں کے کھانے کا سالانہ خرچ ۲۰۳ روپیہ ایک آنہ ہوتا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بنگال کے اندر چار قیدیوں کی خوراک اس کسان کے لیے کافی ہوگی جس کے گھر میں اسے شامل کرکے ۵، ۵ آدمی ہوں لیکن بنگال کی صوبائی تحقیقاتی کمیٹی، مسٹر مومین کے منہ سے پر راضی نہیں ہوتی اور یہ دکھانے کی کوشش کرتی ہے کہ ایسا کسان مبلغ تیس روپے سالانہ (فی کس ۶ روپیہ) بچاتا ہے۔ کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے "پورے صوبہ کی آمدنی ۲۴۴۸۰۰۰۰۰ روپئے ہے، جسے کنبوں کی تعداد پر بانٹ دیا گیا ہے۔ اس طرح فی کس ۷۹ روپئے یا فی کنبہ ۴۰۶ روپئے ہوتے ہیں، اس میں ۴۴ روپئے اور جمع کیے گئے ہیں جو دیگر امدادی ذرائع سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک کنبہ کی جملہ سالانہ آمدنی ۴۵۰ روپئے ہوتی ہے اور خرچ ۴۲۰ روپئے ہوتا ہے اور مبلغ تیس روپئے سالانہ کی بچت ہوتی ہے"

اب مجھے دکھانا یہ ہے کہ تیس روپئے کی رقم کیا واقعی ایک زراعتی کنبہ کے پاس بچ رہتی ہے یا نہیں۔ بنگال میں زراعتی قرضہ تقریباً سو کروڑ ہے اور کسان اس کا باقاعدہ سود ادا کرتے ہیں۔ لیکن اس رقم کو جو بطور سود ادا کی جاتی ہے کمیٹی نے اپنے دکھائے ہوئے اخراجات (۴۲۰ روپئے) میں شامل نہیں کیا ہے۔ ساتھ ہی اس رقم میں، اوڑھنے اور بچھانے کے سامانوں کا خرچ، مکان کی مرمت کا خرچ، شادی بیاہ کا خرچ خانہ داری کے سامانوں کا خرچ اور علاج معالجہ میں صرف ہونے والی رقم کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔ کیا اس عریاں حقیقت کے سامنے آجانے پر بھی کوئی یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ بنگال کا ہر زراعتی کنبہ مبلغ تیس روپئے کی رقم سالانہ پس انداز کرتا ہوگا۔ علاوہ بریں، بنگالی کسانوں کا معیار زندگی

اُن کے اسلاف سے زیادہ اونچا ہوگیا ہے۔ مغربی تہذیب اور جدید فیشن کی نعمتیں اُن کے گھروں پر بھی برسنے لگی ہیں۔ اب وہ بھی اپنے اسلاف کے مقابلہ میں زیادہ قیمتی اور اچھے کپڑے پہننے لگے ہیں۔ تعلیم اور صفائی کا خرچ بھی اُن کے گلے پر پڑ گیا ہے۔ عیش و عشرت اور لہو لعب کے نئے نئے طریقے ایجاد ہوتے جا رہے ہیں۔ اب تو ان کے ہاتھوں میں بھی بیڑی اور سگریٹ دکھائی دینے لگی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کسان پہلے سے زیادہ اچھا کھانے لگے ہیں۔

لہو لعب اور ضروریات زندگی میں اضافہ ہو جانے سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ معیار زندگی بلند ہوگیا ہے۔ بلکہ نشہ آور چیزیں اور نقصان دہ کھیل تماشے دن بدن ہمیں تباہی اور گھٹیا معیار زندگی کی طرف لیے جا رہے ہیں۔ معیار زندگی بلند ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اچھا کھانا ہو صحت بخش مکان ہو، اچھے کپڑے ہوں، ماحول صاف ستھرا ہو اور وہ تمام مادی ذرائع موجود ہوں۔ جو جسم کو تندرست اور شخصیت کو نمایاں اور خوبصورت بناتے ہیں۔ کسان کسی حالت میں بھی اتنی اچھی خوراک نہیں کھاتے جتنی کہ سو برس پہلے کھاتے تھے۔ پھر معیار زندگی کا بلند ہونا کہاں گیا؟ حفظان صحت اور عام ڈاکٹری علاج و معالجے پر روپیہ خرچ کرنا یقیناً معیار زندگی کو بلند کرنا ہے لیکن کمیٹی کے بنائے ہوئے چارٹ میں (جس کا تخمینہ ۴۲۰ روپئے) اس کا نام ہی نہیں۔ اور صفائی کی طرف سے غفلت برتنے اور پاخانہ و پیشاب کا مناسب انتظام ہونے ہی کا تو یہ نتیجہ ہے کہ ہوا گندی ہو کر سیکڑوں قسم کے وبائی امراض پھیلاتی ہے اور لوگ دھڑا دھڑ موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ معمولی زمین کو بغیر اونچا کیے ہوئے مکان بنائے جاتے ہیں اُن میں کھڑکیاں یا روشندان نہیں ہوتے۔ اور نہ ہی صاف اور کھلی ہوا کے آنے کا کوئی اور بندوبست ہوتا ہے۔ کروسن ٹین اور بوریوں کو بطور پردے کے استعمال کیا جاتا ہے۔ کروروں بدنصیب انسان ایسے ہی مکانوں میں پیدا ہوتے، جیتے اور مرتے ہیں۔ کیا زندگی کا بلند معیار یہی ہے؟ کیا اسی کو کسانوں کی ترقی یافتہ زندگی، کہتے ہیں۔ مسٹر مومین کا کہنا کہ کسانوں کی زندگی کا معیار قیدیوں سے بھی پست ہے بالکل ٹھیک ہے۔

صنعتی مزدوروں کی حالت، باوجودیکہ وہ شہر کی خوشگوار فضا

میں رہتے ہیں کسانوں سے کسی طرح بھی اچھی نہیں۔ اُن کی آمدنی اتنی قلیل ہے وہ اُس سے اپنے کو زندہ رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے ملک مزدور کے پاس ایک اچھا اور کھلا ہوا کمرہ ہونا، ایک غیر معمولی بات ہے۔ وہ تو اکثر اپنی راتیں میدانوں میں اور دن کارخانوں میں گذارتا ہے۔

رائل کمیشن کی رپورٹ کے مطابق ایک مزدور کا جو کوئی ہنر نہیں جانتا۔ ماہانہ آمدنی ۱۰ سے لیکر ۲۵ روپے تک ہے۔ وہ مزدور جو ہنرمند ہیں۔ ۳۰ سے ۳۵ روپے تک کماتے ہیں اور وہ جنہیں اول درجے کا ریگر کہا جاتا ہے تقریباً پچاس روپیہ ماہانہ پاتے ہیں۔ تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا ہے کہ لکھنو، کانپور اور گورکھپور میں، مزدوروں کی اکثریت تیس روپے ماہانہ سے زیادہ نہیں کماتی۔ بنگال، بہار اور اُڑیسہ کی لمیٹیڈ پیشوں کے مزدوروں کی آمدنی ۳۰ روپے ماہانہ سے کچھ زائد ہے اور پنجاب میں کہیں کہیں ۳۵ روپے تک ہے۔

لیبر آفس بمبئی کی پیش کردہ رپورٹ کے مطابق ہر مزدور کا روزانہ خرچ چودہ آنے تین پائی ہے۔ لیکن اتنا خرچ کرنے پر بھی ایک مزدور سونے کی جگہ نہیں پا سکتا۔ رہنے کیلئے ایک آرام دہ کمرے کا سوال تو در کنار رہا۔ ڈاکٹر مکھیتا کے تخمینہ کے مطابق بمبئی میں تقریباً اسی ہزار مزدوروں کے پاس جو یو پی اور پنجاب کے رہنے والے ہیں، رہنے کیلئے مکان نہیں وہ اپنے کسی دوست یا رشتہ دار کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کا سامان کمرے کے ایک کونے میں پڑا رہتا ہے اور وہ کسی میدان یا کسی مکان کے برآمدے میں سوتے ہیں

چند خوش نصیب مزدوروں کو جو ۴ روپے سے ۷ روپے ۸ آنے تک ماہوار کرایہ دے سکتے ہیں، رہنے کیلیے ایک چھوٹا سا تاریک اور گندہ کمرہ مل جاتا ہے۔ جہاں وہ اپنے اہل وعیال سمیت رہتے ہیں۔ ڈاکٹر مکھرجی کے بیان کے مطابق کلکتہ کی بستیوں کی حالت اور بھی خراب ہے، چودہ فٹ لمبی اور دس فٹ چوڑی زمین پر جھونپڑیاں کھڑی کر دی گئی ہیں۔ دیواروں کو مٹی سے پلستر کر دیا گیا ہے۔ یہی کچی جھونپڑیاں مرد، عورت اور بچوں کو لے کر تقریباً چار یا پانچ آدمیوں کا مسکن ہوتی ہیں۔ پوری بستی کے لئے ایک مشترکہ پاخانہ اور ایک

مشترکہ کنواں ہوتا ہے۔ ان جھونپڑوں کا کرایہ مبلغ آٹھ روپیہ ہوتا ہے میں نے اکثر اینگلو انڈین کنبوں کو ایسے کمروں میں رہتے دیکھا ہے جو ابتدا میں کوئلہ گھر یا حمام تھے۔ کوئی تعجب نہیں اگر ایسی حالت میں تندرستیاں خراب ہوں اور اخلاق بگڑ جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے صنعتی شہروں میں، تعداد اموات، تعداد پیدائش سے ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے۔

صنعتی اور زراعتی زندگی کے معیار کا مطالعہ کرنے کے بعد پھر ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں جس کی بنیاد قومی آمدنی اور آبادی کے مختلف طبقوں میں اُس کی تقسیم پر ہے۔ خوراک جو کسانوں کو ملتی ہے قیدیوں کی خوراک سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ اور صنعتی مزدور بے گھر بار کا اور پست اخلاق ہوتا ہے۔ کسان کے پاس بظاہر رہنے کے لیے ایک مکان تو ہوتا ہے لیکن وہ رہتا ہے گندگی اور کیچڑ میں۔

صنعتی مزدور جسے رہنے کے لیے ایک مکان تو مل جاتا ہے لیکن وہ رہتا ہے ایک ایسی ماند میں جو انسان تو کیا جانوروں کے رہنے کے قابل بھی نہیں ہوتی۔ اکثر مزدور اپنے بال بچوں کو اپنے وطن میں رکھنے پر مجبور ہوتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود پردیس میں رہ کر گناہ اور اخلاقی لغزش کے مرتکب ہوتے ہیں۔

سولہویں صدی میں، ہندوستان کا معیار زندگی، برطانوی معیار زندگی کے برابر تھا۔ لیکن اس بیسویں صدی میں، ہندوستان کے اندر ۸۸ فیصدی آدمی ایسے ہیں جو بمشکل اپنا وجود کام رکھے ہوئے ہیں انہیں اتنی اچھی خوراک نہیں ملتی جتنی کہ سو برس پہلے ملا کرتی تھی جن کی نظر میں دودھ اور گھی کھانا۔ زندگی کی بہترین نعمتوں سے لطف اندوز ہونا ہے۔ اس لیے کہ یہ چیزیں انہیں مشکل سے ملتی ہیں۔ اگر ہم اچھے کھانوں، اچھے کپڑوں اور خوشنما مکانوں کی تمنا کریں تو سب سے پہلے ہمیں ہندوستان کی دو تہائی آبادی کو تہ تیغ کر دینا ہوگا۔

زندگی کا منظر اتنا گھناؤنا ہوتے ہوئے بھی، ہندوستان اپنے کو مہذب کہتا ہے۔ لعنت ہے ایسی تہذیب پر — ایسے ملک کے لیے لازم ہے کہ وہ "سادہ زندگی اور بلند خیالی" کے متعلق سوچے تک نہیں۔ چہ جائیکہ اس کا پانا اور حاصل کرنا۔ اُس قوم، جو آدھا پیٹ کھا کر زندہ

رہتی اور بار بار مفلسی اور بیماری کی تباہیوں کا شکار ہوتی ہو، بلند خیالی پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔

بیسویں صدی میں جبکہ ہماری آبادی اتنی بڑھ چکی ہے کہ قدرت نے بھی مزید امداد و اعانت سے ہاتھ کھینچ لیا ہے ساتھ ہی شرح مزدوری کے مقابلہ میں، چیزوں کا دام بھی بڑھ گیا ہے۔ ہمارے لیے یہ موزوں نہ ہوگا کہ اپنی پرانی تہذیب کو چھوڑ دیں اور نہ یہی ہو سکتا ہے کہ نئے معیار زندگی کے تصور کو نظر انداز کر دیں۔

ہماری مشکلات کا حل اسی میں ہے کہ مغربی تہذیب اور مغربی صنعت میں جو باتیں سب سے اچھی ہیں انہیں اپنا کر اپنی تہذیب و تمدن کے مطابق بنا لیں ترکیب اجزائے خیال ہی میں ہماری نجات پوشیدہ ہے

نوشتہ۔ اے صمد صاحب پروفیسر اسلامیہ کالج کلکتہ

ترجمہ۔ حسن نجمی

سوکن سے خطاب

شدّاد کے بہشت کی گر نازنیں ہو تم
زہرہ و مشتری کی اگر ہمنشیں ہو تم

کافی نہیں شکست محبت کے واسطے
مانا کہ مہ جمال ہو زہرہ جبیں ہو تم

دکھلاؤ وہ کمال جو ہو وجہ امتیاز
کیا ہو کہاں ہو کس لیئے گوشہ گزیں ہو تم

میرا خمیر بھی تو اسی آب و گل سے تھا
کیا تم بنی ہو نور سے یا آتشیں ہو تم

تم حور ہو بہشت کی یا چودھویں کا چاند
الٹو نقاب دیکھوں میں کتنی حسیں ہو تم

کیا میں جمال حسن کی آئینہ دار تھی
بولو اگر سفید بت مرمریں ہو تم

ترجیح اس نے دی ہے تمہیں مجھ پہ کس لیئے
تم بھی تو آدمی ہو فرشتہ نہیں ہو تم

اس کو تو میرے بعد جہاں سے گریز تھا
بتلاؤ کوئی ساکن عرش بریں ہو تم

تسکین خاطری کے لیے پوچھتی ہوں میں
ورنہ یہ مدعا نہیں میرا حزیں ہو تم

کیا سبزۂ رمیدہ سر رہگذر تھی میں
پروردۂ بہار گل یاسمیں ہو تم

دھندلا سا اک نشاں ہوں میں تم نقش نوبہار
پھر کیوں خدانخواستہ اندوہگیں ہو تم

تم نے کشاکش غم پنہاں سے دی نجات
باور کرو کہ میری رقیبہ نہیں ہو تم

ناقابل قبول کر میں تھی نیاز مند
تم قابل قبول کہ ناز آفریں ہو تم

میں جذبۂ وفا کا سرور لطیف تھی
اور تم سنو۔ خمار مئے انگبیں ہو تم

راحت کی تھی حیات محبت کی ابتدا
تم انتہا ہو۔ یعنے دم واپسیں ہو تم

رضیہ بیگم راحت

بنگالی سے

باغی کا نواں خط

از شاعر انقلاب قاضی نذرالاسلام

از کراچی ۱۵- فروری

وقت دوپہر

بھابی صاحبہ!

آپ کا خط موصول ہوا۔ لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے تمام باتوں کا مفصل جواب دے نہیں سکتا۔ اُمید کرتا ہوں درگذر کردیں گی جب وقت ملیگا اور خواہش ہوگی تو میں مفصل اپنی موجودہ کیفیت جو محض دکھ کے کانٹے میں الجھی ہوئی ہے ارسال کرنے کی کوشش کرونگا۔ لیکن اطلاعاً عرض ہے کہ آئندہ اپنی تلخ باتوں سے میرے دل کو اذیت پہنچانے کی کوشش نہ کیجئے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمام انسانوں میں کچھ نہ کچھ کمزوری کی علامت رہتی ہے۔ مگر اُسے ظاہر کرنا تو سب سے بڑی کمزوری کی نشانی ہے یہی وجہ ہے کہ میں نے دنیا میں اتنی سختیاں اور ایذائیں برداشت کیں۔ اگر میں اس حقیقت کو پہلے جانتا ہوتا تو آج سکھ کی زندگی بسر کرتا آپ میرے دل میں برچھی کی انی چبھونا چاہتی ہیں تو سن لیجئے مجھ میں بھی سہنے کی طاقت ہے۔ اُمید ہے میری اس صاف گوئی کو آپ معاف کریں گی۔

سنئے! انسان کے جسم کے جس حصہ میں تکلیف چھپی ہے — اسی حصہ کو دبانے سے میں ملونگا۔ اندر کا دکھ بالکل اسی قسم کا ہوتا ہے کیا کبھی ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ جس کا دل پھٹا جارہا ہے، اس کے لب قہقہے لگائیں، جس کی آنکھیں غم کا مینھ برسا رہی ہیں اُس کی زبان میں راگنیاں ناچیں۔ نہیں یہ بالکل ناممکن ہے۔ میں ابھی بہت دنوں سے کوشش کر رہا ہوں کہ اپنے دل کی تمام چنگاریاں نہ ختم ہونیوالی جھیلیں اور ہمیشہ دکھے رہنے والے دل کو آپ کی آنکھوں کے سامنے پیش کردوں مجھے یقین ہے کہ آپ ان میں شہد کی مٹھاس ڈھونڈینگی — میرے گیت کے بول تلاش کریں گی — مگر انجان بھابی! وہ شہد، وہ شیرینی میرے نزدیک زہر ہے، تلخ گھونٹ ہے، بھیانک دیو ہے! یہی میری خودداری فطرت کو تباہی کے عمیق اور اندھیرے غار میں گھسیٹے لیے جارہی ہے — خواہش کے اس منہ میں دریائے پدما کی موجیں طمانچے لگا رہی ہیں اور میں بہنے والی کشتی کی طرح بہا جارہا ہوں!

اُف یہ کتنا بھیانک ہے — کتنا ہولناک! دیکھو! دیکھو! میرا سینہ جل رہا ہے، آنکھیں کپکپا رہی ہیں اور — اور! آہ! میں ہاتھ جوڑتا ہوں میری دبی ہوئی چنگاری اور نہ بھڑکاؤ — کیا میرے دکھ کی قیمت اسی جگہ ہے جہاں قصاب کی تیز چھری بیدردی کے ساتھ جانوروں کے گلے پر پھیری جاتی ہے؛ مجھے بچاؤ بھابی! مجھے آزادی دو! اُف! میرے دل کا دکھ باہر نکل کر کانٹے کی چابک کی طرح بج رہا ہے — ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ جلاد کا سخت ہاتھ بڑی سرعت کے ساتھ میرے گلے کے دو ٹکرے کرنے آرہا ہے — میں یہ خط لکھ رہا ہوں اور میرا پورا جسم بیکل ہو رہا ہے! مجھے احساس ہوتا ہے بھابی کہ شاید اس ربع مسکوں میں میری طرح بدنصیب اور کوئی نہ ہوگا۔

ہم لوگوں کو (Mobilization order) جنگ کی ترتیب کا حکم ملا ہے۔ ہر وقت کان میں یہی حکم گونج رہا ہے بہت جلد ہم لوگوں کو کیرہ عرب عبور کرکے بصرہ کے شعلہ بیدار ریگستان کی گود میں رہنا ہوگا۔ یہی ہماری خوشی ہے۔ اسی کے دامن میں ہمیں راحت ہے — مجھے آگ سے محبت ہے صرف آگ سے — آسمان کی لامتناہی بلندیوں میں، ہوا کی مستقیم لہروں میں، ہر طرف آگے پیچھے دائیں بائیں آگ ہی آگ چاہتا ہوں — تاکہ میں دنیا کے

نیچوں پیچ کودتا پھاندتا رہوں۔ پھر میں ان ہی آگ کی سرخ سرخ چنگاریوں میں لال لال خون کے چھینٹے دیکھوں۔ انسان کا خون! خواہش ہوتی ہے کہ دنیا کے تمام انسانوں کا گلا دبا ڈالوں، اُس کے خون کے قطرے سے اپنی پیاسی زبان کی پیاس بجھاؤں۔ لیکن کیا میری یہ پیاس بجھ سکتی ہے؟ آخر مجھے انسانوں سے اتنی دشمنی کیوں ہے؟ انھوں نے میرے ساتھ کیا عداوت کی ہے؟ اس کا جواب میں نہیں دے سکتا۔ تو کیا وہ میرے دشمن نہیں، رقیب نہیں ——— میرے دوست ہیں، رفیق ہیں؟ دنیا چاہتی ہے حسن کی شہرت، مٹھاس اور شیرنی ——— لیکن میرے قلم سے انتقام کی شمشیریں نکل رہی ہیں۔ زہر کا شربت چھوٹ رہا ہے ——— دل کی یہ جو دو مختلف "دشمنی اور دوستی" ہے اس کا قیام کہاں ہے؟ ہائے اسے کوئی نہیں جانتا۔ میرے اس جوالا کی کوئی منزل نہیں ہے، کوئی مسکن نہیں ہے۔ تم نہیں سمجھو گی یہ تکلیف بھابی ——— کبھی نہ سمجھو گی! تاہم میرے خط کو دو تین مرتبہ غور سے پڑھنے کے بعد سمجھنے کی کوشش کرنا۔

ہاں تو آپ نے مرقانہ کے متعلق لکھا ہے طول طویل بیان! تمام باتوں کا جواب لکھنے کے لیے اس وقت میرے پاس وقت نہیں تاہم ایک دو باتیں لکھ دیتا ہوں ——— کیونکہ انسان کو دکھ دینا ہی میرے لیے راحت ہے ——— جانتی ہو میری یہ وحشیانہ اور سفاکانہ دشمنی انسان پر نہیں بلکہ انسان کے خالق کے اوپر ہے! میں اسے کبھی معاف نہیں کر سکتا، کبھی نہیں۔ میری خوبصورت اور حسین زندگی کو اس نے جہنم کے دہکتے ہوئے شعلوں میں پھینک دیا ہے

میرے ہاتھوں سے اس نے ساری قوت چھین لی۔ وہ چاند اور سورج میں گرہن کا داغ دیکر اپنی قوت کا کرتب دکھاتا ہے ——— ایسی قوت میرے پاس بھی ہے۔ میں اُس سے خوف کیوں کھاؤں؟ اُس کا نام لے کر کیوں کانپ اٹھوں؟ بھابی آپ مجھے شیطان کہیں گی، میرے ان الفاظ کو پڑھ کر کان میں انگلیاں ڈال لیں گی ——— اُف! جو بھی ہو! جیسا بھی خیال کیجیے۔ آپ مجھے شیطان کا لقب دیں یا اور کچھ ——— مجھے کیا؟ مجھے تو سکون نہیں ملیگا، آرام نہیں ملیگا۔ جس انسان کے خالق سے نہیں ڈرتا۔ اُس انسان سے میں ڈر جاؤں؟ کیا میں اتنا گیا گذرا ہوں ——— اتنا نیچ ہوں؟ میرا دل جھوٹ سے داغدار نہیں، حقیقت سے مصفا ہے۔ ہاں میں جلاد ہوں، ظالم ہوں، سنگدل ہوں! بانسری کی میٹھی تان چھیڑ کر ہرن ——— خوبصورت ہرن کو بلاتا ہوں اور پھر اسی کے پیٹ میں تیز دھار تلوار پھیر کر، زہر آلود تیر چبھو کر اطمینان کی سانس لیتا ہوں اسی میں میری شانتی ہے، سکون ہے۔ یہ کیسا سکھ ہے۔ بھابی، یہ کیسی راحت ہے؟ اب میرے ہاتھ پاؤں پتھر کے مانند بالکل سخت ہو گئے ہیں

کون مجھے مست و بے خود بنانے کے لیے پیش قدمی کر رہا ہے؟ اور رفتہ رفتہ کس حسینہ کی میٹھی آواز زہر کی طرح لہرا رہی ہے ——— دائمی زہر تاکہ مجھے ——— مجھے! اب میں نہیں لکھ سکتا، میری ساری قوت زائل ہو گئی۔ اچھا، رخصت!

تمہارا منہ پھٹ۔ ذرا الہدیٰ

ترجمہ جمیلونس اختر۔ کلکتہ

چھپے آنسوؤں کا ہار

اُس گلے کے لئے جس میں تصور بھی باہیں نہیں ڈال سکتا

۱

عصمت پہ تری نثار ہونا ہے مجھے
پھر دل کی زمین میں ضبط بونا ہے مجھے
آنسو مرے پردہ در نہیں ہیں اے دوست
رونا بھی جو ہے تو چھپ کے رونا ہے مجھے

۲

جو روگ ہے دل کا دل ہی میں پالوں گا
جتنا بھی چلے گا بس بلا ٹالوں گا
کر دوں گا نثار پردہ ہر لطف حیات
یہ بھی نہ ہوا تو جان دے ڈالوں گا

۳

پھر کام میں سوز دل کو لاتا ہوں میں
ہر سانس میں اک شمع جلاتا ہوں میں
لیکن ترے پردے پہ نہ آنچ آئیگی
آگ اپنے ہی دامن میں لگاتا ہوں میں

۴

غنچے کی طرح مروڑ دوں گا دل کو
بربادی کی زد پہ چھوڑ دوں گا دل کو
اے دوست اگر تیرا کھلونا نہ بنا
واللہ کہ توڑ پھوڑ دوں گا دل کو

۵

ہر شوق سے آزاد میں ہو جاؤں گا
مجبوروں کی فریاد میں ہو جاؤں گا
آباد رہے تا گہ دیار ناموس
پردے ہی میں برباد میں ہو جاؤں گا

۶

باہر نہ کبھی آگ کو جانے دوں گا
شعلے کو کبھی سر نہ اٹھانے دوں گا
جھک جائے تو جھک جائے مرا دل لیکن
میں تجھ پہ کبھی آنچ نہ آنے دوں گا

۷

نالوں سے کبھی کام نہ لوں گا اے دوست
رسوائی کا الزام نہ لوں گا اے دوست
بدنام نہ ہوگی کبھی خلوت تیری
محفل میں ترا نام نہ لوں گا اے دوست

۸

پھر چشم خودی جھپک رہی ہے اے دوست
پھر دل کی نظر جمک رہی ہے اے دوست
ہاں دیکھ کہ پھر میری یہ کافر گردن
چوکھٹ پہ تری لچک رہی ہے اے دوست

۹

سانسوں میں گرہ سی بس رہی ہے اے دوست
مشکیں مرے دل کی کس رہی ہے اے دوست
ہر موج ہوائے پردہ زلفوں کی طرح
لہرا لہرا کے ڈس رہی ہے اے دوست

۱۰

دل میں کوئی شے ٹپک رہی ہے اے دوست
پی پی کے نظر بہک رہی ہے اے دوست
وہ مے جو ابھی ہے خلوتِ مینا میں
آنکھوں سے مری چھلک رہی ہے اے دوست

۱۱

آنسو کو لہو بنا رہا ہوں اے دوست
رگ رگ میں انہیں چھپا رہا ہوں اے دوست
روتی آنکھوں سے روٹھ جانے کی قسم
اب دیکھ کہ مسکرا رہا ہوں اے دوست

۱۲

ہے وقت کا کیا تلخ تقاضا اے دوست
ضد ہے کہ رہے دوئی کا پردہ اے دوست
میں وار کے عصمت یہ تری حسرتِ وصل
کرلوں گا جدائی بھی گوارا اے دوست

۱۳

باتیں نہ کبھی دل کی کہوں گا اے دوست
دھارے پہ خوشی کے بہوں گا اے دوست
دل ڈھونڈے ہزار تجھ سے قربت لیکن
تیرے ہی لیے دور رہوں گا اے دوست

۱۴

آئے نہ زباں پہ حرفِ مطلب اے دوست
ملنے بھی نہ پائیں شوق کے لب اے دوست
احساں احساں تری حیا کا احساں
کیا خوب ملا ہے مجھ کو منصب اے دوست

۱۵

کیوں کرتی ہر آہ ترانہ اے دوست
کیسے نہ دھوکے میں زمانہ اے دوست
پرچے مری زندگی کے پڑھتے رہنا
قسطوں میں چھپے گا یہ فسانہ اے دوست

۱۶

رکھتا ہوں میں شانِ اجنبیت اے دوست
ہے دل ہی دل کی ہر حکایت اے دوست
پردے سے ترے سیکھا ہے پردہ کرنا
رہ جائے گی پردے میں محبت اے دوست

۱۷

لو رازِ سکونِ زندگی ہے اے دوست
دوری ہی میں تجھ سے بہتری ہے اے دوست
دنیا تو سمجھ رہی ہے مجھ کو پاگل
کیا تیرا خیال بھی یہی ہے اے دوست

۱۸

پھر اپنی نقاب الٹ رہا ہوں اے دوست
اب دور ہی تجھ سے ہٹ رہا ہوں اے دوست
بنتا نہیں دل دامنِ منزل کا داغ
میں راہ ہی سے پلٹ رہا ہوں اے دوست

۱۹

خودکشتیِ دل ڈبو رہا ہوں اے دوست
بیگانۂ شوق ہو رہا ہوں اے دوست
پانا ہے مقام اپنی رفعت کا مجھے
میں جان کے تجھ کو کھو رہا ہوں اے دوست

۲۰

ہے پردہ نشیں تری محبت دل میں
رسوا تپشِ جگر نہ ہوگی اے دوست
اک سانس بھی پردہ در نہ ہوگی اے دوست
تجھ کو بھی کبھی خبر نہ ہوگی اے دوست

سید نذر شاہدی

سیمابی اسلوبِ تنقید کی قلعی کھل گئی

جناب ابوالمجود سید منظور الحق مجوّد الرویانی جمشید پور

(قسطِ چہارم)

بند نمبر ۱۳
نہ ہوتی ایسے ناری کی بھلا کیوں روحِ روحانی — خودی کے زعم میں جس نے کیا ردِ امرِ ربانی
اسی کا سا میسر ہو جسے جوشِ ہمہ دانی — یہاں اس کو نہ سوجھے کیوں محبت کی فراوانی

جوشِ ہمہ دانی اور پھر میسر ہو ایک قہقہہ لگائیے اور خاموش ہو جائیے۔ چوتھے مصرعہ پر ہم سے اصلاح لے لی جاتی تو ہم یوں بنا دیتے اسی کو موجھ سکتی ہے محبت کی فراوانی۔ یہاں اس کو نہ سوجھے کیوں؟ کیا فصیح اردو ہے؟

ظاہر ہے کہ یہ بند سیماب صاحب کے اس شعر کا جواب ہے ؎ وہ ناری جس کا سوزِ عشق میں کوئی نہیں ثانی ٭ سراپا آگ میں تھا جسم لیکن روح نورانی ٭ یہاں موصوف شیطان کو ناری اور اس کی تخلیق کو مکمل آگ سے بیان کرنے کے ساتھ ہی اس کے سوزِ عشق کی بے نظیری ملحوظ رکھتے ہوئے جو محض ایک بے بنیاد قیاس ہے اس کی روح کو نورانی قرار دیا ہے اور اس کے اسی بے مثل سوزِ عشق سے ان کی غرض وہی سجدہ آدم کے حکم کا مسترد کر دینا ہے جو خاص خداوندی علم کے سرچشمے سے رونما ہوا تھا۔ یہ امر درحقیقت علمِ الٰہی پر ایک حملہ تھا جسے حضرت مولانا کمالی مدظلہ العالی نے اس بند کے تیسرے مصرعہ میں جوشِ ہمہ دانی سے تعبیر فرمایا ہے۔ نقادِ بند کے اس پہلے شعر سے تو دامن کش اور گویا کہ بے خبر گذر گئے تاکہ جواب کی زحمت کا جواہی کاندھے پر نہ آئے اور دوسرے شعر کے مصرعہ اولیٰ میں جوشِ ہمہ دانی اور میسر صرف ان دونوں جزوں کو بالکل گر غیر متناسب کہہ دیا اور جوشِ نفسیلت میں کسی قہقہے پھر خاموشی کی سفارش کی ہے، مگر عدمِ مناسبت کی کوئی وجہ غالباً ذہنِ تنقید میں موجود نہ تھی اسی لیے محض اسی فقرہ پر اکتفا کی۔ چوتھے مصرعہ میں بزعم خود اصلاح کا کرم فرمایا لیکن افسوس کہ ناظم کی مراد و مفہوم و مضمون بالا سے پیوستہ ہے اس اصلاح ناموزوں کو کسی طرح قابلِ پذیرائی قرار نہیں دیتے محض بے سند کسی امر کی نفی سے حصولِ مدعا معلوم ہر نافی بھی حقیقت میں کسی بات کی نفی کا مدعی ہوتا ہے لایعنی ہاتھ پاؤں پٹکنا مفید مطلب نہیں چوتھے مصرعہ کی لفظی ساخت کے لیے دلیل کی ذمہ داری سے یونہی سبکدوشی نہیں ہو سکتی ہے ؎

شنید نقد کجا رقصِ اضطراب کجا — بہ ہیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

بند نمبر ۱۴
خدا کے حکم کی تعمیل غیروں کی پرستش ہے — کسے سمجھا رہے ہو کیا یہی منشائے دانش ہے
خدارا ایک ہی کیا استقامت اور لغزش ہے — یہ کوئی علم ہے یا علم کی خالی نمائش ہے

فرماتے ہیں:۔

کمالی صاحب واقعی آپ کو سمجھنے کی ضرورت نہیں آپ کو اپنے مہمل اشعار کھانے سے فرصت ملے تو آپ دوسروں کا کلام بھی دیکھئے اس بند کے تیسرے مصرعہ سے آپ جو مفہوم پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ پیدا نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں تو آپ اسے یوں بنا لیجئے اور اپنی نظم سے متعلق سمجھئے ؎ نہیں ہے استقامت نام کو لغزش ہی لغزش ہے — یہ کوئی علم ہے یا علم کی خالی نمائش ہے۔

اس بند میں بھی یاوہ گوئی کے سوا کچھ نہیں حضرت مولانا کمالی نے نظم موصوف کے ایک ایک شعر کو اب تک خوب سمجھکر جوابات لکھے ہیں۔ چنانچہ ہمارے ردِ تعریض کے بالا نوشتہ مضمون سے قارئین بھی اس امر کو بخوبی سمجھتے جارہے ہیں۔ اگر جناب نقاد کو حضرت مولانا کے اشعار میں واقعی اجمال کا وسوسہ ہوا تھا تو چاہیئے تھا کہ سیماب صاحب کے اشعار کو جو کچھ آپ نے سمجھا تھا واضح فرما دیتے تاکہ حضرت مولانا کمالی اور ان کے اشعار کا مہمل ہونا طشت از بام ہوجاتا مگر یہاں تو بھی تیسرے مصرعہ میں ترمیم ضرور کردی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ بھی کوئی سیمابی فن انتقاد کا ضابطہ خاص اور مستقل کلیہ ہے کہ ہر دو بیتی کے تیسرے مصرعہ کو بلا ضرورت لفظوں کی الٹ پھیر سے کسی قدر متبدل کردیا جائے عام ازیں کہ زور دار اسلوب کو کمزور وضع ہی سے بدلنا کیوں نہ پڑے۔ حالانکہ اس بند سے سیماب صاحب کے اس شعر کا جواب شروع ہوتا ہے سے

محبت کب پرستش غیر کی تسلیم کرتی ہے محبت اقتضائے حسن میں ترمیم کرتی ہے

چنانچہ شعر ہٰذا کے پہلے مصرعہ کا جواب یہاں ہے اور دوسرے کا آئندہ بند میں آتا ہے چونکہ سیماب صاحب نے سجدہ آدم کو جو بربنائے امر خداوندی تھا جیسے آپ نے بھی ویسے ہی تسلیم کرتے ہوئے غیر کی پرستش بتایا ہے حضرت مولانا کمالی مدظلہ العالی اسی کی تردید فرماتے ہیں عصمت ملائکہ کی اعانت کے لیے پہلے شعر میں ارشاد ہے سے

خدا کے حکم کی تعمیل غیروں کی پرستش ہے کسے سمجھا رہے ہو کیا یہی منشائے دانش ہے۔

قارئین کرام بہ ادنیٰ تامل سے واضح ہوگا کہ حسب مقام تیسرا مصرعہ کا لب ولہجہ استفہام انکاری جو مقصود محل تھا اصلاحی مصرعہ میں وہ مدھون نام کو بھی باقی نہ رہا۔ بایں ہمہ قابلیت شوق اصلاح کا یہ عالم ہے کہ بایدوشاید خدا ہی ہے جو یہ چالیس منزل مقصود تک پہنچنے کی کفیل ہوں۔

ترسم نرسی کعبہ اے اعرابی کیں رہ کہ تو میروی بترکستان است

بند نمبر ۱۵
مجھے نفضل کرمفرما نہ ہو تسلیم کیا معنی مگر یہ اقتضائے حسن میں ترمیم کیا معنی
جناب یوسفی میں سجدۂ تنظیم کیا معنی نمود کبر کی اور عشق میں تعمیم کیا معنی

اس کی نسبت ارشاد ہے:۔
مولانا سیماب نے نظم پر لکھی ہے۔ آپ پر نہیں۔ آپ اپنا ذکر کیوں کر بیٹھے۔ اقتضائے حسن میں واقعی آپ نہیں سمجھ سکتے یہ بہت ارفع مقام ہے۔ آپ تو ان لوگوں میں سے ہیں جن کا عقیدہ ہے سے

روز و شب ہنگامہ برپا ہے میان کوئے دوست ہڈیوں پر میری لڑتے ہیں سگان کوئے دوست

اور نفضل کرمفرما۔ کیا بلا ہے! ذرا اس کے معنی سمجھ کر سمجھا دیجئے۔ جناب یوسفی میں سجدہ تعظیم سبحان اللہ۔ اگر اب بھی نہ سمجھے تو وہ اس بت کو خدا سمجھے بجا ارشاد ہے آپ کے مولانا سیماب نے ضرور نظم شیطان پر لکھی ہے حضرت مولانا کمالی پر نہیں۔ لیکن مولانا نے اپنا ذکر جس قدر کیا ہے اس کا تعلق فقط نفضل کرمفرما سے ہے کسی شیطان سے نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جناب نقاد کے دخل در معقولات کا کیا موقع تھا۔ رہا اقتضائے حسن میں ترمیم کا معاملہ جس کا تفصیلات آپ موصوف سے حل دریافت کیا گیا ہے نقاد اس کے بہت ارفع مقام ہونے کو بیشک جانتے ہونگے اس کا ہمیں بھی یقین ہے کیونکہ کسی ایسے بلند و بالا مقام کی ماہیت کا علم آپ ہی جیسی شخصیتوں کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے کس لیے کہ جو اصحاب نفضل کرمفرما کی حقیقت سے نابلد محض ہوں ایسے لاہوتی مقامات سے وہی زیادہ واقف ہوسکتے ہیں۔ یہ سچ ہے حضرت مولانا کمالی اسے کیونکر سمجھ سکتے البتہ نفضل کرمفرما کی حقیقت کا علم رکھتے ہیں اپنی اسی استعداد سے موصوف نے نفضل اور کرمفرما دو مشفقانہ اور مناسب الفاظ مضاف و مضاف الیہ کی ترکیب کے ساتھ جناب سیماب کی شان میں استعمال کیے اور بغرض اس سے

جناب سیماب کے توجہ اس امر کی طرف مبذول کرنا تھی کہ وہ چند دریافت طلب امور کا کوئی تشفی بخش جواب مرحمت فرمائیں۔ ظاہر ہے کہ انکی نظم موحد اعظم میں سے اب تک جتنے اشعار زیر بحث آچکے ہیں ان میں موصوف نے شیطان کی خداوند پاک سے بے حد محبت کا ذکر کیا ہے اور محبت کا یہ خاصہ بتایا ہے کہ وہ اقتضائے حسن میں ترمیم کرتی ہے نظر برآں شیطان نے سجدہ آدم کے متعلق جو حکم ایزدی صادر ہوا تھا بخلاف ملائکہ اس لئے انحراف کیا اگر اقتضائے حسن میں ترمیم اسی انحراف کا نام ہے تو حضرت یوسف علیہ السلام کی جناب میں جو متعدد شخصیتوں نے سجدہ تعظیم کیا تھا اسے کیا کہا جائیگا اور عین وقت سجدہ فرشتوں سے جو تعمیل حکم کا صدور ہوا اس کا کیا نام رکھا جائیگا اور عدول حکم میں جو شیطان سے اظہار نمود و کبر۔ خودنمائی و خودرائی نیز توہین آدم اور ملائکہ کو بزعم خود سبک اور خفیف کرنیکے زعم فاسد کو کس حکم میں سمجھا جائیگا۔ خدا کے بندے نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ سجدہ تعظیم جو اس دنیا میں حضرت یوسف کے لیے ذکر کیا گیا اسی طرح توہین آدم اور نمود و کبر و خودی شیطان بر آیات قرآنیہ کے حوالے اخبار مدینہ کے حواشی میں مندرج ہیں۔ خبط استخفاف ملائکہ خود سیماب صاحب کے کلام میں منقول ہوا ہے جہاں موزوں فرمایا گیا ہے ؎

وہ صرف اللہ کو ارض و سما میں پوجنے والا علی الرغم ملائک جس نے حکم سجدہ کو ٹالا

اب الفاظ۔ فضل کرم سفر ما کے نا واقف معنی کا دیگر تمام حقیقتوں سے چشم پوشی برت کر اقتضائے حسن میں ترمیم کو بہت ارفع مقام کہنا لاریب اور ضرور کوئی خاص معنی رکھتا ہے شاید یہی وہ ارفعیت مقام ہو جس تک پہنچنے سے شیطان کو برائے امتیازی خطابات بارگاہ ایزدی سے عطا کیے گئے ہیں کما قال اللہ تعالیٰ ذق انک انت العزیز الکریم حضرت مولانا کمالی کا فہم عالی تو بیانات بالا سے ایک بال کی نوک برابر بھی آگے نہ بڑھ سکا۔ ہاں کچھ آپ کے اور وابستگان اس ارفع مقام کی رسائی سے فائز المرام ہوئے ہوں تو وہی خطابات کے ضرور حقدار سمجھے جائینگے بقول صاحب مسدس حدیقۃ المذاہب

ذق انت العزیز الکریم اس طرف سے خطاب آپ پائیں کمال شرف سے

آپ نے حضرت مولانا کمالی سے خطاب فرماتے ہوئے یہ کیا کہا کہ آپ تو ان لوگوں میں سے ہیں جن کا عقیدہ جناب کے پیش کردہ شعر کے مطابق ہے اس سے تو پڑھنے والے یہی خیال کریں گے کہ صاحبان عقیدہ مذکورہ جن مولانا کمالی بھی بقول جناب شامل ہیں۔ یہ بیان عقیدہ میں انہیں کا قول ہے ؛ ع ہڈیوں پر میری لڑتے ہیں سگان کوئے دوست ۔ نصیب دشمناں ہڈیاں مولانا ہی کی سہی لیکن سگان کوئے دوست کون لوگ ہیں۔ خیر تو ہے کہیں خود جناب نقاد جامع اپنے ہمنواؤں کے لونہ ہوں جو خواہ مخواہ بے سوچے سمجھے تعریف عقوں کے درپے ہیں ؎

زعم میں اپنے یہ نافہم جو استاد ہیں سب معترض ہوجے تو قابل ایراد ہیں سب
بند نمبر ۱۶ جو تھی تکلیف شرع ایزدی کی مسترد کردی بڑا احسان کیا ابلیس کی تصدیق اکڈ کردی
تعبد کی گراں سرمائیگی نذر خرد کر دی خدا سمجھے سخن گو کو سخن ساز کی حد کردی

اس بند کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :۔

کیوں صاحب یہ تصدیق کرنا کیا کوئی بھاری محاورہ ہے۔ شرع ایزدی کی تکلیف تو آپ کی من مانی ہے سیماب صاحب کی نظم میں تو کہیں نہیں۔ تعبد کی گراں سرمائیگی بھی آپ ہی نذر خرد کر رہے ہیں کیا یہ سخن سازی نہیں اگر کوئی اس بند کا چوتھا مصرع یوں پڑھے تو بیجا نہ ہوگا... خدا سمجھے کمالی کو سخن سازی کی حد کردی

محاورات کی سبکی اور گرانی کو آپ سے زیادہ کوئی کیا جان سکتا ہے۔ آپ کی محاورہ شناسی اسی رد تعریض میں کچھ اب تک الم نشرح کی جا چکی ہے۔ انتظار کیجیے کچھ آئندہ بھی آشکار کردی جائیگی لیکن یہ ضرور ہے کہ حضرت مولانا کمالی نے اس بند میں بھی جو

خدا جس جس جگہ رکھدیا ہے مناسب اور موزوں ہے تصدیق کسی امر کی سچائی یا کسی بات کے سچ ہونے کی تائید کرنے کو کہتے ہیں اور کد
اصرار۔ ضد۔ ہٹ۔ پیچ اور کوشش کے معنی رکھتا ہے۔ اشعار ذیل ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ تصدیق لاکلام ہے یاں اس کلام کی	بیعت مگر قبول کرو میر شام کی	(مومن)
۲۔ سمجھائیں کچھ اس کو پیر و مرشد	زیبا نہیں اس میں آپ کو کد	(اختر شاہ)
۳۔ ہو نہ رسوا جلد ترک عشق کر	کیا یہ کد ہے اے دل ناداں سمجھ	(داغ دہلوی)
۴۔ کہتا تھا دل سے میں کہ ستم کا گلہ نہ کر	ضد اور بھی ہوئی انہیں کد اور بھی ہوئی	(نوح)

واقعہ تو اسیقدر ہے کہ سجدۂ آدم کا فرشتوں اور بتابعیت ملائکہ شیطان کو حکم ہوا تھا فرشتوں نے اس کی تعمیل اور شیطان نے
انکار کیا اور اسی انکار کو خود جناب سیماب نے اپنی نظم موعد اعظم میں پیچ سے تعبیر کیا ہے جیسا کہ اس شعر میں ہے۔

ادھر یہ ضد کہ ہو مسجود خاک آدم اولی ادھر یہ پیچ کہ سجدہ ماسوا کو ہو نہیں سکتا

یہاں حضرت مولانا نے اسی پیچ کے معنی میں لفظ کد کا استعمال کیا ہے یعنی سیماب صاحب نے عزازیل کے اس پیچ کرنیکی سچائی
اور تائید ظاہر کر کے اس پر بڑا احسان کیا۔ جب تنقید کے لیے مستعد ہوئے تو اس کے محاورہ یا روزمرہ ہلکے یا بھاری ہونیکو آپ
خود ہی سمجھ سکتے ہیں۔ شرع اصطلاح میں طریق عمل کو کہتے ہیں شرع ایزدی خداوند پاک کا مقرر فرمایا ہوا طریق عمل۔ تکلیف امور شرعیہ
کی ذمہ داری عائد ہونے کو کہا جاتا ہے۔ سجدہ آدم کے بارے میں جو کچھ ذمہ داری شیطان پر عائد ہوئی اس نے اسے مسترد کر دیا
سیماب صاحب نے اپنی نظم میں اس کا خود بھی اقرار کیا ہے اب موصوف نے یہ سب کچھ کر کے اگر فضل و کمال بندگی نذر خرد (رائیگاں) نہیں
کیا تو بقول آپ کے حضرت مولانا کمالی یا کسی اور نے کیا ہوگا؟ اس کی منصفی قارئین کرام کے حوالے کی جاتی ہے اب چوتھے مصرعہ کو
نظر بحسب حال جس طرح چاہیں پڑھیں والی اللہ المشتکی

ابا کو کور باطن طاعت خاص خدا سمجھے سہارا مل گیا دیوار کا اندھے عصا سمجھے۔

بند نمبر۱۸

بہائم جانے قدموں پر نہ سر رکھنے کی کاوش کی صحابہ نے بھی سمت مصطفےٰ سجدے کی خواہش کی
رکوع و سجدہ یا جوا در ہوں و ضعیں پرستش کی حقیقت میں ہیں راہیں ظرف دل کی آزمائش کی

خدا جانے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں ہ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا۔ بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ خیر ادبی حیثیت سے دیکھئے۔ کیا یہاں کاوش کا محل
استعمال صحیح ہے؟ تیسرے مصرعہ میں "یا جوا در ہوں" محل فصاحت تو نہیں ہ مکی آزمائش کی" سماعت پر بار تو نہیں گذرتا؟

اصل یہ ہے کہ اس بند کے مضمون سمجھنے میں فاضل نقاد نے اغماض سے کام لیا اور خدا جانے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں فرما کر اندرونہ مضمون یعنی
حضرت مولانا کمالی کے مافی الضمیر سے تجاہل عارفانہ برتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نظم کسی نظم کے بالمقابل جوابی ہے سیماب صاحب کی نظم کے جس حصے سے
یہاں کا تعلق ہے اسے خیال میں رکھنے کی ضرورت تھی۔ پھر اس بند کے سیاق یعنی گذشتہ بندوں کو غور کر کے سیاق سے یہ مضمون پیدا ہوتا
ہے اسے مجروح کرنے کی نقادانہ تدبیر سے کام لیکر بجائے اس کے اپنی خوش فہمی کا اعتراف کیا اور قابلیت کا بھانڈا پھوڑا ہے صحاح کی
مستند حدیثیں جو اصل مدعا پر حسب دستور اہل علم کتب احادیث کے متفرق ابواب کے مختلف فصلوں سے بطور حوالہ یاد دلائی گئی ہیں
یقیناً انہیں کو کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا کے القاب مرحمت فرمائے گئے ہیں بالعظمۃ للعہ ؎

از خدا خواہیم توفیق ادب بے ادب محروم گشت از فضل رب

حالانکہ بند کے دونوں مصرعوں میں بہائم کے سجود اور بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا خواہش سجود کا ذکر کر کے ہر دو پر دو مرا نکتہ کر

میں کاوش تیسرے مصرعہ میں یا جو اور ہوں، اور چوتھے مصرعہ میں سکی آزمائش کی، کے متعلق پوری ادبی قابلیت کا زور لگا کر شکایتیں پیش کی ہیں۔ پہلے مقام کی بابت لفظ کا محل استعمال غلط بتایا یا جو اور ہوں کو مخل فصاحت سمجھا کی آزمائش کی، کو بار سماعت قرار دیا ہے اور سہ اعتراض کا لب ولہجہ استفہامی ہے یعنی محل استعمال صحیح ہے؟ مخل فصاحت تو نہیں؟ سماعت پر بار تو نہیں؟ جس سے بادنیٰ تامل قارئین کرام اس منشا کو پا سکتے ہیں کہ نقاد خود اپنے اعتراضات کی قطعیت کا علم نہیں رکھتا۔ اب حقیقت ملاحظہ ہو "کاوش" کھود۔ کرید۔ یا ہر نوکدار شے سے پیدا ہونیوالی چبھن اور اسی کے مشابہ جسم کے بعض نازک اعضا میں پیدا ہونیوالے درد کی کسک۔ کھٹک کے معنوں میں آتا ہے

دل فگاری کے سوا ہوتا ہی کیا — کاوش برگشتہ مژگاں دیکھیں (تسلیم)

ہوں وہ دیوانہ کہ دست کاوش تقدیر سے — خود بخود ہوں چاک پیدا دامن تدبیر سے ″

ہنسا دیتا ہے مثل زخم اب تو ناز کاوش بھی — نہ رکھتا تھا یہ لطف تو ترا ذوق ستم آگے ″

کاوش میں وہ لذت ہے کہ بس ہو جنوں کا دنیا پر — حکم یہ دے ہر چمن کے بدلے کھیت ہیں کانٹے بونے کا (شوق)

مگر یہ تمام معنے لفظ کے حقیقی ہی نہیں مجازی بھی ہیں۔ گمان غالب ہے کہ ذہن قارئین میں طرز گفتار سے اسی مفہوم کے استحضار کا ارادہ کر کے ایک عام مغالطہ دینا چاہا ہے تاکہ محل استعمال کی عدم مناسبت کا فی الجملہ بالاضطرار خطرہ واقع ہو جائے ہمیں نفیلت نقا پر اظہار افسوس کرنا پڑتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جناب صبا ہوائی گھرانے اور خاندان کے ایک نوردار فرد ہیں سرد وگرم خشک و تر سازج وسکا بادہائے مخالف کے کتنے تھپیڑے سے خاص تعلق رکھتے ہیں تاہم موصوف کو بستت کی خبر نہیں کہ یہ لفظ مجازاً لگاتار کوشش سعی بلیغ، مشقت تلاش، محنت تحقیق اور جدوجہد کا مرادف بھی لایا جاتا ہے۔ فارسی اردو کے قدیم وجدید اساتذہ سے قطع نظر یہاں تنہا ان کے استاد محترم کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

کیا زندگی اور موت کی آویزش ہے — تا حد نظر سلسلہ کاوش ہے (سیماب)

معلوم ہے بندوں کی کوشش مجھ کو — معلوم ہے ان کی جہد وکاوش مجھ کو ″

نہ جانے کونسی یہ صنف ہے اسرار قدرت کی — ابھی تک کاوشیں ہیں عقل کو تحقیق انساں میں ″

ہے چیستاں کا رزار ہستی مگر ہے ہر ذہن مائل حل — یہ کاوش بے شمار کیوں ہے یہ شورش بے حساب کیا ہے ″

تری دنیا ہے دنیا الٰہی مگر مطمئن ذہن دنیا نہیں ہے — کاوش زندگی کا ہش مرگ کا کچھ نتیجہ بھی ہے یا نہیں ہے ″

دیکھئے سیماب صاحب کے ان اشعار میں حسب گذارش مقامہم مقررہ کے لیئے کاوش کے ساتھ متعدد مرادف الفاظ بھی موجود ہیں

اب حضرت مولانا کمالی مدظلہ العالی کے مصرعہ میں اس لفظ کا استعمال بے محل ہوا ہے یا برمحل آسانی کے ساتھ سمجھ میں آسکتا ہے

رہا یا جو اور ہوں کا تکرار ظاہر ہے کہ یہ چار لفظوں سے مرکب ہے۔ پہلا "یا" بتایا جا چکا ہے کہ یہ عطف کیلئے لایا جاتا ہے مگر واو یا اور حرف عطف کے برخلاف تردید کا فائدہ دیتا ہے "جو" اسم موصول "اور" اسم خاص ہے جو دیگر یا آخر یا غیر کا مفہوم پیدا کرتا ہے۔ "ہوں" فعل ناقص ہونا کے مشتقات سے ہے۔ مخفی نہیں کہ رکوع وسجود کے علاوہ قیام قعود بلکہ اضطجاع علیٰ وغیرہا بھی پرستش وعبادت کے مختص متعلقات سے ہیں الذین یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبہم ویتفکرون فی خلق السموات والارض ربنا ما خلقت ہذا باطلاً سبحانک فقنا عذاب النار حتی کہ دیگر ادیان میں اسلام سے زیادہ صفات تعبد وتعکف کا اختلاف صور دریافت ہوتا ہے۔ اب ہم نہیں سمجھ سکتے کہ یا جو اور ہوں چار ذو لفظ بجائے خود فرما ستعملات اردو سے نہیں؟ یا جملہ کی ترکیب فصاحت کے خلاف ہے؟ پھر عادت کے موافق ادائے مفہوم کے لئے اس تکل

الگ اور جملہ بنا کر مان نہ مان میں تیرا مہمان کے قاعدے سے اصلاح میں دیدی ہوتی یہ بھی ممکن نہ ہوا وہی مثل ہے ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا اب بھی آزمائش کی ہ" کے متعلق یہ فرمانا کہ سماعت پر بار تو نہیں گذرتا نزاکت احساس کا محض اظہار ہے بقول حضرت مولانا کمالی مدظلہ العالی سے

میری نازک دماغی بار نکہت سہہ نہیں سکتی ہوائے فصل گل کرتی ہے فورا سرگراں مجھکو

یہاں یہ بتانا چاہیئے تھا کہ اس مرکب میں وجہ تنافر کیا ہے اگر لفظ "کی" کا قریب قریب دو مرتبہ استعمال ثقیل معلوم ہوتا ہے تو اس کا فیصلہ پہلے اپنے استاد مکرم کے اشعار ذیل پڑھ کر کر لینا چاہیئے تھا۔ فرماتے ہیں۔

زندگی پر موت کی خاموشیاں چھانے لگیں دل نوازی ساز کی نغموں کی لے مدھم ہوئی (سیماب)
سہم کر تاروں کی نادہ پہنا خلوت میں محبت چھپ گئی وہ صداقت اور وفا کی گود کی پالی ہوئی ״
وہ ردس کا شاہنشاہ جسے دنیا اک گھر کی جنت تھی پابوس حکومت تھی جس کی جس کی ٹھوکر میں دولت تھی ״

"کی نغموں کی" "کی گود کی" "کی جس کی" پہلے میں پانچ دوسرے میں تین اور تیسرے میں دو حرفوں کا فصل ہے، اور حضرت مولانا کمالی کے شعر میں شش حرفی لفظ کا فاصلہ ہے

آپ کے اکثر اعتراضات کی نوعیت بتاتی ہے کہ جناب سیماب سے واسطۂ تلمذ کے باوجود کوئی للہی مخالفت ہے کہ بار بار استاد محترم کی مہارت ادب قدرت کلام کمال فصاحت کو عریاں کرنے کے درپے رہتے ہیں یوں ظاہر داری سے حضرت مولانا کمالی کا نام لیتے ہیں چنانچہ اکثر جگہ نزلہ جناب سیماب ہی پر ڈھلتا ہوا نظر آتا ہے۔ خیر نادرہ کارانہ چابکدستی، ہے ضرور قابل تحسین و آفرین بقول مکرہ

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں گفتہ آید در حدیث دیگراں

وہ سجدہ آج ہے جو ماسوا کو ناگوارا ہے مگر آدم کا ذکر افسانہ تکوین کا ٹکڑا ہے
بند نمبر ۱ وہی کل تھا میں کیونکر مان لوں جو آج ہوتا ہے ازل کی بات وہ تھی اور یہ ترکیب دنیا ہے

آپ کی قادر الکلامی کی تو داد ہی نہیں دی جاسکتی۔ عجز طبیعت تو آپ میں نام کو نہیں "وہ سجدہ آج ہے" وہی کل تھا جو آج ہوتا ہے، کس قدر لطیف ٹکڑے ہیں جن پر فصاحت ہی نہیں قواعد بھی مع اپنے تمام اصولوں کے قربان ہو رہی ہے اور شعریت کی دیوی تو آپ کے ہر مصرعہ میں انگڑائی لے رہی ہے چوتھے مصرعہ میں آپنے بڑی ترکیب کے ساتھ بات کے مقابلہ میں ترکیب کا لفظ رکھا ہے ازل کی بات اور ترکیب دنیا سبحان اللہ

نقادی کے خانہ ساز اصول سے توہین و تحقیر مقابل پر دو تین فقرے کس کر مثلاً آپ کی قادر الکلامی کی تو داد ہی نہیں دی جاسکتی نیز عجز طبیعت تو آپ میں نام کو نہیں" نہ معلوم کسے مرعوب کرنے کا سودائے خام پکایا گیا ہے اور خیال فرمالیا ہے کہ ایسا لکھدینے یا کہدینے سے کسی کے کلام پر تنقید ہو جائے گی۔ جناب ہی پر کیا موقوف ہے سیماب صاحب کے شاہکار نظم موعد اعظم کے سلسلہ میں بعض اور صاحبوں کی ہمہ دانی بھی جولائی ۱۹۴۲ء سے اب تک دنیائے ادب کی فضا پر گشت لگاتی پری جمالاں اندر سبھا کی طرح وقتاً فوقتاً دعوت جلوہ یا سیر نیم نظارہ ما دشما ہوتی رہی ہے مگر حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں نکلی سے

کوئی اونچا نہیں ملتا بتان سرو بالا میں جسے دیکھا نظر آیا وہ باون گز کا لنکا میں

اس کے بعد آپ فرماتے ہیں "وہ سجدہ" وہی کل تھا جو آج ہوتا ہے، کس قدر لطیف ٹکڑے ہیں جن پر فصاحت نہیں قواعد بھی مع اپنے تمام اصولوں کے قربان ہو رہی ہے اور شعریت کی دیوی تو آپ کے ہر مصرعہ میں انگڑائی لے رہی ہے"

جوش انتقاد میں پے در پے پھبتیوں سے کام لے کر منصب ذمہ داری کے مجوز معین حدود کی خانہ پری کیا عائد شدہ فرض

سر سے اتارا ہے۔ باایں ہمہ حضرت مولانا کمالی کے کلام سے نقل کیے ہوئے دونوں ٹکڑوں کی اس لطافت کا ذکر و بیان کرتے شرم آتی جس پر فصاحت بلکہ قواعد مع اپنے تمام اصولوں کے قربان ہو رہی ہے۔ قربان جائیے اس زباندانی و ادبی قابلیت کے قواعد اور ہو رہی ہے شاید اس موقع پر زور کشت شعرانہ کے ضمن میں ریاضت مراقبہ کی توجہ احیاناً کہیں گرے ہوئے کسی بے موقع پہنچنے والے بم کا دھماکا سن کر وجدان محاربی کی جانب ہو گئی اور حال کے زیر اثر بصنعت حسن الاستطراد فوجی قواعد کا ذکر اپنے ادبی کارنامے میں منسلک فرما دیا ہے ؎

جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی پاپوش میں لگائی کرن آفتاب کی۔

رہا شہرت کی دیوی کا انگڑائی لینا، یہ سیمابی دنیا کی مختصات سے ہے شاید یہ آپ کی اسی تصویر کا دوسرا رخ ہو جو استاد مکرم کے جانب دارانہ نقطۂ نظر میں خواہ مخواہ بار بار آجاتا ہے بقول غالب

شب خمار ساقی رستخیز اندازہ تھا تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

کیوں نہ ہو پھر وہ بھی متھرا جیسے صنم خانہ زار آبادی میں جہاں صبح و شام کیا روز و شب گھنٹے اور ناقوس کی صداؤں پر دیوتا تھرکتے اور دیویاں طنازانہ محو رقص رہتی ہیں

پھر ارشاد ہوتا ہے "چوتھے مصرعہ میں آپ نے بڑی ترکیب کے ساتھ بات کے مقابلہ میں ترکیب کا لفظ رکھا ہے اول کی بات اور ترکیب دنیائے سبحان اللہ آپ کا صرف یہ سب سے پچھلا فقرہ بادی النظر میں کوئی داقعی ادبی اعتراض سا معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی وجہ جناب کی قلت تدبر ہے اگر آپ نے حضرت مولانا کمالی کے کلام میں بات اور ترکیب کا صحیح وقوع استعمال سمجھکر اصل مفہوم متعین فرما لیا ہوتا تو نا موزانہ رسوائی سے محفوظ رہتے۔ بھلے مانس اکم سے کم معین الشعراء ہی کو پڑھ لیا ہوتا جہاں کم و بیش پینتالیس چھیالیس معنے بات کے لکھے ہیں اور ہر معنی کی سند میں اشعار اساتذہ نقل کیے ہیں ہم یہاں حسب مقام چند معنے لکھتے ہیں

۱۔ سرگذشت۔ یاس دیکھو کہ غیر سے کہدی بات اپنی امیدواری کی (مومن)

۲۔ واقعہ۔ وان تلک کسی نے ہنس کے ذلان سے بات کی ہاں جی لگا وہ کہنے کہ یہ بات کیا ہوئی (میر حسن)

۳۔ طریقہ۔ یہ بھی ہے کوئی بات کہ محشر اٹھائیے آتا ہے تم کو بیٹھے بٹھائے خیال کیا (داغ)

۴۔ حکایت۔ بات اک یاد آئی ہے مجھ کو میری آنکھوں کے آگے گذری جو (منیر)

جناب نقاد کی تسلی کے لیے ذیل میں سیماب صاحب کے دو شعر دیئے جاتے ہیں

خوش تھا کہ ایک بات جو ہے راز زندگی کہدونگا وقت قتل بانداز سرخوشی

بس اب اک دو قدم کی بات ہے وہ آگئی منزل مسافر العداس قدر مایوس منزل سے

رہا ترکیب کا لفظ تو یہ مجازاً طریقہ ساخت یا طریقہ کار اور قاعدہ کے معنی میں آتا ہے۔ چنانچہ حضرت مرحوم داغ فرماتے ہیں ؎

تلاش ان کو ہے میرے راز داں کی نئی ترکیب نکلی امتحاں کی

ایک شعر علام امام شہید مرحوم کا حاضر ہے ؎

کوئی دعوت کی نہیں بنتی ہے مجھ سے ترکیب مگر امت کے مکانوں کی دکھاؤں ترتیب

ترکیب کے یہی معنی جناب سیماب کے ان شعروں میں بھی ہیں

ہزار رنگ کہ [illegible] سکے بھلا مگر اک طور کی ترکیب تھی مجاز نہ تھا۔

چلا آتا کسی ترکیب سے دنیا کو سمجھا کر — نہ یہ شور فغاں ہوتا نہ یہ ماتم بپا ہوتا ہے

جب بات اور ترکیب کے معنے واضح ہو گئے تو باہم دگر دونوں کا تناسب اور متقابل ہونا کئی وجوہ سے یقیناً درست ٹھہرتا ہے۔ اب مولانا کمالی کے کلام میں دونوں لفظوں میں تقابل و تناسب کا ربط متعین نہ کر سکنا اور انہیں بے جوڑ خیال کرنا صبا صاحب کے ادبی دور اندیشی و شعری نکتہ رسی کے لئے بے نظیر سند فضیلت تا بی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے

یہی جذبہ یقیناً فطرت عشق مجازی ہے — مگر آدم کو سجدہ مستقل بندہ نوازی ہے

بند نمبر ۹ — پس و پیش عزازیل ایک طرز حیلہ سازی ہے — جواز سجدہ مرأۃ جمال بے نیازی ہے۔

اس بند کے متعلق فرماتے ہیں۔

اگر کوئی صاحب جذبہ کی تفصیل دیکھنا چاہیں تو مولانا سیماب مدظلہ کی نظم پڑھیں۔ کمالی کا کمال صرف اشارہ کرتا ہے اگر ایک مصرعہ دوسرے سے مربوط نہیں ہے تو نہ ہو بحر میں ہے اور موزوں ہے اسی کو غنیمت جانئے۔ کمالی صاحب نے جواز سجدہ میں دو چیزیں پیش کی ہیں "مستقل بندہ نوازی اور مرأۃ جمال بے نیازی" ان میں اجمال نہیں بلکہ یہ خود ساختہ متصوفانہ اصطلاحیں ہیں جو کمال علم و ادراک کے بعد سمجھ میں آسکتی ہیں اور وہ صرف حضرت کمالی میں ہے

خدا کا شکر ہے کہ حضرت مولانا کمالی مدظلہ العالی کا کمال کم از کم اشارہ کرنا تو خود اپنی زبان سے تسلیم کر لیا اگر سرے سے کلام کو بے معنی ہی فرما دیتے تو آپ کا کوئی کیا کر لیتا۔ جذبہ کی تفصیل کے لیے جناب سیماب کی نظم کا پیش نظر رہنا تو یوں بھی ضروری ہے کیونکہ یہ نظم ہی جوابی ہے اور اسی ضرورت سے نظم موحد اعظم پہلو بہ پہلو چھپوائی گئی تھی تاکہ حضرت مولانا پر کسی کو ابہام اور زیادت بیجا کا شبہ تک در پیش نہ ہو سہ

طے ہوئی آج کی منزل میں مسافت اپنی — [illegible] لگی محنت اپنی

آپ نے اشعار کو موزوں اور بحر میں ہونے کو بھی مان لیا ہے۔ صرف مصرعوں کے باہمی ربط میں کچھ کلام ہے تو جناب کی ربط شناسی کا حال قارئین کرام کو ابھی اوپر دریافت ہو چکا ہے کہ آپ کو کہاں تک اجزائے کلام کی تنسیق میں ید طولیٰ اور مہارت تامہ حاصل ہے کسی امر کے جواز میں دلیل پیش کی جایا کرتی ہے نہ کہ ماہیت و کیفیت جناب نے مستقل بندہ نوازی اور مرأۃ جمال بے نیازی کو کیا دعوائے جواز کی اسناد خیال کیا ہے۔ کیا ٹھکانا ہے تبحر علمی کا۔ پھر آپ مارے خوش فہمی کے ان چیزوں کو خود ساختہ متصوفانہ اصطلاحیں قرار دیکر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ شاعر۔ نقاد۔ مولوی ہی نہیں ماشاءاللہ آپ صوفی صافی بھی ہیں۔ ابتدا سے اب تک نظم حضرت مولانا کمالی خالص متشرعانہ معاقبوں کی حامل چلی آرہی ہے۔ کہیں یہ ذکر نہیں کہ سلوک و تصوف کی رو سے نظم سیماب ناقابل تسلیم ہے۔ جواب آیات قرآنیہ و احادیث نبویہ سے دیئے گئے ہیں جو بالکل صاف ہیں۔ البتہ نظم موحد اعظم کے متصوفانہ اور فلسفیانہ ہونے کا خانہ ساز اصولی نقطۂ نظر کے ماتحت دعویٰ کیا گیا ہے۔ چنانچہ خود مدیر شاعر اور بعض دیگر ہمنواؤں کی تحدی آمیز تحریریں اس پر شاہد ہیں جن میں بعض اقوال صوفیائے عوام سے استناد اور مزید بر آں اسرائیلیات سے بھی بنظر تقویت دعویٰ نقلیں درج کی گئی ہیں یہاں تو جناب نے بے پر کی اڑائی ہے مگر کچھ بے پتے کی جو طاچہ دست غیب بنکر اپنے منہ پر پڑی بقول شخصیکہ

ع — ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

تعمق و امعان کی نگاہیں کام میں لایئے اور پھر فرمایئے کہ وہ خود ساختہ کمال حضرت مولانا میں ہیں یا جناب کے استاد محترم کی ذات شریف میں جن کا تابچہ اسکا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔ اخراتی اور عرض ہے کہ جذبہ کی تفصیل کے لئے اس سے پہلے کئی بند مکرر ہو چکے

سیماب کے اس شعر کے مقابل موزوں فرمایا گیا ہے ؎

یہی جذبہ رہا ہے فطرتِ عشقِ مجاز اب تک کہ عاشق غیر کی تحریم سے ہے بے نیاز اب تک

اس کے دوسرے مصرعہ میں جذبہ کی وہ تفصیل بیان ہوئی ہے جس کی طرف نقاد نے قارئین باتمکین کو متوجہ کیا ہے مگر اس جذبہ کی تفصیل کا متعدبہ حصہ اس سے پہلے دو شعروں میں مذکور ہو چکا ہے اور ان ہر دو شعر کا جواب بھی اس بند سے پہلے لکھا گیا ہے۔ جہاں جذبہ کی سیمابی تفصیل مع اشیاء زائدہ موجود ہے پھر اسے اشارہ کہدینا نقاد کا نور فراست غلاف دخان میں روپوش و مستور ہونے کا منظر ہے۔ حضرت مولانا نے شعر ہذا کے دوسرے مصرعہ پر اس لیے توجہ نہیں فرمائی کہ اس میں کوئی جدا اور تفصیل ماسبق سے زیادہ بات نہ تھی۔ نیز فنی نقطۂ نظر کے ماتحت مصرعہ باعتبار ساخت بہت بج بج اور کئی قسم کے اغلاط کا مجموعہ تھا۔ موصوف کو فنی اعتراضات منظور نہ تھے آپ کو صرف اعتقادیات کے متعلق کچھ کہنا تھا اور بس ساخت مصرعہ کی وہ خرابیاں جن کی بنا پر مصرعہ کو ناقابل التفات خیال کیا گیا وہی وہ چیز ہے جسے ہم نے بج بج ہونے اور اغلاط سے تعبیر کیا ہے مگر نقاد کے ہاں غالباً اسی کو کُب کہا جاتا ہے۔ مصرعہ میں یہ کُب اس طرح لگاتار واقع ہوئے ہیں جس پر یہ عامیانہ مشہور مثل صادق آتی ہے اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی۔ ہم نے یہاں اسے عامیانہ مشہور مثل محض مشتہر بین العوام ہونے کی وجہ سے لکھدیا ہے ورنہ حقیقت میں اس کا ماحصل مفہوم قرآن مقدس کی اس آیت سے مستفاد معلوم ہوتا ہے افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت۔ اب گویا آپ نے حضرت مولانا کے صرف اشارہ کا ذکر محل طنز میں کر کے ہمیں اس امر پر مجبور کیا ہے کہ مصرعہ کے وہ کُب دکھا دیئے جائیں جن کی دید سے جناب کی بالغ النظری اب تک بہرہ یاب نہیں ہوئی۔ اس مصرعہ میں تحریم بمعنیٰ احترام زبان اردو میں نامانوس تو ہے ہی روزمرہ کے خلاف بھی ہے کیونکہ تحریم اصطلاحات شرعیہ میں تحلیل کے مقابل عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے جس کا مفہوم ہے خدا کی حلال کی ہوئی چیزوں کا حرام قرار دینا۔ اسی طرح بے نیازی جائمۃ رکھنے کے موقع پر استعمال کیا گیا ہے جو ہرگز صحیح نہیں جیسا کہ ہم اوپر کہیں بتا آئے ہیں مزید براں مصرعہ کا آخری بھاری بھرکم ایک اور کُب یہ ہے کہ اس مصرعہ میں ردیف۔ اب تک بالکل بیکار۔ بے ضرورت اور قطعاً حشو ہے۔ بار بار شعر کو پڑھ کر سمجھ لیا جائے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

بند نمبر ۲۰

یہاں ہوتے ہیں وہ۔ تم اللہ تمہارے چاہنے والے حسینان جہاں کو دھمکیوں سے پٹتے ہیں پالے
حقیقت کو جو دل دے بازدوی کی قسم کھالے نہیں تو جان کے بھی غالباً پڑ جائیں گے لالے

فرماتے ہیں :۔

آپ یہ بند پڑھ کر کیوں مسکرا رہے ہیں کیا یہ غیر موزوں ہے "وہ پڑ نہ ہنسئے" وہ ہے سے تو مصرعہ پورا کیا گیا ہے۔ رہا زبان کا سوال تو زبان ان چار مصرعوں ہی کی کیا پوری نظم کی داد کے قابل ہے اخر تو بہار کے ایک صاحب کمال کی زبان ہے۔

نقاد اپنے کسی ہم نشین کی ادائے معشوقانہ پر تبصرہ فرما رہے ہیں یا حضرت مولانا کمالی کی نظم عالی کی تنقید یہ بات آپ ہی سے دریافت کرنے کی ہے۔ اصل کلام پر جب کچھ بس نہیں چلتا تو آپ کسی کے مسکرانے ہنسنے اور ہنستے ہنستے لوٹ جانے کا ذکر درمیان میں لے آتے ہیں موصوف کو شرم آنی چاہیے اس دلالانہ بردہ فروشی سے تنقید کا کیا لگاؤ ہے زیادہ سے زیادہ چند سوقی ہوسناک بھڑووں میں آئیں اور کچھ دیگر بے باک نکھٹے بازار بھاؤ کے وقت کا آپ کی اس اوباشانہ معاملہ بندی کی تہہ کو پہنچ کر قہقہے لگائیں کیونکہ ؎

ہو گئے آفت کے ہیں یہ پہر کالے تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے

اس بند سے پیوستہ نقطہ لفظ وہ کی بابت کچھ فرمایا ہے اگرچہ جو کچھ کہا ہے کہنے سے اس کا نہ کہنا ہی بہتر تھا، مگر ہم تو پھر بھی کہینگے کہ غنیمت ہے کچھ کہا تو اس کے علاوہ اپنی خودساختہ چند چھوٹے بڑے جملے ہیں جنہیں بار بار اور تقریباً اکثر جگہ تھوڑا تھوڑا فاصلہ دیکر استعمال فرمالیتے ہیں جیسے "یہ بند پڑھ کر کیوں مسکرا رہے ہیں" "وہ پر بیٹھے" داد کے قابل ہے اور انہیں کے بے بنیاد اعتقاد پر لمحے بھر کے لیے آپ بھی مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے اور اپنے ہمنواؤں کو بھی قدرے شادکامی کا موقع دیتے ہیں اور متفقہ طور پر طے کرلیا جاتا ہے کہ مقابل کے کلام کی تنقید ہوگئی۔

رہا وہ کا حال۔ موصوف اسے مضحکہ خیز اور گویا حشو قرار دیتے ہیں تو امر واقعی یہ ہے کہ یہ بند حضرت حکیم مضطر خیرآبادی مرحوم کے شعر کا حسب مقام جواب ہے چونکہ جناب سیماب نے اپنی نظم میں ایک خاص جذبہ کا بقول نقاد مفصل ذکر کر چکنے کے بعد بطور تمثیل سنداً مضاف و متضمن کیا ہے وہ شعر یہ ہے۔

تمہیں چاہوں تمہارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں   میرا دل پھیر دو مجھسے یہ جھگڑا ہو نہیں سکتا۔

ظاہر ہے کہ اس شعر میں عشق مجازی کا ایک جذبہ مذکور ہوا ہے جسے عشق حقیقی کے جذبات میں سے کسی سے مجالست تو کیا دور کی شاباہت بھی نہیں جن کے تحقق کا سیماب صاحب نے شیطان میں دعویٰ کیا ہے جو گذشتہ کئی اشعار میں بیان ہوتے لہذا حضرت کمالی مدظلہ العالی فرماتے ہیں کہ "وہ" یعنی ویسے یا اس طرح کے تم اور تمہارے چاہنے والے۔ جیسے یا جس طرح کے حضرت مضطر مرحوم کے شعر میں بتائے گئے ہیں۔ یہاں یعنی اس دنیا کے محدود و مادی ماحول میں ہوتے ہیں اور انہیں دنیاوی حسن و جمال والوں کو ایسی دھمکیوں سے پالے پڑتے ہیں جس قسم کی دھمکی کا ذکر اس شعر میں ہے۔ مگر عشق حقیقی کے نامحدود عالم میں فقط ایک ہی وحدہٗ لاشریک خدا کی ذات مطلوب خاص ہے جو اپنی بخشش عطا میں ہے کسی کی دھمکی سہہ سکتا ہے نہ کسی طالب کو اس جسارت و گستاخی کی اس کی جناب میں مجال۔ وہاں کا دستور عشق و حسن یوں ہے کہ جو اس حریم جمال حقیقت میں ہدیۂ دل نذر پیش کش لائے وہ ابدالاباد تک اس دولت گراں مایہ سے دست برداری کے لیے مستعد ہو جائے اور قبول کر بھی یا زد عویٰ یا اس شے کی واپسی کے تقاضے کا ارادہ نہیں نہیں، وسوسہ تک خاطر میں نہ آنے دے۔

اب ان تینوں شرح کردہ مصرعوں کو چوتھے مصرعہ سے ربط دیکر بند کے موزوں اور لفظ وہ کے حشو ہونے نہ ہونے کا اندازہ قارئین کرام خود لگالیں۔ اس جگہ یہ بتا دینا بھی ایک امر ضروری ہے کہ لفظ "وہ" "ویسے" یا اس طرح کا مفہوم ادا کرنے کے لیے آتا ہے، جیسا کہ اشعار ذیل سے واضح ہے

ہوں وہ مشتاق شہادت دیکھ کر چھری تڑپ   صورت بسمل پھڑک جاتا ہے دم شمشیر کا   امیر
وہ ہے تو تیزیٔ عالم تو جو رکھدے ناز سے انگلی   تو عالم مرغ بسم اللہ میں ہو مرغ بسمل کا   میر
چال وہ چلتے ہو دل پستے ہیں جس پہ ہر قدم   کام وہ کرتے ہو تم جس میں کسی کا کام ہو   آتش
وہ محویت کا شبہ تھا کہ باتیں اس نے کیں آکر   رہا تھا شب کو میرا ہی تصور ہم سخن میرا   شوق
فقرہ وہ سنا جس سے کونین تڑپ جائے   فریاد ہے بے معنی فریاد سے کیا ہوگا   سیماب

صوبہ بہار کے اہل کمال ادبا و شعرا پر نکتہ چینی کی نظر اک بے معنی بات ہے کیونکہ اول تو اردو زبان کے دور اول سے اب تک بہت سی یادگار ہستیاں پیدا ہو چکی ہیں جو اپنے امتیازات خاصہ کی بنا پر یادگار ملک ہیں۔ حضرت راسخ عظیم آبادی مرحوم نواب محمد علی شاد عظیم آبادی مرحوم، حضرت شوق نیموی کے علاوہ بھی بہت سے اصحاب کا ذکر بعض مدون تذکروں میں ملیگا فی زمانناً حضرت حسین مرتضیٰ ... تعلق رضوی لمادی گیاوی جلیل بہار مرید کا بری سینائی گیاوی جیسے اصحاب ذوق ہیں جن کی قابل قدر تحریریں بعض ادبی مسائل کے متعلق اپنے مخصوص دعاوی پر خود مدیر رسالہ شاعر نے سنداً پیش کی ہیں۔ نیز حضرت مولینا سید محی الدین

شاہ صاحب تمنا مجیبی عمادی پھلواری وغیرہ جیسے اصحاب جنہیں خود جناب سیماب نے بعض خطوں میں اپنا معاصر کیا اور ان کے ہمراہ شاعروں میں اپنی شرکت کو بڑے افتخار کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ دوسرے حضرت مولانا کمالی مدظلہ العالی کی نسبت مقالۂ انتقاد میں صوبہ بہار کا نام لینا نقاد کی تخمین محض اور بے سر و پا اٹکل ہے۔ کیونکہ حضرت موصوف یوپی میرٹھ کمشنری میں ضلع بلند شہر کے سکان سے ہیں اور گلاؤٹھی نامی مردم خیز قصبہ کے متوطن جو ہندوستان میں بعض دیگر مخصوص مقامات کی طرح شرفائے سادات کے لیے معروف بین الخاص والعام ہے۔ موصوف کے پدر بزرگوار حضرت مولانا حکیم سید محمد حسین یقین رحمۃ اللہ علیہ تھے جو اپنے وقت کے مشاہیر روزگار سے گزرے ہیں ملاحظہ فرما لیا جائے۔ سر سید احمد مرحوم کی آثار الصنادید طبع اول۔ آپ کو فارسی ادب میں حضرت مولانا امام بخش صہبائی دہلوی مرحوم جیسے مشہور عہد استاذ سے شرف تلمذ حاصل تھا جناب قاضی سید عبدالوحید صاحب فدا گلاؤٹھوی کے استاذۂ خاص سے تھے جو نواب مرزا خانصاحب داغ دہلوی مرحوم و مغفور کے نورتن میں محسوب ہیں ملاحظہ ہو سالنامہ شاعر آگرہ سنہ ۱۹۳۲ء

انہیں چاہو اور ان کے چاہنے والوں کو بھی چاہو ۔ جنہیں چاہیں وہ ان سے بھی نہ جھجکو اے حق آگاہو
بند نمبر ۱۲ یہ سب کچھ بس وہی وہ ہیں بھلا میں کون تم کیا ہو ۔ وہ ہوں جس رخ اسی رخ منتظر سیر و تماشا ہو

ارشاد ہے :-

ہر بند کی طرح اس بند کا مطلب بھی وہ ہی سمجھ سکتا ہے جس میں مجذوب کی بڑ سمجھنے کی صلاحیت ہو پہلے مصرعہ میں "اور ان کے" دوسرے میں "نہ جھجکو اے" تیسرے میں "یہ سب کچھ بس" اور چوتھے مصرعہ میں "وہ ہوں جس رخ" خاص طور پر داد طلب ہیں

صبا صاحب کو اس بند میں کہیں انگلی رکھنے کی جگہ نہیں ملی اس لیے برائے نام بھی گفتگو کا کوئی کار آمد پہلو نہ سوجھا مگر بقول شخصے ملا آں باشد کہ چپ نہ شود چاروں مصرعوں میں سے ایک ایک ناتمام ٹکڑے کو تیمناً دہرا دیا مثلاً مصرعہ اولی سے "اور ان کے" دوسرے سے "نہ جھجکو اے" تیسرے سے "یہ سب کچھ بس" چوتھے سے "وہ ہوں جس رخ" اور بطور تازہ نگر کبھی کا بہانا گویا جناب کی دنیائے ادب کے باوا آدم کا تصنیف کیا ہوا ایک فقرہ بڑھا کر مطلقاً ناموزوں سا ایک مخمس گڑھا جو آپ کے نام تنقید میں بجز خورشید سے زیادہ منور ہونے کا شرف رکھتا ہے بند ہذا کے آغاز میں جو پہلا فقرہ قلمبند فرمایا گیا تھا۔ وہ اب جناب کے اس تنقیدی بند مخمس پر بعنوان مطابق النعل بالنعل چسپاں ہو گیا۔ جو یہ ہے "ہر بند کی طرح اس بند کا مطلب بھی وہ ہی سمجھ سکتا ہے جس میں مجذوب کی بڑ سمجھنے کی صلاحیت ہو" اب جوش قابلیت سر پر ہاتھ رکھ کر نقادی کی جان کو رونے اور بین میں بار بار ذیل کا شعر دہرائے ؎

گل کھائے عضو عضو تن درد مند پر ۔ مہریں لگیں جنوں کی مرے بند بند پر

یہ ویسی ہی صورت ہوئی جیسے جناب نقاد کی طرح کوئی غیر سیمابی نو آموز سیماب صاحب کی کسی غزل سے ذیل کے تین شعر بیجان قابلیت میں انتقاد کے لیے اختیار کرے ؎

فریب جلوہ ہیں یہ پردہ ہائے شبنم و گل ۔ چمن طراز حقیقت مجھے خراب نہ کر
رجوع اپنی طرف کر کے بے نیاز نہ ہو ۔ لبوں سے کھینچ کے آزردۂ شراب نہ کر
جلیس جلوت نظارہ کر تجلی کو ۔ انیس خلوت ناکارہ نقاب نہ کر

پھر کسی موقع یا وقت سے متعلق انتقامی جذبہ کے زیر اثر ہر مصرعہ سے ایک ایک ناتمام ٹکڑا لے کر یکجا کرے اور براہ طنز اپنی طرف سے ٹیپ میں ایک نا ملایم فقرہ لکھ دے مثلاً پہلے مصرعہ سے "یہ پردہ ہائے" دوسرے سے "مجھے خراب" تیسرے سے "طرف کر کے" اور چوتھے سے "لبوں سے کھینچ کے" پچھلے مصرعہ سے "خلوت ناکارہ" خاص طور پر داد طلب ہیں۔ ایسے میں اگر اس کارفرما کا کوئی ہم پہلو رفیق خلوت ان کارستانیوں کو دیکھ کر مسکراتا۔ ہنستا اور ہنستے ہنستے لوٹتا جاتا تھا بھی منہ میں بعد خود کہ رفقا کو جماہی اور اس کے رفیق کو انگڑائی

آجائے تب تو کلام سیماب کی تنقید میں چار چاند بھی لگ جائیں

مجاز مضطر حسنِ حقیقی یا دہ اطلاقے — جمال ذات گنجائش نیا بد اندرا فاقے
بند نمبر ۲۲ — مجو ہموار ذوق جلوہ مشتاقے بہ شتاقے — الا - ابلیس و آدم امتیازے نہ دراخلاقے

کمالی صاحب آپ کے اشعار میں زبان کے کُب کیا کم ہیں - غریب فارسی کو تو بخشئے یہ آپ کی ٹیڑھی ترچھی چالوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ مجاز مضطر یعنی چہ؟ چوتھے مصرعہ میں "نہ" پر غور فرمائیے۔ بری طرح کُب پیدا کر رہا ہے۔ اس کی "ہ" الف سے بدلی جارہی ہے اور اگر اسے نہ نہادن کا امر سمجھا جائے تو امتیاز نہادن شاید کمالی صاحب کے گھر کی فارسی ہوگی۔ اس کے علاوہ ان چاروں مصرعوں کی نثر یا ترجمہ کیجئے تو انشاء اللہ آپ ہنستے ہنستے لوٹ جائیں گے۔

نقاد کی اس تنقیدی عبارت میں اعتراض صرف دو ہیں اول مجاز مضطر کیا ہے۔ دوم امتیاز نہادن خلاف محاورہ فارسیاں ہے۔ باقی محض فقرہ بازی ہے۔ پہلا فقرہ اس باب میں ہے کہ حضرت مولانا کمالی کی زبان میں کُب ہیں (از ان جملہ ایک کُب "امتیازے نہ" میں بتایا ہے۔ دوسرے فقرہ میں فارسی زبان کی ہمدردانہ سفارش کی گئی ہے۔ تیسرے فقرے میں قارئین کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے کہ اگر فارسی بند کی نثر یا ترجمہ بنا لیجئے تو آپ ہنستے ہنستے لوٹ جائیگا۔ جواباً اول دونوں اعتراضوں کو سمجھا پھر فقرات کے متعلق بقدر مناسب عرض کیا جائیگا۔

اعتراض اول - مجاز مضطر یعنی چہ؟ عرض کیا جاچکا ہے کہ جناب سیماب نے اپنی نظم موحد اعظم کے پہلے قطع کو حضرت مضطر مرحوم کے شعر پر تمام کیا ہے۔ چنانچہ رسالہ شاعر شمارہ جولائی ۱۹۶۲ء میں اس شعر کی نسبت حاشیہ میں مختصر تعارف موجود ہے یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ مضطر مرحوم کے اس شعر میں عشق مجازی کا ایک جذبہ بخلاف جذبات عشق حقیقی بیان ہوا ہے یہاں حضرت مولانا کمالی مدظلہ العالی اسی کو مجاز مضطر فرماتے ہیں چونکہ موصوف اپنے کلام میں اس جذبہ کے مبین ہیں لہذا مجاز کی نسبت بالکل صحیح ہے، اب اگر اس کا سمجھنا نقاد کے فہم سے بالاتر ہے تو حقیقت حال کی تغلیط نہیں کی جاسکتی ہے۔ مجاز کا بالوجہ کسی شخص کی جانب منسوب کیا جانا ہرگز محل اعتراض نہیں ملاحظہ ہو سہ

کیا حقیقت سے ہوا ہے آشنا تیرا مجاز — کیا پڑھی ہے تو نے چوکھٹ پر شوالے کی نماز

جس طرح سیماب صاحب کے اس شعر میں مجاز کی نسبت مخاطب سے کی گئی ہے اسی طرح مجاز مضطر میں اس کی نسبت حضرت مضطر کی طرف ہے اگرچہ وجہیں دونوں جگہ جداگانہ ہیں بہرحال صحت میں کلام نہیں

اعتراض دوم :- "امتیازے نہ" کے متعلق یہ فرماتے ہیں "امتیاز نہادن کمالی صاحب کے گھر کی فارسی ہوگی" کیا عرض کیا جائے خدا واسطے کا عناد ہے کہ حضرت مولانا کمالی کی شان عالی میں جو زبان پر آتا ہے کہہ جاتے اور جو نوک قلم میں ہوتا ہے لکھ جاتے ہیں۔ امتیاز نہادن اگر فی الحقیقت فارسی محاورے کے خلاف تھا تو عدم جواز کی کوئی سند نقل کی ہوتی کسی ماہر زبان کا قول صحت میں پیش کرتے۔ حق یہ ہے کہ امتیاز نہادن میں اعتراض کرتے وقت امتیاز کا لفظ ہی شریک رکھنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ دریافت کرنا چاہئے تھا کہ نہادن مصدر فارسی محاورہ میں کس کس معنی کے لیے آتا اور کس کس لفظ کے شامل کیے جانے سے کیسے کیسے محل استعمال کا موجب ہوتا ہے لیکن نقاد کی جانے بلا۔ یہ مصدر حسب بیان اصحاب لغت متعدد معنوں کے لیے لایا جاتا ہے اور مطالبت مفہوم کی غرض سے اکثر مناسب الفاظ کے ساتھ استعمال میں آتا ہے جن میں سے نہادن کا ایک معنی قرار دادن ہے چنانچہ حافظ شیرازی فرماتے ہیں سہ

المنۃ للہ کہ چومن بے دل و دیں شد — آنرا کہ منش عاقل و فرزانہ [illegible] یا کہتا ہے سہ

اور اسی طرح یہ مصدر بنا رکھنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ جیسا کہ مخلص کاشی کے اس شعر میں ہے ؎

در ازل بست است مخلص دل بیاں شمشاد قد عشق جز بر راستی ننهد بنائے خویش را۔

اسی دوسرے معنی کی بنا پر نہادن جو نہادن کا ماضی نیز حاصل مصدر ہے اساس بنیاد کا مرادف بھی ہے ظاہر ہے کہ حضرت مولانا کے کلام میں اس نے صحیح محل استعمال پایا ہے۔ دیکھئے چوتھا مصرع یوں ہے۔ الا ابلیس و آدم امتیاز سے نہد در اخلاق۔ یعنی ہوشیار باش۔ ابلیس و حضرت آدم میں دربارۂ اخلاق امتیاز کی کوئی حد قرار دے یعنی مقرر کر یا باعتبار ہر دو کے درمیان امتیاز کی دیوار قائم کر بات صاف ہے مگر اسے کیا کیجئے کہ ملکی نقادیات کے سمجھنے سے بھی قاصر ہے۔ اب رہے نقرہائے سہ گانہ تو سنئے تو سنئے پہلا فقرہ اردو زبان کے کب کی شکایت میں ہے۔ اس امر کی بابت بطور حفظ ما تقدم ہم انیسویں صدی میں کافی حد تک کچھ عرض کر چکے ہیں اور کچھ یہاں عرض کیے دیتے ہیں بغور ملاحظہ فرمائیں۔ جناب سیماب فرماتے ہیں ؎

سکوں پذیر جنون شباب ہو نہ سکا شگفت موسم گل کامیاب ہو نہ سکا

دیکھئے جناب کے مشاق اور ماہر زبان و ادب استاد شگفت کو جس کی تانیث زبان اردو میں مستعمل ہے خدا جانے موسم مضاف الیہ کے دھوکے سے یا شگفت بکسر کاف فارسی بمعنی تعجب کے قیاس پر مذکر لائے ہیں جو زبان اردو کا کھلا ہوا کب ہے، کیونکہ اگر شعر کو محاورہ کے مطابق صحیح کر لیا جائے تو مطلع مصرعوں کے ہم مادہ ہو جانے سے دنیائے شاعری کی عجائب المخلوقات بنجاتا ہے اس طرح کہ

سکوں پذیر جنون شباب ہو نہ سکا ، شگفت موسم گل کامیاب ہو نہ سکی۔

اور سنئے موصوف اپنی نظم "غیر اللہ کو پہلا سجدہ" میں فرماتے ہیں

ملت بیضا کے اے کافر گر و بتخانہ ساز کفر میں اور شرک میں تجھکو نہیں ہے امتیاز

اسی شعر کے دوسرے مصرع میں لفظ "میں" مکرر لایا گیا ہے نظر بمفہوم پہلا "میں" قطعاً حشو ہے جو اردو زبان کا سب نمایاں کب ہے۔ اسی نظم میں ایک اور شعر فرماتے ہیں ؎

حکم اب اس کو سمجھتا ہے تو پھر اے کم نگاہ سجدۂ تعظیم کو اب کر دیا ہے کیوں گناہ

اس کے دوسرے مصرع میں کر دینے کا فاعل کون ہے وضاحت نہیں کی گئی اگر مخاطب ہی کو جو سمجھنے کا فاعل ہے اس کا فاعل قرار دیا جائے تو صاحب مضمون کی مراد اس کی متحمل نہیں۔ پھر اسی مصرع میں کر دیا ہے کیوں گناہ سے سیماب کی یہ غرض معلوم ہوتی ہے کہ سجدۂ تعظیم کو اگر حکم اب سمجھتا ہے تو پھر تو نے خواہ حضرت آپ نے اسے گناہ کیوں قرار دیا ہے۔ کسی امر کے قرار دینے کو کر دینا کہنا خلاف روزمرۂ اردو ہے۔ لہٰذا اس شعر میں اسم فاعل کا حذف زبان کا ایک الگ کب الگ ہے اور بجائے قرار دینا کے صرف کر دینا کہنا ایک کب الگ ہے۔ اور سنئے کسی غزل میں فرماتے ہیں۔

داماں سحر پر کندہ ہے اب تک افسانۂ غم میرا یہ تارے مری آنکھیں ہیں یہ گریہ ہے شبنم میرا۔

ظاہر ہے کہ دامن پر بجکن۔ جامدانی کاڑھی جاتی ہے بیل بوٹے نکالے جاتے ہیں چھینٹ چھاپی جاتی ہے سلما ٹانکا جاتا ہے کوئی چیز کندہ نہیں کی جاتی۔ دوم یہ کہ دوسرے مصرع میں "یہ گریہ ہے شبنم میرا" "یہ تارے مری آنکھیں ہیں" کی طرح "یہ شبنم ہے گریہ میرا" شاعر کی غرض ہے۔ اب غور فرمائیے کہ اگر اس کو صحیح کر دیا جائے تو مطلع صاف ہو جاتا ہے اور مطلع سے شعر بن جانے کے بعد بھی ایطائے ردیف جلی کا عیب باقی رہ جاتا ہے اور نظر بمراد صحیح "گریہ" سے "میرا" کا بعد عیب تعقید کا موجب ہے یہ کب جو ترکیب اس شعر میں موجود ہیں فہم سخن شرط ہے

[illegible]

علق مجبوراً ہم کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ آپ جس امر کے شاکی ہیں وہ جناب سیماب کے کلام میں کثرت سے پایا جاتا ہے اشعار ذیل ملاحظہ ہوں

ایک طوفان تھا مگر کوزہ نشیں ہوتا رہا ۔۔۔ ہائے وہ آنسو کہ جذب آستیں ہوتا رہا

مجھ سے پہلے کوئی جلوہ نگر دل نہ ہوا ۔۔۔ یہ وہ منصب ہے کہ موسیٰ کو بھی حاصل نہ ہوا

اب تک نہ اس نے سیکھا با این ہمہ قدامت ۔۔۔ آئین دوستداری اس محفل کہن میں

نہ پوچھ مجھ سے مری ہر رنگی و ہمہ رنگی ۔۔۔ جو کچھ سمجھ لیا جس نے مجھے وہی ہوں میں

دیکھئے ان اشعار میں کوزہ ۔ جلوہ ۔ ہمہ کی ہ الف سے بری طرح بدل رہی ہے اور چوتھے شعر کے دوسرے مصرعہ میں سمجھ لیا کا الف بھی دب رہا ہے مزید براں دعوت جلوہ کی سرخی میں یہ امر ہے کہ متعلق جناب سیماب کے ایک خاص نوشتہ کا ملخص درج موصوف دریافت طلب امر کی نسبت جواباً تحریر فرماتے ہیں ان اشعار میں فنی نکتہ صرف اتنا ہے کہ جلوہ کی واو کی حرکت (فتحہ) میں اشباع ہے جس سے الف کا دھوکا ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ رہا اشباع کا سوال تو تقطیع میں اہل اہل فن اسے جائز سمجھتے ہیں ۔ ۔ اشباع جائز ہے ۔ شاعر ستمبر ۱۹۳۱ء صفحہ ۔ دوسرے فقرہ میں فارسی زبان کی ہمدردانہ سفارش ہے اس میں تحکم ترشیتانہ جملہ یہ ہے کہ ثمانی صاحب کے گھر کی فارسی ہوگی ۔ افسوس ہے سیماب صاحب کا فارسی کلام ہماری نظر سے نہیں گذرا یہاں ہم رسالہ شاعر شمارہ مارچ ۱۹۳۲ء کے صفحہ ۹ کی جانب قارئین کرام کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں جہاں اصلاح سخن کی سرخی کے نیچے صفحے کے دو کالم کر دیئے گئے ہیں اور پہلے کالم میں تعارف زیر عنوان یہ عبارت ہے "ابو المختار طرفہ قریشی بلند اردی کی نعت پر حضرت مولانا سیماب اکبر آبادی کی اصلاح جناب طرفہ صاحب کا نفس کلام کچھ ہو کیسا ہی ہو ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں نہ اور کسی کے کلام پر نقد و تبصرہ مقصود و مقام ہے یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ نعت شریف کے کل آٹھ اشعار تھے اور اشعار فارسی زبان میں ہیں متعدد اشعار پر اصلاح لکھی گئی ہے ۔ ایک ایک کا ذکر کرنا باعث طوالت ہے ہم فقط پانچواں شعر مع اصلاح نقل کرتے ہیں ملاحظہ ہو ۔

گنہگارم سزا دارم و لے ام امتی تو ۔۔۔ کرم کن یا رسول اللہ نہ جز تو آسرا دارم ۔۔۔ (طرفہ)

گنہگارم سزا وارم و لے در امت والا ۔۔۔ کرم کن یا رسول اللہ نہ از تو آسرا دارم ۔۔۔ (اصلاح)

اب خوب سمجھ کر شعر اور اصلاح کو پڑھ لینے کی ضرورت ہے "آسرا" اس شعر میں قافیہ لایا گیا ہے ۔ یہ لفظ ہندی ہے ہرگز فارسی نہیں ہے اس کے علاوہ "نہ از تو آسرا دارم" عجیب و غریب ترکیب ہے جو کسی طرح بھی طرفہ صاحب کے موافق مراد نہیں قرار دی جا سکتی پڑھنے والے حضرات خود غور فرمائیں معلوم نہیں نہ کو کہیں مسند دیا اس سے مضمون نعت میں کیا خوبی پیدا ہوگئی خیر نعت شریف کے بعد فاضل مدیر رسالہ جناب اعجاز صاحب خلف سیماب صاحب نے بطور تذئیل اصلاحی اشعار پر نشانات رموز بنائے ہیں پھر انہیں رموز کے مطابق اصلاح کی توجیہیں قلم بند کی ہیں چنانچہ اس شعر پر رقمطراز ہیں "ام امتی کو زبان سے ادا کرنے میں قباحت ہوتی تھی ۔ فارسی اصول و قواعد کے خلاف تھا "در امت والا" سے دونوں عیب دور ہوگئے اور مقصد وہی رہا ۔ دوسرے مصرعہ میں "رسول اللہ" کی ہ دب رہی تھی بیشک غور کرنے کی جگہ ہے کہ دونوں مصرعوں میں رسول اللہ کی ہ نہ اس وقت دبتی تھی نہ اب دبتی ہے بلکہ لام مشدد پر جو حرکت فتحہ قائم مقام الف ہے وہ دبتی تھی اور اب بھی دبتا ہے کیونکہ اصلاح میں صرف لفظ "جز" کو "از" سے بدل دیا گیا ہے ۔ مگر توجیہ مدیر کی بے ربطی سے ہمیں الجھنا فضول ہے یہ اس لیے کہ جناب کے یہاں کا دستور ہی یہ معلوم ہوتا ہے چنانچہ رسالہ دستور الاصلاح کے صفحہ ۶۲ پر صوفی کے شعر پر غالب کی اصلاح مع توجیہ یوں لکھی ہے ۔

صوفی ؎ ۔۔۔ حق نے دی ان کو شہنشاہی دیں ۔۔۔ کی عطا مہر نبوت کی نگیں

اصلاح ؎ ۔۔۔ " " " ۔۔۔ سونپ کر مہر نبوت کی نگیں

توجیہ ۔ نگیں اور نگینہ مذکر ہے یہی وجہ اصلاح تھی

لفظ "آسرا" کے ہندی ہونے میں اگر ناگوار کو ذہول ہوا تھا تو جناب مدیر نے بھی اس کی نسبت مطلقاً بے توجہی برتی اب انصاف شرط ہے کہ حضرت مولانا ثمانی کی فارسی ثمانی کے گھر کی ہے یا یہ فارسی سیماب صاحب کے گھر کی ؎ وزیرے چنیں شہریارے چناں ۔ جہاں کس نگیرد قرار جہاں تیسرے فقرہ میں نقادی نے جو کچھ فرمایا ہے بہتر ہے ۔ فارسی ہند کی فارسی نثر ہا گر مقاحس کا جی چاہے امتحان کر کے پڑھنے والا ہنستے ہنستے لوٹ جاتا ہے یا جناب کی غلط راوی پر بے اختیار قہقہہ لگانے پر مجبور ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ فارسی ۔۔۔

ضروری تصحیح

گذشتہ ماہ اپریل میں سیمابی اسلوب تنقید کی غلطی گلگی " کے زیر عنوان جو مضمون شائع ہوا ہے اسمیں اکثر جگہ کتابت کی غلطی ہے قارئین کرام مندرجہ ذیل جدول کو دیکھکر تصحیح فرمالیں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۶	۱۷	نبجے	بجا	۴۱	۲۶	والوں	والا	۴۴	۲۸	کسی	×
۳۷	۹	بردلی	مددلی	"	۳۱	بنے منت	بے منت	۴۵	۱	سرستوں	سرستیوں
۳۸	۱۱	سکھپائی	سکھپالی	۴۲	۲۱	پوروؤں	پورووں	۴۶	۵	ہرکبیرو صغر	ہرکبیر و صغیر
"	۱۲	پخوڑے	پچھوڑے	"	۲۵	ملاحظہ ہوں	ملاحظہ ہو	"	۶	عنیت	عینیت
"	۲۶	بن سکی	بن سکتی	۴۳	۴	چمنہ وچغانہ	بچغانہ وچغانہ	"	۷	غیربث	بغیریت.
۳۹	۵	وارہوتا	واردہوتا	"	۱۰	فلاف	×	"	۱۱	عنت وغربت	عینیت وغیریت
"	۱۱	ساعت	سرعت	"	۱۰	حرف	×	"	۱۱	اماغ	اصاغر
"	۳۱	کلدٗ	×	۴۴	۲۱	توجہ	بوجھ	۴۷	۵	الہ باطلہ	الہہ باطلہ
۴۰	۱۳	تیرا	تیرہ	"	۲۳	تعکم	قلم	"	۷	سننے والا	سینے والا
"	۱۲	اہتراز	اہتزاز	"	۲۴	کم	کپ	۴۸	۶	خداکو پوجنے والا	خداکا پوجنے والا
۴۱	۱	درماں	داماں	"	۲۶	ہو	ہوگا	"	۹	سرکس متمر	سرکش و متمرد
"	۲۱	لفظ کا	لفظ کو	"	۲۷	خم تر	خم	"	۲۱	ہیرا پائے	پیرا

قسط سوئم کے آغاز میں سہو کاتب سے پنجم بند کا آخر حصہ جو الگ صفحہ پر لکھا تھا ترک ہوگیا ہے قارئین کرام قسط سوئم کا شروع مضمون یہ سمجھیں اور اس طرح رسالہ اپریل کے مضمون کو مکمل فرمالیں" ـــــ ادارہ

"مجسمہ علم پیکر دانائی کو لفظ " دانا" کے تمسخر کی تو سوجھی مگر "صدر اعظم" ناظم صدر اعظم کی شرمناک فاش عامیانہ غلطی کا احساس نہ ہوا۔ اور ہوا تو شرم نہ آئی۔ کہنہ مشقی اور قدرت کلام کے لیے اس سے زیادہ اور کیا امر ننگ و عار کا موجب ہوسکتا ہے؟ کوئی غیرتمند ہوتا تو چلو بھر پانی میں ... حضرت مولانا نے کس نزاکت و لطافت کے پیرائے میں تشبیہ یا اشارے فرمائے ہیں کہ محتاج تعریف نہیں۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

کہا ملکوت کا جبروت کا ناسوت کا داتا

ملاحظہ ہو جناب سیماب کے غلط استعمال کیے ہوئے الفاظ بہ تورجوں کے توں کس خوبی سے مولانا نے کیے ہیں۔ پھر نویں بند میں عالم ملکوت و ملکوت کا اجمالاً اضافی حیثیت یاد دلایا گیا ہے [illegible] بیعت ملائکہ شیطان سے تا اسما کہ تک نا واقف ہونیکا بجواب "وعلم آدم الاسماء (الآیۃ)" بھی ذکر فرمادیا جو حسب مقام شیطان کو عام جاننے کی تردید میں ہے اور طرزادا میں یہ بھی بتلادیا کہ باعتبار اعراب "ملکوت" و "جبروت" کو بسکون لام وبائے موحدہ بے احتیاطی سے موزوں کرنے والا شخص کس حد تک اعلاج کے جانیکا مستحق ہے بعض صاحبوں نے جوش تاریخ [illegible] شعرائے فارسی کے

کے تصرف کا سہارا لیا ہے اور بات بنانیکی کاوش کی ہے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ غلط لفظ بہرحال غلط سمجھا جائیگا۔ چنانچہ ایسا کرنیوالے خود اپنے ہی زبان میں معترضین کی زد سے محفوظ نہیں رہے۔ ادبیات فارسی کی تاریخ کا مطالعہ شرط تحقیق ہے اور یہ حقیقت ہے کہ "ملکوت" "جبروت" صحیح بفتح لام وبائے موحدہ ہیں۔ فارسی اردو کے بعض مستند شعراء کے اشعار درج ذیل ہیں۔

(ملکوت) مرغ باغ ملکوتم دریں دیر خراب :: می شود نور تجلی ئے خدا دانۂ ما
حضرت غوث الاعظمؒ

ماطائر قدسیم نوا را نہ شناسیم :: مرغ ملکوتیم بجا را نہ شناسیم — فیضی

ع۔ تو علم ملکوت شود نرسی بہ اوج کلام او — مرزا عبد القادر بیدلؔ

حضرت حکیم سنائیؒ کی کسی مشہور مناجات کا مصرعہ ہے

(جبروت) ع تو جلیل الجبروتی تو امیر الامرائی

نور جبروتیم ز ظلمت نہ براییم :: آئینہ جسمیم صفا را نہ شناسیم — (فیضی)

جبروت حرم و بتکدہ حیراں بہ نگر :: ہمہ با بخیہ زدو سر بگریباں [illegible]

نقد و نظر

نغمۂ زندگی : ۔ سید فضل احمد کریم فضلی بی۔ لٹ (آکسن) آئی۔ سی۔ ایس (بنگال) کے مجموعہ کلام کا نام ہے اور زیر نظر سطور میں اُس کا ایک تنقیدی جائزہ مقصود ہے۔

اس مجموعہ میں نہ صرف غزلیات ہیں بلکہ رباعیات۔ قومی نظمیں اور ایک مثنوی نما طویل نظم بھی شامل ہے۔ بہ الفاظ دیگر فضلی صاحب نے ہر صنف شعر میں طبع آزمائی کی ہے جو ایک نقاد کو اُن کی شاعری کے متعلق ایک صحیح اندازہ لگانے میں بہت مدد دیتی ہے

آج کل تنقید کا ایک عام اصول یہ ہوگیا ہے کہ کسی شاعر کے کلام کو پرکھنے کے لیے مغرب کے مفکرین اور نقادوں کے حوالہ سے شاعری کی تعریف کرکے زیر تنقید کلام میں اُس کی مماثلت تلاش کی جاتی ہے میرے خیال میں یہ طریقہ کچھ پسندیدہ نہیں۔ شاعری میں ایک شخصیت کا اظہار ہوتا ہے اس لیے اُس اظہار کو کسی خارجی قانون یا ضابطہ کی کسوٹی پر کسنا درست نہیں۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ خود اُس شاعر کا نظریۂ شاعری کیا ہے؟ اور وہ اپنے اس نظریہ کو اپنے اشعار میں کس حد تک نمایاں کرسکا ہے۔ یہ فضلی صاحب کی شاعری کے متعلق اظہار خیال کے لیے میں ان کی اپنی رائے زیادہ مقدم سمجھتا ہوں

خوش قسمتی سے انھوں نے شاعری کے متعلق بالعموم اور اپنی شاعری کے متعلق بالخصوص اس مجموعہ میں بہت سی شہادتیں مہیا کردی ہیں "عذر شعر گوئی" میں وہ بڑی صفائی کے ساتھ اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ :۔

شاعری ہے جو شعر خوانی | چشمے سے اُبل رہا ہے پانی
چشمہ یہ رہیگا یوں ہی جاری | ہو یا نہ ہو پینے والا کوئی

اور آگے بڑھ کر کہتے ہیں :۔

اظہار خودی کا یہ فسوں ہے | اس کا ہر ایک کو جنوں ہے

ایک جگہ اور فرماتے ہیں

عشق نے دی جو دل کو آگ | شعلے بھی نکلے بن کر راگ
راگ جو شعر بن گیا | نغمۂ زندگی بنا

حاصل کلام یہ کہ شاعری "اظہار خودی" کا نام ہے اور اظہار خودی کی تحریک شدت احساس یا عرف عام میں عشق سے ہوتی ہے

اب دیکھنا یہ ہے کہ "نغمۂ زندگی" میں جس خودی کا اظہار ہے وہ کتنا مکمل اور صحیح ہے۔ مگر اس سے پہلے کہ ہم اس طرف رجوع ہوں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فضلی صاحب کی شاعری کی متعلق اُن کی اپنی رائے پر بھی نظر ڈال لی جائے۔ تاکہ ہمیں یہ معلوم ہوسکے کہ وہ خود اس اظہار سے مطمئن ہیں یا نہیں۔

فضلی صاحب اپنی شاعری سے بہت مطمئن ہیں بلکہ اُنہیں اپنا آپ معتقد کہنا چاہیئے :۔

اُسے سمجھئے مذاق سخن سے بیگانہ | ترے کلام میں فضلی جسے کلام ہوا
کیسے کہتا ہے ایسے اچھے شعر | فضلیؔ کم سخن خدا معلوم
یہ فضلی کا لطف سخن دوستو | خداداد ہے اکتسابی نہیں
ہمیں تو بس یہی بھاتی ہے فضلی | ترے الفاظ میں جو سادگی ہے

اور اسی طرح کے متعدد اشعار ہیں جن میں آپ اپنے گُن گائے گئے ہیں صرف ایک غزل میں وہ اپنے طرز شعر گوئی سے نا مطمئن نظر آتے ہیں :۔

ہماری شاعری میں ان دنوں کچھ | شکوہ لفظ و عریانی بہت ہے
کہاں وہ غالب و اقبال کی بات | مگر ہاں نقل جا بجا بہت ہے۔
غزل کہنا نہیں آسان فضلی | تمہیں شوق غزل خوانی بہت ہے

ہمیں یہ پتہ نہیں ملتا کہ یہ "کن دنوں" کی بات ہے جس غزل سے یہ اشعار لیے گئے ہیں اُس میں تلاش کے باوجود نہ شکوہ لفظی دستیاب ہوتا ہے اور نہ عریانی ۔ اگر اس دور کی اور غزلیں سامنے ہوتیں تو فضلی صاحب کے اس اعتراف کی صداقت کا اندازہ ہوسکتا۔ تیسرے شعر میں انھوں نے ایک غیر مشروط یعنی زمانے سے آزاد ہو کر ایک فیصلہ صادر فرمایا ہے :۔ غزل کہنا نہیں آسان فضلی

اگر اس فیصلہ کو ان کے ایک سابقہ بیان کے ساتھ رکھا جائے :۔

جانِ فضلی کی غزل ہے اور وہ خود جانِ غزل تو قاری کا ذہن ایک عجیب انتشار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور وہ اس تذبذب میں پڑ جاتا ہے کہ وہ فضلی کو کیا سمجھے "نقال جاپان" یا "جانِ غزل"؟

اسی سلسلہ میں "عرضِ حال" کے عنوان سے جو اشعار لکھے گئے ہیں وہ بھی قابلِ غور ہیں۔ ان اشعار میں انھوں نے بتایا ہے :۔

مرے اشعار میں کیا شئے چھپی ہے ۔

اور اس کی وجہ بھی بیان کی ہے

یہ مانا خودستائی اس میں ہوگی مگر میں کیا کروں لازم یہی ہے

پھر ایک دوست کی زبان سے اپنے اشعار کے حسن کی پردہ کشائی کی ہے۔ جس میں دو شعر ہمارے مفیدِ مطلب ہیں :۔

کسی کی زندگی کا شعر اک جزو مگر اسکی مجسم شاعری ہے
غضب کا اسپہ ہے ذی حِس طبیعت قیامت اس پہ پھر زندہ دلی ہے

یہ تو ہوئی فضلی صاحب کی اپنی رائے اپنے اشعار کے متعلق۔ اب آئیے ان کے اشعار کو ہم اپنی پسند پر جانچیں۔ فضلی صاحب کے نزدیک ان کی شاعری "نغمۂ زندگی" ہے اسی لیے ہمارا کام اور بھی آسان ہو جاتا ہے۔ کیونکہ زندگی کے خلفشار کو کم و بیش ہر آدمی محسوس کرتا ہے اگر شاعر دل پذیر انداز میں اس کے اظہار میں کامیاب ہو گیا تو بے شک ہم اُس کی نغمہ سرائی کے قائل ہونگے۔

مگر فضلی صاحب کے کلام میں ہیں امید۔ نشاط اور حوصلہ خال خال نظر آتا ہے۔ اسی لیے اُن کا یہ دعویٰ کہ :۔

ازل میں ملا مجھ کو جام مسرت مری شاعری ہے پیامِ مسرت

زبانی دعویٰ سے زیادہ سنگینی نہیں رکھتا۔ ان کا زیادہ تر تخاطب دل اور دلدار سے ہے۔ اور انہیں کے معاملات ان کی شاعری کا سرمایہ ہیں۔ دل سے گذر کر جب وہ اپنے ماحول پر نظر ڈالتے ہیں تو زیادہ تر وہ بیم و ہراس۔ حزن و یاس کی کیفیات میں اُلجھ جاتے ہیں۔

کوئی تو خیر ہو نہ ملے نہیں نعمت انتظار کے قابل
[illegible]

ہر سمت آفت ہر سو بلائیں کیسے بھلا ہم گھبرا نہ جائیں

اور پھر کبھی کبھی یہ "افتادگی" بھی طاری ہو جاتی ہے :۔

جو شایانِ شان ہو ترے وہ عطا کر مرا کیا۔ میں کیا جانوں کیا چاہتا ہوں

چند اور اشعار بھی قابلِ غور ہیں :۔

جو ہوں کامیابی سے ہم بے نیاز تو ممکن نہیں کامیابی نہ ہو۔
ناکامیاں ہی اصل میں ہیں کامیابیاں اک بات جاننے کی ہے یہ۔ جان جائیے
آسماں کو برا نہ لگ جائے پھول سے کہہ دو یوں ہنسا نہ کرے

ان کے علاوہ ایک غزل کی غزل اس بات کا ثبوت دیتی ہے کہ وہ زندگی کے کسی مسئلہ میں کوئی واقفیت نہیں رکھتے

کیوں گرے آسمان سے بجلی کیوں جلے آشیاں نہیں معلوم
کوئی خوشدل ہے کوئی بیدل ہے کیوں یہ رنگِ جہاں نہیں معلوم
کیا زمین و زماں نہیں واقف کیا مکین و مکاں۔ نہیں معلوم

اسی طرح وہ ہر اُس حالت کے متعلق اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے چلے گیے ہیں جو انسانی فکر کو پریشان کرتی رہتی ہے۔ ایک جگہ ہمیں یہ بھی شعر ملتا ہے :۔

میں نہیں جانتا کہ خود کیا ہوں مجھ سے کیوں پوچھئے خدا کیا ہے؟

ان ناقابلِ تردید شہادتوں کے پیشِ نظر جو اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ شاعر کو خود نہ اپنا کوئی شعور ہے اور نہ اپنے ماحول کا ــــ (اور اگر ہے تو لاعلمی کا) کوئی معقول شخص یہ ماننے پر آمادہ نہیں ہو سکتا کہ اسے اپنی "خودی" کے اظہار کی ضرورت تھی۔

ہمیں تو نغمۂ زندگی میں ایک ایسی شخصیت نظر آتی ہے جو زندگی کے بندھنوں میں الجھ کر اُنہیں توڑنے کی ہمت نہیں رکھتی بلکہ اُن سے دور رہنا ہی پسند کرتی ہے۔ عافیت طلبی اس کا مقصدِ زندگی ہے اور جو اقتدار اُسے نصیب ہے اسی کو مستحکم اور مستزاد کرنے کی امنگوں کے بجائے وہ متمنی ہے کہ :۔

عافیت: بے زری میں تو جو ملے لے لوں اس اقتدار کے بدلے

یہی وہ ذہنی کیفیت ہے جس نے اُن کی میرے خیال میں بہترین اور اس مجموعہ کی تنہا دل نواز غزل کہلائی ہے :۔

کا رہا دل ناداں پہ ہنسی آتی ہے ہائے ان حسرت و ارماں پہ ہنسی آتی ہے
دیکھی ہم نے بہت یاں کی بہاریں فضلی گل تو کیا سارے گلستاں پہ ہنسی آتی ہے

اسی لیے زندگی کا جو نغمہ فضلی صاحب نے سنایا ہے اُس میں

وہ پیغام عمل نہیں ملتا جس کی طرف انہوں نے اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:۔

زندہ ہے شاعر کے دم سے ... تخیل
اندرونی کیفیات سے طبع نقاد ... شاعری میں حالات

حسن و عشق کی ترجمانی سادہ اور دلنشیں پیرایہ میں کی گئی ہے اور اس پر اچھے یا برے کا فیصلہ ... نہیں ... کیا جا سکتا کہ اس کا تعلق انفرادی تجربات سے ہے۔ کلام میں شوخی بھی ہے اور کہیں کہیں برجستگی بھی مثلاً

شیخ صاحب بڑے عذاب میں ہیں ... کار رہا ہے ثواب کی خاطر

"لمحۂ زندگی" میں قومی نظمیں بھی ہیں۔ مگر وہ ایک موزوں طبع کے اشعار ہیں کیونکہ جیسا میں اوپر لکھ چکا ہوں "فضلی" صاحب کا تعلق دل اور اس کے معاملات سے ہے، انہیں زندگی سے کوئی لگاؤ نہیں اور ایک جگہ تو وہ خود کہتے ہیں:۔

مجھے دل کے معاملات سے کام ہے ... میری شاعری انقلابی نہیں

تعجب ہے کہ اس ... اس کے باوجود فضلی صاحب قومی نظمیں لکھنے کی طرف کیوں متوجہ ہوئے؟ بظاہر تقلید کے سوا اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی (تقلید میں) اخلاص کے بجائے ضرورت۔ عادت یا خواہش کارفرما ہوتی ہے اور ایسی کوشش کو دیکھ کر ہم:۔

چشمے سے ابل رہا ہے پانی
نہیں پڑھ سکتے۔

"آکسفورڈ" کے عنوان سے جو طویل نظم ہے وہ تسلسل بیان کے اعتبار سے کامیاب ہے اور کہیں کہیں اس میں اچھے اشعار بھی مل جاتے ہیں۔ میرے خیال میں فضلی صاحب اس قسم کی شاعری میں کامیاب رہ سکتے ہیں۔ وہ ایک اچھے "رپورٹر" ضرور ہیں مگر آرٹسٹ کی حیثیت سے اُن میں بڑی خامیاں ہیں

اس جائزہ کو ختم کرنے سے پہلے میں ایک اور حیرت کا اظہار کرنا ضروری سمجھتا ہوں فضلی صاحب نے "دیباچہ" کے ماتحت لکھا ہے

اور دیوانوں میں دیباچے ہیں ... ہم یوں ہی چھاپ دیں جدت ہوگی
مل ہی جائیگی ہمیں اے فضلی ... شعر کی اصل جو قیمت ہوگی

مگر ہمیں اس شعر کے ساتھ ہی "عذر شعر گوئی" اور "عرض حال" کے عنوانات سے خود صاحب دیوان نے وہی تمام باتیں بتادی جو "دیباچہ" میں ہوا کرتی ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر یہ "جدت" کا ادعا کیونکر صحیح ہوا ــــ ایک ادیب سے جب اس باب میں گفتگو ہوئی تو انھوں نے ازراہ تفنن کہا ــــ "کہ حقیقی جدت اُس وقت ہوتی کہ فضلی صاحب شعر کہنے کے باوجود دوسرے شاعروں کی طرح اپنا دیوان نہ چھپاتے" ــــ اس جملہ معترضہ سے مقصد یہ ہے کہ فضلی صاحب اپنے کلام کی جن صفات کے قائل ہیں وہ اصطلاح عام میں وہ مفہوم نہیں رکھتے جو اُن کے اپنے ذہن میں معین ہوتا ہے مثال میں اسی جدت کو لے لیجئے ـــــــــ ہم لوگ کسی "نئی چیز" کے متعلق اس کا استعمال کرتے ہیں اور فضلی صاحب پرانی باتوں کی تکرار پر اس لفظ کو منطبق کرنے میں بھی کوئی ہرج نہیں سمجھتے۔

ان تمام باتوں کے باوجود "لمحۂ زندگی" کا مطالعہ بیکار نہ ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے مطالعہ سے آپ کو ارتقائے ذہنی نصیب نہ ہو۔

"رخ"

REG. No 2535

JADID URDU

36, MARSDEN St. CALCUTTA

قواعد و ضوابط

۱۔ رسالہ ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوا کریگا۔ خریداروں کو چاہیئے کہ رسالہ ۱۵ تاریخ تک نہ ملنے پر دفتر سے طلب کریں۔

۲۔ اہل قلم حضرات سے درخواست ہے کہ وہ مضامین مہینے کی ۱۵ تاریخ تک اڈیٹر کے نام بھیجدیں

۳۔ مضامین صاف اور شستہ تحریر ہوں۔

۴۔ وہی مضمون پرچہ میں شائع ہوسکتا ہے جو معیار ادب و اخلاق سے گرا نہ ہو۔

۵۔ دل آزار و فرقہ وارانہ مضامین نیز سیاسی مضامین شائع کرنا پرچہ کی پالیسی کے خلاف ہے۔

۶۔ نمونہ کا پرچہ مفت نہیں بلکہ ۳/ کا ٹکٹ آنے پر بھیجا جائیگا۔

۷۔ جواب کیلئے جوابی کارڈ یا اسٹامپ کا آنا ضروری ہے۔

۸۔ خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ۔ منیجر جدید اردو نمبر ۳۶۔ مارسڈن اسٹریٹ۔ کلکتہ

۹۔ کاروباری حضرات اشتہار کیلئے منیجر سے خط و کتابت کریں

۱۰۔ سالانہ چندہ صرف دو روپیہ (عہ) غیر ممالک کیلئے دو شلنگ رنگون اور برما کے لیے تین روپے (سے)

اے جلیل منیجر جدید اردو نمبر ۳۶ مارسڈن اسٹریٹ۔ کلکتہ

اُردو

مشرقی ہند کا علمی ادبی ماہنامہ

تین آنہ فی پرچہ

دو روپے قیمت سالانہ

مدیر مسئول
پرویز شاہدی
مدیر اعزازی
ایم ظہور احسن قاضی

جدید اردو
کلکتہ

جولائی سنہ ۴۲ء

چندہ سالانہ دو روپیہ
" ششماہی ایک روپیہ چار آنہ
غیر ممالک کیلئے ۵ شلنگ

جلد ۵ | نمبر ۷

فہرست مضامین

پرنٹر پبلشر اے جلیل نے مطبع ہند پریس میں چھپوا کر ۳۶ مارسڈن اسٹریٹ سے شائع کیا

نوائے وحشت

درد کا میرے یقیں آپ کریں یا نکریں
عرض اتنی ہے کہ اِس راز کا چرچا نکریں

لاکھ غافل سہی پر ایسے بھی ہم کور نہیں
کہ چمن دیکھ کے ذکرِ چمن آرا نکریں

عقل و دانش سے تو کچھ کام نہ نکلا اپنا
کب تک آخر دلِ دیوانہ کا کہنا نکریں

وہ نگاہیں عجب انداز سے ہیں عشوہ فروش
غمِ پنہاں کو ہمارے کہیں رسوا نکریں

تیرے آشفتہ سر ایسے بھی نہیں سودائی
کہ دل و دیں کے لیئے زلف کا سودا نکریں

میں نے بیہودہ توقع کی سزا پائی ہے
کچھ خیال آپ مری حسرت دل کا نکریں

میرے ارمانوں کو کاش اتنی سمجھ ہو وحشتؔ
کہ اُن آنکھوں سے مروت کا تقاضا نکریں

رضا علی وحشتؔ

غزل

ہم اپنے داغِ دل کی روشنی سے کام لیتے ہیں
کسی شب چودھویں کا چاند جب بے نور ہوتا ہے

میں رہ کر دور بھی آٹھوں پہر ہوں ہم نفس تیرا
عدو نزدیک رہ کر دل سے کوسوں دور ہوتا ہے

نہ لینا بھول کر انفاس کا تم جائزہ اس سے
کسی کا چاہنے والا بہت مجبور ہوتا ہے

بھلا مختار ہونے کا ہو دعویٰ ایک بندے کو
وہی اپنی خوشی جو آپ کو منظور ہوتا ہے

شکستِ دل کی ساعت یاد آجاتی ہے مجھکو بھی
کبھی جب میکدے میں کوئی شیشہ چور ہوتا ہے

میں صدقے اللہ اللہ اس کی شانِ بے نیازی کے
کروروں دار پر چڑھتے ہیں اِک منصور ہوتا ہے

میں قائل اُس محبت کا کہیں سب دیکھ کر خالد
کسی کا دل کسی کے عشق میں یوں چور ہوتا ہے

محمود الرب خالدؔ (بنگلور)

نظم

مجھے وہ یاد آگئی
مجھے وہ یاد آگئی

وہ دل میں میرے آگئی۔ سکونِ جان پاگئی
خوشی سی دل پہ چھا گئی۔ کہ اس کی یاد آگئی
مجھے وہ یاد آگئی
مجھے وہ یاد آگئی

وہ ذکر دلربا ہوا۔ مرے لیئے برا ہوا
یہ کیسا تذکرہ ہوا۔ کہ زخمِ دل ہرا ہوا
پھر آج یاد آگئی
پھر آج یاد آگئی

وہ خود نہیں ہے گو عیاں۔ تجلّی دلمیں ہے نہاں
سمجھ نہ اس کو بدگماں۔ جو تیری یاد ہے یہاں
وہ یاد ہے نہ جانے بس
وہ یاد ہے نہ جانے بس

دماغ میں غرور ہے۔ وہ مست و پر سرور ہے
لبوں پہ شور صور ہے۔ سلیمؔ بے قصور ہے

"بسمارک" کی غرقابی کے دلچسپ حالات

بن جنگی جہاز "بسمارک" کی غرقابی نے بحری ماہرین پر ایک نئے
، کا دروازہ کھول دیا ہے۔ گذشتہ بیس سال کی جہاز سازی
ازمائش تھی جس میں یہ معلوم ہوگیا کہ جدید قسم کے دیو قامت جنگی جہاز
طرز کے جہازوں اور طیاروں کی جنگ کا کیا نتیجہ ہوسکتا ہے۔
ـ کی غرقابی کے بارے میں ملاحوں اور عملے کی ہمت کا بھی امتحان
ہی یہ جان پر بھی دیکھ کر کن حالات کے ماتحت عملہ اپنا استقلال
.کھ سکتا ہے۔
م ممالک یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ غرقابی سے تھوڑی
بسمارک" پر کیا حالات پیدا ہوئے۔ ذیل میں بسمارک کی غرقابی کے
ت دیے گئے ہیں وہ ہر لحاظ سے قابل اعتبار ہیں۔

بسمارک کی روانگی

۲۲۔ مئی سنہ ۱۹۴۱ء کو "بسمارک" مشہور جرمن کروزر جہاز "پرنس ایوجین"
ت میں ساحل ناروے سے روانہ ہوا تھا۔ ان دونوں کا رخ اس
سمندری علاقے کی طرف تھا جو گرین لینڈ اور آئس لینڈ کے درمیان
ہے۔

۲۴۔ مئی سنہ ۱۹۴۱ء کو برطانیہ کے پرانے جنگی جہاز ہڈ کے عرشے سے
ـ کو دیکھا گیا۔ اس عرصے میں ایک اور برطانی جنگی جہاز پرنس
یلز موقع پر پہنچ گیا۔

"بسمارک" اور "ہڈ" کی جنگ

پہلے وار ہڈ نے کیا۔ بسمارک کی تمام توپوں نے خوفناک گرج کے
ۂ اس کا جواب دیا اس کے بعد بسمارک کی توپوں کا رخ "پرنس
یلز" کی طرف ہوگیا۔ پرنس آف ویلز کو کچھ نقصان پہنچا۔ کیونکہ
. کامیابی سے متحرک جنگ نہیں لڑ سکا۔ چنانچہ اب لڑائی "ہڈ" اور
.ک میں شروع ہوئی۔
بسمارک" کی توپوں نے تیسری مرتبہ ہڈ پر گولوں کی باڑھ ماری۔
اگلے حصے سے دھوئیں کا بادل اٹھتا دیکھا گیا۔ اور جہاز کی رفتار
سست پڑگئی۔
ہڈ کے دو حصے ہو چکے تھے۔ اگلا حصہ فوراً پانی میں غرق ہوگیا

دوسرا نصف حصہ بھی چند منٹ پانی پر تیرنے کے بعد سمندر کی تہ میں چلا گیا۔

ہڈ کی غرقابی کی خبر بسمارک کے عرشے پر بجلی کی تیزی سے پھیل گئی۔ جرمن ملاح اچھل اچھل پڑتے تھے اور خوشی کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ جنگ شروع ہوتے ہی بسمارک کا بالائی حصہ خالی ہو چکا تھا۔ مگر اس حصے میں افسر اور ملاح کھچا کھچ بھرے ہوئے تھا۔ اور ہر ایک دوسرے سے بغلگیر ہو رہا تھا۔

بسمارک کے عملے نے صرف معمولی جدوجہد کے بعد برطانیہ کے ایک بڑے جنگی جہاز کو غرق کر دیا تھا۔ ہڈ کو ایک کاری ضرب لگی تھی۔ لیکن ہڈ کے عملے کو چنداں نقصان نہیں پہنچا تھا صرف چند ملاح معمولی طور پر مجروح ہوئے۔

جشن جاری رہا

اس روز اور اس کے اگلے روز بسمارک کے عرشے پر خوب جشن رہا جرمن امیر البحر لوبجن نے تمام عملے کو جمع کرکے ایک پرجوش تقریر کی۔ تقریب نہایت شان و شوکت سے منائی گئی۔ کیونکہ اس روز اتفاق سے امیر البحر لوبجن کی ۵۲ ویں سالگرہ بھی تھی۔ تقریر کے خاتمے پر تالیوں کا شور مچ گیا۔

ہٹلر کا ایک ریڈیائی پیام مبارکباد پہنچا جس میں توپ خانے کے اعلیٰ افسر شنشناڈر کو بہترین جرمن فوجی تمغہ "آئرن کراس" دینا منظور کیا گیا۔ اسی طرح دیگر عملے کو ریڈیو پر تمغے بخشے گئے۔

بسمارک کے عرشے پر فلم ساز بھی خوب سرگرم تھے۔ انھوں نے "ہڈ" اور "بسمارک" کی لڑائی کو فلم کیا تھا۔ اور اب خوشی کی تقریب کی فلم لی جا رہی تھی اس فلم کے ذریعے برلن والوں کو یہ دکھانا مقصود تھا کہ برطانیہ سے "ملکۂ بحر" کا خطاب کس طرح چھینا گیا۔

بسمارک پر تقریباً پانچ سو نوجوان جرمن بحری افسر تھے جن کو تربیت کے لیے بھیجا گیا تھا۔ ان افسروں کو اسی شاندار فتح کی توقع تھی جس کو انھوں نے ابھی ابھی دیکھا تھا۔ نوجوان آفیسرں کے دلوں پر ہٹلر کا دبدبہ اور بھی بیٹھ چکا تھا ان کے کانوں میں ہٹلر کے یہ الفاظ گونج رہے تھے۔

"آج ہم جرمنی کے حاکم ہیں کل ساری دنیا ہمارے سامنے سرنگوں ہوگی"

ان کو یقین ہوگیا تھا کہ جرمن قوم ہی بہترین قوم ہے اور یہ کہ

من قوت ناقابل مغلوب ہے۔ اور علی الخصوص بسمارک کی ضرب دنیا کا کوئی جہاز برداشت نہیں نہیں کرسکتا ہے۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ اس سے پہلے بسمارک جیسا مضبوط جنگی جہاز تعمیر نہ ہوا تھا۔ یہ یقین کرنے کے وجوہات موجود ہیں کہ معاہدہ کے مطابق جہازوں کے وزن کی جو حدبندی کی گئی تھی اس سے یہ جہاز بہت زیادہ وزنی تھا۔ ۳۵ ہزار ٹن محض ظاہر کیا جاتا تھا۔ بعض حلقوں کا خیال ہے کہ اس کا وزن پچاس ہزار ٹن تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ضرورت پڑنے پر یہ جہاز ایسی تیز رفتاری سے نقل و حرکت کرسکتا تھا جو برطانیہ یا امریکہ کے کسی جہاز کے بس ممکن نہیں۔

بہترین جہاز

بظاہر بسمارک عام جنگی جہازوں کی مانند معلوم ہوتا تھا۔ لیکن سطح آب کے نیچے اس پر پانچ فولادی چادریں چڑھی ہوئی تھیں۔ غرضیکہ جرمنوں کو یقین تھا کہ بسمارک کی غرقابی ناممکن ہے

بسمارک کے عرشے پر کچھ ایسے گھاگ آفیسر بھی تھے جو خوب سمجھتے تھے کہ بسمارک کو غرقابی کا ایسا ہی خطرہ ہوسکتا ہے جیسا کہ کسی دوسرے جہاز کو۔ مثال کے طور پر کپتان لینڈمین اسی نظریے کا حامل تھا۔ لیکن اس کا اعلیٰ افسر ایک کٹر نازی امیر البحر لوٹجن تھا۔ لوٹجن نہایت جوشیلا تھا۔ مگر ملاحوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ باطن میں اس کی کمزوری اس کی ظاہری بہادری سے کہیں زیادہ ہے۔

ملاحوں کے علاوہ بسمارک پر بہت سے دیگر کارندے بھی سوار تھے۔ مجموعی طور پر ۲۴۰۰ افراد بسمارک کے عرشے پر تھے۔ جہاز پر اس قدر آدمیوں کے لیے جگہ نہ تھی۔ لیکن جرمن ملاح یہ سب کچھ خوشی سے برداشت کررہے تھے۔ کیونکہ اس تکلیف کے عوض میں ان کا جہاز مضبوط ترین بنادیا گیا تھا۔

کدھر کو

جرمن ملاحوں میں قیاس آرائی شروع ہوئی کہ آخر بسمارک کہاں جارہا ہے۔ بعض ملاحوں کا خیال تھا کہ گنیشا اور شارن ہارسٹ کی مانند بسمارک بھی برطانوی تجارتی جہازوں کا "شکار" کرنے جارہا ہے۔ بعض ملاحوں کی رائے تھی کہ بسمارک کو جزائر ازورس پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ چند ملاحوں کا نظریہ تھا کہ وہ بحر اوقیانوس میں ... بحری بیڑے میں شامل ہونگے۔ لیکن حالات سے ان قیاسات کی تصدیق نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ ان کو اس مقصد کے لیے ضروری سامان ... دیا گیا تھا۔ آخر کار سب نے یہ تسلیم کیا کہ بد کی قسمت میں ... کے ہاتھوں غرقاب ہونا لکھا تھا۔

مصیبت کا وقت

ہمیشہ خوشی کس کو حاصل رہتی ہے، دوسرے ہی دن جرمن ملاحوں کی خوشی رنج سے بدل گئی۔ "پرنس یوجین" واپس جرمنی کی طرف چلا گیا۔ اس وقت موسم سخت خراب ہوچکا تھا۔ برف باری ہورہی تھی اور سرد ہوا کا جھکڑ چل رہا تھا۔ "بسمارک" کا اکثر عملہ ناتجربہ کار تھا انھوں نے اس سے پہلے اس قدر وسیع سمندر نہ دیکھا تھا۔ اب ان کو احساس ہوا کہ وہ وطن سے بہت فاصلے پر ہیں۔

بہت جلد جرمن حکام کو یقین ہوگیا کہ بسمارک کی تلاش کی جارہی ہے۔ ۲۶ مئی کو گرین لینڈ کے جنوبی سرے پر ایک طیارہ دیکھا گیا تھوڑی دیر بعد ایک امریکن ساخت کی ایک کٹالینا اڑان کشتی بادل کے ایک ٹکڑے سے نکل کر "بسمارک" کے اوپر منڈلانے لگی۔ "بسمارک" کی توپیں اونچی ہوگئیں اور پے در پے گولے برسنے شروع ہوگئے۔ طیارے فوراً غائب ہوگئے۔ اب جرمن ملاحوں کو یقین ہوگیا کہ ایک زبردست ہاتھ ان کے گلے کی طرف بڑھ رہا ہے۔

جرمن حکام میں نوک جھونک

بسمارک کے عرشے میں یہ افواہ بڑے زور شور سے پھیل گئی کہ امیر البحر لوٹجن اور کپتان لنڈمین میں تکرار ہوئی ہے۔ بند کمرے میں سے امیر البحر لوٹجن کو غصے میں بولتا ہوا سنا گیا۔ کپتان لنڈمین نے لوٹجن کو بتایا تھا کہ برطانوی حکام پر اب بسمارک کو غرق کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائیں گے۔ اس لیے "بسمارک" کا رخ فوراً وطن کی طرف پھیر دیا جائے۔

امیر البحر لوٹجن نے لنڈمین کی درخواست کو نامنظور کردیا، اور اعلان کیا کہ وہ "بسمارک" کو اس سے زیادہ شاندار مہمات پر لے جانا چاہتا ہے۔ اب ذرا ملاحوں کی ڈھارس بندھی، سبھوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر افق کی وسعتوں کو دیکھنا شروع کردیا۔ ان کو ہر لمحہ کمک کی امید تھی۔

طیارے آئے

اگلے طیارے نمودار ہوئے لیکن یہ جرمن کمک نہ تھی۔ برطانوی طیاروں کے جھتوں نے اپنے شکار کو تلاش کرلیا تھا۔ شہد کی مکھیوں کی مانند طیارے بسمارک پر چھاگئے۔ ایک کے بعد دوسرا طیارہ غوطہ مار کر نیچے کی طرف آتا تھا اور تارپیڈو کی ضرب مار کر صاف نکل جاتا تھا ایک تارپیڈو جہاز کے بیچوں بیچ پڑا۔ پانی کی ایک بڑی لہر بسمارک کے ستونوں سے بھی اونچی اٹھی اور یہ بڑا جہاز ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک ہلکی سی کشتی کی طرح ہچکولے کھانے لگا۔ بہت جلد ملاحوں کو معلوم ہوگیا کہ جہاز کے ایک بڑے حصے میں بڑا سا سوراخ ہوگیا ہے اور جہاز میں پانی بھرتا جارہا ہے۔

یہ معمولی نقصان تھا۔ مگر امیرالبحر لوٹجن کو گویا سانپ سونگھ گیا
اس کا تمام جوش و خروش ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ شاید اس کو ایک ریڈیائی
پیام بھی موصول ہوا تھا کہ برطانوی طاقتیں بسمارک کی راہ روکنے کی
فکر میں ہیں۔ اس پیام نے لوٹجن کو اور بھی زیادہ بدحواس کر دیا تھا
لوٹجن نے تمام ملاحوں کو طلب کیا اور ان کو بتایا کہ بسمارک کو جنگ کرنے
پر مجبور کیا جائیگا۔ اور یہ کہ اسے جرمن آبدوز جہازوں اور طیاروں کے
بہت پہنچنے کی امید ہے اگر کمک نہ بھی پہنچی تو بھی بسمارک فریق مخالف
کے دو جہازوں کو ساتھ لے کر ڈوبے گا۔ آخر میں اس نے کہا کہ ...
ملاحو! اپنے حلف پر قائم رہو۔ اپنے فیورر کے وفادار رہو

افسروں کی بوکھلاہٹ

لوٹجن کے یہ الفاظ سن کر نوجوان افسروں کے چہروں پر ہوائیاں
اڑنے لگا۔ ان کو تو یہ بتایا گیا تھا کہ بسمارک کا غرق ہونا ناممکن ہے اب
اچانک ان کو موت کا پیام سنایا جا رہا تھا۔

امیرالبحر لوٹجن کے الفاظ نے مایوسی پھیلا دی تھی اس کو دور کرنے کی
غرض سے ایک اعلان جاری کیا گیا کہ جرمن آبدوز جہازوں کا ایک جتھہ پہنچا
چاہتا ہے۔ طیارے بھی پہنچنے والے ہیں اور دو سو طیاروں کا ایک جتھہ
نزدیک پہنچ چکا ہے۔

"فضائیہ سے مقابلے میں بسمارک" ساحل فرانس پر پہنچنے کی فکر
میں تھا۔ مگر شام کے وقت برطانوی سورڈفش" طیاروں کا ایک جتھہ
نمودار ہوا اور اچانک بسمارک پر تین وار کیے۔ دو وار تو خالی گئے
مگر تیسرے تارپیڈو نے پتوار بیکار کر دیا۔ اب بسمارک چکر کھانے لگا
بسمارک پر سخت افراتفری پڑی ہوئی تھی۔ لوٹجن نے وعدہ کیا
کہ جو انجنیئر بسمارک کا چکر کھانا بند کر دے گا۔ اسے آئرن کراس کا تمغہ
دیا جائیگا۔ فوراً انجن روک دیئے گئے۔ ایک انجنیئر کو سخت کوشش
کے بعد معمولی کامیابی ہوئی مگر دوبارہ انجن چلانے پر پھر جہاز چکر کھانے
لگا۔

چیخ و پکار اور شور و شغب

اب جہاز پر سخت ہنگامہ برپا ہوا۔ ملاح بے تحاشا چیخ رہے
تھے اور گھبراہٹ میں ادھر ادھر دوڑتے پھرتے تھے۔ اسی ہنگامے میں
فیورر کا ایک پیغام موصول ہوا۔

"ہماری روح ہمارے فاتح رفیقوں کے ساتھ ہے"

انجنیئروں نے جہاز کو سیدھا چلانے کی بہت کوشش کی
مگر سب بے سود۔ جہاز ایک شرابی کے مانند لڑکھڑا رہا تھا۔ جہاز
کے چکر کھانے بند کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔

قریباً ایک بجے رات برطانوی تباہ کن جہاز اندھیرے کے
پردے کو چیر کر باہر آئے۔ برطانوی تباہ کن جہاز بسمارک کو اسی طرح
گھیرے ہوئے تھے، جیسا کہ شکاری کتے زخمی ریچھ کو گھیرتے ہیں۔ برطانوی
جہاز موقع پا کر بسمارک پر گولوں کی باڑھ بھی مارتے تھے۔ اب تک
بسمارک کے بہت سے دیگر حصوں میں بھی پانی بھر چکا تھا اور بہت
سے ملاح غرق ہو چکے تھے۔

لوٹجن چلا رہا تھا کہ ہٹلر امداد بھیجنے والا ہے۔ اس کو اب بھی
ہٹلر کی بھیجی ہوئی امداد پہنچنے کی توقع تھی۔ ملاحوں کو جوش دلانے
کے لیے اس نے چلا کر کہا: "ہم آخر دم تک جنگ کریں گے۔ جرمن بحری
بیڑے کے سپہ سالار فیورر کی عمر دراز ہو!" بسمارک پر افواہ پھیلی کہ
لنڈمین اور لوٹجن میں پھر جھگڑا ہوگیا۔

اگلی صبح کو دور افق پر برطانوی جنگی جہاز "روڈنے" اور کنگ جارج
آتے دکھائی دیئے۔ ان جہازوں نے تقریباً گیارہ میل کے فاصلے سے
بسمارک پر گولہ باری شروع کی ۱۶۔ انچ دہانے کی توپ کے گولے کا وزن
اکیس سو پاؤنڈ (تقریباً چھبیس من) ہوتا ہے۔ گولہ نصف میل فی سکنڈ
کی رفتار سے نشانے کی طرف جاتا ہے، جوں ہی ایسا ایک گولہ پڑتا
تھا۔ بسمارک دہل جاتا تھا اور ہچکولے کھانے لگتا تھا۔ تھوڑی دیر
تک بسمارک نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ایک گولہ بڑے کنٹرول
روم میں پڑا، اس نے بسمارک کی لڑنے کی قوت ختم کر دی۔ ملاح اب
بھی توپوں کی باڑھ مارتے تھے۔ لیکن نشانہ چوک جاتا تھا

اب "روڈنے" اور کنگ جارج پنجم" نامی برطانوی جنگی جہاز
بسمارک سے صرف دو میل کے فاصلے پر پہنچ چکے تھے۔ یہ دونوں جہاز
ٹھیک نشانے پر گولہ باری کر رہے تھے۔ پے در پے گولوں نے
جہاز کے تمام ستونوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اب دو دکش (چمنیاں)
آگ اگل رہی تھیں۔ ایک توپخانہ شکستہ ہو کر ایک طرف کو جا گرا۔ اس
کی توپوں کا رخ آسمان کی طرف تھا۔ اس قدر تباہی کے بعد کوئی دوسرا جہاز
سطح سمندر پر نہیں ٹھہر سکتا تھا۔

ملاحوں نے بغاوت کر دی

اب بسمارک کے عملے کی ہمت پست ہو چکی تھی جو ملاح اپنے
افسروں کا حکم ماننے سے انکار کرتا تھا۔ ان کو گولی مار دی جاتی تھی
جہاز میں پانی بھرنا شروع ہو گیا تھا۔ پیچیدہ راستوں کی بھول بھلیاں
میں اب پانی بھرتا جاتا تھا۔ بہت سے ملاح جہاز پر ہی پانی میں
ڈوب مرے

جہاز کے بالائی حصے میں سخت ہنگامہ برپا تھا۔ جہاز کے نچلے
حصے سے بھاگ بھاگ کر عملہ اوپر آ رہا تھا۔ سخت دھینگا مشتی جاری
تھی زخمی کراہ رہے تھے۔ ہر طرف لاشوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے

اب لسمارک کروٹ کے بھل جھک گیا اور آہستہ آہستہ پانی کی سطح کے نیچے جانے لگا۔ برطانوی جہاز قریباً ایک سو ملاحوں کی جان بچانے کے لیے آگے بڑھے۔ یہ ملاح سطح آب پر جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ لیکن اسی عرصے میں اطلاع ملی کہ جرمن آبدوز جہاز آ رہے ہیں۔ برطانوی جہاز اس علاقے سے روانہ ہو گئے۔ اور وہاں ایک سو ملاحوں میں سے اکثر کو ان کی قسمت پر چھوڑ گئے۔

جن چند افراد کو برطانوی جہاز بچا لائے تھے۔ ان کے ابھی تک حواس باختہ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کو ہنوز تک مصیبت کا سامنا پڑا ہے۔ ان کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے جسم میں روح نہیں ہے ان کی بدحواسی بے جا نہ تھی۔ ان کو یقین دلایا گیا تھا کہ وہ ناقابل مغلوب ہیں۔ اور اس پر ان کو پورا اعتماد تھا لیکن ان کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا پڑا کہ یہ عقیدہ سراسر غلط تھا۔

ترجمہ۔ لودمحمد خاں مغربی۔

کلام ہوش

ہم ہیں خیر سے کل خوبیاں زمانے کی ۔۔۔ بس اب کسر ہے تو صرف ان کے مسکرانے کی
جفا کا نام تو رسوا ہوا زمانے میں ۔۔۔ بلا سے مٹ گئی بنیاد آشیانے کی
بس اک اشارۂ چشم کرم مرے ساقی ۔۔۔ مجھے پیالے سے حاجت نہیں پلانے کی
ہے تیرا سوز ہی اے شمع جانِ پروانہ ۔۔۔ اُسے تو اشکوں سے کوشش نہ کر بجھانے کی
جفائے حسن سے سب لے رہے ہیں دلچسپی ۔۔۔ بدل دی میری وفا نے روش زمانے کی
ربابِ دل نے تو شکووں کا راگ چھیڑا تھا ۔۔۔ وفا کی آن نے رخصت نہ دی سنانے کی
گداز شمع نے کی ایسی ہمت افزائی ۔۔۔ مسابقت ہے پتنگوں میں جی گنوانے کی
کسی کے دل میں بھی روشن نہیں چراغ سکوں ۔۔۔ بجھا چکی ہے طبیعت ہوا زمانے کی
بڑھایا ذوقِ سجود اہلِ دہر کا میں نے ۔۔۔ جبیں پہ لیکے نشانی اُس آستانے کی

پلا رہے ہیں مسلسل وہ ہوش کو ساغر
بری نہیں یہ روش ظرف آزمانے کی

ابراہیم ہوش

بنگالی سے

باغی کا سترہواں خط

از شاعرِ انقلاب قاضی نذر الاسلام

از شیوان
وقت نصف شب

میری اچھی دیدی!

بیساکھ کی آندھیوں کی تمام تر چیرہ دستیاں حباب آسا ہوگئیں اور اس کی تیز رو سانس میری زندگی کو بہا لے گئیں۔ لیکن بارش کی رم جھم ابھی تک اسی طرح شباب پر ہے۔ آج اساڑھ کی پہلی تاریخ ہے۔ شاید میری زندگی کا یہ اساڑھ کبھی ختم نہ ہوگا۔ کبھی نہیں میری دیدی! مجھے بچاؤ بارش کے ان سنگریزوں سے!

شادی کے بعد میں نے کسی کو خط نہیں لکھا۔ آہ! میری پیاری ماں میری عزیزہ اور شوخ بھابھی غرض میری نظروں سے سب اوجھل ہوگئے۔ اپنی روح میں ایک ایسا خلا محسوس کررہی ہوں جہاں خزاں کی اداسیاں اور سناٹے سر پیٹتے ہیں، جہاں بجلی اور الجھنیں قہقہے لگاتی ہیں۔ اب میری آنکھیں کسی کو نہیں دیکھ سکینگی۔ جیسے سبھوں نے ماتم کا سیاہ نقاب اوڑھ لیا ہے اور چاروں طرف دھواں ہی دھواں نظر آرہا ہے۔ دیدی! آج مجھے احساس ہورہا ہے کہ دنیا میں تمہارے سوا میرا اور کوئی نہیں۔ صرف تم ہی آج میرے بیقرار دل کے لیے باعث سکون ہو۔ تمہاری یاد اور تمہارا پیارا تصور ہی میری آنکھوں کو راحت دیتا ہے اسی لیے میرا دل تمہیں تڑپ تڑپ کر پکار اٹھتا ہے۔ تم ہی میری سکھی ہو، میری سہیلی ہو، دوست ہو۔ دل چاہتا ہے کہ اپنے سینے کی تمام چنگاریاں تمہارے سامنے بکھیر دوں۔ آہ! سکھی، میری دیدی!!

آج اساڑھ کے سیاہ بادلوں کے ساتھ ساتھ میرا بھی دل لہرا رہا ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ مٹی کی طرح میں بے چین ہوجاؤں، اور ان کالی گھٹاؤں کی طرح لہرانا چھوڑ دوں۔ زندگی میں میں نے جتنا سرمایہ جمع کیا ہے، سینے کے اندر جتنی کہانیاں اور افسانے مدفون ہیں ان سب سے میں آج آزاد ہونا چاہتی ہوں۔ کاش میں ان لوگوں سے نجات حاصل کرسکتی۔ بتا سکتی ہو دیدی کیسے رہا پا سکتی ہوں؟

دن رات کے چوبیس گھنٹے میں میری آنکھیں برستی رہتی ہیں، جیسے برسات کے سیاہ بادلوں کو بھی شکست دیدینگی۔ ان آنکھوں میں کتنی آندھیاں ہیں، کتنے طوفان ہیں، کتنی بجلیاں کوندتی ہیں اور کتنے شعلے ناچتے ہیں آہ! یہ میرے آنسو ہیں یا برسات کی رم جھم!

شاید تم سوچ رہی ہوگی کہ میں پاگل ہوگئی ہوں، مجھے جنون ہوگیا ہے۔ کاش اگر یہ سچ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ میں تو یہی چاہتی ہوں کہ میرا احساس مردہ ہوجائے۔ میرے تخیل میں اوس پڑجائے عورت کی المناک زندگی فرض سے کبھی رہائی نہیں پا سکتی۔ شاید یہ سن کر تم ناخوش ہورہی ہوگی۔ لیکن کیا تم نے کبھی سخت مٹھیوں کے بیچوں بیچ پھولوں کی المناکیاں دیکھی ہیں؟ دیدی! مجھے تڑپ تڑپ کر مرجانا پسند ہے لیکن فرض کی ان مٹھیوں تلے سسک سسک کر دم توڑنا پسند نہیں۔ شاعر کا قول ہے کہ عورت کی زندگی محبت کے گلے میں ڈالنے کیلئے گویا پھولوں کے گچھے کو گوندھا گیا ہے لیکن مردوں کے سخت پنجوں میں عورتیں کراہتی ہیں۔ آخر ایسا کرنے کی اجازت کس نے دی ہے؟ یہ کس کا قصور ہے بتا سکتی ہو؟

دنیا میں زندہ رہنے کی خواہش دل سے یکلخت زائل ہوگئی اور اس طرح فرض کے ہاتھوں مرجانا بھی پسند نہیں۔ ایک عجیب کشمکش میں سانس لے رہی ہوں۔ دیدی اگر مرنا ہی ہے تو میں چاہتی ہوں کہ اس وقت میرے سامنے میری عزیز ترین چیز کا وجود باقی نہ رہے۔ بلکہ اتنی خواہش ہے کہ گھر کی تمام کھڑکیاں کھلی رہیں اور میں آخری بار دنیا کو دیکھ سکوں! اس دنیا کو جہاں میں نے اپنی پوری زندگی آنسوؤں کی لڑیوں میں گوندھ کر مسل ڈالا۔ میرے کچلے ہوئے دل اور مسلی ہوئی روح کو اسی دن سکون ملیگا جب ہوا کی سانسیں اکھڑ جائیں گی اور چاروں طرف ظالم انسان چیخیں مار مار کر روئینگے۔ مردوں کے آنسو ہمارے لیے باعث مسرت ہوتے ہیں دیدی!

میں بھی کیسی پگلی ہوں کہ خط کے اندر بھی دکھ اور تکلیف کی باتیں لکھ رہی ہوں اور جیسے سکھ چین کے الفاظ بھول ہی گئی دیدی! میں اپنی کتاب زندگی کا وہی صفحہ پڑھتی ہوں۔ جہاں بیقراریاں اور

المناکیاں تحریر ہیں۔ جہاں آنسوؤں کی گرم گرم دھاریں بہتی ہیں میں نے اپنی اس خزاں رسیدہ زندگی کے متعلق بہت سوچا آج بھی سوچتی ہوں مگر اس کا نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلتا۔ تم ہی بتاؤ اگر اپنے چاروں طرف مظلوم عورتوں کی سسکیاں سنوں تو ان آنکھوں میں آنسو کیسے نہ بھر آئیں۔ بولو دیدی بولو! کیا بول سکتی ہو؟

ہمارے سرتاج فرشتے ہیں، دیوتا ہیں۔ اُن کی پرستش کرنا ہم پر فرض ہے۔ لیکن ہم عورتیں گویا زمین و آسمان دونوں کے لیے وبالِ جان ہیں۔ کاش ہمارا وجود ہی نہ ہوتا۔ جانتی ہو دیدی میرے سوامی ہمیشہ افیم کے نشہ میں مست و بیخود رہتے ہیں۔ جیسے وہ فردوس کی بہاریں لوٹ رہے ہوں۔ میں بھی چاہتی ہوں کہ افیم کھا کر سدا کے لیے احساس کو زائل کر دوں —— لیکن حرص طمع اور لالچ نے میری زندگی کا گلا گھونٹ ڈالا وہ آکر کہتی ہے۔ "بدنصیب! تجھے زندہ رہنا ہوگا بھاگ جانا چاہتی ہے دکھ کی تکلیف سے۔ تیری آنکھوں کی پتلیوں میں رہ رہ کر موت رقص کیا کرے گی، قہقہے لگائیگی" یہ سن کر میں کہتی ہوں —— "ارے نادان! تو کیا میں ڈرتی ہوں۔ میری بھی خواہش ہے کہ میں زندہ رہوں۔ میں تجھے خوش آمدید کہتی ہوں۔ مجھے ازادی نہیں چاہیئے"

میرے سوامی روپ کے پجاری ہیں، حسن کو پوجتے ہیں تم سن کر خوش ہوگی کہ انھوں نے میرے ساتھ حسن کا سودا کیا ہے۔ مگر میں نہیں چاہتی کہ اُن کے خلاف کوئی قدم اٹھاؤں۔ یہ کہانی کوئی نئی نہیں ہے۔ ہندوستان کی زیادہ تر عورتوں کی زندگیاں اس کہانی کی زنجیر میں جکڑی ہوئی ہیں۔ ہماری سماج میں عورتیں شکار کی حیثیت رکھتی ہیں اور مرد اس شکار کو پھانسنے کے لیے ہوس کے دام پھیلاتے ہیں۔ کتنے اچھے شکاری ہیں یہ! صبح کی اچھوتی شعاؤں کی طرح، پھولوں کی دلآویز خوشبو کی مانند مردوں کے کانوں میں یہ آوازیں گونجتی رہتی ہیں —— "کہو دوستو! اچھے اور حسین شکار کہاں ہیں؟" اگر کہیں پتہ مل گیا تو روپ کے پجاری ہوس کی پیاس بجھانے کے لیے چاندی کے چند ٹکڑے لے کر بڑی شان کے ساتھ نکلتے ہیں ان کا یہ عمل قابل فخر ہے مگر آہ! عورتوں کے لیے لعنت اور گناہ سے زیادہ نہیں۔

میرے سوامی شکار کرتے کرتے صف اول میں جگہ حاصل کر چکے ہیں ان کی آنکھیں تجربہ کار ہوگئی ہیں اور ہاتھ پاؤں ماہر۔ جب میں ان کے قریب جاتی ہوں تاکہ اپنے روپ کے پجاری کو خوش کروں تو وہ روٹھ کر منہ پھیر لیتے ہیں۔ ان کے روٹھنے کا مطلب یہ ہے کہ میں انھیں مناؤں۔ کچھ دیر تک یہی حالت رہتی ہے

یہاں تک کہ ان کے سارے دانت باہر نکل جاتے ہیں۔ یہ سن کر تم حیرت کروگی دیدی! کہ ان کے سارے دانت سونے کے ہیں، ہاں سونے کے۔ اپنی لاج اور شرم کو چھپانے کے لیے انھوں نے سونے کے دانت لگا لیے ہیں۔ نئے دانت لگوانے کے دو مقصد تھے۔ ایک تو یہ کہ اُن کی بوڑھی آغوش کو گرم کرنے کے لیے کوئی نئی نویلی جوان لڑکی ہاتھ آجائیگی اور دوسری بات یہ کہ گوشت کھانے کو ملیں گے نہ جانے ہماری طرح کتنی جوان آرزوئیں بوڑھی آغوش کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھ رہی ہوں گی۔

میرے سوامی زمیندار ہیں۔ یہ سن کر شاید تم خوش ہوگی اور نہ جانے کتنی عورتیں خوشی کے مارے اچھل پڑیں گی۔ مگر دیدی! کاش تم میرے دل کی باتیں جان سکتیں کہ مجھے اس سے ذرا بھی خوشی نہیں۔ میری آنکھیں ہر وقت آنسوؤں سے ڈوبی رہتی ہیں اور دل غم کے بار سے جھکا رہتا ہے

میرے سوامی روزانہ مجھے جدید ترین زیوروں سے آراستہ کرتے ہیں۔ مگر آہ! انہیں کیا معلوم کہ میرا دل خوش بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ اور وہ جان بھی کیسے سکتے ہیں۔ زیور سے آراستہ دیویوں کی قیمت بڑھ سکتی ہے۔ لیکن خاک سے بنے ہوئے انسان کی قیمت میں اضافہ کیوں نہیں ہوتا ہے دیدی؟ بتا سکتی ہو۔ اُف رے بدنصیب عورت! دل کا پیالہ خالی کرکے جسم کو قیمتی زیورات سے زیب دیکر کس طرح مسکراتے ہوئے بڑھی جا رہی ہے۔ زیور نہایت خوبصورت ہے لیکن آہ! دل کی خواہش کیسے مٹ سکتی ہے۔ میں مانتی ہوں کہ زیور سے حسن کی زیبائش بڑھ جاتی ہے مگر دل کا مرجھایا ہوا کنول تو شگفتہ نہیں ہوتا۔ میرے سوامی بھی یہی کہتے ہیں دیدی!

کتنا عجیب ہے انسان کا دل۔ جو انسان، انسان کا خون چوس چوس کر اتنا موٹا ہو گیا ہے آج اسی انسان نے محض خواہش کی تشنگی بجھانے کے لیے کنگال بننا پسند کر لیا۔ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے! میرے سوامی زمیندار ہیں، میں پھر کہتی ہوں۔ زمیندار کے نام کے پیچھے ایک قسم کی خواہش ہوتی ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ راجہ اور زمیندار ان لوگوں کے لیے باعث رحمت ہیں۔ لیکن یہ راز کسی کو نہیں معلوم اور نہ معلوم کرنے کی ضرورت سمجھتے ہیں کہ ان کی عیش و عشرت میں پلی ہوئی اینٹوں کے اندر حسن کا خرید و فروخت ہوتا ہے کتنی معصوم عورتیں اپنی عصمت کی حفاظت کی خاطر ہنستے ہنستے خودکشی کرکے سدھار گئیں۔ جاتے وقت ان کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے آنسو کے کتنے گوہر آبدار قطرے گرتے رہے صرف

... لیے کہ ان دولت و حسن کے پجاری کی آغوش گرم کرنے کے لیے کوئی ...ری معصوم و مظلوم لڑکی کو زبردستی دام تزویر میں اسیر کیا جائیگا۔ جو ...ت زیور اور دولت کے علاوہ کسی دوسری چیز کی خواہشمند ہوتی ہے ...انہی سے پکار پکار کر کہہ رہی ہوں کہ اس دنیا میں وہ چیز جسے تمہارا ...ڈھونڈ رہا ہے عنقا ہے۔ سسک سسک کر مر جاؤ، خودکشی کر لو ...س لا زوال چیز کو کبھی تلاش نہ کرو۔ آج میرا احساس بار بار مجھے ...رہا ہے جب میں یہ سوچتی ہوں کہ زندگی میں جس چیز کو میں نے سب سے ...دہ حاصل کرنے کی کوشش کی، اسی کو پا نہ سکی۔ اور اب میرے سوامی ...بھی سمجھ لیا ہے کہ حقیقی محبت کی کتنی قیمت ہے۔ لیکن آہ! یہ حقیقت ...پر اس وقت ظاہر ہوئی جب زندگی کے چراغ میں تیل کا ایک قطرہ ...نہ رہا۔ اب وہ ایکبار از سر نو جوانی کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ وہ ...ہتے ہیں کہ ان کے بوڑھے لبوں میں کوئی آب حیات کا ساغر لنڈھا دے ...ہوس پرور آنکھوں نے کبھی میرے ساتھ نظریں چار نہ کیں، اور جس ...لڑکھڑاتی ہوئی زبان نے محبت کی باتیں نہ کیں آج میرے ساتھ پاگل ...را ہے گناہ کی معافی مانگ رہی ہے

حسن عورت کے لیے وبال جان ہے جس کی چبھن اور کھٹک ...م زیست بیکل کرتی ہے۔ یہ سبق میں نے اپنے سوامی سے پڑھا ہے جو ...ذ کے سمندر میں ہمیشہ تیرتا رہیگا۔ انھوں نے میرے حسن کو دولت ...ترازو میں وزن کیا تھا جس کا اعتراف وہ آج بھی کر رہے ہیں ...شیطنت پرور نگاہوں کو یہ نہیں سوجھتا کہ حسن و دولت کی مرہون ...ت نہیں۔ وہ محبت کی نرم و شیریں باتوں کی خواہشمند ہے!

آج وہ ہوس اور خواہش کو تیاگ دے کر میری آغوش میں عشرت کے مزے لوٹنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ میرے لیے باعث فخر نہیں کہ میں نے اس بوڑھے کمزور کو شکست دیدی! اگر میرے پاس حسن اور جسم کے علاوہ اور کوئی چیز ہوتی تو میں سب کچھ دیدیتی — مگر انہیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ میرے پاس کہاں ہے دیدی! راون نے رام کی سیتا کا اغوا کیا تھا، یہ کہانی تمام انسانوں کے دلوں میں نقش ہے — لیکن اس حقیقت کو دہرانے کے لیے کوئی دوسرا بالمیکی پیدا نہیں ہوا تاکہ سیتا نے رام کو کیسے ٹھکرا دیا اور کیوں قبول کیا؟ یہ عورت کے لیے باعث تذلیل نہیں تو اور کیا ہے —؟

چھوڑو ان باتوں کو۔ سنو دیدی آج کل میں غم کا زہر اور دکھ کی خوراک نگل کر خوب موٹی ہو گئی ہوں۔ میری قسمت بہت اچھی ہے کیونکہ میرے سوامی کی کوئی اولاد نہیں۔ میں انہی کی سیوا میں اپنی عزت سمجھتی ہوں۔

دیدی! نہ جانے تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اپنی خیر و عافیت سے کبھی آگاہ نہیں کرتی ہو۔ دیکھو تمہارے لیے میں کتنا بے چین رہتی ہوں مگر خیال ہوتا ہے کہ اور زیادہ خط نہ لکھ سکونگی کیونکہ دل کے اندر رہ رہ کر کوئی سوئی چبھو جاتا ہے۔ اور میں ہر وقت تڑپتی رہتی ہوں۔ تم ہی بتاؤ بھلا اس حال میں تمہیں کیسے یاد کر سکتی ہوں۔ شب و روز بس شاہی کتابوں سے دل بہلاتی ہوں اور رگاہے اخبارات میں جنگ کی خبریں بھی دیکھ لیتی ہوں: میرا دل چاہتا ہے کہ بحیرۂ عرب کی بے چین لہروں کے اس پار اپنی بیکل روح سے ہمیشہ کیلئے الگ ہو جاؤں۔ کاش!

مجھے معاف کر دو دیدی! معاف کر دو مجھے۔ اچھا الوداع ! — بدنصیب مرجانہ

ترجمہ۔ محمد یونس احمر۔ کلکتہ

افسانہ

"اے کاش! میں سونے کا بنا ہوتا"

کامل ایک ہفتہ کے بعد، سکھو کی آئی ہوئی موت واپس لوٹ گئی۔ گلٹیاں بیٹھ گئیں۔ بخار جاتا رہا۔ دوسرے ہفتہ میں کمزوری دور ہوگئی اور تیسرا ہفتہ ختم ہوتے ہوتے وہ بالکل تندرست ہوگیا۔ اُس کی زندگی کا سہارا، اب صرف خلیل تھا۔ اُس کا بھتیجا۔ مرحوم بھائی کی یادگار وہ اُسے گود میں لے کر، اپنی چھوٹی سی بستی کا جائزہ لے رہا تھا اُس کے پڑوسیوں نے بالکل سچ کہا تھا۔ اُس کے نوجوان ساتھیوں میں آدھے سے زیادہ مر چکے تھے۔ آدھے سے زیادہ بستی ویران ہو چکی تھی۔ آدھے سے زیادہ گھروں پر تالا چڑھ چکا تھا۔ طاعون کی اس بھیانک بربادی کو دیکھ کر وہ کانپ اُٹھا۔ اپنے گھر کا چہل پہل۔ بھائی اور بھابھی کی میٹھی میٹھی باتیں یاد آگئیں۔ اُس نے اپنے تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں پر قابو جاتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اُس کی آنکھیں بھیگ اٹھیں اور چہرہ تمتمانے لگا۔ اسی اثنا میں خلیل اُس کی گود میں مچلا۔ وہ اُس معصوم فرشتے کی طرف متوجہ ہوا۔ اُس کے متبسم چہرے پر یتیمی کے آثار نمایاں تھے۔ وہ ماں کی سکھ سے بھری ہوئی گود کی تلاش کر رہا تھا۔ زخم خوردہ سکھو، مزید چوٹ برداشت نہ کرسکا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

زمانے کی گردش قائم رہی۔ وقت اپنا کام کرتا رہا۔ دن بدلے۔ دنوں کے ساتھ موسم بھی بدلتے رہے۔ سکھو نے شادی کی اور یتیم سا خلیل اب اپنی چچی کی گود میں پلنے لگا۔ اسی طرح پانچ برس اور بیت گئے۔ ادھر خلیل پرائمری اسکول چھوڑ کر مڈل میں داخل ہوا اور اُدھر جنگ عظیم چھڑی۔ پرامن و پرسکون دنیا میں، پریشانی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ تہذیب و تمدن کا علمبردار یورپ، جنگ کے جہنمی شعلوں کا شکار ہونے لگا۔ جنگ کچھ اور پھیلی اور اپنے ساتھ اپنی ضرورتوں کو بھی بڑھاتی گئی۔ یہاں تک کہ ہندوستان بھی جانی اور مالی امداد دینے پر مجبور ہوگیا۔ تندرست اور ہٹے کٹے نوجوان، فوج میں بھرتی ہوکر سمندر پار جانے لگے۔ سکھو بھی فوج میں بھرتی ہوگیا۔ وہ سوچ رہا تھا "میں سرکاری کپڑا پہن کر بہت بھلا معلوم ہونگا، لوگ مجھ سے ڈرینگے میری عزت کرینگے۔ جہاں جاؤنگا۔ سیکڑوں آنکھیں ایک ساتھ میرے اوپر اٹھینگی۔ کافی تنخواہ ملیگی جس سے میری دن رات کی مصیبت دور ہو جائے گی۔ یہی نہیں مجھے ساری عمر پنشن بھی ملیگی" مگر اُس نے یہ نہ سوچا کہ اگر مرگیا تو کیا ہوگا؟ زندوں کو مرنے کے متعلق سوچنے کی فرصت ہی کیا ہے؟

سکھو کی روانگی کے وقت گاؤں والے ٹوٹ پڑے۔ سب کی آنکھیں پرنم تھیں۔ اس لیے نہیں کہ سکھو جا رہا تھا بلکہ اُن کے گاؤں سے وہ نوجوان جا رہا تھا جس کے حسن اخلاق کی بنا پر وہ اکثر کہا کرتے تھے "سکھو آدمی نہیں ہیرا ہے" وہ چلا گیا۔ اُس کے لیے فوجی زندگی عجوبہ روزگار میں سے تھی۔ ایسے ایسے ہتھیار چھونے کو ملے جن کا وہ تصور بھی نہ کرسکتا تھا۔ تین مہینے کی ٹریننگ ختم ہوئی اور اُسے سمندر پار عراق بھیج دیا گیا۔ سمندری جہاز اور سمندر کو دیکھ کر وہ انگشت بدنداں تھا۔ سمندر پار کی ہر چیز اُس کی حیرت کا باعث تھی۔ وہ ان میں بڑی دلچسپی لے رہا تھا۔ لیکن جنگ کا تصور آتے ہی وہ کانپنے لگ جاتا۔ اُس کا دھڑکتا ہوا دل اُس کی پریشانی میں اور اضافہ کردیتا۔ وہ بار بار دست بدعا ہوکر کہتا تھا "یارب! لڑائی کے میدان میں جانے کی نوبت نہ آئے۔ تنخواہیں ملتی جائیں اور اسی طرح سکھ اور چین سے دن کٹتے جائیں" بارے اُس کی دعا مقبول ہوگئی۔ وہ ابھی عراق ہی میں تھا کہ خبر آئی "جرمنی نے ہتھیار ڈال دیے" وہ خوشی سے ناچ اٹھا۔ گھر چھوڑنے کے بعد، یہ پہلا موقعہ تھا جب اسے وطن کی یاد میں کچھ سکون ملا۔ ورنہ اس سے پہلے وطن بیوی اور خلیل کی یاد آتے ہی وہ گھبرا اٹھتا تھا۔ رات کی تنہائی میں اکثر اُس کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں۔ لیکن آج وہ خوش تھا، اس کی رگیں فرط مسرت سے کانپ رہی تھیں۔ اس لیے کہ اب وہ وطن جانے والا تھا۔ اس بات کا اسے یقین تھا۔ کامل یقین۔

وہ بخیریت وطن واپس لوٹ آیا۔ اُس کے خاکی کپڑے اور بھاری سیاہ بوٹ میں ایک عجیب شان پوشیدہ تھی۔ لیکن یہ چیزیں اُس سے اُسی روز واپس لے لی گئیں جب وہ بمبئی سے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ پھر بھی فوجی ملازمت نے سکھو میں نمایاں تبدیلی پیدا کردی تھی۔ اب وہ پہلے کی طرح، نرم مزاج، نرم دل نہ تھا۔ اُس کی ہر بات میں سختی پیدا ہو چکی تھی۔ اُس نے اپنے پڑوسیوں اور بھائی بندوں سے ملنا جلنا کم کردیا۔ فوجی زندگی نے اُسے اکھڑ بنا دیا تھا۔ یہ اکھڑپن تمکنت سے بدلی اور تمکنت دھیرے دھیرے غرور سے بدل گئی۔ اب سکھو اپنے تئیں گاؤں بھر میں سب سے بڑا اور باعزت سمجھنے لگا۔ اُسے گندے اور میلے کپڑے والوں سے نفرت ہوگئی۔

کچھ دنوں کے بعد، برطانوی سرکار کی طرف سے اُن ہندوستانیوں کو ملازمتیں دی جانے لگیں جو جنگ سے واپس آکر ہندوستان میں بیکار بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن میں سکھو بھی تھا۔ وہ ریلوے پولس میں بھرتی ہوگیا اور بیس روپئے ماہوار تنخواہ ملنے لگی۔ اب سکھو کے دن پہلے کی بہ نسبت اور زیادہ سکھ چین سے کٹنے لگے۔ کھدر، موٹا، اور بھدا معلوم ہونے لگا سر کو تیل اور کنگھی کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ پیر میں جو بیس گانٹھے، جوتہ نظر آنے لگا۔ سکھو کا غرور کچھ اور بڑھا۔ بڑھتا ہی چلا گیا۔ کیوں نہ ہو دولت کی برکتیں جو ساتھ تھیں۔

خلیل مڈل پاس کرکے بیٹھا ہوا تھا۔ ایک دوست نے سکھو کو رائے دی "خلیل کو انگریزی پڑھاؤ اُسے فوراً نوکری مل جائے گی ایک زمانہ وہ تھا جب تم نے سرکار کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھی تھی سرکار تمہارا ضرور خیال کرے گی" بات معقول تھی۔ سکھو کے دل میں اتر گئی۔ خلیل نے، جان توڑ محنت کرکے، دو سال کے اندر، انگریزی بولنا اور لکھنا سیکھ لیا، سکھو اُسے لیے دیئے اپنے بڑے صاحب کے پاس پہنچا۔ صاحب نے خلیل سے دو تین سوالات کیے اور اس کی علمی لیاقت سے مطمئن ہوکر ایک مہینہ کے اندر ہی اندر، اُسے چالیس روپئے ماہوار کی جگہ دیدی۔

خلیل کے نوکر ہونے کی دیر تھی کہ سکھو کے گھر میں سونا برسنے لگا۔ تنخواہ سے زیادہ رشوت کی رقم گھر میں آنے لگی۔ خلیل مہذب تھا۔ تعلیمیافتہ تھا۔ اُس کی عقل، اَن پڑھ لوگوں سے، کہیں بہتر اور بلند تھی۔ وہ لوٹ رہا تھا۔ ایک طرف کمپنی کو اور دوسری طرف اپنے غریب بھائیوں کو اپنے علم کے ذریعہ۔ اپنی مہذب عقل کے ذریعہ اب سکھو اور خلیل کا نصب العین صرف دولت کمانا تھا۔ سوتے، جاگتے چلتے پھرتے ہر وقت اُن کے سامنے ایک ہی چیز رہتی تھی۔ دولت صرف دولت۔ دولت کے اِس نشہ نے، اُنہیں درجہ انسانیت سے گرا کر وہاں پہنچا دیا جہاں انسان اور حیوان میں کوئی تمیز باقی نہیں رہتی۔ سکھو اپنے دکھ سکھ کے ساتھی، پڑوسیوں کو بھلا بیٹھا اپنے بچپن کے دوستوں سے متنفر ہوگیا۔ یہاں تک کہ اُسے اپنے اُس نام سے بھی نفرت ہوگئی۔ جو اُس کے تکلف دہ ماضی کی یادگار تھا۔ اب وہ سکھو نہیں سخاوت تھا رشوت لینے میں خلیل اپنے چچا سے دو قدم آگے تھا۔ وہ اپنی مٹھی گرم کرتے وقت، محبت و اخلاق، انسانیت و شرافت، غرضکہ اس قسم کی ہر چیز کو پس پشت ڈال دیتا تھا۔ آخر مہذب جو ٹھیرا۔

دولت کی فراوانی نے، سکھو کے لیے نئے نئے مشاغل پیدا کردیئے۔ سب سے پہلے اس نے اپنا مکان بنوایا۔ اس کے مہذب و متمدن بھتیجے نے، میز، کرسی، اور دیگر جدید آرائشی سامانوں کے ذریعہ اسکی خوبصورتی بڑھائی۔ لیکن ازاں ان دونوں نے اِس نئے خوبصورت مکان کو دیکھا اور مسکرا کر رہ گئے۔ یہ مکان نہیں تھا، اُن کی عزت و شرافت کی بنیاد پڑی تھی۔ شاید مستقل اور غیر متزلزل بنیاد جس نے سکھو کی زندگی کو قدرے پر اُمن و پرسکون بنا دیا۔ اِسی سکون کے عالم میں، وہ ایک روز بیٹھا بیٹھا اپنی گذشتہ اور موجودہ زندگی کی درمیانی کڑیوں پر غور کر رہا تھا۔ ہولناک ماضی اور رنگین حال کے درمیان، صرف ایک ہی چیز نمایاں دکھائی دی :- دولت — موٹے اور وزنی کپڑوں کی جگہ باریک ریشم، دال بھات کی جگہ مرغن غذائیں، جھونپڑی جگہ عالیشان محل۔ اتنا بڑا تغیر کس نے پیدا کیا؟ اُس کا ذہن بول اٹھا "دولت نے" اس کی نام نہاد عزت و شرافت کا باعث کون ہوئی؟ دولت،

وہ سوچنے لگا "لوگ میری نہیں میری دولت کی عزت کرتے ہیں۔ اگر وقت کے بھیانک چکر نے مجھ سے میری دولت چھین لی تو؟ اے کاش! میں سونے کا بنا ہوتا۔ پھر تو میری عزت و شہرت کو کوئی بٹہ نہ لگتا" اُس نے دیکھا سیکڑوں گردنیں اُس کے سامنے جھک رہی ہیں۔ لاتعداد پیشانیاں اس کی چوکھٹ پر رگڑی جا رہی ہیں۔ وہ بڑبڑانے لگا "تو کیا میں سونے کا نہیں بن سکتا۔ ضرور بن سکتا ہوں" اتنا سوچنے کے بعد، سکھو تصور کی دنیا میں جا پہنچا۔ اس کے سامنے چند گندے اور میلے انسانوں کی ایک قطار کھڑی تھی۔ یہ کمزور و ناتواں انسان سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ ان کی دھنسی ہوئی گرد آنکھیں، بار بار دہشت سے بند ہو جاتی تھیں۔ ان کے ایک جانب سکھو تھا اور دوسری طرف خلیل۔ وہ باری باری ایک ایک آدمی کی تلاشی لے رہے تھے۔ دھیلا۔ پیسہ۔ آنہ دو آنہ، اُن کے پاس جو کچھ تھا بڑی بے دردی سے چھین لیتے تھے۔ اُن کے پاس ہی قانون انسانیت کی موت پر ہنس رہا تھا — امارت، غربت کو پیس کر مسکرا رہی تھی — اور وہ دونوں اپنی فتح و کامرانی پر خوش تھے

ان دونوں میں ایک گاؤں کا سب سے بڑا امیر تھا اور دوسرا اسی گاؤں کا سب سے بڑا مہذب اور تعلیمیافتہ — یہی تھے وہ انسان جو دن کے اُجالے میں، سفید کپڑوں میں لپیٹ کر، اپنی عزت و شرافت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں اور رات کو —؟ رات کو یہ اپنے اصلی روپ میں آجاتے ہیں۔ ان کی خونبار آنکھیں اپنا شکار تلاش کرنے لگ جاتی ہیں یہ انسانی بھیڑیئے اپنے تیز دانتوں اور لمبے ناخنوں سے، غریب و نادار انسانوں کا جسم اِس بری طرح چیر پھاڑ کر رکھ دیتے ہیں کہ شاید بھیڑیا بھی ویسا نہیں کرسکتا۔

لیکن کیا دنیا کی بدلتی ہوئی حالت اِن کا ساتھ دے گی؟ کیا یہ یونہی

ڈاکہ

پیاری نے صبح ہوتے ہی اپنا جھاڑو اور ٹوکری سنبھال اور اپنے فرائض سرانجام دینے کے لیے روانہ ہو پڑی۔ گو اِس کے والدین نے تہذیب کے ٹھیکہ داروں کی نظر میں ایک نہایت حقیر پیشہ اختیار کر رکھا تھا۔ لیکن اِس حسینہ نے جو کمسنی کی منزلوں کو طے کرتی ہوئی شباب کے بلند ترین مقام پر پہنچ چکی تھی کبھی اِس کی پرواہ نہ کی تھی اور نہ ہی کسی پہلو سے اپنے پیشہ کو حقیر تصور کرتی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور اس پر تمام انسان مختلف ایکٹروں کی حیثیت سے اپنا اپنا پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ پیدا کرنے والے کے نکتہ نظر سے تمام انسان یکساں ہیں اور نیچ اونچ کا انحصار محض ذات پات پہ نہیں بلکہ اعمال و اخلاق پر ہے۔ ایک نیک معاش انسان تہذیب کے دائرے کے اندر خواہ کسی قسم کا پیشہ بھی اختیار کیے ہوتے ہو شریف اور باعزت کہلانے کا حق رکھتا ہے۔ برعکس اس کے ایک پٹھان، مغل، برہمن یا کسی اور اونچے خاندان کا لڑکا جس کے اعمال قابل نفرت ہیں۔ جو تہذیب کے اصلی معنوں کو نہیں سمجھتا۔ جو انسانیت کے معیار سے گر چکا ہے۔ دنیا کی کسی ذی ہوش سوسائٹی میں شریف کہلانے کا مستحق نہیں۔

پیاری انہی خیالات کے زیر اثر چلتے چلتے ایک دروازے کے سامنے رُک گئی اور دروازے پر دستک دیتی ہوئی بولی "بائی جی دروازہ کھولو"

یہ نرمل بابو کا مکان تھا۔ جو کہ لوکل عدالت کے ایک سربرآوردہ وکیل تھے۔ آج اتوار کا دن تھا اپنے کمرے میں بیٹھے حسینان پیرس کی تصویروں کا البم ملاحظہ فرما رہے تھے۔ نوکر کسی کام کے لیے بازار گیا ہوا تھا۔ اور اہل و عیال کو یہ علاقہ (Non family area) یا حکومت بنگال کے مترجم کے الفاظ کے مطابق "غیر خاندانی" قرار پانے کی وجہ سے اگلی شام کو سسرال روانہ کر چکے تھے۔ آواز سنکر اٹھے اور دروازہ کھولتے ہی بولے: "آہو! پیاری تم ہو آؤ"

پیاری اندر داخل ہوئی۔ بابو جی حویلی کا دروازہ بند کرکے پھر اپنے کمرے میں کرسی پر دراز ہو گیے۔ اور دوبارہ تصویروں کے البم کی ورق گردانی شروع کر دی۔ اُدھر پیاری نے اپنا کام شروع کر دیا وہ پاخانہ وغیرہ کی صفائی سے فراغت پاکر صحن بدرو صاف کرنے میں مصروف تھی۔ کہ نرمل بابو بولے:

"پیاری! کل دن بھر تمہاری بائی جی کی تیاری کی الجھن میں رہے میرا کمرہ صاف کرنے کی کسی کو نہ سوجھی۔ ہر ایک چیز گرد آلود ہو رہی ہے تم جانتی ہو کہ میں تمہاری بائی کی طرح چھوت چھات کا حامی تو ہوں ہی نہیں۔ میرے نزدیک سب انسان ایک ہی جیسے ہیں۔ اسلیے اگر تم برا نہ مانو تو کمرے کے اندر پڑے ہوئے کاغذ کے چند ٹکروں کو اُٹھا لو اور جھاڑن لے کر ذرا کمرے کے اندر کی اشیا پر سے گرد جھاڑ دو"

پیاری بابو جی کا اس قدر بلند نظریہ دیکھ کر جو کہ اس کے اپنے خیالات کا ترجمان تھا بہت خوش ہوئی۔ اور دل ہی دل میں کہنے لگی "بابو جی کتنے اچھے آدمی ہیں۔ جو تمام امیر و غریب انسانوں کو یکساں سمجھتے ہیں۔ چھوت چھات کی بری رسموں سے نفرت کرتے ہیں" وہ انہی خیالات کے ماتحت کمرے کے سامان کو صاف کر رہی تھی۔ اور بابو جی جن کے خیالات حسینان پیرس کی نیم عریاں تصویریں دیکھ کر پہلے ہی سے منتشر تھے اپنے جذبات پر قابو نہ پاتے ہوئے کرسی پر سے اُٹھے اور کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے پیاری کو کواڑوں کے اندر والی تہوں کو صاف کرنے کا اشارہ کیا۔ پیاری نے جونہی دروازے کا رخ کیا بابو جی نے دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر اُسے دینا چاہا۔ پیاری نے نوٹ اور بابو جی کی نگاہوں کو بیک نظر دیکھا۔ انکی آنکھوں سے کمینگی اور آوارگی ٹپک رہی تھی۔ پیاری کے غصے کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اُس نے نرمل بابو کو اُن کے شریف اور ذات شریف پیشہ اور شریف صورت ہونے کی یاد دلائی اور اُن کی رذیل حرکات کی ملامت کرتے ہوئے اپنی عصمت کو کسی قیمت پر بھی بیچنے سے بھی صاف انکار کر دیا۔ لیکن بابو جی پہ پراگندہ خیالات اور نفسی خواہشات کے زیر اثر جنون کا عالم طاری تھا۔ اُنھوں نے وحشی درندے کی طرح اُس پر حملہ کر دیا اور اُس کی چیخ پکار کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اُس کی عصمت کے بے بہا موتیوں کو جو کسی کی امانت تھے لوٹ لیا۔

پیاری جو کہ چند منٹ پیشتر نو خیز کلی کی طرح تھی۔ بہت مرجھائے ہوئے پھول کی مانند گردن نیچے کیے کھڑی تھی، وہ بے بسی کی حالت میں آپ اپنی مدد نہ کر سکی۔ اور اپنے ہونیوالے شوہر راتو کی امانت کو جس کا اُسے اپنی جان سے زیادہ خیال تھا اِس طرح بے دردی سے لٹ جانے کا بہت صدمہ ہوا۔ اُس کی خودداری نے راتو کو اب منہ دکھانا گوارہ نہ کیا۔ اور وہ اِس دھوکہ باز دنیا کی موجودہ تہذیب اور اِس کے مہذب ٹھیکہ داروں پر لعنت بھیجتی ہوئی گنگا کے گھاٹ کی طرف

تاثرات

نا کتخدا کی ایک شب

شباب کی امنگیں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لیے یکساں طور پر بیخودی اور اضطراب کا پیغام لاتی ہیں، لیکن اس زمانہ میں رواسم کی زنجیریں عورتوں کے لیے ابھی اتنی ڈھیلی نہیں ہوئی ہیں جتنی کہ لڑکوں کے لیے ــــ مرد اپنے احساسات کا بڑی بے باکی سے اظہار کر سکتا ہے مگر عورت "آہ" کرنے پر بھی بدنام ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت کے باوجود عورت کا تخئیل اسی طرح آزاد ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس تخئیل کو آرٹ کا ذریعہ اظہار نصیب نہیں ہوا۔ ذیل میں اس قسم کے تخئیل کا ایک دیانت دارانہ مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ جس میں بے شرمی اور بے حیائی کی تلاش کے بجائے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ایسا تخئیل کس انقلاب کا پیش خیمہ ہے اور اس کا مقابلہ کیسے کیا جا سکتا ہے؟

میرے اللہ یہ آج کی رات مجھے کیا ہو گیا ہے۔ کیسی وحشت ہو رہی ہے۔ دل کیوں گھبرایا ہوا معلوم ہوتا ہے، آنکھوں میں خمار نہ قلب میں سکون ہے، ذہن کام نہیں کرتا، دماغ پر یاس و حرماں دھواں بنکر چھا رہا ہے۔

بھابھی صاحبہ کو بھی ضد ہے جب کہیں جائیں گی مجھے بھی ساتھ جانے پر مجبور کر دینگی، میری ایک نہ سنینگی۔ اچھا یہ بندی بھی ایسی ویسی نہیں اب جو کہیں مجھے ساتھ چلنے کو کہا تو میں ان کا بغیر لحاظ کئے بغیر صاف انکار کر دونگی

دیکھو تو اس زمانہ کے مردوئے بھی کیسے بے شرم ہیں ان سے جان بچانا ہو یا، ان کی طرف کوئی دیکھے یا نہ دیکھے، مگر یہ ہیں کہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ٹکٹکی باندھ دیتے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا آخر اس سے انکا مطلب ــــ میرے سامنے جو یہ تصویر ٹنگی ہوئی ہے کیسی اچھی تصویر ہے، نہ جانے کس مصور نے اس کو بنایا ہے کاش اس میں جان آ جاتی تو میں اس سے باتیں کرتی ــــ اچھا آج جب میں چلمن سے لگی کھڑکی سے، راستے کی طرف دیکھ رہی تھی، ایک شخص پھٹے میلے کپڑے پہنے، سر کے بال الجھے ہوئے، چہرہ گرد آلود نیچی نظر کیے۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھائے چلا جا رہا تھا، اس کی آنکھوں میں کچھ نمی بھی تھی، اور وہ اپنے دل کی گہرائی سے درد بھری، بھرائی ہوئی آواز میں یہ شعر گنگنا تا جا رہا تھا

فغاں میں، آہ میں، فریاد میں، شیون میں، نالوں میں
سناؤں درد دل طاقت اگر ہو سننے والوں میں

کیسی دکھ بھری آواز تھی، وہ کوئی بھکاری یا سائل نہیں معلوم ہوتا تھا، اگر ایسا ہوتا تو یقینی کسی کے سامنے دست سوال دراز کرتا یا کسی کے در پر کھڑا ہو کر صدا لگاتا، یقینی دکھ کا مارا، زمانے کا ستایا ہوا کوئی شریف انسان تھا ــــ مجھے تو اس کی صورت اس تصویر سے کہیں زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے، مجھے تو اس کی آواز میں درد معلوم ہوتا تھا ــــ جب وہ کہتا تھا، سناؤں درد دل طاقت اگر ہو سننے والوں میں ــــ اللہ آسان کرے بیچارے پر کون سی مصیبت آ پڑی ہے کس درد دکھ کا مارا ہوا ہے۔ میرا دل بھی اس کی طرف کھنچا جا رہا ہے کاش وہ ابھی یہاں آ جائے تو میں اس کا درد دل سنوں اسے تشفی دوں اس کے گلے میں باہیں ڈال کر اسے پیار کروں

توبہ توبہ یہ آج مجھے کیا ہو گیا ہے کیسے برے خیالات، میرے دل میں آ رہے ہیں، ابھی میرے کنوار پتے کا زمانہ ہے، کوئی سن پائے تو کیسی ناک کٹے، مجھے کیا، کوئی روئے رویا کرے، کوئی مرے مرا کرے غیر مرد سے مجھے مطلب ہی کیا، یہ سب تو زمانہ کے مطلبی بے مروت مشہور ہیں۔ ہوگا کوئی سڑی دیوانہ زمانے کا ٹھکرایا ہوا ــــ لیکن نہیں ہرگز نہیں وہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ اس کا دل پاک ہے دنیا کے مکر و فریب سے، اس کے دل میں درد ہے، محبت ہے، طلب ہے، چاہت ہے اگر وہ آ جائے تو ضرور میرے دل کو سکون اور قلب میں ٹھنڈک ہو وہ تو نہ جانیں کہاں آہستہ آہستہ چلا گیا، وہ تو اپنی تصویر میرے دل میں چھوڑ گیا، وہ اس وقت کہاں ملے گا، میں اسے ڈھونڈنے کد ہر جاؤں اور جا بھی نہیں سکتی۔ سماج اور سوسائٹی کی فولادی زنجیر میں جکڑی ہوئی ہوں، اس کو توڑنا میرے بس کی بات نہیں ہے ــــ اف آج کیسی الجھن اور پریشانی ہے۔ دل پریشان معلوم ہو رہا ہے۔ خیالات کے طوفان ہیں کہ امڈے چلے آ رہے ہیں ــــ ذرا گھڑی تو دیکھوں کیا وقت ہوا ہے رات بھیگ گئی، ادئی میرے اللہ ۲ بج گئے کیا ساری رات ایسے ہی الجھن اور پریشانی میں کٹے گی۔ اماں نے تو آج صبح سویرے اٹھنے کی سخت تاکید کر دی ہے۔ کیا کروں۔ برا ہو جوانی کا اس سے تو کہیں بہتر تھا لڑکپن۔ رات آرام سے بسر کرتی تھی، دن لاپرواہی سے کھیل کود میں گذر جاتی تھی، جوانی کیا آئی وبال جان، آئی۔ دن تو خیر سے پڑھنے

کلینے تین، گھر کے کام دھندے میں گذر جاتی ہے، رات کیا آتی ہے قیامت سے زیادہ سخت۔ کاٹے نہیں کٹتی۔ سچ ہے جوانی تنہائی کیلئے نہیں ہے، مصیبت ہے اس کے لیے جو تنہا ہے، مسرت ہے اس کے لیے جس کا کوئی ہمدم، مونس، دمساز اور ساتھی ہے —— بغل کے کمرہ میں بھائی صاحب کتنی سکھ و آرام کی نیند سوئی ہوئی ہونگی، وہ ہونگی اور بڑے بھائی . . . . ان دونوں کی زندگی مسرت اور آرام سے کٹتی ہے —— ایک مجھ جلی کو دیکھو، تنہا میں ہوں اور اتنا بڑا پلنگ اس پر نرم نرم گدا، لیکن کسی کروٹ چین نہیں، ہر طرف بدن میں کانٹوں جیسا چبھتا ہے۔ اتنا اچھا سجا ہوا کمرہ اُس پر ہر طرف اداسی سی چھائی ہوئی ہے اور عجب بھیانک سا معلوم ہوتا ہے

برا ہو ہمارے رواج کا، جس نے مردوں کو ہر طرح کی آزادی دے رکھی ہے، لیکن عورتوں کے ساتھ بندش اور پابندی ہے مجال کیا کہ ہم لوگ ذرا لب بھی ہلا سکیں کسی کے سامنے اپنے دل کی حالت بھی کہہ سکیں۔ مجھ جلی کی عمر اس وقت کیا ہوگی، اب اٹھارہواں سال ختم ہونے کو ہے۔ لیکن کسی کو میری فکر بھی ہے، کسی کے کانوں جوں بھی رینگتی ہے لیکن یہاں تو ہمارے سینے پر لدے چلتے ہیں۔ ابا رہتے تو کچھ نہ کچھ میری فکر ضرور کرتے، مگر خدا کو منظور نہ تھا، وہ تو میرے بچپن ہی میں اس دنیا سے سدھارے دعا کرتی ہوں کہ خدا انہیں مغفرت کرے ہمیشہ ان پر رحمت کی بارش ہو۔ اب بھیا ہیں، انہیں اپنے ہی دھندے سے کب فرصت جو ادھر توجہ کریں وہ تو بس صرف کھانے کپڑے سے آسودہ کر دیتے ہیں، بس اسی کو غنیمت جانئے۔ اماں بیچاری پردے کی بیٹھنے والی اس پر شکی مزاج اور بڑی ناک والی، اب بات بنے تو کس طرح بیسیوں جگہ سے پیام آئے، لیکن انھوں نے صرف اپنی عقل لڑا لڑا کر کسی کو ایک نہ ایک نقص نکال کر ٹال دیا —— اب میرے دل کی مراد پوری ہوتی مشکل نظر آتی ہے اس لیے کہ اماں کی خواہش میں سمجھ گئی۔ ان کی خواہش بس اسی قدر ہے کہ کوئی خوب امیر کبیر روپے والا دولتمند ملے تو وہ مجھے بیاہ دیں، چاہے وہ مجھ سے محبت کرے یا نہ کرے، وہ مجھے چاہے یا نہ چاہے —— لو یہ اذان کی آواز کان میں آرہی ہے، اب کیا خاک سوؤنگی اب تو مجھے وضو بنا کر نماز ادا کرنا ہے۔ اس کے بعد تلاوت قرآن پاک

عبدالجلیل

مزاحیہ

غزل

بھیڑ ارمانوں کا مجمع حسرتوں کا دل میں ہے
عشق کا سارا ذخیرہ بس اسی فائل میں ہے

ان سے ملنے کی تمنا نامراد اس دل میں ہے
یعنی معمولی سی مشکل بھی مہا مشکل میں ہے

دست وحشت سے ہے عریانی کا شکوہ قیس کیوں
جب لنگوٹی بھر کا کپڑا پردۂ محمل میں ہے

اک اشارے میں بنا دیتا ہے مرگی کا مریض
یہ ادا اللہ رکھے بس میرے قاتل میں ہے

میں بتاؤں ان کے خال رخ کا اک انطارج ہے
کوئی کیا جانے کہ دھبا کیوں مہ کامل میں ہے

جھانک کر کنج لحد میں طعن سے بولا وہ شوخ
بھاگ کر زندان ہستی سے چھپا اس بل میں ہے

کھل چکا کس مادی نظروں سے یہ راز نہاں
پردہ جلوہ ہے کہ جلوہ پردۂ حائل میں ہے

مجھسے تجھ کو مانگتا ہے وہ جہاں کو چھوڑ کر
اللہ اللہ کتنی وسعت دامن سائل میں ہے

انگلیوں کو دیکھتے رہتے ہیں اس مطلب سے وہ
ناخنوں پر یاں لکھا ہے جو تمہارے دل میں ہے

ورنہ ٹکرائے نہ پروانے مجاب شمع سے
کوئی تو حاصل یقینی سعی لاحاصل میں ہے

ہر خطا پر بے خطا سمجھا کرو خود کو ثش
درحقیقت جب خطا انساں کے آب و گل میں ہے

ثش

دارجلنگ

دارجلنگ جو حکومت بنگالہ کا موسم گرما کا دارالخلافہ ہے۔ نیپال بھوٹان اور سکم کی خود مختار پہاڑی ریاستوں کو اپنے دامن عاطفت میں گھیرے ہوئے اپنے دلفریب قدرتی مناظر اور گوناگوں دلچسپیوں کے ساتھ دنیا کے تمام سیاحوں محاسن فطرت کے دلدادوں اور شاعرانہ تخیل کے لیے تازہ بہ تازہ نو بہ نو مواد تلاش کرنے والوں کو دعوت نظارہ دے رہا ہے۔

وجہ تسمیہ

لفظ "دارجلنگ" (Darjeeling) دراصل دو الفاظ "ڈرجے" (Dorje) اور "لنگ" (Ling) کے مرکب کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ شہر دارجلنگ کے صدر میں آبزرویٹری ہل (Observatory Hill) نامی ایک اونچا ٹیلا ہے جس کی چوٹی پر بدھ مذہب کی ایک مقدس عبادت گاہ (Monastery) تھی جس کا نام "ڈرجے" تھا اور لنگ کے معنی ہیں "مقام"۔ اس عبادت گاہ کی نسبت سے اس علاقہ کا نام "ڈرجے لنگ" (Dorje-Ling) یعنی "ڈرجے کا مقام" ہوا اور اگرچہ انیسویں صدی کے اوائل میں گورکھوں نے دارجلنگ پر حملہ کرنے کے دوران میں اس عبادت گاہ کو تباہ و برباد کر ڈالا مگر اس علاقہ کا یہ نام جو بعد میں "ڈرجے لنگ" سے دارجلنگ ہو گیا اور اب تک قائم ہے۔

ریلوے لائن

کلکتہ کے سیالدہ اسٹیشن سے دو ٹرینیں یعنی دارجلنگ میل (Darjeeling Mail) اور نارتھ بنگال ایکسپریس (North Bengal Express) سلی گوری (Silliguri) اسٹیشن کو جاتی ہیں۔ اس اسٹیشن سے ایک چھوٹی لائن "دارجلنگ ہمالین ریلوے" (Darjeeling Himalaya Railway) جو ۱۸۸۱ء سے جاری ہے دارجلنگ کو جاتی ہے۔ سلی گوری سے روانہ ہو کر تقریباً آٹھ میل کی مسافت طے کرنے کے بعد ٹرین پہاڑ کے اوپر چڑھنا شروع ہوتی ہے یہاں تک کہ کالی ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی جب یہ ٹرین کافی بالائی حصہ پر چڑھ چکی ہوتی ہے تو قدرت کے ہوشربا مناظر نظر کے سامنے آنے شروع ہوتے ہیں جنہیں ایک طرف بلندی سے گرتی ہوئی جاذب طبع آبشاریں اور دوسری طرف ایسی گہرائی کہ نظر کام نہ دے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ٹرین اسی طرح پہاڑوں کا چکر لگاتی ہوئی گھوم (Ghoom) اسٹیشن تک مسلسل اوپر کو چڑھتی جاتی ہے جس کے بعد نیچے کو اترتے ہوئے دارجلنگ اسٹیشن پہنچتی ہے۔ دارجلنگ کا ریلوے اسٹیشن جو گھوم اسٹیشن کے بعد ہی ہے اور اس ریلوے لائن کا آخری حد (Terminus) ہے۔ کلکتہ کے سیالدہ اسٹیشن سے براہ ریلوے ۳۷۹ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

سلی گوری سے شہر دارجلنگ جانے کے لیے مذکورہ بالا ریل کے علاوہ ٹیکسیوں (Taxi) جسے وہاں لائٹ کار (Light-Car) کہتے ہیں اور موٹر بسوں (Motor Bus) کا بھی بخوبی انتظام ہے جو ریلوے لائن کے متوازی چلتی ہیں۔ ان کا اسٹینڈ (Stand) ریلوے اسٹیشن سے تھوڑے فاصلہ پر شمال جانب شہر کے بازار کے قریب ہے بازار کی مشرق جانب ایک سڑک ماؤنٹ پلیزینٹ روڈ (Mount Pleasant Road) ہے اس جگہ بھی ٹیکسیوں اور بسوں کا ایک چھوٹا سا اسٹینڈ ہے۔

شہر

شہر دارجلنگ سینچل (Senchal) کے سلسلہ کوہ کی اس شاخ پر واقع ہے جو گھوم کے قریب سے شروع ہو کر مسلسل شمال کی جانب بڑھتی ہوئی کاٹا پہاڑ (Katapahar) جالا پہاڑ (Jalapahar) اور چوراستہ (Chowrasta) ہوتی ہوئی آبزرویٹری ہل کے بعد دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ایک حصہ برچ ہل (Birch Hill) پہنچ کر ختم ہوتا ہے اور دوسرا حصہ لیبانگ (Lebong) تک جاتا ہے۔

کاٹا پہاڑ ۷۸۸۶ فٹ سطح سمندر سے بلند ہے اور شہر دارجلنگ کا سب سے اونچا سرا ہے اس کے بعد یہ سلسلہ بہت تیزی کے ساتھ کم بلند ہو گیا ہے۔ چنانچہ جالا پہاڑ جو کاٹا پہاڑ کے بالکل قریب ۷۰۵۲ فٹ سطح سے بلند ہے۔ بعد ازاں یہ سلسلہ آہستہ آہستہ کم بلند ہوتا ہوا چوراستہ پہنچ کر اس کی بلندی ۷۰۰۲ فٹ رہ جاتی ہے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ نسبتاً تیزی کے ساتھ اوپر کی طرف چڑھتا ہوا آبزرویٹری ہل کی چوٹی پر سطح سمندر سے ۷۱۶۳ فٹ بلند ہو جاتا ہے مگر پھر فوراً ہی نیچے کی طرف اتر کر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ایک حصہ سیدھا تھوڑی دور جا کر برچ ہل میں ختم ہوتا ہے جس کا سب سے اونچا سرا ۶۸۷۴ فٹ سطح سمندر سے بلند ہے اور دوسرا حصہ شمال مشرق کی

طرف سے عمیق ہوتا ہوا لیبانگ تک چلا گیا ہے جو سطح سمندر سے ۵۹۷۰ فٹ بلند ہے۔ یہ گول شہر دارجلنگ کا جنوبی سرا اور لیبانگ شمالی سرا ہے۔ شہر کا رقبہ تقریباً پانچ مربع میل ہے

مندرجہ بالا سلسلۂ کوہ کا مشرقی حصہ بہت تیزی کے ساتھ عمیق ہوتا چلا گیا ہے جس کی وجہ سے اس طرف عمارتیں بہت کم ہیں اور جو کچھ عمارتیں ہیں بھی وہ زیادہ تر پہاڑی قوموں کے افراد کی ہیں جو عمیق راستوں پر اسی آسانی سے چل سکتے ہیں جیسے دوسرے لوگ مسطح سڑکوں پر۔ مگر یہ سلسلہ مغرب کی طرف بہت آہستہ آہستہ ڈھالو ان ہوتا گیا ہے جس کی وجہ سے شہر کی اکثر و بیشتر آبادی اسی حصہ پر ہے۔ اسی حصہ پر تمام سرکاری و نیم سرکاری اور پبلک (Public) عمارتیں اور شہر کا بازار اور ریلوے اسٹیشن وغیرہ واقع ہیں۔ بازار کے قریب بوٹانیکل گارڈن (Botanical garden) ہے اور اس سے کچھ فاصلے پر جنوب مغرب جانب جیل خانہ ہے۔ جیل خانہ کے قریب ہی مسلمانوں کا قبرستان ہے۔ قبرستان کے قریب بجلی (Electric) کے کارخانے ہیں۔ آبشار وکٹوریہ (Victoria Fall) جو دنیا کی مشہور آبشاروں میں سے ہے اسی حصہ میں واقع ہے۔ شہر کے دو نامی و گرامی سینیٹوریم (Sanitorium) یعنی ایڈن سینیٹوریم (Eden sanitorium) اور لیوس جوبلی سینیٹوریم (Lewis Jubilee Sanitorium) بھی اسی حصہ پر واقع ہیں۔ اول الذکر بازار کی مغرب جانب ہے اور موخر الذکر جس میں متوسط طبقہ کی رہائش کا بھی انتظام ہے۔ ریلوے اسٹیشن کی مغرب جانب ایک وسیع احاطہ کے اندر واقع ہے۔

کاٹا پہاڑ اور جالا پہاڑ اور لیبانگ میں فوج کی چھاؤنیاں ہیں، لیبانگ میں فوج کی چھاؤنی کے سامنے ہی گھوڑ دوڑ (Race) کا مشہور میدان ہے جو پہاڑ کو مسطح کر کے بنایا گیا ہے

کاٹا پہاڑ سے جالا پہاڑ ہوتے ہوئے چوراستہ تک اور آبزرویٹری ہل کے ارد گرد طبقۂ اولیٰ کے رہائشی مکانات اور اعلیٰ درجہ کے انگریزی ہوٹل واقع ہیں۔ حکام اور بڑے تاجروں کا اکثر حصہ یہیں آباد ہے۔

چوراستہ کی شمال جانب آبزرویٹری ہل کے دامن میں ایک چھوٹا سا باغیچہ بنایا گیا ہے جس کا نام سابق گورنر بنگالہ سر جان انڈرسن (Sir John Anderson) کے نام پر (Anderson Garden) رکھا گیا ہے۔

آبزرویٹری ہل کی شمال جانب گورنمنٹ ہاؤس (Government House) یعنی گورنر بنگالہ کے رہنے کا مکان ایک وسیع احاطہ کے اندر واقع ہے۔

آبزرویٹری ہل کی مغرب جانب تھوڑے ہی فاصلہ پر مشہور وکٹوریہ پارک (Victoria Park) ہے

برچ ہل کی مغرب جانب عیسائیوں کا قبرستان ہے۔ اسی قبرستان میں جنرل لائڈ (General Lloyd) مدفون ہیں جن کا ذکر آخری باب میں ہے۔

امراء کے بعض مکانات اور ہوٹلوں اور چند سرکاری و نیم سرکاری اور پبلک عمارتوں کے علاوہ جو پتھروں یا کانکریٹ (Concrete) کی بنی ہوئی ہیں۔ باقی تمام عمارتیں لکڑی کی بنی ہوئی ہیں۔ اینٹ کی بنی ہوئی چند عمارتیں تھیں جو سب کی سب سنہ ۱۹۳۴ء کے زلزلہ میں منہدم ہو گئیں۔

سینیٹوریم اور ہوٹلوں کے علاوہ دارجلنگ میں مسافرخانوں کا معقول انتظام ہے۔ ہندوؤں کے لیے متعدد دھرمسالے اور بورڈنگ ہاؤس (Boarding House) شہر کے تقریباً تمام حصوں میں ہیں۔ مسلمانوں کے لیے "انجمن اسلامیہ دارجلنگ" کا مشہور و معروف مسافر خانہ ہے جو شہر کے بازار کے بالکل قریب واقع ہے اور اپنے پورے اسلامی روایات کے ساتھ ہر آنے والے مسافر کو اپنے سایہ میں جگہ دینے کے لیے چشم براہ ہے۔ اس مسافر خانہ میں بلا اُجرت سات دن قیام کی عام اجازت ہے اور جگہ خالی رہنے کی صورت میں اس سے زیادہ دن کے لیے بھی رہ سکتے ہیں مگر سات روز سے زیادہ قیام کی صورت میں انجمن کے اخراجات کی کفالت کے لیے کچھ چندہ دینا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ مسافرخانہ سے ملحق شہر کی جامع مسجد ہے

کارٹ روڈ

یہ وہ مشہور و معروف سڑک ہے جو بڑی تدبیروں اور جانفشانیوں سے پہاڑوں کو کاٹ کر کئی سال کی محنت کے بعد سنہ ۱۸۶۹ء میں تیار ہوئی یہ سڑک سیلی گوڑی سے دارجلنگ اسٹیشن اور دارجلنگ بازار ہوتے ہوئے لیبانگ تک چلی گئی ہے۔ اس سڑک کے تیار ہونے سے قبل بھی سیلی گوڑی سے دارجلنگ اور لیبانگ جانے کا راستہ تھا جو اب بھی موجود ہے مگر وہ راستہ بہت عمیق ہے جس پر کوئی پہیوں والی گاڑی نہیں چل سکتی، اسی لیے اس نئے راستہ کا نام کارٹ روڈ (Cart Road) یعنی گاڑی چلنے کا راستہ رکھا گیا ہے۔ اس کی لمبائی سیلی گوڑی سے لیبانگ تک تقریباً ۴۹ میل اور چوڑائی اوسط ۲۵ فٹ ہے۔ دارجلنگ ہمالین ریلوے کی ٹرین

اسی سڑک پر چلتی ہے۔ سیلی گوری سے گھوم اسٹیشن تک یہ سڑک مسلسل اوپر کو چڑھتی گئی ہے اور گھوم کے بعد دارجلنگ اسٹیشن اور دارجلنگ کے بازار ہوتے ہوئے لیبانگ تک نیچے اترتی گئی ہے۔ موٹر کار ٹیکسیاں اور بسیں بھی اسی سڑک سے سیلی گوری سے شہر دارجلنگ اور شہر دارجلنگ سے لیبانگ جاتی ہیں۔ شہر دارجلنگ سے لیبانگ جانے کیلئے علیحدہ ٹیکسیاں اور بسیں ہیں۔

سواری

شہر دارجلنگ میں کارٹ روڈ کے علاوہ بعض سڑکوں پر موٹر چلنے کی اجازت ہے۔ باقی راستوں میں سوائے رکشوں (Rickshaws) اور گھوڑوں کے کسی اور سواری کی اجازت نہیں ہے۔ بائیسکل ڈولی گھوڑا گاڑی بیل گاڑی وغیرہ کا تو وہاں نام ونشان بھی نہیں ہے۔ چوراستہ کے جنوب مغربی گوشہ پر کرایہ کے گھوڑوں کا ایک اڈا ہے۔ دارجلنگ کے گھوڑے چھوٹے قد کے اور بڑے سدھے ہوئے ہوتے ہیں اس لیے جس شخص نے کبھی بھی گھوڑے کی سواری نہ کی ہو وہ بھی وہاں بہ آسانی اس کی سواری کر سکتا ہے اور اگر وہ چاہے تو ایک پہاڑی سائیس گھوڑے کے ساتھ پاپیادہ جائیگا اور وہ پاپیادہ اتنا ہی تیز جائے گا جتنا کہ سوار گھوڑے کی پیٹھ پر۔ چونکہ دارجلنگ کے راستے مسطح نہیں ہیں اس لیے وہاں رکشا چلانے کے لیے کم سے کم چار آدمی ہوتے ہیں دو آگے اور دو پیچھے۔ مال واسباب لادنے کے لیے وہاں کسی سواری کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ وہاں کے قلی جن میں زیادہ تر عورتیں ہیں۔ دو من وزن کا بوجھ بہ آسانی اٹھا سکتے ہیں۔ وہاں بوجھ سر پر نہیں اٹھایا جاتا، بلکہ پیشانی سے ایک رسی بندھی ہوتی ہے اور اس رسی کے سہارے پیٹھ پر بوجھ لادا جاتا ہے۔ وہاں ایسے بھی قد آور قلی ہیں جو بڑا اثاثہ اور دوسری وزنی چیزیں مثلاً لکڑی کا بڑا الگدار اپنی پیٹھ پر لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجاتے ہیں۔

بازار

ریلوے اسٹیشن سے شمال کی جانب تھوڑے ہی فاصلہ پر بازار ہے جہاں ضروریات زندگی کی بکثرت دکانیں ہیں مگر یہاں کی خرید وفروخت میں پہاڑوں کی بنی ہوئی چیزیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں مثلاً تلبے کے خاص قسم کے بنے ہوئے برتن۔ پہاڑی پتھروں کے بنے ہوئے زیورات۔ نیپالی چھری۔ لاسا کی ساڑیاں وغیرہ۔ کلکتہ کی طرح دارجلنگ میں بھی مارواڑیوں، پنجابیوں، کاشمیریوں اور ہندوستان کے مختلف مقامات کے باشندوں کے دوکانیں اور تجارتی منڈیاں ہیں

بازار میں ایک مسطح جگہ بنادی گئی ہے جہاں ہر سنیچر اور اتوار کے روز ہاٹ لگتی ہے جس میں دور ونزدیک کے پہاڑی علاقوں سے تازہ سبزیاں پھل اور غلہ وغیرہ آکر فروخت ہوتے ہیں۔ ان ہاٹوں میں سبزیاں اور پھل بہ نسبت کلکتہ کے بہت زیادہ سستی بکتی ہیں۔ چنانچہ لوگ بکثرت یہ چیزیں بطور تحفہ کے کلکتہ لیجاتے ہیں۔ شہر کے سبزی فروش ان ہی ہاٹوں سے سبزیاں اور پھل خرید کر دوکانوں میں رکھ لیتے ہیں۔ تاکہ ہاٹ کے دنوں کے علاوہ بھی لوگوں کو یہ چیزیں مہیا کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ دوکانوں میں یہ چیزیں اُن داموں کو نہیں ملینگی جن داموں کو ہاٹوں میں ملتی ہیں بلکہ اکثر اوقات دونوں داموں میں نمایاں فرق ہوتا ہے

چوراستہ

یہ چوراستہ ریلوے اسٹیشن سے شمال مشرق کی جانب ایک پربہار مقام ہے۔ یہ مقام شہر کا مرکز ہے۔ شہر کی بیشتر اونچی اور فیشن ایبل (fashionable) دوکانیں اس کی جنوب مغرب میں واقع ہیں۔ چوراستہ ایک کشادہ اور مسطح جگہ ہے اس کی مغرب اور مشرق جانب آرام کے لیے بنچیں (Benches) بچھی ہوئی ہیں اور شمال مشرقی گوشہ پر بارش سے بچاؤ کے لیے ایک گول سایہ دار مقام بھی بنا دیا گیا ہے۔

آبزرویٹری ہل

آبزرویٹری ہل چوراستہ کی شمال جانب ایک اونچا ٹیلا ہے۔ یہ ٹیلا دارجلنگ میں ایک نادر مقام ہے۔ اس کی چوٹی سے اردگرد کے تمام برفانی چوٹیاں صاف نظر آتی ہیں۔ اس چوٹی پر سائبان کے اندر ایک بکس رکھا ہوا ہے جس کے اندر ایک نقشہ ہے۔ اس نقشہ میں اور سائبان کی دیواروں پر اس علاقہ کے تمام اونچے اونچے پہاڑوں کی سمت اور ان کی بلندی درج ہے۔ اس جگہ ایک غار ہے جس کے اندر داخل ہونے کی کوئی ہمت نہیں کرتا۔ اس غار کے متعلق مشہور ہے کہ یہ ایک سرنگ ہے جو تبت کے پایہ تخت لاسا کو گئی ہے

مال روڈ

آبزرویٹری ہل کے دامن میں چاروں طرف پہاڑ کو نہایت خوبصورتی سے کاٹ کر ایک گول راستہ بنایا گیا ہے جس کا نام مال روڈ (Mall Road) ہے۔ یہ راستہ چوراستہ سے شروع ہوکر آبزرویٹری ہل کے دامن کے گرد ہوتا ہوا چوراستہ کو واپس آتا ہے۔ یہ راستہ تقریباً ہموار ہے اور چہل قدمی کے لیے ایک خوش منظر اور پر فضا مقام ہے۔ جا بجا بنچیں بچھی ہوئی ہیں جن میں سے اکثروں پر بارش سے بچنے کے لیے سائبان ڈال دیئے گئے ہیں

برچ ہل

شہر دارجلنگ میں اس وقت صرف برچ ہل ہی وہ مقام رہ گیا ہے جہاں جنگلوں کی قدرتی خوبصورتی کی جھلک اب تک دیکھ

باقی ہے ورنہ باقی تمام مقامات سے جنگلوں کو کاٹ کر یا تو عمارتیں اور پارک بنا دیے گئے ہیں یا چائے کی کاشت شروع کر دی گئی ہے۔

اکثر لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر چوراستہ اور مال روڈ طے کرتے ہوئے اس سڑک پر نکل آتے ہیں جو گورنمنٹ ہاؤس کی مغربی جانب واقع ہے۔ یہاں سے وہ سیدھے برچ ہل کی سیر و تفریح کے لیے نکل جاتے ہیں۔ برچ ہل جانے کے اور بھی راستے ہیں مگر مذکورۂ بالا راستہ گھوڑے کی سواری کے لیے مناسب ہے۔

برچ ہل میں سیر و تفریح کے لیے خوشنما راستے بنے ہوئے ہیں جن میں کیاریاں لگی ہوئی ہیں اور جا بجا بنچیں بچھی ہوئی ہیں۔ برچ ہل کی چوٹی پر وسط میں ایک سائبان پڑا ہوا ہے جس کے نیچے آرام کرنے کے لیے بنچیں بچھی ہوئی ہیں

سنچل لیک

سلسلۂ کوہ سنچل کا سب سے اونچا سرا سطح سمندر سے ۸۶۰۰ فٹ بلند ہے۔ ۱۸۴۳ء میں اس سرے پر فوج کی چھاؤنی قائم کی گئی تھی لیکن چونکہ اس مقام پر بارش زوروں کی رہتی ہے اور سردی بہت زیادہ ہے۔ اس لیے ۱۸۶۷ء میں چھاؤنی جالا پہاڑ پر منتقل کر دی گئی

اس جگہ پہاڑ کو کھود کر ایک بڑا حوض بنایا گیا ہے جس کا نام حوض کی وسعت کی مناسبت سے سنچل لیک (Senchal Lake) یعنی سنچل کی جھیل رکھا گیا ہے۔ یہیں سے پینے کا پانی نلوں کے ذریعہ شہر میں پہنچایا جاتا ہے

یہ حوض بہت بڑا احاطہ کے اندر واقع ہے جو چاروں طرف سے گھرا ہوا ہے تاکہ کوئی نادان حوض کے پانی کو گندہ نہ کرے اگرچہ اس احاطہ کے اندر عوام کو جانے کی عام اجازت نہیں ہے لیکن اگر کوئی ذمہ دار شخص کسی ایک فرد یا متعدد افراد کے متعلق مونسپلٹی (Municipality) کے کسی رکن سے سفارش کرے تو اس فرد یا ان افراد کو جن کے لیے سفارش کی گئی ہو اس احاطہ کے اندر جا کر پانی کو مختلف مصالحوں اور دواؤں کے ذریعہ صاف کرنے اور اسے شہر میں پہنچانے کے انتظام کا معائنہ کرنے کی اجازت بذریعہ ایک اجازت نامہ (Pass) کے مل جاتی ہے۔ واضح رہے کہ اجازت نامہ پر جس فرد یا جن افراد کے نام لکھے ہوں گے صرف انہی کو احاطہ کے اندر داخل ہونے کا حق ہوگا۔

ٹائگر ہل

سنچل کے سلسلۂ کوہ کا ایک مشہور و معروف سرا ٹائگر ہل (Tiger Hill) ہے جو ۸۵۱۵ فٹ سطح سمندر سے بلند ہے چونکہ اس کی مشرقی جانب کوئی اونچا پہاڑ نہیں ہے۔ اس لیے آفتاب طلوع ہوتے وقت اس مقام سے بہت گہرائی سے نکلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس مقام سے آفتاب کے طلوع ہونے کا نظارہ اس قدر خوشنما ہوتا ہے کہ یورپ اور امریکہ سے شائقین اس نظارہ سے لطف اندوز ہونے کے لیے آتے ہیں۔ جب آفتاب کے طلوع ہونے کا وقت آتا ہے اس وقت مشرقی جانب فضا پر پہلے تو گوناگوں رنگ چھا جاتے ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے آفتاب عالمتاب ایک عجیب شان جاذبیت کے ساتھ چکری کی طرح گھومتا ہوا رونق افروز ہو جاتا ہے۔ اس نظارہ سے لطف اٹھانے کا بہترین موسم وسط اکتوبر سے وسط نومبر تک کے وہ ایام ہیں جب مطلع بالکل صاف ہو کیونکہ وسط اکتوبر کے قبل اکثر فضا غبار آلود رہتی ہے اور وسط نومبر کے بعد اس مقام پر برف جمنی شروع ہوتی ہے۔

ٹائگر ہل جانے کے راستے اس قدر تنگ ہیں کہ سوائے گھوڑوں اور بیبی آسٹن کار (Baby Austin Car) کے کوئی دوسری سواری نہیں جا سکتی ہے۔ اگرچہ ٹائگر ہل شہر سے کافی فاصلہ پر ہے مگر اکثر لوگ پاپیادہ ہی جاتے ہیں۔ رات کے دو ڈھائی بجے روانہ ہو جانے سے آدمی بآسانی طلوع آفتاب کے کافی عرصہ قبل ٹائگر ہل پہنچ جا سکتا ہے۔

آبزرویٹری ہل کی چوٹی سے بھی آفتاب کے طلوع ہونے کا منظر بھلا معلوم ہوتا ہے

موسم

دارجلنگ میں موسموں کی تبدیلی ٹھیک ہندوستان کے اور علاقوں کی طرح ہے یعنی اپریل سے جون تک موسم گرما۔ جولائی سے وسط ستمبر تک موسم باراں۔ وسط ستمبر سے اکتوبر تک موسم خزاں۔ نومبر سے فروری تک موسم سرما اور مارچ میں موسم بہار۔

درجۂ حرارت:۔ شہر دارجلنگ کا کم سے کم درجۂ حرارت (Temperature) ۳۲ ڈگری (32°F.) اور زیادہ سے زیادہ ۷۸ ڈگری (78°F.) ہے اگرچہ عموماً درجۂ حرارت ۴۳ سے کم اور ۶۲ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اپریل سے اکتوبر تک عموماً درجۂ حرارت ۵۵ اور ۶۷ کے درمیان رہتا ہے جس کی وجہ سے یہاں ان مہینوں میں اتنی ہی سردی ہوتی ہے جتنی کلکتہ میں دسمبر اور جنوری کے مہینوں میں۔

بارش:۔ دارجلنگ میں بارش عموماً اپریل سے شروع ہوتی ہے اور ستمبر یا اکتوبر تک اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ان مہینوں میں فضا اکثر غبار آلود رہتی ہے اور ہر وقت بارش کا اندیشہ رہتا ہے اسلیے ان مہینوں میں لوگ بغیر برساتی اور چھتری کے باہر نکلنا مناسب نہیں سمجھتے ہیں۔ جولائی سے وسط ستمبر تک کا زمانہ جو اصل موسم باراں کا زمانہ

ہے بہت ہی تکلیف دہ ہے۔ اگرچہ کلکتہ کی طرح سڑکوں پر بارش کا پانی جمع تو نہیں ہوتا ہے کیونکہ وہاں پانی کے جمع ہونے کی کہیں گنجائش نہیں ہے مگر جب بارش شروع ہوتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کبھی موقوف ہی نہ ہوگی

سرما:۔ موسم سرما میں اور خاص کر دسمبر اور جنوری کے مہینوں میں یہاں کے اکثر باشندے اور دیگر علاقوں سے آئے ہوئے لوگ نیچے اتر آتے ہیں یا ایسے پہاڑی علاقوں میں چلے جاتے ہیں جو نسبتاً کم سرد ہیں۔ غربا اور وہ لوگ جو اپنے پیشوں کی وجہ سے مجبور ہیں اس موسم میں بھی یہیں رہتے ہیں۔ جس وقت دارجلنگ اتنا کثیر الآباد نہ تھا جتنا اب ہے اُس وقت دسمبر اور جنوری کے مہینوں میں یہ علاقہ برف سے ڈھکا ہوا رہتا تھا۔ کثرت آبادی کی وجہ سے اب ایسا تو نہیں ہوتا ہے مگر پھر بھی اکثر اوقات راستوں پر برف جم جاتا ہے۔

سیر و تفریح کے لیے دارجلنگ جانے کا بہترین موسم وسط ستمبر سے وسط نومبر تک کا زمانہ ہے۔

صحت

دارجلنگ ایک نہایت صحت بخش مقام ہے بشرطیکہ سردی سے حفاظت کے لیے کافی گرم کپڑے ہوں اور معدہ کی حفاظت کی جائے ٹھنڈ لگ جانے سے نمونیہ (Pneumonia) کا خدشہ اور معدہ کے بگاڑ سے پہاڑی دست (Hill Diarrhoea) کا خطرہ ہے اور یہ دونوں موذی امراض ہیں اس لیے نہایت ضروری ہے کہ جسم کے اور حصوں کے ساتھ ساتھ پیٹ کے پاس ہمیشہ گرم کپڑا ہو ورنہ معدہ میں ٹھنڈ لگ جانے سے مہلک قسم کا پہاڑی دست ہو جانا کوئی بعید امر نہیں ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ دارجلنگ میں آئے دن لوگوں کو نمونیہ اور پہاڑی دست ہوتے رہتے ہیں یہ باتیں محض احتیاط کے طور پر لکھدی گئی ہیں تاکہ ممکن خطرات سے آگاہی ہو جاوے ورنہ اگر احتیاط سے رہا جائے تو دارجلنگ صحت کے اعتبار سے نہایت مفید جگہ ہے۔ بھوک خوب لگتی ہے۔ صالح خون زیادہ سے زیادہ مقدار میں پیدا ہوتا ہے۔ وزن بڑھ جاتا ہے۔ نا موزوں فربہی کم ہو جاتی ہے۔ جسمانی طاقت ترقی کر جاتی ہے۔ بدن میں چستی آجاتی ہے اور زیادہ محنت کرنے سے بھی تکان محسوس نہیں ہوتی ہے۔ مچھر کھٹمل کوے چیل وغیرہ یہاں بالکل نہیں ہیں۔

کہر۔ دارجلنگ کی کہر بہت مفید صحت ہے جس وقت کہر ہو رہی ہو کوشش کرنی چاہئے کہ زیادہ سے زیادہ مقدار میں سانس کے ذریعہ اس کو پھیپھڑے کے اندر پہنچایا جائے۔ اس سے سینہ کو بہت بہت فائدہ ہوتا ہے۔ علاوہ بریں کہر کا یہ بھی اثر ہے کہ رنگ صاف ہو جاتا ہے اور چہرے پر سرخی دوڑ جاتی ہے

"جنت طفلاں" دارجلنگ بچوں کے لیے "جنت طفلاں" مشہور ہے۔ جو بچے کمزور ہوں، سست رہتے ہوں اور ان کی بالیدگی ٹھیک نہ ہوتی ہو وہ دارجلنگ میں کچھ روز رہکر مضبوط قد آور چنچل اور ہنسوڑ ہو جاتے ہیں اور دارجلنگ کی آب و ہوا کا اثر وہاں سے چلے آنے کے بعد بھی قائم رہتا ہے

سرکاری صوبجاتی دفاتر

حکومت بنگالہ کے دفاتر ماہ اپریل میں کلکتہ سے دارجلنگ منتقل ہوتے ہیں اور جون کے اختتام پر کلکتہ واپس آجاتے ہیں۔ پھر موسم باراں کے ختم ہو جانے کے بعد وسط ستمبر میں دارجلنگ چلے جاتے ہیں اور اوائل نومبر میں کلکتہ واپس آجاتے ہیں۔

دارجلنگ میں صوبجاتی دفاتر کی دو عمارتیں جو ایک دوسرے کے قریب چوراستہ کے مغرب جانب واقع ہیں۔ یہ عمارتیں سکریٹریٹ بلڈنگ (Secretarial Building) اور تھارن کاٹج (Thorn cottage) کے نام سے مشہور ہیں۔ تھارن کاٹج میں علاوہ دفتروں کے عیسائی اور دیگر قوموں کے رہائشی کوارٹر (Quarter) بھی ہیں۔ ہندو کلرکوں کی رہائش کے لیے دو کوارٹر ہیں جو سکریٹریٹ بلڈنگ کی مغرب جانب ایک دوسرے سے متصل میڈو بینک (Meadow Bank) اور میگڈالا کاٹج (Magdala cottage) کے نام سے مشہور ہیں۔ مسلمان کلرکوں کا کوارٹر بازار کے بالکل قریب ٹیکسیوں اور بسوں کے اسٹینڈ کے سامنے کارٹ روڈ کے کنارے واقع ہے اور یہ اولڈ کچہری بلڈنگ (Old Katchery Building) کے نام سے مشہور ہے۔ کیونکہ اس عمارت میں پہلے کچہری تھی۔ دفتریوں اور چپراسیوں کے کچھ کوارٹر سکریٹریٹ بلڈنگ سے متصل ہیں۔ کچھ تھارن کاٹج کے جنوب میں اس عمارت میں ہیں جو لیٹل تھارن کاٹج (Little Thorn cottage) کے نام سے مشہور ہے بعض میڈو بینک کی مغرب جانب واقع ہیں اور بعض بازار سے کچھ دور شمال کی جانب اُس عمارت میں ہیں جو جیمن ویلا (Jaoman Villa) کے نام سے مشہور ہے۔ گورنمنٹ ہاؤس کے افسروں کلرکوں دفتریوں اور چپراسیوں کے کوارٹر گورنمنٹ ہاؤس کی مغرب جانب کارٹ روڈ تک پھیلے ہوئے ہیں۔

تعلیم

یہ تو نہیں کہا جا سکتا ہے کہ سلطنت برطانیہ سے ملحق ہونے کے

قبل دارجلنگ میں تعلیم کا کوئی سلسلہ نہ تھا مگر اس میں شک نہیں کہ عیسائی مشنریوں (Missionaries) نے یہاں تعلیم بڑے زوروں میں پھیلائی چنانچہ ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اس وقت شہر کے گوشہ گوشہ میں میڈل (Middle) اور پرائمری (Primary) اسکول پھیلے ہوئے ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا ہے کہ اس وقت یہ پہاڑی قومیں ابتدائی تعلیم میں ہندوستان کی دوسری قوموں سے پیچھے ہیں۔ البتہ اعلیٰ تعلیم (Higher education) ابھی ان میں زیادہ نہیں پھیلی ہے مگر پھر بھی بعض حضرات نہ صرف ہندوستان کی یونیورسیٹیوں (Universities) کے بلکہ مغربی ممالک کی یونیورسیٹیوں کے سند یافتہ ہیں۔ میٹرکولیشن (Matriculation) تک کی تعلیم کے لیے دو اسکول ہیں ایک سرکاری ہائی اسکول (Government High School) اور دوسرا مہارانی گرل اسکول (Maharani Girl School) چونکہ یہاں یورپین (European) قومیں کثرت سے آباد ہوگئی ہیں اس لیے ان کی تعلیم کے لیے خاص یورپین طرز کی کئی درسگاہیں ہیں جن میں سینٹ پال اسکول (Saint Pauls school) سینٹ جازف کالج (Saint Josephs college) ڈایوسیسن گرل اسکول (Dioceson Girls school) اور لاریٹو کانونٹ (Loreto Convent) زیادہ مشہور ہیں۔ ان درسگاہوں میں داخلہ کے لیے اینگلو انڈین (Anglo Indian) کا شمار یوروپین قوم میں ہے۔ کچھ عرصہ سے اکثر یوروپین درسگاہوں میں یوروپین اور اینگلو انڈین کے علاوہ اور قوموں کو ۵ فیصدی داخلہ کا حق دیدیا گیا ہے۔ انجمن اسلامیہ دارجلنگ کے ماتحت ایک میڈل اسکول اور ایک جونیر مدرسہ (Junior Madrasah) جامع مسجد کے احاطہ کے اندر واقع ہیں۔ سینٹ پال اسکول جالا پہاڑ کے قریب ۷۴۶۷ فٹ سطح سمندر سے بلندی پر واقع ہے اور سینٹ جازف کالج ریلوے اسٹیشن سے دو میل شمال کی جانب لیبانگ جانے کے راستہ میں کارٹ روڈ کے کنارے اس مقام میں جو نارتھ پوائنٹ (North Point) کے نام سے مشہور ہے ۷۰۰۵ فٹ سطح سمندر سے بلندی پر واقع ہے۔ دارجلنگ ہائی اسکول اور مہارانی گرل اسکول ریلوے اسٹیشن کے قریب ہیں۔ ان اسکولوں کے علاوہ خاص پہاڑی زبان کی تعلیم کے لیے خود پہاڑی قوموں کے زیر سرپرستی متعدد تعلیم گاہیں ہیں۔

برفانی چوٹیاں

شہر دارجلنگ کے چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑوں کا سلسلہ ہے۔ جنوب میں سنچل کا سلسلۂ کوہ ہے جس میں سنچل لیک اور ٹائیگر ہل واقع ہیں اور باقی تین جانب ایسے اونچے اونچے پہاڑ ہیں جن میں سے اکثر ہمیشہ برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ یوں تو دارجلنگ خود خوبصورت ہے مگر ان برفانی چوٹیوں نے دارجلنگ کے حسن کو دوبالا کردیا ہے۔ ان اونچے پہاڑوں میں حسب ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں

سنگالیلا:- شہر دارجلنگ سے ۲۰ میل مغرب کی جانب سنگالیلا (Singalila) کا بلند سلسلۂ کوہ ہے جو تقریباً ۶۰ میل لانبا ہے یہ سلسلہ دارجلنگ اور سکم کے علاقوں کو نیپال سے علیٰحدہ کرتا ہے اس کا سب سے نیچا حصہ تقریباً دس ہزار فٹ اور اس کی سب سے اونچی چوٹیاں سنداکپھو (Sandakphu) ۱۱۹۲۹ فٹ اور فالوت (Phalut) ۱۱۸۱۱ فٹ سطح سمندر سے بلند ہیں۔

سنداکپھو:- سنداکپھو شہر دارجلنگ سے ۳۷ میل کے فاصلہ پر شمال مغرب کی جانب واقع ہے۔ یہ ضلع دارجلنگ کی سب سے اونچی چوٹی ہے۔ یہاں سے ماؤنٹ ایورسٹ (Mount Everest) کی چوٹی جو ۲۹۰۰۲ فٹ سطح سمندر سے بلند ہے اور دنیا کی سب سے اونچی چوٹی ہے صاف نظر آتی ہے

فالوت:- فالوت ضلع دارجلنگ کی دوسری بلند چوٹی ہے۔ یہ چوٹی شہر دارجلنگ سے شمال مغرب کی جانب ۵۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور دارجلنگ نیپال اور سکم تین علاقوں کا سرحد ہے اس چوٹی کی خصوصیت یہ ہے کہ نہ تو یہ کم بلند پہاڑوں کی مانند جنگلوں سے گھری ہوئی ہے اور نہ سر بفلک چوٹیوں کی طرح ہر زمانہ میں برف سے ڈھکی رہتی ہے۔ گورنر بنگالہ سیر و تفریح کی غرض سے وقتاً فوقتاً اس چوٹی پر تشریف لیجایا کرتے ہیں جہاں ان کے قیام کے لیے ایک چھوٹا سا خوبصورت بنگلہ بنا ہوا ہے فالوت سے کنچنجنگا (Kinchinjunga) کا سماں بہت پُربہار نظر آتا ہے

چولا:- شہر دارجلنگ کی مشرق جانب ۴۰ میل کے فاصلہ پر سنگالیلا سے زیادہ بلند چولا (Chola) کا سلسلہ ہے چولا سے مشرق بھوٹان کا علاقہ ہے جس کی سب سے اونچی چوٹیاں گپ موچی (Gipmochi) ۱۴۵۲۳ فٹ اور چوماہنگو (Chumaenago) یا ڈوپنڈیکا (Dopendika

۱۷۳۱۰ فٹ سطح سمندر سے بلند ہیں۔

کنچنجنگا:۔ کنچنجنگا کی حسین اور شہرآفاق چوٹی ۲۸۱۴۶ فٹ سطح سمندر سے بلند ہے۔ یہ چوٹی شہر دارجلنگ سے ۵۰ میل شمال کی جانب واقع ہے جس وقت بادل کھل کر مطلع صاف ہو جاتا ہے اُس وقت لوگ جوق درجوق کنچنجنگا کی خوبصورتی کا بہار دیکھنے کے لئے نکلتے ہیں۔ اس وقت اس چوٹی کا سماں قابل دید ہوتا ہے۔ کنچنجنگا کے قرب و جوار اور بھی بڑی اونچی اونچی چوٹیاں ہیں۔ مثلاً کنچنجنگا کی مغرب جانب کابرو (Kabru) کی چوٹی ۲۴۰۱۵ فٹ اور جانو (Jano) کی چوٹی ۲۵۳۰۰ فٹ سطح سمندر سے ہیں۔ مشرق میں پانڈیم (Pandim) کی چوٹی ۲۲۰۲۰ فٹ سطح سمندر سے بلند ہے۔ اس سے اور زیادہ مشرق کی طرف نارسنگھ (Narsingh) کی چوٹی ۱۸۱۴۵ فٹ سینا لچو (Sinialchu) کی چوٹی ۲۵۲۰۰ فٹ اور کینچھاؤ (Kinchinjhau) کی چوٹی ۲۲۷۰۰ فٹ سطح سمندر سے بلند ہیں۔ ان چوٹیوں کے بعد دونگکیا (Dongkya) کا سلسلہ جس کی سب سے اونچی چوٹی ۲۳۱۸۴ فٹ سطح سمندر سے بلند ہے دور تک چلا گیا ہے۔

ان برفانی چوٹیوں کا سماں اپریل اور مئی اور پھر ستمبر اور اکتوبر کے مہینوں میں ٹھیک آفتاب کے طلوع اور غروب ہونے وقت خاص طور پر خوشنما ہوتا ہے۔ اُس وقت ان چوٹیوں پر سنہرے سرخ اور زرد رنگ چھا کر ایک عجیب دلکشی پیدا کر دیتے ہیں

ضلع

ضلع دارجلنگ جس کا رقبہ ۱۱۶۴ مربع میل ہے شمال میں سیکم مغرب میں نیپال اور مشرق میں بھوٹان کی خودمختار پہاڑی ریاستوں سے متصل ہے۔ اس کے جنوب میں جلپائی گوری اور پورنیہ کے میدانی علاقے ہیں طبعی اعتبار سے یہ ضلع دو حصوں پر منقسم ہے۔ ایک پہاڑی علاقہ اور دوسرا ترائی کا علاقہ جو پہاڑی علاقہ کی جنوب جانب ہے۔ ترائی کا علاقہ اکثر و بیشتر سلی گوری کے سب ڈویژن پر مشتمل ہے جس کا سب سے نیچا حصہ سطح سمندر سے ۳۰۰ فٹ بلند ہے۔ جغرافیائی حیثیت سے ضلع دارجلنگ کا پہاڑی علاقہ تین ٹکروں میں بٹا ہوا ہے

(۱) پہاڑ کا وہ سلسلہ جو ترائی سے شروع ہو کر برچ ہل اور لیبانگ تک پھیلا ہوا ہے۔

(۲) مندرجہ بالا سلسلہ کی مغرب کے علاقے اور

(۳) کلمپانگ (Kalimpong) کا علاقہ جو مقدم الذکر سلسلہ کی مشرق جانب واقع ہے۔ ان سلسلوں کے درمیان ۴۰۰۰ سے ۶۰۰۰ فٹ تک گہری نشیب ہے جو گرم اور مضر صحت ہونے کی وجہ سے غیرآباد ہے مگر ہر سلسلہ سے دوسرے سلسلہ تک جانے کے لیے سہل راستے ہیں

شہر دارجلنگ کے علاوہ ضلع کے حسب ذیل شہر خاص طور پر قابل ذکر ہیں

کرسیانگ:۔ کرسیانگ (Kurseong) دارجلنگ ہمالین ریلوے کا مشہور جنکشن ہے۔ یہ جنکشن سلی گوری اور شہر دارجلنگ ریلوے اسٹیشنوں کے درمیان واقع ہے اور سطح سمندر سے ۴۸۶۴ فٹ بلند ہے۔ یہاں سے پورنیہ کا علاقہ صاف نظر آتا ہے۔ کرسیانگ کی شہری آبادی جنکشن سے بلندی پر ہے۔ چونکہ یہاں کا درجہ حرارت شہر دارجلنگ کے درجہ حرارت سے زیادہ ہے جس کی وجہ سے یہ مقام نسبتاً کم سرد ہے اور چونکہ سلی گوری اور شہر دارجلنگ دونوں مقامات سے ریل کا سیدھا راستہ ہے اس لیے ہندوستان کے مختلف غیر پہاڑی علاقوں کے باشندے یہاں کثرت سے آباد ہیں۔ یورپین آبادی اور بھی زیادہ بلندی پر ہے۔ ریلوے جنکشن سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر ڈاؤ ہل (Dow Hill) کی چوٹی پر سطح سمندر ۶۰۰۰ فٹ بلند دو یورپین سرکاری اسکول یعنی وکٹوریہ بوائز اسکول (Victoria Boys School) اور ڈاؤ ہل گرلز اسکول (Dow Hill Girls School) واقع ہیں جن میں شہر دارجلنگ کے اکثر یورپین اسکولوں کی طرح دیگر اقوام کو ۲۵ فیصدی کے داخلہ کا حق حاصل ہے

کلمپانگ:۔ کلمپانگ (Kalimpong) شہر دارجلنگ سے مشرق کی جانب ۲۸ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ کلمپانگ سطح سمندر سے ۳۹۳۳ فٹ بلند ہے۔ یہاں کی آب و ہوا معتدل ہے۔ اس مقام پر عیسائیوں کی بڑی زبردست مشنریاں جن کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہے کہ بہت بڑی تعداد میں یہاں کے باشندے عیسائی ہو چکے ہیں۔ یہاں کا سب سے قدیم مشن گلڈ مشن (Guild Mission) ہے جو سنہ ۱۸۸۳ء میں قائم ہوا تھا اس مشن کے ماتحت کئی درسگاہیں اور اسپتال ہیں۔ کلمپانگ کی ایک بہت مشہور درسگاہ سینٹ انڈروز کلونیل ہوم (Saint Andrews Colonial Homes) ہے جو سنہ ۱۹۰۰ء میں قائم ہوئی تھی۔ تبت کے ساتھ تجارت کے لیے کلمپانگ ایک تجارتی مرکز ہے اور نیپال بھوٹان اور سیکم سے بھی اس کے تجارتی تعلقات ہیں

مانگپو:۔ مانگپو (Mungpu) شہر دارجلنگ سے جنوب مشرق کی جانب ۱۸ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ مقام کونین کی پیداوار کے لیے مشہور ہے۔ یہاں سے کونین تیار ہو کر دور کے علاقوں اور اسپتالوں میں جاتی ہے

قومیت

ضلع دارجلنگ کے قدیم باشندے منگولین Mongolians

قوم سے ہیں۔ ان کی پانچ شاخیں مشہور ہیں۔ (۱) نیپالی (Nepalese) (۲) لیپچا (Lepcha) (۳) بھوٹیا (Bhotia) (۴) تبتی (Tibetan) اور (۵) راج بنسی (Rajbansi) جسے کوچ (Koch) بھی کہتے ہیں

نیپالی:۔ ضلع دارجلنگ میں اس وقت زیادہ تر آبادی نیپالی قوم کی ہے۔ گورکھا (Gurkha) فوج جو تمام ہندوستان میں مشہور ہے۔ اسی قوم کے افراد سے مشتمل ہے۔ یہ قد کے چھوٹے اور غفیل ہیں مگر بہت بہادر اور نہایت فرمانبردار ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں کہاوت ہے کہ "حکم کا جواب نہیں اور موت کا علاج نہیں" اس سے اس قوم کی فرمانبرداری اور بہادری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ قوم نیپال سے آکر دارجلنگ میں آباد ہوئی۔

لیپچا:۔ لیپچا علاقہ دارجلنگ کے قدیم باشندے ہیں۔ اس وقت اس قوم کے زیادہ تر افراد خانگی خدمات پر مامور ہیں۔ خانگی خدمات کی انجام دہی میں انہیں اس قدر شہرت حاصل ہے کہ دوسرے علاقوں کے لوگ ان کی خدمت سے خوش ہو کر انہیں اپنے علاقوں میں لیجاتے ہیں چنانچہ اس وقت اس قوم کے افراد نہ صرف ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بلکہ برما جاوا سماترا سے لیکر امریکہ تک خانگی خدمات پر برسر روزگار ہیں

بھوٹیا اور تبتی:۔ جو لوگ زمانۂ قدیم میں تبت سے آکر بھوٹان یا سیکم میں آباد ہوئے اور پھر وہاں سے دارجلنگ آئے وہ بھوٹیا کہلاتے ہیں اور جو لوگ براہِ راست تبت سے آئے وہ تبتی کہلاتے ہیں یہ نہایت قد آور قوم ہے اور پورے ضلع دارجلنگ میں اُن تمام پیشوں کی مالک ہے جن میں زیادہ سے زیادہ طاقت کی ضرورت ہے اس قوم کی جسمانی طاقت کا اندازہ اس ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ دارجلنگ کی ریل کے جاری ہونے کے قبل ایک بھوٹیا ایک بڑا پیانو کا بکس (Piano) سلی گوری سے شہر دارجلنگ تک بغیر کسی جگہ رُکے ہوئے اپنی پیٹھ پر لے آیا تھا۔ اِن علاقوں کے باشندوں کی اُس وقت کی اقتصادی حالت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اس بھوٹیا نے اتنی بڑی محنت محض پانچ روپیوں کے عوض میں برداشت کی تھی۔

راج بنسی یا کوچ:۔ راج بنسی یا کوچ ایک ہی قوم کے دو نام ہیں۔ یہ قوم پہلے تو صرف ترائی کے علاقہ میں پائی جاتی تھی مگر اب اس قوم کے افراد جلپائی گوری اور کوچ بہار کے علاقوں میں کثرت سے پھیل گئے ہیں۔ مذکورہ بالا پہاڑی قوموں کی طرح یہ قوم بھی آریہ قوم کے ہندوستان میں آنے کے قبل سے یہاں آباد ہے یہ طاقتور اور مضبوط قوم ہے اور میدانی علاقوں کے باشندوں کے ساتھ آپس میں شادی بیاہ ہونے کی وجہ سے اپنی جسمانی ساخت اور طرز تمدن کے اعتبار سے زیادہ ملتی جلتی ہے

زبان

ضلع دارجلنگ کے پہاڑی علاقہ کے باشندوں کی زبانیں مختلف مقاموں میں مختلف ہیں۔ مگر جو زبان شہروں میں پہاڑی قوموں کی مشترکہ زبان (Lingua franca) ہے وہ عرفِ عام میں نیپالی زبان کہلاتی ہے۔ یہ مشترکہ زبان ہندی زبان سے تھوڑی بہت ملتی جلتی ہے باہر والوں کے ساتھ یہ لوگ ہندی میں بات کرتے ہیں اور شہروں کے تقریباً تمام پہاڑی باشندے ہندی سمجھتے ہیں ترائی میں اس وقت عموماً بنگلہ زبان بولی جاتی ہے۔

زبان کے سلسلہ میں پہاڑی زبان کے حسب ذیل تین عام اور سب سے زیادہ کثیر الاستعمال الفاظ کا ذکر کر دینا ضروری ہے کیونکہ دارجلنگ پہنچنے کے ساتھ ہی ہر شخص کو ان الفاظ سے سابقہ پڑتا ہے

۱۔ نانی (Nanny) بمعنی "بڑی بہن"
۲۔ داجو (Daju) بمعنی "بڑا بھائی"
۳۔ جیو (Jeu) بمعنی "جی" یا "جناب"

دارجلنگ کے علاقوں میں علاوہ خاص رشتہ داروں کے جن کو ان کے رشتہ کے اعتبار سے پکارنا ضروری ہے۔ باقی ہر عورت کو "نانی" اور ہر مرد کو "داجو" کے مہذب خطاب سے پکارنے کا دستور ہے اور یہ دستور بلا لحاظ اس امر کے ہے کہ وہ عورت یا مرد خادمہ یا خادم یا قلی ہو "جیو" کا لفظ جوابی کلمہ ہے۔ یعنی جب کسی کو پکارا جاتا ہے یا کسی کو کسی سوال کے جواب میں اثبات کا ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے "جیو"

مندرجہ بالا تین الفاظ کے علاوہ مندرجۂ ذیل الفاظ بھی عام طور سے استعمال ہوتے ہیں

(۱) کیٹا (Keta) یا کینچا (Kancha) بمعنی لڑکا
(۲) کیٹی (Keti) یا کینچی (Kanchi) بمعنی لڑکی
(۳) چیا (Chiya) بمعنی چائے (Tea)

پیداوار

علاوہ چائے قہوہ اور کونین کے جن کی کاشت ۱۸۶۴ء سے جاری ہے۔ ضلع دارجلنگ کی حسب ذیل پیداوار مشہور ہے جو شہر دارجلنگ اور دوسرے مقامات میں ہاٹ کے موقعوں پر فروخت ہونے کے لیے آتی ہے۔

پھلوں میں نارنگی جو وہاں کثرت سے ہوتی ہے۔ انناس۔ ناشپاتی سیب۔ امرود وغیرہ

سبزیوں میں اسکوچ جو وہاں بے انتہا پیدا ہوتا ہے۔ سیم۔ بیم گوبی کی دونوں قسمیں پھول گوبی اور بند گوبی وغیرہ

مصالحوں میں بڑی الائچی جس کی وہاں کثرت ہے۔ لانبی اور گول دونوں قسموں کی ہری مرچ جو وہاں بہت بڑی بڑی ہوتی ہے اور جسے لوگ اچار بنانے کے لیے خاص طور سے پسند کرتے ہیں وغیرہ

چائے کی کاشت

ضلع دارجلنگ میں چائے کی کاشت بہت بڑے پیمانہ پر ہے۔ ضلع کے اکثر حصہ میں جنگلوں کو صاف کر کے چائے کے کھیت بنا دیے گئے ہیں خود شہر دارجلنگ میں کثرت سے چائے کے کھیت اور چائے کی کمپنیاں ہیں۔ چائے کی کاشت ہی کی بدولت یہ علاقہ اس قدر کثیر الآباد ہے کیونکہ یورپین اور بنگالی اور ہندستان کے دوسرے غیر پہاڑی علاقوں کے باشندے اور سیکم اور نیپال کے علاقوں سے آئی ہوئی پہاڑی قومیں اکثر و بیشتر اسی تعلق سے کوئی کھیت کے مالک (Tea planters) کی حیثیت سے کوئی کمپنیوں کے منتظم (Managers) کی حیثیت سے کوئی دفتروں میں ملازم (Clerks and others) کی حیثیت سے اور کوئی کھیتوں میں مزدور (Coolies) کی حیثیت سے پورے ضلع میں پھیلی ہوئی ہیں۔ تھوڑے بہت سے لوگ سرکاری و نیم سرکاری دفتروں میں ملازمت اور دوکانداری کے سلسلہ میں بھی آباد ہیں مگر یہ دفاتر اور دوکانیں بھی اسی چائے کی کاشت کی مرہون منت ہیں۔ دارجلنگ ہمالین ریلوے کا قیام بھی چائے ہی کی تجارت کی سہولت کی غرض سے عمل میں آیا تھا۔ شہر دارجلنگ اور ضلع کے دوسرے شہروں میں یورپین اسکولوں کی اتنی بڑی تعداد ان ہی چائے کے کھیتوں کے مالکوں (Tea planters) کے بچوں کی تعلیم کیلئے ہے

الحاق

ضلع دارجلنگ کا وہ سلسلہ جو سلی گوری سے برچ ہل اور لیبانگ تک پھیلا ہوا ہے اور ضلع کے وہ علاقے جو مذکورۂ بالا سلسلہ کی مغرب جانب واقع ہیں سلطنت برطانیہ میں داخل ہونے کے قبل حکومت سیکم کے علاقے تھے اور کلیانگ کا علاقہ حکومت بھوٹان کا علاقہ تھا۔

کپتان لائڈ (Captain Lloyd) جو بعد میں جنرل (General) کے لقب سے ملقب ہوئے ۱۸۲۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی (The East India Company) کی طرف سے سیاسی ضروریات کی غرض سے سیکم تشریف لے گئے۔ اس سفر میں کپتان موصوف کا گذر فروری ۱۸۲۹ء میں اس مقام سے ہوا جہاں اب شہر دارجلنگ آباد ہے

اس وقت اس مقام میں آبزرویٹری ہل کے ارد گرد صرف ۲۰ گھر تھے اور باقی حصے غیر آباد پڑے ہوئے تھے کیونکہ گورکھوں کے متواتر حملوں سے خوفزدہ ہو کر یہاں کی آبادی دوسرے علاقوں میں چلی گئی تھی کپتان موصوف نے چھ دن اس مقام پر قیام فرمایا اور چونکہ اس مقام کا درجۂ حرارت لندن کے درجۂ حرارت کے تقریباً برابر ہے اسلیے بیمار انگریزی حکام اور تجار کی رہائش کے لیے انھوں نے اس مقام کا انتخاب فرمایا۔ چنانچہ اُن کے مشورہ سے وائسرائے ہند لارڈ ولیم بنٹنک (Lord William Bentinck) نے یکم فروری ۱۸۳۵ء میں ضلع دارجلنگ کا پہاڑی علاقہ مہاراجہ سیکم سے دوستانہ طور سے بطور عطیہ کے حاصل کیا۔ یہ مقام سیکم نیپال اور بھوٹان کے علاقوں کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے اس کا برطانیہ کے قبضہ میں آنا سیاسی نکتۂ نگاہ سے بہت مفید ثابت ہوا۔

۱۸۳۹ء میں ڈاکٹر کیمپبل آئی ایم ایس (Dr. Campbell I.M.S.) جو اس وقت نیپال میں سلطنت برطانیہ کے ریزیڈنٹ (Resident) تھے۔ دارجلنگ کے سپرنٹنڈنٹ (Superintendent) بنا کر بھیجے گئے اور انہیں دیوانی فوجداری سیاسی و انتظامی اختیارات تفویض ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے نیپال اور سیکم کے علاقوں سے لوگوں کو بلا بلا کر اس علاقہ میں آباد کرنا شروع کیا اور ان کی تالیف قلوب کے لیے زمینیں مفت مرحمت فرمائیں اور رہائش و زراعت کے لیے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ پھر تبت اور دوسرے علاقوں سے تجارتی تعلقات قائم ہوئے اور فوج کی چھاؤنیاں قائم کی گئیں۔

۱۸۴۹ء میں برطانیہ اور مہاراجہ سیکم کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور ایک ہی سال کے اندر اندر ترائی کا علاقہ جو حکومت سیکم کا سب سے زرخیز علاقہ تھا برطانیا کے قبضہ میں آگیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک برطانیہ اور سیکم کے تعلقات سلجھے ہوئے رہے مگر پھر کشیدگی پیدا ہو گئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ۱۸۶۱ء میں برطانوی فوجیں سیکم کے پایہ تخت تملانگ (Tumlong) میں داخل ہو گئیں مہاراجہ سیکم تخت سے دست بردار ہوئے اور ان کی جگہ ان کا بیٹا ایک ماتحت حکمران کی حیثیت سے تخت نشین کیا گیا۔ اسی سنہ کی ۲۸ تاریخ کو نئے مہاراجہ اور برطانیا کے درمیان ایک صلح نامہ پر جانبین کے دستخط ہوئے جس کی رو سے دارجلنگ کی شمالی جانب کے علاقہ پر مہاراجہ صاحب بہادر کا قبضہ رہا۔ مگر منجملہ اور امور کے تبت کے ساتھ تجارت کے سلسلہ میں سیکم سے ہو کر گذرنے والے انگریزی تجار کو نہ صرف تجارتی مراعات حاصل ہوئیں بلکہ اس علاقہ

سے گذرنے والے تمام تجار اور مسافروں کی جان ومال کی حفاظت کی حکومت سیکم ذمہ دار ہوئی۔

اسی دوران میں حکومت بھوٹان اور حکومت برطانیہ کے درمیان جنگ کی آگ بھڑک اٹھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے تو وسط وسط جنوری ۱۸۶۶ء میں دوار (Dooars) کا علاقہ حکومت بھوٹان کے ہاتھ سے نکلا اور پھر ۱۸۶۶ء میں کلیانگ کے علاقہ پر برطانیہ کا قبضہ ہوا اور اس طرح وہ پورا خطہ جو ضلع دارجلنگ کے نام سے موسوم ہے حکومتِ سیکم اور حکومت بھوٹان سے نکل کر حکومت برطانیہ سے ملحق ہوگیا۔

۱۸۶۶ء سے ابتک ان علاقوں میں کامل امن وامان قائم ہے

اسی سال سے اس ضلع کی اقتصادی تمدنی علمی تجارتی زراعتی انتظامی ومعماری ترقیاں پورے اطمینان وسکون کے ساتھ نہایت جوش وخروش سے شروع ہوئی۔ پہاڑوں کو کاٹ کر سہل اور آسان سڑکیں بنائی جانے لگیں۔ کارٹ روڈ کی تیاری زوروں پر ہونے لگی جنگلوں کو صاف کرکے جابجا چائے کے کھیت بنے۔ اسکول اسپتال ہوٹل مسافرخانے قائم ہونے شروع ہوئے۔ الغرض دارجلنگ ایک جنگلی علاقہ سے ایک نہایت شاندار متمدن خطہ ہوگیا۔

سید منظور عالم

"ماں"

حق ماں سے زیادہ نہیں دنیا میں کسی کا
جو قابل عزت ہے وہ رتبہ ہے اسی کا

سینچا ہے اسی ماں نے تمہیں خون جگر سے
پروان چڑھے اس کی دعاؤں کے اثر سے

نیند اپنی اسی ماں نے تمہارے لیے کھوئی
گذری ہیں وہ راتیں بھی کہ دم بھر نہیں سوئی

اس ماں نے تمہیں جاگ کے آرام دیا ہے
اور لوریوں سے نیند کا پیغام دیا ہے

ارماں سے خواہش سے تمناؤں سے پالا
ہے کون بھلا ماں کی طرح چاہنے والا

ہر امر میں واجب ہے تمہیں ماں کی اطاعت
بیٹا ہی وہ کیا جس میں نہ ہو خوئے سعادت

سایہ ہے جہاں ماں کا وہاں حق کا کرم ہے
اس بی بی کے قدموں کے تلے باغ ارم ہے

راضی ہے اگر ماں تو خدا شاد رہے گا
لو اس کی دعائیں تو گھر آباد رہے گا

تعلیم کے برباد تم اوقات نہ کرنا
ماں جس سے ہو ناخوش وہ کبھی بات نہ کرنا

کیا ماں کی توقع کا بھی کچھ پاس ہے تم کو
اور اس کی تمناؤں کا احساس ہے تم کو

اور کچھ ہے امید بڑی نور نظر سے
روشن ہو مرا نام زمانے میں پسر سے

کہنے لگیں ہر شہر کہ بڑا نام کیا ہے
اللہ نے اس ماں کو بھی کیا بخت دیا ہے

انگشت نمائی یہ کریں خویش و برادر
بیٹا ہو اگر ایسا تو خوشا ماں کا مقدر

فرزند ہو لائق تو خوشی ہوتی ہے ماں کو
کرتی ہے فراموش غم جور زماں کو

رہتی ہے یہ امید کہ لکھ پڑھ کے بڑھے گا
زینے پہ ترقی کے مرا لال چڑھے گا

کونین میں نایاب ہے مادر کی محبت
اس گنج گرانمایہ کی لازم ہے حفاظت

ہو جائے کسی بات پہ ماں گر کبھی برہم
اداب سے آگے سر تسلیم کرو خم

جو ماں کا ہے رتبہ وہ حدیثوں سے عیاں ہے
راحت کو نہ جھٹلائے گا جو مرتبہ داں ہے

قرآن میں ماں باپ کی عظمت کا بیاں ہے۔
ایسا مگر اس دور میں فرزند کہاں ہے

رضیہ بیگم راحت

شاعر جنّی

کلکتہ کے نامور شاعر و مصنف عبدالغفور خاں نسّاخ نے "سخن شعرا" (تذکرہ شعرائے اردو، مولفہ ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۴ء) کے علاوہ اپنے فارسی گو معاصرین کا بھی ایک تذکرہ فارسی میں لکھا تھا۔ یہ تذکرہ "ع" کی ردیف تک شائع ہونے پایا تھا کہ مولف نے سفر آخرت اختیار کیا۔ اس نایاب تذکرہ کا ایک نسخہ شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن خاں صاحب پرنسپل طبیہ حبیبیہ کالج ڈھاکہ کے ذاتی کتب میں موجود ہے مندرجہ ذیل محیر العقول واقعہ اسی تذکرے سے بطور اختصار ترجمہ کیا گیا ہے۔ جنات کا وجود ہے یا نہیں یہ تو خدا جانے لیکن جب تک نساخ کی روایت کو جو کلکتہ کے نہایت معزز اور معتبر لوگوں کی شہادتوں پر مبنی ہے، سراسر جھوٹ کا پشتارہ نہ فرض کر لیا جائے ہمیں جنات سے پیچھا چھوٹنا مشکل ہے

عندلیب شادانی

مولوی عبدالحلیم عاصم ساکن کلکتہ۔ ایک نہایت سلیم الطبع اور خوبرو نوجوان ہیں جس وقت اس کی عمر کوئی پندرہ سولہ برس کی تھی اور وہ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں پڑھتے تھے۔ ان کا مبلغ علم اس سے زیادہ نہ تھا کہ انگریزی اور فارسی کی چند ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں۔ ایک بزرگ جنّی جو مذہباً مسلمان اور ایک نہایت بلند پایہ عالم، صوفی اور شاعر تھے۔ ان پر آنے لگے۔ یہ واقعہ سنہ ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۴ء کا ہے۔

ابتدا اس کی یوں ہوئی کہ عید کا دن تھا۔ شام کے وقت یہ خوبرو صاحبزادے (عاصم) خوبصورت کپڑے پہن، عطر مل، اپنے ابا جان منشی عبدالکریم مرحوم کے ہمراہ نواب امیر علی خاں (مشیر واجد علی شاہ، بادشاہ اودھ) سے ملنے گئے۔ کوئی پہر رات گئے جب باپ بیٹے دونوں وہاں سے لوٹے اور گرجا گھر کے پاس پہنچے جو مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پہلو میں واقع ہے تو یکایک لڑکے پر بیہوشی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ باپ نے بڑی دشواری سے لڑکے کو قریب کے ایک مکان میں پہنچایا۔ وہاں پہنچتے ہی غش کھا کر گر پڑا اور اس بیہوشی کے عالم میں بے سر و پا باتوں کے علاوہ عربی اور فارسی کے اشعار پڑھنے لگا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد نہایت فصیح و بلیغ عربی بولنے لگا۔ اس کے بھائی مولوی عبدالحکیم مرحوم نے جو عربی اچھی جانتے تھے۔ عربی میں اس سے باتیں شروع کیں۔ مگر مولوی صاحب کی گفتگو میں وہ فصاحت و بلاغت کہاں جو لڑکے کی تقریر میں تھی۔

فاضل جنّی اس بنگالی نژاد لڑکے کی زبان سے فقط عربی فارسی میں گفتگو ہی نہیں کرتے تھے، بلکہ عربی، فارسی اور ترکی میں فی البدیہہ اشعار لکھوا دیتے تھے جس وقت لڑکے کے ہوش و حواس درست ہوتے تھے تو اس کی شعر گوئی موقوف ہو جاتی تھی۔ چند روز اسی طرح گذر گئے۔ عموماً مغرب کی نماز کے بعد وہ حضرت جن اس لڑکے پر آیا کرتے تھے اور بہت سی عجیب و غریب باتیں اس لڑکے سے ظہور میں آتی تھیں۔ لڑکے کے بزرگوں نے اس آسیب کے دفع کرنے کی ہزاروں تدبیریں کیں۔ مگر ایک بھی کارگر نہ ہوئی اس زمانے میں کلکتہ میں ایک صاحب خاکی شاہ مشہور عالم تھے انہیں بلوایا گیا۔ انھوں نے جھاڑ پھونک شروع کی تو فاضل جنّی نے لڑکے کی زبان سے چند شعر خاکی شاہ کے سامنے پڑھے ان میں دو شعر یہ ہیں ؎

ضعیفم، ناتوانم، لیک آخر آتشی ہستم
چہ باک از خاک دارد خواہش پیکار در دلہا

ترجمہ (ضعیف و ناتواں ہوں۔ پھر بھی آخر آتشی ہوں میں
نہیں ڈر، جنگ کی خواہش اگر ہے خاک کے دل میں۔ مترجم)

خدا را یاد باید کرد و خود را نیز باید جست
چرا، اندر تلاش دیگراں گیرید مشکل ہا۔

ترجمہ (کرو اللہ کو یاد اور خود اپنے تئیں ڈھونڈو
تلاش غیر میں تم کس لیے پڑتے ہو مشکل میں۔ مترجم)

اور یہ مصرعہ بھی فرمایا ع

تو خاکی و من آتشی، پیکار خاک و آتش است

خاکی شاہ نے حرز سلیمانی لڑکے کے بازو پر باندھنا چاہا تو حضرت جنّی نے فی الفور یہ شعر پڑھا ؎

آتشی و آتشم، در پیراہن انساں شدم
باک سلیماں چرا، خود چو سلیماں شدم

اور کبھی کبھی لڑکے کے بزرگوں کو تسلی بخش اشعار سناتے تھے ان میں سے ایک یہ ہے

ازیں محنت و درد چندیں منال
فربی علیٰ کل شیءٍ قدیر

عربی کے یہ دو شعر بھی انہیں کے ہیں۔

یا دافع البلاء و یا رافع الضرر   یا خالق الخلائق من کل منتشر
یا ناصب لا الٰہ و یا سید البشر   نورک منور ربک کالنور فی القمر

غرض جب اس واقعے کی شہرت عام ہوئی تو کلکتہ کے بڑے بڑے علما۔ فضلا اور امرا دیکھنے کے لیے آنے لگے۔ جو دیکھتا تھا حیران رہ جاتا تھا۔

ایک دن جنی موصوف نے کہا کہ میں علمائے کلکتہ میں سے کسی فاضل معقولات کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا عبدالحق خیرآبادی۔ ابن مولانا فضل حق خیرآبادی مرحوم اُن دنوں مدرسہ عالیہ کلکتہ کے مدرس اول تھے۔ ان کے ایک شاگرد نے گزارش کی کہ حضور اس جنی کی ملاقات کو تشریف لے چلیں۔ مولانا نے جنیوں کے متعلق چند مشکل اور دقیق سوال لکھ کر اس شاگرد کے حوالے کیے اور کہا کہ اس کا جواب فاضل جنی سے طلب کرو۔ فاضل جنی نے ان تمام سوالوں کے جواب نہایت معقول اور اہل اسلام کی کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے اس کے مطابق دیے۔

جس دن فاضل جنی کلکتہ اور اہل کلکتہ کو خیرباد کہنے والے تھے شام کے وقت کلکتہ کے بعض مقتدر لوگ جن میں راقم (نساخ) کے برادر معظم، نواب عبداللطیف۔ خان بہادر۔ اور مولوی عبدالرؤف وحید بھی تھے۔ نیز مدرسہ عالیہ کلکتہ کے مدرسین و طلاب اور دوسرے لوگ اس آسیب زدہ لڑکے کے گھر پر جمع ہوئے۔ دیکھا کہ لڑکے کا رنگ زرد ہے۔ آنکھیں لال ہو رہی ہیں۔ گاؤ تکیہ کے سہارے دو زانو بیٹھا عربی و فارسی میں اہل زبان کے لہجے میں گفتگو کر رہا ہے لوگوں نے پوچھا "آپ کا وطن؟"

کہا "کردستان"

پھر پوچھا "اسم شریف؟"

کہا "شیخ" (کچھ نہیں)

پوچھا "آپ کی زبان؟"

کہا "میری اور تمام کردوں کی زبان پارسی ہے"

پوچھا "عربی میں آپ کیوں گفتگو کرتے ہیں؟"

کہا "عربی میں نے پڑھی ہے اور عربی میں بات چیت کرنا مجھے بہت پسند ہے کیونکہ یہ ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان ہے۔ اور اللہ جل شانہ، کا کلام بھی اسی زبان میں نازل ہوا ہے"

پوچھا "آپ کا مذہب؟"

کہا "سنی ہوں اور صوفی"

پوچھا "منقولات آپ نے کس سے پڑھے؟"

کہا "فقہ و اصول آپ کے علماء سے۔ اور حدیث و تفسیر اپنے فضلا سے"

پوچھا "اور معقولات؟"

کہا "جنوں سے"

پوچھا "شعر و سخن میں کس سے مشورہ کیا؟"

کہا "مولانا جامی علیہ الرحمۃ سے، ہمیشہ انسانی شکل میں انکی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ اور اشعار پر اصلاح لیا کرتا تھا"

پوچھا "اس وقت آپ انسانی شکل اختیار کر کے ہم لوگوں کے سامنے کیوں نہیں آتے؟"

کہا "اس میں زحمت ہے؟"

اس محل پر حضرت وحید نے فرمایا کہ مولانا جامی کے معاصرین سے تو آپ واقف ہونگے۔ ذرا اُن کے نام تو بتایئے؟"

کہا "ہاتفی، فغانی، ساغری، آصفی وغیرہ"۔ یہ کہا اور جناب وحید سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "خاک پائے شعرا ہوں"

فرمایا "سخنور ایسا ہی کہا کرتے ہیں۔ اچھا کچھ اپنا کلام سنایئے

حضرت وحید نے اپنی ایک غزل پڑھی جس کا مطلع یہ ہے

چاک در گلشن زدم چوں سینہ را، گل گفت، بس
نیمۂ از نالہ سر دادم کہ بلبل گفت، بس

جیسے ہی جناب وحید کی غزل تمام ہوئی فاضل جنی نے اس زمین میں فی البدیہہ غزل نہایت دلربا انداز میں سنائی:۔

نعرہ از دل بر آمد۔ در چمن گل گفت بس
نغمۂ اندر گلو پیچید قلقل گفت بس

بس مگو اے جانِ من از بوسہ لب ہائے نوش
غم بمن پیچیدہ و بنگر کہ کاکل گفت بس

غیرت عشاق باید دید اے سنگیں دلاں
شوق تر دیدم بہ گل از پردہ بلبل گفت بس

شب بر آمد آں پری در بزم لیکن بے حجاب
گفتم اے دل کن تحمل، خود تحمل گفت بس

اس غزل میں تین چار شعر اور بھی تھے۔ مگر افسوس کہ ضائع ہو گئے حکیم محمد سجاد سہانی نے مطلع کے پہلے مصرعہ پر اعتراض کیا کہ چمن میں تو گل ہوتا ہے نہ کہ مُل (شراب)۔ فرمایا "ہاں ہوتا تو نہیں مگر لائے وہاں لے جاتے ہیں۔ کیونکہ صحن چمن ہی صحبت عیش اور بادہ کشی کے لیے بہترین جگہ ہے یہ سب نے اس جواب کو پسند کیا۔ اس کے بعد ایک اور غزل انھوں نے ارشاد فرمائی۔ کل تین چار شعر محفوظ رہ گئے ہیں باقی ضائع ہو گئے ؎

وقت مے نوشی ست ساقی کو ایاغ آسماں

کنج گلشن باید دیار رو چراغ آسماں
زاغ گوں داری تو گیسو جانِ من معلوم شد
کشتۂ تیرِ نگاہِ تست زاغ آسماں
شب برآمد آں پری بارو ئے رشکِ ماہِ نو
ماہتاب از خجلت او گشت داغ آسماں

اس کے بعد حاضرین نے ہر قسم کے سوالات پوچھنے شروع کیے۔ حضرت جنّی نے ہر سوال کا جواب نہایت شافی دیا۔ ایک بار پھر لوگوں نے پوچھا کہ اچھا اپنا نام اور تخلص تو بتایئے؟"

کہا" گم ناموں کا نام کیا۔ رہا تخلص تو خاقانی۔ انوری، سعدی حافظ جو چاہے فرض کر لیجئے۔ کیونکہ تمام افراد کائنات کا وجود واحد ہے"

پوچھا" آپ کا سن شریف؟"

کہا" چھ سو برس اور میرے والد ماجد بھی ابھی زندہ ہیں"

پوچھا" اس لڑکے پر جناب نے کیوں تسلط فرمایا؟"

کہا" انسانوں کی صحبت مجھے پسند ہے۔ چونکہ کلکتہ میں اتفاقی طور پر آنا ہوا یہاں کے علما فضلا سے ملنے کو جی چاہا۔ لہذا یہ ذریعہ اختیار کیا۔ مقصود اس لڑکے کو ایذا دینا نہیں۔ میرا جو مقصد تھا وہ حاصل ہو گیا۔ لہذا آج رات کو میں آپ حضرات سے رخصت ہوتا ہوں اور پھر کبھی کلکتہ نہیں آؤنگا۔ یہ کہا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور نہایت فصیح عربی میں فاتحہ خیر پڑھا۔ اس کے بعد الوداع کہہ کے سب سے رخصت ہوئے فی الفور لڑکے نے چند انگڑائیاں لیں اور اٹھ بیٹھا۔ اس کے بعد بالکل اچھا خاصہ تھا۔ کسی قسم کا کوئی اثر اس پر باقی نہ تھا افسوس کہ راقم (نساخ) ان دنوں کلکتہ میں موجود نہ تھا۔ ورنہ بچشم خود ان عجائبات کا مشاہدہ کرتا۔

نساخ کے نزدیک حضرت جنّی کے کلام کا جو مرتبہ بھی ہو۔ مترجم کی نظر میں یہ اشعار مولانا جامی کے کسی شاگرد کے بجائے جعفر زٹلی کے کسی شاگرد سے منسوب کیے جانے کے قابل ہیں (شادانی) ماخوذ از "شیرازہ"

ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

غزل

حسنِ خود نما بن جا عشق میں فنا ہو کر
محرمِ حقیقت ہو۔ حیرت آشنا ہو کر

مدعائے ہستی کو جان۔ مبتلا ہو کر
آشنائے ہستی بن۔ وقفِ مدعا ہو کر

اب مرے جگر میں وہ درد بن کے بیٹھے ہیں
درد کی دوا لے کر درد کی دوا ہو کر

تک رہا ہوں حیرت میں ایک ایک صورت کو
رہ گیا ہوں سر تا پا شکلِ آئینا ہو کر

رہنما جو بننا ہو راہ میں فنا ہو جا
خود نشانِ منزل بن مثلِ نقشِ پا ہو کر

مجھ پہ جو گذرتی ہے آپ ہی سمجھ لیجئے
لب پہ بات اگر آتی ہے تو التجا ہو کر

بندگی کو دل مطلوب اور دل کو ہم محبوب
ہم تو مٹ گئے خواجہ بندۂ وفا ہو کر

خواجہ قدوائی

نقد و نظر

گارساں دتاسی اور اُسکے ہمعصر بہی خواہاں اردو :۔ مولفہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ۔ قیمت ایکروپیہ چارآنہ ۔

ملنے کا پتہ :۔ سب رس کتاب گھر ۔ خیریت آباد ۔ حیدرآباد دکن ـــــ طبع ثانی

ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کو لکھ کر نہایت اہم کام انجام دیا ہے ۔ جسے دنیائے ادب میں کبھی فراموش نہیں کیا سکتی ۔ بہت دنوں سے یہ ضرورت محسوس کیجا رہی تھی کہ زبان اردو کے متعلق کوئی ایسی مستند اور جامع کتاب لکھی جائے جن کے اندران بہی خواہان اردو کا ذکر ہو ۔ جنہوں نے اردو زبان کو اپنے خون سے سینچا ۔ بڑی بڑی قابل قدر خدمات انجام دیئے اور گہوارے میں کھیلنے والی ننھی بچی کو ہفت افلاک کا تارہ بنا دیا ۔ ہم ڈاکٹر صاحب کے بہت ممنون ہیں کہ انھوں نے گارساں دتاسی جیسے قابل وقعت محسن کے حالات لکھ کر دشمنان اردو کی زبانیں بند کر دی ہیں جو سالہا سال سے اس کی بیخ کنی میں مصروف تھیں ۔ موصوف اگرچہ فرانسیسی تھے لیکن انہیں اردو پر اس قدر دسترس اور قدرت حاصل تھی کہ بڑے بڑے مقالے لکھے ، ہمارے مصنفوں اور تصنیفوں پر ناقدانہ نظر ڈالی اور فرانسیسی زبان میں ہندوستانی ادب کی مکمل تاریخ لکھ کر تین جلدوں میں شائع کی دتاسی پہلا غیر ہندوستانی شخص تھا جس نے غیر ملک فرانس میں اردو سیکھی اور اردو سے متعلق بے شمار معلومات حاصل کیے ، وہ کبھی ہندوستان نہیں آیا اردو سے اس کی حیرت انگیز دلچسپی معلوم کر کے ہندوستانی مسلمانوں کو سبق حاصل کرنا چاہئے ۔ ہم یہاں موصوف کی تقریروں کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں جو اردو ہندی تنازع کے متعلق کہے گئے تھے :۔

"اردو نے ہندوستان میں جو حیثیت قائم کرلی ہے وہ باقی رہے گی ۔ وہ اگر چاہیں کہ لوگوں کو عربی اور فارسی الفاظ ترک کرنے پر آمادہ کریں تو اس میں بھی انہیں کامیابی نہیں ہو سکتی ۔ اس واسطے کہ اسلامی حکومت کے زمانے میں صدیوں سے جو الفاظ عام زبان پر چڑھ گئے ہیں وہ آسانی سے ترک نہیں کیے جا سکتے ۔ ان کی کوشش بالکل ایسی ہو گی جیسے انگریزی فضلا یہ فیصلہ کریں کہ ان کی قوم ان فرانسیسی الفاظ کا استعمال ترک کر دے جو انگریزی الفاظ میں نارمن فتوحات کے بعد گھل مل گئے ہیں ۔"

دتاسی نے آج سے تقریباً ستر سال قبل ہندوستان کے اردو ہندی تنازع کے متعلق جو صحیح اندازہ کیا تھا وہ آجکل کے بہی خواہان اردو کے لیے سبق آموز ہے ۔ موصوف نے اردو کی تائید میں بہت ساری مستند اور مدلل باتیں لکھی ہیں ۔ انھوں نے اپنے خطبہ میں کہا تھا :۔

"یہ عجیب بات ہے کہ جس طرح آجکل یورپ میں ایک تحریک اٹھی ہے جس کا نصب العین یہ ہے کہ پھر سے ازمنۂ وسطیٰ کی طرف رجوع کیا جائے جو اب بولیاں ہو کر رہ گئی ہیں ۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی ازمنۂ وسطیٰ کو زندہ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے ۔ ہندوستان میں بھی ازمنۂ وسطیٰ کی ادبیات کو قدر اور احترام کے ساتھ دیکھا جا رہا ہے ۔ اس وقت ہندی کی حیثیت بھی ایک بولی کی سی رہ گئی ہے جو ہر گاؤں میں الگ الگ طریقے سے بولی جاتی ہے ۔ چنانچہ ہندوؤں کی کوشش ہے کہ اردو کی بجائے ہندی کو فروغ دیا جائے حالانکہ اردو بہ نسبت ہندی کے زیادہ شستہ ہے ۔ لیکن ہندی ان کے نزدیک خالص ہندوستان کی زبان ہے اس واسطے کہ وہ سنسکرت سے نکلی ہے ۔ اُن کو یہ نہیں سوجھتا کہ اردو زبان میں فارسی اور عربی کی ساری خوبیاں جمع ہو گئی ہیں ۔ یہ دونوں زبانیں (فارسی و عربی) اسلامی مشرق کی قابل احترام السنہ ہیں اور دنیا کے تمام علماء و فضلاء ان دونوں کو ہمیشہ سے اسی نظر سے دیکھتے آئے ہیں ۔"

محولا بالا اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو زبان کی حیثیت اور وقعت غیر ممالک میں کیا ہے ان کی ناقدانہ نگاہوں نے کس طرح اردو کو ہندی پر ترجیح دیا ۔ حالانکہ موصوف ہندی کے بھی بڑے ماہر اور عالم تھے ۔ لیکن انھوں نے ہمیشہ اور ہر مقام پر اردو کا رتبہ بلند کیا ہم ان لوگوں سے پر زور اپیل کرتے ہیں کہ وہ حضرات اس قیمتی کتاب کا ضرور مطالعہ کریں جن کے دلوں میں اردو کی محبت ہے اور ان سے بھی ہماری استدعا ہے جو اس پیاری زبان کو مٹا دینے پر تلے ہوئے ہیں وہ کم از کم ایک بار "کتاب گارساں دتاسی" ضرور مطالعہ کریں ۔ آپ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اسی سے لگا سکتے ہیں کہ پہلے ایڈیشن کے ختم ہونے کے بعد اب دوسرا اڈیشن شائع کیا گیا

ہے۔ امید ہے ہندو اور مسلمان حضرات ضرور اس سے مستفید ہونگے۔ م۔ا

"کشمش نانی" مصنفہ :۔ شجاع احمد۔ قیمت دس آنے
ملنے کا پتہ :۔ سب رس کتاب گھر۔ خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن

جہاں اردو ادب میں دیگر موضوعات کی کتابیں خال خال ہیں وہاں بچوں اور بچیوں کے لیے عمدہ اور مفید کتابیں بھی جلوہ گاہ اشاعت پر بہت کم آتی ہیں۔ حالانکہ یہی چھوٹے بچے بڑے ہو کر ایک دن قوم اور وطن کے لیئے مفید ثابت ہونگے۔ لیکن صد ہزار افسوس کہ ہندستان میں بچوں اور بچیوں کی تعلیم کا کچھ خیال ہی نہیں کیا جاتا۔ اگر ہم ہندستان سے قطع نظر دیگر ممالک پر نظر ڈالیں تو ہمیں حیرت ہوگی کہ وہاں زیادہ تر توجہ ان ہی ننھی منھی کلیوں پر دی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ آگے چل کر یہی بچے قوم و ملک کے لیئے باعث فخر ثابت ہوتے ہیں ۔۔!

ہمیں نہایت خوشی ہے کہ ادارہ ادبیات اردو نے اس کمی کو پوری کرنے کی اولوالعزمی کے ساتھ قدم اٹھایا ہے، اور اب تک اس سلسلہ کی بہت سی کڑیاں آسمان ادب پر نمودار ہو چکی ہیں۔ ان میں سے ہمارے پاس مذکورہ بالا کتاب برائے تبصرہ پہنچی ہیں۔ جس کا ہم نے مطالعہ کیا۔ اور ہمیں بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ بچوں اور بچیوں کے لیے یہ کتاب نہایت مفید اور اعلیٰ ہے۔ زبان نہایت سادہ اور سلیس ہے جسے بچے آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ "کشمش نانی" عوام میں بہت مقبول ہوگی۔ خاص کر بچے تو پڑھ کر ہنستے ہنستے لوٹ جائیں گے۔ کدا

شان خدا :۔ مؤلفہ مولانا عبیدالرحمن صاحب عاقل رحمانی۔ صفحہ ۱۷۵۔ کاغذ اور طباعت عمدہ۔ قیمت ایک روپیہ
ملنے کا پتہ کتابستان پوسٹ بکس نمبر ۳۱۶۴ بمبئی نمبر ۳

یوں تو دہریت اور الحاد کا دورہ ہر زمانے میں کم و بیش رہا۔ لیکن یورپ کے دور ترقی میں جبکہ سائنس اور فلسفہ کی ترقی نے زور پکڑا تو اس کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے علماء اور فلاسفہ بھی دہریت کے میدان میں کود پڑے، اور وجود باری تعالیٰ سے صاف انکار کر دیا اور صرف اسلامی عقائد نہیں بلکہ عیسائی عقائد کے خلاف بھی انیسویں صدی کے اخیر اور بیسویں صدی کے شروع تک سخت ہنگامہ آرائی کرتے رہے، جس کے اثر سے ہندستان بھی نہ بچ سکا اور یہاں بھی اکثر اس خام عقیدہ کے جال میں لوگ پھنسنے لگے اس لیے ضرورت تھی کہ اردو میں بھی اس موضوع پر کتابیں شائع کی جاتیں جس میں باری تعالیٰ کی ہستی کو نہایت مستحکم اور قطعی دلائل کے ساتھ، علم الکلام اور سائنس کی روشنی سے ثابت کر کے دہریت اور الحاد کے شبہات کا دنداں شکن جوابات دیں۔ ع۔ ج

اس میں کوئی شک نہیں کہ مؤلف کتاب نے اس کتاب میں بڑے بڑے علماء اور فلاسفہ کے اقوال اور بحث سے ایک حد تک ان کے دعوی اور شبہات کو رد کر دیا ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ نئی روشنی والے پرانے دلائل اور اقوال کو نہ مانیں، اس لیے بہت ضرورت ہے کہ اردو زبان میں اور بھی اس طرح کی جامع اور معنی کتابیں شائع کی جائیں۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :۔ مؤلفہ ٹامس کارلائل، مترجمہ مولانا عبیدالرحمن صاحب عاقل رحمانی۔ صفحہ ۹۳۔ کاغذ و طباعت عمدہ قیمت ۸ر
ملنے کا پتہ کتابستان پوسٹ بکس نمبر ۳۱۶۴ بمبئی نمبر ۳۔

ایک غیر مسلم نے رسول اللہ صلعم کی حیات طیبہ پر نہایت عمدہ فلسفیانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے، اور ساتھ ساتھ مخالفین اسلام کے اعتراضوں کا جواب بھی نہایت مدلل اور واضح طور پر دیا ہے۔ وہ رسول صلعم کی عظمت حسن و عمل، اور جوش صداقت کا خود بھی قائل تھا، اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتا تھا۔ چنانچہ وہ ایک جگہ اسی کتاب میں نہایت صداقت اور راست گوئی سے کہتا ہے۔

"موجودہ دور کے مہذب اور متمدن فرد کے لیئے بڑے شرم کی بات ہے کہ وہ اپنے کان کو اس کلام کی طرف متوجہ کرے کہ (نعوذ باللہ) (دین اسلام جھوٹ ہے اور محمد مکار اور جھوٹا ہے)۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس قسم کے لغو اور باطل کلاموں کی اشاعت سے جنگ کریں"

یہ ہے اس کا جوش عقیدت جو نہایت سچائی کے ساتھ رسول خدا اور دین اسلام کے بارے میں عقیدتمندانہ اظہار خیال کیا ہے، پھر ایک جگہ پردہ دنیا والوں کو کس طرح دین اسلام کی خوبیاں بتاتے ہوئے اسلام کی طرف رجوع کرتا ہے۔

"میرے خیال میں دین اسلام، نصرانیت کی ایک قسم ہے اور اس میں مسیحیت کے بجائے روحانیت کے شریف اور اعلیٰ معانی موجود ہیں لہذا دوستو! اسلام کا درجہ پہچانو اور اس کے حق میں کچھ کمی نہ کرو . . . . . یہ ایک ایسا دین ہے کہ جس پر لوگ دل کی گہرائیوں سے ایمان لاتے تھے"
اس کتاب کی عبارت آسان اور شستہ ہے ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے۔ ع۔ ج

جواہر العلوم :۔ [illegible] طباعت عمدہ [illegible] مولانا عبدالرحیم صاحب [illegible] اسلامیہ کالج [illegible]

اردو میں کیا ہے، صفحہ ۲۱۶۔ قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ کتابستان، پوسٹ بکس نمبر ۲۱۶۴ بمبئی نمبر ۳

یہ کتاب بہت دلچسپ قصہ اور مکالمہ کی صورت میں لکھی گئی ہے اس کی عبارت بہت سلیس، عام فہم اور بامحاورہ ہے۔ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں زمین کے عجائبات کا ذکر ہے جس میں مصنف نے اپنے تجربہ اور دوسروں کی تحقیق سے ایسے ایسے عجائبات عالم کا ذکر کیا ہے جس سے ابتک اکثر لوگ ناواقف ہونگے۔ دوسرے باب میں علویات، یعنے آسمان کے عجائبات کا ذکر ہے جس میں آسمان کے فوائد اور منافع کا بیان ہے۔ اس میں مسائل ہیئت متقدمین اور متاخرین کا اختلاف اور دوران ارض کی بحث، الغرض تمام مشکل مسائل کو نہایت آسان طریقہ پر بیان کیا گیا ہے

تیسرے باب میں وہ سب قرآن پاک کی آیتیں جن کا تعلق ان سب مباحث سے ہے نہایت واضح طور پر پیش کی گئی ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے بہت ساری مفید اور دلچسپ باتیں معلوم ہونگی، یہ کتاب عورتوں اور بچوں کے لیے مفید ہے

"ع۔ ج"

فلمستان

جھولا ——— ایک "نقاد" کی نظر میں

یہ بمبئی ٹاکی کی پیشکش ہے، اس میں آشوک کمار، لیلا چٹنس، شاہ نواز، ڈی، ایچ، ڈیسائی، ممتاز علی کرونا دیوی، شہزادی راجکماری شکلا، نے اداکاری کے فرائض انجام دیئے ہیں، یہ اداکاران بلاشبہ اچھے ہیں، اور انہیں جو کردار سپرد کیا گیا تھا اسے حسن وخوبی سے انجام دیا ہے، لیلا چٹنس نے ہیروئن (کگیتا) کا پارٹ کیا ہے، اور واقعہ ہے کہ بڑی خوبصورتی سے کیا ہے، خوبصورتی اسلیے کہ اگر چہ وہ اب شباب کی منزل سے گذر چکی ہے، لیکن اس کے باوجود اس نے ایک الھڑ حسینہ کا جو پارٹ انجام دیا، وہ سچ تو یہ ہے کہ اسی کا حصہ ہے، اسی طرح دیگر اداکاروں نے بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی،

جہاں تک کردار کا تعلق ہے، فلم نہایت کامیاب ہے مگر جہاں تک اسٹوری کا تعلق ہے، صد درجہ فرسودہ، ناقص، اور ناکامیاب ہے، اول تو اسٹوری سے کوئی نتیجہ خیز مقصد نہیں نکلتا، دوئم اسٹوری کی ترتیب کچھ اس نوع سے رکھی گئی ہے کہ بات سے بات نکلتی ہوئی نہیں معلوم ہوئی، بلکہ نکالی ہوئی معلوم ہوتی ہے، اسٹوری میں فن کی بہ نسبت عوام کے رجحان اور پسند کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے اور یہی سب سے بڑی وجہ اس کی فرسودگی اور لغویت کی ہے

دوسری بات یہ ہے کہ اس کمپنی کی تمام اسٹوریاں کم وبیش ایک ہی محور کے گرد گھومتی نظر آتی ہیں، صرف ذرا سے ردو بدل کے ساتھ بمبئی ٹاکی کی تمام اسٹوریاں فن اور مقصد کے لحاظ سے ایک ہی ہیں۔

گانے میں کوئی دلکشی نہیں، دھن بھی اچھے نہیں، اور اس کا تو ذکر فضول ہے کہ اس میں آرٹ اور فن کا لحاظ رکھا گیا ہو، سین سینری کے لحاظ سے بھی یہ کوئی کامیاب فلم نہیں کہا جا سکتا۔

ع ج

RED. No. C. 2535

JADIDURDU
36, MARSDEN ST. CALCUTTA

قواعد و ضوابط

۱ - رسالہ ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو شایع ہوا کریگا خریداروں کو چاہئے کہ رسالہ ۱۵ تاریخ تک نہ ملنے پر دفتر سے طلب کریں۔

۲ - اہلِ قلم حضرات سے درخواست ہے کہ وہ مضامین مہینے کی ۱۵ تاریخ تک ایڈیٹر کے نام بھیجدیں

۳ - مضامین صاف اور شستہ تحریر ہوں۔

۴ - وہی مضمون پرچہ میں شایع ہوسکتا ہے جو معیار ادب و اخلاق سے گرا نہ ہو۔

۵ - دل آزار و فرقہ دارانہ مضامین نیز سیاسی مضامین شایع کرنا پرچہ کی پالیسی کے خلاف ہے۔

۶ - نمونہ کا پرچہ مفت نہیں بلکہ ۲ر کا ٹکٹ آنے پر بھیجا جائیگا۔

۷ - جواب کے لئے جوابی کارڈ یا اسٹامپ کا آنا ضروری ہے۔

۸ - خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :- منیجر جدید اردو ۳۶ مارسڈن اسٹریٹ کلکتہ

۹ - کاروباری حضرات اشتہار کے لئے منیجر سے خط و کتابت کریں

۱۰ - سالانہ چندہ صرف دو روپیہ (عہ) غیر ملک کے لئے [illegible]

اے جلیل - منیجر جدید اردو نمبر ۳۶ مارسڈن اسٹریٹ کلکتہ

مشرقی ہند کا علمی ادبی ماہنامہ

تین آنہ فی پرچہ

دو روپے قیمت سالانہ

مدیر مسؤل
پرویز شاہدی
مدیر اعزازی
ایم ظہور احسن قاطمی

جدید اردو کلکتہ

اگست سنہ ۴۲ء

چندہ سالانہ دو روپیہ
،، ششماہی ایک روپیہ چار آنہ
فی پرچہ تین آنہ
غیر ممالک کیلئے ۵ شلنگ

جلد ۵ — نمبر ۸

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر عبدالجلیل نے مطبع ہند میں چھپوا کر ۳۶ مارسڈن اسٹریٹ کلکتہ سے شائع کیا

نکٹائی مارکہ زردہ

ہندوستان بھر میں اپنی خصوصیت کے اعتبار سے بے نظیر ہے۔ اعلیٰ درجے کے تمباکو سے ماہرین کیمیا اور خود مالک کارخانہ کی نگرانی میں یہ زردہ تیار کیا جاتا ہے۔ جس محنت اور احتیاط سے یہ زردہ تیار کیا جاتا ہے ان کی صحت و کامیابی تجربہ سے ثابت ہو چکی ہے۔ یہ زردہ تمام اجزا سے پاک ہے جس صفائی اور ستھرائی سے یہ زردہ تیار کیا جاتا ہے اس کی بنا پر مالک کارخانہ کی طرف سے اس بات کی ضمانت پیش کی جاتی ہے بوتلوں اور خوبصورت ڈبوں اور ٹکسوں میں آپ کے لیے حاضر ہے

نکٹائی مارکہ زردہ نکٹائی مارکہ کارخانے کی بے مثل و بے نظیر و دیگر چیزوں کی طرح نکٹائی مارکہ مشکی قوام بھی اپنی آپ نظیر ہے اس قوام میں بہترین اور مفید ترین اجزا کے علاوہ مشک خالص اور زعفران کا حصہ غالب ہے۔ گلاب اور کیوڑہ کے عرق میں اس کا قوام تیار کیا جاتا ہے، نہایت خوش ذائقہ اور خوشبودار، دل و دماغ کو فرحت بخشتا ہے۔ پان کھانے والوں کو خصوصیت سے فائدہ پہنچاتا ہے۔ نفاست پسند طبیعتوں کے لیے بہترین تحفہ ہے۔ یہ قوام در اصل ایک طرح کا ایک معجون ہے ایکبار آزمائش کیجئے اس کی تمام خوبیاں آپ پر روشن ہو جائیں گی۔ پھر یہ معجون برابر آپ کا ہمدم و دمساز بنا رہیگا اور لطف یہ کہ کم خرچ بالانشیں۔ ولایتی شیشیوں میں جدید ترین مشینری کے ذریعہ بند کیا جاتا ہے ممکن نہیں کہ خرابی آجائے۔ جن اجزا سے یہ قوام تیار کیا جاتا ہے وہ تمام پاک اور صاف چیزیں ہیں اس لیے ہر مذہب و ملت کا آدمی نکٹائی مارکہ قوام بے تکلف استعمال کر سکتا ہے۔

کیسر بلاس پان کی نہایت خوشبودار، خوش رنگ، بے انتہا لذیذ، بے حد مزیدار مسالہ ہے۔ ہمارے کارخانہ کی خاص ایجاد ہے جو علم سائنس کے ذریعہ اور ان کے اصولوں کو مدنظر رکھ کر تیار کیا جاتا ہے۔ کیسر بلاس معدہ کی تمام شکایتوں کو دور کرتا ہے دل اور دماغ کو فرحت بخشتا ہے۔ آپ پان کھاتے ہوں تو کیسر بلاس ضرور استعمال کریں۔ اس لیے کہ بازار کا کوئی مسالہ ہمارے کیسر بلاس کی لذت اور خوشبو اور ذائقہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسے نہایت عمدہ شیشیوں میں خوبصورت لیبل سے آراستہ کر کے اس طرح پیک کیا جاتا ہے کہ کوئی چیز ہاتھ سے مس نہیں ہوتا۔ یہ وہ مسالہ ہے جس نے قلیل عرصہ میں دنیا کے تمام مسالوں میں ہلچل ڈالدیا ہے۔ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اس کی مانگ بجلی کی رفتار کی طرح بڑھتی جا رہی ہے۔ اس مسالہ میں اتنی خوبیاں ہیں جو بیان نہیں ہو سکتیں۔

محمد مصطفیٰ حسین مالک کارخانہ نکٹائی مارکہ زردہ نمبر ۱۴۱ ہوڑہ روڈ ہوڑہ کلکتہ

شاخیں

نمبر ۵ کلایو اسٹریٹ کلکتہ۔ نمبر ۱۱۔ آرسکن روڈ بمبئی نمبر ۱/۵۔ کیننگ اسٹریٹ۔ کلکتہ

شذرات

دوسرے محاذ جنگ کی ضرورت :۔ گذشتہ شدتِ سرما میں جرمنوں کو اپنی دیوانگی اور سفاکی کی جو قیمت ادا کرنی پڑی ہے وہ ارباب سیاست سے پوشیدہ نہیں۔ تہربانِ المانیہ نے اپنے بندگان سادہ لوح کو یقین دلایا تھا کہ جاڑا ختم ہوتے ہی وہ روس سے انتقام لے لیگا، ایک ایسا انتقام جو روس کو ہمیشہ کے لیے تباہ کردے۔ سرما کا کاروانِ ژالہ و برف رخصت ہو چکا لیکن اب تک رہبر ہلاکت کا قدم اس منزل کے قریب بھی نہ پہنچ سکا جس کا مہینوں سے وعدہ کیا جا رہا تھا۔ روس کی قومی عظمت و آزادی کا پھول اس آگ کی بہار اور بموں کی برسات میں اور بھی شگفتہ نظر آرہا ہے۔ سموم شیطنت کے طمانچوں سے انسانیت کے معصوم رخسار لال تو ضرور ہوجاتے ہیں لیکن اس سرخی میں غیرت اور جوشِ انتقام کا رنگ بھی جھلکنے لگتا ہے۔ جرمنی کے "بہاری حملے" اب تک آزادیِ روس کے گل شاداب کو شدت مظالم کے باوجود پامال نہ کرسکے۔ ہر چند فسطائی درندوں کی انسانیت کُش اور خونخوارانہ دیوانگی سے انسانیت اور مساوات کے علمبردار روس کو بڑے بڑے نقصان اٹھانے پڑے۔ اور اب تک پڑ رہے ہیں، ہر چند نازی ڈاکوؤں کی بیدردی اور سفاکی سے روس کا شیرازہ کافی حد تک پراگندہ ہوا اور اب تک ہو رہا ہے، پھر بھی لینن کا بخشا ہوا عزم راسخ اور اسٹالن کی پالی ہوئی غیرت قومی اسے دشمنوں کے سامنے کسی حالت میں بھی جھکنے نہ دے گی۔ اس میں شک نہیں کہ روسی لشکر کو بعض بعض محاذوں سے پیچھے ہٹ جانا پڑ رہا ہے، بعض بعض مقاموں پر فوج غنیم کی اکثریت نے ان محافظان آزادی و مساوات کو لوٹ جانے پر مجبور کیا ہے اور کر رہے ہیں، پھر بھی یہ دشمنوں کی عارضی کامیابی جانبازانِ روس کے ارادوں کو متزلزل نہیں کرسکتی۔ اُن کی آتشِ انتقام بڑی شدت کے ساتھ دہک رہی ہے اور دہکتی رہیگی۔ اس جنگ کے سلسلے میں ایک بھی روسی کا نام سننے میں نہیں آتا جس نے اپنے ملک و قوم کے ساتھ غداری کی ہو۔ وطن کے لیے مرمٹنے کی مثالیں تو روز ہی نظر آرہی ہیں۔ اتنا مکمل اتحاد اور اتنی عظیم الشان وطن پرستی اپنی نظیر آپ ہیں۔ انھیں حالات کے مطالعے کے بعد ارباب نظر کو اس فیصلہ پر پہنچنا پڑا کہ روس سے کوئی اُس کی آزادی نہیں چھین سکتا اور جرمنی کو اپنی وقتی کامیابیوں کی قیمت آخر میں پائی پائی اور کوڑی کوڑی ادا کرنی پڑے گی۔

ہر چند روس کی فتح ایک متوقع چیز ہے پھر بھی جرمنوں کے بہیمانہ حملوں کی شدت سے تنگ آکر قائدین روس کو دوسرا محاذ جنگ قائم کرنے کے لیے اتحادیوں کو آمادہ کرنا پڑ رہا ہے۔ اگر اتحادیوں نے یورپ میں ایک اور محاذ جنگ جرمنی کے خلاف قائم کرلیا تو پھر دیوانہ المانی، کو کسی اور فصد کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ اس مسئلہ پر اتحادیوں کا دماغ صرف غور ہی نہیں کر رہا ہے بلکہ عمل کے قدم بھی اٹھ رہے ہیں۔ خدا کرے جلد ہی کوئی عملی صورت ظہور پذیر ہو۔

اگر دوسرا محاذ جنگ قائم نہ ہوسکا تو غریب روس کو بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جرمنی کا سارا زور اسی پر صرف ہوگا اور دشمن انسانیت کی وہ ساری طاقت جو اس نے کمزور ملکوں کو تباہ کرکے اپنے اندر پیدا کی ہے پوری شدت کے ساتھ روس کی بربادی اور غارتگری میں کام آئیگی۔ ان حالات میں روس کے لیے مقابلہ کرنا ایک عقدہ دشوار بنا رہیگا۔ ہر چند اتحادیوں کا مدد روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے پھر بھی روس کی نجات کے لیے یہ چیز کافی نہیں۔ اس وقت روس کی آزادی اور کامیابی سے ساری دنیا کی امیدیں وابستہ ہیں، اسی کی فتح پر محوری طاقتوں کی شکست منحصر نظر آتی ہے۔ ان حالات میں یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اتحادیوں کو ماہرین سیاست اور ارباب حل وعقد اس مسئلہ کے ساتھ اُسی خلوص اور انصاف کے ساتھ کام لیں گے جس کا یہ مستحق ہے۔

پرویز شاہدی

مطالعہ شباب

محبت اے جوانو بحث میں لائی نہیں جاتی
سمجھ لینے کی ہے یہ بات سمجھائی نہیں جاتی

کبھی اک خاص رستے سے یہ ہرجائی نہیں جاتی
نگاہِ شوق منزل میں بھی ٹھہرائی نہیں جاتی

جوانی میں نظر کو راہ دکھلائی نہیں جاتی
یہ ظالم خود بہک جاتی ہے بہکائی نہیں جاتی

جوانی خود خمستانِ شرابِ کیف پرور ہے
یہاں اک بوند بھی باہر سے منگوائی نہیں جاتی

شباب اُن کا ہے طالب مجھ سے سوگندِ محبت کا
مگر مجھ سے جوانی کی قسم کھائی نہیں جاتی

جوانی کی وفا رنگین شیشوں کی عمارت ہے
یہ خود ہی وقت سے ڈھے جاتی ہے ڈھائی نہیں جاتی

شباب اندھی محبت میں دکھاتا ہے چمک اپنی
نظر ہوتی ہے لیکن کام میں لائی نہیں جاتی

محبت عہدِ برنائی میں چھپ کر رہ نہیں سکتی
یہ بجلی خود تڑپ جاتی ہے تڑپائی نہیں جاتی

ہوا کرتے ہیں ہم آہنگ دو دل نوجوانی میں
یہ پہنچ جاتی ہے خود آواز پہنچائی نہیں جاتی

محبت کی بصیرت کھو گئی جلووں کی کثرت میں
یہ عالم ہے کہ اب اپنی نظر پائی نہیں جاتی

بھٹکنے دو جوانی کو بھٹک کر خود سمجھ لے گی
نصیحت سے یہ ضدی راہ پر لائی نہیں جاتی

جوانی ہے وہ دیوانی جو تا یعاد نادانی
خرد کی جھڑکیوں سے ہوش میں لائی نہیں جاتی

شباب اور معتدل بن کر رہے اچھی کہی ناصح
تری باتوں میں کچھ بھی زندگی پائی نہیں جاتی

جوانی اور توفیقِ گنہ گاری ارے توبہ
یہ وہ نعمت ہے اے زاہد جو ٹھکرائی نہیں جاتی

جوانی کی امنگوں میں ہے باقی آج تک شوخی
جبھی پرویز میں سنجیدگی پائی نہیں جاتی

پرویز شاہدی

رفتارِ وقت

مشرق بعید:- ۲۳- مارچ ۱۹۴۲ء کو جزائر انڈمان (کالا پانی) پر جاپانی فوجوں کا قبضہ ہوگیا۔ اس جزیرہ میں ۸۵ سزا یافتہ اشخاص تھے جن میں سے اس وقت صرف ۱۵۰ جیل میں تھے

۲۶- مارچ کو اتحادی (چینی) فوجیں ٹونگو (برما) میں محصور ہوگئیں ٹونگو مانڈلے سے ۲۰۰ میل جنوب میں واقع ہے، امدادی فوجیں بھیجی گئی تھیں لیکن یکم اپریل تک اس پر جاپانیوں کا قبضہ ہوگیا۔

۲- اپریل کو جاپانی فوجوں نے برما کے مغربی ساحل یعنی بندرگاہ اکیاب پر بھی قبضہ کرلیا لیکن انگریزی فوجوں نے اس سے قبل وہاں کے ہوائی اڈے اور دوسری کام کی چیزوں کو برباد کردیا۔

۵- اپریل کو چند جاپانی طیارہ بردار جہاز "سیلون" کے قریب پہنچ کر ہوائی جہاز کے ذریعہ کالمبو اور ٹرنکومالی پر زبردست حملے کیے۔ ان دونوں مقامات کو شدید نقصانات پہنچے، اور دو برطانوی کروزر (ہر ایک کا وزن دس ہزار ٹن) تھا اور ایک طیارہ بردار "ہرمس" نامی جس کا وزن بھی دس ہزار ٹن تھا سمندر میں غرق ہوگیا، ان سب میں سے گیارہ سو آدمی کسی طرح زندہ بچائے جاسکے۔

؟ ۷- اپریل کو چند جاپانی طیاروں نے ہندوستان کے مشرقی ساحل وزیگاپٹم اور کوکناڈا پر بم برسائے جس سے معمولی قسم کا نقصان پہنچا۔

۸- اپریل کو جزیرہ مانوس (مجمع الجزائر نیوگنی کے شمال میں) جاپانیوں کا قبضہ ہوگیا۔

۹- اپریل کو سیبو اور بتان (جزیرہ فلپائن) پر بھی قبضہ جاپانی فوجوں کا ہوگیا، جہاں تقریباً ساٹھ ہزار اتحادی فوجیں اور دیگر اشخاص گرفتار ہوئے۔

اسی تاریخ کے درمیان برما میں تین مقامات پر زبردست جنگ شروع ہوگئی (۱) دریائے اراودی کے کنارے "میگوے" کے نزدیک (۲) برما ریلوے لائن کے کنارے "تایو ہلا" کے پاس (۳) "تساون" کے علاقہ میں موچی کے نزدیک۔

۱۱- اپریل کو جاپانی فوجوں [illegible]

کی جانب مقام "یاوو" پر قبضہ کرلیا تھا، اس کے بعد "میکھو" کی طرف بڑھے

۱۷- اپریل کو جاپانی فوجوں نے "میکھو" پر قبضہ کرلیا۔ اس مقام سے ۴۲ میل شمال کی جانب "ینانگ یونگ" میں تیل کا ایک بڑا چشمہ تھا، جو کہ چین اور ہندوستان دونوں کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا، اس چشمہ سے تقریباً ہر ماہ دس لاکھ گیلن تیل برآمد کیا جاتا تھا۔ اس چشمہ کو اتحادی فوجوں نے برباد کردیا تاکہ دشمن اس سے فائدہ حاصل نہ کرسکے۔

برما:- یکم مئی:- اتحادی (چینی) افواج نے مانڈلے کا تخلیہ کردیا۔ آج ہی کی تاریخ لیشیو (Lashio) پر بھی جاپانیوں کا قبضہ ہوگیا، اور آج تاریخ سے برما میں اتحادیوں نے ہر قسم مدافعت بھی بند کردی اور جاپانی فوجیں تین راستوں سے بتدریج آگے کی طرف بڑھیں اور اتحادی فوجیں پیچھے ہٹنے لگیں (۱) دریائے چندوین کے کنارے کنارے ہندوستانی سرحد کی طرف اس محاذ پر زیادہ تر برطانوی فوجیں تھیں (۲) دریائے اراودی ریلوے لائن کے کنارے کنارے مٹکینیا (MYITKYNIA) کی طرف (۳) "لیشیو روڈ" کی طرف سے چینی سرحد کی طرف۔

۵ مئی کو جاپانی فوجیں سرحد برما کو عبور کرکے چین میں داخل ہوگئیں

۹ مئی بروز شنبہ:- برما کی جنگ ختم ہوگئی، یعنی اتحادی فوجوں نے مدافعت بند کردی

؟ ۸- مئی کو جاپانی طیاروں نے پھر ہندوستان (چٹاگانگ) پر بمباری کی جس سے خفیف سا نقصان ہوا۔

تاپان میں جو میتک ہیگلکور ریلوے کے کنارے ایک اہم مقام ہے۔ سات ہزار چینی سپاہی جو جاپانیوں کے طرفدار تھے ان کا ساتھ چھوڑ کر چینی قومی حکومت کے ساتھ ہوگئے۔

۱۱- مئی کو جاپانی فوج نے بھامو اور مٹکینا پر قبضہ کرلیا۔

۱۵- مئی تک برطانوی فوجیں نہایت بہتر حالت میں اپنے کو برما سے نکال کر ہندوستان آگئیں۔ اور اب ہندوستان اور برما [illegible]

رفتہ رفتہ اور بھی اس کو مضبوط بنایا جا رہا ہے اور اب تک برما کے ہندوستانی باشندوں کا ۸۰ فیصدی حصہ ہندوستان آگیا ہے ماہ مئی کے تیسرے ہفتہ تک تقریباً ۹ لاکھ ہندوستانی اپنے وطن پہنچ گئے، ممکن ہے تقریباً تین لاکھ یا اس سے کچھ زیادہ وہاں رہ گئے ہوں۔

۱۶۔ مئی تک جاپانی فوجیں چینی حدود میں "چادشی" کی طرف سو میل تک بڑھتی چلی آئیں، لیکن چینی فوجوں نے پھر انہیں پسپا کرنا شروع کر دیا، مئی کے آخر ہفتہ تک چین کے صوبہ چیکیانگ اور یونن میں طرفین کے درمیان زبردست جنگ شروع ہوگئی

۲۷۔ مئی کو ایک لاکھ جاپانی فوجوں نے ملکر چیکیانگ کے صدر مقام کنوا پر قبضہ کرلیا۔

شاہ برطانیہ نے مارشل چیانگ کائی شیک کو (۲۴ اپریل کو) جی۔ سی۔ او۔ جی کا اعلیٰ فوجی خطاب عطا کیا ہے۔

۸۔ مئی سے بحیرہ کورل میں اسٹریلیا اور جزائر سولمن کے درمیان اتحادی اور جاپانی بیڑے میں زبردست بحری جنگ شروع ہوگئی

یکم جون کو مارشل چیانگ کائی شیک نے ریاستہائے متحدہ کو مخاطب کرتے ہوئے براڈکاسٹ کیا ہے۔ کہ اگر امریکہ اپنے تیار کردہ سامان جنگ کا صرف دس فیصدی حصہ اگر چین کو دیدے تو چینی فوجیں اسے سو فیصدی منافع پہنچانے کو تیار ہیں، اگر حصول فتحیابی کا عزم ہے تو ہمت استقلال اور فراخدلی کے ساتھ میکانیکی سامان جنگ سے چینی فوجوں کی اعانت لازم ہے۔ پھر آگے چل کر مارشل نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ آخری فتح ہماری ہے اور چینی فوجیں ہر قیمت پر مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ہر سننے والے کو اس بات پر یقین کرلینا چاہیے کہ چینی باشندوں کو اس بات پر پورا وثوق ہے کہ وہ اصول جو اطلانتک چارٹر میں قلمبند کیے گئے ہیں وہ صرف سیاسی چاپلوسیاں نہیں ہیں۔

۶ رجون کو جاپانی فوجوں نے جزیرہ "مگ وے" پر حملہ کیا تھا، لیکن ان کا ایک بہت بڑا طیارہ بردار جہاز اور متعدد دوسر جنگی جہاز برباد کر دیے جس سے وہ پسپا ہو کر بھاگ گئے۔

۷۔ جون۔ چینی علاقہ نوچو اور چینشیں پر جاپانی فوجوں نے قبضہ کرلیا

۹ اور ۱۳۔ جون کے درمیان الاسکا (شمالی امریکہ) کے جزائر الئشین جو ڈچ ہاربر کے قریب ہے جاپانی فوجیں اس میں داخل ہوگئیں۔

۹۔ جون کو برطانوی اور امریکی فضائی دستے چینی فوجوں کی مدد کرنے کے لیے پہنچ گئے

۱۳۔ جون تک جاپانیوں کے ۲۳۲ بحری جہازات غرقاب یا نقصان رسیدہ ہوئے۔ صرف مڈوے کی لڑائی میں چار جاپانی طیارہ بردار جہاز غرق ہوئے اور دس ہزار سپاہی مارے گئے اسی تاریخ کو جنگی محکمہ امریکا نے اعلان کیا ہے کہ جزائر ہوائی کے ایرفورس کا کمانڈر جنرل کلیرنس "ٹینکر" جزیرہ مڈوے کی لڑائی کے بعد سے لاپتہ ہے، اس سے زیادہ تفصیل بتائی نہیں گئی ہے

اسی تاریخ کو چنگ کنگ سے اعلان کیا گیا ہے کہ چینی افواج نے منگل کی آدھی رات کو "چوشن" خالی کر دیا اور انگلن کے شہر کی جنگ میں ہزاروں جاپانی ہلاک ہوئے اور اب جاپانی فوجیں چی کیانگ کے نزدیک بڑے ہوتے رہے ہیں اور دس پر چینیا متحرک دستے صوبہ چیکیانگ کے نزدیک سے حملہ کیا۔ لیکن چینی فوجوں نے ایک اور مقام "یوشان" جو ہوائی اڈے کا بندرگاہ تھا خالی کر دیا ہے۔ صوبہ چیکیانگ میں چینی نے چند شہر جاپانیوں سے واپس لے لیے۔

۱۸۔ جون کو چینی فوجوں نے جاپانیوں سے چنگ شام بھی واپس لے لیا اور ۲۱۔ جون تک مشرقی چین میں جاپانیوں کی پیش رکی رہی

چین کی تین ہزار نایاب اور بیش قیمت کتابیں امریکہ میں محفوظ ہیں، اور اب انتظام یہ کیا جا رہا ہے کہ ان تمام کتابوں کی نقلیں مکروفلم (microfilm) لے لی جائیں۔ ان میں اکثر کتابیں [illegible] اور [illegible] کے درمیان کی مطبوعہ ہیں، اسی کتب خانے میں ایک نظم کی کتاب [illegible] کی مطبوعہ ہے جس کے بارے میں محققین کا خیال ہے کہ اس سے زیادہ قدیم مطبوعہ کتاب دنیا میں موجود نہیں ہے

روس اور جرمن :۔ جرمن فوجوں نے جزیرہ نمائے کریمیا میں زبردست پیمانہ پر جارحانہ کارروائی شروع کر دی ہے

۸ مئی کو جرمن فوجوں نے جزیرہ نمائے کرش پر ہولناک حملہ شروع کر دیا ہے لیکن دوسری طرف روسی مارشل ٹیموشنکو نے پوری طاقت کے ساتھ خارکوف پر حملہ کر دیا اور جرمنوں کے پہلے خط مدافعت کو توڑ دیا۔

۱۶۔ مئی کو کرش میں جرمن فوجیں داخل ہوگئیں اور خارکوف کے محاذ پر روسیوں کو چند دنوں تک نمایاں کامیابی ہوتی رہی۔

۲۳۔ مئی تک روسی فوجوں نے کثیر تعداد میں جرمن فوجوں کو ہلاک اور زخمی کر دیا۔ صرف تین دنوں کی جنگ میں قیاس ہے کہ

۱۵ ہزار جرمن مارے گئے ہونگے۔

۲۴۔ مئی کو روسی فوجوں نے ایک زبردست جنگ کے بعد "کرچ" کا مکمل تخلیہ کردیا۔ لیکن محاذ خارکوف پر طرفین کے درمیان زندگی اور موت کی جنگ شروع ہوگئی

۲۷ مئی کو یہ جنگ سست پڑگئی (غالباً یہاں پر بھی روسیوں کو شکست ہوگئی اور مارشل تیموشنکو زخمی ہوگیا)

۳۔ جون کو خارکوف کے محاذ جنگ (خارکوف سے دکھن) سے خبر آئی ہے کہ روسی سپہ سالار مارشل تیموشنکو ہلاکت سے بال بال بچ گیا، لیکن بری طرح زخمی ہوگیا ہے۔

۱۱۔ جون کو روس اور برطانیہ کے درمیان ایک معاہدہ تکمیل پاگیا ہے جس کی رو سے دونوں نے جنگ میں ایک دوسرے کی امداد عہد و ثوق کیا ہے اور جنگ کے بعد نیا نظام قائم کرنے میں اس کے دو دفعات بہت اہم ہیں (۱) روس اپنے اس عزم بالجزم کا دوبارہ اظہار کرتا ہے کہ ہم کبھی بھی ہٹلر کے زیر اثر جرمن حکومت یا کسی اور جرمنی حکومت کے ساتھ جو متشددانہ اور ناانصافانہ حکمت عملی کو ترک نہ کرے صلح کرنے کو تیار نہ ہونگے اور نہ اقوام متحدہ کے کسی اور دشمن کے ساتھ جداگانہ صلح کرینگے

(۲) دونوں حکومتیں جنگ کے بعد یورپ اور دوسرے ممالک کی ان اصول کے ماتحت جو اطلانتک چارٹر میں منضبط ہیں نئی تعمیر میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرینگی (۳) اگر معاہدے کی تجدید نہ کی گئی تو یہ معاہدہ بیس سال تک قائم رہے گا۔

۱۳۔ جون تک سیباستوپول (کریمیا) کی جنگ میں ۶۰ ہزار جرمن ہلاک ہوگئے لیکن اب تک ان کا پوزیشن برقرار ہے۔

۱۹۔ جون تک خارکوف کی جنگ نہایت ہولناکی کے ساتھ جاری تھی اور جرمن سپہ سالار نے اس علاقہ کی تمام محفوظ فوجوں کو بھی صف میں لاکھڑا کردیا تھا۔

۲۴۔ جون سے روسیوں نے سیباستوپول کا تخلیہ شروع کردیا۔

لندن ۲۳۔ جون۔ ماسکو ریڈیو نے روس کے محکمہ اطلاعات کے حوالے سے اعلان کیا ہے کہ ایک سال کی لڑائی میں جرمنوں کو تقریباً ایک کرور آدمیوں سے ہاتھ دھونا پڑا ہے ان کے مقابلہ میں روس کے ۴۵ لاکھ آدمی کام آئے۔ اسی عرصہ میں جرمنی کی ۳۰ ہزار توپیں برباد ہوگئیں اور روس کی ۲۲ ہزار۔ جرمنی کے ۱۴ ہزار ٹینک اور روس کے ۱۵ ہزار۔ جرمنی کے بیس ہزار اور روس کے ۹ ہزار ہوائی جہاز برباد ہوئے۔

افریقہ :۔ لیبیا میں دو نئے جرمن جرنیلوں کی آمد سے محوری فوجیں زبردست پیمانے پر آگے بڑھنے کی طیاریاں کرنے لگیں۔

مئی کے آخری ہفتہ سے طرفین میں گھمسان کی لڑائی شروع ہوگئی۔ یہ جنگ ٹینکوں اور آہن پوش گاڑیوں کی زبردست جنگ ہے۔

لیبیا کے مقام "نائٹ برج" میں چار دنوں کی ہولناک ٹینکوں کی جنگ کے بعد اتحادیوں کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اور طبروق خطرے سے نکل آیا۔ لیکن ۴۔ جون کو پھر محوری فوجوں نے بیر حکیم پر تازہ دم حملہ شروع کردیا۔

۶۔ جون سے برطانوی فوجوں نے بھی جوابی حملے شروع کردیئے

۱۱۔ جون کو بیر حکیم پر محوری فوجوں کا قبضہ ہوگیا

۱۴۔ جون تک جنگ کا آدور طبروق سے ۴۰ میل کے فاصلہ پر تھا۔

۱۶۔ جون تک برطانوی فوجیں اس مقام سے جو غزالہ کے دکھن میں طبروق سے ۴۰ میل پچھم تھا، ہٹ گئیں۔

۱۹۔ جون کو طبروق پھر دشمنوں کے نرغہ میں آگیا۔

۲۰۔ جون کو وہاں نازک صورت حال پیدا ہوگئی۔

۲۴۔ جون کو طبروق پر محوری فوجوں کا دوبارہ قبضہ ہوگیا۔

ہندوستان

۳۰۔ مارچ کو سر اسٹافورڈ کرپس "لارڈ پریوی سیل حکومت برطانیہ" نے وہ تجاویز جو ملک معظم کی حکومت نے ہندوستان کے موجودہ سیاسی تعطل کو دور کرنے اور ان کو شریک جنگ بنانے کے لیے منظور کرکے "سر" موصوف کے حوالہ کیا تھا، وہ شائع کردی گئی ہے، جس کے اہم نکات یہ ہیں۔

(۱) ان تجاویز کا مقصد یہ ہے کہ ایک نیا ہندوستانی یونین قائم کیا جائے جس کی حیثیت ایک ایسے ڈومینین کی ہو جو سلطنت متحدہ اور دوسری ڈومینینوں سے اس بنا پر متحد ہو کہ وہ تاج برطانیہ کی وفاداری کا مشترکہ حلف اٹھائیں۔ لیکن ہر حال میں ان کے مساوی ہو اور کسی حال میں بھی کسی کے ماتحت نہ ہو اندرونی اور بیرونی معاملات کے اعتبار سے۔

(۲) جنگ کے خاتمہ کے بعد فوراً ہندوستانیوں کی ایک جماعت جو مندرجہ ذیل طریقہ پر منتخب کی جائے ہندوستان کے لیے آئندہ دستور اساسی مرتب کرنے کے لیے مقرر کردی جائیگی۔

۳- دیسی ریاستوں کو بھی اس دستور کی ترتیب میں شرکت کا موقعہ دیا جائیگا۔

۴- ملک معظم کی حکومت مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ اس طرح سے مرتب شدہ دستور اساسی کو منظور و نافذ کرنے کا عہد کرتی ہے۔

(الف) اگر برطانوی ہند کا کوئی صوبہ اس طرح مرتب شدہ دستور کو قبول نہ کرے اور اپنے سابق حاصل کردہ حیثیت پر قائم رہنا چاہے تو اس کو اس کی اجازت دیجائیگی، مگر اسے یہ حق حاصل رہیگا کہ وہ جب چاہے اس دستور کو قبول کرے۔ ایسے صوبوں کو بھی اگر وہ خواہش کریں تو ملک معظم کی حکومت مجوزہ انڈین یونین کے مساوی ایک دستور عطا کریگی جس کی ترتیب اُسی قاعدہ کے مطابق ہوگی جس طرح اصل انڈین یونین کی۔

(ب) ملک معظم کی حکومت اور دستور ساز جماعت کے درمیان ایک معاہدہ ہو جائیگا، اس معاہدہ میں وہ تمام ضروری امور مندرج ہونگے جو برطانویوں کے ہاتھوں سے ہندستانیوں کے ہاتھوں میں اختیارات کی کامل تفویض کی بنا پر پیدا ہونگے جن کا ان ذمہ داریوں کی بنا پر جو ملک معظم کی حکومت نے نسلی اور مذہبی اقلیتوں کے لیے اپنے سر لی ہیں مندرج ہونا ضروری ہے لیکن اس بنا پر انڈین یونین کے اختیارات محدود نہ ہونگے جو کہ وہ دولت مشترکہ برطانیہ کی دوسری شریک اور ریاستوں سے آئندہ جس قسم کے تعلقات رکھنا چاہیں رکھیں

اگر کوئی انڈین اسٹیٹ دستور کو قبول یا نہیں قبول کرے تو معاہدہ کی تجدید کرنی پڑے گی (اگر ضرورت لاحق ہو)

(ج) دستور ساز جماعت مندرجہ ذیل طریقہ سے منتخب ہوگی لیکن اگر ہندوستان کی بڑی بڑی سیاسی جماعتیں اگر کسی دوسرے پر رضامند ہو جائیں تو یہ طریقہ بدلا جاسکتا ہے۔

جنگ کے اختتام کے بعد فی الفور صوبائی مجالس مقننہ کا نیا انتخاب عمل میں آئیگا۔ اور تمام منتخب اراکین جن کی تعداد ۱۶۰۰ ہوتی ہے ایک جگہ بیٹھ کر اپنی جماعت سے دس فیصدی (۱۶۰) اراکین کا انتخاب کریں گے، یہی (۱۶۰) اراکین کی جماعت دستور ساز جماعت کہلائیگی۔

دیسی ریاستیں بھی اپنی آبادی کے تناسب سے اپنے نمائندے بھیجے گی جن کے اختیارات برطانوی ہند کے نمائندوں کے مساوی ہونگے

(د) موجودہ تشویشناک زمانہ میں جب تک نیا دستور مرتب نہ ہو جائے ہندوستان کی مدافعت کی تمام ذمہ داریاں ملک معظم کی حکومت کے کاندھوں پر ہونگی۔ لیکن ہندستان کے تمام جنگی مادی اور اخلاقی ذرائع کی فراہمی اور تحصیل حکومت ہند کے سر عائد ہوگی جس میں ہندوستانیوں کو بھی ہاتھ بٹانا ہوگا۔ ہندستان کی بڑی بڑی سیاسی جماعتوں سے ملک معظم کی حکومت خواہش کرتی ہے اور انہیں دعوت دیتی ہے کہ وہ فی الفور اور موثر طریقہ سے اپنے وطن دولت مشترکہ برطانیہ اور اتحادیوں کے جنگی مشاورتی کمیٹی میں بھی شرکت کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ کیونکہ موجودہ جنگ کی فتح ہی پر ہندوستان کی آئندہ آزادی کا دارومدار ہے۔

اس برطانوی پیش کش کو ہندستانیوں نے (کانگریس و مسلم لیگ) بالاتفاق نامنظور کر دیا۔ انہیں اُن تجاویز پر جو آئندہ کے لیے ہیں اتنا شدید اعتراض نہ تھا اور ممکن تھا کہ بعض ترمیمات کے ساتھ وہ انہیں منظور کر لیتے، لیکن موجودہ حالات کے متعلق جو تجاویز پیش کی گئیں اس سے ہندستانی رضامند نہ ہو سکے۔ سب سے بڑا سوال مدافعت کی ذمہ داریوں کا تھا۔ جسے ہندستانی اپنے ہاتھوں میں رکھنے کے لیے مصر تھے اور حکومت برطانیہ اپنے ہاتھوں میں رکھنے کے لیے۔ اس پر کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ دوسرا زبردست مطالبہ کانگریس کا تھا وہ یہ کہ عارضی حکومت ہند کی مجلس انتظامیہ کے اراکین مجالس مقننہ کے سامنے جواب دہ ہوں اور وائسرائے یا گورنر جنرل کو ان کے بنائے ہوئے قوانین کو مسترد کرنے کا اختیار نہ ہو۔ اس تجویز کو نہ حکومت برطانیہ اور نہ مسلم لیگ ہی قبول کرنے پر آمادہ تھی اور نہ دوسری اقلیتیں۔

غرض یہ ہے کہ کرپس مشن بظاہر ناکامیاب واپس گیا اور پیش کش واپس لی گئی۔

۱۸- اپریل تک صوبہ بنگال نے ایسٹ انڈیا فنڈ اور دیگر مذہبی پیسی فنڈ میں ایک کروڑ ساڑھے ۱۲ ہزار ۹۹۷ روپیہ تک دیے۔

۱۸- مئی کو ایک زبردست ریلوے حادثہ "اردولال" میں ٹنڈوگرام اسٹیشن کے درمیان کراچی میل کو لاہور جاتے وقت ہوا۔ اس حادثہ کی بنا یہ بیان کیا جاتا ہے کہ حر قوم کے چند ڈاکوؤں نے ریلوے لائن کی پٹری کو اکھاڑ دیا تھا جس کے سبب یہ حادثہ پیش آیا اور ڈاکو بھی اسی مقام پر

تاک میں چھپے بیٹھے تھے کہ گاڑی رکتے ہی مسافروں پر حملہ آور ہو گئے جس سے کہ ۴۲ مسافر ہلاک اور ۳۰ زخمی ہوئے۔ مرنے والوں میں وزیر سندھ سر غلام ہدایت اللہ کے صاحبزادے بھی تھے

ماہ مئی کے اخیر ہفتہ میں جنگی جہازوں کی حفاظت میں بہت سے باربردار جہاز سلامتی کے ساتھ ہندستان پہنچ گئے۔ اتنے بڑے جتھے کے ساتھ اس سے قبل جہازات ہندستان نہیں پہنچے تھے۔ ان سب جہازوں میں ہندستان کی مدافعت کے لیے بے شمار جنگی سامان تھے، اس کے علاوہ اچھی خاصی تعداد میں سپاہی اور آفیسر بھی تھے

۱۲۔ جون کو ہز رائل ہائینس ڈیوک آف گلوسٹر ملک معظم کے چھوٹے بھائی ہندستان پہنچ گئے، اور اسی دن دہلی میں ریڈیو کے ذریعہ ملک معظم کا پیغام ہندستانیوں کے نام سنایا جس کا خلاصہ یہ ہے۔

"مجھے اس خیال سے دلی مسرت ہے کہ میرا بھائی ہندستان کا ملاحظہ کر رہا ہے اس بڑے ملک کا جس کے دیکھنے کی مجھے بہت آرزو تھی مگر نہایت افسوس ہے کہ میں ابھی تک اپنی آرزو پوری نہ کر سکا لیکن میں اس دن کا نہایت شوق و بے چینی کے ساتھ انتظار کر رہا ہوں جبکہ سارے عالم میں پھر امن و امان کا دور دورہ ہو جائیگا میں نے اپنے بھائی کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ میری طرف سے ہندستانی باشندوں اور والیان ملک کے نام خوشدلی اور امید افزائی کا پیغام سنا دے"

(اس کے بعد موجودہ جنگ کے متعلق کچھ اظہار ہے)

ڈیوک ممدوح کی موجودہ سیاحت ہند کا اصلی مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے یہاں کی جنگی طیاریوں کو ملاحظہ فرمائیں یہاں کے فوجی حکام سے تبادلہ خیال کریں اور اپنے قیمتی مشوروں سے انہیں مطلع فرمائیں۔ آپ خود بھی ایک تجربہ کار اور جنگ آزمودہ فوجی جنرل ہیں۔

۱۵۔ جون ڈاکٹر ر گھو بندر راؤ سول ڈیفنس ممبر حکومت ہند نے دہلی میں وفات پائی۔ آپ ناگپور (سی۔ پی) کے کامیاب بیرسٹر تھے ۱۹۲۴ء میں صوبہ متوسط کی مجلس اول کے ممبر منتخب ہوئے۔ آپ سوراج پارٹی کے لیڈر بھی تھے اور دو مرتبہ وزارت کے عہدے پر سرفراز ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں صوبہ متوسط کے قائم مقام گورنر مقرر ہوئے

کالکا روڈ پر ایک ریل موٹر کے رک جانے کا واقعہ اپنی نوعیت کا نہایت تعجب انگیز اور افسوسناک ہوا ہے۔ صرف دو آدمی نے مل کر پورے ٹرین کے مسافر کو پریشان کر دیا، اور چھ آدمی قتل کر دیئے گئے، مقتولین میں سے کچھ فوجی آفیسر بھی تھے پھر ان دونوں ڈاکوؤں نے راہ فرار اختیار کر لیا جس کے سراغ رسانی کے لیے سرکار نے دس ہزار روپیہ کا اعلان کیا ہے جو شخص بھی مجرم کا پتہ لگائے گا اتنی رقم اس کو دی جائے گی۔

۸۔ مئی جمعہ کے روز تیسرے پہر کے وقت جاپانی ہوائی جہازوں نے چٹگاؤں کے علاقہ میں بم گرائے اور ہوائی جہاز کے ذریعہ مشین گنوں سے گولیاں برسائیں۔ جس سے معمولی نقصان ہوا۔ کچھ لوگ مرے اور زخمی ہوئے

دوسرے دن صبح کے وقت پھر اسی مقام پر جاپانی جہازوں نے حملہ کیا۔ ۱۰۔ مئی کو جاپانی ہوائی جہازوں نے مشرقی آسام کے ایک چھوٹے سے قصبہ پر ہوائی حملہ کیا جس سے جانی اور مالی نقصان بہت کم ہوا۔

مشاعرہ:۔ کلکتہ ۵۔ جولائی:۔ بروز اتوار سالانہ مشاعرہ پنجاب مسلم ایسوسی ایشن کا زیر صدارت سر آدم جی حاجی داؤد صاحب اور زیر اہتمام سالک صاحب لکھنوی ایکٹنگ سکریٹری منعقد ہوا۔ مشرق بعید کی عبرت خیز کشمکش جو اثر کلکتہ اور اہل کلکتہ پر پڑا ہے اسے دیکھتے ہوئے مشاعرہ کی کامیابی کی امید نہ تھی۔ مگر ہمیں یہ دیکھ کر انتہائی مسرت ہوئی کہ سالک صاحب نے اپنی انتہائی کوشش سے پنجاب مسلم ایسوسی ایشن کی روایات قدیمہ کو برقرار رکھا۔ اراکین کلب اور شعرائے کرام کافی تعداد میں شریک بزم ہوئے اور ساڑھے گیارہ بجے شب تک کافی رونق اور چہل پہل رہی۔ اس وسیع شہر میں جہاں دیگر اقوام و ملل کے لیے متعدد دلچسپی کے سامان ہیں، وہاں مسلمانوں کی یہ تفریح گاہ بھی قابل فخر ہے۔

مشاعرہ وقت مقررہ پر ٹھیک آٹھ بجے شروع ہو گیا۔ شعرائے کرام میں ساحر بنگالہ خان بہادر حضرت رضا علی وحشت۔ حضرت اسحاق امرتسری پروفیسر حضرت پرویز شاہدی، حضرت قمر صدیقی حضرت پرتو لکھنوی، جناب [illegible] کلیم صاحب، جناب طور صاحب۔ جناب ابراہیم ہوش صاحب، حضرت ناصر سیالکوٹی (شاعر انسانیت) جناب ریاض اشرف صاحب وغیرہ ہم شریک محفل تھے۔ تقریباً ۱۲ بجے محفل برخاست ہوئی۔

آج جبکہ زبان اردو زندگی و موت کی کشمکش سے گذر رہی ہے جبکہ اردو کو نیست نابود کر دینے کی ٹھان لی گئی ہے۔ ہمیں یہ دیکھ کر کسی قدر تسکین ضرور ہوتی ہے کہ ابتک چند ایسی انجمنیں باقی ہیں جو خدمت اردو کو اپنا مقصد زندگی بنائے ہوئے ہیں، چند ایسے درد مند دل ہیں جو اب تک اردو کیلئے دھڑک رہے ہیں! انہیں انجمنوں میں ایک پنجاب مسلم ایسوسی ایشن بھی ہے:

ا ا المخلص

غزل

حسن بتانِ تند خو۔ پر نہ کسی کا آئے دل
تجھ سے خدائے رنگ و بو۔ بس ہے یہی دعائے دل

شانِ خدا ہو جلوہ گر۔ پردے اگر اٹھائے دل
عرش بریں جھکائے سر۔ جلوے اگر دکھائے دل

تجھ میں بھی ہے لگن وہی۔ درد وہی جلن وہی
زخم جگر بتا لگی۔ کب سے تجھے ہوائے دل

وقت سحر وہ گلعذار۔ مرکب ناز پر سوار
نکلے اگر پئے شکار۔ کیسے کوئی بچائے دل

نکھرا ہے اب جہان دل۔ چمکا ہے آسمان دل
پھولا ہے گلستان دل۔ آیا وہ آشنائے دل

توڑے فلک ستم ہزار۔ ڈہائے غضب بھی بے شمار
میں نہ مگر ہوں بیقرار۔ مجھکو نہ گر ستائے دل

مجھکو اے میرے چارہ گر۔ ایسے مرض کی کیا خبر
درد بڑھ آیا تا جگر۔ تو نے جو کی دوائے دل

میں نے یہ کیا غضب کیا۔ بزم سے اس کی اٹھ گیا
یاں سے کہیں نہ جا نہ جا۔ آتی رہی صدائے دل

رکھے قدم سنبھال کے۔ خوب ہی دیکھ بھال کے
دلبر خوش جمال سے پینگ اگر بڑھائے دل

قصہ شب فراق کا۔ دینے لگا انہیں مزہ
کہتے ہیں مجھ سے پھر سنا۔ اپنا وہ ماجرائے دل

اس پہ نہ جاں کرے فدا۔ اس کو نہ دل ہی دے جگہ
یہ تو کہو کرے وہ کیا۔ اس سے نہ جو لگائے دل

تو جو کبھی سرور جاں غصہ ہو مجھ پہ ناگہاں
یہ تو بتا کہ مہرباں۔ کیسے تجھے منائے دل

نکلا اُدھر وہ تند خو۔ پہنچا اِدھر یہ روبرو
ہونے لگی ہے گفتگو۔ آئی نہ ہو قضائے دل

جاتے ہو تم۔ مرتسری پیشِ بتانِ آذری
دل یہ رہے نظر دری۔ دیکھو پھسل نہ جائے دل

محمد صادق مرتسری

ہند اور موسیقی!

تاریخ بتاتی ہے کہ زمانۂ قدیم میں جب کائنات پر تاریکی کے بادل چھائے ہوئے تھے ہندوستان اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ چمک رہا تھا! —— روم و یونان درندوں کے مسکن تھے، فارس کی خاک کسی یزداں کے قدموں سے مس نہ ہوئی تھی، مصر ترقی کی ابتدائی حالت میں تھا!

موسیقی ہند کا قدیم ترین فن ہے۔ شام وید جو تقریباً ۱۵۰۰ ق م مرتب ہوئی تھی اُن روحانی نغموں سے معمور ہے جو قدیم آریا اپنے دیوی دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے گایا کرتے تھے۔ ان نغموں میں وہ کل عناصر موجود تھے جن سے زمانۂ مابعد میں متفرق طرز و ساز وجود میں لائے۔ اشوک اور چندر گپت کا زمانہ (۲۳۲ ق م تا ۳۳۰ء) علم و حرفت کا غیر فانی زمانہ تھا! موسیقی کی دیوی نے بھی اپنی پرانی چادر اتار پھینکی اور ایک نئے مگر سادے لباس میں سامنے آئی۔ اس نئے روپ کو دیکھتے ہی عوام کی نگاہیں بلا ارادہ اٹھ گئیں اور لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ دوربین نگاہوں نے اس سے علمی و اخلاقی کام لینا شروع کیا۔ بلند خیال نوجوان اور شہزادے دربارِ موسیقی سے فیضیاب ہونے لگے۔ اجنتا کی لاثانی مصوری بھی اس اثر سے نہ بچ سکی اور اس کی تصویروں میں بھی جابجا آلات موسیقی جگہ پانے لگے۔ پھر ایک ایسا فرقہ پیدا ہوا جس نے راگ ہی کو عبادت کا بہترین ذریعہ سمجھا اور اس طرح موسیقی ایک پاک اور روحانی شے متصور ہونے لگی۔

ہندوستان میں موسیقی کا جو طریقۂ تقسیم رائج تھا اسے سب سے پہلے یونان نے اپنایا اور ظہورِ مسیح سے دو سو برس قبل تک وہاں کے گیت اسی طریقہ کے پابند رہے۔ پھر ایران و عرب نے بھی یہی روش اختیار کی۔ شروع اہل عرب اپنے نغموں کے لیے کسی خاص نظام کے پابند نہ تھے۔ مگر رفتہ رفتہ وہ بھی اسی طریقۂ تقسیم کے ماتحت آ گئے اور ایک زمانہ تک اسی پر کاربند رہے یہاں تک کہ اسلامی تہذیب نے موسیقی کو ایک مکروہ شے قرار دیدیا

پھر بھی خاندان عباسیہ کی ترقی کا زمانہ علم موسیقی کا سنہرا [illegible] مامون کے دربار کامل فن اور ماہر مغنیوں سے معمور تھے۔ اس فن پر نفیس نفیس کتابیں شائع ہو رہی تھیں اور اُن لوگوں کے بنائے ہوئے قاعدے غیر اقوام و ملل کے لیے معیارِ موسیقی تھے۔ چنانچہ اس فن کے مشہور مصنف فارابی (سال رحلت ۹۵۰ء) نے اپنی مشہور تصنیف "المغنی" اکیس جلدوں میں مکمل کی اور جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آج علم موسیقی پر کسی زبان میں اتنی جامع تصنیف موجود نہیں ہے!

مشہور دھنیں جو دورِ عباسیہ میں رائج تھیں یہ ہیں:۔

(۱) رهاوی —— سورج نکلنے سے قبل

(۲) حسینی —— سورج نکلنے کے بعد

(۳) بزرگ —— نیم شب سے قبل

(۴) نوا —— نغمۂ نیم شبی

(۵) حجازی —— پو پھٹنے سے ایک گھنٹہ قبل۔ وغیرہ وغیرہ

تقریباً ہزار سال قبل جب ہندوستان پر مسلمانوں کے عام حملے شروع ہو گئے تھے، یہاں کی موسیقی پر ایک خاص اثر پڑا مسلمانوں کے میل جول سے جو چند نئی طرزیں بغدادی نوجوانوں کے ساتھ آئیں وہ یہاں کے قدیم سُروں میں اس طرح سما گئیں کہ ہندوستان کی موسیقی کے قدرتاً دو حصے ہو گئے۔ جنوبی ہند جو اسلامی حملوں سے دور تھا اپنے قدیم سُروں پرست رہا لیکن وسط ہند جو متفرق قوموں کا اکھاڑا بن چکا تھا موسیقی کا قدیم دامن چھوڑ بیٹھا اور اس طرح ہندوستانی موسیقی کے دو نمایاں حصے ہو گئے پہلا جنوبی یا کرناٹکی اور دوسرا شمالی یا ہندوستانی!

محمود غزنوی علم و حرفت کا بہت بڑا سرپرست تھا۔ اس کے دربار میں ابو سینا اپنے علم کی وجہ سے ایک بااثر شخص تھا۔ علم موسیقی پر اس کی بھی ایک نایاب تصنیف ہے جس کے بارے میں مسٹر لین پول کہتے ہیں:۔

> "کسی بات پر ناخوش ہو کر محمود نے ابو سینا کو قید کر دیا حالت اسیری میں اس نے ایک کتاب لکھی جس میں سُروں اور تال کا بیان تھا۔ جب محمود کو معلوم ہوا تو اس نے اسے رہا کر دیا تاکہ وہ اپنا کام آزادی سے انجام کو پہنچائے۔"

غلام خاندان کے بادشاہوں میں التمش اور خلجی خاندان میں علاء الدین ایسے بادشاہ گزرے ہیں جنہوں نے اپنے دور حکومت میں علم و فن کو ترقی دینے کی کوشش کی۔ ان کے دربار میں مایہ ناز گویے موجود تھے جن کے لیے خزانوں کا منہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ فخر ہند امیر خسرو دہلوی فن شاعری کے علاوہ فن موسیقی میں بھی کامل تھے۔ وہ اس میں نئی نئی طرزیں ایجاد کرتے ستار (جو کثرت استعمال سے ستار ہو گیا ہے) انہیں کی ایجاد ہے اور اپنے گیت اکثر اسی پر گایا کرتے تھے۔ اسی طرح ترانے اور سرگم بھی انہیں کے ذریعہ وجود میں آئے اور اس طرح آئے کہ آج انہیں علم موسیقی کا گرامر سمجھا جاتا ہے۔

لیکن موسیقی اپنے تکمیل کے لیے دور اکبر کے انتظار میں تھی۔ یہ وہ دور حکومت تھا جسے غیر سلطنتیں نگاہ حسد سے دیکھ رہی تھیں، یہ وہ دور تھا جس نے ہند و مسلم کو محبت کی مضبوط زنجیروں میں جکڑ دیا تھا، یہ وہ دور تھا جس میں سیاست کے پردہ میں مذہبی نفرت کی تعلیم نہ تھی ــــ علم اور تحصیل علم کے لیے اکبر کے خزانے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ اس کے نورتن کا ایک آبدار موتی، تان سین، دنیائے موسیقی کا خدا تھا! وہ اگر ایک طرف اُن لغدادی شہ دن کا ماہر تھا جن سے کسی زمانہ میں دربار عباسیہ گونجا کرتے تھے تو دوسری طرف ان راگوں کا دیوتا تھا جن سے جنوبی ہندستان کے کوہستان اور شوالے مسحور تھے!

اکبر اس کے بنائے ہوئے راگ سنتا۔ ہر راگ کی تاریخ دراصل دریافت کرتا، ہر راگ پر اپنی رائے دیتا اور پھر نورتن کے فیصلے کا انتظار کرتا اگر نورتن کا فیصلہ راگ کے موافق ہوتا تو اس راگ کو فروغ دیا جاتا ورنہ نہیں۔

قدیم پسند کے عام پسند راگ یہ تھے:۔

(۱) سری
(۲) بسنت
(۳) بھیرو (بھیرویں اور دیس کی اصل بھی بھیرو ہی ہے)
(۴) پنچم
(۵) میگھ
(۶) ناتھ۔

ان چھ راگوں میں نورتن کے فیصلہ سے جو تبدیلی کی گئی وہ معیار موسیقی قرار پائی اور کم و بیش وہی آج تک قائم ہے۔ چنانچہ اُن میں سے تین بالکل تبدیل کر دیے گئے۔ بسنت کی جگہ مالکوس کو، پنچم کی جگہ ہنڈول کو، اور ناتھ کی جگہ دیپک کو دی گئی، عام گویوں سے ان کی مشق کرائی تاکہ عوام میں رائج ہوں اور ایسا ہی ہوا

کہا جاتا ہے جب تان سین مرا تو اکبر خود کاندھا دیتا ہوا ہمراہ میت تھا۔ اس کی قبر گوالیر میں بتائی جاتی ہے جس کی سرہانے املی کا ایک درخت ہے۔ گویوں کا اعتقاد ہے کہ جو کوئی اس درخت کی پتیاں کھا لیتا ہے اس کا گلا شیریں ہو جاتا ہے اور آواز پر درد اور اس حقیقت نما دھوکے میں تقریباً سیکڑوں شائق موسیقی حضرات وہاں پہنچتے ہیں اور پتیاں چبا کر چلے آتے ہیں۔

سالک لکھنوی

غزل

ضبط سے خالی اگر ہے ان کا دیوانہ نہ بن
بن اگر دنیا میں رسوائی کا افسانہ نہ بن

چل سخی کے راستہ پر، پیروی سائل کی چھوڑ
ہو سکے تو بن صراحی ورنہ پیمانہ نہ بن

لامکاں والے کو دل کی تنگیاں ہیں ناپسند
رہ سکے جس میں نہ کوئی ایسا کاشانہ نہ بن

اس طرح مٹ جا کہ روئے عمر بھر سارا جہاں
بھول جائے جس کو دنیا ایسا افسانہ نہ بن

جس محل پر جو بنا سب ہے وہیں دیتا ہے زیب
وقت پر بن جا سڑی بیوقت دیوانہ نہ بن

دلمیں چھپ کر رہنے والا ہے زمانہ سے حسین
رنگ عالم کی ہوس میں اس سے بیگانہ نہ بن

دوسرے کا قرض ادا کرنا بہت دشوار ہے
رند ہے تو رند ہی رہ پیر میخانہ نہ بن

شمع کی لو میں سما جا ہے یہی الفت کی شان
آگ کے شعلوں سے ڈرنے والا پروانہ نہ بن

وہ بھی رسوا ہوں جہاں میں تیری بدنامی کیساتھ
اس طرح مٹ مٹ کے خاک کوئے جانانہ نہ بن

کھینچ لے نظروں میں میخانہ کا میخانہ • جواںؔ
چار قطروں میں چھلکنے والا پیمانہ نہ بن

جواںؔ سندیلوی

غزل

ذرہ ذرہ آشنائے راز ہے
یہ مرے انجام کا آغاز ہے

حسن کیا ہے رعدِ باراں کی کڑک
عشق کیا۔ اِک برقِ بے آواز ہے

حسن کیا مضراب گل ضرب صبا
عشق کیا۔ مجبوریوں کا ساز ہے

علم دنیا کو ہے غلط بالکل غلط
راز ہے راز محبت راز ہے

دور آنکھوں سے مگر دل کے قریں
بھولنے والے یہ کیا انداز ہے

راز الفت سے ہوئے آگاہ وہ
اشک ناداں درد کا غماز ہے

ناز ہے اُن کو متاعِ حسن پر
مجھ کو اپنی بے بسی پر ناز ہے۔

اش . . . افؔ

معیارِ گناہ!

دنیاداری کے دھندوں سے میں مدت ہوئی نجات پا چکا تھا، مدیکلہ دم کے لیے چونکہ کسی بڑی دولت کی ضرورت نہیں ہوسکتی، اس لیے میں ایک جگہ جم کر کبھی نہیں رہا، ہمیشہ دور دراز شہروں سیاحت ہی کرتا رہتا ہوں

اُن دنوں میں پنجاب میں تھا اور وہاں کے تاریخی شہروں اور خوبصورت دیہاتوں کی سیر کرتا پھرتا تھا۔ پنجاب میں عام طور پر سڑکیں اچھی نہیں ہیں اس لیے لاری کے سفر میں بہت تکلیف ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لگاتار کئی روز لاری کا سفر کرکے میں بہت زیادہ تھک گیا تھا۔

راولپنڈی کی طرف جاتے ہوئے جب لاری ایک چھوٹے سے شہر میں پہنچی تو میں نے سوچا کہ دو ایک روز یہیں رُک جاؤں، اِس طرح تھکن بھی دور ہو جائے گی اور یہاں کی سیر بھی کرلوں گا۔

یہ شہر گجرات تھا جو راولپنڈی سے جانے والی گرانڈ ٹرنک روڈ کے کنارے آباد ہے۔

بس اسٹینڈ پر جب میں اُترا، تو وہیں میں نے سرائے کا پتہ پوچھ لیا اور چلنے لگا۔ جب سے میں نے سیاحت شروع کی ہے ہمیشہ سرائے ہی میں ٹھہرتا ہوں کیونکہ دھرم شالے کی خشک اور بے جان زندگی کے مقابلے میں سرائے کی زندگی ہمیشہ رنگین اور دلچسپ ہوتی ہے۔ خصوصاً پنجاب کی ہر سرائے میں جو نکہ جلال آباد، سمرقند اور بخارا کے عجیب وغریب سوداگر، اپنے بے ڈھنگے لباسوں کے ساتھ موجود رہتے ہیں اس لیے وہاں کی زندگی بہت ہی دلچسپ اور پُربہار ہوتی ہے۔

گرد وغبار سے اَٹی ہوئی سڑک پر چلتا ہوا میں سرائے کی طرف جا رہا تھا کہ دفعتاً میری نظر ایک چھوٹے سے بنگلے کے پھاٹک پر لگی ہوئی تختی پر پڑی، جس پر "این، سین، ایڈووکیٹ" لکھا ہوا تھا۔

ہندوستان کے اس انتہائی مغربی کنارے ایک بنگالی خاندان کی موجودگی پر مجھے نہ صرف حیرت ہوئی بلکہ میں نے اسے اپنی خوش قسمتی پر محمول کیا اور اب یہ ممکن نہ تھا کہ گھر کے اندر جاکر کسی سے کم سے کم ملاقات بھی نہ کرتا۔

میں جوش اور خوشی سے دروازے کی طرف بڑھا مگر جیسے ہی میں نے دروازے پر پڑی ہوئی چک اٹھائی، میرے منہ سے حیرت، خوشی اور جوش کے ملے جلے جذبات کے تحت بے اختیار ایک چیخ سی نکل گئی "نارین ـــــ تم یہاں؟"

نارین بھی مجھے دیکھتے ہی اپنی کرسی سے اچھل پڑا اور پورے جوش مگر حیرت سے چلایا:۔

"ابھیلاش ـــــ ارے تم یہاں، کالے کوسوں دور کیسے آگئے؟" اور وہ مجھ سے لپٹ گیا ـــــ اُس کے اردگرد جو موکل بیٹھے تھے اُنہیں وہ تقریباً بھول گیا اور میرے یہ کہنے کے باوجود کہ تم اپنا کام جاری رکھو، وہ اپنے مؤکلوں سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "کام دوسرے وقت بھی ہوسکتا ہے مگر ایک پرانے دوست کو پا کر اُس سے بے تعلقی اور غفلت برتنا میں جائز نہیں سمجھتا" پھر وہ اپنے موکلوں سے مخاطب ہوکر کہنے لگا "یہ میرے بہت پرانے دوست ہیں اور چونکہ آج بیس سال کے بعد ملاقات ہوئی ہے، اس لیے آج میں اِنہی سے کچھ باتیں کروں گا ـــــ آپ لوگ کل آئیے گا!"

~~~

نارین اور ہم کلکتہ کے ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے اور ہوسٹل میں ایک ہی کمرے میں رہتے بھی تھے ـــــ ایم اے کی تکمیل کے بعد ہماری تعلیم ختم ہوگئی اور کشمکش روزگار نے ہمیں جدا کردیا، حتیٰ کہ ہم ایک دوسرے کو تقریباً بھول گئے! لیکن یہ دنیا بہت بڑی نہیں ہے، اس کے رستے اور پگڈنڈیاں اس طرح ساتھ ساتھ چلتی ہیں کہ بعض اوقات دو مسافر کئی بار ایک ہی جگہ جمع ہو جاتے ہیں ـــــ اور بیس سال بعد ہم بھی آخر مل ہی گئے

تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، اس کے بعد نارین نے میرے لیے ایک کمرہ ٹھیک کردیا اور کہا "میں امید کرتا ہوں تم اس وقت تک میرے ساتھ ہی رہو گے جب تک تمہاری طبیعت اکتا نہ جائے" پھر اندر کے دروازے کے پاس جاکر اُس نے کسی کو پکارا "رما، رما، یہاں آکے دیکھو، جانے ہاں کون آیا ہے؟" اور تھوڑی دیر بعد ایک عورت دروازے
~~~

میں آکھڑی ہوئی جس کی عمر تیس سال کے قریب تھی اور جو عالانہ تناسب اور خدو خال کے لحاظ سے کسی قدر حسین مگر انتہائی متین اور سنجیدہ منظر آتی تھی ۔

نارین نے تعارف کرایا :۔ یہ ابھیلاش ہے، میرا بچپن کا ساتھی اور دوست، ہماری خوش قسمتی سے سیاحت کرتا ہوا اس طرف آنکلا ہے ——— اور یہ ہے میری بیوی ،رو ما ،،

روما کے خاموش سلام کا جواب دیتے ہوئے جب میں نے اسے غور سے دیکھا تو دفعتاً مجھے خیال آیا کہ اسے میں نے اس سے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے، کب اور کہاں ؟ یہ مجھے یاد نہ آسکا!

مجھے وہاں رہتے ہوئے کئی دن گذر گیے، نارین اور میں اکثر اکٹھے بیٹھکر گذرے ہوئے زمانے اور بیتے ہوئے دنوں کی باتیں کیا کرتے تھے لیکن میں نے کسی قدر حیرت سے محسوس کیا کہ روما نہ تو کبھی ہماری گفتگو میں شریک ہوتی نہ زیادہ دیر ہمارے قریب ہی رہتی، بلکہ اندر کے کمرے میں ہر وقت کسی نہ کسی کام میں لگی رہتی۔

ساتھ ہی دو ایک بار میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ اُس وقت تک اپنے شوہر سے بھی بات چیت نہیں کرتی جب تک وہ خود اُسے نہ بلائے اور جب وہ اُس کی کسی بات کا جواب بھی دیتی تو اس کی آواز درد اور مایوسی میں اِس طرح ڈوبی ہوئی ہوتی جیسے کوئی بہت دور سے بول رہا ہو!

میں اس کی وجہ جاننے سے قاصر تھا کیونکہ جب تک میں وہاں رہا، وہ ایک بار بھی مجھ سے مخاطب نہیں ہوئی نہ میں نے ہی اُس سے بات چیت کی، لیکن مجھے یقین ضرور ہو گیا تھا کہ کوئی مخفی غم اندر ہی اندر اُسے گھلائے ڈالتا ہے !

گرمیوں کے دن تھے اس لیے نارین اور ہم باہر صحن میں سویا کرتے تھے اور روما برآمدے میں، ایک رات گرمی کچھ زیادہ تھی اور ہمیں نیند نہیں آرہی تھی دفعتاً نارین کہنے لگا۔

تم نے اپنے بارے میں اب تک کچھ نہیں بتایا، یہ تو ظاہر ہے کہ تم نے اپنے آپ کو دنیاداری کے جھمیلوں سے الگ رکھا ہے مگر تفصیل سے تم نے کبھی نہیں بتایا کہ زندگی کے اس طویل دور میں تمہیں کیسے کیسے واقعات سے دو چار ہونا پڑا ہے ؟،،

تم ٹھیک کہہ رہے ہو نارین ! واقعی میں نے اپنے متعلق تمہیں کچھ نہیں بتایا، کیونکہ نہ تو تم نے کبھی پوچھا اور نہ کبھی میں نے ہی بتانے کی ضرورت محسوس کی، اس کے علاوہ میری زندگی بہت سارے واقعات کا مجموعہ نہیں ہے ـــ شادی میں نے واقعی نہیں کی مگر کبھی ارادہ

ضرور تھا اور اس سلسلے میں اپنے ہی گاؤں کی ایک لڑکی کو میں نے پسند بھی کر لیا تھا اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ بھی مجھ سے شادی کرنے پر آمادہ ہے لیکن اس کے والدین چونکہ بہت غریب تھے اس لیے اپنی لڑکی کی جوانی اور حسن سے مالی فائدہ اٹھانے کے خواہشمند تھے اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ اس کی شادی کسی امیر آدمی سے ہو جاتی، اور میں تو، تم جانتے ہی ہو ہمیشہ سے غربت کا رسیا ہوں اور ایسے آدمی کے پاس دولت کہاں ؟

کچھ دنوں کے بعد جب میں گاؤں پہنچا تو معلوم ہوا کہ لیلا کی شادی ایک بڈھے زمیندار سے ہو گئی ہے ——— یہ گویا میری محبت اور پسند کی موت تھی ۔ چنانچہ میں نے یقین کر لیا کہ عورت میری دنیا سے ہمیشہ کے لیے نکل چکی ہے۔

اس کے بعد مجھے یہی ٹھیک معلوم ہوا کہ گاؤں اور گھر سے اپنا آخری تعلق بھی منقطع کر لوں چنانچہ اونے پونے مکان بیچ کر اس طویل سفر پر روانہ ہو گیا۔ بس یہی میری زندگی کی داستان ہے۔ اور تم جان چکے ہو گے کہ اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے لیکن میں دیکھتا ہوں تمہارے حالات مجھ سے مختلف ہونے پر بھی کچھ عجیب سے ہیں، تم نے شادی بھی کر لی ہے اور ممکن ہے تم مطمئن اور سکھی بھی ہو مگر ایک بات میرے دل میں بری طرح کھٹک رہی ہے۔ میں جب سے یہاں آیا ہوں تمہاری بیوی کو کبھی خوش نہیں دیکھا، وہ ہمیشہ بہت ہی غمگین اور پریشان سی رہتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس کی زندگی میں خوشی اور سکھ کا کبھی گذر تک نہیں ہوا،، کافی غور و فکر کے بعد بھی میں نہیں سمجھ سکا کہ ایسا کیوں ہے ؟،،

میری بات سن کر نارین تھوڑی دیر خاموش رہا اور اندھیرے کی وجہ سے چونکہ اس کا چہرہ نہیں نظر آ رہا تھا اس لیے میں اُس کے جذبات کا اندازہ نہ کر سکا، دفعتاً اُس کی آواز سنائی دی:۔

میری زندگی کے واقعات بڑے ہی دردناک ہیں، ابھیلاش، تمہیں یاد ہو گا کہ جب ہم ایم اے میں پڑھتے تھے تو میں "قانون" کے لکچروں میں بھی شریک ہوا کرتا تھا اور جب تعلیم ختم ہو گئی تو میں نے قانون کا امتحان دے کر "ایل" کی ڈگری بھی حاصل کر لی اور باقاعدہ ایک قانون دان بن گیا۔

اس کے بعد میں اپنی بہن کے یہاں چلا گیا تاکہ پریکٹس شروع کرنے سے پہلے چند روز آرام کر لوں ۔

میری بہن کے پڑوس ہی میں ایک نوجوان ہمسایہ گھر تھا اس کی عمر زیادہ سے زیادہ اُنیس یا بیس سال ہو گی اور اس لڑکی کے گھر والوں میں بہت گہرے دوستانہ تعلقات قائم تھے اور وہ ...

ایک دوسرے کے یہاں آتی جاتی رہتی تھیں

چند ہی روز بعد میں نے محسوس کیا کہ غیر ارادی طور پر میں اس بیوہ کی طرف کھنچا جا رہا ہوں اور روز بروز اس کی کشش زیادہ ہی ہوتی گئی، مجھے نہیں معلوم خود اُس کی لڑکی کو میری حالت کا علم تھا یا نہیں اور اُس کے جذبات و خیالات کیا تھے، کیونکہ نہ تو میں اُس سے کبھی ملا نہ بات ہی کی ـــــ لیکن یہ دنیا ہمیشہ بے گناہوں پر ہی ظلم کرتی ہے، جلد ہی گاؤں بھر میں ہمارے "تعلقات" کا چرچا ہونے لگا اور شریر لوگوں نے ہمیں اس حد تک بدنام کر دیا کہ آخر ایک روز میرے بہنوئی نے صاف لفظوں میں مجھے اپنے گھر سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔

اس سراسر جھوٹے الزام اور اپنی توہین کا جس قدر صدمہ مجھے ہو سکتا تھا، ظاہر ہے۔ مگر احتجاج اور شکایت کی کوئی گنجائش نہ تھی ـــــ میں مرد ہونے پر بھی چپ چاپ اپنی توہین برداشت کر گیا اور کچھ نہ کر سکا۔ مگر اس لڑکی کا دل شاید مجھ سے زیادہ مضبوط اور احساس زیادہ بیدار تھا، چنانچہ جس روز صبح میں گاؤں سے رخصت ہو رہا تھا اُسی روز اُس بدنصیب بیوہ کے گھر سے نیلگوں دھوئیں کا ایک بادل سا اٹھا اور بے گناہ لڑکی کو راکھ کا ڈھیر بنا کر غائب ہو گیا ـــــ اُس نے اپنے جسم پر کراسن تیل چھڑک کر آگ لگا دی اور اپنی بے گناہی پر قربان ہو گئی!

اور میں اپنے آپ کو اس کا "قاتل" تصور کر کے گاؤں سے نکل آیا۔ اس حادثے نے نہ صرف میرے جذبات کا خون کر دیا تھا بلکہ میرے احساس میں زہر کی سی تلخیاں بھر دی تھیں!

چنانچہ میں اپنے گھر بھی واپس نہیں گیا کیونکہ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ سب باتیں وہاں بھی پہنچ چکی ہیں اور ان پر یقین کر لیا گیا ہے۔ اس کے بعد ہی والدہ کے انتقال کی خبر ملی اور میں نے یہ سوچ کر اطمینان کی سانس لی کہ اب گھر کا اور دنیا کا کوئی بوجھ بھی میرے سر پر نہیں ہے۔

میں نے آوارہ گردی شروع کر دی اور اب میرے دل میں سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ کسی طرح اپنے گناہ کا کفارہ ادا کر دوں، اب مجھے ایک ایسے آدمی کی تلاش تھی جو صحیح راہ عمل بتا سکے۔ اس لیے میں بنارس کی طرف روانہ ہو گیا کیونکہ وہیں ایسا آدمی ملنے کی امید تھی ـــــ لیکن بہت دن گذر جانے پر بھی مجھے اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی اور ایسا کوئی آدمی بھی نہ مل سکا جو میرے دل میں بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھا سکتا!

آج کل کی طرح ہی گرمی کا موسم تھا اور رات کا وقت، میں تنہا گھاٹ کے قریب بیٹھا ہوا اپنے پاگل دل سے باتیں کر رہا تھا، اور بیتے ہوئے دنوں کی یاد مجھے بے چین کیے ہوئے تھی دفعتاً ساڑی میں لپٹی ہوئی ایک عورت گھاٹ کی طرف آتی دکھائی دی اور میرے دیکھتے دیکھتے وہ سیڑھیاں اتر کر پانی میں جا پہنچی، دفعتاً بجلی کی سی تیزی سے میرے دماغ میں خوف کا ایک ایک مبہم احساس پیدا ہوا "کہیں یہ عورت خودکشی کے ارادے سے تو یہاں نہیں آئی ہے" اور میں اپنے اس قیاس پر غور کر رہا تھا کہ اُس کے پانی میں کودنے کی آواز سنائی دی۔

جس جگہ وہ ڈوب رہی تھی، وہاں پانی بہت زیادہ گہرا نہیں تھا مگر اُس آدمی کے لیے ضرورت سے بھی زیادہ گہرا تھا جو اپنے آپ کو بچانا نہ چاہتا ہو! ـــــ میں فوراً پانی میں کود پڑا اور اُسے نکال لایا۔

جلد ہی اسے ہوش آ گیا اور اُس نے بہت غصے اور انتہائی جوش سے کہا کہ مجھے اِس ظالم دنیا میں دوبارہ واپس لانے کا مجھے کوئی حق نہیں تھا۔ اس کے بعد اُس نے میری منت و خوشامد بھی کی کہ میں اُسے مرنے سے نہ روکوں مگر میں نے اسے اس کی اجازت نہ دی اور بہت دیر تک سمجھانے بجھانے کے بعد میں اُسے اس کے ارادے سے باز رکھنے میں کامیاب ہوا۔

وہ ایک اچھے دولتمند گھرانے کی بیوہ تھی، میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے لیے کیا کروں کہ اُس نے کہا: "جبکہ آپ نے مجھے مرنے سے بچا ہی لیا ہے تو آپ یہ بھی ضرور چاہتے ہوں گے کہ میں دوبارہ خودکشی کی کوشش نہ کروں؟ اس لیے مجھے بتائیے کہ میں باعزت طور پر زندہ رہنے کے لیے کیا کروں؟"

اور اُس کی اِسی بات نے میری مدتوں کی تلاش و جستجو کامیاب بنا دی، مجھے وہ آدمی مل گیا جس کی مدد سے نہ سہی، اس کی مدد کر کے میں اپنے گناہ کا کفارہ ضرور ادا کر سکتا تھا ـــــ چنانچہ میں نے روما کو تعلیم دینی شروع کر دی اور شہر میں دو چھوٹے چھوٹے کمرے کرائے پر لے کر ہم دونوں اکٹھے رہنے لگے۔

ایک ماہ بعد میں نے روما سے کہا کہ دنیا میں باعزت طور پر زندہ رہنے کے لیے ہمیں چاہیئے کہ آپس میں شادی کر لیں تاکہ ہماری زندگیوں کو پھر ایک بار برباد نہ کیا جا سکے!

میری بات سن کر وہ بہت بے قرار ہو گئی اور مہینوں روتی رہی میرے بار بار پوچھنے پر بھی اُس نے مجھے صرف ایک جواب دیا "یہ ناممکن ہے، آپ نہیں جانتے میں کتنی گنہگار عورت ہوں اور میں کسی

قیمت پر بھی آپ کی زندگی میں داخل ہو کر اسے ناپاک بنانے کی ہمت نہیں کر سکتی!"

میں تمہارے ماضی سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا، ہر آدمی کے ماضی کا دامن کوئی نہ کوئی چاک لیے ہوئے ہوتا ہے اور میرا ماضی بھی اس سے خالی نہیں ہے۔ میں بھی گناہ کر چکا ہوں اور میرے گناہ کے کفارے کے لیے یہ ضروری ہے کہ میں تمہاری زندگی برباد نہ ہونے دوں اور دوبارہ تمہیں اس ناپاک دنیا میں جانے سے روکوں جو تم سے، تمہاری روح کا سکون اور دل کا چین چھین چکی ہے۔ اس لیے تمہیں میرا ساتھ دینا ہو گا!"

میں نے اُسے سمجھایا اور جواب میں اس کے رخسار آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ رات کو سوتے وقت مجھے اپنے بستر پر ایک رقعہ پڑا ہوا ملا جس میں روما نے لکھا تھا: "میں جوانی میں اپنے جیون ساتھی کا انتخاب کر چکی تھی لیکن دولت کے لالچ نے میرے خیالات کا، میری پسند کا اور خود میرا گلا گھونٹ کر، مجھے ایک بڈھے دولت مند سے بیاہ دیا، جو کوئی جوان بلکہ ادھیڑ لڑکیوں اور لڑکوں کا باپ تھا۔

شادی کے دن ہی سے میرے سوتیلے لڑکے میرے دشمن بن گئے اور چند ہی سال بعد جب ان کا بڈھا باپ مر گیا تو انہیں اپنی دشمنی کی تکمیل کرنے کا موقع مل گیا۔

وہ سب لوگ بنارس چلے آئے اور یہیں رہنے لگے، مگر یہاں آتے ہی اُنھوں نے مجھ سے صاف کہہ دیا کہ میں اس گھر میں ایک نوکرانی کی طرح اگر چاہوں تو رہ سکتی ہوں، اس سے زیادہ کوئی حق بھی مجھے نہیں دیا جائیگا۔

میں اپنی قسمت پر صبر کر کے بیٹھ رہی کیونکہ شادی کے دن ہی سے میری دنیا اُجڑ چکی تھی، میری زندگی خود میرے لیے ایک ایسا بوجھ بن گئی تھی جس کا کوئی مصرف نہ ہو، اور اب عیش و آرام کی مجھے کیا ضرورت ہو سکتی تھی؟

لیکن ایک رات، جبکہ میں سو رہی تھی بعض نامعلوم اشخاص نے میری عصمت دری کی کوشش کی، مگر اس سے پہلے کہ وہ کامیاب ہو سکیں میں گھر سے بھاگ نکلی، —— اور غالباً اُن کا مقصد بھی یہی تھا!

میں سیدھی دریا پہ پہنچی تاکہ اپنی دکھ بھری زندگی دریا کی نذر کر کے ہمیشہ کے لیے رسوائی کے اس قید خانے سے آزاد ہو جاؤں —— مگر افسوس کہ میں اپنے اس مقصد میں بھی، کامیاب نہیں ہو سکی اور جو کچھ ہوا آپ خوب جانتے ہیں!"

اس نے جن واقعات کا ذکر کیا تھا، ان میں کہیں بھی مجھے اُس کا گناہ نظر نہ آسکا اور اگر اس نے گناہ کیا بھی ہوتا تو بھی میں اسے اہمیت نہ دیتا کیونکہ گناہ کے سماجی معیار سے میں اچھی طرح واقف ہو چکا تھا چنانچہ میں نے اسے سمجھا بجھا کر شادی پر راضی کر ہی لیا اور اس کے بعد ہم مختلف شہروں میں پھرتے پھراتے یہاں آکر بس گئے۔

میں تو اب اپنے دل کو کسی قدر مطمئن پاتا ہوں کیونکہ گناہ کا بوجھ کچھ ہلکا محسوس ہوتا ہے مگر روما ایک لمحہ کے لیے بھی ذہنی کشمکش اور مفروضہ گناہ کے تصور سے نجات نہیں پا سکتی۔

اس کی زندگی میں نہ کوئی امنگ ہے، نہ آرزو، سکھ اور اطمینان کا تو اس کے ہاں کبھی گزر ہی نہیں ہوتا، اس کے باوجود ایک وفادار خادمہ کی طرح میری ہر خدمت میں ہمہ تن مصروف رہتی ہے لیکن تنہائی میں جب کبھی وہ مجھ سے بات کرتی ہے، بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اُس کی صرف یہی ایک درخواست ہوتی ہے کہ میں اسے زندگی کے عذاب سے نجات پانے کی اجازت دیدوں —— اور میں یہی نہیں کر سکتا!"

نارین خاموش ہو گیا، اس کے چہرے پر دکھ کا سیاہ بادل سا نظر آرہا تھا، اور میں بھی خاموش تھا کیونکہ ان واقعات پر تبصرہ کے لیے میرے پاس کوئی لفظ موجود نہ تھا —— تلخ حقائق اور جھوٹی ہمدردی کو ایک جگہ جمع کرنے سے مجھے ہمیشہ سے نفرت ہے!

دوسرے روز نارین حسب معمول کچہری چلا گیا اور دوپہر کی گرمی اور لو سے پریشان ہو کر میں لیٹا ہوا تھا کہ گھر کا ملازم ایک رقعہ میرے پاس لایا۔ میں نے حیرت سے رقعے پر نظر ڈالی۔ لکھا تھا:

"میں روما نہیں ہوں۔ میرا اصلی نام لیلا ہے، وہی لیلا جس کی وجہ سے تمہاری زندگی تباہ و برباد ہو چکی ہے۔ تم نہیں سمجھ سکتے کہ میں کتنی دکھی ہوں اور مجھے بڑی خوشی ہوگی اور میں تمہارا احسان مانوں گی اگر تم یہ گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ دو اور پھر کبھی میری زندگی میں آنے کی کوشش نہ کرو!"

میرا دل بھی بھر آیا، میں نے فوراً نارین کے نام ایک رقعہ لکھا کہ "میں بہت اُکتا گیا ہوں اس لیے اپنا سفر پھر شروع کر رہا ہوں" اور اپنا مختصر سامان لے کر چل دیا! (ماخوذ)

شریف چکوالی

پیغام حیات

اسیری میں بڑھینگی جس قدر پابندیاں میری — گھٹینگی اتنی ہی مجبوریاں اے باغباں میری
قفس میں رہ کے بھی سیر چمن ہوگی تصور میں — نہ چھینی جائیں گی صیاد سے آزادیاں میری
ذرا یہ حسن تقسیم آکے دیکھے کوئی گلچیں کا — چمن کی کائنات عہد گل اس کی، خزاں میری
چمن ہی تک نہیں محدود رہ سکتے مرے نالے — قفس میں بھی نہیں رکنے کی یہ چلتی زباں میری
میں اپنا مدعا صیاد کو سمجھا کے چھوڑونگا — نہ ہونگیں مانع اظہار اب خاموشیاں میری
دہکتی ہے وہ چنگاری یقیں کی سینۂ دل میں — بالآخر گل کے رہ جائینگی اکدن بیڑیاں میری
کشاکش رفتہ رفتہ فطرت دل بنتی جاتی ہے — کہ مشکل خواہ ہوتی جاتی ہیں آسانیاں میری
اسی کی خاک سے گلشن کی پھر تعمیر نو ہوگی — ہوئی ہرچند نذر برق شاخ آشیاں میری
دل اندوہگیں میں اونگھتی ہیں جو تمنائیں — انہیں ہشیار کرکے چھوڑیگی اکدن فغاں میری
مرے گیتوں کے دھارے پر بہینگے نغمے ہی نغمے — فضا کو مست کردینگی ترنم ریزیاں میری
شب تاریک میں ہوگی یہ رہبر صورت انجم — درائے کارواں بن جائے گی طرز فغاں میری
مرے آنسو کا ہر قطرہ ہے مستقبل کا اک دفتر — مرے ماتھے کے ہر بل میں لکھی ہے داستاں میری
مری رسوائیوں پر ہنسنے والے یہ بھی سوچا ہے — تری ذلت پہ ہونگیں خندہ زن بربادیاں میری
اٹھیگا لیکے انگڑائی مرا ذوق عمل جسدم — سلا دینگی جمود قلب کو بیداریاں میری
بنے گا لالہ زار اس روز سنگ آستاں ان کا — جب آئیں رنگ پر یہ بے غرض قربانیاں میری
جفاکاری کی بنیادیں بہالے جائینگی اکدن — ابھی پلتی ہیں پلکوں میں جو طوفاں خیزیاں میری
مری وارفتگی روشن کرے گی شمع منزل کی — خرد کی رہنما ہونگیں جنوں پردازیاں میری

دل خفتہ میں جس دم ہوش کروٹ لے گی خودداری
بدل جائیں گی عزو ناز سے رسوائیاں میری

ابراہیم ہوش

بنگالی سے

باغی کا تیسرا خط

از شاعر انقلاب قاضی نذر الاسلام ۔ ترجمہ محمد یونس احمر

سالار

۱۹۔ جنوری ۔ وقت صبح

نور الہدیٰ! خوش رہو۔

تمہارا خط میرا لڑکا جو جوری نوکر شام کو چائے کی میز پر رکھ کر چلا گیا تھا۔ میں اُسی وقت چائے پینے میں مشغول تھا۔ لیکن تمہاری تحریر دیکھ کر میں اُچھل پڑا اور جیسے میرے ویران دل کے اندر بہار کی اُمنگیں ناچنے لگیں۔ میں نے عالم وارفتگی میں پھر دوسری کپ تیار کی اور مزے لے لے کر پیتا رہا ــــ پیتا رہا اور خط سے دل بہلاتا رہا۔

تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ تمہاری بدمزاج بھابی خط پڑھنے میں مخل انداز نہ ہوئیں اور نہ اس بات کی اپیل پیش کی کہ تم نے انہیں بھی کیوں نہیں یاد کیا۔ ایسی عفیفہ و رعورت اس اندھیر نگری میں ملنا بہت دشوار ہے مجھے امید ہے کہ تمہیں اپنی بھابی صاحبہ سے جتنی بدگمانی ہو چلی تھی اب دور ہو جائیگی۔

ہماری بچی کی زبان پھوٹی ہے۔ دیکھو وہ تمہارے خط کو چھین کر اور نیچے میں دو دو ھے کر دیا ۔ ہی ہے جب بھی اس کی نظر چائے پر پڑ جاتی ہے وہ بے تحاشا چائے چائے کہہ کر دوڑتی ہے۔ جب میں ڈانٹ بتاتا ہوں تو اس کی آنکھیں اُمنڈ آتی ہیں۔ اس سنسار میں خدا نے میری پیٹھ کو اس بچی نے باندھ دیا ہے۔ اور پھر ساتھ افلاطونی بیوی کا ظلم ۔ زندگی عجیب ضیق میں ہے ۔ اور ہاں تم صوفیہ کو تو جانتے ہی جو اس دن وہ اپنی ماں کی الجھن اور پریشانی کا مذاق اُڑا رہی تھی۔ ماں نے یہ دیکھ کر کہا ــ ہاں ری! ہنس لے جب تیرے ناتی پوتا ہونگے تو معلوم ہوگا ۔

آج میں تمہیں طول طویل خط لکھنے بیٹھا ہوں۔ میں نے عہد کر لیا ہے کہ دل کے جو الا میں جتنی چنگاریاں سلگ رہی ہیں انہیں اس خط کے ذریعہ سرد کرنا ہی ہوگا۔ اور ہاں تم بھی میرے ان شعلہ بار الفاظ کو خوب غور سے پڑھنا۔ میں بھلا دنیوی دھندے میں غرق رہنے والا انسان ــ مجھے فرصت ملے تو کہاں سے ۔ اور اگر بد قسمت فرصت مل بھی تو خط لکھنے کے لیے تم جیسے دماغ کی ضرورت ہے ۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ اگر میں نے خدا نخواستہ خط لکھنا شروع بھی کیا تو خوب لکھتا ہوں ۔ ورنہ کچھ بھی نہیں ۔ تم نے مجھے اپنے خط میں مغرور لکھا ہے مگر یقین مانو کہ آج تک اس لفظ سے میری شناسائی نہیں ہوئی سمجھ میں نہیں آتا عقل و شعور رکھ کر احمقانہ فعل تم سے کیسے سرزد ہو جاتے ہیں۔ دراصل تم نرے احمق ہو۔ مجھے خوف ہے کہ آئندہ خط میں کہیں تم روٹھ نہ جاؤ۔ نہیں بھائی نہیں تم احمق نہیں ۔ تمہاری تحریر دیکھ کر مجھے شک ہونے لگا ہے کہ اب تم وہ نور الہدیٰ نہیں جو چند سال پہلے تھے ۔ تمہاری طرز نگارش اور انداز بیان میں ایسی لوچ اور شیرینی ہوتی ہے کہ میں شرابی کی طرح مستی میں بے خود ہو جاتا ہوں ۔ سوچ رہا ہوں کہ تمہیں قابل قدر سند عطا کروں۔ لیکن دنیا کے آلام و افکار کا اسپ تیز رو مجھے اس طرح بھگائے لیے جا رہا ہے کہ لگام کھینچنے کی مہلت ہی نہیں ملتی

دیکھو دیکھو کمرہ کے عقب میں کرسی کے اوپر ایک نیا شگوفہ کھلنے والا ہے جس کی خوشبو شاید تمہاری تک میں بھی پہنچ گئی ہوگی سمجھے؟ نہیں ارے بھائی سنو! ان عورتوں کی طرح دنیا میں شاید حقیر اور کوئی جانور ہی نہیں۔ ان کی مثال ان بطخوں جیسی ہے کہ جب تین چار بطخیں ایک جگہ جمع ہوتی ہیں تو کس طرح "چیں چیں" کی آوازیں بلند ہوتی ہیں ۔ یہ عورتیں بھی جب ایک ساتھ انجمن سجاتی ہیں تو یقین مانو گھر کی چھت ہل جاتی ہے ۔ غیر شعور اور احمق عورت مرد کے لیے آگ ہے آگ: ہر وقت اُس کی قینچی کی طرح زبان مردوں کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتی ۔ شاید مجھے بھی خط لکھنا ملتوی کرنا ہوگا ۔ دیکھو نا وہ آ رہی ہے ۔ خیال ہوتا ہے کہ ایسی عورتوں کو سمندر کی اتھاہ گہرائی میں غرق کر دوں ۔ افسوس ہے افسوس !

دوپہر کے وقت!

جان بچی لاکھوں پائے! ابھی تو خط لکھئے

پاس ہی خواب میں بے ہوش ہے۔ ایسا سنہرا

ہے۔ کچھ دیر کے لیے تو تو میں میں کا طوفان تھم گیا۔ میں بھی اس درمیان میں خط ختم ہی کر کے دم لوں گا۔ ورنہ اگر خدا نخواستہ آنکھ کھل گئی تو سب خاک ہی میں مل جائیگا۔

لونا لیڈری! وہ دن یاد ہے جب تم کہتے تھے کاش تمہاری آنکھوں کے سامنے ایک ننھا سا بچہ ہوتا اور میں بھی یہی آرزو کرتا تھا کہ کاش مجھے بھی ایک ایسا ہی بچہ ملے تاکہ اپنی زندگی مکمل کر سکوں آج وہ غنچہ میری زندگی کے چمن میں آنکھیں کھولے دیکھ رہا ہے اور اس کی عطر بیز خوشبو ہر طرف پھیل رہی ہے۔ مگر آہ! زندگی کے تغلرات مجھے اس حسین بچہ کی نگہداشت سے جدا کیے ہوئے ہیں کبھی کبھی ایسا احساس ہوتا ہے کہ میرے دل کے اداس صحرا کے ہرن کا بچہ اشک ریز آنکھوں سے نیلے آسمان کی لامحدود وسعت کو دیکھتا ہے اور پھر اس کے گلے میں سونے کی زنجیر جھنکار اٹھتی ہے وہ مجھ سے بھاگ جانا چاہتا ہے اس کشادہ کائنات کی پہنائیوں میں جہاں ہر وقت نسیم کی جلوہ پاشیاں ہوتی ہیں اور مقدس نغمات بال کشا ہوتے ہیں۔ اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ اب تمہیں ایک ایسی بات سنانا چاہتا ہوں جسے سن کر تمہیں کچھ فائدہ ہو۔ دیکھو میرے ان الفاظ پر خوب غور کرنا۔

جب تک انسان شادی کی ہلاکت پرور زنجیر میں مقید نہیں ہوتا اس وقت تک اس کے دو پیر رہتے ہیں اور وہ آسمان کی وسعت ترین چوٹیوں میں آزاد پنچھی کی طرح پرواز کرتا رہتا ہے اسے کسی قسم کا بندھن روک نہیں سکتا۔ لیکن جب وہ اس زنجیر میں قید ہو جاتا ہے تو اس کے چار پیر ہو جاتے ہیں۔ اب اس کی آزادی چھین لی جاتی ہے۔ اس کی آزاد خواہشیں اور آرزوئیں پائمال ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ میں نے تو کبھی نہیں دیکھا کہ کوئی پرندہ یا دیگر جاندار چار پیر سے اڑ سکتے ہیں۔ صرف دو پیر ہی پرواز کرنے کا باعث ہوتے ہیں۔ یہ چار پیر زندگی کو تباہ کرنے والے نہیں تو اور کیا ہیں۔ اور اگر قسمت میں اولاد ہے تو اس سے بڑھ کر دنیا میں وبال جان اور کوئی نہیں۔ جوں جوں نسل میں اضافہ ہوتا جائیگا۔ تکلیفیں اور مصیبتیں بڑھتی جائیں گی۔ شب و روز بس اولاد کی پرورش کیلئے فکر دامنگیر رہیگی۔ اگر اولاد انجام کار میں نیک ہوئی اور دنیا میں سربلندی حاصل کی تو خیر ورنہ والدین کے لیے اس سے بڑھ کر مصیبت اور کیا ہے کہ بری نسل خاندان کی مضبوط جڑیں کھوکھلی کر دیتی ہے

بھائی میرے، تم جو اپنے کو سمندر کی تیز خرام لہروں میں روپوش رکھنا چاہتے ہو کیا آخر کامیاب بھی ہو سکو گے؟ جانتے ہو میں تو طوفور ہوں۔ کہیں نہ کہیں پتہ لگا لوں گا۔ یاد رکھو تم مجھ غوطہ خور سے بھاگ نہیں سکتے۔ احمق! ہیرے کو بھی کبھی چھپا کر رکھا جا سکتا ہے؟ کیا خوشبو کو رومال سے ڈھانک کر رکھ سکتے ہو؟ اُف، قسمت ہا قسمت!! مجھ جیسا بیس بائیس سال کا لڑکا کیا خاک سمجھے گا۔ تمہارے دل کو صرف وہی چیزیں بھاتی ہیں جن کے اندر شاعرانہ تخیل کی جھلک ہو، جہاں تصور کی دوشیزائیں انگڑائیاں لیتی ہوں۔ تم شگوفوں اور کلیوں میں کھو جانا چاہتے ہو اور میں اولاد کے جنجال میں اسیر ہوں۔ تم میں اور مجھ میں کتنی تفاوت ہے۔

بھائی یہ دنیا بہت پر از آلام ہے۔ خاردار جھاڑیاں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں اور ہمیں ان ہی جھاڑیوں کو طے کرنا پڑتا ہے۔ شاید تم اب تک تصور کی اسی رنگین دنیا میں کھوئے ہو گے جہاں تمہاری آنکھوں کے سامنے "چشم آہو" مسکراتی ہے اور تم ہزاروں تمنائیں لیکر اس کے رخسار احمریں پر لوست کا شیریں تحفہ پیش کرتے ہو۔ لیکن میں زخمی پنچھی کو لیکر خون کے آنسو بہاتا ہوں۔ زندگی کی یہی وہ دو مختلف اور متضاد راہیں ہیں جہاں مساوات کی بھینٹ ہوتی ہے۔

کسی فرانسیسی ادیب کا قول ہے کہ خدا نے انسان کو قوت گویائی اس لیے عطا کی ہے تاکہ دل کی باتیں پوشیدہ رکھے یہ قول کتنا پر از حقیقت ہے۔ ان باتوں کو سوچ سوچ کر تمہاری وہ باتیں یاد آتی ہیں کہ کس طرح تم نے اپنے دل کے تمام تکالیف و مصائب کو ہم لوگوں سے مخفی رکھا۔ جانتا ہوں انسان ہو کر انسان کو سمجھنا نہایت دشوار ہے۔ لیکن انسان ہو کر آنکھوں میں خاک جھونکنا اس سے بھی زیادہ مشکل اور کٹھن ہے۔ تم جیسے انسان کو وہی پہچان سکتا ہے۔ جس کے دل کے اندر بھی غم کی چنگاریاں برستی ہیں اور کوہ آتش فشاں پھٹتا ہے۔ کلیوں کی شگفتگی سے انسان کو غیر معمولی مسرت حاصل ہوتی ہے لیکن اسے کوئی نہیں جانتا کہ ان کی ہنسی میں کتنی المناک چیخیں اور کرب دبے چھپے ہوتی ہیں۔ بچوں کی سفید چھاتیوں کے اندر دکھ کے کتنے داغ نمایاں ہیں انہیں کون جاننے کی کوشش کرتا ہے اور جاننے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہم تو صرف پھولوں کی شگفتگی اور اس کی ظاہری نمود سے مسرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

میرے بھائی! سچ کہتا ہوں کہ تمہاری غیر معمولی فطرت کو میں آج تک پہچان نہ سکا۔ میں جب بھی تمہاری گذشتہ کہانیوں پر نظر ثانی کرتا ہوں میری آنکھیں اس طرح برس پڑتی ہیں کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ دور کیوں جاؤ ابھی کل کی بات ہے

جنگ میں جانے سے قبل تم نے آخری بار مرجانہ پر نگاہ دوڑائی تھی تو اس وقت تم کس طرح بے حس و حرکت ہو گئے تھے ـــــ اس دن یکایک میرے لبوں پر یہ شعر لہرا اٹھا تھا ؎

لبوں پر کہیں رہ نہ جائے شکایت
محبت کا پُرجوش اظہار کر لوں!

مگر آہ! تم دوسرے دن یکایک کارزار حیات کی حقیقی جنگ میں چلے گئے۔ تمہیں شاید نہیں معلوم تھا کہ میں نے مرجانہ کے ساتھ تمہاری نسبت پکی کر دی تھی۔ اس دن مجھے اپنی غلطی محسوس ہوئی تھی اور بھول کر سوئی ہوئی آنکھیں جاگ اٹھی تھیں۔ آہ! سونے کا پنجرہ دیکھ کر پنچھی خوشی خوشی قریب آیا ہی چاہتا تھا کہ اسے یکایک اپنی اسیری خوف ہوا اور پھر آسمان کی پہنائیوں میں پرواز کر گیا۔

آج میں تم سے اپنے دل کی برسوں سے چھپی ہوئی باتیں کہنا چاہتا ہوں اور مجھے کامل یقین ہے کہ تم مجھے معاف کر دو گے۔ جانتے ہو بائی ادل اول تمہارے ساتھ مرجانہ کی شادی کا بہت مخالف تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم شادی کر کے زندگی کی نئی آفت مول لو۔ بات میں نے آج تک کسی سے نہیں کہی اور کہتا بھی کیسے جبکہ میں جان رہا تھا کہ اگر دوسرے لوگوں کو معلوم ہو گیا تو میں ہدف لعنت بن جاؤں گا۔ لیکن جب میری خواہش ہوئی کہ نہیں میں غلطی پر ہوں تمہاری شادی مرجانہ کے ساتھ کر دی جائے کہ یکایک نہ جانے کن ظالم کے سنگین ہاتھوں نے تمہیں مجھ سے جدا کر دیا۔ میں تمہیں زندگی کے اس بندھن میں نہیں جکڑ سکا۔ اب میں اپنی حماقت اور ناکامی پر روتا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ میرا یہ خیال کہ مرد ہی عورتوں کے دل کی باتیں جاننے میں ماہر ہے غلط ثابت ہوا کیونکہ تمہاری بھابی نے مجھ سے یہ راز کہہ کر میری آنکھیں کھول ڈالیں کہ تم جنگ میں جانے سے قبل مرجانہ کو دیکھ کر بے حس و حرکت ہو گئے تھے اور مرجانہ نے بھی محبت میں آ کر تمہارے پیروں میں گر کر محبت کا کشکول پیش کیا تھا۔ یہ سن کر میں جھوم اٹھا کہ دونوں کو ایک دوسرے سے حقیقی محبت ملی، وقت گذر چکا تھا اور سارے کام درہم برہم ہو گئے تھے کاش مجھے یہ بات پہلے سے معلوم ہوتی! کاش میں پہلے سے جانتا

میں آج سوچ رہا ہوں کہ جس میدان جنگ میں ہزاروں کشت ہوتے ہیں۔ خون کی ندیاں بہتی ہیں وہاں تم کس حالت میں زندگی کی سانس لے رہے ہو گے۔ سڑی ہوئی لاشیں سپاہیوں کی آخری چیخیں اور بندوق کی سنسناہٹ ان مناظر سے تمہارا دل کیا بیٹھ نہیں جاتا ہو گا۔ نہیں معلوم

بجلی کی کس کڑکتی بانسری نے تمہارے نازک دل کو ہم لوگوں سے جدا کر دیا۔ لیکن یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ اس دن نہ جانے تمہارے دل کے اندر کہاں سے ظالمانہ اور وحشیانہ قوت آگئی تھی جب تم تنہا اسٹول کے بیچ میں پانچ چھ سو سو لجروں کو پریشان کر رہے تھے۔ اسی دن مجھے معلوم ہوا تھا کہ تمہارے نازک دل کے اندر آگ کی کتنی بلند پر بہت چھپی ہوئی ہے جس کو ہوا کے تیز و تند جھونکے کبھی بجھا نہیں سکتے۔

میں نے سوچا تھا کہ اس خط کے اندر تم سے ساری باتیں کہہ دوں گا لیکن بیان کرتے ہوئے مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے اور یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ شاید تمہارے دل کو بھی رنج پہنچے۔ بھائی! میں اتنا بے رحم نہیں ہوں کہ تمہیں خواہ مخواہ کا دکھ پہنچاؤں مگر یہ کس حسینہ کی بانسری کی چیخ تھی جس نے تم جیسے خاموش ہرن کو چونکا دیا؟ اور تم فرار ہو گئے۔ تم نے اپنے دل کی باتیں سبھوں سے کیوں نہیں بیان کر دیں! آہ! تم ایک معمہ ہو ـــ لاینحل معمہ!

صوفیہ کی شادی کے بارے میں آجکل بہت پریشان ہوں سوچا تھا کہ تم سے بھی رائے مشورہ لوں گا لیکن تمہیں بیجا تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ میرا اور تمہاری صاحبہ کا خیال ہے کہ اس کی شادی منور کے ساتھ کر دی جائے۔ تم اپنی رائے لکھنا۔ تاہم اس کے لیے دو چار ماہ ٹھہرنا ہی ہو گا۔ کیونکہ منور کے بی اے کا امتحان قریب ہے نتیجہ برآمد ہوتے ہی کام شروع کر دوں گا۔ کیا تم تین چار دن کے لیے چھٹی لے کر گھر آ سکتے ہو؟ اگر تم نہ آ سکے تو شادی غم میں بدل جائے گی ـــــ دیکھو بھائی چھٹی کی خوب کوشش کرنا۔

تمہارے سامنے صوفیہ نہایت شریر تھی۔ حتیٰ کہ تم سے جھگڑا بھی کرتی تھی لیکن تمہیں یہ سنکر حیرت ہو گی کہ جب سے تم جنگ میں گئے ہو اس کے خیالات بالکل بدل گئے ہیں۔ اور روز و شب بس تم ہی کو یاد کرتی ہے تمہاری جنگ میں شرکت کو وہ دنیا کے تمام بڑے کاموں سے سخت سمجھتی ہے اور جب تمہارے متعلق گفتگو کرتی ہے تو دانتوں میں انگلی داب لیتی ہے جس دن تم گئے تھے اس دن اس کے آنسو دیکھنے کے قابل تھے اسے اتنا دکھ ہوا تھا کہ مکمل سات دن سات رات بھوکی پیاسی رہی۔ اس وقت بھی جب باتوں باتوں میں تمہارا ذکر نکلا تو اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے کئی عدد تمہیں رومال کا گلدستہ بھیجا ہی شاید مل گیا ہو گا۔ اس کی بڑی آرزو ہے کہ تمہیں جنگی لباس میں دیکھے۔ اگر تمہارے پاس اپنا موجودہ فوٹو ہو تو ضرور بھیج دینا۔ روپے دیغیرہ کی ضرورت ہو تو مجھے لکھنا میں بھیج دوں گا۔ امید کرتا ہوں تم اچھے ہو گے۔ یہاں بھی سب بخیریت ہیں۔

تم خوش نصیب اور نہ جانے کیا کیا کہہ کر بیجا ہنسی اڑاتے تھے لیکن اب اگر تم دیکھو گے کہ وہ [illegible]

[illegible]

خوابِ حسرت

پھر یاد آ رہا ہے وہ دورِ زندگانی — جس پر لٹا چکا ہوں سرمایۂ جوانی

پُر کیف کس قدر تھا اپنا وہ عہدِ الفت — تم بھی تھے مہرباں کچھ، کچھ مہرباں تھی قدرت

مائل ہوئی طبیعت جس سمت قبلہ رو تھی — پیشِ نگاہ پیہم تصویرِ آرزو تھی

تم بھول جاؤ لیکن میں بھول جاؤں کیسے — لمحے یہی تو حاصل تھے میری زندگی کے

جب تک جہاں سے ہم تم روپوش ہو نہ جائیں — شوقِ بہم دگر میں کیوں دونوں کھو نہ جائیں

ہر چند شرم سے تھیں آنکھیں جھکی جھکی سی — لیکن مئے محبت ان سے چھلک رہی تھی

چشمِ کرشمہ پرور بدمست مد بھری تھی — کیفیت محبت آنکھوں سے جھانکتی تھی

خاموش گو تمہارے لبہائے قرمزی تھے — رنگین وشی کے پھر بھی وہ دے رہے تھے چھینٹے

حسنِ سکوت آپ آئینہ بیاں تھا — ہر موجِ تبسم پیغام بر زباں تھا

پیغام وہ کہ جس سے ہو حشر دل میں برپا — روٹھی ہوئی ادا میں منّت کا صاف منشا

پہلو تھے پہلوؤں میں چٹکی کے گدگدی کے — ہونٹوں پر دونوں جانب تھے لطف چاشنی کے

سو سو چھپا دتوں پر وہ لطف ہمکناری — آغازِ قیدِ غم کا انجام رستگاری

پیشِ نظر ہے نقشہ وہ قربِ باہمی کا — جب نام کو نہ پردہ حائل رہا دوئی کا

اب تک برائے منظر چشمِ نظارہ وا ہے — سچ کہہ رہا ہوں تم سے شاہد میرا خدا ہے

دل میں گماں تھا اور وہ بھی یقین کی حد تک — شاید رہینگی قائم یہ صحبتیں ابد تک

عہدِ وفا کی رسمیں معدوم ہو رہی ہیں — افسانہ اب وہ باتیں معلوم ہو رہی ہیں

افضل نقوشِ الفت اُبھریں گے پھر بالآخر
تعبیرِ خوابِ حسرت ہو کر رہے گا ظاہر

افسانہ ساز

نجمہ کوچ پر بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی، اس کی نگاہیں مقابل کی تصویر پر جمی ہوئی تھیں۔ جس میں ایک ننھا بچہ آئینہ میں اپنی شکل دیکھ کر بے تحاشا ہنس رہا تھا اور اس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے کھلونے بکھرے پڑے تھے۔ سفاً کسی کے رنگی آہٹ سنائی دی اس نے فوراً پلٹ کر دیکھا، نوکر چائے لیکر آیا اور مقابل کی میز پر چن کر چلا گیا۔ وہ اٹھی اور الماری سے رسالہ طراز نکال کر دیکھنے لگی۔ شکل سے اس نے شاید صفحہ بھی پڑھا ہوگا کہ اس کی سہیلی شہناز آئی۔ نجمہ اُسے دیکھ کر بے ساختہ کہہ پڑی "آؤ آؤ چائے نوش کرو، میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔" شہناز نجمہ کے عقب میں بیٹھ گئی اور بولی "کیا تم سینما نہیں چلو گی؟"

"چلونگی کیوں نہیں، واہ تم بھی اچھی ہو۔"

"کب چلو گی؟ کیا تصویر ختم ہو جانے کے بعد؟" شہناز نے نجمہ کے ہاتھ سے رسالہ لے لیا۔

"اچھا شہناز! تم نے وہ مضمون دیکھا، میرا چاند؟ آہا کیا عرض کروں تعریف کے لیے موزوں الفاظ نہیں، افسانہ ساز نے کیا لکھا ہے عرش کے تارے توڑ کر ایک جگہ جمع کر دیئے ہیں۔"

"واقعی" شہناز نے داد دیتے ہوئے کہا "واللہ افسانہ نے مجھ پر جادو کر دیا، کون شخص ہے وہ، گذشتہ ماہ کے پرچہ میں بھی اس کا ایک رومانی افسانہ تھا۔ وہ بھی ناقابل تردید رہا مگر لطف تو یہ ہے کہ اسی کا افسانہ اول نمبر میں ہوتا ہے۔ واقعی بلند پایہ کے افسانے لکھتا ہے، پھر سلیس اردو میں۔"

"میرا خیال ہے کہ اُسے اپنے مضامین دکھایا کروں۔ امید ہے کہ اس سے کچھ فن مضمون نگاری حاصل ہو جائے۔"

"اچھا ہے دکھایا کرو، میں بھی اپنے ادب لطیف دکھایا کروں گی۔" شہناز نے پرچہ کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن اس کا پتہ کس طرح معلوم ہوگا؟" نجمہ کچھ سوچنے لگی۔

"طراز کے مدیر سے معلوم کر سکتے ہیں، یہ کونسی بڑی بات ہے" شہناز بولی

"ہاں یہ ٹھیک رہی،" نجمہ کے حسین چہرہ پر ہلکی سی مسرت رقص کر گئی۔ بولی "ارے! میں تو بھول ہی گئی، لو لو چائے پڑے پڑے ٹھنڈی ہوئی جا رہی ہے۔"

نجمہ اور شہناز چائے نوشی میں مصروف تھے کہ ہاشمی نجمہ کے بڑے بھائی آئے اور مقابل کی آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے:۔

"کیا خیال آرائیاں ہو رہی ہیں شہناز، آج تو تم بہت دنوں کے بعد دکھائی دی ہو، اگر کوئی خطا ہو گئی ہو تو معاف کر دو۔"

"کیسی خطا؟ آپ تو مجھے نادم کر رہے ہیں۔"

"ندامت کی کوئی بات نہیں، یہی کہ تم بہت دنوں کے بعد آئی ہو۔"

"واہ آپ نے خوب کہا، میں تو روزانہ آتی ہوں اور نجمہ کے ہمراہ پارک جایا کرتی ہوں، البتہ آپ کہیں گوشہ نشیں رہتے ہیں جو دکھائی نہیں پڑتے۔"

"خیر جانے بھی دو اس مہمل بحث کو، ہاں تو کس موضوع پر خیال آرائیاں ہو رہی تھیں؟"

یہی کہ نجمہ کہہ رہی ہیں، یم شاہ بڑا اچھا ادیب ہے۔ طراز میں اس کے بڑے اچھے افسانے شائع ہوتے ہیں، خیال ہے اُسے اپنے مضامین دکھایا کروں، قطعی ممکن ہے کہ اس کی اصلاح سے اس فنکاری کا کچھ پہلو حاصل ہو جائے۔"

"کیا میں ہی اکیلی کہہ رہی تھی" نجمہ اپنی صفائی کے لیے روٹھ کر بولی "تم بھی تو کہتی تھیں ہم اسے اپنے ادب لطیف دکھایا کرینگے؟"

"ہاں ہاں بھئی میں کب نہیں کہہ رہی ہوں، لیکن تمہارے بعد۔"

"ہائے میرے اللہ اس قدر سفید جھوٹ" نجمہ کھسیانی سی شکل بنا کر بولی "مجھی پر تہمت کا ٹوکرا دھر رہی ہو۔"

"اچھا خدا لگتی کہو پہلے کس نے کہا تھا" شہناز نے اپنی صفائی کے لیے ذرا زور دے کر کہا۔

"اچھا بھئی جھگڑتی کیوں ہو تم لوگ،" ہاشمی مطمئن لہجے میں بولے "کوئی مضائقہ نہیں، بہت عمدہ خیال ہے، میں بھی جہاں تک ہو سکے اسے اپنے افسانے دکھانے کی کوشش کروں گا۔"

"تب تو خوب رہا" شہناز انتہائی شادمانی کے زیر اثر کہہ پڑی۔ "میں کل ہی طراز کے ایڈیٹر کو خط لکھ کر کریم شاہ کا پتہ لگاتی ہوں"

"ہاں ضرور لکھو گی شہناز" نجمہ نے جذبۂ مسرت سے کہا "ارے سینما نہیں چلوگی؟" شہناز نے اپنی کلائی پر کی گھڑی دیکھ کر کہا "سوا چھ ہو چکے، بحث ہی میں وقت ٹل گیا"

"چلئے بھیا آپ بھی چلئے" نجمہ نے طراز کو الماری میں رکھتے ہوئے کہا۔

پھر تینوں گفتگو کرتے ہوئے ریگل کی طرف چل دیئے۔

نیلے آسمان پر سفید سفید بادلوں کے گالے بچھڑے ہوئے عاشقوں کی طرح گلے مل رہے تھے۔ آخری شعاع آفتاب رقص بسمل کا نظارہ پیش کر رہی تھی۔ ساری فضا میں دبی دبی سی سرگوشیوں کی سرسراہٹیں تیر رہی تھیں۔ شہناز ٹی پارٹی کا مکمل اہتمام کرکے نجمہ اور ہاشمی کا انتظار کر رہی تھی۔ آج خلاف معمول اس کے شگفتہ چہرہ پر اضطرابی کا عکس آئینہ دار تھا۔ وہ بھولے خرگوش کی طرح کمرے میں جلدی جلدی ٹہل رہی تھی۔ اتنے میں کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی، وہ ٹھٹھک کر رہ گئی، پھر آواز آئی۔

"شہناز"

وہ دوڑ کر باہر نکلی۔ دیکھا نجمہ اور ہاشمی کھڑے ہوئے ہیں۔ اس نے ان کا نہایت تپاک سے استقبال کیا اور اندر لے آیا۔ تینوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ہاشمی شہناز کو غور سے دیکھ رہے تھے چونکہ آج وہ خلاف توقع کچھ بہکی ہوئی سی تھی۔ پھر نجمہ سے کہا:

"نجمہ!"

"جی بھیا" نجمہ ہاشمی کی طرف رجوع ہو گئی

"سنا" ہاشمی نے نہایت مطمئن لہجہ میں کہا۔

"جی" نجمہ ہاشمی کا منہ غور سے تکنے لگی۔ شہناز بھی ہکا بکا ہو کر سننے لگی۔

"ایک گویا تھا بہت عمدہ گانے والا۔ لوگ اس کا گیت سن کر بیتاب ہو جاتے تھے۔ یعنی اس کی آواز میں اس قدر درد تھا۔ ایک دن اس نے سوچا" ہاشمی کچھ دیر رک گئے پھر بولے "سوچا کہ ایک ستار خرید لوں، پھر تو ستار کی طلسم انگیز آواز پر میرا گیت سونے پر سہاگہ ہو جائے گا۔ خیر اسی اشتیاق میں اس نے ایک ستار خرید لیا۔ دوسرے ہی دن جب وہ ستار پہ گانے لگا تو اُس کی آواز ستار کے سر سے ملتی ہی نہ تھی۔ لاکھ کھنکھار رہا ہے، لونگ چبا رہا ہے لیکن سب بے سود۔ بڑا حیران ہوا کہ کیا راز ہے"

ادھر شہناز کی چھاتی پر سانپ لوٹ رہے تھے وہ سوچ رہی تھی "کیا میں بے سود ہاشمی کے تصور میں گم رہا کرتی ہوں، کیا وہ میری آرزوؤں کی کائنات کو روند ڈالیں گے"

"لیکن ـــــ" ہاشمی کہتے کہتے رک گئے۔ شہناز کا تار تخیل ٹوٹ پڑا۔ وہ چونک گئی جیسے ننھے بچے سوتے میں بادل کی گرج سے ڈر کر گھبرا جاتے ہیں اور حواس باختہ ادھر ادھر تکنے لگتے ہیں۔ پھر ایک دم بولی۔

"اچھا پہلے چائے پی لیجئے پھر اپنی افسانہ سازی جتائیےگا"

"کیا تم خفا ہو گئیں؟" ہاشمی مسکراتے ہوئے بولے۔

"کیوں خفا ہو جاؤں؟" وہ چائے بنانے لگی۔ پھر تینوں چائے نوش کر ہی رہے تھے کہ نوکر آیا اور خط دے کر چلا گیا۔ شہناز شتابی میں لفافہ چاک کر کے خط پڑھنے لگی۔ نجمہ اور ہاشمی انہماک سے سننے لگے

دفتر رسالہ طراز جمشید پور

۱۸۔ جولائی ۶۲ء

محترمہ تسلیم

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ آپ کی حوصلہ افزائی کا شکریہ بہرحال آپ نے جو حضرت یم شاہ کا پتہ دریافت کیا تھا وہ حسب ذیل ہے۔

نمبر ۲۲ علی احمد اسٹریٹ، حسن آباد

یادگیٹس

منیجر

ہاشمی زیر لب مسکرا رہے تھے اور شہناز کی سطح رخ پر پریشانیوں کی لہریں انگڑائیاں لے رہی تھیں۔ نجمہ ایکدم بول اٹھی۔

"ارے یہ تو ہمارے مکان کا پتہ ہے"

"جی ہاں" ہاشمی مطمئن انداز میں بولے "ہمارے مکان کا پتہ ہے۔ تو یہ تم لوگ بھی کتنی نادان ہو یم شاہ کو الٹا پڑھو۔ دیکھو کیا ہو جاتا ہے۔

"جی ہاں، ہاشمی ہو جاتا ہے" نجمہ ایکدم کھل کھلا کر ہنس پڑی اور شہناز دانتوں میں آنچل دبائے اپنی پشیماں نگاہیں نیچی کر لیں

"اچھا اتنی آزردہ نہ ہو، میں تمہارے مضامین دیکھ دیا کروں گا" ہاشمی یہ کہہ کر ہنستے ہوئے کرسی سے اٹھے اور شہناز کی مرمریں نازک انگلیوں سے خط لیکر باہر چلے گئے۔

خواجہ عبدالرزاق

غزل

کیا غضب میرا فسانہ ہو گیا
آشنا اُن سے زمانہ ہو گیا

زلف اس رخ پر پریشاں کیا ہوئی
گلستاں پر شامیانہ ہو گیا

ہے عجب بحر معانی لفظ عشق
لب پر آیا اور فسانہ ہو گیا

آپ ہی سے پوچھتا ہوں مہرباں
میرا دشمن کیوں زمانہ ہو گیا

ان کے در کی پاسبانی مل گئی
"مرنے جینے کا ٹھکانہ ہو گیا"

ان کی نظروں میں مرے مکتوب کا
سارا دفتر مجرمانہ ہو گیا

تیغ ابرو سے کٹا دل اور جگر
تیر مژگاں کا نشانہ ہو گیا

ان کی یہ تحریر اب تک یاد ہے
آپ کو دیکھے زمانہ ہو گیا

مرحبا مجنوںؔ کہ آخر عشق میں
تو بھی رسوائے زمانہ ہو گیا

سید حسن مجنوںؔ

غزل

داستان غم اگر اپنی سنا دیتا ہوں میں
دوست تو کیا دشمنوں کو بھی رلا دیتا ہوں میں

جب کبھی ہوتا ہے میرا سامنا اس شوخ سے
حال دل چشم تمنا سے سنا دیتا ہوں میں

ہے سبق آموز عبرت باغ عالم کی بہار
خندۂ گل دیکھ کر آنسو بہا دیتا ہوں میں

وضع انکی اور ہے اپنا رویہ اور ہے
بد دعا دیتے ہیں وہ مجھکو دعا دیتا ہوں میں

ہوک سی اٹھتی ہے جب میرے دل مہجور میں
آنسوؤں کے ساتھ خون دل بہا دیتا ہوں میں

بیٹھ جاتا ہے وہیں مجنوں کلیجہ تھام کر
نجد کے صحرا میں جب واثقؔ صدا دیتا ہوں میں

سید بدیع الزماں واثقؔ

ادبستان

ایک امیرزادے کی مجلس

ریاست بھوپال۔ چوک۔ ایک امیرزادے کا مکان۔ گرمیوں کے دن ہیں۔ سورج غروب ہونے میں ابھی پورا ایک گھنٹہ باقی ہے۔ وسط صحن جس میں ہری ہری دوب جما کر گول سا تختہ بنا دیا ہے۔ اس کے اردگرد کئی کرسیاں بچھی ہوئی ہیں جن پر یاران جلسہ چہ میگوئیوں میں مصروف ہیں۔ صحن سے دو سو قدم کے فاصلے پر سرا پردہ عصمت ہے۔ اس کے برابر ہی بڑا پھاٹک ہے۔ داہنی طرف اصطبل ہے۔ پھاٹک تک جو سڑک صحن چمن طے کرکے آئی ہے اس پر سرخ بجری کٹی ہوئی ہے۔ سرخ بجری کا یہاں کیا ٹھیک ہے شہر کی تمام سڑکیں یہاں اسی سے رنگین ہوئی ہیں چونکہ یہ ایک قسم کی پہاڑی زمین ہے۔ لہٰذا اس کی خاک، راہگیروں کے سفید کپڑوں پر گلال بن کر چھاپے مارتی رہتی ہے اور شاید اسی غرض سے عموماً یہاں کے باشندے۔ کیا عورت کیا مرد سرخ پوش ہی رہتے ہیں۔ حاضرین جلسہ یا جس سوسائٹی کا ہم ابھی ذکر کر رہے ہیں اس میں بھی کئی احباب سرخ پوش ہیں جو بھوپالی کہے جاتے ہیں۔ باقی ادھر ادھر کے مسافران تازہ وارد۔ بھوپالیوں کی ایک اور بھی پہچان ہے۔ امیر ہو تو ذرا تکلف سہی اور اگر غریب ہوا تو بالکل سادی وضع میں ایک رومال مع بٹوہ کے ضرور بغل یا ہاتھ میں دکھائی دے گا۔ اس میں چار چیزیں لازمی ہوتی ہیں۔ چونے کی چنوٹی۔ ایک پتلی سی خلال ویسی ہی کان کریدنی اور قریب قریب اسی قد و قامت کی چمچی۔ دور کیوں جاؤ یہیں دیکھ لیجئے جتنے بھوپالی حضرات بیٹھے ہیں سب کے پاس ایک ایک رومال ہے جس کے کونے میں ایک ایک بٹوہ بندھا ہے۔ داہنی طرف کا کلا بھی بائیں سے بہت زیادہ پھولا ہوا ہے جو گٹکا کھانے کی دلیل ہے یہاں پان بہ نسبت گٹکے کے کم کھایا جاتا ہے اور شوقین لوگ اس میں بھی بہت سی … سیکڑوں نکالتے رہتے ہیں۔ چاندی سونے کی چنوٹی ویسی ہی۔ خوشنما خلال۔ بھاری بھاری خوشنما زنجیریں۔ غرض ایک گٹکے کے لیے یہاں بھی ہزارہا تکلفات ہوتے ہیں۔ افیون چانڈو وغیرہ۔ پیٹر بازی اکثر زیادتی کے ساتھ دیکھی جاتی ہے … گٹکا۔ پان، چھالیا، کتھا آمیز کر کے بنایا جاتا ہے۔

لوگ یہاں کے ملنسار اور متواضع بھی فرد ہیں۔ بات چیت میں فرق ہوتا۔ روزمرہ میں مغائرت۔ یہ ہر ملکے و ہر رسمے کے حوالے کر دینا چاہیے۔ علاوہ بھوپالیوں کے چند پردیسی شریف زادے بھی ہیں جن کی قطع وضع بول چال الگ بتائے دیتی ہے کہ وہ کہاں کی مٹی ہیں۔ ایک کوئی شاہجہاں پوری ہیں اور دو صاحب دلی۔ لکھنؤ کے نام لیوا آپس میں چنیاں چٹکیں ہو رہی ہیں۔ صدر میں ایک آرام چوکی بھی خالی ہے جس پر غاشیہ پڑا ہوا ہے معلوم ہوتا ہے کہ میر مجلس یا صدر انجمن ابھی کہیں ادھر ادھر تشریف رکھتے ہیں تب ہی تو یاران جلسہ آپس میں اس طرح غلا ملا اور بے تکلفانہ گرم سخن ہیں کہ کسی کو کسی کے سوء ادب کا بھی خیال نہیں۔ باشاید الناس علی دین ملوکہم کا معاملہ ہو خیر دیدہ باید۔ اسے لیجئے وہ نواب صاحب! یا میر مجلس بھی تشریف لے آئے ایک نوجوان سرو قد ابریشمی پوشاک زیب بدن کیے۔ گل انار رنگ کا دوپٹہ جس میں سنہری انگشتیا ٹھپہ لگا ہوا سر سے باندھے۔ اودی ٹسری کا تنگ پاجامہ کامدار جوتی پہنے سبز مخملی میان میں جڑاؤ قبضے کی بانکی تلوار داہنے ہاتھ میں لیے خراماں خراماں آکر آرام چوکی پر بیٹھ جاتا ہے۔ حاضرین بھی تعظیم دے کر اپنی اپنی جگہ جم جاتے ہیں۔ شکل و صورت کے لحاظ سے تو میر مجلس یا موجودہ نوجوان امیرزادہ متوسط درجہ کا حسین ہے۔ لیکن سیرت ناگفتہ بہ اول درجہ کے عیاش طبع ناعاقبت اندیش۔ اندھا دھند خرچ کر دینے والے۔ چنانچہ باپ کے ترکہ میں سے دو ڈیڑھ لاکھ روپیہ ابھی کوئی دو برس ہوئے پایا تھا۔ قریب نصف کے تو ٹھیکری کر چکے۔ انہیں یاران جلسہ اور مصاحبت میں گھرے اٹھاؤ بیٹھے رہے۔ باقی جو کچھ بچا کھچا ہے وہ بھی کوئی دن جاتا ہے جو ٹھکانے لگ دیتے ہیں۔ سر پر کوئی بڑا بوڑھا تو ہے ہی نہیں جس کا خوف و ہراس ہو یا پاس ادب مانع ہو اب تو اللہ رکھے یہی ننگی شمشیر بے جوہر جا ہیں بجلیاں گرا دیں۔ دوسرے جوانی کا عالم۔ سب پر طرہ یہ کہ حضور حضور کہنے والوں کے چھینٹے۔ پھر جو کچھ نہ اٹھائیں تھوڑا ہے

جو جو کچھ رنگ نہ دکھائیں تعجب ہے۔ غرض یہ رنگیلے چھبیلے شوقین آج کل تمام بھوپال میں ایک نئی نویلی سرکار ہیں جنہیں اپنا روپیہ مفت لٹا دینا منظور ہے۔ یار لوگوں کا بھلا کیا بگڑتا ہے ترس کھائے اُن کی جوتی۔ خیال کرے ان کی پیزار۔ ان کے لیکھے کل کیا بگڑتا آج بگڑ جائے ان کے تو گھر بے ہیں۔ مردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں انہیں اپنے حلوے مانڈے سے کام۔ لیکن جہاں اتنی بے اعتدالیاں ہیں وہاں انہیں احباب میں دو ایک محقق اور وسیع النظر بھی موجود ہیں جو رئیس زادے پر اپنے اخلاقی اثر ڈالنا چاہیں تو ہر طرح ڈال سکتے ہیں۔ مگر جناب وہی مثل ہے کس کی بکری اور کون ڈالے گھانس۔ یہ بھی جیسا رنگ دیکھتے ہیں ویسا ہی برتتے ہیں۔

نوجوان " (حاضرین) سے ایک شخص کی طرف مخاطب ہوکر) میر صاحب!! اب تو بہت ہی کچھ گرمیاں پڑنے لگیں۔ خدا خدا کرکے شام ہوتی ہے۔ پسینوں میں نہا نہا جاتے ہیں "

میر صاحب دہلوی " پیر و مرشد۔ بجا۔ درست۔ یوں فرمایئے ع

گرمی نہیں اک آگ برستی ہے فلک سے "

نوجوان " (مسکراکر) کیا خوب مصرعہ بھی گرما گرم فرمایا ہے "

لکھنوی " جی ہاں کیوں ماشاءاللہ رہنے والے کس بستی کے ہیں دلّی۔ شاہجہاں آباد

میر صاحب (بستی کے نام پر تربھر ہوکر) اے سبحان اللہ جی ہاں جناب! ہے تو وہ ایسا ہی ویرانہ جس میں سے لکھنو جیسے کئی جھونپڑے آباد ہوگئے ہیں

لکھنوی " میر صاحب! قبلہ! زبان سنبھالیے زبان۔ میں نے کیا کہا اور آپ نے کیا فرمایا آپ تو بھرے ہی بیٹھے تھے جیسے.....

میر صاحب " نہیں صاحب بھرے بڑے کو تو خدا ہمیں ہمیشہ ہی بھرا پڑا رکھے۔ اس وقت تو گنبد کی آواز تھی جیسا کوئی کہے گا ویسا ہی سنے گا۔

ایک بھوپالی " اجی حضرت ان باتوں سے کیا فائدہ ؟ صاحبزادہ صاحب نے اس لیے تو گرمی کی شکایت کی ہی نہیں تھی کہ آپ لوگ آپس میں گرما گرمی شروع کردیں۔ ایک فرمائشی قہقہہ"

لکھنوی " جی نہیں جناب! ہم سے کوئی گرم ہوکر کیا لے گا۔ دنیا جانتی ہے ہارا لوہا مانے ہوئے ہے ع

دعویٰ زبان کا لکھنؤ والوں کے سامنے
اظہار بوئے مشک غزالوں کے سامنے

میر صاحب " میر صاحب اس کا جواب دیا ہی چاہتے تھے جو صاحبزادہ صاحب اِن کا منشا سمجھ کر خود بیچ میں بول اٹھے۔

نوجوان " استغفر اللہ آپ لوگ بھی کتنے ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ بھلا اس ہٹ دھرمی سے نتیجہ۔ اے حضرت کوئی اور ذکر چھیڑے جو دل بہلے لطف زندگی ملے بقول منجھلے میاں (دہی بھوپالی آدمی) کہ ابھی تو دن بھر گرمی میں عرق عرق ہوتے آئے تھے یہاں آکر چاہا تھا کہ آپ لوگوں کی بذلہ سنجی سے کچھ ظرافت نصیب ہوگی۔ دل و دماغ فرحت پائیں گے وہاں چھوٹتے ہی بسم اللہ غلط ہوگئی کہ آپس ہی میں نوکا جھونکی شروع ہوگئی۔

میر صاحب " حضور میری نسبت تو کچھ خیال نہ فرمائیں پہل تو یہ ہمارے بین صاحب (دہی لکھنوی) ہی کی طرف سے تھی۔ میں تو جب بولا ہوں جب وہ حد سے گذر لیے ہیں۔ خدا کی شان ہے یہ ادب آموزی کا نتیجہ ہے۔ ہمیں سے سیکھا برسوں ہماری ہی روزمرہ کی جگالی کی۔ جب کچھ توں تاں غوں غاں کرنے لگے تو جھٹ اپنی اونچی دوکان اور پھیکا پکوان مشہور کرنے لگے۔ صاحب ثروت بنے۔ سچ کہا ہے کسی نے ؎

زبان لکھنؤ دلّی سے اچھی
ہماری بلی اور ہمیں سے میاؤں

نوجوان :۔ (ذرا مسکراکر) الہی توبہ۔ حضرت میر صاحب کسی طرح یہ قصہ مختصر بھی ہوگا یا نہیں۔ ان فضول باتوں میں تو کوئی کام کی بات نکالی ہوتی۔ کوئی تحقیق ہی فرمائی ہوتی جو معلومات بڑھتی اور آپس کی بحث مزا دیتی "

لکھنوی " (طعن سے) جی دیکھئے تو بھلا! جس مجلس میں ہمارے میر صاحب جیسے فلسفی موجود ہوں پھر وہاں بات بات میں فلسفہ نہ ظاہر ہو تو رہی بات۔

ایک بھوپالی ۔ نہیں صاحب آپ کی ہٹ دھرمی ہے ایمان ہے توجہان ہے۔ ہمارے میر صاحب کے فلسفی ہونے میں ذرا کلام نہیں تحقیق ان کی بہت بڑھی ہوئی ہے۔ بین صاحب اس وقت ذرا آپ خاموش رہیں (میر صاحب سے) ہاں میر صاحب! اب تو ضرور کوئی نہ کوئی مسئلہ چھڑ جائے جس سے دو گھڑی لطف رہے اور ہم جیسے ناواقف بھی حظ اٹھائیں۔

میر صاحب ۔ اس پر کچھ کہنا ہی چاہتے تھے جو لکھنوی پھر بول اٹھے۔

لکھنوی " اجی حضرت بس رہنے ہی دیجئے۔ سب تحقیق اور فلسفہ ہی ہے ہم تو یہ جانتے ہیں بلبلِ علیہ السلام سے نہ کوئی محققانہ تقریر

ہے نہ کوئی فلسفانہ گورکھ دھندا نہ کوئی چلتا ہوا جادو۔ اگر حقیقت میں کوئی کارآمد چیز ہے تو بس زر۔ زر۔ زر اسی کے لیے ہمارے میر صاحب قبلہ بھی محقق بنے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے ہیں نہیں تو کہاں دلی کہاں بھوپال کالے کوسوں کا فرق کہنا چاہئے۔

نوجوان۔ خیر تو اسی مضمون پہ سہی۔ کچھ دیر آپ ہی کی طرف سے سہی رہے۔

لکھنوی۔ (مسکرا کر) میں اس میں عرض تو کروں مگر حضور کو یہ ذکر مطبوع نہ ہوگا۔ کیونکہ آپ تو ایک دریا دل سرکار ہیں روپیہ کی آپ کے آگے کیا ہستی ہے بھلا۔

راوی۔ فی الحقیقت آپ تو اس سے کوسوں بھاگتے ہیں آپ کے سامنے تو زر بے چارے کی اتنی بھی ہستی نہیں جتنی کنکر پتھر کی ہے

اسلیے کور وز روشن شمع کافوری نہد
زدو بینی کہ بشب روغن نباشد در چراغ

منجھلے میاں۔ یہ نہیں صاحب آپ فرمائیں تو صاحبزادے صاحب ضرور توجہ فرمائیں گے اسے لیجئے فرمائش ہی جوان کی ٹہری

لکھنوی۔ بہت بہتر مجھے کیا عذر ہے۔ سنئے جناب!

زر۔ فارسی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا نام اس زبان میں اس لیے درست رکھا گیا ہے کہ دنیا کے بہت سے کام اسی کے ذریعہ سے درست ہوتے ہیں۔ خدا نے اسے عجیب برگزیدہ اور قیمتی درجہ عنایت کیا ہے۔ ہمارے مالوں کا کفیل۔ ہماری آرائشی مکانوں کی نمود و نمائش۔ رعایا اور لشکر کی آسائش اور ضرورتوں کا بر لانے والا۔ غریبوں کا دستگیر امیروں کا حوصلہ دکھانے والا۔ ذرہ کو اپنے مہر سے آفتاب بتانے والا مگر ہے تو یہی زر ہے۔ زر نہ ہو تو ملک نہ ہو۔ فصیح عرب کا قول ہے لا ملک الا بالرجال ولا رجال الا بالمال۔ وہ کس کس روپ میں درشن دیتا ہے۔ کس کس جون میں جنم لیتا ہے۔ سلاطین کا مقصود۔ اساطین کا محسود جو فتنہ پرور جفا پیشہ عاشق کی پرواہ نہ کرے وہ اس کے آگے سجدے میں سر دھرے۔ خود پتھر سے پیدا ہو مگر سنگدلوں کو موم کرکے بغیر اس کی یاد کے زاہد محراب کی طرف رخ نہ کرے بغیر اس کی محبت کے دائظ ممبر پہ نہ جائیں۔ اس کی محبت باپ بیٹوں میں تلوار چلا دے۔ ماں بیٹے کو زہر دیدے۔ بیٹی ماں کی جان کی دشمن ہو جائے۔ یہاں تک کہ جس چیز کے اول زر لگا دیں وہی زریں ہو کر سب پہ فوق لے جائے۔ زمانہ کو ندین زمانہ کہیئے تو سست جنگ کہلانے نہ گولڈن انڈیا مشہور ہوتا۔ نہ یورپ کے بچے بچے کی زبان پر ہوتا۔ قاعدہ کو زریں کہیں تو اس کے برابر کارآمد کوئی قاعدہ نہ سمجھا جائے۔ روپیہ تو روپیہ نام کو یہ شرف ہے کہ مرغ زریں کہیں دکھائے تو سیکڑوں کمپا مارنے کو مستعد ہو جاتے ہیں مختصر یہ کہ دنیا میں اگر کوئی چیز ہر مشکل کو سوائے مرض موت کو آسان کرنے والا ہے تو وہ زر ہے۔ لیکن اس میں یہ بھی افسوس ہے کہ جتنا اس کو چھپاؤ اتنا ہی سر چڑھ کر بولتا ہے۔ نظم

زر نہاداشتن بود مشکل
گرچہ دارندہ حیلہا سازد
زر اگر در زمیں کنی پنہاں سر برآرد کتف بیا خرازو
دولت یافتہ زدست مدہ
کہ بداں دولتت نہ باز آید

لکھنوی۔ صاحب نے اس نظم پر اپنی تقریر ختم کر دی اور حضار نے صدائے تحسین و آفریں بلند کیں صاحبزادے صاحب نے بھی بہت کچھ داد دی اور پھر میر صاحب سے بھی فرمائش ہوئی کہ وہ ایسا ہی کوئی چٹکلہ فرمائیں۔

میر صاحب۔ میں بے چارہ کیا عرض کروں مجھے تو کسی چیز پہ بحث نہیں کرنی ہاں اگر اس وقت کچھ کہنا بھی ہے تو بس۔ زبان شائستہ اور ناشائستہ ہی کی نسبت اور اسی کے متعلق ضرب المثلیں بھی گذارش کرنی ہیں۔ کیونکہ یہ ٹکا سی زبان جدھر چاہتی ہے ہل جاتی ہے۔ پھر چاہے سر ہی کیوں نہ کٹ جائے۔ مگر اس کی بھانویں بھی نہیں۔

نوجوان (مسکرا کر) آپ اپنے پہلو سے نہ ہٹئے کسی طرح سے۔ اچھا مہربان! اسی پہ کچھ فرمائیے کیا مضائقہ ہے یہ ہی سہی۔

میر صاحب۔ زبان منہ کے اندر سخت دانتوں کے پڑوس میں بے استخوان نرم گوشت ہے۔ فارسی مثل ہے۔ زبان گوشتینست بہر طرف کہ میگردانی می گردد۔ عربی مثل ہے۔ اللسان ترجمان القلوب۔ اس کی باتیں نرم گرم سخت، شیریں، نمکیں آتشیں ہوتی ہیں۔ جب ہم کسی کو آتش زبان کہتے ہیں تو اس کی زبان کو تین اعتبار سے آتشی قرار دیتے ہیں۔

(۱) آگ سے حرارت نکلتی ہے جو چیزوں کو جوش میں لاتی ہے ایسے ہی زبان سے وہ باتیں نکلتی ہیں جو دل کے جذبات کو جوش میں لاتی ہے یہاں تک کہ سرد اور تحمل مزاج سے تحمل مزاج کو خودمند کو بھی گرما دیتی ہے

(۲) آگ بہت سی چیزوں کو روشن کرتی ہے اس لیے اسے

اچھا ملازم اور برا آقا بھی کہتے ہیں یہی زبان کا حال ہے کہ اگر وہ ہماری ملازم بنے تو ہمارے کاموں کو سنوارتی ہے اور آقا بنے تو ستیا ناس کر دیتی ہے۔ اسی طرح جلی کٹی باتیں مارے غضب کے دل میں پھپھولے ڈالدیتی ہیں اور سننے والا آگ بولا ہو جاتا ہے۔

حضرت سلیمان۔ (۱) ملائم زبان ہڈی کو توڑ ڈالتی ہے

بنگالی (۲) آب ساکن پتھر میں شگاف ڈالتا ہے (یعنی سکوت سخت دل کو نرم کرتا ہے۔

افغان (۳) نیزہ کا زخم اچھا ہو سکتا ہے۔ مگر زبان کا زخم جو دل پر لگتا ہے وہ کبھی اچھا نہیں ہوتا۔

ترکی (۴) جو شخص اپنی زبان کو اپنے اختیار میں رکھتا ہے وہ گویا اپنا سر بچاتا ہے۔ زبان فطرت کے پہیہ میں آگ لگاتی ہے اور فطرت کے پہیہ سے مراد ان طریقوں سے ہے جن پر دنیا چل رہی ہے قاعدہ ہے کہ اگر پہیہ کو تیل چربی وغیرہ چکنائی سے نہ چکنائیں تو اس میں فوراً آگ لگ جاتی ہے۔ اسی طرح اگر دل کو محبت اور نواضع کی چکنائی نہ پہنچے تو الفاظ دل میں آگ لگا دیتے ہیں جذبات کے بخارات ملبند ہو جاتے ہیں۔ غضب کی آگ بھڑکنے لگتی ہے اور زندگی بالکل غارت ہو جاتی ہے

یونانی (۵) زبان میں ہڈی نہیں ہے مگر وہ ہڈی کو توڑ ڈالتی ہے

ترکی (۶) زبان تلوار سے زیادہ آدمیوں کو مارتی ہے۔

ترکی (۷) کان دو زبان ایک، جب دو سنو تو ایک کہو

چینی (۸) ایک دفعہ کا بولا ہوا لفظ رتھوں کے لشکر سے بھی ہاتھ نہیں آتا۔

اردو (۹) مارتے کا ہاتھ پکڑا جاتا ہے۔ کہتے کی زبان نہیں پکڑی جاتی۔

اردو (۱۰) زبان ہی ہاتھی پر چڑھاوے۔ زبان ہی سر کٹوادے۔

جاپانی (۱۱) انگل بھر کی زبان ۵ فٹ کے لمبے آدمی پر غالب ہوتی ہے

تیلگو (۱۲) اگر تمہارے پاؤں میں لغزش ہو تو سنبھل سکتے ہو لیکن اگر زبان میں لغزش ہو تو واپس نہیں لے سکتے۔

سیرما (۱۳) آدمیوں کی بدزبانی موچی کی قینچی یا رانپی ہوتی ہے کہ سوائے ناپاک چمڑے کے اور کچھ نہیں قطع کرتی۔

یدرگا (۱۴) کنویں کو بند کرسکتے ہیں مگر کسی کا منہ نہیں بند کرتے۔

فارسی (۱۵) ؎

زباں بریدہ بکنج نشست وصم بکم
بہ از کسے کہ نہ باشد زباں اندر حکم

فارسی (۱۶) زبان خوش مار از سوراخ بر می آید

عربی۔ (۱۷) حموضات الطعام خیر من حموذات الکلام۔ (کلام کی ترشیوں سے طعام کی ترشیاں اچھی ہوتی ہیں۔

عربی (۱۸) سکوت اللسان سلامت الانسان (زبان کی حفاظت میں انسان کی سلامتی ہے۔)

عربی۔ (۱۹) الصمت زینت العالم وستر الجاہل۔ (خاموشی عالم کی زینت ہے اور جاہل کی عیب پوشی)

عربی (۲۰) رب قول اشد من الصول (بہت دفعہ ایک ہی بات کہنے سے زیادہ سخت ہو جاتی ہے)

عربی (۲۱) منقبتہ المرء تحت لسانہ (زبان کے نیچے آدمی کی بزرگی ہے۔)

اور بس یہی میرا منشا، تھا۔ ہمارے اکثر احباب ایسے ہیں کہ بیسیوں دفعہ اپنا عیب کھلوانا چاہتے ہیں اور اپنی ہرزہ سرائی سے باز نہیں آتے۔ آدمی ایک دفعہ چپ ہو جائیگا لیکن باربار ایک ہی مضمون اپنی نسبت ہتک کا سنکر فرشتہ خصلت بھی کچھ نہ کچھ کہہ بیٹھیگا اس لیے ہر شخص کو لازم ہے کہ کہنے سے پہلے سوچ لے کہ جن لفظوں کو میں کہنا چاہتا ہوں ان میں کسی کے فہم کا تو پہلو نہیں۔ اور اس کے معنی کہاں تک پھیلتے ہیں۔ والسلام

یہ فقرے ختم ہوتے ہی پھر ایک دفعہ چاروں طرف سے واہ وا کے نعرے ملبند ہوگیے۔

آغا شاعر قزلباش دہلوی

فلمستان

چورنگی — ایک نقاد کی نظر میں

اس میں کوئی شک نہیں کہ "فضلی برادرس کمپنی لمیٹڈ" نے اپنے قیام سے سوسائٹی کی ایک بہت بڑی کمی پوری کردی ہے۔ اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ موجودہ طوفان تعصب میں ایک ایسے چراغ کی ضرورت تھی جو ہماری معاشرتی اور تمدنی زندگی پر پوری روشنی ڈالتی ہے۔ اس بلند آہنگ دعوی کے ساتھ عوام کی تربیت ذوق اور خواص کی تسکین شوق کے پرفریب وعدوں سے کام لیتی ہوئی یہ کمپنی وجود میں آئی۔ اس کمپنی کے اس مضحکہ خیز اعلان کا تو ذکر ہی کیا جب شروع شروع اس کمپنی نے اعلان کیا تھا کہ "ہماری کمپنی شاندار اسلامی پکچر پیش کرے گی"

پھر بھی ارباب شوق کی نگاہیں منتظر تھیں، لیکن ان کو انتظار میں سخت مایوسی ہوئی، اس کمپنی کا پہلا شاہکار "معصوم" یا "گناہ معصوم" کے نام سے نگار خانہ سے نکل کر پردہ فلم پر پیش ہوا، اس فلم میں فن مصوری اور آرٹ کا جس بیدردی سے خون کیا گیا ہے اس کا رنگ قارئین کو اس تنقید میں نظر آئیگا جو فروری ۴۲ء کے "جدید اردو" میں شائع ہو چکی ہے۔ اس فلم میں سب سے حیرت کی بات یہ ہے کہ ڈائرکٹر صاحب پوری فلم تو کسی طرح تیار کر گئے ہیں، لیکن فلم کا نام انتخاب کرنے میں گھبرا گئے۔ اسی گھبراہٹ میں کبھی تو "معصوم" اور کبھی "گناہ معصوم" کے نام سے اعلان کردیا۔ خیر یہ اس کمپنی کی پہلی پیش کش تھی جو ایسی ویسی ہوکر رہ گئی۔ اب امید تھی اس کی دوسری پیش کش بقول کسی کے "نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول" کے مصداق ہوگی لیکن اس کے برعکس یہ تو کچھ اور ثابت ہوئی، "خشت اول چوں نہد معمار کج تا ثریا میرود دیوار کج" یعنی اب جتنی بھی دیوار اونچی ہوتی جائیگی زیادہ ٹیڑھی نظر آئے گی آپ اگر کمپنی کی دوسری شاہکار کی فنی سفاکی دیکھنا چاہتے ہیں تو "چورنگی" کا رنگ دیکھیے۔ دیکھنے کے بعد آپ کو خود معلوم ہوجائیگا بلکہ آپ متعجب ہونگے کہ اس فلم کا ڈائرکٹر ہندستانی ہوکر بھی ہندستانی طرز معاشرت، تمدن، اخلاق و عادات سے کتنا نابلد ہے اور اس نے ہندستان کی ان سب خوبیوں کا کس طرح مذاق اڑایا ہے

"چورنگی" اس نام سے تو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کلکتہ کی اس شاہراہ پر چلنے والے گوناگوں اور مختلف النوع وحیثیت کے کرداروں کو ایک مربوط اور دلچسپ سلسلہ واقعات میں چورنگی افسانہ کا پس منظر ہوگی۔ جہاں تک اس تخئیل کا تعلق ہے وہ بے حد قابل داد ہے۔ کیونکہ "چورنگی" موجودہ زندگی کے تقریباً تمام رخوں کا چوراہا ہے۔ اسی سڑک پر موٹرنشین موٹروں میں سوار شان بان کے ساتھ گذرتے نظر آتے ہیں۔ اور پیدل انسان بھی۔ شراب وکباب کی افراط کے ساتھ فاقہ گرستگی کی بہتات بھی اسی ایک راستہ میں دکھائی دیتی ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں ضروریات زندگی کے علاوہ عیش و آرام کے لوازم۔ حتی کہ انسانی اخلاق کا بھی کاروبار ہوتا ہے۔ اس لیے ایک دور رس نظر ایک حساس طبیعت اور ایک ذہنی صناع کا "چورنگی" کے روزمرہ مناظر میں سے ایک دلچسپ کہانی کا نکال لینا بعید از قیاس نہیں ہوسکتا۔ مجھے امید تھی کہ فضلی صاحب نے اس کہانی میں ان تمام توقعات کو پورا کیا ہوگا — لیکن ؎ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

واقعہ صرف اتنا ہے کہ ایک بھکارن "چورنگی" میں بھیک مانگتی ہے۔ ایک رئیس زادہ اس کو کبھی کبھی اس سڑک پر دیکھتا ہے۔ اور بھیک دیتا ہے۔ جو رفتہ رفتہ محبت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ اور وہ اپنی منگیتر اور اپنے باپ کو چھوڑ کر اس سے شادی کر لیتا ہے۔ — باپ پھر آخیر میں، بھکارن کو اپنی بہو تسلیم کرلیتا ہے، اور اس کی منگیتر جو اپنی امارت و مغربیت کے نشہ میں چور تھی، اپنے ہیرو کا ایثار دیکھ کر اتنا متاثر ہوتی ہے کہ وہ خود نرس بن جاتی ہے۔ اب غور فرمایئے کہ اس قسم کی کہانی مختلف طرح سے نہ جانیں کتنی بار پردہ سیمیں پر آچکی ہیں ایک امیر کا لڑکا، بھکارن، اچھوت، کسان اور غریب کی لڑکی سے شادی کرلینے کا فسانہ لوگوں کو فلم ساز اس سے پہلے بھی متعدد بار سنا چکے ہیں — اور انصاف کی نظر سے دیکھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ [illegible] زیادہ تر اسی قسم کے اور دوسرے فلمی افسانے ہوتے ہیں۔ پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا

اس افسانہ کا نام چورنگی کیوں رکھا گیا۔

اگر چورنگی میں بھیک مانگنے کی رعایت سے افسانہ کا نام چورنگی ہو سکتا ہے، تو جھرنا گڈھ پوسٹ آفس اینڈ ٹیلیگراف آفس کے احاطہ میں محبت کے پینگ بڑھنے کی کہانی کا نام "جھولا" کے بجائے "جھرنا گڈھ پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف آفس ہونا چاہئے تھا۔ ایسا عنوان افسانہ نگار کے بھونڈے اور سطحی نظر کی غمازی کرتا ہے۔ اور فضلی صاحب کے متعلق یہ انکشاف ہمارے لیے حیرت انگیز افسوس کا سبب ہوا۔

اب اگر آپ فنی نقطۂ نگاہ سے بھی اس فلم کو دیکھیں تو آپ کو یہ بھکارن چھوکری، افسانہ نگار کی ذہنی تخلیق معلوم ہوگی، ورنہ آپ غور فرمائیں، اس کے لباس، اس کے چال ڈھال اور اس کی زبان پر تو ہندستان کے کسی گوشہ میں آپ کو ایسی بھکارن نظر نہیں آئیگی، اس کی زبان ایسی شستہ ہے کہ جیسے کسی دختر نشاط کی ہو، اس کی گفتگو سنئے تو ایسا معلوم ہوگا کہ وہ ایک اعلیٰ قسم کی سوسائٹی گرل ہے، اس کا پہناوا اتنے سلیقے کا کہ کسی طرح سے اس پر بھکارن ہونے کا گمان ہی نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ چورنگی کی بھکارن ہر قسم کا ٹھوس تجربہ حاصل کیے ہوئے ذرتی ہے تو ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سے بھوت بھوت کہہ کر چلا اٹھتی ہے۔

اداکاری ــــ اب کرداروں کو لے لیجئے۔ غالباً ہندستان کی فلمی تاریخ میں یہ پہلا فلم ہے جس میں کرداروں کا نام نہیں دیا گیا ہے۔ نہ جانیں کون سی مصلحت سے ڈائرکٹر کمپنی نے ایسا کیا، ــــ ہیروئن (مس چورنگی) کا ایک مصیبت کے وقت حضرت آرزو لکھنوی کی یہ غزل گانا سہ "آؤ۔ آؤ۔ مری بگڑی کے بنانے والے۔" جس کے ایک شعر میں معجزۂ شق القمر کا اشارہ ہے اور جس کی ڈائرکٹر صاحب نے کیمرہ کی مدد سے تصویر کی وضاحت بھی کردی ہے، ہم نہیں سمجھ سکتے ہیں کہ شعار رسول خدا کے معجزہ کی نقالی کرنا ایک مسلمان کے لیے کہاں تک درست ہے اس کا فیصلہ تو ہمارے علماء دین ہی کر سکتے ہیں۔ اگر ہمارے علمائے دین نے اس کردار اور سین کو ناجائز قرار دیا تو میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ فضلی برادر لمیٹیڈ کمپنی کے ڈائرکٹر نے اچھا نہیں کیا، بلکہ گناہ بے لذت کے مرتکب ہوئے۔

مکالمہ:۔ مکالمہ کا ایک نقص اوپر درج ہو چکا ہے۔ زبان کے اعتبار سے وہ کافی خوشگوار ہیں۔ کہیں کہیں ڈرامائیت پیدا کرنے کی کوشش میں "کتابی" طرز تحریر پیدا ہوگیا ہے جو بولنے میں بیگانہ سا معلوم ہوتا ہے۔ تاہم فضلی صاحب اس میدان میں ناکامیاب نہیں ہیں۔ وہ لکھ سکتے ہیں۔ اگرچہ وہ "کرداروں" کو انسان بنانے سے بالکل بے بہرہ نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر کردار کی زبان سے وہ خود بول رہے ہیں۔ اسی لیے ان کی انشا قطعاً لغوی معنوں میں ان کی خود نوشت سوانح عمری ہو کر رہ گئی ہے۔

گانے:۔ شاعری کے اعتبار سے اچھے ہیں ان کے برمحل استعمال پر البتہ شک کیا جا سکتا ہے۔ جگر کی غزل سہ "ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے" بھکارن کے منہ سے اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ خواہ خاک نشین کی معنویت پر کتنا ہی سر کیوں نہ دھنا جائے۔ پھر جس وقت جگر کی یہ غزل بھیکارن اپنی سہیلیوں کے ساتھ گاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس وقت اس جھرمٹ میں ایک فقیر (جوکر بنا ہوا) بھی اچھلتا، کودتا دکھائی دیتا ہے۔ اگر ذرہ سا اس کے چہرے کا رنگ اور میں ہٹا دیا جائے تو پھر آپ کو دھوکہ ہو جائیگا کہ خود شاعر موصوف تو نہیں ہیں ــــ مس چورنگی جب پہلی بار "پی کوک کلب" میں جاتی ہے اور وہاں شہزادی جگر کی ایک غزل گانا شروع کرتی ہے تو اس کا دوسرا شعر بھکارن (یعنی مس چورنگی) گا دیتی ہے۔ یہ گویا ترکی بہ ترکی جواب ہوتا ہے۔ جو ذہنی طور پر شہزادی کو بھکارن کی سطح پر یا بھکارن کو شہزادی کی سطح پر کھینچ لے جاتا ہے۔

موسیقی:۔ خوب ہے۔ مہتاب کی وہ آواز جو مکالمہ ادا کرتی ہے۔ اور وہ آواز جو گانا گاتی ہے۔ یکساں نہیں، اور یہ پہلے بینا میں کوئی نقص نہ ہونے کے باوجود یہ آسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ مہتاب نہیں بلکہ کوئی اور گا رہا ہے۔ کیونکہ گانیوالے کی آواز اور اس کے لب ولہجہ میں "بنگالیت" نمایاں ہے۔ بہت نمایاں ــــ (قاضی نذر الاسلام) مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے وہ طرزیں باندھیں کہ سن کر جی خوش ہو جاتا ہے۔

ناچ نہ ہونے کے برابر ہیں "پان" جو دکھایا گیا ہے وہ بالکل فضول سا معلوم ہوتا ہے۔ مہتاب کے گانے کے ساتھ

ناچنا بھی بہت اچھا نہیں کہا جا سکتا، سیدھے، طویل اور مدھم حرکات ہیں جن کو گانے کے ساتھ ہم آہنگ کر لیا گیا ہے ۔۔۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ کیا بہتر ہوتا "چورنگی ہے یہ چورنگی" والے گانے کو سنگت میں گوایا جاتا اور اس پر ناچ ترتیب دیا جاتا اور مضائقہ نہ ہوتا تو شاعر صاحب بھی اس موقع پر بلا لیے جاتے کیونکہ بار بار نام پبلسٹی کرنے سے تو زیادہ بہتر ہوتا کہ ایسے ہی موقع پر بذات خود نمایاں ہو جاتے ۔۔۔ اداکاری میں ایکٹرسیں ایکٹروں سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ بہتر کام انیس خاتون کا ہے۔ مہتاب بھی اچھی ہے۔ نظیر کاشمیری غنیمت ہے۔ امجد بری طرح ناکامیاب رہا۔

پھر غور کیجیے تو ہیرو اور ہیروئن کی شخصیت میں ایک ہی روح سمائی ہوئی ہے، صرف لباس اور ماحول کے فرق کو دیکھ کر دو جدا جدا شخص کہا جا سکتا ہے ورنہ وہ دونوں جب بات چیت کرتے ہیں تو ایک ذہنیت اور ایک علمیت کے مالک نظر آتے ہیں۔ پھر ایک طرف ظاہر کیا جا رہا ہے کہ بھکارن جاہل ہے اور لکھنا پڑھنا نہیں جانتی اس کے چچا اور چچی ٹھیٹھ دیہاتی زبان بولتے ہیں اس کی سہیلیاں بھی بنگالی اردو یعنی تانیث تذکیر اور واحد جمع کی قیود سے آزاد اردو بولتی ہیں۔ لیکن اس کے منہ سے شستہ اردو کے علاوہ بعض اوقات تو ادبی قسم کے جملے بھی زبان سے نکلتے ہیں، پھر گاتی بھی ہے تو جگر کی غزلیں ۔۔۔ کیا یہ حسن مذاق قابل یقین نظر آسکتا ہے۔ پھر زبان کے علاوہ بھکارن کا دماغ فلسفیانہ معلوم ہوتا ہے ۔۔۔ "تم کیوں بھیک مانگتی ہو؟" کے سوال پر اس نے عام بھکارنوں کی طرح اپنی غربت کا حوالہ نہیں دیا بلکہ خود سوال کرتی ہے کہ آپ بھیک کیوں نہیں مانگتے" ۔۔۔ پھر ہیرو کہتا ہے کہ یہ "بری چیز ہے" پھر وہ جواب دیتی ہے "یا اس لیے کہ آپ کے پاس دولت ہے" ۔۔۔ ذرہ غور فرمائیے یہ لیاقت جاہل بھکارن میں نہیں ہوتی۔

دوسرا اہم کردار ہیرو کا ہے۔ یہ خود مغربیت میں ڈوبا ہوا ہے، اور فرسودہ رسم ورواج سے بغاوت کرنے کی جرات بھی اس میں موجود ہے۔ چنانچہ بھکارن سے شادی کر لینے کا تہیہ اس کا سب سے کھلا ثبوت ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ اپنے زور بازو سے دولت کمانے کو قابل فخر سمجھتا ہے، یہاں تک کہ موقع پر رکشا کھینچنا بھی اسے برا نہیں معلوم ہوا ۔۔۔ یہ سب مردانگی اور بہادری ہے ۔۔۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ہیرو کے باپ نے بھکارن کو اپنی بہو تسلیم کر لیا تو پھر اس کی وہ خود اعتمادی کہاں گئی۔ پھر اس نے اپنے زور بازو سے کسب معیشت کا خیال ترک کر کے باپ کی دولت پر قناعت کیوں کر لی؟ کیوں نہیں اس نے اپنے باپ سے "معصوم" کی طرح کہہ دیا کہ مجھے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کا شوق ہے۔ آپ کی خوشنودی میرے سر آنکھوں پر۔ ہیرو کے یہ نہ سمجھنے پر شبہ ہوتا ہے کہ اس کی علحدگی اور کشمکش اپنے محبت کے حصول کے لیے "روزہ بہ قصد موت" قسم کی مدافعت مجہول تھی کیونکہ جانتا تھا کہ ایک دن باپ کی محبت اس کے آگے ہتیار ڈالے گی۔ (نوٹ) چورنگی کا سو فیصدی سچا واقعہ آئندہ جدید اردو میں افسانوی صورت میں شائع کیا جائیگا۔ قارئین کرام انتظار کریں۔

ع - ج

اعلان

"سیمابی اسلوب تنقید کی قلعی کھل گئی" کے عنوان سے جو سلسلہ "جدید اردو" میں شائع ہو رہا تھا، اتفاقیہ طور پر بند ہو جانے کی وجہ سے اکثر قارئین کرام کے خطوط دفتر میں موصول ہو رہے ہیں ۔۔۔ جواباً عرض ہے کہ مولانا سید منظور الحق صاحب جو خود اس سلسلے کو جاری رکھے ہوئے تھے، دفتر جدید اردو کو اطلاع دی ہے کہ میں بوجوہ چند در چند مشغولیت کے باعث اس سلسلہ کو جاری نہیں رکھ سکا۔ انشاء اللہ بہت جلد اس سلسلہ کو جاری کر دوں گا۔

"ادارہ"

RED. No C. 2535

JADIDURDU

36, MARSDEN St. CALCUTTA

قواعد و ضوابط

۱ - رسالہ ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو شایع ہوا کریگا خریداروں کو چاہئے کہ رسالہ ۱۵ تاریخ تک نہ ملنے پر دفتر سے طلب کریں۔

۲ - اہلِ قلم حضرات سے درخواست ہے کہ وہ مضامین مہینے کی ۱۵ تاریخ تک ایڈیٹر کے نام بھیجدیں

۳ - مضامین صاف اور شستہ تحریر ہوں۔

۴ - وہی مضمون پرچہ میں شایع ہوسکتا ہے جو معیارِ ادب و اخلاق سے گرا نہ ہو۔

۵ - دل آزار و فرقہ دارانہ مضامین نیز سیاسی مضامین شایع کرنا پرچہ کی پالیسی کے خلاف ہے۔

۶ - نمونہ کا پرچہ مفت نہیں بلکہ ۲ر کا ٹکٹ آنے پر بھیجا جائیگا۔

۷ - جواب کے لئے جوابی کارڈ یا اسٹامپ کا آنا ضروری ہے۔

۸ - خط وکتابت و ترسیل زر کا پتہ:- منیجر جدید اردو ۳۶ مارسڈن اسٹریٹ کلکتہ

۹ - کاروباری حضرات اشتہار کے لئے منیجر سے خط وکتابت کریں

۱۰ - سالانہ چندہ صرف دو روپیہ (عہ)، غیر ممالک کے لئے ۵ شلنگ

لے جلیل - منیجر جدید اردو نمبر ۳۶ مارسڈن اسٹریٹ کلکتہ

جدید اردو

مشرقی ہند کا علمی ادبی ماہنامہ

تین آنہ فی پرچہ

دو روپے قیمت سالانہ

پروپرائٹر: شاہد ...

جدید اردو کلکتہ

مدیر اعزازی: محمد ظہور احسن قاضی

چندہ سالانہ دو روپیہ
ششماہی - ایک روپیہ
فی پرچہ ۳ر

ستمبر سنہ ۱۹۴۲ء

جلد ۵ | نمبر ۹

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر عبدالجلیل نے قطب ہند پریس میں چھپوا کر ۱۲ مارسڈن اسٹریٹ سے شائع کیا۔

نکٹائی مارکہ زردہ

ہندوستان بھر میں اپنی خصوصیت کے اعتبار سے بے نظیر ہے۔ اعلیٰ درجے کے تمباکو سے ماہرین کیمیا اور خود مالک کارخانہ کی نگرانی میں یہ زردہ تیار کیا جاتا ہے جس محنت اور احتیاط سے یہ زردہ تیار کیا جاتا ہے ان کی صحت و کامیابی تجربہ سے ثابت ہو چکی ہے۔ یہ زردہ تمام اجزا سے پاک ہے۔ جس صفائی اور ستھرائی سے یہ زردہ تیار کیا جاتا ہے۔ اس کی بنا پر مالک کارخانہ کی طرف سے اس بات کی ضمانت پیش کیجاتی ہے۔ بوتلوں اور خوبصورت ڈبوں اور بکسوں میں آپ کے لیے حاضر ہے

نکٹائی مارکہ زردہ

نکٹائی مارکہ کارخانے کی بے مثل و بے نظیر دیگر چیزوں کی طرح نکٹائی مارکہ مشکی قوام بھی اپنی آپ نظیر ہے۔ اس قوام میں بہترین اور مفید ترین اجزا کے علاوہ مشک خالص اور زعفران کا حصہ غالب ہے۔ گلاب اور کیوڑہ کے عرق میں اس کا قوام تیار کیا جاتا ہے۔ نہایت خوش ذائقہ اور خوشبودار، دل و دماغ کو فرحت بخشتا ہے۔ پان کھانے والوں کو خصوصیت سے فائدہ پہنچاتا ہے نفاست پسند طبیعتوں کے لیے بہترین تحفہ ہے۔ یہ قوام دراصل ایک طرح کا ایک منجن ہے۔ ایک بار آزمائش کیجیے۔ اس کی تمام خوبیاں آپ پر روشن ہو جائیں گی۔ پھر یہ منجن برابر آپ کا ہمدم و دمساز بنا رہیگا اور لطف یہ کہ کم خرچ بالانشیں۔ ولایتی شیشیوں میں جدید ترین مشینری کے ذریعہ بند کیا جاتا ہے۔ ممکن نہیں کہ خرابی آ جائے۔ جن اجزا سے یہ قوام تیار کیا جاتا ہے وہ تمام پاک اور صاف چیزیں ہیں۔ اس لیے ہر مذہب و ملت کا آدمی نکٹائی مارکہ قوام بے تکلف استعمال کر سکتا ہے۔

کیسر بلاس

پان کی نہایت خوشبودار، خوشرنگ بے انتہا لذیذ بے حد مزیدار مسالہ ہے۔ ہمارے کارخانہ کی خاص ایجاد ہے جو علم سائنس کے ذریعہ اور ان کے اصولوں کو مدنظر رکھ کر تیار کیا جاتا ہے۔ کیسر بلاس معدہ کی تمام شکایتوں کو دور کرتا ہے۔ دل اور دماغ کو فرحت بخشتا ہے۔ آپ پان کھاتے ہوں تو کیسر بلاس ضرور استعمال کریں۔ اس لیے کہ بازار کا کوئی مسالہ ہمارے کیسر بلاس کی لذت اور خوشبو اور ذائقہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسے نہایت عمدہ شیشیوں میں خوبصورت لیبل سے آراستہ کرکے اس طرح پیک کیا جاتا ہے کہ کوئی جز ہاتھ سے مس نہیں ہوتا۔ یہ وہ مسالہ ہے جس نے قلیل عرصہ میں دنیا کے تمام مسالوں میں ہلچل ڈالدیا ہے۔ ہندستان کے گوشہ گوشہ میں اس کی مانگ بجلی کی رفتار کی طرح بڑھتی جا رہی ہے۔ اس مسالہ میں اتنی خوبیاں ہیں جو بیان نہیں ہو سکتیں۔

محمد مصطفیٰ حسین مالک کارخانہ نکٹائی مارکہ زردہ نمبر ۱۴۱ ہوڑہ روڈ ہوڑہ کلکتہ

شاخیں

نمبر ۲۵ کلایو اسٹریٹ کلکتہ۔ نمبر ۱۱ آرسکن روڈ بمبئی۔ نمبر ۱/۲۵ کیننگ اسٹریٹ۔ کلکتہ

غزل

پسِ پردہ بھی انکی جلوہ سامانی نہیں جاتی
نہیں جاتی مری آنکھوں سے حیرانی نہیں جاتی

کوئی مجنوں جو ویرانہ کبھی آباد کرتا ہے
بھیانک اور ہو جاتا ہے ویرانی نہیں جاتی

وہ بھر کر آنکھ میں آنسو تسلی دینے آئے ہیں
پریشاں اور ہوتا ہوں پریشانی نہیں جاتی

ہماری عقل دوراندیش ہے وجہِ پریشانی
سکوں ملتا ذرا لیکن یہ دیوانی نہیں جاتی

ہمارا نام تک سننا گوارا کر نہیں سکتے
یہی انداز کہتا ہے پشیمانی نہیں جاتی

جنابِ شیخ کے ارشاد پر کہنا پڑا آخر
حقیقت ہو جوانی میں مگر مانی نہیں جاتی

مرے نالے بھی بیخودؔ شعر کے سانچے میں ڈھلتے ہیں
اسیری میں بھی بلبل کی خوش الحانی نہیں جاتی

عباس علیخاں بیخودؔ

انقلابِ حسن

التفاتِ حسن ہم رنگِ جفا ہونے لگا
مژدۂ جاں بخش، پیغامِ قضا ہونے لگا

یاس کی تاریکیاں جس سے منور تھیں کبھی
وہ تبسم اب تو ظلمت آشنا ہونے لگا

ایکدن وہ تھا کہ تھا پیوستِ دل تیرِ نظر
ایکدن یہ ہے کہ تیر اُن کا قضا ہونے لگا

شیشۂ دل میں شرابِ کہنۂ اُمید ہے
لیکن اس میں زہرِ حرماں کا مزا ہونے لگا

جن لبوں پر ورد تھا ہر دم کسی کے نام کا
اُن لبوں پر ہر گھڑی کیوں "یا خدا" ہونے لگا

کھا گئی اُمید اپنی سادہ لوحی میں فریب
بے وفا ورنہ کوئی کیوں باوفا ہونے لگا

دل کو حیرت کیوں نہ ہو اس انقلابِ حسن پر
میں نے کیا سمجھا تھا خواجہ اور کیا ہونے لگا

خواجہ قدوائی

ادب میں خرافات کی اہمیت

یہ ایک حقیقت ہے بے حد دلچسپ اور شیریں کہ ایک طرف ہم ذہین کی مدد سے کائناتی مسائل پر تفکر کرتے ہیں تو دوسری طرف دانستہ نادانستہ خواب و خیال کی دنیا کو طلسمات سے آباد کرتے ہیں۔ بسا اوقات ہم جانے کیوں حقیقت سے کوسوں دور بھاگنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ نیوٹن نے سورج کی کرنوں کے بارے میں تحقیقات سے یہ ثابت کیا کہ یہ سات مختلف رنگوں کا ہم آہنگی ہے۔ اس پر ایک دل جلا انگریزی انشا پرداز بول اٹھا کہ ظالم ہوتم نے ان تجزیے سے قوس و قزح کے نشاط انگیز حسن کو خاک میں ملا دیا اسی طرح ایک خطرت پرست ہندستانی شاعر نے جو عطار کو دیکھا کہ وہ عرق گلاب کی خاطر پھولوں کو توڑ رہا ہے تو وہ نازک دل چیخ اٹھا۔

"گلوں کی کھینچ کے عطار نے خراب کی بو
کہاں وہ ان کا پسینہ کہاں گلاب کی بو"

جاہلی اور رومانی دور میں ہم زیادہ تر جذبات کی رو میں بہہ جایا کرتے ہیں مگر جب اقتصادی مسائل ہمارے خیالات کو حقیقی مادی دنیا کی طرف متوجہ کرتے ہیں تو اس وقت خیال آرائیوں کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے زندگی کے اہم پیچیدہ مسائل ہمارے سامنے نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ اور اس طرح مغرور رفتہ ہم مکمل مجسمہ سے مانٹے کارلو (MONTE CARLO) کے قمار خانے میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ مشینی تمدن کی موجودہ برکتوں نے ہمیں بہت حد تک حقیقت بیں بنا دیا ہے اور انہی حقائق کی روشنی میں ہم اپنے ماحول کا جائزہ لیتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ کبھی کبھی ایک مبہم تمنا کی خاطر ہم پھر وقت کی سوئیوں کو سیکڑوں اور ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں بار الٹی گھمانی شروع کرتے ہیں اور اسے گنتے ہوئے دور میں پہنچ جاتے ہیں جہاں رنگ محل کی خوشبو دوشیزہ مجسم بنکر انگڑائیاں لینے لگتی ہے

تان سین کے راگ، جہانگیر کا عشق اور شاہجہاں کا تصور تاج ہمارے لیے تمام دماغی عیاشیاں بہم پہنچاتے ہیں۔ یہی حال ادب کا ہے۔ اس حقیقت سے کون واقف نہیں کہ آدمی کو ہر لفظ کا صحیح تلفظ کرنا چاہئے مگر معصوم بچوں کی تتلاتی زبان جو الفاظ کو بگاڑ دیتی ہے تو اس کی شیرینیت کتنی بڑھ جاتی ہے۔ بناؤ سنگار سے حسن کی زیبائش تو ہوتی ہے مگر کبھی کبھی بکھرے گیسو بھی ڈس جایا کرتے ہیں، رقاصہ کے پاؤں نغماتی زیر و بم کے ساتھ تھرکتے ہیں اور جسم کا ہر حصہ جذبات کا ظاہری پرتو ہوتا ہے مگر کسی نے کسی بے خود اور نیم مدہوش رقاصہ کو لڑکھڑاتے ہوئے بھی دیکھا ہے؟ فنی اصول و قواعد سے نادانستہ انحراف کبھی کبھی لطف دوبالا کر دیا کرتا ہے۔ مشینی دنیا کے مسائل پر غور کرتے کرتے ہمارا دماغ تھک جاتا ہے اور ہم ذہنی سکون کی خاطر خرافات کی آڑ میں پناہ لیتے ہیں۔ نیویارک کے سر بفلک محل، پیرس کی جنت نگاہ شاہراہیں دنیا کی خوشبو سے بسی ہوئی عشرت گاہیں ہمارے موجودہ طریقۂ فکر کا نتیجہ ہیں مگر ہمارا حال یہ ہے کہ زلالی کی طرح کبھی اپنے ہی لاجواب شعر کو خرافات سمجھ کر قلم زد کر دیتے ہیں اور روما، دلی اور قاہرہ کے کھنڈر میں ایک تخیلی اندر سبھا رچاتے ہیں۔ ایسے کتنے ہی جاہل قدیم کتبوں اور محرابوں پر فنی نگاہ ڈالتے ہوں۔ یہ سیر سپاٹے دراصل تغیر پسند انسان کی بیتاب تمنا کے آئینہ دار ہیں اور ان کو ہمارے دماغ کے لیے وہی اہمیت حاصل ہے جو ادب میں خرافات کو حاصل ہے۔

مشاہیر عالم کے حالات بھی اس خرافاتی مسئلہ کو سمجھنے میں بہت مدد دیتے ہیں۔ اہل فن کی ظاہری حماقتوں سے خود ان کے فن کی دلچسپیاں اور بڑھ جاتی ہیں۔ علم ریاضی کے آفتاب نیوٹن کے بارے میں اس کے سیرت نگار لکھتے ہیں کہ وہ جب تک بیٹھے ہوئے پیسوں کو متعدد بار گنتا نہیں تھا وہ پریشان سا رہتا تھا حالانکہ وہ علم ہندسہ کا بے مثال ماہر تھا۔ یورپ کے تان سین بیتھوفن کا یہ حال تھا کہ جب تک وہ اپنے پاؤں کو برف پر نہیں رکھتا تھا اس کو دلکش اور سوز و ساز میں ڈوبے ہوئے راگ سوجھتے ہی نہ تھے۔ نپولین کی دلیری سے کس کو انکار ہو سکتا ہے مگر ایٹ کی یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ وہ بلی سے ڈرتا تھا مایہ ناز شعرا اور ادیب جو عالم خیال میں بھٹک گئے ہیں تو ان سے ادب کو چار چاند لگ گیے ہیں۔ ایک بار ایک ناقد نے گیٹے سے پوچھا کہ تمہارے کلام میں بعض مقامات مبہم سے کیوں ہیں؟ شاعر مسکرایا اور کہا تم سے بہلا ناقد یہی تو وہ تاریکیاں ہیں جن پر شاعر [illegible]

نازک خیالات اس حد تک لطیف ہو گئے ہیں ہم منظروں کا مشاہدہ نہیں کر پاتے اچھوتے تخیل اور نازک استعارات اشارات اس تصوراتی دنیا کی ایک دھندلی سی جھلک دکھا جاتے ہیں اور کبھی کبھی ہم ان سنگریزوں سے منزل کا سماں باندھنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ سنگتراش اگر مجسم نازنین کے تمام زاویوں کو صاف صاف نمایاں کر دے تو پھر تصور کے لیے لطیف احساس کہاں باقی رہتا ہے۔

دلکش فریب اور معصومانہ تشریح مسائل کی وہ دنیا وہ شیش محل ہے جہاں نا واقفیت کے چراغ سے ہزاروں تارے جھلملاتے لگتے ہیں اور چند لمحوں کے لیے ہم مسرت و انبساط کی روشن دنیا میں ناچنے لگتے ہیں اور ———

"اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا"

ایلس نے جنسیات پر جو تحقیقات کی ہیں ان کی اہمیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ مگر جب یہ بھی فرائڈ کی ہمنوائی کرتے ہوئے محبت کو شہوت قرار دیتا ہے تو دھڑکتے ہوئے پریمی دل "شراب رنگیلی نگہ" اور "چاندنی کی راتیں جوڑوں کے دن" کا خون ہو جاتا ہے تشریح الابدان کی موشگافیوں سے بحث نہیں مگر جب حجاب آگیں رخساروں کی اصلیت یہ رہ جاتی ہے کہ وہ گوشت خون ہڈیوں اور رگوں کا متناسب مجموعہ ہے تو چند لمحوں کے لیے اس کی دلکشی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور اس طرح جمالیات کے لیے یہ دنیا تنگ ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ جسمانی فقدان ہمارے ماحول کو خشک اور غیر دلچسپ بنا سکتا ہے اسی لیے ہم ادبی سنجیدگیوں میں گاہے ماہے خرافات کی جھلک دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس وقت ہم جس دور سے گذر رہے ہیں اس میں ابھی تک یہ غیر عناصر جلوہ فرما ہیں۔ یہ علمی نظارے قہوہ خانوں کی گپیں، دوستوں کے قہقہے، میخواروں کے رعشہ دار ہاتھوں سے چھلکی ہوئی انگوری شراب اور ہماری تمام رنگ رلیاں گو مرکز حقیقت سے کسی قدر منحرف کیوں نہ ہوں ان میں ہمارے تھکے ہوئے دماغ خمار آگیں انگڑائیاں لیتے ہیں۔ جدید تفریحی رجحانات میں قرون وسطی کی سادگیاں اور دلچسپ حماقتیں ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا ذیلی پسند انسان امریکی فلموں میں الف لیلہ کی تخئیلی دنیا کو نت نئے رنگوں سے پیش کر کے لطف اندوز ہوتا ہے۔

تمہارے عالم پہ چھانے والے تیرے نے ہزاروں شعر کہے۔ مگر خرافات کی بدولت نشتروں کا حسن دو بالا ہو گیا ہے۔ جیسے گلاب کے ساتھ کانٹے ہوں۔ "بے رنگ" "مجموعۂ اردو" نے "دیوان غالب" کے معنوی حسن کو اس معصومانہ تنقید سے اور بھی دلچسپ بنا دیا ہے جس طرح ایک مصور اعظم ایک معنوی ربط قائم کرنے کے لیے شبیہ کے ارد گرد دلکش پس منظر لاتا ہے۔ اسی طرح فن کار کی ادبی لغزشوں سے اس کی دلکشی بڑھ جاتی ہے

یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ آرٹ جس قدر بلند ہوگا، اسی قدر آرٹسٹ کی زندگی بظاہر خشک معلوم ہوگی۔ ہوتا یہ ہے کہ اہل فن اپنی جودت طبع ذہانت اور حیرت انگیز مشاہدوں کو فن میں منتقل کر دیتے ہیں۔ عموماً ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے مشاہیر کچھ دلچسپ حماقتیں کر بیٹھتے ہیں اور ان خرافاتی حرکتوں سے انسانی فطرت کی بے باکانہ سادگیاں اپنے اصلی روپ میں جھلک پڑتی ہیں۔

"باہر کمال اندکے آشفتگی خوش است :: ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش"

ڈاکٹر سید اختر امام - ام - اے - (علیگ)

تاجِ زندگی

دلِ انساں سے کیوں جنسِ ستم رانی نہیں جاتی
ستم کوشی ستم سازی کی شیطانی نہیں جاتی

زمیں اِس کی ہوا اس کی ہر اک شے بر ملا اسکی
غضب ہے اس کی فطرت کی ہوس رانی نہیں جاتی

حکومت فرش پر اس کی وزارت عرش پر اس کی
پر اس کی طفلِ ناداں کی سی نادانی نہیں جاتی

ہوس ہے کارفرما اس کے جینے اور مرنے میں
لحد میں بھی ہوس کی دل سے جولانی نہیں جاتی

ہوس نے رہزنی صید افگنی انسان کو بخشی
زمیں سے اس جفاجو کی جہاں بانی نہیں جاتی

تمنا ہے ہوس کو پھر ابد تک شہر یاری کی
نگاہِ کافری سے کفر سامانی نہیں جاتی

زمین زن اور زر کو تو خدا سمجھا تو کیا سمجھا
تری اس کافری سے کیا مسلمانی نہیں جاتی

اگر دنیا ہے مومن کی تو تیری ہو نہیں سکتی
کہ تیرے دل سے بے دینی کی سلطانی نہیں جاتی

اڑینگے گرد رہ بن کر ہوس پرور ستم پرور
ترے دل سے مگر انکی گراں جانی نہیں جاتی

قناعت کر قناعت کر یہی اکسیر تسکین ہے
ہوس کے زہر سے دل کی پریشانی نہیں جاتی

جھکے گی پھر جبینِ دنیا کی اُس انسان کے آگے
فقیری میں بھی جس کے دل کی سلطانی نہیں جاتی

محبت اور قربانی ہے تاجِ زندگی ماہرؔ

کہ قاتل کے بھی دل سے اس کی تابانی نہیں جاتی

دو باب کا ڈرامہ

ارتھی

[ایک شاہوکا کمرہ۔ شام کا وقت ہے۔ سورج کی روشنی مدھم ہو رہی ہے۔ ایک ادھیڑ عمر کا شخص موہن بجلی کے قمقمے کے سامنے بیٹھا ہے مگر ابھی روشنی نہیں ہوئی۔ اُس کے آگے یورپ کا نقشہ رکھا ہے۔ اور اس کے دائیں ہاتھ میں ایک سرخ پنسل ہے۔ جس سے وہ نقشہ پر نشان بنا رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خود عنقریب اس سفر کا ارادہ رکھتا ہے]

[چچی داخل ہوتی ہے، یہ بھی ایک ادھیڑ عمر کی عورت ہے جس نے عمر بھر شادی نہ کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے۔ یہ فطرتاً بہت سخت کوش ہے لیکن اس کی سخت کوشی کبھی کبھار ظاہر ہوتی ہے۔ یہ ان اگلے وقتوں کے لوگوں میں سے ہے جن کی زندگی کا مقصد اس لیے فوت ہو چکا ہے کہ انھوں نے بعض "روحانی وجوہ" کی بنا پر ساری عمر شادی نہ کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔

چچی :۔ دیکھو نا! . . . . . بھلا اِس طرح تمہاری آنکھیں خراب نہ ہوں گی کیا؟

موہن :۔ چچی! مجھے اِس وقت کچھ مت کہئے۔ آپ میرا حد سے زیادہ فکر کرتی ہیں، جو بعض وقت مجھے بہت برا لگتا ہے، بھلا یہ بھی کوئی انصاف ہے؟

چچی :۔ اچھی بات! بہت اچھا! مگر دیکھو۔ تم بھی میری بات میں مت ٹوکا کرو۔ میں نے تم کو بچپن سے اب تک اپنے ہاتھوں میں پالا۔ اور اپنا تمام روپیہ تمہارے لیے بنک میں جمع کرا دیا۔ اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ تم بھی میری مرضی اور خوشی کا کچھ پاس کرو۔

موہن :۔ لیکن چچی! آپ میرے لیے اتنی پاگل کیوں ہو رہی ہیں، ذرا سوچئے تو سہی کہ میری آنکھیں یورپ کا نقشہ دیکھنے سے کیونکر خراب ہو سکتی ہیں؟

چچی :۔ دیکھو بیٹا موہن۔ شام کے دھندلکے میں پڑھنا آنکھوں کیلیے برا ہے۔ میرے اچھے بیٹے، میری بات سنو۔ میں تم سے عمر میں بڑی ہوں میں نے اپنے بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ بعض باتوں میں میری عقل اور تجربہ تم سے بڑھ کر ہے۔ دیکھو۔ یہ مدھم روشنی آنکھوں کو نقصان پہنچاتی ہے۔ میں نے انگوڑی سائنس تو نہیں پڑھی، مگر اتنی تو سمجھ مجھ میں ضرور ہے، میں دودھ پیتی بچی نہیں ہوں۔

موہن :۔ ہاں چچی۔ یہ تو آپنے سچ کہا۔ آپ کی عمر اب کوئی پچاس برس کی ہوگی

چچی :۔ ہاں بیٹا۔ میں آج سے پچاس برس پہلے پیدا ہوئی تھی۔

موہن :۔ لیکن چچی۔ آپ تو ابھی ستر برس کی [illegible] معلوم ہوتی ہیں!

چچی :۔ (قدرے جھینپتے ہوئے) ہیں! بیٹا۔ تم یہ کیا کہتے ہو؟ — لیکن بیٹا موہن۔ یہ کیا بات ہے؟ جو شخص بھی مجھے دیکھتا ہے۔ یہی سمجھتا ہے کہ شاید میں ایک نوجوان لڑکی ہوں۔ اور سنو تو (شرماتے شرماتے چہرہ سرخ ہو جاتا ہے) بعض لوگ تو مجھے شادی کا پیغام بھی بھیج دیتے ہیں۔

موہن :۔ ہاں۔ ہاں چچی۔ کیوں نہیں۔ اور آپ تو پیغام کا نام سن کر خوش ہو جاتی ہوں گی؟

چچی :۔ واہ بیٹا۔ یہ بھی ایک ہی کہی۔ میں تو سب کو اپنے بیٹوں جیسا سمجھتی ہوں۔ مگر موہن تم بڑے شریر ہو۔ جو ایسی باتیں کرتے ہو۔

موہن :۔ کیوں چچی۔ آپ کو معلوم نہیں۔ بوڑھے لوگ تو یہ دل سے چاہتے ہیں کہ ان کی جلد شادی ہو جائے۔

چچی :۔ دیکھو موہن۔ ایسی بری باتیں نہ کرو، ورنہ میں ابھی بگڑ جاؤنگی۔ کیا تم اپنی چچی کی عزت کرتے ہو؟ (آگے بڑھ کر وہ بجلی کے قمقمے کا بٹن دبا دیتی ہے) ہاں اب ٹھیک ہے۔ اب کمرہ روشن ہو گیا۔

موہن :۔ چچی! میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی ہمارے ساتھ یورپ کو چلیئے!

چچی :۔ بھلا بیٹا۔ میں کیونکر جا سکتی ہوں؟ میں یہاں گھر کی دیکھ بھال کروں گی۔ اور اب میں کہیں بھی جانا نہیں چاہتی۔ اور ان دنوں تو یورپ میں بڑی سردی ہوگی۔ میں ایسی سخت سردی میں ٹھٹھر کر مر جاؤنگی اور وہاں اب تو وہاں پہلے زمانے کی نسبت بہت سخت سردی پڑتی ہوگی۔

موہن :۔ چچی! آپ یورپ کب گئی تھیں؟

چچی :۔ میں وہاں پچھلی لڑائی سے بہت پہلے گئی تھی۔ اُن دنوں وہاں لڑائی جھگڑے کا کوئی ڈر نہیں تھا۔ مگر اب تو کل دنیا ہی بدل گئی ہے۔

موہن :۔ لیکن چچی۔ ایک تم ہو کہ نہیں بدلی۔ جیسی جھگڑے سے پہلے تھی، ویسی اب ہو۔

(چچی اٹھکر کمرہ سے باہر چلی جاتی ہے، موہن آپ سے آپ باتیں کرتا ہے)

ہماری چچی بھی عجیب آدمی ہے۔ ہمیشہ مجھ پر اپنا حکم چلاتی ہے کہ میں یہ کام اس کی مرضی سے کروں، اور یہ کام نہ کروں۔ کبھی کہتی ہے کہ میں اخبار نہ پڑھا کروں کیونکہ اُس میں جھوٹی خبریں ہوتی ہیں، کبھی کہتی ہے، کہ میں فلاں آدمی سے بات نہ کروں۔ حیرانی کی بات ہے، کہ میری چچی مجھے قیدی بنا کر رکھنا چاہتی ہے میرے لیے میری چچی ہٹلر سے کیا کم ہے۔ میں تو اس چچی سے تنگ آگیا ہوں۔ اور اب کہتی ہے، کہ میں اس کی کوئی بات نہ ٹوکوں۔ مگر میں کیا کروں۔ کیا نہ کروں، اُس کے پاس روپیہ ہے۔ دولت ہے!

(موہن کی چھوٹی سی لڑکی کمرہ میں آہستہ آہستہ داخل ہوتی ہے)

لڑکی :۔ پتا جی، پتا جی۔ ہم جہاز پر کب سوار ہونگے؟ کیا جہاز بہت بڑا ہوتا ہے؟

موہن :۔ ہاں ننھی! اب ہم جلد ہی جہاز پر جائیں گے۔ اور ہاں جہاز بہت بڑا ہوتا ہے

لڑکی :۔ کیا جہاز ہاتھی سے بھی بڑا ہوتا ہے۔

موہن :۔ ہاں۔ رانی! جہاز ہاتھی سے بھی بڑا ہوتا ہے

لڑکی :۔ کیا سڑک سے بھی بڑا۔ اور ہمارے گھر سے بھی بڑا؟

موہن :۔ ہاں بیٹی، ہمارے گھر سے بھی بڑا۔ وہ اس سے تین گنا اونچا ہوتا ہے، اور اُس میں سات سو "کیبن" ہوتے ہیں

لڑکی :۔ مگر پتا جی "کیبن" کیا ہوتا ہے؟

موہن :۔ بیٹا :۔ بیٹا۔ یہ ایک کمرہ سا ہوتا ہے

(گھر کے اندر سے رانی کی ماں لڑکی کو پکارتی ہے۔ اور "رانی" "رانی" کی آواز سنائی دیتی ہے)

جاؤ۔ رانی۔ تمہاری ماتا تم کو بلا رہی ہے، جاؤ اپنی ماتا کا کہنا مانا کرو

لڑکی :۔ (چلا کر ماں سے) جی ماتا جی، بہت اچھا۔ میں آرہی ہوں (موہن سے) مگر پتا جی۔ یہ تو بتائیے۔ کیا جہاز سمندر سے بھی بڑا ہوتا ہے؟

موہن :۔ (گھبرا کر) ننھی۔ تم بھی عجیب عجیب سوال پوچھتی ہو، تم کو کس نے بتایا، کہ جہاز سمندر سے بھی بڑا ہوتا ہے؟

لڑکی :۔ مگر پتا جی۔ اگر سمندر جہاز سے بھی بڑا ہوتا ہے، تو کیا سمندر میں جہاز غرق نہیں ہو سکتا؟

موہن :۔ نہیں بیٹا۔ جب تک سمندر میں طوفان نہ آئے، جہاز نہیں ڈوب سکتا۔

لڑکی :۔ لیکن پتا جی۔ اگر سمندر میں طوفان آجائے، تو پھر جہاز کیا کرتا ہے؟

موہن :۔ جہاز بچ بھی جاتا ہے۔ جہاز والے کئی چالیں اور ترکیبیں جانتے ہیں۔ جن سے وہ جہاز کو بچا لیتے ہیں

لڑکی :۔ مگر پتا جی، شیلا بہن کہتی تھی، ـــ وہی شیلا بہن جو رنجیت سیٹھ کے کارخانہ میں کام کرتی ہے۔ وہ کہتی تھی، کہ ہزاروں آدمی جو کارخانوں میں کام کرتے ہیں، وہ سمندر کی طرح بہتے ہیں، اور کارخانہ کے مالک کی ہستی ایک جہاز کی مانند ہے۔ سو اس لیے کارخانہ کے مالک کو بھی کئی چالیں آتی ہونگیں!

موہن :۔ اونہہ۔ وہ اَن پڑھ گنوار شیلا تم کو فضول باتیں سکھاتی رہتی ہے۔

(گھر کے اندر سے لڑکی کی ماں کی آواز پھر سنائی دیتی ہے "رانی!" "رانی!!")

لڑکی :۔ آرہی ہوں۔ ماتا جی۔ (پھر موہن سے) اچھا۔ پتا جی کیا آپ نے سمندر اور جہاز کے متعلق بھی کوئی کہانی لکھی ہے؟

موہن :۔ ہاں۔ بیٹا۔ کئی کہانیاں اور کئی نظمیں لکھی ہیں۔

لڑکی :۔ لیکن پتا جی۔ آپ اُس سمندر کی بابت کچھ نہیں لکھتے جو کارخانے میں بہتا ہے۔ اور اُس چالیں جاننے والے جہاز کی بابت بھی جو کارخانے کا مالک ہے!

لڑکی کی ماں نلینی کمرہ میں داخل ہوتی ہے۔ اور اس کے پیچھے چچی آتی ہے۔ اس کے ہاتھوں میں دودھ کا پیالہ ہے۔ جسے وہ ایک چھوٹی سی میز پر رکھ دیتی ہے۔

نلینی :۔ رانی میں تجھے کتنی بار پکار چکی ہوں۔ پکارتے پکارتے میرا سر بھی درد کرنے لگا۔

لڑکی :۔ ماتا جی۔ میں پتا جی کو بہت کم دیکھتی ہوں۔ مجھے پتا جی سے بہت پیار ہے، اور میں اپنے پتا جی سے باتیں کر کے بہت خوش ہوتی ہوں۔

چچی :۔ (لڑکی سے) تم کیسی بچی ہو۔ اپنے پتا کا وقت ضائع کرتی ہو

اور اب تم کو کوئی کام کرنے نہیں دیتی! آؤ ادھر آؤ۔ اب یہ تمہارے سونے کا وقت ہے۔

(چچی رانی کو ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھا لیتی ہے، اور کمرہ سے باہر لے جاتی ہے)

موہن :۔ یہ کتنی موہنی مورت ہے؟

نلینی :۔ کون! تمہاری بڑھیا کھوسٹ چچی؟

موہن :۔ نہیں۔ میں تو رانی کو کہہ رہا ہوں

نلینی :۔ اچھا۔ میری ایک بات مانوگے؟ میں کمخواب کی سنہری پوشاک ضرور خریدنا چاہتی ہوں، چاہے کچھ ہو جائے۔ جب ہم یورپ کو جائینگے تو وہاں ہم پھٹے پرانے چیتھڑوں میں کیونکر جا سکیں گے۔ ہمارے پاس کوئی خاص ہندوستانی چیز ہونا چاہئے۔ میں نے تو سنا ہے کہ فرانس کے لوگ ہندوستان کی زرق برق لباس دیکھ کر پاگل ہو جاتے ہیں

موہن :۔ مگر نلینی۔ کمخواب کے دام بہت زیادہ ہیں۔ بھلا سوچو تو سہی، ایک ہزار روپے کیا کم دام ہیں؟

نلینی :۔ تو پھر کیا ہوا۔ ہے بھی تو وہ کتنا خوبصورت اور اچھا! معلوم ہے وہ بنارس کا بنا ہوا ہے؟ سارا یورپ اس کو دیکھ کر پاگل ہو جائیگا

موہن :۔ اچھا میں چچی کو پوچھونگا۔ اگر وہ مان جائیں تو۔۔۔۔!

نلینی :۔ (بات کاٹ کر) وہ۔ چچی سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟

موہن :۔ کیونکہ سارا روپیہ چچی کا ہے نہ!

نلینی :۔ لیکن آپ تو شاعر ہیں، ادیب ہیں، اور شاعر کا حق سب کے روپیہ پر ہوتا ہے

موہن :۔ اچھا۔ میں چچی کو کسی بہانہ سے کہونگا کہ ہمارے دیس کی عزت کی خاطر اس پوشاک کا خریدنا ضروری ہے کیونکہ اگر ہم ولایت کو اپنے ملک کی اچھی اچھی چیزیں لے کر جائینگے۔ تو اس طرح ولایت والوں کے دلوں میں ہمارے ملک کی عزت بڑھیگی۔

نلینی :۔ (پیار سے) آپ تو واقعی بہت بڑے شاعر ہیں (پاس آکر بیٹھ جاتی ہے) آپ جو کہتے ہیں سچ ہے، ہمیں یہ قیمتی پوشاک صرف اپنے ہی لیے نہیں بلکہ اپنے دیس کے لیے بھی ضرور خریدنا چاہئے۔

(نوکر کمرہ میں داخل ہوتا ہے)

نوکر :۔ کام ختم کے مالک رنجیت سیٹھ جی آپ لوگوں سے ملنے کیلئے آئے ہیں

موہن :۔ اچھا [illegible]

(نوکر کمرہ سے باہر جاتا ہے)

نلینی :۔ (منہ بنا کر) اوہ! یہ رنجیت سیٹھ جی ہمیشہ ایسے بے وقت میں آجاتے ہیں، دیکھئے۔ میں آپ کو ایک پتے کی بات کہوں میرا خیال ہے کہ نہ جانے یہ رنجیت سیٹھ مجھ سے شاید کچھ پریم کرتا ہے مگر اس میں اس کا کیا قصور ہے؟ یہ سب میرا ہی قصور ہے، کہ بھگوان نے مجھے اتنی سندر کیوں بنایا!

(رنجیت سیٹھ کمرہ میں داخل ہوتا، وہ ادھیڑ عمر کا ایک فیشن پرست آدمی ہے۔ دولتمند ہے مگر دوسروں کا خون چوس کر امیر بن گیا ہے)

رنجیت :۔ خیریان موہن جی۔ نمستے اور بھابی جی کو بھی نمستے۔ کہئے کیا حال ہے؟ یورپ جانے کی تیاری ہو رہی ہے نا؟

نلینی :۔ جی ہاں سیٹھ جی۔ اور ہم ابھی آپکے آنے سے پہلے ایک بات کر رہے تھے۔

رنجیت :۔ کیسی بات کر رہے تھے؟

نلینی :۔ بات یہ تھی۔ کہ میں بنارس کی بنی ہوئی کمخواب کی سنہری پوشاک خریدنا چاہتی تھی جس کی قیمت صرف ایک ہزار روپئے ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہم اپنے دیس کی خاطر کوئی سندر چیز ولایت لے جائیں، تو اس سے ہمارے دیس کی شہرت ہوگی۔ ہمارے بڑے بڑے کانگرسی لیڈر بھارت ورش کا نام اتنا مشہور نہیں کر سکتے، جتنا یہ کمخواب کی پوشاک مشہور کر دیگی۔

رنجیت :۔ ہاں بالکل ٹھیک ہے (جیب سے بنک کے چیک کی کتاب نکال کر) کیا آپ لوگ میری طرف سے اس کے لیے چیک منظور کرینگے

نلینی :۔ اجی نہیں، نہیں۔ رہنے دیجئے۔ ہم روپیہ نہیں لیں گے۔

موہن :۔ سیٹھ جی۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟

رنجیت :۔ آخر میرے چیک دینے میں ہرج ہی کیا ہے؟

نلینی :۔ نہیں، آپ کی بڑی مہربانی۔ ہم چیک نہیں لے سکتے۔

رنجیت :۔ اچھا۔ چیک مت لو۔ لیکن پوشاک تو لوگے نا؟

موہن :۔ نہیں۔ نہیں، دیوالی پر میری چچی یہ پوشاک نلینی کو لے دیگی۔

رنجیت :۔ اوہ! ابھی دیوالی میں تو بہت دن ہیں، اور جب دیوالی آئیگی تو دیکھا جائیگا۔ اس وقت پھر دیا نہ کوئی اور چیز [illegible] [illegible]

نلینی:۔ سیٹھ جی۔ آپ کتنے سخی آدمی ہیں!

رنجیت:۔ (چیک پر لکھ کر، دستخط کر کے اور چیک کا ورق پھاڑ کر نلینی کو دیتا ہے) یہ میں اپنی طرف سے آپ لوگوں کے لیے ایک ناچیز تحفہ پیش کرتا ہوں۔ آپ مجھے ہمیشہ اپنا تابعدار سمجھئے

نلینی:۔ یہ آپ کی بڑی مہربانی ہے۔

موہن:۔ (غصہ میں آپے سے باہر ہو کر) دیکھئے سیٹھ جی۔ یہاں آکر پاجی پن مت کیا کیجئے۔

رنجیت:۔ ہیں۔ یہ کیا ہوا؟ کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ آپ ناراض ہو گئے یعنی آپ کے خیال میں آپ کو میری کسی بات پر شک ہے۔

موہن:۔ نہیں۔ خیر (قدرے دھیما ہو کر) اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اس سے ہماری دوستی مضبوط ہوگی، تو آپ بڑی خوشی سے چیک دیجئے، لیکن بہرحال یہ آپ کی بڑی مہربانی ہے۔

رنجیت:۔ اجی۔ مہربانی کیسی؟ خدا نے مجھے دھن دیا ہے اور مجھے امیر بنا دیا ہے، تو میرا فرض ہے، کہ میں اپنے دوستوں کی مدد کروں یہ پرماتما کی مہربانی ہے، کہ میں امیر ہوں۔ بڑی سڑک پر میری چار کوٹھیاں کرائے پر ہیں۔ میرے سات کارخانے چل رہے ہیں۔ اور اس وقت میرے دس کارخانے ہیں

موہن:۔ جی ہاں۔ یہ اپنی اپنی قسمت ہے بعض آدمی امیر گھروں میں پیدا ہوتے ہیں، اور بعض غریب گھروں میں۔ ساری عمر محنت مزدوری کرتے ہیں، لہو پسینہ ایک کرتے ہیں پھر کہیں جا کر پیسہ کی شکل دیکھنا نصیب ہوتی ہے۔ اس امیری غریبی میں بھی پرماتما کا ایک خاص مطلب ہے۔

نلینی:۔ سیٹھ جی۔ کیا آپ کو معلوم ہے، کہ میرے پتی جی ایک بہت بڑے شاعر اور ادیب ہیں۔

(چچی کمرہ میں داخل ہوتی ہے، اس کے ہاتھوں چائے اور ناشتہ کا تھال تھا)

چچی:۔ لیجئے سیٹھ جی۔ چائے پیجئے۔

رنجیت:۔ اوہو۔ آپ نے تکلیف کیوں کی؟

چچی:۔ اجی نہیں۔ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ چائے تو اس گھر میں پانی کی طرح بہتی ہے۔ لیجئے یہ کیک کھائیے۔ یہ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے سیٹھ جی میرا بھتیجا موہن چائے کا بڑا شوقین ہے بہت چائے پیتا ہے، اور ہاں شاعر کو ضرور چائے پینا چاہئے۔ چائے پینے سے دماغ میں اچھے اچھے شعر آتے ہیں

رنجیت:۔ آپ تو بڑی سمجھدار قابل معلوم ہوتی ہیں، شاید آپ بہت کتابیں پڑھتی ہیں!

چچی:۔ آہ۔ کیا کہوں۔ میرے پاس اتنا وقت کہاں؟ لیکن وقت سے ہوتا بھی کیا ہے! میں یوگ اور گیان کے طریقوں سے آنکھیں بند کر کے تمام کتابوں کے حال معلوم کر لیتی ہوں۔ میں سائنس بھی جانتی ہوں اور فلسفہ بھی۔ میرے بھتیجے کو سب حال معلوم ہے۔ میرا بھتیجا خود بھی ایک بہت بڑا شاعر اور ودیا دان ہے

موہن:۔ چچی جی۔ آپ ہر وقت مجھے شاعر اور ودیا دان مت کہا کیجئے آپ بار بار ایک ہی بات کی رٹ لگا کر مجھے شرمندہ کرتی ہیں،

چچی:۔ واہ بیٹا۔ کیوں۔ ہمارا سارا کنبہ شاعروں کا ہے۔ اچھا۔ اپنی بات چھوڑو۔ مجھے دیکھو۔ کیا میں شاعر نہیں ہوں؟

رنجیت:۔ جی ہاں۔ کیوں نہیں۔ موہن کو خوش ہونا چاہئے کہ آپ اس کی چچی ہیں۔

چچی۔ ہاں، ہاں۔ اور میں بھی خوش ہوں، کہ موہن میرا بھتیجا ہے کتنا اچھا پیارا اور لاڈلا بیٹا ہے میرا کہنا جھٹ مان لیتا ہے۔ میرے لیے تو ابھی یہ ننھا بچہ ہے۔ کتنا بھولا بھالا ہے، لوگ اسے دھوکا بھی دے جاتے ہیں۔

رنجیت:۔ جی ہاں۔ موہن بہت نیک آدمی ہیں

چچی۔ اور ہاں۔ اسی لیے تو ان کا میں اتنا فکر رکھتی ہوں ہر وقت جو کسی کرتی ہوں۔ میری رائے میں شاعر ایک دیوتا ہے اور اس کو ایک اونچی جگہ پر رکھنا چاہئے کیونکہ وہ دوسرے لوگوں کی برابری نہیں کر سکتا۔ وہ ایک قسم کا اوتار ہوتا ہے

موہن۔ میں یہاں سے اٹھ جاتا ہوں۔ جب میری تعریف کی جائے، تو میں بہت برا مانتا ہوں۔

چچی:۔ ارے واہ بیٹا، تم کیوں اٹھ جاؤ گے موہن، کیا میرا اتنا بھی حق نہیں کہ میں جو چاہوں کہوں؟ تم کو برا ماننے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر تم ایک بڑے شاعر ہو، تو تمہارا اس میں کیا قصور ہے؟ پرماتما نے تم کو شاعر بنا کر پیدا کیا۔ اور میں نے تم کو شاعر کیا، پالا، پوسا۔

موہن:۔ اچھی بات ہے۔ میں چپ رہتا ہوں۔ آپ جو دل میں آئے کہئے۔

رنجیت :- (موہن سے) اجی، آپ ان کی باتوں کا برا نہ مانا کریں مجھے تو ان کی باتیں سن کر خوشی ہوتی ہے

(گھر کے اندر سے لڑکی کے پکارنے کی آواز آتی ہے۔ "ماتا جی" "ماتا جی")

نلینی :- سیٹھ جی۔ میں تھوڑی دیر کے لیے گھر میں جانے کی معافی چاہتی ہوں (چلی جاتی ہے)

رنجیت :- کیا آپ نے ان دنوں کوئی نئی نظمیں لکھی ہیں؟

چچی :- جی ہاں۔ بہت ساری۔ کوئی شمار ہی نہیں

رنجیت :- آپ زیادہ تر کیسی نظمیں لکھتے ہیں؟

چچی :- بڑی اچھی اچھی۔ میرا خیال ہے کہ میرا بھتیجا اپنی عمر سے بڑھکر بعض چیزیں کہہ جاتا ہے اور اُن کی قدر اُس کی موت کے بعد ہوگی، اس وقت تک لڑائی بھی ختم ہو جائیگی۔ سب جھگڑے نپٹ جائیں گے۔ شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیئینگے

موہن :- میں زیادہ تر روحانی زندگی کے متعلق نظمیں اور شعر لکھتا ہوں۔

رنجیت :- وہ "روحانی زندگی" کیا ہوتی ہے؟

موہن :- یعنی آدمی کی آتما اور ایشور کے تعلق کی باتیں۔ اس کو یوگ بھی کہتے ہیں۔

چچی - اجی۔ میرا بھتیجا یوگی شاعر ہے، یوگی

رنجیت :- میں نے سنا ہے، کہ آج کل شاعر غریبی سے تنگ آکر جینے سے بیزار ہو جاتے ہیں، اور ایسی نظمیں لکھتے ہیں، جن میں خودکشی کرنے کا پرچار ہوتا ہے

چچی :- آہ۔ یہ لوگ کتنے بیوقوف ہیں۔

موہن :- (بڑے غور و فکر کے انداز میں) سنئے۔ مہاراج۔ غریبی کوئی چیز نہیں۔ اگر آپ ذرا دھیان کریں تو معلوم ہوگا کہ ہر جگہ پرماتما کا ہاتھ چل رہا ہے۔ مگر اس کو کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ امیر غریب سب ایک ہیں۔ اگر ہم کو پرماتما کی ہستی پر پورا بھروسہ ہے، تو ہم کو معلوم ہو جائیگا کہ اس دنیا میں سب برابر ہیں۔ اگر ایک آدمی غریب بھکاری ہے تو اس سے ایک امیر آدمی کی امیری ظاہر ہوتی ہے۔ اگر رات نہ ہوتی تو ہمیں دن کا اجالا کیونکر بھلا معلوم ہوتا!! اگر موت نہ ہوتی۔ تو جینے کی کچھ قدر نہ ہوتی۔

چچی :- ہاں بیٹا۔ یہی تو اس دنیا جہان کا اصل بھید ہے

موہن :- نہیں ہم سب اپنے راستوں پر چل رہے ہیں، مجھے فرصت ملتی ہے، تو میں شعر کہتا ہوں۔ اور گلیوں میں بھیک مانگنے والے فقیر کو بھی فرصت ملتی ہے۔ مگر وہ بھیک ہی مانگتا ہے۔ پس ہم دونوں شخص قدرت کی ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔

رنجیت :- میں ایسے ٹھوس فلسفے کی باتیں تو نہیں سمجھتا لیکن خیر۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ ہمارے ملک میں آجکل موہن جیسے فلسفی موجود ہیں جبکہ ان دنوں بعض شاعر سوشیلزم اور آزادی کا شور مچاتے رہتے ہیں۔ آپ اُن سب سے جدا ہیں، ہم کو آپ سے بڑی امیدیں ہیں۔ ان دنوں آپ کا موجود ہونا بہت اچھا ہے۔ جبکہ دنیا میں چاروں طرف لڑائی اور جنگ کی خبریں پھیل رہی ہیں اور جبکہ دنیا میں ہر طرف "انقلاب" "انقلاب" کا شور ہو رہا ہے، آپ کا وجود ہماری خوش قسمتی کا باعث ہے۔

چچی :- ہاں سیٹھ جی۔ آپ سچ کہتے ہیں، سچ بات یہی ہے جب دنیا میں انقلاب کا ہنگامہ گرم ہوتا ہے تو اوتار یا رشی جنم لیتے ہیں، تاکہ بھلے اور شریف آدمیوں اور استریوں کی زندگیاں برباد نہ ہوں۔ لیکن جب کوئی انقلاب آجائے، تو یہ بڑا ڈر ہوتا ہے، کہ کہیں گیہوں کے ساتھ گھن بھی نہ پس جائے۔ میرا موہن بھی بعض وقت ایسی بہکی بہکی باتیں کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ شاید وہ بھی اُنہی لوگوں کا ہمخیال ہے، لیکن میں ہمیشہ اس کو تاکید کرتی رہتی ہوں کہ وہ ایسا خیال کبھی اپنے دل میں نہ لائے اور ان لوگوں کی باتوں پر کان نہ دھرا کرے

موہن :- میں حیران ہوں کہ آجکل کے شاعر رنج میں اتنا کیوں گھلتے ہیں!

رنجیت :- ابھی کئی دن کی بات ہے کہ ایک شاعر ریل کے نیچے آکر مر گیا کیونکہ اس پر بہت قرضہ ہو گیا تھا۔ اور اس کے پاس ایک کوڑی تک نہ تھی۔

موہن :- میں کہتا ہوں کہ شاعر تو شاعر، کوئی آدمی بھی کیوں بھوکا مرے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔

چچی - دیکھو بیٹا۔ دراصل بات یہ ہے ہر ایک شاعر کا تمہاری طرح کی چچی تھوڑا ہی ہوتی ہے۔ لیکن خیر کسی کی چچی ہو یا نہ ہو ریل کے نیچے آنا بہت بری بات ہے، اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی پاپ نہیں۔

موہن - ہاں، اس سے سراسر بزدلی ظاہر ہوتی ہے، زندگی ایک قسم کی نعمت ہے۔ ہمیں اس نعمت کو یوں ضائع نہ کرنا چاہئے۔ خودکشی واقعی بہت ناقابل داد فعل ہے، میں خودکشی پر موت کو ترجیح دیتا ہوں۔

چچی :- شاباش۔ بیٹا تم ٹھیک کہتے ہو۔

رنجیت :- مگر میرا خیال ہے کہ صرف نچلے طبقے کے لوگ ہی زیادہ تر [illegible] کرتے ہیں۔

چچی :- ہاں اچھے شریف آدمی تو کبھی اس کا خیال تک بھی نہیں کرتے۔

موہن :- لیکن میں نے سُنا ہے کہ کئی کروڑپتی اور لکھ پتی بھی خودکشی کر لیتے ہیں کیونکہ وہ جینے کے ہاتھوں تنگ آ جاتے ہیں۔

چچی :- ہاں۔ کوئی خال خال ایسا بھی کرتے ہونگے۔

موہن۔ مگر ہماری زندگی کتنی اچھی ہے!

چچی :- ہاں بیٹا۔ مگر میں تو صرف تمہارے ہی لیے زندہ ہوں، تاکہ تم دنیا کی گندی اور گندی ہوا سے بچے رہو۔ تم پرماتما کے اوتار ہو۔ اسی لیے تم اتنے پاک پوتر اور نیک ہو، جب تم اپنی نظموں کو یورپ لے کر جاؤ گے، تو تم اپنی شاعری سے ساری ولایت کو جاگر کر دو گے، اور میں سمجھتی ہوں تمہاری نظموں سے لڑائی اور جنگ کے جھگڑے بھی مٹ جائیں گے، اور پھر سب لوگ بھائی بھائی بن کر رہا کریں گے۔

رنجیت :- جی ہاں۔ اور یہ سب آپ کی پیار تمنا کا اثر ہوگا چچی جی۔

موہن :- کیا آپ لوگ میرے ولایت جانے کے بعد میرے تمام حالات سے باخبر رہیں گے؟

چچی :- کیوں نہیں! اخباروں میں سب حال چھپتا رہیگا، میں اخبار والے کو روپے دیکر تمہاری تعریف میں کچھ نہ کچھ لکھواتی رہونگی۔ روپے دیکر اخبار میں جو چاہے، لکھوا لو۔

رنجیت :- ہاں۔ ہاں جو شخص اپنا نام یا شہرت چاہتا ہے، اس کو روپیہ ضرور خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اچھا اب میں جاتا ہوں، مجھے اجازت دیجئے۔ آپ کی اس چائے اور کیک کے لیے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

چچی :- ابھی نہیں۔ مجھے آپ کے درشن کر کے بڑی خوشی ہوئی۔

رنجیت۔ میں کوئی سات آٹھ دن کے لیے شہر سے باہر جا رہا ہوں، لیکن آپ لوگوں کے یورپ جانے سے پہلے میں ضرور واپس آ جاؤں گا۔ اور آپ کو جہاز تک چھوڑ کر آؤں گا۔

موہن :- ہمارا ارادہ ہے کہ ہم "وائسرائے آف انڈیا" نام کے جہاز پر سوار ہونگے۔

رنجیت :- ہاں۔ یہ بہت اچھا جہاز ہے

(کمرہ میں نوکر داخل ہوتا ہے)

نوکر :- دودھ والا گوالا آیا ہے، مہاراج۔

چچی :- کیا کہتا ہے؟

نوکر :- روپے مانگتا ہے جی!

چچی :- یہ گوالے، اور دھوبی، اور نوکر بہت ستاتے ہیں، جب دیکھو روپے مانگتے ہیں (نوکر سے) اچھا، اس کو بولو، ایک ہفتہ ٹھہر کر آئے

(نوکر کمرہ کے باہر جاتا ہے)

رنجیت :- جی ہاں یہ نچلے درجے کے لوگ سچ مچ بہت ستاتے ہیں، صرف ایک ادھ روپے کی خاطر وہ مارے مارے پھرتے ہیں، اور ہم کو بار بار تنگ کرتے ہیں، یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید ہم اُن کا حساب مار لیں گے۔ کیا بتائیں یہ سب لوگ جاہل اور ان پڑھ ہوتے ہیں۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی کی آواز آتی ہے)

چچی :- مگر ان لوگوں کا کچھ مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ (نوکر اور گوالا دونوں ساتھ ساتھ کمرہ میں داخل ہوتے ہیں) ارے ہیں یہ کیا؟ یہ گوالا کمرہ میں کیوں گھس آیا؟ ابے چلو۔ باہر جاؤ

گوالا :- بڑی بی بی، میں ایک مہینے سے پچھلا حساب مانگ رہا ہوں اور اب دو مہینے کا حساب باقی ہے۔

چچی :- ارے۔ یہ کیسا آدمی ہے؟ کیا ہم تمہارا روپیہ مار لیں گے؟ تم ہم کو کیا سمجھتے ہو؟ دیکھو تم لاکھ شور مچاؤ۔ مگر ہم ایک مہینے سے پہلے تمہارا حساب نہیں چکائینگے۔ اور دیکھو تو۔ تم ہم کو دودھ کی بجائے پانی دیتے رہے ہو۔ اس لیے تم کو ایک پیسہ بھی نہ ملنا چاہئے

موہن :- چچی۔ اس آدمی کو کہو۔ کہ کمرہ سے باہر جا کر بات کرے اس سے سخت بدبو آ رہی ہے۔ اس کے کپڑے کتنے گندے ہیں؟ اور اس طرح تم لوگ ایک معمولی آدمی سے جھگڑا مت کرو، مہربانی کر کے میرے کمرہ کی شاعرانہ فضا کو متزلزل مت کرو۔

چچی :- ابے۔ سنتا ہے کہ نہیں؟ میرا بھتیجا دنیا کی دو چیزیں کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔ ایک میل کچیل۔ دوسرے شور شرابا۔ جاؤ۔ باہر جاؤ

گوالا :- اجی۔ پہلے میرا حساب چکا دیجئے۔ پھر میں آپ سے آپ باہر چلا جاؤں گا۔ گھر میں میرے بچے بھوکے مر رہے ہیں

چچی :- تم اُن کو دودھ پینے کو کیوں نہیں دیتے۔ تمہارے گھر میں تو [illegible]

موہن :- (چچی سے) چچی اس کے کپڑوں سے سخت بدبو آ رہی ہے (گوالے سے) ارے باہر کیوں نہیں جاتا؟

(نوکر گوالے کی طرف لپکتا ہے، اور اسے دھکا دے کر باہر [illegible])

گوالا (دھکا کھا کر کمرہ سے باہر لڑھکتے ہوئے [illegible]

(نوکر اور گوالا دونوں لڑھکتے ہوئے کرہ کے باہر چلے جاتے ہیں)

رنجیت :۔ دیکھو۔ موہن کو کتنا رنج پہنچا ہے! دیکھا۔ نچلے درجے کے لوگ کس قدر کمینے ہوتے جا رہے ہیں، اگر آئے دن اس طرح جھگڑے ہونے لگے تو ہماری زندگی اجیرن ہو جائیگی۔

(نلینی کمرہ میں داخل ہوتی ہے)

نلینی :۔ (غصہ سے) یہ گوالا کتنا کمینہ ہے۔ اس نے ہماری ہتک کر دی اور ہم کو اور چچی کو گالیاں دیں۔

موہن :۔ چچی۔ یہ تمہارا اپنا قصور ہے۔

نلینی :۔ مگر گوالا ابھی تو نرا پاجی تھا

رنجیت :۔ آپ کو اتنا گرم ہونے کی کیا ضرورت ہے!

نلینی :۔ ہم اس کو اس کا بدلہ دے کر چھوڑیں گے

رنجیت :۔ ہم پولس میں اس کی رپورٹ لکھوا دیں گے۔ اور اس پر بیجا حملہ کرنے کے جرم میں مقدمہ دائر کر دیں گے۔

نلینی :۔ لیکن ہمارے پاس ثبوت تو کوئی ہے نہیں!

رنجیت :۔ لیکن ہمارے پاس روپیہ جو ہے۔ روپے سے ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اچھا۔ اب میں جاتا ہوں۔ نمستے۔

(رنجیت کمرہ کے باہر چلا جاتا ہے)

موہن :۔ چچی یہ سب تمہارا اپنا قصور ہے۔ میری بات سنو۔ تم ان لوگوں کا حساب وقت پر کیوں نہیں چکاتی؟

چچی :۔ دیکھو۔ موہن۔ تم میرے ساتھ جھگڑا مت کرو۔ میں نے کتنی بار تم سے کہا کہ تم مجھے کسی بات پر مت ٹوکا کرو۔ میں ان لوگوں کا حساب چکانا چاہتی اس گھر کی مالک میں ہوں۔ تم نہیں ہو! اس لیے تم چپ رہو۔

موہن :۔ اچھا۔ اب میں کچھ نہیں بولوں گا۔

چچی :۔ دیکھو بیٹا۔ تم کو گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ ان معمولی باتوں میں تم اپنا سر کھپاؤ۔ تم اپنے شعر لکھتے رہا کرو۔ شاعر کو اس دنیا کے جھگڑوں سے کیا مطلب؟

(ٹیلیفون کی گھنٹی کی آواز پھر سنائی دیتی ہے)

اوہ۔ یہ ٹیلیفون بھی ہم کو بہت تنگ کرتا ہے (اٹھ کر چچی ٹیلیفون کے پاس جاتی ہے) ہیلو۔ کون ہے؟ جی ہاں۔ میں چچی ہی بول رہی ہوں! آپ کس کو بلا رہے ہیں؟ موہن کو؟۔۔۔ موہن اس وقت آرام کر رہا ہے۔ وہ ٹیلیفون کے پاس نہیں آ سکتا۔ نہیں وہ ہے تو اسی کمرہ میں۔ لیکن وہ بہت تھکا ہوا ہے ٹیلیفون کے پاس نہیں آ سکتا۔ لیکن آپ ہیں کون؟

موہن :۔ ایسے ہی کوئی ہوگا

چچی :۔ ذرا زور سے بولو جی۔۔۔

نلینی :۔ بھلا اس میں بولنے والا یا ٹیلیفون کا کیا قصور ہے۔ خود تو چچی کانوں سے بہری ہے۔

چچی :۔ مگر میں کہتی ہوں۔ آپ ہیں کون؟ اوہو! وکیل صاحب! معاف کیجئے۔ نمستے! کہئے کوئی نئی تازی خبر! کیا ضروری کام ہے؟

موہن :۔ ہیں! یہ کیا؟ وکیل اور ضروری کام؟

چچی :۔ آپ مجھے ہی بتا دیجئے نا۔ موہن اس وقت تھکا ہوا ہے ۔۔۔ ہیں! کیا بنک کے بارہ میں۔۔۔۔۔۔؟

موہن :۔ یہ رات کو اتنا کیا ضروری کام آن پڑا؟

چچی :۔ کیا؟ کیا؟ کیا؟

نلینی :۔ یہ تو بالکل پگلی ہو گئی ہے بے چاری بوڑھی جان ہے۔

چچی :۔ (ٹیلیفون کے پاس کرسی پر گر پڑتی ہے) ہیں۔۔۔! بنک کا دیوالہ۔۔۔! ارے موہن! کیا یہ سچ ہے؟ (وہ بے ہوش ہو جاتی ہے اور ٹیلیفون کا ریسیور زمین پر گر پڑتا ہے۔)

(نوکر کمرہ میں داخل ہوتا ہے)

نوکر :۔ اجی۔ وہ دودھ والا گوالا آپ کو بہت دور تک کوستا ہوا گالیاں دیتا ہوا گیا۔ کہتا تھا کہ پرماتما اس گھر کا جلدی ہی ناس کرے گا۔

موہن :۔ (اس کو گلے سے پکڑتے ہوئے) اچھا۔ چپ رہو۔ کمبخت

(تمام اسٹیج پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ لڑکی آہستہ آہستہ سفید فراک پہنے ہوئے روشن موم بتی ہاتھ میں پکڑے کمرے میں داخل ہوتی ہے بتی کی روشنی سے اس کا چہرہ چمک رہا ہے)

لڑکی :۔ پتا جی۔ میں نے ایک خواب دیکھا۔ کہ سمندر ہمارے جہاز کو غرق کر گیا

(پردہ)

دوسرا باب

(چھ ماہ بعد۔ گھر اجڑا ہوا ہے۔ کرسیاں میزیں سب غائب ہیں۔ سادہ سا کمرہ ہے جس سے غربت اور مفلسی صاف نظر آ رہی ہے۔ لکڑی کے ایک ٹوٹے پھوٹے تختے پر موہن ایک پھٹا پرانا کمبل اوڑھے سویا ہوا ہے۔ صبح کا وقت ہے۔)

(چچی چپ چاپ کمرہ میں داخل ہوتی ہے۔ صورت سے کچھ بھونچکی سی معلوم ہو رہی ہے۔ بنک کے دیوالہ نے اس کے ہوش و حواس گم کر دیے ہیں

اور وہ نیم پاگل ہوگئی ہے۔ صرف کبھی کبھی ٹھیک سے بات کرتی ہے)

چچی :۔ چپ۔ ڈاکو۔ دھوکے باز۔ اگر میں اپنا سارا روپیہ زمین میں گڑھا کھود کر دبا دیتی، تو اچھا تھا۔ لیکن اب گویا انھوں نے مجھ کو گڑھے میں دبا دیا ہے (آہ بھرتی ہے) آہ۔ چور۔ ڈاکو (سوئے ہوئے موہن کے پاس جاتی ہے) اس بے کار بدمعاش کو تو دیکھو —— ارے جاگ۔ اب تو جاگ پاجی۔ کیا افیون کھا کر پڑا ہے۔ ساری جاگ اٹھی ہے۔ مگر تم ابھی تک سو رہے ہو۔ بنک کا دیوالہ بھی نکل گیا۔ چوروں نے مجھے لوٹ بھی لیا اٹھو۔ جاگو۔ سویرا ہو گیا۔

(لڑکی کمرہ میں داخل ہوتی ہے)

لڑکی :۔ دادی۔ آپ اتنی اُداس کیوں ہیں؟

(چچی ہاتھوں کی انگلیوں پر کچھ گننے لگ جاتی ہے۔)

دادی چچی۔ آپ ہر وقت انگلیوں پر کیا گنتی رہتی ہیں؟

چچی :۔ اپنے سر کے سفید بال!

لڑکی :۔ مگر دادی جی۔ آپ اتنی اداس کیوں ہیں؟

چچی :۔ چور۔ ڈاکو۔ اٹھائی گیرے

لڑکی :۔ دادی جی۔ کیا میں آپ کو کوئی گیت گا کر سناؤں؟

چچی :۔ سب چور ہیں۔ ڈاکو ہیں۔ تم بھی چور ہو۔ تمہاری ماں بھی چور ہے۔ تمہارا باپ بھی چور ہے۔ تم نے مجھے لوٹ لیا۔ اگر میں زمین میں گڑھا کھود کر دبا دیتی، تو اچھا تھا۔

لڑکی :۔ دادی جی۔ کیا دبا دیتی؟

چچی :۔ (لڑکی کی طرف گھور کر دیکھتے ہوئے) تمہارا سر (پھر وہ آہستہ آہستہ باہر جاتی ہے)

(لڑکی روتی ہوئی اپنے باپ موہن کے پاس آتی ہے)

لڑکی :۔ پتا جی۔ آپ کو دادی جی چور کہتی ہیں۔ پتا جی۔ آپ مجھ سے بولیے تو سہی۔ مجھ سے تو اب کوئی ٹھیک سے نہیں بولتا (اور رونے لگتی ہے)

موہن :۔ (بہت پھٹی ہوئی اور بھرائی ہوئی آواز میں) رانی، روؤ مت۔ میں جو تم سے بولتا ہوں

لڑکی :۔ اچھا۔ اب میں نہیں روتی۔ پتا جی۔ آپ کا چہرہ اُداس کیوں ہے؟ (پیار کرتے ہوئے) پتا جی۔ کیا میں آپ کو گیت گا کر سناؤں؟ پتا جی آپ مجھے پیار نہیں کرتے؟

موہن :۔ کیوں نہیں کرتا۔ بیٹا۔ واہ میں اور تم کو پیار نہیں کروں۔

لڑکی :۔ مگر ماتا جی تو مجھے مارتی رہتی ہیں اور دادی مجھے ابھی کہہ رہی تھیں، کہ وہ میرا سر گڑھا کھود کر دبا دیں گی۔

موہن :۔ اس کا کیا ہے۔ اس کو کہنے دو! مگر تمہاری ماتا تو تم کو پیار کرتی ہے نہ؟

لڑکی :۔ نہیں پتا جی۔ اب وہ مجھے پیار نہیں کرتی۔ کبھی میرے کان کھینچتی ہے۔ اور کبھی لکڑی سے مارتی ہے۔

موہن :۔ شاید تمہاری ماتا کی طبیعت اچھی نہ ہوگی

لڑکی :۔ لیکن پتا جی۔ وہ تو کبھی گھر میں بیٹھتی ہی نہیں۔ سارا دن وہ رنجیت سیٹھ کے ساتھ جاتی آتی رہتی ہیں، اب مجھے ماتا جی بالکل اچھی نہیں لگتیں کیا ماتا جی آپ کو پیار کرتی ہیں؟

(باہر سے ایک بھاری سی آواز سنائی دیتی ہے "گھر میں کوئی ہے"!)

موہن :۔ یہ تو ہمارے بڑھئی کی آواز معلوم ہوتی ہے (چلّا کر) کون ہے؟ اندر آجاؤ!

(بڑھئی کمرہ میں داخل ہوتا ہے)

بڑھئی :۔ نمستے۔ مہاراج۔ بہت دیر کے بعد آپ کے درشن ہوئے۔ آپ ولایت جانے سے پہلے مجھ سے صندوق بنوا کر لے گئے تھے۔ کہیے ولایت ہو آئے؟

موہن :۔ ارے بھئی۔ نہیں جا سکے۔ پرماتما کی مرضی!

بڑھئی :۔ جی سرکار۔ پرماتما کی مرضی میں کسی کو دخل نہیں، اچھا یہ لیجیے بیوی جی یہ جھولا بننے کو دے آئی تھیں!

موہن :۔ (حیرانی سے) جھولا؟ کیسا جھولا؟ کس کا جھولا؟

بڑھئی :۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ مگر بیوی جی نے مجھے یہ جھولا ایک اور ہی جگہ پر لانے کو کہا تھا۔ پر جب میں وہاں جھولا لے کر گیا، تو مجھے ان کا ٹھکانا ہی نہ مل سکا۔ صبح سات بجے سے وہ ٹھکانا ڈھونڈھتا ڈھونڈھتا تھک گیا۔ اور اب آخر اسے یہاں آپ کے پاس لے آیا ہوں

موہن :۔ مگر کیا تم کو پکا پتہ ہے کہ نلینی ہی جھولا بنانے کو کہہ گئی تھیں؟

بڑھئی :۔ جی ہاں۔ اور میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ آپ کے یہاں لڑکا پیدا ہوا ہے، مبارک ہو آپ کو!

موہن :۔ کیا؟

بڑھئی :۔ جی ہاں۔ اور ان دنوں بیوی جی کا رنگ بھی کچھ بدلا ہوا ہے ان کے گال بہت گلابی گلابی ہیں، اور ہونٹ بہت لال لال ہیں۔ اور ان کے سر کے بال بھی اب اور ہی طرح کے معلوم ہوتے ہیں اور اب وہ سگریٹ بھی بہت پیتی ہیں۔ میں نے تو یہ سمجھا کہ شاید آپ اب بہت امیر ہو گئے ہیں۔

موہن :۔ امیر! تم اِس کمرہ کا حال نہیں دیکھ سکتے۔

بڑھئی :۔ (ایک لمحہ کے لیئے خاموش رہنے کے بعد) جی ہاں۔ یہ تو ٹھیک ہے۔ سچ پوچھئے، تو میں جب کمرہ میں داخل ہوا۔ تو مجھے بڑا اچنبھا ہوا۔ چاروں طرف غریبی برس رہی ہے۔ شاعر لوگوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہم ٹھہرے مزدور آدمی۔ ہمارا کیا ہے؟

موہن :۔ لیکن بھئی یہ جھولا کیسا ہے؟ اس کا کچھ پتہ بتاؤ۔ کہیں تم بھول تو نہیں رہے ہو؟

بڑھئی۔ نہیں مہاراج یہ کبھی ہو سکتا ہے؟ یہ آپ ہی کی بیوی جی میری دوکان بنانے کے لیئے کہہ آئی تھیں، اور ان کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ اجی وہی رنجیت سیٹھ جن کے کئی کارخانے ہیں!

لڑکی :۔ پتا جی، یہ جھولا بالکل ارتھی جیسا ہے!

بڑھئی :۔ ہیں!! ارتھی؟ واہ۔ یہ بھی ایک ہی کہی، مگر ہاں: ارتھی اور جھولا کچھ ایک سے ہوتے ہیں۔

(چچی چپ چاپ دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوتی ہے۔)

چچی :۔ ارے یہ کون گنوار آدمی ہے؟

بڑھئی :۔ جی۔ میں آپ کا پرانا داس بڑھئی ہوں!

چچی :۔ (ہنسنے لگتی ہے) سب چور ہو۔ ڈاکو ہو۔ ٹھگ ہو۔ دھوکے باز ہو۔ اٹھائی گیرے ہو

موہن :۔ (بڑھئی سے) اِس کی باتوں کی پرواہ مت کرو، اس کا سر پھرا ہوا ہے۔ اس کا کل روپیہ بنک میں مارا گیا۔

بڑھئی :۔ جی مہاراج۔ روپے کا نقصان بہت برا ہوتا ہے۔

چچی :۔ ارے تمہارے ہاتھ گنواروں جیسے ہیں، تمہاری شکل چوروں جیسی ہے۔ (ہنستی ہے) ہا! ہا! ہا! کیسی باتیں کرتے ہو۔ تم مزدور پیشہ آدمی۔ بڑھئی ذات۔ تم روپے کے نقصان کو کیا جانو۔ دن رات تم لکڑی چھیلنے کا کام کرتے ہو۔ لکڑی خشک اور سخت لکڑی! تمہارا دل اور دماغ بھی لکڑی کی طرح سخت ہے۔ تم بھلا روپے کا نقصان کیا جانو۔ چور کہیں کا۔ ڈاکو۔ اٹھائی گیرا۔ دھوکے باز۔ کیا بکتا ہے؟ یہاں کیوں آیا ہے؟

موہن :۔ یہ جھولا لے کر آیا ہے چچی۔

لڑکی :۔ مگر پتا جی یہ جھولا میرے کس کام کا ہے۔ میں تو اب بہت بڑی ہو گئی ہوں۔ چلنے پھرنے لگی ہوں۔

چچی :۔ گونجنا جھولا (قہقہہ مار کر ہنسنے لگتی ہے) ہاں رانی۔ تم اب جھولے کے لائق تو نہیں ہو۔

لڑکی :۔ لیکن یہ جھولا تو ارتھی جیسا ہے

چچی :۔ کس کی ارتھی؟ تمہاری ارتھی؟

لڑکی :۔ مگر میں ابھی ارتھی کے لائق ہوں کہاں؟ میں ابھی ننھی سی تو ہوں!

بڑھئی :۔ جی نہیں۔ اصل میں مجھے جھولا بنانے کو کہا گیا تھا۔

چچی :۔ (موہن سے) کیوں موہن! کیا تم نے کہا تھا؟ اور کس کے لیے؟ تم تو مجھ سے جونک کی طرح چمٹے ہوئے ہو، ایک کوڑی تک تم خود کماتے نہیں ہو نکھٹو ہیں کے! تم سے اپنی جورو اور ایک بچی تک کا پیٹ پالا نہیں جا سکتا اب ایک اور بچے کے لیے جھولا بنوالیا۔ واہ رے۔ واہ!

لڑکی :۔ دادی جی۔ آپ میرے پتا جی کو ایسا کیوں کہتی ہیں؟

چچی :۔ کیا بکتی ہے چھوکری؟ (اُس کے تھپڑ مارتی ہے، لڑکی ڈگمگاتی ہوئی اپنے باپ کے پاس آتی ہے، اور بلبلا کر رونے لگتی ہے)

موہن :۔ چچی۔ آخر اس کا کیا مطلب ہے؟ دیکھو میں ساری عمر تمہارے دکھ سہتا رہا ہوں۔ تم نے مجھے برباد کر دیا۔ تم نے مجھے اپنے پاس بیکار بنا کر رکھ چھوڑا۔ اور ہر وقت میری بیوی کا تعریف کرتی رہی۔ اور اب تم میری ننھی بچی کو میری آنکھوں کے سامنے مارتی ہو۔ پہلے بھی یوں تم اس کو مارا کرتی تھی۔ آخر تمہارا کیا مطلب ہے؟ اگر تم نے ساری عمر شادی نہ کرانے کا ارادہ کر رکھا ہے۔ تو پھر ہم کو اپنے غصے کا نشانہ کیوں بناتی۔ تم کو چاہئے تھا کہ کہیں دیکھ بھال کر اپنا بندوبست کر لیتی، مگر تمہارے سر پر تو روگ کا بھوت سوار تھا۔ تمہارے روگ نے ہم کو بھی تباہ کر دیا۔

چچی :۔ ہاں، ہاں بکے جاؤ۔ مجھے گالیاں دیتے جاؤ۔ تم کو شرم نہیں آتی۔ میں نے ساری عمر تم کو کھلایا۔ پلایا۔ پالا۔ پوسا۔ بڑا کیا۔ اور اب یہ میرا قصور ہے، کہ بنک فیل ہو گیا۔ اور سارا روپیہ جو میں نے تمہارے نام سے بنک میں جمع کیا تھا۔ اڑ گیا۔ کیا میں نے روپیہ تمہارے نام سے جمع نہیں کیا تھا؟ اور اب تم مجھے گالیاں دیتے ہو۔ شرم نہیں آتی۔

موہن :۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ تم نے مجھے تباہ کر دیا۔

بڑھئی :۔ (موہن سے) اچھا۔ مہاراج۔ میں جاتا ہوں۔ پھر کسی وقت آؤنگا، نمستے (باہر نکلتا ہوا، دھیمی آواز سے، آپ ہی آپ دوسری طرف منہ کر کے) اتنا بڑا گھر یوں تباہ ہو گیا۔ آہ۔ یہ سب پرماتما کے کھیل ہیں

(کمرہ کے باہر چلا جاتا ہے)

موہن :۔ چچی۔ دیکھو جو ہو گیا سو ہو گیا۔ میں اس وقت بعد کچھ

بھی نہیں کر سکتا

چچی :۔ تم ذرا اپنی طرف تو دیکھو! شراب پی پی کر تم نے اپنے کو تباہ کر لیا ہے اور مجھے سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ تمہارے پاس شراب کے لیے روپیہ کہاں سے آتا ہے؟ تم اپنی جورو کی کمائی پر اینٹھتے ہو۔ شرم کرو۔

موہن :۔ ہاں میں شراب پیتا ہوں۔ مگر یہ لت مجھکو تم ہی نے لگائی تھی۔ تم خود مجھے شراب منگا کر دیا کرتی تھی اور اب میں تم سے تنگ آگیا ہوں۔ میں مانتا ہوں کہ تم نے مجھے کھلایا پلایا۔ لیکن تمہارا مطلب کیا تھا؟ اگر تم میری بھلائی چاہتی تھی۔ تو تم مجھے اپنا قیدی بنا کر نہ رکھتی۔ تم نے مجھے کبھی غریبوں کی زندگی قریب سے دیکھنے کا موقع ہی نہ دیا۔ تاکہ میں اپنے شعروں میں غریبوں کے حال نظم کرتا۔ مگر تم مجھے ہمیشہ یوگ کا سبق پڑھاتی رہی تم مجھے یہی کہتی رہی، کہ میں ایک "دیوتا" ہوں "اوتار" ہوں۔ تم نے مجھے لاڈ پیار سے کھلا پلا کر بگاڑ دیا۔ اور مجھے اپنی روٹی کمانے کا بھی موقع نہ دیا۔ تم نے مجھے محنت مزدوری کرنے سے بھی روکے رکھا۔ تم کو میرا ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک کرسی اٹھا کرلے جانا گوارا نہ تھا۔ تم نے مجھے کبھی کوئی کام کی کتاب تک پڑھنے نہ دی۔ اور ہمیشہ مجھے یوگ اور نجوم کی فضول فضول کتابیں لاکر دیتی رہی۔ اور اب دیکھو۔ کیا ہوگیا! جونہی میں نے سنا تمہارے بنک کے دیوالے کی خبر سنی۔ میری شاعری فنا ہوگئی۔ میری روح مرجھا گئی اور تو اور اب میں آدمی ہی نہیں رہا۔ اس نقصان کا صدمہ میرے لیے کچھ کم نہ تھا۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔ میرا دماغ شل ہوگیا۔ اب بتاؤ میں کس کام کا ہوں اور تمہیں کوسں کر جی ہلکا نہ کروں تو اور کیا کروں!

چچی :۔ ہاں۔ یہ میرے احسانوں کا بدلہ ہے نا؟

موہن :۔ بدلہ کیسا؟ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ تم کو برا لگتا ہے، تو تم نے ایسا کیوں کیا تھا

(رنجیت سیٹھ کمرہ میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ نلینی بھی ہے۔ جو بہت بنی سنوری ہوئی ہے۔ دونوں خوب اونچی آواز سے کھلکھلا کر ہنستے ہیں)

نلینی :۔ واقعی۔ وہ ناچ بہت اچھا تھا۔

رنجیت :۔ ہاں۔ اودے شنکر بہت اچھا ناچتا ہے۔ اور اس کے ساتھ کی لڑکیاں بھی کمال کرتی ہیں۔ (موہن سے) ارے بھئی موہن۔ تم ابھی تک یہاں بیٹھے ہو۔ باہر نوکری ڈھونڈنے کیوں نہیں گئے؟

نلینی :۔ اس کو نوکری کون دے گا؟

چچی :۔ صبح سے بیٹھا مجھے گالیاں دے رہا ہے۔ کوستا ہے۔ بکتا جھکتا ہے

نلینی :۔ چچی۔ تم اس کی کچھ مت سنا کرو۔ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ہمارے ہاتھوں سے یہ گیا۔ ہر وقت غریبوں کے جھونپڑوں کی اور گھاٹوں کی اور جنگلوں کی باتیں کرتا رہتا ہے۔ کوئی کب تک سنا کرے

رنجیت :۔ موہن۔ تم جو ادھر ادھر نوکری ڈھونڈتے پھرتے ہو۔ تو تم میرے کارخانے میں ہی کیوں نہیں نوکری کر لیتے۔ پہلے پہل تم کو تھوڑی تنخواہ ملیگی۔ مگر پھر آہستہ آہستہ ترقی کر جاؤ گے۔

نلینی :۔ ہاں۔ میں بھی تو یہی کہتی ہوں۔

موہن :۔ آپ کی بڑی مہربانی ....!

(نلینی اور رنجیت دونوں پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگتے ہیں۔)

نلینی :۔ اچھا مسٹر رنجیت۔ چلو ہم جائیں۔ مجھے نو بجے فلم کمپنی میں جانا ہے، اور وہاں مجھے ایک فلم میں ایک نکھٹو شوہر کی بیوی کا پارٹ ادا کرنا ہے (ہنستے ہوئے نلینی اور رنجیت دونوں کمرہ کے باہر جاتے ہیں)

چچی :۔ رنجیت سیٹھ جی۔ میری ایک بات سنتے جائیے۔ اچھا۔ چلئے میں آپ کی موٹر تک آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔

(وہ بھی اُن کے پیچھے کمرہ کے باہر جاتی ہے)

موہن :۔ اس کا نام لوگوں نے "سوسائٹی" رکھا ہے۔ کہ چہرہ پہ پاؤڈر سرخی، مستی لگالی اور آوارہ پھرا کیے۔ کتنی بے شرم زندگی ہے؟

لڑکی :۔ (کونے میں الگ بیٹھے بیٹھے) پتاجی! پتاجی!

موہن :۔ ہاں۔ بیٹی؟

لڑکی :۔ کیا وہ سب لوگ چلے گیے؟

موہن۔ ہاں۔ بیٹی

لڑکی :۔ پتاجی۔ مجھے بہت جاڑا لگ رہا ہے، میرا دم گھٹا جاتا ہے، کیا سچ مچ وہ سب گیے؟

موہن۔ ہاں۔ سب گیے!

لڑکی :۔ وہ سب چیل گدھ کی طرح یہاں آئے تھے۔ آہ۔ میرا دل دہلنے لگا۔ میرا بدن کانپ رہا ہے۔

موہن :۔ بیٹی گھبراؤ مت۔ میں تمہارے پاس ہوں۔

لڑکی :۔ مگر پتاجی میرا حلق سوکھ گیا ہے۔ مجھے پانی کا ایک گھونٹ پلا دو

موہن :۔ (کٹوری میں پانی لاکر دیتے ہوئے) لو پانی۔ بیٹی گھبراؤ مت، دیکھو۔ سنو۔ تمہارا پتا تم کو ایک اچھی سی کہانی سناتا ہے

لڑکی :۔ پتاجی۔ آپ تو شاعر ہیں۔ یہ آپ کہانیاں سنانے لگے۔ اب

آپ کہانیاں لکھا کیجئے۔ غریب مزدوروں کی کہانیاں۔ اور اچھے اچھے گیت بھی۔

موہن :۔ ہاں بیٹا۔ میں اب کیا کروں۔ مجھے اب کچھ اچھا نہیں لگتا، میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا ہے! میں چاہتا ہوں کہ خودکشی کرلوں۔

لڑکی :۔ پتاجی۔ پتاجی!

موہن :۔ بیٹا، مجھے اب کچھ اچھا نہیں لگتا۔ پرماتما موت دے دے تو اچھا ہے۔

لڑکی :۔ پتاجی میرا دم گھٹ رہا ہے، پتاجی۔ میرا سانس رک رہا ہے، اچھا۔ پتاجی۔ آپ ماتاجی کو مت بتائیے۔ کہ مجھے ماتاجی اچھی نہیں لگتیں۔ پتاجی۔ مجھے صرف آپ ہی سے پیار ہے، ماتاجی سے نہیں ہے۔ مگر ماتاجی کو یہ بات مت بتائیے آہ۔ پتاجی۔ میں اکیلی ہی جارہی ہوں۔ اکیلی پتاجی اچھا۔ نمسکار۔ پتاجی۔ پتاجی!

(مرجاتی ہے)

موہن :۔ (تکیہ کے نیچے سے شراب کی بوتل نکالتا ہے، اور پینے لگتا ہے) آہ۔ میری زندگی کی یہ ایک ہی خوشی تھی۔ وہ بھی چل دی۔ اچھا بیٹا۔ نمسکار! یہ گھر تباہ ہوگیا۔ برباد ہوگیا۔ بجلی گر پڑی۔ "ایسی سوسائٹی" کا ستیاناس ہو۔ یہ دنیا سراسر دھوکا ہے۔ میری زندگی کا کھلونا مجھ سے چھن گیا

چچی (لڑکو میں داخل ہوتی ہے) جاؤ۔ نکھٹو۔ تم باہر سے جاکر لکڑیاں لاؤ۔ تم کچھ کما دھا کر نہیں لاتے۔ اگر رنجیت سیٹھ تم کو روپے نہ دے تو ہمارا کیونکر گزارہ چلے گا

موہن :۔ (جانے کے لیے اٹھ جاتا ہے) اچھا اب میں جاتا ہوں (لڑکی کے پاس جاتا ہے اور اس کو پیار کرتا ہے۔ آہ۔ میرے بیٹے میرے چاند۔ ہاں۔ مجھے یاد ہے تم نے کہا تھا کہ تم اکیلی جارہی ہو، تم زندگی میں بھی اکیلی تھی۔ اور مرکر بھی اکیلی ہو۔ اچھا۔ گھبراؤ مت، میں بھی آرہا ہوں۔ تم اب اکیلی نہیں رہوگی۔

چچی :۔ تم ایسے کہاں جارہے ہو؟ یہ لو روپیہ! جاکر لکڑیاں لاؤ۔ سمجھ گئے نا؟

موہن :۔ ہاں، ہاں۔ میں سمجھ گیا۔ لکڑیاں۔ لکڑیاں! اُدھر دیکھو۔ اس کا دم نکل گیا ہے، رانی مرگئی ہے۔ میری زندگی کا سہارا! اُدھر دیکھو۔ اچھا۔ اب میں جاتا ہوں۔ نمسکار چچی۔

(آہستہ آہستہ باہر جاتا ہے۔)

چچی :۔ (لڑکی کے پاس آکر مردہ لاش کو دیکھ کر چیخ مارتی ہے اور جھولے کو اٹھا کر باہر کی طرف جاتی ہے) ارتھی! ارتھی!! ارتھی!!! (ماخوذ)

(پردہ)

عبدالحی۔ ایم۔ اے

غزل

آنکھ سے آنکھ کا ملنا بھی بلا ہوتا ہے
آن کی آن میں انساں فنا ہوتا ہے

فرصت رشک کہاں بزم عدو میں مجھکو
محو رہتا ہوں جہاں ذکر ترا ہوتا ہے

نگہِ شوق کو آتے ہیں طریقے لاکھوں
دل کا مطلب بھری محفل میں ادا ہوتا ہے

تیری ہر بات میں اک شان نئی ہوتی ہے
تیری ہر آن میں اک رنگ نیا ہوتا ہے

ایک ہے رند ادھر ایک اُدھر مست شباب
ایسی محفل میں یہ ظاہر ہے کہ کیا ہوتا ہے

بت کو دی دل میں جگہ اپنا خدا مجکو ملا
اس میں واعظ کوئی نقصان ترا ہوتا ہے

روح تازہ ہے مئے جام محبت سے مری
عمر جاتی ہے چلی جائے تو کیا ہوتا ہے

عجز کا داغ ترے دل میں نہ ہو گر عابد
گو اثر لاکھ جبیں پر ہو تو کیا ہوتا ہے

درد دل سوز جگر مہر و وفا عجز و نیاز
جس کے حصہ میں یہ ہوں مرد خدا ہوتا ہے

مست آنکھوں سے ذرہ کر تو نظر چار و نظرف
بے پئے کوئی بھی عارف بہ خدا ہوتا ہے

آپکے ظلم و ستم اور مٹائیں گے مجھے
کیا شہید رہ الفت بھی فنا ہوتا ہے

بانیِ جور و جفا دیکھ ۔ وفا کیش امیر
ہر ادا پہ تری قرباں و فدا ہوتا ہے

باغی کا چوتھا خط

از شاعرِ انقلاب قاضی نذرالاسلام۔ مترجمہ محمد یونس احمر

پیارے نورالہدیٰ خوش رہو۔

آج بیقرار ہو کر دل کی اس بندھانے کے لیے یہ مختصر سا خط کانپتی ہوئی انگلیوں سے تمہیں لکھ رہی ہوں۔ اس لیے کہ میری کمزور آنکھیں آسمانِ دل کے گم شدہ تارے کو ڈھونڈھ رہی ہیں؟ مگر آہ تم مجھے مطلق بھول گئے اور اتنے دنوں تک بھول کر اپنی بوڑھی ماں کے پاس ایک آدھ خط بھی نہیں لکھا۔ سمجھ میں نہیں آتا آخر تم اتنے کٹھور اور سنگدل کیسے ہو گئے! میں تو کبھی ایسی سنگدلی تم میں نہیں پائی۔ جو لڑکا اپنی ضعیف ماں کا بھی ہوا آخر اس پر اپنا حق کیسے جتاؤں۔ تمہارے دل کے اندر اگر ذرا سا بھی رحم کا مادہ ہوتا تو اس طرح مجھے ماہیٔ بے آب کی طرح نہ تڑپاتے۔ کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ میں آگ کی لپکتی ہوئی چنگاریوں میں جلوں اور تم قہقہہ لگاؤ میں تمہاری یاد میں بیکل ہو کر آنکھوں ہی آنکھوں میں ساری رات گنتا دوں اور تم میٹھے خواب میں بے سدھ پڑے رہو؟ کاش تم میری نگاہوں کے سامنے ہوتے تو میں بتا سکتی کہ بیٹا! تمہاری نحیف ماں کا کلیجہ تمہارے غم میں کتنا خشک ہو گیا ہے؟ لیکن آہ! تم دور بہت دور ہو اتنی دور جہاں میرا تخیل بھی نہیں پہنچ سکتا ہے!

میں تمہیں کبھی خط نہیں لکھتی لیکن اس دن رو بونے ہنستے ہنستے کہا تھا "ماں تم نے بڑی غلطی کی کہ اس کی جدائی کے وقت اُس سے بولنا بھی ترک کر دیا تھا۔ شاید اسی لیے وہ تم سے روٹھ گیا ہے۔ اسے ایکبار خط لکھ کر منا لو!" دیکھا کس طرح میرے ہی سر الزام تھوپا گیا؟ مگر بیٹا! تمہیں کیسے بتاؤں کہ جس دن تم میری نگاہوں کو داغِ مفارقت دیئے جا رہے تھے اور بوڑھے دل میں سوئیاں چبھو رہے تھے اُس دن میں کس طرح بیکل ہو کر اندر ہی اندر کڑھ رہی تھی۔ اور سینے کے اندر کس طرح دکھ کے کانٹے چبھ رہے تھے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں اس کا ذرا بھی احساس نہ ہو گا۔ میرے لال! آخر کب تک اپنی اس ماں سے روٹھے رہو گے جس کے دونوں پیر قبر میں لٹک چکے ہیں۔ ایکبار میری آنکھیں اس طرح [illegible] ہو گئیں کہ [illegible] سے بھی جاگ نہیں سکتیں۔ خدا سے میری روز و شب یہی دعا ہے کہ اب میری بارگراں زندگی کو اس دنیا سے اٹھا لے کیونکہ اب تکالیف اور مصائب کے انگارے برداشت نہیں کر سکتی۔ سوکھ سوکھ کر کلیجہ باجرا بن گیا مگر تم سے اتنی مایوسی کے بعد بھی دل سے یہ آواز نکل آتی ہے کہ نہیں میں اس وقت مروں جب تم میرے سامنے رہو اور تمہارے ہاتھوں کی مٹی مجھے نصیب ہو۔

یاد ہے میں کبھی کبھی تمہاری شرارت سے جھلا اٹھتی تھی اور دو ایک طمانچے بھی مار دیتی تھی۔ مگر تم نادان بچے کو کیا معلوم کہ ان خشم آلود آنکھوں میں پیار کی کتنی شیرینیاں روپوش ہیں! میں سوچ رہی ہوں کہ تمہارے دل میں بھی وہ بھولی بسری باتیں محفوظ ہونگی؟ نہیں، نہیں بھلا تم جیسے چنچل مزاج لڑکے کو کیسے یاد رہ سکتی ہے۔ بچے کی محبت ماں کے دل میں کتنی زیادہ ہوتی ہے بیٹا! تمہیں نہیں معلوم۔

مجھے آج تمہارے عہدِ طفلی کی وہ باتیں یاد آ رہی ہیں جب تم اپنے چند ہمجولیوں کے ساتھ ہم بوڑھی عورتوں کی جماعت میں گھس کر اپنی اپنی رام کہانیاں سناتے تھے اور جب ان بیکار باتوں کو سن کر تم لوگوں سے پرے ہٹ جاتی تھی تو تمہارے چہرے پر کس طرح بل آ جاتا تھا اور منہ بسور لیتے تھے۔ بات بھی درست ہے کہ ہم مربیوں میں تم بچوں کا بیٹھنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ آج رو بونے بھی مجھ سے یہ بات کہی کہ میرے اس طرح پرے ہٹ جانے سے تمہارے دل کو سخت دھکا لگتا تھا۔ کیا یہ سچ ہے بیٹا؟ لیکن میں اسے یقین نہیں کرتی کہ تمہارا سخت دل ذرا سی بات سے ٹوٹ سکتا ہے!

تم بچے ہم ماؤں کے لیے دشمن ہو دشمن! ماں اپنے بچوں کو کتنی مصیبتوں اور دقتوں کے بعد عقل و شعور سے ہمکنار کرتی ہے، اسے اس قابل بناتی ہے کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر ماں کا سہارا بن جائے مگر یہی بچے سیانے ہو کر ماں کی [illegible] زندگی کے لیے بارگراں ثابت ہوتے ہیں [illegible] [illegible] دیتے ہیں۔ اگر بچے ان باتوں کا [illegible] کر لیں تو

دنیا کی ساری مائیں فضول پریشانیوں سے بری ہوجائیں۔ اُف! ہڈی بالکل سیاہ ہو گئی ہے سیاہ!

آجکل شب و روز خدا سے یہی مناجات کرتی ہوں کہ تم صحیح و سلامت جنگ کی ہولناکیوں سے واپس آ جاؤ تاکہ میری بوڑھی پتھرائی ہوئی آنکھیں اپنے لال کو دیکھ کر تازہ اور شگفتہ ہو جائیں۔ میرے لال دیکھو خوب بچ بچ کر رہنا شاید تمہیں کھانے پینے میں بہت تکلیف ہوتی ہوگی۔ مجھے اس کا بہت احساس ہے۔ یقین مانو جب بھی میں کھانے کے لیے بیٹھتی ہوں یکایک تم میری آنکھوں میں گھومنے لگتے ہو اور فوراً خیال ہوتا ہے کہ میرا لال غیر ملک میں بھوکا پیاسا ہوگا اور میں بدنصیب ماں گھر میں بیٹھ کر اطمینان کی زندگی بسر کر رہی ہوں۔ یہ سوچ کر آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے ہیں اور ہاتھ کا نوالہ گر جاتا ہے۔

بیٹا! خط کا جواب فوراً لکھنا اور اپنی تمام باتیں مفصل بیان کرنا میں تمہارے پیارے ہاتھوں کی خوبصورت تحریر دیکھنے کے لیے بہت بے قرار ہوں۔ اُف! اب ہاتھ سے قلم چھوٹ رہا ہے، انگلیاں کانپ رہی ہیں تاہم میں نے کسی طرح خود سے خط لکھ ڈالا۔ تم جو اوروں کو خط لکھتے ہو ان میں سے کوئی بھی مجھے نہیں سناتا ہے اس لیے تم گاہے گاہے مجھے بھی یاد کرلینا یعنی براہ راست میرے نام خط ارسال کرنا۔

اچھا اب ختم کرتی ہوں۔ سانس پھول رہی ہے اور آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا ہے۔ پروردگار تمہیں ہمیشہ زندہ و سلامت رکھے۔ آمین

تمہاری دکھیا
'ماں'

غزل

جب عشق ہی حاصل عشق کا ہے، پھر حسن کی پروا کون کرے؟
مجنوں کی لیلیٰ ہے ہر سو، پھر لیلا لیلا کون کرے؟

وہ روٹھ گئے جب سے نہ ملی، وہ اٹھ کے چلے، تو قرینہ تھی،
اے ساقیٔ محفل! تو ہی بتا اب کس کی تمنا کون کرے؟

وعدہ تو ہوا، ایفا نہ ہوا، گویا دلربا آنکھوں نے
خودداریٔ دل یہ کہتی ہے، بیکار تقاضا کون کرے؟

جب دل ہی اپنا ٹوٹ گیا، اک وہ بھی سہارا چھوٹ گیا
پھر ناؤ کو کیا ڈر موجوں کا، طوفان کی پروا کون کرے؟

تھی جس کی ہوس وہ گل نہ ملا اور جل کے نشیمن خاک ہوا
اس حسرتِ پیہم کی زد میں احساس تمنا کون کرے

جو خیال میں آئے جاتا ہے، ہستی پہ چھائے جاتا ہے
اب اس سے حجاب دل کیا ہو، اب اس سے پردہ کون کرے!

یہ ہستی بخشش ہے تیری، اب توبہ ایسی بخشش سے،
جس شے کو واپس کرنا ہو، اس شے کی تمنا کون کرے۔

جلنا ہے تو اپنی آگ میں جل، کیا ٹھیک ہے شمع محفل کا
جو خود ہی بجھنے والی ہو، دل اس پر شیدا کون کرے!

ہر گام کسی کی منزل ہے، ہر رہرو گو ہے ناواقف،
جب یہ ہو حقیقت اے سالک، منزل کا ارادا کون کرے؟

سالک لکھنوی

ARISTIDES

ارسٹائڈس

قدیم یونان کا ایک شہرہ آفاق شجاع و مدبر مخلص خادم قوم

میں جدید اردو کی اس اشاعت میں قدیم بہادران یونان کے متعلق پلوٹارچ کی لکھی ہوئی کتاب (P[illegible] of Greek [illegible]) کے پہلے باب کا خلاصہ[1] سپرد قلم کر رہا ہوں۔ اس باب میں ارسٹائڈس کا ذکر ہے جس نے پانچویں صدی قبل مسیح میں اپنے ملک و قوم کی نہایت اچھے وقت میں شاندار خدمات انجام دیں اور اپنی عقل و تدبر اور جانفشانیوں کی بدولت یونان کو ترقی و اقبال کے اعلیٰ مدارج تک پہنچا دیا۔

قدیم یونان کا ایک دور تو وہ گزرا ہے جبکہ خود یونانیوں کے عقائد کے مطابق انسان اپنے بہادرانہ کارناموں ([illegible]) کی وجہ سے غیر فانی ہو کر دیوتاؤں کے صف میں جگہ پا سکتا تھا اور دیوی دیوتا کوہ الائمپس کی چوٹیوں سے اتر کر فانی انسانوں کی ملاقات و امداد کیا کرتے اور اگر موقع ملتا تو ان سے رشتۂ ازدواج بھی پیدا کر لیتے تھے۔ لیکن میں جس زمانے کی حالت لکھ رہا ہوں اس زمانے میں عقائد بہت کچھ بدل چکے تھے۔ قدیم دیوی دیوتاؤں (جوپیٹر یا جوو۔ جونو۔ منروا یا پلاس ایتھینی۔ پروسپرینا۔ اپولو۔ ڈیانا۔ وینس۔ پلیٹو وغیرہ) کی پرستش تو ضرور ہوتی تھی مگر دیوتا دیوتا سمجھے جاتے تھے اور انسان انسان۔ دونوں کے جسمانی تعلقات کا خیال تعلیم یافتہ طبقہ کے دماغوں سے دور ہو چکا تھا لیکن روحانی تعلقات کا عقیدہ مستحکم طریقہ سے موجود تھا۔

چھٹی صدی قبل مسیح سے آریاؤں کے انتہائی عروج کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ یہی زمانہ تھا جبکہ ایران میں سائرس[2] نے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی تھی جس کی ایک ڈانڈ چین و تاتار سے اور دوسری ڈانڈ یونان و مصر سے ملی ہوئی تھی۔ ہندوستان پر بھی وہ فوج کشی کر چکا تھا۔ اس سلطنت کے مقابل اس وقت دنیا کی کوئی سلطنت نہ تھی اور آریاؤں کی تو یہ سب سے بڑی سلطنت تھی جو اس زمانہ میں قائم ہوئی۔ ہندوستان میں بھی بڑی بڑی سلطنتیں قائم ہونے لگی تھیں (بمبسار نے مگدھ کی نامی سلطنت کی بنیاد ڈال دی تھی) لیکن ابھی تک کوئی طاقتور مرکزی سلطنت قائم نہ ہوئی تھی (سب سے پہلی طاقتور مرکزی سلطنت چندر گپت موریا نے سکندر اعظم کی ہندوستان سے واپسی کے بعد [illegible] میں قائم کی تھی)۔ اہل یونان بھی محققین کے قول کے مطابق آریا نسل سے تھے۔ مگر وہاں معاملہ بالکل برعکس تھا وہاں کے باشندے بادشاہ یا مطلق العنان حکمران کے نام سے عار کھاتے تھے وہاں جمہوری نیابتی حکومت کا دور دورہ تھا (سکندر اعظم کے دور سلطنت میں بھی ان کا نظام جمہوریت بہت حد تک باقی رہا اور سکندر کی بادشاہت اہل یونان پر متغلبانہ نہیں بلکہ مصالحانہ تھی) کسی قیمت پر بھی یونان جمہوری نیابتی حکومت کے بدلے مطلق العنانہ حکومت قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ اس کے لیے انہیں بڑی بڑی قربانیاں دینی پڑیں اور بڑے بڑے مصائب جھیلنے پڑے۔ یونانی اس وقت کیسی حکومت پسند کرتے تھے اور تہذیب و تمدن کے کس دور سے گذر رہے تھے یہ اس کا مختصر حال ارسٹائڈس کے حالات زندگی سے ظاہر ہوگا جو مندرجہ ذیل ہے

ارسٹائڈس لیسی میکس کا بیٹا اور ایٹی اوچس خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اس نے اولیس کی نگرانی میں تعلیم و تربیت پائی تھی [illegible]

---

[1] اس ترجمہ درمیان مضمون میں کچھ اپنے خیالات کا بھی اظہار ہے جسے بغور ناظرین آسانی کے ساتھ سمجھ جا سکتے ہیں۔

[2] یونانی مورخین کے مطابق اس کا نام سائرس Cyrus تھا جس نے [illegible] قبل مسیح میں وفات پائی اور میڈیا۔ ایشیا۔ بابل۔ ہندوستان [illegible] کو ایک سلطنت [illegible] سکندر اعظم [illegible] ([illegible]) [illegible]

خاندان کے متعلق مختلف بیانات ہیں۔ مگر زیادہ قرینِ قیاس یہی ہے کہ اس نے ہمیشہ نہایت عزت و مسرت کے ساتھ زندگی بسر کی۔ یہاں تک کہ اُس کی وفات کے بعد اُس کی دو لڑکیاں افلاس کے باعث کافی عرصہ تک نا کتخدا رہ گئیں۔

کلستھینز (Clisthenes) جس نے ایتھنز سے مطلق العنان حکمرانوں (TYRANTS) کو نکال باہر کرنے کے بعد خالص جمہوری نیابتی حکومت کی بنیاد ڈالی تھی اُس کے خاص دوستوں میں تھا۔ پھر بھی وہ لائکرگس لیسیڈیمونین (باشندہ اسپارٹا) (Lycurgus the Lacedaemonian) کو بھی نہایت تقدس و عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور اسے سب سے بڑا قانون ساز سمجھتا تھا۔ (اہل اسپارٹا عرصہ دراز سے ایسی ہی حکومت پسند کرتے تھے اور وہاں بادشاہ بھی ہوتے تھے اگرچہ وہ مطلق العنان نہ ہوتے تھے۔ تاہم یہ طرزِ حکومت دیمقراطیسی حکومت کا مخالف تھا) اسی وجہ سے ارسٹائڈس کا رجحان ارسٹاکریسی (Aristocracy) (حکومت شرفاء) کی طرف زیادہ تھا اور وہ ہمیشہ اپنے زبردست حریف تھیمسٹوکلس (Themistocles) کی جو خالص دیمقراطیسی Democracy (حکومت عوام) کا حامی تھا، پرزور مخالفت کیا کرتا تھا۔

تھیمسٹوکلس طبقہ عوام میں بہت ہر دلعزیز تھا۔ اُس کے خصوصی دوست و احباب بھی بہت تھے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ میں ایسے اجلاس کی صدارت کرنا نہیں چاہتا جہاں غیروں سے زیادہ اپنے دوستوں کو فائدہ نہ پہنچا سکوں۔ اس کے برخلاف ارسٹائڈس نے اپنی خاص روش اختیار کی تھی۔ وہ نہ تو اپنے دوستوں کو خوش کرنے کے لیے کسی قسم کی ناانصافی کے لیے رضامند ہوتا اور نہ ان کی درخواست بالکل رد کر کے انہیں قطعی مایوس و ناراض کرتا۔

تھیمسٹوکلس بھی اپنے وقت کا بہت بڑا مدبر، بہادر اور فدائے قوم تھا۔ لیکن وہ اکثر جلد بازی کر کے خطرناک کارروائیاں کر بیٹھتا تھا اور اس طرح عوام میں ہر دلعزیز بننا چاہتا تھا۔ ارسٹائڈس نہیں چاہتا تھا کہ وہ من مانی کارروائی کر کے ملک و قوم کو نقصان پہنچا دے۔ اسی وجہ سے ارسٹائڈس اس کو ناکامیاب بنانے اور اُس کے اثر کو مٹانے کی ہر امکانی کوشش کیا کرتا تھا۔ باوجود منصف مزاج ہونے کے تھیمسٹوکلس کی مخالفت میں اُسے ناانصافی سے بھی کام لینا پڑتا تھا۔ لیکن جہاں قوم و ملک کے حقیقی مفاد کا سوال آتا تھا وہاں فوراً دوستی کا ہاتھ بڑھانے کیلئے دل و جان سے تیار ہو جاتا۔ یہی نہیں بلکہ اپنے حریف و رقیب کو آگے بڑھا کر خود دوسرا درجہ قبول کر لیتا۔ اس کا ثبوت آئندہ واقعات سے ملیگا

حکومت کے انقلاب و تغیر کے زمانے میں ارسٹائڈس کا استقلال بھی حیرالعقول تھا۔ نہ تو وہ اپنی عزت افزائی و قدردانی پر مغرور و نازاں ہوتا اور نہ اپنی ذلت و ناکامیابی پر دل شکستہ۔ وہ میانہ روی و استقلال کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتا رہتا اور اس پر یقین رکھتا کہ ملک و قوم کی خدمت کرنا اس پر فرض ہے خواہ اسے اپنی خدمات کا مناسب انعام و معاوضہ ملے یا نہ ملے۔ ایک دفعہ اسٹیج پر ایک قدیم یونانی بہادر امفیاروس کی مدح میں اسکائلس کے کچھ اشعار پڑھے گئے جن کا مطلب یہ تھا

"اس جوانمرد کا اصول یہ ہے کہ وہ کام کرنا چاہتا ہے دکھلانا نہیں چاہتا۔ اس کا دماغ مناسب و مکمل عقل پر قائم ہے۔ اور اسے کسی قسم کی ستائش کی حاجت نہیں"

تو سب کی نگاہیں بے ساختہ ارسٹائڈس کی طرف اٹھ گئیں گویا کہ ان اشعار کا صحیح مصداق اُس کے سوائے کوئی نہ تھا۔

ایک بار ارسٹائڈس نے اپنے ایک زبردست دشمن کے خلاف ٹریبونل میں مقدمہ چلایا۔ جتنے مجسٹریٹ تھے وہ مجرم کو اپنی بریت میں کچھ بولنے کا موقع دیئے بغیر اپنا فیصلہ صادر کرنے والے تھے۔ ارسٹائڈس کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ ایتھنز کا کوئی باشندہ خواہ وہ اس کا جانی دشمن ہی کیوں نہ ہو قوانین ملکی کے عطا کردہ حقوق سے محروم کر دیا جائے۔ چنانچہ اُس نے خود اٹھ کر مجسٹریٹوں سے سفارش کی کہ اس ملزم کو بھی قانون مروجہ کے مطابق اپنی صفائی کا موقع دیا جائے۔

ایک بار جبکہ ارسٹائڈس خود اجلاس عدالت کی صدارت کر رہا تھا مدعی نے ملزم کے متعلق کہا "جناب اس نے آپ کو بہت کچھ نقصان پہنچائے ہیں" ارسٹائڈس نے بگڑ کر کہا "مجھ سے نہ کہو بلکہ اُس نے تمہیں جو کچھ نقصان پہنچائے ہیں صرف انہیں بیان کرو کیونکہ میں یہاں پر اپنا مقدمہ نہیں بلکہ تمہارا مقدمہ فیصل کرنے کے لیے بیٹھا ہوں"

ایک وقت جب کہ وہ خزانہ کا افسر بنایا گیا تو اس نے اگلے افسروں خاص کر تھیمسٹوکلس کی بددیانتیاں کھول کھول کر ظاہر کیں اس پر [illegible] نے کہا "باوجود اس قدر عقل رکھنے کے وہ [illegible] ہاتھوں کو قابو میں [illegible]

جب سالانہ حساب کا وقت آیا تو تھیمسٹوکلس نے اس کی مخالفت میں ایک جماعت کھڑی کر دی جنہوں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر حساب میں متعدد غلطیاں نکالیں اور عام مجلس نمائندگان میں اسے خیانت کا مجرم ثابت کر دیا۔ لیکن شہر کے معزز اور سمجھدار لوگ ارسٹائڈس کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور اُسے نہ صرف تمام جرائم سے بری الذمہ ثابت کر دیا بلکہ اسے دوبارہ خزانچی کے عہدے پر سرفراز کرا دیا۔

اس دفعہ ارسٹائڈس نے اپنی حکمت عملی بدل دی اپنے ماتحت افسروں کو روپیہ ہضم کرنے کا پورا پورا موقعہ دیدیا۔ دوسرے سال محاسبہ کے وقت اس کی ہر طرف سے تعریف و توصیف ہونے لگی۔ اور سبھوں نے یکزبان ہو کر سفارش کی کہ ارسٹائڈس ہی پھر خزانچی بنایا جائے۔ لیکن اس فدائے قوم نے اپنی قوم کو خوب ملامت کی اور اصل معاملہ بیان کر دیا۔ اور کہا کہ مجھے تمہاری گذشتہ توہین سے زیادہ موجودہ عزت افزائی سے صدمہ پہنچا ہے اور شرم آتی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوتا ہے کہ تمہیں بدطینت لوگوں کی پرورش کا خیال قومی خزانہ کی حفاظت کے خیال سے کہیں زیادہ ہے۔

اسی زمانہ میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس سے ارسٹائڈس کی محیر العقول فراخدلی۔ عالی حوصلگی۔ عالی دماغی، شجاعت اور مخلصانہ قومی خدمت روز روشن کی طرح ظاہر ہو گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں سلطنت[1] ایران جن کی سلطنت چین سے مصر کی آخری حد تک اور دریائے سندھ و بحیرہ عرب سے بحیرہ اسود و مارمرا اور روم تک پھیل چکی تھی یونان کو بھی سرنگوں کرنا چاہتے تھے۔ کم سے کم وہ چاہتے تھے کہ یونان[2] اُن کا حلیف و بہی خواہ بن جائے۔ لیکن یونانیوں کو جہاں اپنی آزادی سے والہانہ محبت تھی وہاں انہیں ہر مطلق العنان حکمران اور اس کے طریقہ سلطنت و حکومت سے قلبی نفرت و عداوت بھی تھی۔ خواہ بادشاہ اُن کے ساتھ بہاں تک بھی احسان و سلوک کرنا چاہے لیکن اہل یونان کے ساتھ مصیبت یہ تھی کہ وہ مختلف قبائل میں بٹے ہوئے تھے جو آپس میں بڑی مشکل سے متحد ہوتے تھے۔ ہر قبیلہ اپنی شاندار روایات ماضیہ کی بنا پر پورے ملک کی سیادت و قیادت کا دعویدار تھا۔ بالخصوص اہل ایتھنس اور اہل اسپارٹا میں تو پوری رقابت تھی۔ اہل ایتھنس اپنی اعلیٰ دماغی اور علم و فن میں اعلیٰ ترقی کی بدولت پورے یونان ہی نہیں بلکہ غیر ہمسایہ ممالک میں بھی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے تو اہل اسپارٹا اپنی اعلیٰ جسمانی طاقت اور جنگی مہارت کی بدولت سب پر گوئے سبقت لے گئے تھے جہاں تک ملکی (سول مامنمنٹ) نظم و نسق کا سوال تھا اہل ایتھنس کی سیادت ادنیٰ کوشش سے قائم ہو جاتی مگر فوجی قیادت اہل اسپارٹا کسی قیمت پر بھی اپنے ہاتھوں سے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ ارسٹائڈس کی تنہا کوشش تھی کہ اہل اسپارٹا نے درۂ تھرما پلے میں حیرتناک جانبازی دکھائی اور ایرانیوں کو شکست فاش دیکر پورے یونان کو بچا لینے کے باوجود بھی خود ہی فوجی قیادت مطلقی کا بھی دعویٰ چھوڑ دیا اور اہل ایتھنس ہر معنی میں پورے یونان کے سردار و قائد اعظم ہو گئے۔ اور یہ جیسا کہ آئندہ واقعات سے ظاہر ہو گا بہت ہی اچھا ہوا ورنہ ایرانی اُسی وقت پورے یونان کو پامال کر کے ہمیشہ کے لیے ان کی آزادی و عزت کا جنازہ نکال دیتے۔

یہ زمانہ شہرہ آفاق شہنشاہ ایران داراب بن بہمن (Darius I) کا زمانہ تھا۔ یونانیوں نے ایک ایرانی بندرگاہ سارڈس میں آگ لگا دی تھی۔ دارا نے ایک زبردست فوج اپنے نامی جنرل ڈیٹس (Datis) کے ماتحت یونانیوں کی تادیب کے لیے روانہ کی جس کا اصل مقصد یہ تھا کہ پورے یونان کو ایرانی سلطنت میں ملا دے۔ ڈیٹس اپنی فوجوں کو جہازوں میں بٹھا کر میراتھن پہنچ گیا۔ اور قریب کے علاقوں کو تاخت و تاراج کرنا شروع کر دیا۔ چونکہ یہ علاقہ ایتھنس کے قریب تھا اس لیے اصل مقابلہ اہل ایتھنس کو کرنا پڑا۔ انہوں نے دو سپہ سالار مقرر کیے اول ملتیاڈس۔ دوئم ارسٹائڈس۔ دونوں باری باری سے فوج کی قیادت کیا کرتے لیکن ارسٹائڈس نے دیکھا کہ اس طریقے سے جنگ میں ایسے زبردست دشمن کے مقابلہ میں کامیابی ناممکن ہے تو وہ خود رضاکارانہ طور پر قیادت سے علیحدہ ہو گیا اور پورا اختیار ملتیاڈس کے ہاتھوں میں دیکر خود اس کی مخلصانہ اطاعت پر کمربستہ ہو گیا۔ ارسٹائڈس کی دیکھا دیکھی دوسرے جنرلوں (امدادی فوجوں کے افسروں) نے بھی اپنی باری کی قیادت رضاکارانہ طور پر چھوڑ دی اور پورا اختیار ملتیاڈس کو

---

[1] داراب اول (دریوش) بن بہمن (Darius I) جس نے ۵۲۱ ق م تا ۴۸۵ ق م تک سلطنت کی اسے قدیم شاہان ایران کا یونانی مورخین کے خیال کے مطابق بہت بڑا بادشاہ سمجھا جاتا ہے۔

[2] ... ایک چھوٹی سی ریاست تھی کہ ... اس وقت جبکہ ایرانی ... یونانیوں سے کہیں زیادہ مہذب اور ... تھے شہر ... پر ... کر ... لیا ...

کے ہاتھوں میں دیدیا۔ یہ طریقہ پورا کامیاب رہا۔ ملٹیاڈس بہت تجربہ کار جنرل تھا وہ تمام دوسرے جنرلوں اور ان کی ماتحت فوجوں کو مناسب مقامات پر تعینات کرتا رہا اور اس طرح اُس نے ایرانیوں کو بہت ذلیل شکست دے کر بھگا دیا۔ داراب بن بہمن کے عہد سلطنت میں پھر دوسرا حملہ یونان پر نہیں ہوا۔

اس جنگ میں ارسٹائڈس کی عزت اس قدر بڑھ گئی کہ وہ آئندہ سال آرچن ( ) کے نہایت معزز عہدے پر منتخب کیا گیا اور اس سال کا نام اس کے نام پر ارسٹائڈس رکھا گیا۔ یونان میں آرچن کا عہدہ اعلیٰ ملکی عہدہ تھا۔

ارسٹائڈس بہت سے صفات حسنہ کا حامل تھا۔ لیکن اس کی وہ صفت جس نے اُسے تمام خاص و عام کی نگاہوں میں نہایت ہی ہر دلعزیز بنا دیا وہ اس کی اعلیٰ انصاف پسندی تھی۔ یہ ایسی صفت تھی کہ اس کی وجہ سے اس کے دوران حکومت میں قوم و ملک کو گرانقدر فوائد حاصل ہوئے۔ اس طرح سے اگرچہ وہ ایک غریب اور معمولی (مگر شریف و معزز) طبقہ کا آدمی تھا لیکن پھر بھی "عادل" "مقدس" کے شاہانہ و مقدس لقب سے ملقب ہو گیا۔ لیکن یہی لقب کچھ عرصہ کے بعد اس کے گوناگوں مصائب و پریشانیوں کا باعث بن گیا۔ وجہ یہ ہوئی کہ وہ لوگ جو اپنے آپ کو تدبر و شجاعت میں اس کا مد مقابل سمجھتے تھے اور امور مملکت میں برسر اقتدار آنا چاہتے تھے لیکن ارسٹائڈس کے جیتے جی یا اس کی موجودگی میں کسی طرح اعلیٰ کامیابی تک پہنچ نہ سکتے۔ اس کے جانی دشمن بن گئے۔ سب کا سرغنہ تھیمسٹوکلس تھا جو سیاست و شجاعت میں ارسٹائڈس سے کسی حال میں کم نہ تھا اور بہت بڑا مقرر بھی تھا اگرچہ اس کے اخلاق بہت پست تھے (یہی بات آگے چل کر اس کی ذلت و بربادی کا باعث ہوئی) اس نے ارسٹائڈس کے خلاف بہت سے سیاسی حربے استعمال کیے لیکن سب اس پر الٹ کر پڑے۔ آخر اس نے عوام میں مشہور کرنا شروع کر دیا کہ ارسٹائڈس نے چھوٹی چھوٹی عدالتوں کو اس لیے توڑ دیا ہے کہ تمام معاملات و مقدمات خود مطلق العنانہ طور پر فیصل کرے اور اس طرح وہ انصاف کی آڑ لے کر شاہانہ طاقت و اختیار حاصل کر رہا ہے۔

یہ حربہ بہت کارگر ثابت ہوا کیونکہ اہل یونان کسی حال میں بھی ایک شخص واحد کو اتنا اختیار نہ دے سکتے تھے کہ وہ مطلق العنان ہو جائے جب انہیں یقین دلا دیا گیا کہ ارسٹائڈس کی روز افزوں ہر دلعزیزی اور اضافۂ اثر و اقتدار جمہوریت کے لیے نہایت خطرناک ہے تو تمام شہروں کے نمائندے ایتھنس میں جمع ہوئے تاکہ ارسٹائڈس کو اوسٹراسزم ( ) کے ذریعہ جلاوطن کر دیں اس قسم کی جلاوطنی کسی سخت جرم یا بداخلاقی کی بنا پر نہ کی جاتی تھی بلکہ اس کا منشا صرف یہ ہوتا تھا کہ ایسے شخص کے اثر و اقتدار کو مٹا دیا یا کم کر دیا جائے جس کے بارے میں مطلق العنان بن جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہو۔

اوسٹراسزم کا طریقہ یہ تھا کہ ہر شہری (وہ شخص جسے انتخابات نمائندگان حکومت میں حصہ لینے کا اختیار ہو جسے انگریزی میں [illegible] کہتے ہیں) ٹوٹے برتن یا سنکھ یا سیپ پر اُس شخص کا نام لکھ دیتا تھا جس کو جلاوطن کرنا منظور ہوتا تھا اس کے بعد اس برتن یا خول کو ایک لکڑی کے احاطے میں جو شہر کے چوراہے پر خاص اسی کام کے لیے بنایا جاتا تھا لا کر رکھ دیتا تھا۔ جب تمام برتن اور خول جمع ہو جاتے تو انہیں شمار کیا جاتا اگر ان کی تعداد چھ ہزار (۶۰۰۰) سے کم ہوتی تو اس پر کوئی کارروائی نہ کی جاتی۔ لیکن چھ ہزار یا اس سے زیادہ تعداد میں ہونے سے یہ دیکھا جاتا کہ سب سے زیادہ برتنوں یا خولوں پر سب سے زیادہ کس کا نام مکتوب ہے جس کا نام زیادہ ہوتا اُسے دس سال کے لیے جلاوطن کر دیا جاتا لیکن اسے اپنی جائداد سے منتفع ہونے کی عام اجازت دیجاتی تھی۔ ایک زمانے تک تو اس ذریعہ سے عموماً صرف بڑے بڑے لوگ جلاوطن کیے جانے لگے لیکن بعد میں عوام الناس بھی اس طرح جلاوطن کیے جانے لگے تو یہ طریقہ جلاوطنی کا موقوف کر دیا گیا

غرض یہ کہ ارسٹائڈس جلاوطن کر دیا گیا اور ایتھنس اور اس کے زیر اثر علاقوں کی حکومت تھیمسٹوکلس کے ہاتھوں میں آگئی۔ لیکن تین ہی سال کے بعد جبکہ شہنشاہ ایران زرکسیس[1] ( ) نے لکھوکھا سپاہیوں کے ساتھ یونان کو ایک طرف سے پامال کرنا شروع کر دیا تو وہ واپس بلا لیا گیا۔ واپسی کے بعد پھر اس نے اپنے حیرت انگیز جذبۂ ایثار و خدمت قومی کا عدیم المثال مظاہرہ کیا اس نے اپنے قدیمی حریف تھیمسٹوکلس کی قیادت بطیب خاطر قبول کر لی اور خود سب سے خطرناک محاذات پر ایک معمولی افسر کی حیثیت سے داد جانبازی دیتا رہا۔ اسی کی زبردست شجاعت و حکمت عملی کا نتیجہ تھا کہ ۴۸۰ ق۔م میں سلامس[2] (Salamis) کی لڑائی میں

[1] داراب بن بہمن ( ) کا بیٹا تھا اور بہت بڑا فاتح جنرل تھا ۵۱۹ ق۔م میں پیدا ہوا اور ۴۸۵ سے ۴۶۵ ق۔م تک سریر آرائے سلطنت ایران رہا

[2] اس سے تھوڑے ہی عرصہ پہلے درۂ تھرماپلے میں اہل اسپارٹا نے مشہور عالم جانبازی کا مظاہرہ کر کے دشمنوں کو مرعوب کر دیا تھا

ایرانیوں کو زبردست شکست ہوئی اور شہنشاہ اپنے سپہ سالار مردونیس (Mardonius) کے حوالے تین لاکھ فوج کرکے خود گھر بھاگ گیا۔

اُس کے ایک سال بعد ۴۷۹ ق۔م میں پلیٹے (Plataea) کی جنگ میں ارسٹائڈس نے صرف ۸ ہزار کی جمعیت سے ایرانیوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ اس جنگ میں اگرچہ وہ اہل ایتھنس کا سپہ سالار تھا مگر اس وقت تمام یونانی فوجیں متحد ہوکر ایرانیوں کا مقابلہ کر رہی تھیں اور سب کا سپہ سالار اسپارٹا کا باشندہ پوسیناس (Pausanias) تھا جس کی اطاعت ارسٹائڈس کے لیے بھی لازمی تھی۔ لیکن جنگ کی تفصیل دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یونانیوں کی فتحیابی میں اصل ہاتھ ارسٹائڈس اور اہل ایتھنس ہی کا تھا۔ جب کوئی خطرناک موقع درپیش آیا فوراً ارسٹائڈس رضاکارانہ طور پر اپنی ایشیائی فوج کی مختصر جمعیت کو ساتھ لیکر آگے بڑھ گیا۔ آخر ایرانیوں کو نہایت ذلیل و تباہکن شکست ہوئی۔ ان کا سپہ سالار اعظم مردونیس سخت ذلیل طریقہ سے ہلاک ہوا (ایک اسپارٹن سپاہی نے پتھر مار کر اس کا سر توڑ دیا اس کا نائب افسر ارتابزوس (Artabazus) صرف چالیس ہزار فوج کے ساتھ ایران بھاگ گیا۔

اس فتحیابی نے یونانیوں کی عزت میں چار چاند لگا دیئے۔ ان کی دھاک دور دور تک بیٹھ گئی اور ایک عرصہ دراز تک یونان اجنبی حملوں سے محفوظ و مصئون رہ کر تہذیب و تمدن، علم و ہنر اور فنون لطیفہ میں شاندار ترقی کرتا رہا۔ سقراط و افلاطون و ارسطو ایسے نامور حکماء اسی دور امن و امان میں پیدا ہوئے۔

ایران و یونان کی جنگوں اور حکومت کے نظم و نسق میں ارسٹائڈس کی شاندار مدبرانہ، مخلصانہ اور جانبازانہ خدمات کی وجہ سے اہل ایتھنس کا اثر و اقتدار سارے یونان پر غالب آگیا اور ملکی قیادت کے علاوہ فوجی قیادت عظمیٰ بھی اہل اسپارٹا کے ہاتھوں سے نکل کر اہل ایتھنس کے ہاتھوں میں چلی آئی اور آئندہ سال خود ارسٹائڈس تمام افواج متحدہ یونانیہ کا قائد اعظم مقرر کیا گیا اور حکومت کی باگ ڈور بھی اسی کے ہاتھوں میں دیدی گئی۔ اس کے بعد جو اُس نے انتظامات کیئے وہ اہل یونان کے لیے بالعموم اور اہل ایتھنس کے لیے بالخصوص نہایت مفید اور خوش آئند تھے۔

جبکہ لیسی ڈومینیس (اہل اسپارٹا) کے ہاتھوں میں فوج کی قیادت عظمیٰ تھی یونان کی دیگر ریاستیں جنگی اخراجات اور فوجی ضروریات کے لیے ایک قسم کا ٹیکس ادا کیا کرتی تھیں۔ لیکن ٹیکس کی تقرری و وصولی کسی منظم طریقہ پر نہ تھی۔ بعض ریاستوں کو بہت زیادہ دینا پڑتا تھا اور بعض کو بہت کم۔ اب تمام ریاستوں نے مل کر اہل ایتھنس سے یہ درخواست کی کہ خاص ارسٹائڈس کو اس کام پر متعین کیا جائے کہ ان کی زمینوں اور آمدنیوں کی جانچ پڑتال کرکے ٹیکس اسطرح مقرر کردے کہ ہر ریاست کو اُس کی حیثیت کے مطابق بوجھ اٹھانا پڑے۔ ارسٹائڈس نے یہ اختیار پاکر جو درحقیقت اسے سارے یونان کا مالک و خود مختار بنا رہا تھا خود کوئی ناجائز فائدہ نہ اٹھایا بلکہ اور بھی غریب ہوگیا اور ٹیکس اس قدر کم مقدار میں مساویانہ طریقہ سے مقرر کیے کہ تمام ریاستیں بطیب خاطر مقرر کردہ ٹیکس ادا کرنے کے لیے رضامند ہوگئیں۔ اور اس کے انتظام کو یونان کی خوش قسمتی " (The happy fortune of Greece) سے تعبیر کرنے لگیں۔ کیونکہ ارسٹائڈس کے مقرر کردہ ٹیکس کی پوری مقدار صرف ۴۶۰ ٹیلنٹ (ایک ٹیلنٹ = ۲۰۰ پونڈ انگریزی) ہوتی تھی اس کے تھوڑے عرصہ کے بعد پریکلیس (Pericles) نے اس کی مقدار بڑھا کر ۶۰۰ ٹیلنٹ کر دی اور اس کے بعد کے ناظمین حکومت نے تو اس کی مقدار ۱۳۰۰ ٹیلنٹ (۲۶۰۰۰۰ پونڈ) تک پہنچا دی۔ یہ اضافہ اس لیے نہیں ہوا کہ آئندہ دور میں جنگ کے اخراجات بہت بڑھ گئے بلکہ ان ناظمین حکومت نے عوام کو اس کا عادی بنا دیا کہ وہ عالیشان عمارتوں اور یادگاروں کی تعمیر اور قومی کھیل تماشوں، جشنوں اور تہواروں پر دل کھول کر روپیہ خرچ کریں۔

ارسٹائڈس کی انصاف پسندی کا سب سے بڑا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے تھیمسٹوکلس نے عام جلسہ نمائندگان اہل ایتھنس میں بیان کیا کہ میں نے ایک ایسی تدبیر سوچی ہے جس سے اہل ایتھنس کو انتہائی فائدہ پہنچنے کی امید ہے مگر بہت راز کی بات ہے۔ نمائندوں کو ارسٹائڈس پر اس قدر اعتماد تھا کہ انھوں نے تھیمسٹوکلس سے کہا کہ تم اپنا راز صرف ارسٹائڈس سے کہدو اگر وہ تمہاری تدبیر پسند کرے تو اچھا ہے ورنہ اپنے خیال کو ہمیشہ کے لیے دماغ سے نکالدو۔ اس کی تدبیر یہ تھی کہ تمام اتحادیوں کے جنگی بیڑوں میں چپ چاپ آگ لگا دی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اہل ایتھنس پورے یونان کے مالک و فرمانروا ہو جائیں گے۔ ارسٹائڈس

نے یہ تدبیر سن کر نمائندوں سے جا کر کہا تھیمسٹوکلس کی جو تدبیر ہے اس سے بڑھ کر کوئی تدبیر اہلِ ایتھنس کے لیے مفید نہیں ہو سکتی۔ مگر اس سے زیادہ بد انصافی کی بھی کوئی دوسری بات نہیں ہو سکتی۔ صرف اسی رپورٹ کو سن کر تمام نمائندوں نے بیک زبان تھیمسٹوکلس کو حکم دیدیا کہ اپنے اس خیال کو ہمیشہ کے لیے اپنے دماغ سے نکال دو

ارسٹائڈس اگرچہ فطرتاً نہایت انصاف پسند واقع ہوا تھا لیکن بعض سیاسی معاملات ایسے درپیش ہو جاتے تھے جہاں قومی مفاد کے لیے اسے بھی جادۂ انصاف سے ہٹنا پڑتا تھا۔ لیکن جب بھی وہ ایسا کرنے کے لیے مجبور ہوتا تھا تو بہت سنبھل کر اور خوب غور و خوض کر کے کیا کرتا تھا اور جن لوگوں کو اس سے نقصان پہنچتا تھا بعد میں ان کے ساتھ کچھ اچھا سلوک کر دیا کرتا تھا۔

یونان کا نامور حکیم افلاطون[1] (Plato 429–347 B.C.) ایتھنس کے عظیم المرتبت اور نامور لوگوں میں صرف ارسٹائڈس ہی کو حقیقی معنی میں قابلِ قدر و منزلت سمجھتا تھا۔

اپنے سب سے بڑے حریف و مخالف تھیمسٹوکلس کے ساتھ اس کا سلوک اور بھی حیرت انگیز تھا۔ اگرچہ وہ ارسٹائڈس کی حکومت کے تمام معاملات میں سخت مخالفت کیا کرتا تھا اور اس کی جلاوطنی کا باعث بھی وہی تھا، پھر بھی جب تھیمسٹوکلس خود حکومت و ریاست کے خلاف شدید جرائم کے الزام میں ماخوذ ہوا اور ارسٹائڈس کو اپنا انتقام لینے کا زرین موقع ہاتھ آیا پھر بھی اس نے اس وقت اس سے ذرہ برابر بھی جذبہ انتقام سے کام نہ لیا، بلکہ جبکہ الکمین، سیمن اور دوسرے بڑے بڑے یونانی مدبرین و مقربین تھیمسٹوکلس کی جلاوطنی کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائے تھے۔ صرف تنہا ارسٹائڈس تھا جس نے نہ کوئی ایسا کام کیا اور نہ کوئی ایسی بات زبان سے نکالی جس سے تھیمسٹوکلس کو کسی قسم کا نقصان پہنچے۔ کیونکہ اپنی فطرت کے مطابق جس طرح ارسٹائڈس کو اپنے حریف کے اقبال پر کسی قسم کا رشک و حسد نہیں ہوا اسی طرح اس کی قسمت کے بگاڑ سے بھی اسے کسی قسم کی خوشی حاصل نہیں ہوئی۔

ارسٹائڈس نے اچھی عمر پا کر پانچویں صدی قبل مسیح کے نصف آخر میں بقول معتبر بمرض طبعی وفات پائی اور قومی چندہ سے اس کی شاندار یادگار تعمیر کی گئی لیکن وفات کے وقت وہ اتنا غریب ہو گیا تھا کہ اس کے ترکہ سے اس کی تجہیز و تکفین بھی مناسب طریقہ سے ناممکن تھی۔ اس کے پسماندگان کے ساتھ بھی قوم نے بہت اچھا سلوک کیا۔ اس کی دونوں لڑکیوں کو اخراجات شادی کے لیے قومی خزانے سے تین تین ہزار درہم ملے اور اس کے بیٹے لیسی میکس (Lysimachus) کو اہلِ ایتھنس نے ایک سو رپئے چاندی اور ایک سو ایکڑ زمین عطا کی اور چار درہم روزانہ وظیفہ بھی مقرر کر دیا۔ لیکن اس نے کوئی نمایاں شہرت حاصل نہ کی وہ بھی ایک بیٹی چھوڑ کر مرا اور اس کا بھی قوم نے معقول وظیفہ مقرر کر دیا۔

غرض یہ کہ ارسٹائڈس کی زندگی ہر صورت سے کامیاب زندگی گذری اور قوم نے بھی اس کی پوری قدر دانی کی۔ اس کی اور اس کی قوم کی زندگی دوسرے لوگوں اور قوموں کے لیے قابلِ تقلید نمونہ ہے۔

سید مظہر حسین مظہر مبارکی

---

[1] افلاطون ۴۲۹ تا ۳۴۷ ق م سقراط کا شاگرد اور ارسطو کا استاد تھا۔

غزل

محمد شفیع سرور

وہ پرکیف راتیں وہ رنگیں فسانہ
ہمیں بھی سکھا دے کوئی بھول جانا

شبِ غم میں یاد آ کے اے جذبِ الفت
اُجڑی ہوئی میری دنیا بسانا

مٹا کر میری مضطرب زندگی کو
سرہانے آ کر نہ آنسو بہانا

میں بھولے سے ان کو جو یاد آ گیا ہوں
بنا باز مانے نے اس کو فسانہ

نہیں ملتا دنیا میں کوئی ٹھکانہ
[illegible] آگیا [illegible] زمانہ

یونان جدید :۔ وہ علاقے جو ترکی یورپ، بلغاریہ، یوگوسلافیہ، البانیہ بحیرۂ ایجین اور بحیرۂ روم کے درمیان ہیں

یونان قدیم :۔ کوہ الامپس کے جنوب کے علاقے۔



نقشہ یونان قدیم (۴۰۰ قبل مسیح) و جدید (۱۹۱۴ء و ۱۹۴۱ء کے درمیان)

یادداشت :۔ میراتھون ایتھنس سے ۱۸ میل شمال مشرق میں واقع ہے

۲ درۂ تھرماپلے کوہ الامپس اور خلیج سلونیکا (شہر سلونیکا و لاریسا کے درمیان) واقع ہے۔ جرمن اور اتحادیوں سے ابھی حال میں اس مقام پر سخت جنگ ہوئی تھی۔

۳ ایتھنس جس صوبے میں واقع ہے اس کا نام اٹیکا ہے۔ اٹیکا اور مقدونیہ کے درمیان کا علاقہ تھسلی کہلاتا ہے۔ اسپارٹا کے شمال میں تھیبس ...

خنجر کی نوک

نرگس اب چودہ سال کی ہوگئی تھی۔ لانبا قد۔ کُھبتا نقشہ۔ معصومیت کی تصویر۔ حُسن کی پتلی۔ سلیقہ شعار۔ سعادتمند لڑکی۔ اچھے سے اچھے کھانے پکالیتی۔ سینا، پرونا، بیل بوٹے کاڑھنا، زری اور کلابتون کا کام بنانا، گھر کو صاف ستھرا رکھنا، چیزیں قرینے سے سجانا، اُس کا روزمرہ کا کام تھا۔

ماں، نرگس سے بہت خوش تھی۔ اور خوش کیوں نہ ہوتی نرگس گھر بھر کے لیے ایک فرشتۂ رحمت تھی۔ اس کے دل کی ٹھنڈک تھی۔ آنکھوں کا نور تھی۔

اب اس کی شادی کے لیے پیغام آنے لگے۔ برادری والوں کے پیغام آئے۔ دور نزدیک کے سب شریف گھرانوں کے پیغام آئے مگر نرگس کے والد کی خواہش یہ تھی کہ میری بیٹی کی منسوب ایسے گھر میں ہو جو ہر اعتبار سے بہت اچھا ہو اور خاصہ متمول بھی ہو کہ نرگس کو آئندہ کبھی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے

پہاڑی پور کے رئیس عالی جاہ کے صاحبزادہ کنور عبدالوالی کی نسبت کا پیغام آیا۔ اور یہ پیغام گویا تیر بہدف تھا۔ یہ رشتہ نرگس کے والدین نے بہت پسند کیا۔ پہاڑی پور کے رئیس کی زمینداری اس ضلع میں بھی بہت کافی تھی۔ اور ان کے نام سے وہاں کا بچہ بچہ واقف تھا۔ مگر قصبہ پہاڑی پور وہاں سے بہت دور تھا اور نرگس کی ماں اپنی بیٹی کو اتنی دور جگہ پر بیاہنا نہیں چاہتی تھی۔ کئی دن تک اس نسبت پر بھی ردوکد ہوتی رہی۔ اور آخر کار باپ کی رائے ہی بہتر سمجھی گئی اور منظوری کا فیصلہ ہوگیا۔ نرگس کے والد خود پہاڑی پور جاکر کنور کو دیکھ بھی آئے۔

لڑکا پسند کرلیا گیا۔ میٹرک کا امتحان پاس کرچکا تھا۔ صورت شکل کا بھی اچھا تھا۔ فٹ بال اور کرکٹ کی بازیگاہوں میں بھی اس کی شہرت تھی۔ انگریزی فیشن کی بوباس بھی تھی۔ الغرض نرگس کے والد کو لڑکا ہر طرح سے پسند تھا۔ دولتمند گھرانے کا چشم و چراغ تھا اور اس خاندان کی شرافت اور نجابت دور دور تک ضرب المثل ہوچکی تھی۔

بات پکی ہوگئی۔ منگنی ہوگئی۔ شادی کی تمام رسمیں ایک ایک کرکے انجام پاگئیں۔ نکاح ہوگیا۔ مگر رخصتی چار سال کے لیے ملتوی کردی گئی۔ اس لیے کہ اگر ابھی سے رخصتی ہوجائیگی تو لڑکے کی تعلیم میں خلل آئے گا اور اس کی تربیت ادھوری رہ جائے گی۔ لڑکی والوں نے اس عذر کو بہت معقول سمجھا اور رخصتی چار سال کے لیے ملتوی کردی گئی۔

۲

دن گذرتے گیے اور زمانہ بدلتا گیا۔ عبدالوالی کی طبیعت اور مزاج میں کچھ عجیب سی تبدیلی ہوگئی۔ اس کے ساتھی بدل گیے، سوسائیٹی بدل گئی۔ وہ گاہے ماہے بہت آوارہ لڑکوں کی صحبت میں بھی پایا جاتا۔ بعضوں کا بیان تھا کہ وہ شراب بھی پینے لگا ہے مگر اس خبر کی تصدیق نہ ہوسکی۔

اتنا ضرور ہے کہ وہ ایف اے کے سال اول کے امتحان میں ناکامیاب ہوگیا اور بری طرح ناکامیاب ہوا۔ دوسرے سال پھر اُس نے امتحان دیا اور پھر ناکامیاب ہوا۔ اس کی یہ دوسری ناکامی اس کے ماں باپ پر اور گھر کے تمام بڑے بوڑھوں پر سخت شاق گذری اور سب نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ اب لڑکے کی بیوی کی رخصتی جلد کرادیجائے

کیا عجب ہے کہ بیوی کے دباؤ اور اثر سے لڑکا راہ راست پر آجائے اور اس کی آوارہ منشی دور ہوجائے۔

رخصتی کے لیے پھر نرگس کے والد سے پیام و کلام ہونے لگے۔ یہ لوگ پہلے ہی سے منتظر تھے کہ رخصتی کسی طرح ہوجائے۔ لڑکی سیانی ہوگئی تھی اور اب رخصتی کو زیادہ دنوں تک روکے رکھنا مناسب نہ تھا۔

۳

اس اثنا میں نرگس کے چچیرے بھائی کی برات بیراپور میں ہونے والی تھی۔ اور نرگس کا گھر بھر اس برات میں شرکت کی تیاریوں میں سرگرم تھا

ریل گاڑی شام کے چھ بجے چھوٹتی تھی اور پانچ گھنٹے کا سفر تھا۔ سارا کنبہ کا کنبہ سفر کرنے والا تھا۔ آٹھ بھائی بہن۔ دو ماں باپ دس۔ تین مامائیں۔ تیرہ۔ پھر ماماؤں کی دو لڑکیاں۔ پورے پندرہ

مسافروں کا قافلہ تھا۔ اچھی خاصی چلت پھرت کی پلٹن جا رہی تھی۔ نرگس کے والد انور عالم بہت گھبرائے ہوئے تھے۔

ٹکٹ خریدنا۔ سب کو اسٹیشن لے جانا۔ پھر سامان حفاظت سے ریل گاڑی میں رکھوانا۔ گھوڑے گاڑی والوں سے معاملہ قلیلیا کی رگ جھگ۔ مسافروں کی بھیڑ بھاڑ۔ طرح طرح کے بکھیڑے تھے۔ انور عالم بڑی مصیبت میں تھے۔ مگر یہ تمام مراحل بڑی آسانی سے طے ہو گئے اور سب کے سب بہت اطمینان سے درمیانہ درجہ کی زنانہ گاڑی میں سوار ہو گئے اور گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی روانہ ہو گئی

رات کا وقت اور پورے پانچ گھنٹہ کا سفر تھا۔ ایک دو گھنٹہ تو یونہی باتوں باتوں میں کٹ گئے اور پھر سب پر یکے بعد دیگرے نیند کا غلبہ ہوتا چلا گیا۔ اور جس کسی کو جہاں کہیں جگہ ملی وہ وہیں دراز ہو گیا۔ نرگس بھی اوپر کے ریک پر چڑھ گئی۔ اور اسی کے ایک گوشہ میں سمٹ سمٹا کر سیاہ کمبل اوڑھ کر سو رہی۔

بیرا پور اسٹیشن آگیا۔ یہاں گاڑی کل پانچ منٹ ٹھہرتی تھی انور عالم نے اپنے سامنے جلدی جلدی سب سامان گاڑی سے باہر نکلوایا۔ عورتوں بچوں کو اتروایا۔ سیٹی بجی۔ اور گاڑی چلدی

غریب نرگس اوپر والے ریک پر سوئی کی سوئی رہ گئی اور کسی کی اس پر نظر نہیں پڑی۔ پانچ چھ برقعہ پوش عورتوں اور آٹھ دس بچوں بچوں کے ہجوم میں اور پھر ایسی بھیڑ بھاڑ شور غل اور افراتفری کے عالم میں بیچارے انور عالم یہ نہ دیکھ سکے کہ نرگس بھی ساتھ میں ہے یا نہیں۔ گاڑی سے اتری یا نہیں۔

اسٹیشن سے یہ لوگ برات کے گھر پہنچے اور وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ نرگس نہیں ہے۔ ایک قیامت برپا ہو گئی۔ شادی کا گھر ماتم کدہ بن گیا۔ رونا پیٹنا شروع ہو گیا۔ یہ بات روشن ہو گئی کہ نرگس ریل گاڑی ہی میں اوپر والے ریک پر سوئی کی سوئی رہ گئی کسی نے اسے جگایا نہیں۔ اور اس کی نیند بڑی گہری تھی۔ وہ ہمیشہ بڑی گہری نیند سوتی اور مشکل سے جاگتی تھی۔

اب گاڑی کو بیرا پور سے چھوٹے ہوئے بھی تین گھنٹہ ہو گئے تھے۔ رات کے دو بج چکے تھے۔ اور ہر طرف سناٹا تھا بہر حال فوراً اسٹیشن جا کر دولت نگر کے اسٹیشن ماسٹر کو تار

دیدیا گیا کہ ایک جوان لڑکی درمیانی درجہ کے زنانہ ڈبہ میں اوپر کے ریک پر سوئی ہوئی ہے اسے گاڑی سے اتار لیا جائے اور اس کے والدین کو بیرا پور خبر کی جائے۔ دولت پور جانے والی اس دن اور کوئی دوسری گاڑی نہیں تھی۔ دوسری گاڑی پھر وہی رات کے گیارہ بجے چھوٹتی تھی۔ قیامت کا عالم تھا۔

۴

رات کے دو بجے اور نرگس سوئی سوئی گاڑی کی آخری منزل پر دولت پور پہنچ گئی۔ مسافر سب کے سب اتر گئے۔ گاڑی بالکل خالی ہو گئی اور وہ سوئی ہی رہی۔ گاڑی اسٹیشن سے تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر یارڈ میں پہنچا دی گئی۔ اب یکا یک نرگس کی آنکھ کھل گئی۔

ڈبہ میں بالکل ہُو کا عالم تھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ اندھیرا تھا وہ گھبرا گئی۔ تھر تھر کانپنے لگی۔ ریک سے نیچے اتر آئی۔ ڈبہ سے باہر نکل آئی۔ گاڑی یارڈ میں کھڑی تھی۔ وہاں کئی گاڑیاں اور بھی تھیں۔ مگر سب پر وہی ہُو کا عالم تھا۔ چاروں طرف گھنا جنگل تھا۔ زمین اس کے پیروں تلے سے نکلی جاتی تھی

اتنے میں ایک ریلوے کا ملازم سبز لالٹین ہاتھ میں لیے اسی کی طرف بڑھتا ہوا نظر آیا۔ وہ اسی یارڈ کا ایک پرانا قلی تھا۔ بہت بوڑھا تھا اور آہستہ آہستہ چلا آرہا تھا۔

اس نے نرگس کی داستان بڑی ہمدردی سے سنی اور بہت متاثر ہوا اور کہنے لگا:۔

"بیٹی۔ ہمارے چھوٹے بابو (اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر) کا گھر بہت قریب ہے۔ میں تمہیں وہاں پہنچائے دیتا ہوں۔ ہندو ہیں مگر شریف آدمی ہیں۔ تم رات بھر ان کے یہاں ٹھہر جانا۔ صبح وہ تمہارا کچھ نہ کچھ انتظام ضرور کر دیں گے۔ تم ذرا بھی فکر نہ کرو۔ میں صبح سویرے بڑے بابو کو بھی تمہاری خبر کر دوں گا۔"

بوڑھے قلی نے نرگس کو چھوٹے بابو کے کوارٹر میں پہنچا دیا۔ وہ ابھی ابھی اسٹیشن سے آ ہی رہے تھے کہ نرگس بھی وہاں پہنچی۔ چھوٹے بابو کے ساتھ ان کے ایک نوجوان مہمان بھی تھے جو اسی دو بجے والی گاڑی سے وہاں پہنچے تھے۔

چھوٹے بابو نے نرگس کے سونے کا ایک الگ کوٹھری میں انتظام

کردیا۔ نوجوان مہمان کے لیے کھانا پہلے سے تیار تھا۔ نرگس کو بھی وہی کھانا کھلا دیا گیا اور اسے یقین دلا دیا گیا کہ کل صبح اس کے والد کو تار سے اطلاع کر دی جائیگی۔ اور امید ہے کہ وہ رات کی گاڑی سے سوار ہو کر پرسوں یہاں پہنچ جائیں گے اور تمہیں اپنے ہمراہ واپس لے جائیں۔ نرگس کسی قدر مطمئن ہوگئی اور بستر پر لیٹ رہی اب اس کی نیند اڑ چکی تھی بہت ڈر رہی تھی اور باوجود ایک گونہ اطمینان کے اُسے ہنوز بڑی پریشانی تھی۔

۵

نوجوان دوست نے چھوٹے بابو سے کہا: "یار لڑکی تو بلا کی حسین ہے بلا کی۔ دیکھو بات سے نہ جانے پائے۔ کوئی ایسی صورت کرو کہ . . . . ."

بس وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ چھوٹے بابو چراغ پا ہوگیے۔ آگ بگولہ ہوگیے۔ اور اسے سخت لعن طعن کرنے لگے۔ نوجوان بھی بظاہر بہت نادم ہوا اور جھوٹ موٹ عذر معذرت کے حیلے بہانے کرنے لگا۔ مگر اس کی نیت خراب ہو چکی تھی اور وہ دل ہی دل میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔

صبح ہوگئی اور اتفاق سے صبح کے وقت پھر نرگس کی آنکھ لگ گئی اُسے نیند آگئی اور وہ بے خبر سو گئی۔ چھوٹے بابو ڈیوٹی پر جانے والے تھے۔ انھوں نے دوست کے ساتھ ناشتہ کیا۔ نرگس کے لیے ناشتہ الگ رکھ دیا۔ اور خود اسٹیشن چلے گیے۔ اپنے دوست کو تاکید کر گیے کہ خبردار اپنے دل میں کسی برے خیال کو جگہ نہ دینا۔ انھوں نے اسے سمجھا دیا کہ دوسروں کی بہو بیٹیوں کو خود اپنی ماں بہنیں سمجھنا چاہیئے۔ تاکہ دوسرے بھی ہماری ماں بہنوں کو اپنی بہو بیٹیاں سمجھیں الغرض چھوٹے بابو اپنے نوجوان دوست کو سب نشیب فراز سمجھا کر چلے گیے اور نوجوان اس کوارٹر میں اکیلا رہ گیا۔ نرگس ہنوز سو رہی تھی۔

چھوٹے بابو کے چلے جانے پر نوجوان کی نیت بگڑی اور خوب بگڑی۔ دل میں بلا کا فتور پیدا ہوا۔ وہ نرگس کی کوٹھری میں داخل ہوگیا۔ نرگس اٹھ بیٹھی۔ وہ آگے بڑھا۔ یہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے دروازہ کی اوپر والی کنڈی جو بہت اونچی تھی بند کر دی۔ دونوں ایک کوٹھری میں بند ہوگیے۔

نرگس حد سے زیادہ خوفزدہ ہوگئی تھی۔ وہ باہر بھاگ جانا چاہتی تھی مگر کوٹھری بند تھی۔ وہ اسے پکڑنا چاہتا تھا مگر یہ چیختی تھی چلاتی تھی اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر بھاگ رہی تھی۔ ایک چھوٹا سا خنجر میز پر کھلا پڑا تھا نرگس نے اٹھا کر زور سے نوجوان کے سر پر مارا اس نے ہاتھ سے سر کو بچا لیا۔ مگر اس کی کلائی خنجر کی نوک سے بری طرح زخمی ہوگئی۔ خون بہنے لگا۔ اس نے کلائی پر رومال باندھ لیا اور پھر نرگس کا پیچھا کیا۔ وہ دیوانہ ہو رہا تھا۔ پاگل ہوگیا تھا۔

نرگس کہاں تک اور کب تک مقابلہ کرتی۔ وہ بہت پھرتیلا بھی اور بڑا شہزور بھی۔ یہ بہت کمزور تھی۔ اور خوف سے کانپ رہی تھی تھک کے گر پڑی . . . . . . بے بس ہوگئی . . . . . . مجبور ہوگئی۔

۶

دوپہر کو چھوٹے بابو آئے۔ نرگس وہیں بستر پر پڑی رو رہی تھی۔ وہ کچھ بول نہیں سکتی تھی۔ چھوٹے بابو نے بتایا کہ تمہارے والد کا تار آگیا ہے اور وہ رات کی گاڑی سے پہنچیں گے۔ رات کی گاڑی سے اس کے والد آگیے اور وہ بیرا پور پہنچ گئی۔ دو دن برات کی تقریب میں شامل رہی۔ پھر وہاں سے وہ سب لوگ واپس گھر چلے گیے۔ وہ بھی اپنے گھر پہنچ گئی۔

اب نرگس بہت بدل گئی تھی۔ وہ پہلی سی نرگس نہ تھی۔ وہ اکثر تنہائی میں روتی ہوئی پائی جاتی۔ کسی کام میں اس کا جی نہیں لگتا تھا اسے کسی سے بات کرنا بھی بہت ناگوار ہوتا تھا۔ اس کی طبیعت چڑچڑی ہوگئی تھی۔ دیوانی ہوگئی تھی۔

تقریباً دو مہینے کے بعد اس کی ماں کو "کسی" بات کا احساس ہوا۔ اور وہ نرگس سے وقتاً فوقتاً کچھ سوالات کرنے لگی۔ نرگس نے اسٹیشن کے سارے واقعات بیان کر دیئے۔ ماں کے کلیجہ پر بجلی سی تڑپ گئی۔ اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔

باپ کو بھی اس کی خبر ہوگئی۔ ابھی رخصتی میں ایک مہینہ کی دیر تھی۔ طبیبوں کی طرف رجوع کیا گیا۔ ڈاکٹروں سے مشورہ لیا گیا طرح طرح کی کوششیں کی گئیں کہ کسی طرح اسقاط ہو جائے۔

اس قسم کے حمل کی خبریں چھپانے سے کب چھپ سکتی تھیں شدہ شدہ لوگوں میں چرچے ہونے لگے۔ پولس کو بھی اطلاع مل گئی کوتوالی کے تھانیدار نے آکر انور عالم سے کہا کہ اگر مرضیا اسقاط حمل کی

کوشش کی جائے گی تو سارے گھر کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائیگی اور نتیجہ برا ہوگا مزید کوشش روک دی گئی۔

رخصتی کا دن آگیا۔ برات کی تاریخ آگئی، قیامت کی گھڑی آپہنچی پولس کا تھانیدار رئیس پہاڑی پور حالی جاہ کا پرانا دوست تھا۔ اور پرانے دوستانہ تعلقات کی بنا پر وہ مجبور ہو گیا کہ ناجائز عمل کی داستان ان کے گوش گذار کر دے۔ اسقاط کی کوششوں کے قصے کہہ دے

بس پھر کیا تھا۔ براتیوں میں ایک آگ سی لگ گئی۔ کہرام مچ گیا برات والوں کا سامان بندھنے لگے۔ بیرنگ واپسی کی تیاریاں ہونے لگی۔ سب سے پہلے کنور کے والد اٹھ کر چلے گئے۔ سیدھے اسٹیشن جا پہنچے غصے سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ کنور عبدالوالی بھی آگ بگولہ ہو رہا تھا اس کا تپسر پچیر اپنے بڑے بوڑھوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھا۔ مغلظات اس کی زبان پر تھیں

۷

نرگس خاموش تھی۔ اس نے اتنی مدت میں پہلے سے خوب سوچ سمجھ لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور وہ جو کچھ سوچ چکی تھی وہی کر گذرنے والی تھی زہر ہلاہل کی شیشی اس نے کہیں سے حاصل کر لی تھی اور وہ اس کے پاس تھی۔ مگر وہ ایک دفعہ اپنے شوہر سے مل لینا چاہتی تھی۔ اسے ایک بار دیکھ لینا چاہتی تھی۔

اس نے اپنے شوہر کو ایک خط لکھا اور اپنی ایک خاص سہیلی کے ہاتھ سے اس کے پاس بھجوا دیا۔

کنور نے جلدی سے لفافہ چاک کیا اور ذیل کی عبارت پڑھی۔

میرے سرتاج۔ میرے مالک۔ میرے آقا۔ خوش رہو۔
میرا سلام قبول کرو کہ یہی میرا پہلا اور آخری سلام ہے
میری زندگی تو خیر خاک میں مل گئی اور کل طلوع آفتاب سے
پہلے میری لاش بھی خاک میں مل جائیگی۔ البتہ میری زندگی کی
صرف یہی ایک تمنا ہے کہ میں مرنے سے پہلے ایک بار تمہیں
دیکھ لوں اور بس۔ میں تمہیں (اپنے شوہر کو) ایک بار
دیکھ لینا چاہتی ہوں۔ یہی میری ایک تمنا ہے۔ امید کہ تم
میری یہ تمنا نہیں ٹھکراؤ گے۔ اگر میری تم سے صرف ایک بار
ایک منٹ کے لیے ملاقات ہو جائے تو پھر مجھے مرجانے میں
کوئی بھی تکلیف نہ ہوگی اور میں چین سے قبر میں نیند سوؤنگی
اور اگر میں تم سے ایک بار بھی مل نہ سکی تو پھر میں کیا کہوں
سوائے اس کے کہ یہی میری قسمت میں لکھا تھا اور قسمت
کا لکھا پورا ہو کر رہا۔

تمہاری گنہگار کنیز نرگس

کنور نے سوچا ملاقات میں کیا حرج ہے۔ ضرور ملنا چاہیے۔ اور اُسے تنبیہ بھی کرنا چاہیے۔ کہ تم جیسی بدکار لڑکیوں کی یہی سزا ہے جو تمہیں ملنے والی ہے۔ وہ اُسی سہیلی کے ساتھ اندر زنان خانہ میں چلا گیا اور خاص نرگس کے کمرہ میں جا کھڑا ہوا۔

نرگس نے اسے آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ دونوں سناٹے میں آگئے۔ یہ وہی نوجوان تھا جو چھوٹے بابو کے گھر نرگس کی کوٹھری میں جبراً گھس آیا تھا۔ نرگس نے کہا:۔

"کہئے آپ کی کلائی میں درد تو نہیں ہے۔ کس کم بختی نے آپ پر خنجر سے حملہ کیا تھا۔ اے ہے کس کم بختی نے آپ پر خنجر کی نوک سے حملہ کیا تھا۔ چھوٹے بابو کے کوارٹر میں۔ دولت پور کے اسٹیشن پر"

کنور کا بدن تھر تھرانے لگا۔ دنیا اس کی آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ اس نے جلدی سے آپ کو سنبھالا اور کہنے لگا

"نرگس! تم تو گنہگار نہیں ہو۔ گناہگار تو میں ہوں میری خطا معاف کر دو"

کنور نے کمرہ کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ دونوں پھر ایک کوٹھری میں بند ہو گئے۔ وہ وہیں پلنگ پر بیٹھ گیا۔ نرگس کے قریب۔ نرگس کے قدموں میں۔ نرگس اب اِدھر سے اُدھر نہیں بھاگتی تھی۔ وہ خاموش بیٹھی تھی۔

باہر سے کسی نے آواز دی "گاڑی کا وقت ہو گیا ہے۔ آئیے جلدی سے باہر آئیے" اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ کمرہ بند تھا۔

براتی چلے گئے۔ کنور نہیں گیا۔ وہ وہیں رہ گیا۔

دوسرے دن کنور نے کہا اب میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں رہوں گا۔ نرگس کے پاس نرگس کے ساتھ۔ نرگس میری ہے اور میں نرگس کا ہوں۔ اس رات سے کنور کی زندگی میں ایک اور انقلاب پیدا ہو گیا۔ وہ دنیا جہان کے تمام شریف زادوں میں سب سے زیادہ نیک اور سب سے زیادہ شریف سمجھا جانے لگا۔ وہ پھر بدل گیا۔

کہنے والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ نرگس نے اپنے خاوند پر جادو کر دیا ہے اور یقیناً یہ بات سچ بھی تھی۔ کنور سحر زدہ ہو چکا تھا اور نرگس کے اشاروں پر چلتا تھا۔

سید بدیع الزماں بدیع مدحق

فلمستان

معاشرتی تصویریں

ہندستان اور امریکہ کی بنی ہوئی معاشرتی تصاویر میں کس قدر نمایاں فرق ہے۔ اس کا اندازہ ذیل کے مضمون سے ہو سکتا ہے۔ جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ امریکن ماہرین کے نزدیک معاشرتی تصاویر کو فلمی صنعت میں کس قدر بلند درجہ حاصل ہے اور ان کی تیاری کے لیے کتنا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اسی مضمون کی روشنی میں "ہندوستان کی مایہ ناز فلم کمپنی" "کا جو رنگی" جس پر رسالہ جدید اردو اگست ۱۹۴۲ء کے شمارے میں تنقید شائع ہو چکی ہے۔ ملاحظہ کیجیے اور غور فرمائیے کہ اس طرح کے فلم سے ہندوستانیوں کو کونسا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔

معاشرتی تصویروں کے متعلق عام طور پر یہ خیال ہے کہ معاشرتی تصویریں بڑی آسانی اور سہولت کے ساتھ تیار ہو جاتی ہیں لیکن ایک امریکن ماہر معاشرتی تصاویر پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فلمی صنعت میں مشکل ترین چیز معاشرتی تصاویر کی تیاری ہے۔ کیونکہ معاشرتی تصویروں کے ایک ایک ٹکڑے کو انسانی فطرت کی کسوٹی پر کسا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صرف وہی ڈائرکٹر معاشرتی تصاویر بنا سکتے ہیں جو علم النفس کے ماہر ہوتے ہیں۔ یہ ہے معاشرتی تصاویر کے بارے میں امریکہ کے ماہرین فن کی رائے۔

امریکہ کی حالت تو یہ ہے کہ وہاں صرف علم النفس کے ماہرین ہی معاشرتی تصویریں بناتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کی کیفیت یہ ہے کہ یہاں ایک معمولی کیمرہ مین بھی چند روز کیمرہ گھمانے کے بعد معاشرتی تصاویر کا ماہر بن جاتا ہے اور موقع ملتے ہی فوراً ڈائرکٹر بن بیٹھتا ہے۔ خواہ اس کی ڈائرکٹ کردہ تصاویر انسانی فطرت کے خلاف بغاوت ہی کیوں نہ ثابت ہوں۔ چنانچہ ہندوستان کی فلمی صنعت میں ایک دو نہیں ایسی درجنوں مثالیں ہیں کہ وہ لوگ جن نہ مشاہدہ کی قوت ہے اور نہ علم النفس سے واقفیت ہے۔ بے تکلف الٹی سیدھی معاشرتی تصاویر بناتے رہتے ہیں

امریکہ میں ایک معاشرتی تصویر کا انتہائی کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کا افسانہ محض برائے نام ہو یعنی تصویر کو اول سے لیکر آخر تک معاشرتی ٹکڑوں سے ترتیب دیا جاتا ہے اور یہ معاشرتی ترتیب اس قدر موثر اور دلکش ثابت ہوتی ہے کہ جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم تصویر نہیں دیکھ رہے ہیں بلکہ زندگی کے حقیقی واقعات ہماری نظروں کے سامنے گذر رہے ہیں۔ اگرچہ امریکہ میں ایسی بھی معاشرتی تصاویر بنائی جاتی ہیں جن کا افسانہ بے حد موثر ہوتا ہے لیکن ان کو خالص معاشرتی تصاویر میں شمار نہیں کیا جاتا بلکہ ان کی افسانوی حیثیت کو زیادہ نمایاں خیال کیا جاتا ہے امریکہ میں اعلیٰ ترین معاشرتی تصویر صرف وہ ہے جس کو بغیر افسانے کے صرف معاشرتی ٹکڑوں سے کامیاب بنا دیا جائے

ہندوستان کی تیار کی ہوئی معاشرتی تصاویر امریکہ کی معاشرتی تصاویر سے بہت مختلف ہوتی ہیں۔ یہاں معاشرت کے ساتھ اور بھی بہت سی چیزیں ٹھونس دی جاتی ہیں۔ چنانچہ ہندستان میں کبھی ایک بھی معاشرتی تصویر ایسی تیار نہیں ہوئی جو گانوں سے بھری ہوئی نہ ہو۔ یہاں ہر فلم میں گانا بجانا لازمی ہے اور یہ محض اس لیے ہوتا ہے کہ تفریحی سامان کے بڑھنے کے بعد ڈائرکٹر کی کمزوریاں دب جائیں۔ ورنہ جہاں تک اصل حقیقت کا تعلق ہے معاشرتی تصویر وہ ہے جو نہ گانے کی محتاج ہو نہ کسی طویل افسانہ کی بلکہ معاشرتی زندگی کے ٹکڑوں سے اسے مرتب کر دیا گیا ہو۔

معاشرتی تصاویر کے امریکن معیار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ امریکہ کے ماہرین کے نقطۂ نظر سے معاشرتی تصاویر کی تیاری کتنا مشکل اور دشوار کام ہے۔ لیکن ہندوستان میں ابھی تک یہی سمجھا جا رہا ہے کہ معاشرتی تصاویر کی تیاری بڑا آسان کام ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ ہندوستان کو بھی اندازہ ہو جائیگا کہ صحیح معنوں میں معاشرتی تصاویر کی تیاری کوئی آسان کام نہیں ہے۔

(صداقت)

REG. No. C. 2535

JADIDURDU

جدید اردو

۱ - رسالہ ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوا کریگا۔ [illegible] کو چاہئے کہ اس ماہ کی

۱۵ تاریخ تک دفتر پر دوسرا طلب [illegible]

۲ - اہل قلم حضرات سے درخواست ہے کہ وہ مضامین مہینے کی ۱۵ تاریخ تک ایڈیٹر کے نام بھیج دیں

۳ - مضامین صاف اور شستہ تحریر ہوں۔

۴ - وہی مضمون پرچہ میں شایع ہو سکتا ہے جو معیار ادب و اخلاق سے گرا نہ ہو۔

۵ - دل آزار و فرقہ دارانہ مضامین نیز سیاسی مضامین شایع کرنا پرچہ کی پالیسی کے خلاف ہے۔

۶ - نمونہ کا پرچہ مفت نہیں بلکہ ۳/ کا ٹکٹ آنے پر بھیجا جائیگا۔

۷ - جواب کے لئے جوابی کارڈ یا اسٹامپ کا آنا ضروری ہے۔

۸ - خط وکتابت و ترسیل زر کا پتہ :- منیجر جدید اُردو ۳۶ مارسڈن اسٹریٹ کلکتہ

۹ - کاروباری حضرات اشتہار کے لئے منیجر سے خط وکتابت کریں

۱۰ - سالانہ چندہ صرف دو روپیہ (عگر) غیر ممالک کے لئے ۵ شلنگ

اے جلیل۔ منیجر جدید اردو نمبر ۳۶ مارسڈن اسٹریٹ کلکتہ

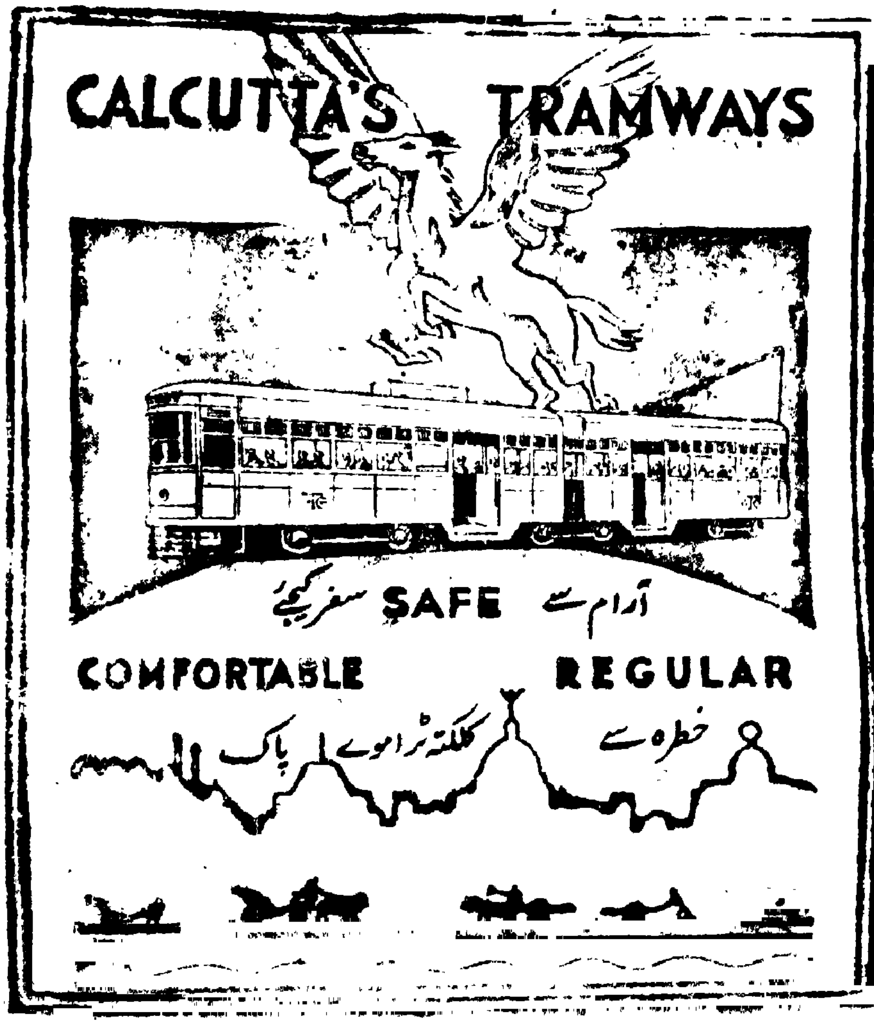
مشرقی ہندوستان کا علمی ادبی ماہنامہ

جدید اردو

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی

قیمت فی پرچہ ۴ر

سالانہ ع



CALCUTTA'S TRAMWAYS
آرام سے SAFE سفر کیجئے
COMFORTABLE
REGULAR
کلکتہ ٹراموے
خطرہ سے
پاک



حاجت عراس بہ آمد رسیدہ است ساز
من ز دعا با رسائی خویش اثر نداشتی

نکٹائی مارکہ زردہ

ہندوستان بھر میں اپنی خصوصیت کے اعتبار سے بے نظیر ہے۔ اعلیٰ درجے کے تباکو سے ماہرین کیمیا اور خود مالک کارخانہ کی نگرانی میں یہ زردہ تیار کیا جاتا ہے۔ جس محنت اور احتیاط سے یہ زردہ تیار کیا جاتا ہے ان کی صحت و کامیابی تجربہ سے ثابت ہو چکی ہے۔ یہ زردہ تمام اجزاء پاک ہے۔ جس صفائی اور ستھرائی سے یہ زردہ تیار کیا جاتا ہے اس کی بنا پر مالک کارخانہ کی طرف سے اس بات کی ضمانت پیش کی جاتی ہے۔ بوتلوں اور خوبصورت ڈبوں اور ٹنوں میں آپ کے لیے حاضر ہے۔

نکٹائی مارکہ زردہ

نکٹائی مارکہ کارخانے کی بے مثل و بے نظیر دیگر چیزوں کی طرح نکٹائی مارکہ مشکی قوام بھی اپنی آپ نظیر ہے۔ اس قوام میں بہترین اور مفید ترین اجزا کے علاوہ مشک خالص اور زعفران کا حصہ غالب ہے۔ گلاب اور کیوڑہ کے عرق میں اس کا قوام تیار کیا جاتا ہے۔ نہایت خوش ذائقہ اور خوشبودار، دل و دماغ کو فرحت بخشتا ہے۔ پان کھانے والوں کو خصوصیت سے فائدہ پہنچاتا ہے۔ نفاست پسند طبیعتوں کے لیے بہترین تحفہ ہے۔ یہ قوام دراصل ایک طرح کا ایک منجن ہے۔ ایک بار آزمائش کیجئے۔ اس کی تمام خوبیاں آپ پر روشن ہو جائیں گی۔ پھر یہ منجن ہمیشہ آپ کا ہمدم و دمساز بنا رہیگا اور لطف یہ کہ کم خرچ بالانشین۔ ولایتی شیشیوں میں جدید ترین مشینری کے ذریعہ بند کیا جاتا ہے۔ ممکن نہیں کہ خرابی آجائے۔ جن اجزا سے یہ قوام تیار کیا جاتا ہے وہ تمام پاک اور صاف چیزیں ہیں۔ اس لیے ہر مذہب و ملت کا آدمی نکٹائی مارکہ قوام بے تکلف استعمال کر سکتا ہے۔

کیسر بلاس

پان کی نہایت خوشبودار، خوشرنگ بے انتہا لذیذ بے حد مزیدار مسالہ ہے۔ ہمارے کارخانہ کی خاص ایجاد ہے جو علم سائنس کے ذریعہ اور ان کے اصولوں کو مدنظر رکھ کر تیار کیا جاتا ہے۔ کیسر بلاس معدہ کی تمام شکایتوں کو دور کرتا ہے۔ دل اور دماغ کو فرحت بخشتا ہے۔ آپ پان کھاتے ہوں تو کیسر بلاس ضرور استعمال کریں۔ اس لیے کہ بازار کا کوئی مسالہ ہمارے کیسر بلاس کی لذت اور خوشبودار ذائقہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسے نہایت عمدہ شیشیوں میں خوبصورت لیبل سے آراستہ کر کے اس طرح پیک کیا جاتا ہے کہ کوئی جز ہاتھ سے مس نہیں ہوتا۔ یہ وہ مسالہ ہے جس نے قلیل عرصہ میں دنیا کے تمام مسالوں میں ہلچل ڈال دیا ہے۔ ہندستان کے گوشہ گوشہ میں اس کی مانگ بجلی کی رفتار کی طرح بڑھتی جا رہی ہے۔ اس مسالہ میں اتنی خوبیاں ہیں جو بیان نہیں ہو سکتیں۔

محمد مصطفیٰ حسین مالک کارخانہ نکٹائی مارکہ زردہ نمبر ۱۴۱ ہوڑہ روڈ ہوڑہ کلکتہ

شاخیں

نمبر ۷۵ کلایو اسٹریٹ کلکتہ۔ نمبر ۱۱ آرسکن روڈ بمبئی۔ نمبر ۱/۷۵ کیننگ اسٹریٹ۔ کلکتہ

مدیر مسئول
پرویز شاہدی
مدیر اعزازی
ایم ظہور احسن قاضی

اسلامیہ جدید اردو

اکتوبر سنہ ۴۲ء

چندہ سالانہ دو روپیہ
ششماہی ایک روپیہ چار آنہ
فی پرچہ ۴؍

جلد ۵ | نمبر ۱۰

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر عبد الجلیل نے مطبع سندبر پریس ۱۱ چھپوا کر ۳۶ مارسڈن اسٹریٹ سے شائع کیا

شذرات

کانگریس کی ادارہ عملیہ نے ادھر سول نافرمانی کی دھمکی کے ساتھ فوری آزادی کا مطالبہ پیش کیا ہی تھا کہ حکومت برطانیہ کے کان کھڑے ہوئے اور گورے ارباب حل و عقد نے ہندستان کے سب سے بڑے سیاسی ادارے کے وطن پرست افراد کو گرفتار کر لیا۔ گاندھی جی نے وائسرائے بہادر سے ملنا چاہا لیکن باریابی نہیں ہوئی۔ گرفتاری کی خبر ملک کے گوشے گوشے میں آگ کی طرح پھیلی اس کے بعد جس انتشار و ابتری، فتنہ انگیزی، لوٹ مار کی مثالیں ظہور میں آئیں اور ہنوز آرہی ہیں اُن سے تاریخ کے اوراق ہمیشہ رنگین رہیں گے ریل کی لائنوں، ٹیلی فون کے تاروں، تھانوں، ڈاکخانوں، کچہریوں، سرکاری عمارتوں وغیرہ پر جارحانہ حملے ہونے لگے۔ حکومت کو چیلنج دے کر باغیوں کا گروہ جان لینے اور جان دینے پر تُل گیا۔ حکومت ہند نے جبر و تشدد سے اس بھڑکتی ہوئی آگ پر پانی ڈالنا شروع کیا، شعلوں کا رقص سرکشی کسی حد تک تھم گیا، لیکن اب تک مکمل طور پر بجھائی نہ جا سکی اور نہ اس کی کوئی ظاہری امید معلوم ہوتی ہے۔ راکھ کے ڈھیر میں چنگاریاں سو گئی ہیں ہوائے تازہ کی ایک ٹھوکر میں جاگ جائیں گی۔

کوئی وطن پرست اور ذی شعور ہندوستانی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ ایسے وقت میں جبکہ جاپانی بھیڑیے، ہمارے ملک ہمارے وطن، ہماری تہذیب، ہماری معاشرت، اور ہمارے اقتصادی و سیاسی نظام کو نگل جانے کے لیے منہ کھولے ہوئے ہیں۔ خدمت قوم کے پردے میں ان دہشت انگیزوں اور فتنہ فروشوں کا یہ جاہلانہ اقدام تحریک آزادی کو بھی اس قوم زرد کے درندوں کا لقمہ بنا رہا ہے۔ کوئی حکومت ملکی ہو یا غیر ملکی ایسے برے اور خطرناک وقت میں اس تحریک بغاوت کے سلسلے میں چشم پوشی سے کام نہیں لے سکتی اس جنگ عظیم کے نتیجہ پر اتحادیوں کی زندگی اور موت کا انحصار ہے۔ اس لیے ہر وہ تحریک جو دشمنوں کو مدد پہنچائے یا اُن کی ہمت بڑھائے اسی قابل ہے کہ فوراً کچل دی جائے۔ اس آتش بغاوت کے بجھانے کے سلسلے میں حکومت ہند کے افعال کافی حد تک سیاسی جواز رکھتے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں پولس اور حکام نے کچھ زیادتیوں سے بھی کام لیا ہے۔ مرکزی اسمبلی میں تحقیقات کی درخواست بھی کی گئی لیکن کوئی تشفی بخش نتیجہ نہ نکلا۔

اب یہ کہنا بیکار ہے کہ حکومت برطانیہ اور حکومت ہند نے لیڈروں کو گرفتار کرنے میں تنگ نظری اور کوتاہ بینی سے کام لیا۔ یہ کہنا بھی تحصیل حاصل ہے کہ گرفتار گاندھی جی آزاد گاندھی جی سے کہیں زیادہ خطرناک ہیں۔ ماہرین سیاست کو یہ بھی معلوم تھا اور ہے کہ اگر مہاتما گاندھی گرفتار نہ کیے جاتے تو کم سے کم اپنے عقیدہ عدم تشدد کی وجہ سے وہ اس قسم کی بغاوت کو پسند نہ کرتے۔ اُن کو اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے پر مجبور ہونا پڑتا۔ یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس وقت عوام کی حرکات کو ضبط و نگہداشت میں رکھنے والا کوئی نہیں۔ یہ بات حکومت بھی جانتی ہے کہ بندوق کی گولیوں سے ہمدردی مول نہیں لی جاتی۔ یہ بھی ایک روشن حقیقت ہے کہ اگر حکومت پہلے ہی سے دور اندیشی اور عاقبت بینی سے کام لیتی، مولانا آزاد و پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ جیسے محبوبان ملک و قوم کو گرفتار نہ کرتی، تو یہ انسانیت سوز واقعات ظہور میں نہ آتے اور سلطنت کو اس اقدام جبر و تشدد پر مجبور نہ ہونا پڑتا۔

خیر جو ہوا سو ہوا۔ ابھی تک پانی سر سے اونچا نہیں ہوا ہے۔ دھارے کی تیزی اب بھی روکی جا سکتی ہے۔ ہندوستان کے سیاسی اداروں کا باہمی اختلاف بھی ان دنوں اس حد تک مایوس کن نہیں ہے جس حد تک پہلے تھا۔ سیاسی نظریے جو بھی ہوں مقاصد جیسے بھی ہوں، طریقہ عمل کی نوعیت جس طرح کی بھی ہو، اس وقت یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ہر سیاسی ادارہ حفاظت ملک کے لیے اختیارات کا متفقہ مطالبہ پیش کر رہا ہے۔ بڑھتے ہوئے خطروں کے سیلاب کا رخ دیکھ کر اتحادیوں کے دوش بدوش ہو جانے اور اتحاد کا محاذ بنانے کیلئے بیتاب ہے مسلم لیگ، کانگریس، ہندو مہاسبھا اور دوسرے سیاسی اداروں کی تجویزوں کو غور کر کے دیکھیے وہی اختیارات کے مطالبے کی صہبائے تند کا دریا لہریں مارتا دکھائی دیگا۔ یہ اور بات ہے کہ چرچل اور ایمری جیسے سامراجی متوالے اس کو گدلا پانی سمجھتے رہیں۔ کاش عمائدین حکومت اب بھی دور اندیشی سے کام لیں۔

پرویز شاہدی

ارشادِ وحشت

پھر موجِ بہار آئی طراوت کو چمن کی　　پھر بات بنی لالہ و نسرین و سمن کی

راحت کا تصور ہی تو ہے رنج کا باعث　　غربت میں ستاتی ہے مجھے یادِ وطن کی

صیاد نے لا پھینکا جو اک پھول قفس میں　　آنکھوں میں مری پھر گئی تصویر چمن کی

مشہور کیا ماہ نے ذکر اُس کی جبیں کا　　غنچے نے کہی سب سے حدیث اُس کے دہن کی

ناگفتہ نہ رہ جائے کہیں دل کا فسانہ　　کہنا ہے سخن اور نہیں تاب سخن کی

فرقت زدہ دل اور ترے وصل کا مژدہ　　یہ کوئی نئی چال نہ ہو چرخِ کہن کی

مخلوط ہے غم میں اثرِ عیشِ گزشتہ　　ہے شامِ غریبی میں جھلک صبحِ وطن کی

تم جور کیے جاؤ، نہیں کوئی حقیقت　　اک سوختہ دل سوختہ جاں سوختہ تن کی

ہے رہگزرِ شوق پہ دیوانوں کا جلسہ　　بیٹھے ہیں سب امید پہ اک عہد شکن کی

ہم فن جسے سمجھے ہیں کوئی فن نہیں وحشت
مشکل ہے کہ اب قدر ہو کچھ فنِ سخن کی

رضا علی وحشت

رفتار وقت

ستمبر ۱۹۴۲ء کے پہلے ہفتہ سے جنگ کا چوتھا سال شروع ہوگیا، کیونکہ برطانیا کا اعلان جنگ ۳-ستمبر ۱۹۳۹ء کو ہوا تھا۔ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ تباہ کن لڑائی کے تین سال گذر چلے اور اب چوتھا سال بھی شروع ہوگیا ہے، یہ لڑائی اتنے وسیع پیمانہ پر لڑی جا رہی ہے کہ دنیا کا کوئی خطہ بھی اس لڑائی سے باہر نظر نہیں آرہا ہے۔ نہ اس کی انتہا معلوم ہوتی ہے اور نہ اس کے متعلق کوئی پیشینگوئی ہی قابل وثوق ثابت ہوسکتی ہے۔ سمندر، خشکی، ہوا۔ الغرض کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں تباہی اور بربادی کے ساتھ لڑائی نہ ہورہی ہو۔

روس و جرمن:۔ لندن ۵-جولائی ۱۹۴۲ء جنوبی مغربی (خارکوف) محاذ پر پھر زبردست لڑائی شروع ہوگئی۔ ۱۴-جولائی تک جرمنی فوجیں علاقہ ورونیز میں گھس پڑیں اور ۱۸-جولائی کو دریائے ڈون کو بھی عبور کرگئیں۔

۲۳ جولائی۔ ماسکو کی اطلاع کے مطابق روس اور جرمنی کے درمیان کوہ قاف کی جنگ نہایت جوش و خروش کے ساتھ شروع ہوگئی ہے۔ ۲۴-جولائی کی خبروں سے معلوم ہوا کہ روستوف (Rostov) خطرے میں گھر گیا ہے اور ۲۶ جولائی کو جرمنی فوجی دستے نوزچ شہر میں داخل ہوگئے، ۲۸-جولائی کی خبر ہے کہ اسٹالین گراڈ بھی خطرے میں گھر گیا ہے اور اسی تاریخ کو جرمنی فوجوں نے اور بھی کئی مقام سے دریائے ڈون کو عبور کرلیا۔ مگر روسی فوجوں نے بھی ایک ایک انچ زمین کے لیے جان توڑ مقابلے کیے۔ اور جرمنی فوجوں کو بے انتہا نقصان جان پہنچا کر پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا۔ یہاں پر روسی فوجوں نے آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے کا کچھ بھی خیال نہیں کیا، بلکہ صرف ایک ہی چیز ان کے پیش نظر تھی کہ جس قدر جرمنی فوجوں کو ہلاک کرسکیں کر ڈالیں۔

۲۹-جولائی کو جرمن خبروں سے پتہ چلا کہ اس وقت وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گیے ہیں جو کہ روستوف سے ۱۵۰ میل پورب کو ہے۔ روسیوں کا بیان ہے کہ جرمن فوجیں روستوف سے ۵۰ میل کے فاصلے پر لڑ رہی ہیں اور روستوف سے ۱۲۰ میل اتر پورب میں اسمالنکایا کے مورچہ پر جرمنوں نے دریائے ڈون کو موڑ کے قریب کئی جگہ سے پار کرلیا ہے اور انھوں نے جو مورچے وہاں قائم کیے تھے وہ دور تک پھیل گیے ہیں اور اس وقت وہ اسٹالن گراڈ ریلوے کی طرف بڑھ رہے ہیں جہاں سے اسٹالن گراڈ صرف ۴۰ میل کے فاصلے پر ہے۔

۷-اگست کی رات کو شمالی کوہ قاف میں روسیوں کی حالت پہلے سے زیادہ خطرناک ہوگئی۔ ان کو مزید مقامات سے پیچھے ہٹنا پڑا اور صرف دریائے لاول ایک قدرتی رکاوٹ باقی رہ گیا تھا لیکن یہ دریا بھی بہت چھوٹا تھا اس لیے یہاں پر زیادہ دنوں تک مدافعت نہیں ہوسکی۔ ۹-اگست تک جرمنی فوجوں نے سالنک سے آرماویر تک ایک سو میل کا فاصلہ چھ دنوں میں طے کرلیا۔

۱۵-اگست تک روسیوں نے شمالی کاکیشیا کا ایک اہم شہر اور ریلوے جنکشن کراسنوڈور خالی کردیا۔ اسی تاریخ کو جرمن فوجوں نے دریائے کوبان کو بھی عبور کرلیا اور گروزنی کے تیل کے چشموں کو بھی خطرہ ہوگیا۔ ۲۳-اگست تک لینن گراڈ کے مورچہ کی شدید جنگ اہمیت اختیار کرنے لگی۔ اسی طرف اسٹالن گراڈ کا محاصرہ اور بھی خطرناک ہوگیا

۲۷-اگست اسٹالن گراڈ کو خطرہ اور زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اس شہر سے کل پچیس میل کے فاصلے پر گھمسان کی جنگ ہورہی ہے اور روسی فوجیں محاصرے کے مقابلے کی تیاریاں کررہی ہیں۔

۱۱-ستمبر۔ روسی مورچہ کی اطلاع ہے بدستور یعنی اسٹالن گراڈ کے لیے خطرہ اور زیادہ بڑھ گیا ہے اور روس مغربی اور جنوب مغربی مورچہ پر پسپا ہونے پر مجبور ہوگیے ہیں۔ اور اب اسٹالن گراڈ ہر طرف سے جرمن فوجوں کے حصار میں آگیا ہے۔ تمام راستے مسدود ہوگیے ہیں روسی حکومت نے اپنی فوجوں کو مقابلہ پر ڈٹے رہنے کا حکم دیدیا ہے۔

قفقاز کے محاذوں کے سلسلہ میں روسیوں نے نوو روسسک پر جرمن قبضہ تسلیم کرلیا ہے۔ اس وقت روسیوں کے لیے بحر اسود میں "توآپسی" اور "باطوم" یہی دونوں اہم بندرگاہ رہ گئے ہیں۔ لیکن توآپسی میں جنگی بیڑا نہیں رکھا جا سکتا ہے اور باطوم ایک غیر محفوظ مقام ہے اس لیے اس وقت روس کے سامنے بحری بیڑہ رکھنے کا اہم سوال ہے

ہندوستان: ۱۴ جولائی کی تحریک کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے اجلاس میں حکومت برطانیہ سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ فی الفور ہندوستان کی عنان حکومت ہندوستانیوں کے حوالے کردے ورنہ یہاں ایک نہایت وسیع پیمانہ پر مخالفانہ اجتماعی تحریک شروع کردی جائیگی۔

بمبئی ۷ اگست صبح کے وقت آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس تقریباً تین گھنٹہ تک جاری رہا تھا جس میں روزمرہ کے معاملات پر بحث کی گئی۔ دوسرے دن کانگریس ورکنگ کمیٹی کی جانب سے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں جو ریزولیوشن پاس ہوا تھا اس میں کانگریس کی آئندہ تحریک کا پس منظر پیش کرنے کے بعد یہ واضح کیا گیا تھا کہ آزاد ہندوستان ہی جنگ میں موثر امداد کرسکتا ہے اور اس کی امداد فیصلہ کن ثابت ہوگی، نیز اعلان آزادی کے بعد کی حکومت کا خاکہ پیش کیا گیا ہے اور جس میں برطانیہ اور اتحادی قوموں سے آخری اپیل کی گئی کہ اگر یہ اپیل موثر ثابت نہ ہوئی تو وسیع پیمانہ پر قومی جدوجہد شروع ہوگی جس کی باگ ڈور مہاتما گاندھی کے ہاتھ میں دیدی گئی ہے

اس ریزولیوشن کا خلاصہ یہ ہے کہ برطانیہ ہندوستان میں اپنی حکومت اور اختیارات سے دست کش ہوکر ملک کی آزادی کا مطالبہ پورا کردے تاکہ آزاد ہندوستان پوری قوت اور جوش کے ساتھ اپنی حفاظت کا انتظام خود کرسکے اور ہندوستان میں ایسی قومی حکومت کی جائے جس میں ملک کی تمام پارٹیاں شامل ہوں، اور وہ تمام پارٹیوں رضامندی سے کانسٹیٹیوٹ اسمبلی کے ذریعہ ہندوستان کا نیا آئین حکومت تجویز کرے جس کی صورت ایسے فیڈریشن کی ہو جس میں تمام شامل ہونیوالے صوبے خود مختار ہوں اور مرکزی حکومت اور صوبوں کے اختیارات کے علٰحدہ علٰحدہ طے ہوجانے کے بعد بقیہ اختیارات جو کچھ بھی ہوں مرکزی حکومت کے بجائے خود مختار صوبوں کے اختیار میں ہوں

۹ اگست کی صبح ۵ بجے بمبئی میں مولانا ابوالکلام آزاد، مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، سردار پٹیل اور دوسرے کانگریس کے لیڈران اور تقریباً دو سو ممبر گرفتار کرلیے گئے۔ اور تمام کانگریس کمیٹیاں غیر قانونی قرار دیدی گئیں اس کے بعد مختلف صوبوں میں کانگریسی عہدیدار گرفتار ہونے لگے، جس کی وجہ کر تمام ہندوستان میں پہلے تو غم و غصہ کی اظہار میں جلوس وغیرہ کی صورت میں کیے گئے اس کے بعد جب پولس نے روک تھام شروع کرنا چاہی تو بلوہ اور فساد کی نوبت آگئی، اور سب سے پہلے بمبئی، پونا، اور احمدآباد میں شدید ہنگامہ اور فساد ہوا۔ اس کے بعد یہ ہنگامہ اتنا بڑھا کہ سارے ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل گیا۔ بڑے چھوٹے شہروں کے علاوہ، گاؤں اور دیہات بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکے اور شاید ہی کوئی ایسی جگہ بچی ہو جہاں پولس کو فائرنگ کرنے کی ضرورت نہ پڑی ہو۔ بعض جگہ تو ایسا ہوا کہ فوجی امداد کی ضرورت لاحق ہوگئی۔ کئی موقعہ پر تو ہوائی جہاز کے ذریعہ مشین گن چلانیکی ضرورت پڑی۔

۱۲ ستمبر سے سب سے زیادہ شدید ہنگامہ کا زور، صوبہ بہار، یوپی، مدراس اور بمبئی میں ہوا۔ جہاں ہر چہار طرف بلوائیوں نے ریلوے لائن ٹیلیفون کے کھمبے اکھاڑ کر پھینک دیا۔ اور اکثر چھوٹے چھوٹے پل بھی نقصان پہنچایا یا توڑدیا۔ اور اکثر اسٹیشن اور مال گودام میں آگ لگاکر برباد کردیا۔ بہت سارے گاؤں، دیہات اور شہر کے سب پوسٹ آفس، پولس اسٹیشن، عدالت اور سرکاری عمارتوں کو بھی آگ لگاکر جلا ڈالا، یا برباد کردیا۔ ۲۰ اگست سے گورنمنٹ کچھ صورت حال پر قابو پالیا ہے اور تادیبی کارروائیاں کرنی شروع کردی ہیں۔ ۲۵ اگست سے کچھ سلسلہ رسل و رسائل بھی جاری ہوگیا لیکن ستمبر کے آخر تاریخ تک اخباروں میں کہیں نہ کہیں سے ہنگاموں کی خبریں آتی رہتی ہیں۔

وائی۔کے۔طارق مرحوم: ہمیں یہ معلوم کرکے بیحد صدمہ ہوا کہ کلکتہ کا یہ نوجوان ادیب ۲۲ ستمبر کو ایک طویل علالت کے بعد رہگرائے عالم جاودانی ہوگیا — انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔ مرحوم بہت ملنسار اور خوش طبع نوجوان تھے اور ادب کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ ابتدائی توجہ قلمی طرف منعطف کررکھی تھی اس سے ان کا ادبیانہ صلاحیتیں مکمل طور پر آشکارا نہیں ہوسکیں۔ طارق مرحوم کو کلکتہ کی اردو صحافت سے بہت قریبی تعلق تھا۔ چنانچہ "پیاری" سے قبل "مرحوم گزشتہ" کی ادارت کے فرائض انہیں کے سپرد تھے

ہم انکے پسماندگان سے ہمدردی ہے اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین

عبدالجلیل

رندوں کی مناجات

میخانہ کے دروازہ پر اک رند خرابات
پھیلائے ہوئے ہات پہ کرتا تھا مناجات

کہتا تھا کہ اے کوثر و تسنیم کے مالک
سچ ہے کہ ملوث ہے معاصی سے مری ذات

مانا نہیں وہ رند تری بزم کے قابل
جس کے سحر و شام بسر ہوں بخرافات

لیکن یہ سنا ہے کہ ترے در سے خداوند
پھرتا نہیں سائل کوئی محروم عنایات

ہوگی نہ کمی کچھ بھی ترے بحر عطا میں
سن لے جو ہماری بھی تو اے سامع دعوات

کیا ہے کہ تری بزم میں پاتے نہیں ہم راہ
کیوں وقف رقیبوں ہی پر ہیں تیری مدارات

کیوں بادہ گلرنگ کے پیمانہ گلگوں
ملتے نہیں اب ہات سے تیرے ہیں ہیہات

آئیگی وہ کیا جوش میں ساقی تری رحمت
جائیگی نہ کیا سرسے ہمارے یہ سیہ رات

گھیرے ہیں ہمیں ہند میں دنیا کی بلائیں
امداد کر امداد کر اے دافع آفات

بے فیض نہ رہ جائیں تری مے کے پجاری
خالی نہ پھریں تیرے گدا کے جو اٹھیں ہات

دے ہم کو بھی ساقی مے باقی مے باقی
سن لے مرے مولا ترے قربان یہ مناجات

محمد اسحاق امرتسری

غزل

آب اس کی آب کوثر سے لذیذ
قند ہے لب اس کے خنجر سے لذیذ

ذکر تسنیم اور کو تا صبح سنا
اس کے لب ہیں جام کوثر سے لذیذ

کڑوی باتیں قند سے میٹھی لگیں
وہ لب شیریں ہیں شکر سے لذیذ

دشت وحشت میں اسی کا لطف ہے
کچھ نہیں ہے اس میں پتھر سے لذیذ

رات دن کھاتا ہوں جی بھرتا نہیں
کچھ نہیں غمہائے دلبر سے لذیذ

ملک کی ہر چیز اچھی ہے سلیم
اس کے فاقے بھی مزعفر سے لذیذ

سلیم فہمی

قرۃ العین

یہ مضمون ڈاکٹر محمد اسحاق بی ایس سی۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ ڈی لندن کے ایک تحقیقاتی مقالہ کا ترجمہ ہے۔

ناصرالدین شاہ کے اوائل عہد میں ایران میں ایک نیا فرقہ ظہور پذیر ہوا جس کا نام فرقہ بابیہ ہے۔ اس نئے فرقہ کے ماننے والے رفتہ رفتہ بڑھتے گئے جب شاہ پر حملہ ہوا تو چند بابیوں پر شبہ ہوا اور اس کے بعد بابیوں پر حکومت کی طرف سے طرح طرح کے ظلم ڈھائے گئے جن کا کما حقہ بیان نہیں ہو سکتا لیکن بابیوں نے اس ہمت اور استقلال سے ان مظالم کو برداشت کیا کہ آخر کار لوگ اس سے متاثر ہوئے اور ان کے ہمدرد بن گئے۔ قرۃ العین بھی ان مصائب میں ان کی شریک تھی۔ اس مضمون میں اس کی زندگی اور ان اشعار سے بحث کی گئی ہے جن کو عام طور سے اس سے منسوب کیا جاتا ہے

قرۃ العین کا اصل نام ام سلمیٰ ہے۔[1] وہ ایک مشہور عالم حکیم قزوین حاجی ملا صالح کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اس کی پیدائش سنہ ۱۲۳۰ یا ۱۲۳۱ھ مطابق ۱۸۱۴ یا ۱۸۱۵ء میں ہوئی۔ اپنے چچا کے لڑکے ملا محمد[2] سے بیاہی گئی جس سے تین اولاد ہوئی دو لڑکے اور ایک لڑکی۔

یہ ایک تعلیم یافتہ خاتون تھی۔ عربی، حدیث وتفسیر میں ماہر تھی۔ خدا نے بڑی فصاحت و بلاغت عطا فرمائی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بے نقاب ہو کر مجمع عام میں مذہبی موضوعات پر عالمانہ تقریریں کیا کرتی تھی۔ مشہور مستشرق مسٹر براؤن نے جب صبح ازل سے دریافت کیا کہ کیا سچ مچ قرۃ العین نے نقاب چھوڑ دی تھی۔ جواب ملا "یہ غلط ہے کہ اس نے نقاب اتار دی تھی۔ کبھی کبھی دوران تقریر میں جوش آ جاتا تو چہرے سے نقاب سرک جایا کرتی تھی لیکن جلد ہی وہ پھر درست کر لیا کرتی تھی"[3]

یہ اوائل میں وہ باب کے روحانی رہنما سید کاظم علی[4] رشتی کے عقائد پر ایمان رکھتی تھی۔ وہ سید سے سلسلہ مراسلت رکھتی تھی اور اس کے اصول کی باریکیوں پر اظہار خیالات کرتی تھی۔ سید اس کی قابلیت کا معترف ہو گیا اور اپنے خطوط میں اسے قرۃ العین (آنکھوں کی ٹھنڈک) لکھتا اور اسی نام سے وہ زیادہ مشہور ہے۔ سید کاظم علی رشتی کے انتقال کے بعد وہ مرزا علی محمد[5] باب کے اصولوں پر ایمان لائی اور اپنی فصیح و بلیغ تقریروں سے بہتوں کو اس سلسلہ میں داخل کیا۔

سید کاظم علی رشتی ہی کی زندگی میں کربلا گئی۔ وہ وہاں نہ صرف سید سے ملی بلکہ اس کے سربرآوردہ معتقدوں سے بھی ملاقات ہو گئی۔ جن میں ملا حسین بوشہروی (باب کا داعی اول) بھی تھا۔ سید کاظم کے انتقال کے بعد جب ملا حسین شیراز چلا گیا تو اس نے اس سے التجا کی کہ اگر وہ کوئی روحانی رہنما پانے میں کامیاب ہو تو اسے بھی اطلاع دے۔ بابی عقاید پر ایمان لانے کے بعد ملا حسین نے قرۃ العین کا وہ خط باب کو دکھلایا۔ باب اس کی قابلیتوں کا معترف ہوا اور اپنے اٹھارہ خطوط زندہ (حروف حی)[6] میں شامل کر لیا۔ جو بابی ریاست کا گروہ اولیٰ ہے۔

(۱) محمود آفندی آلوسی کے بیان کے مطابق اس کا اصل نام ہند تھا اور ام سلمیٰ کینت تھی (دیکھو کوکب دریہ صفحہ ۶۳ ـ ۶۴ مصنفہ ابوالحسین آوارہ) وہ زرین تاج کے نام سے بھی مشہور

(۲) مندرجہ ذیل شجرہ سے اس کے خاندانی تعلقات کی وضاحت ہوتی ہے

محمد البرغانی القزوینی

حاجی ملا محمد تقی — حاجی ملا محمد صالح — حاجی شیخ جواد — حاجی ملا علی

ملا محمد (حاجی ملا محمد تقی کا بیٹا) — قرۃ العین (حاجی ملا محمد صالح کی بیٹی)

(۳) سفرنامہ براؤن صفحہ ۳۱۴

(۴) از ۱۲۰۵ھ ۱۷۹۰ء تا ۱۲۵۹ یا ۱۲۶۱ھ ۱۸۴۳ یا ۱۸۴۵ء

(۵) ۱۸۱۹ء میں شیراز میں پیدا ہوا۔ ۲۳ مئی ۱۸۴۴ء میں باب ہونے کا اعلان کیا۔ جولائی ۱۸۵۰ء میں تبریز میں مارا گیا۔

(۶) باب کے پہلے منتخب اٹھارہ معتقد۔ باب نے انہیں اٹھارہ زندہ خطوط اور اپنے کو نقطہ لکھا ہے۔ ان منتخب معتقدوں کو خاص کر تعلیم دی جاتی تھی کہ وہ لوگوں کو تیار کریں اور خود بھی تیار رہیں تاکہ وہ آنیوالی مقدس ہستی کا استقبال مناسب طریقہ سے کریں۔

کچھ دنوں تک قرۃ العین کربلا میں رہی اور پردے سے سید کاظم علی رشتی کے پیروؤں کو مذہبی اصول کی تعلیم دیتی رہی۔ وہاں کے گورنر نے اسے گرفتار کرنا چاہا تو وہ کربلا سے بغداد میں آئی اور مفتی اعظم کے روبرو اپنے مقدمہ کی نہایت عمدہ طریقہ سے پیروی کی۔ اب یہ مسئلہ کہ آیا اسے تبلیغ کی اجازت دی جائے یا نہ دی جائے، پہلے پاشائے بغداد اس کے بعد ترکی کے مرکزی حکومت کے روبرو پیش ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسے ترکی سلطنت سے باہر نکل جانا پڑا۔ بغداد سے کرمان شاہ اور ہمدان کو واپس ہوتے ہوئے اس نے تبلیغی کام جاری رکھا اور بہت سے لوگوں کو اپنے اصول کا معتقد بنایا۔ چند بابیوں کو ایک عورت کا عوام کے سامنے آکر تبلیغ کرنا ناگوار ہوا۔ اور انھوں نے باب کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ باب نے نہ صرف اسے تبلیغ کی اجازت دی بلکہ جناب طاہرہ کا خطاب بھی عطا کیا۔ اس خطاب نے بابی مذہب میں قرۃ العین کی حیثیت اور بھی بلند کردی۔

قرۃ العین چاہتی تھی کہ وہ ہمدان سے طہران جائے اور جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے اسے امید تھی کہ وہ خود محمد شاہ کو اپنی اس نئے مذہب کا پیرو بنانے میں کامیاب ہوگی۔ اس کے باپ کو اس کی خبر ہوئی۔ اس نے اپنے ملازموں کو بھیج کر اسے قزوین بلالیا۔ اگرچہ اس کی شادی کی تاریخ ٹھیک معلوم نہیں لیکن قیاس کیا جاتا ہے کہ قزوین آنے کے بعد اس کی شادی اس کے چچازاد بھائی سے کردی گئی۔ یہ شادی بالکل ناکام ثابت ہوئی۔ اس لیے کہ اس کے شوہر کو اپنے باپ کی طرح شیخیوں اور بابیوں سے سخت نفرت تھی۔ آخرکار قرۃ العین نے اس کے ساتھ زندگی بسر کرنے سے انکار کردیا۔ اسی لیے جب اس کا چچا اور خسر بابیوں کے ہاتھ سے قتل ہوا تو وہ بھی ملزم ٹھہرائی گئی۔ اور لوگوں کا خیال ہوا کہ یہ قتل اس کے اشارے سے ہوا۔ اس کے شوہر نے بھی حاکم قزوین کے سامنے اظہار دیا کہ اس کے باپ کا قتل قرۃ العین کے اشارے سے ہوا ہے۔ لیکن آخرکار قرۃ العین بری ہوگئی۔

اگرچہ وہ اس الزام سے بری ہوگئی لیکن اب اس کا قزوین میں رہنا ناممکن ہوگیا۔ اس لیے وہ طہران ہوتی ہوئی خراسان کو روانہ ہوگئی۔ یہ بدشت میں بابی داعیوں کے جلسہ میں حاضر تھی۔ وہاں سے ملا محمد علی بارفروشی اور اس کی جماعت کے ساتھ مازندران کو روانہ ہوئی۔ اس کے بعد کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ملا محمد علی اور اس کی جماعت کا ساتھ چھوٹنے کے بعد قرۃ العین پر کیا گذری۔ یہانتک کہ وہ گرفتار کرکے طہران لائی گئی۔

۱۸۵۲ء میں ایک دن نصیر الدین شاہ گھوڑے پر سوار طہران میں جا رہا تھا کہ چار بابی بابیوں نے اس پر گولی چلائی۔ ایک نے اسی وقت اپنے کو ہلاک کرلیا۔ دوسرا کوئیں میں کود پڑا اور باقی دو کو بادشاہ کے ملازموں نے گرفتار کرلیا۔ تفتیش شروع ہوئی اور بابیوں کی سازش کا انکشاف ہوا۔ قرۃ العین کو قید کرکے طہران لائے اور محمود خاں کلانتر کے باغ والی عمارت میں جس میں سیڑھیاں نہ تھیں حراست میں رکھی گئی۔ اس سازش میں اس کے شریک ہونے کا ثبوت نہیں ملتا اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیوں گرفتار کی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ محمود خاں کے بیٹے کی شادی کی تقریب پر قرۃ العین کو اس کے گھر لائے جہاں بہت سی معزز بیگمات جمع تھیں۔ اس کی تقریر کا لوگوں پر بڑا اثر ہوا۔ لیکن کسی کو اس کی موافقت میں کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ بادشاہ نے اسے خط لکھا کہ اگر وہ بابیت چھوڑ دے تو وہ اسے اپنے حرم میں داخل کرلیگا۔ اس کے جواب میں اس نے اس خط کی پشت پر یہ شعر لکھ کر بھیج دیا۔

تو و ملک و جاہ سکندری، من و رسم و راہ قلندری
اگر آں خوش است در خوری دگر ایں بد است مرا سزا۔

تو ہے اور سکندر کی شان شوکت ۔ میں ہوں اور راہ رسم قلندری
اگر وہ بہتر ہے تو تو اس کا سزاوار ہے اور اگر یہ بری ہے تو میں اسکی مستحق ہوں

محافظ قید خانہ اس کی فصاحت و بلاغت سے بہت زیادہ متاثر تھا اس نے بھی التجا کی کہ باب کا مذہب ترک کردے تاکہ اسے قید سے نجات ملے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ آخرکار حکومت کے حکم سے بڑی اذیت سے ماری گئی۔[1] اس کے صبر و استقلال نے ڈاکٹر پولک پر بڑا اثر کیا جو اسکی موت کے وقت وہاں تھا۔[2]

اگرچہ قرۃ العین شاعرہ کی حیثیت سے بھی مشہور ہے لیکن جو غزلیں اس کے نام سے مشہور ہیں مشکوک ہیں۔[3] مندرجہ ذیل غزل جو بحر کامل میں ہے اس کے نام سے منسوب ہے

(۱) قرۃ العین کی موت کے بارے میں مختلف روایتیں مشہور ہیں اور یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ان میں کونسی درست ہے۔ گوبینو کہتا ہے کہ جب جلاد قتل کردیا تو وہ جلادی گئی۔ ایک روایت ہے وہ محل کے باغ نگارستان کے ایک اندھے کنوئیں میں ڈالدی گئی اور وہ کنواں پتھروں سے پاٹ دیا گیا۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ اس کی موت بڑی تکلیف سے واقع ہوئی۔ یہ واقعہ ۱۷ اگست ۱۸۵۲ء کا ہے۔

(۲) پولک (پرشین حصہ اول صفحہ ۳۴۳)

(۳) ابو حسین ادارہ۔ کوکب دریہ صفحہ ۳۰۹ (نسخہ مصریہ ۱۹۲۳) نیز کشف الحیل جلد دوئم صفحہ ۶۴

لمعات وجہک اشرقت وشعاع طلعتک اعتلیٰ — زچہ رو الست بربکم نزنی بزن کہ بلیٰ بلیٰ
بجواب طبل الست تو زنولا چہ کوس بلای زدند — ہمہ خیمہ زد بدر دلم سپہ غم و حشم بلا
من و عشق آں مہ خوبرو کہ چو شد صلای بلا برو — بنشاط و قہقہہ شد فرو کہ انا الشہید بکربلا
چو شنید نالہ مرگ من پی ساز من شد و برگ من — فمشیٰ الیَّ مہرولاً و بکیٰ علیَّ مجلجلا
چہ شود کہ آتش حیرتی زنیم بقلۂ طور دل — فسککتہ و دککتہ متدکدکاً متزلزلا
پی خوان دعوت عشق او ہمہ شب زخیل کروبیان — رسد ایں صفیر مہیمنی کہ گروہ غمزدہ الصلا
تو چہ فلس ماہی حیرتی کہ زنی بجبر و جود دم — بنشیں چو طاہرہ دم بدم بشنو خروش نہنگ لا

تیرے چہرے کا آفتاب طلوع ہوا اور اس کی شعاعیں بلند ہوئیں — کیوں تو الست بربکم نہیں کہتا کہ میں پکار اٹھوں بلیٰ بلیٰ
تیرے "طبل الست" کے جواب میں محبت سے "بلیٰ" کا کیسا نقارہ بجا — کہ میرے دل کے در پر غم کی سپاہ اور بلا کے حشم کا خیمہ نصب ہو گیا
میں ہوں اور اس خوبرو کی محبت۔ جب بلا کی صدا بلند کی — تو وہ خوشی اور قہقہوں میں ڈوب گئی اس لیے کہ میں شہید کربلا ہوں
جب اس نے میری موت کے نالے سنے تو میری تجہیز و تکفین میں مشغول ہو گیا — مہر و محبت سے میرے پاس آیا اور گریہ و زاری کی
اگر تو میرے دل کے طور کی چوٹی کو آتش حیرت سے جلا دے تو کیا مضائقہ ہے — کیونکہ تو نے ہی اسے بنایا ہے یہ تیری تعمیر ہے تجھے اختیار ہے کہ تباہ و برباد کرے
تمام رات تیرے دعوت عشق کے خوان کی طرف فرشتوں کا گروہ — آواز دیتا رہتا ہے "اے غمزدہ آؤ"
تو کس ماہی حیرت کا چھلکا ہے کہ "بحر وجود" کا دم بھرتا ہے — طاہرہ کی طرح خاموش بیٹھ اور "نہنگ لا" کی آواز دم بدم سن[1]

لیکن آیتی جس کا پہلے تخلص اوارہ تھا یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ یہ غزل ایک قدیم شاعر محمد باقر صحبت لاری کی ہے۔ اس کے دیوان میں یہ پوری غزل چند اختلافات کے ساتھ درج ہے اور مقطع کے دوسرے مصرعہ میں اس کا تخلص صحبت نظم ہے

ذیل کی غزل جو بحر کامل میں ہے اس کی طرف منسوب کی جاتی ہے

جذبات شوقک الجمت بسلاسل الغم والبلا — ہمہ عاشقان شکستہ دل کہ دہند جان بردلا
اگر آں صنم ز سر ستم پی کشتن من بیگنہ — لقد استقام بسیفہ فلقد رضیت بما رضا
سحر آں نگار ستمگرم قدمی نہاد ببسترم — و اذا رایت جمالہ طلع الصباح کانما
نہ چو زلف غالیہ بار او نہ چو چشم فتنہ شعار او — شدہ نافۂ ہمہ ختن شدہ کافری ہمہ خطا[2]
تو کہ غافل از می و شاہدی پی مرد عابد زاہدی — چہ کنم کہ کافر جاہدی ز خلوص نیت اصفیا
بمراد زلف معلقی پی اسپ و زیں معرقی — ہمہ عمر منکر مطلقی ز فقیر فارغ و بی نوا
تو و ملک و جاہ سکندری من و رسم و راہ قلندری — اگر آں خوش است تو در خوری و گر ایں بد است مرا سزا
بگذر ز منزل ما و من بگزیں بملک فنا وطن — فاذا فعلت بمثل ذا فلقد بلغت بما تشا

تیرے شوق کے جذبات درد و غم کی زنجیر میں جکڑ دیتے ہیں — تمام عشاق دل شکستہ کو جو جو تیری محبت کی راہ میں جان نثار کرتے ہیں
اگر وہ صنم ستمگری سے مجھ بے گناہ کے قتل پر تلوار کھینچے — تو جو اس کی رضا ہو ہمارا سر تسلیم خم ہے
صبح کو اس نگار ستمگر نے میرے بستر پر قدم رکھا — جب میں نے اس کا جمال دیکھا تو معلوم ہوتا تھا صبح طلوع ہو گئی
تمام حسن کے نافے اور تمام خطا کی کافری — نہ اس کی زلف غالیہ بار کی طرح خوشبو دار ہے نہ اسکی چشم فتنہ گر کی طرح سیاہ

(۱) تحفۂ طاہرہ میں یہ ایک طویل غزل کا (جس میں ۲۱ شعر ہیں) مقطع ہے اس غزل کا مطلع ہے

ہلا اے گروہ عمائیان بکشید ہلہلۂ و ہا — کہ ظہور دلبر ما عیاں شدہ فاش و ظاہر و برملا

(۲) براؤن۔ بابی مذہب کے مطالبہ کے لیے مواد صفحہ ۳۵۱-۳۵۲۔ طبع کیمبرج ۱۹۱۸ء

توشراب وشاہد سے غافل کسی مرد عابد و زاہد کی تلاش میں ہے   افسوس کہ تو اصفیا کے خلوص نیت کے ساتھ کافر و منکر ہے
تو پیچ کھلتی ہوئی زلفوں اور مغرق زین اور گھوڑے کی فکر میں محو ہے   تجھے عمر بھر میں کب فرصت ملیگی کہ فقیر و بے نوا کی طرف توجہ کرے
تو اور ملک شان سکندری رکھتا ہے اور میں راہ و رسم قلندری   اگر وہ بہتر ہے تو تجھے مبارک ہو اور یہ برا ہے تو مجھے زیبا ہے
تمام ذہن کی منزل سے گذر جا اور ملک فنا میں سکونت اختیار کر   پس اگر تو نے ایسا کیا تو تو اپنی مراد کو پہنچے گا (۱)

براؤن نے ایک مثنوی ساقی نامہ بھی اس کے نام سے منسوب کی ہے لیکن اس کے یقین کے اسباب بھی مستند نہیں
مندرجہ ذیل غزل بھی قرۃ العین کے نام سے مشہور ہے(۲) آیتی نے اپنے کواکب الدریہ میں بھی اسے اسی کی طرف منسوب کیا ہے(۳) لیکن بعد کو اس نے اپنا خیال بدل دیا ہے(۴)۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں فردوسی کی صد سالہ یادگار کے موقع پر جب دوسری مرتبہ میں طہران گیا تو مجھے آیتی سے ملنے کا فخر حاصل ہوا۔ میں نے اس سے ایرانی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی۔ اس وقت آیتی نے یقین کے ساتھ اپنے خیال کا اظہار کیا کہ یہ غزل قرۃ العین کی نہیں بلکہ ملا عبدالوہاب قزوینی متخلص بہ حزیں کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ مقطع جس میں حزیں کا تخلص نظم تھا درمیانی شعر سے بدل کر اس میں طاہرہ رکھدیا گیا ہے۔ دلیل میں بڑی جدت ہے لیکن مستند نہ ہونے کی وجہ سے معتبر نہیں ہوسکتی۔

گر بتو افتدم نظر چہرہ بچہرہ رو برو   شرح دہم غم ترا نکتہ بنکتہ مو بمو
از پی دیدن رخت ہمچو صبا فتادہ ام   خانہ بخانہ در بدر کوچہ بکوچہ کو بکو
دور دھان تنگ تو عارض عنبرین خطت   غنچہ بغنچہ گل بگل لالہ بلالہ بو ببو
میرود از فراق تو خون دل از دو دیدہ ام   دجلہ بدجلہ یم بیم چشمہ بچشمہ جو بجو
مہر ترا دل حزیں بافتہ بر قماش جان(۵)   رشتہ برشتہ نخ بنخ تار بتار پو بپو
در دل خویش طاہرہ گشت و ندید جز ترا   صفحہ بصفحہ لا بلا پردہ بپردہ تو بتو
اگر کبھی میرا تجھ سے سامنا ہوجائے اور نظریں ملیں   تو تیرے غم کی شرح کروں نکتہ نکتہ بال بال
تیرے رخ زیبا کی دید کی تمنا میں صبا کی طرح پھرا ہوں   گھر گھر در در کوچہ کوچہ گلی گلی
تیرے دہن تنگ اور عنبریں خط والے رخساروں کی جھلک   غنچہ غنچہ پھول پھول لالہ لالہ اور خوشبو خوشبو میں
تیری فرقت میں میری آنکھوں سے خون دل رواں ہے   دجلہ دجلہ، سمندر سمندر، چشمہ چشمہ نہر نہر
تیری محبت کو غمزہ دل نے قماش جاں میں(۵) بن دیا ہے   دھاگا دھاگا ریشہ ریشہ تانا تانا بانا بانا
طاہرہ نے اپنے دل میں جاکر دیکھا تو تیرے سوا کچھ نظر نہ آیا   صفحہ صفحہ جلد جلد پردہ پردہ میں تہہ بتہہ

ایک چھوٹی سی کتاب تحفۂ طاہرہ کے نام سے جس میں قرۃ العین کے اشعار ہیں اسفندیار بختیاری نے شائع کی ان میں نئی اور غزلیں ہیں جن کے متعلق براؤن یا آیتی نے کچھ ذکر نہیں کیا ہے۔

پس ہم دیکھتے ہیں کہ محض چند غزلیں جو قرۃ العین کے نام سے منسوب ہیں۔ ان میں ایک کے متعلق جو تعین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی نہیں۔ باقی ایک کے متعلق بھی شک ہے۔ پھر قرۃ العین کی شہرت کا انحصار کس چیز پر ہے؟ یعنی یہ شعر گوئی، بنا پر نہیں ہوسکتی۔ اس کی شہرت کا سبب کچھ اور ہی ہے مختلف مصنفین کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علوم مذہبی پر اسے عبور کامل تھا اور وہ بڑی فصیح و بلیغ مبلغ تھی۔ سامعین اس کی فصاحت و بلاغت سے مسحور ہوجاتے اور وجد کے عالم میں اس کی تقریر سنتے لہٰذا اس کی شہرت کی اصلی وجہ اس کی علمیت اور خطابت تھی۔

خواہ یہ غزلیں قرۃ العین کی ہوں یا نہ ہوں لیکن خیالات و طرز ادا میں یکساں اور متحد ہیں۔ انمیں عربی ترکیبات اور جملوں کی بھرمار ہے۔ لیکن معانی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ان کی روانی شاندار الفاظ اور خوبصورت قافیوں نے اس کی موسیقیت و دلچسپی میں اضافہ کردیا ہے۔

---

(۱) براؤن۔ مواد برائے مطالعہ فرقہ بابیہ۔ صفحہ ۳۴۹ – ۳۴۸ (مطبع کیمبرج سنہ ۱۹۱۸ء) (۲) محمد اسحاق سخنوران ایران در عصر حاضر جلد دوم صفحہ ۸ – ۱۴ طبع دہلی سنہ ۱۹۳۳ء (۳) کواکب الدریہ صفحہ ۳۰۸ (۴) کشف الحیل جلد دوم صفحہ ۸۴ حاشیہ (۵) تحفۂ طاہرہ صفحہ ۴ پر اس غزل میں مندرجہ ذیل زائدہ ہے
ابرو چشم و خال تو صید نمودہ مرغ دل   طبع بطبع دل بدل مہر بمہر خو بخو۔ (۶) طبع کراچی یکم نومبر سنہ ۱۹۴۹ء بابی۔ بہائی)

کیف جاوید

اُلجھ کر رہ گیا ہوں آپ اپنے جذبۂ دل سے
مری منزل تھی آگے چاند اور تاروں کی منزل سے

جو ممکن ہو تو آ اور چھین لے کاشانہ دل سے
بھری محفل کی محفل لے چلا ہوں تیری محفل سے

سماجی بندشیں کیا چھین سکتی ہیں تمہیں مجھ سے
کہ دل سے دور رہ کر بھی بہت نزدیک ہو دل سے

تمہیں پا کر بھی میری حسرتیں کچھ کم نہیں ہوتیں
بکھر جاتی ہیں موجیں جس طرح ٹکرا کے ساحل سے

مری تسکین میری نیند سب کچھ لے لیا تو نے
جو ممکن ہو تو اپنی یاد بھی لے لے مرے دل سے

ہجوم یاس کا کیا پوچھنا بس مختصر یہ ہے
کہ تیری یاد بھی آتی ہے تو آتی ہے مشکل سے

بہت کچھ پہلے تھیں قیصری مگر اب ایک حیرت ہے
کہ میری یاد بھی جاتی رہے اس شوخ کے دل سے

جاوید قیصری

ایک کشتی پر گنگناتا ہوا چلا جا رہا تھا ــــــ چلا جا رہا تھا۔ دوستوں کے قہقہے، معطر لباس، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہنس پڑنے والی بے حجاب جانیاں اور اس پس منظر کے ساتھ گوئٹے (Gothe) کے

"Nuz wer die sehnsucht Kennt
Weiss-Was ich Leide"

پر منچلے احباب تبصرہ کر رہے تھے، میں نے کہا گوئٹے نے غلط نہیں کہا تھا " اے سعدی! اے عطار! اے حافظ! کہاں ہو آؤ اور دیکھو کہ تمہارا ایک بھائی زندان غم میں اسیر برلن میں شیراز کے پھولوں کے لیے تڑپ رہا ہے" اس شاعر کو کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا تھا کہ اسی کی روح مشرق میں حافظ کے روپ میں جلوہ گر رہ چکی ہے، خیر یہ تو گوئٹے کا حسن بیان ہوگا مگر یہ تو ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ دنیا کے تقریباً تمام بڑے شاعر ایک فضا میں پرواز کرتے ہیں۔ تمام سماجی بندشیں ٹوٹ جاتی ہیں اور لسانیاتی اختلاف کے باوجود ایک ہی تخیلی مرکز پر جمع ہو جاتے ہیں، دور کیوں جاتے ہو شیراز کے اسی فطرت نگار سعدی ہی کو لو وہ ایک جگہ اپنا ساز اس طرح چھیڑتا ہے

"شب فراق کے داند کہ تا سحر چند است
مگر کسیکہ بہ زندان عشق در بند است"

اب اس شعر کو وائلڈ کے اس البیلے اور رنگیلے شاعر کے اس شعر سے ملاؤ جس پر ابھی ہم تبصرہ کر رہے تھے ــــ ناؤ نا ہوش شیشہ جیسی چلی جا رہی تھی اور لوکارنو کے جھیل میں ایک بین الاقوامی طرحی مشاعرہ منایا جا رہا تھا مجھکو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت ساری کائنات "فرش سے تا عرش" موج رنگ "کے طوفان میں غرق ہے اور اسی سرمستی میں حجابات کے سارے پردے چاک کر ڈالنا چاہتی ہے۔ آہ محویت کے عالم میں جو گردن اٹھائی اور گرد و پیش کے پہاڑوں کو دیکھا تو ایسا معلوم ہوا کہ آج ہماری خاطر پہاڑوں پر چراغاں ہے اور پانی پر ہر طرف چراغ جھلملا رہے ہیں۔ یہ نظارہ اس درجہ دلکش اور نشہ آور تھا کہ چند لمحوں کے لیے میں اس شیش محل میں کھو سا گیا۔ مگر اسی لذت کے

غزل

آسان ہوئی کتنی جانگدازی
اے غم تری عمر کی درازی

پل پل کی خبر وہ لے رہے ہیں
اللہ اللہ دل نوازی

کترا کے نکل رہی ہے دنیا
فتنے جو اٹھے ہیں امتیازی

کچھ زور جو شوخیوں پہ چلتا
کیا کیا ہوتی زمانہ سازی

شعر [illegible] طاہرہ [illegible] (ترجمہ)

در دل خویش طاہرہ گشت و ندید جز ترا

اگر کبھی میرا تجھ سے سامنا ہو جائے اور نظریں ملیں
تیرے رخ زیبا کی دید کی تمنا میں صبا کی طرح پھرا ہوں
تیرے دہن تنگ اور عنبریں خط والے رخساروں کی جھلک
تیری فرقت میں میری آنکھوں سے خون دل رواں ہے
تیری محبت کو غمزہ دل نے تماش جاں بنا دیا ہے (۵)
طاہرہ نے اپنے دل میں جاکر دیکھا تو تیرے سوا کچھ نظر نہ آیا

[illegible]
تو تیرے غم کی شرح کردوں نکتہ نکتہ بال بال
گھر گھر در در کوچہ کوچہ گلی گلی
غنچہ غنچہ پھول پھول لالہ لالہ اور خوشبو خوشبو میں
دجلہ دجلہ سمندر سمندر چشمہ چشمہ نہر نہر
دھاگا دھاگا ریشہ ریشہ تانا تانا بانا بانا
صفحہ صفحہ جلد جلد پردہ پردہ میں تہہ بتہہ

ایک چھوٹی سی کتاب تحفہ طاہرہ کے نام سے جس میں قرۃ العین کے اشعار ہیں اسفندیار بختیاری نے شائع کی اس میں تین اور غزلیں ہیں جن کے متعلق براؤن یا آتی نے کچھ ذکر نہیں کیا ہے۔ ان میں ایک کے متعلق تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی نہیں۔ باقی ایک کے متعلق بھی شک ہے۔ پس ہم دیکھتے ہیں کہ محض چند غزلیں جو قرۃ العین کے نام سے منسوب ہیں۔ پھر قرۃ العین کی شہرت کا انحصار کس چیز پر ہے؟ یعنی شعر گوئی کی بنا پر نہیں ہو سکتی۔ اس کی شہرت کا سبب کچھ اور ہی ہے۔ مختلف مصنفین کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علوم مذہبی پر اسے عبور کامل تھا اور وہ بڑی فصیح و بلیغ مبلغ تھی۔ سامعین اس کی فصاحت و بلاغت سے مسحور ہو جاتے اور وجد کے عالم میں اس کی تقریر سنتے لہذا اس کی شہرت کی اصلی وجہ اس کی علمیت اور خطابت تھی۔ خواہ یہ غزلیں قرۃ العین کی ہوں یا نہ ہوں لیکن خیالات و طرز ادا میں یکساں اور متحد ہیں۔ انہیں عربی ترکیبات اور جملوں کی بھرمار ہے۔ لیکن روانی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ان کی روانی شاندار الفاظ اور خوبصورت قافیوں نے اس کی موسیقیت و دلچسپی میں اضافہ کر دیا ہے۔

---

(۱) براؤن۔ مواد برائے مطالعہ فرقہ بابیہ۔ صفحہ ۳۴۸-۳۴۹ (مطبع کیمبرج ۱۹۱۸ء) (۲) محمد اسحاق سخنوران ایران در عصر حاضر جلد دوم صفحہ ۱۴۸ طبع دہلی ۱۹۳۳ء
(۳) کواکب الدریہ صفحہ ۳۰۸ (۴) کشف الحیل جلد دوم صفحہ ۴۸ حاشیہ (۵) تحفہ طاہرہ صفحہ ۴ پر اس غزل میں مندرجہ ذیل زائد ہے (۶) طبع کراچی یکم نومبر ۱۹۴۰ء بابی
طبع بہ طبع و دل بدل مہر بمہر و خو بخو
ابرو بچشم و خال تو صید نمودہ مرغ دل

غالب کا نگارخانہ

مشرقی نگارخانۂ ادب کے پرستار جناب ڈاکٹر اختر امام صاحب ایم۔ اے پی ایچ ڈی یورپ کے تصویر خانوں میں ادبی مصوری کا کافی مطالعہ کر چکے ہیں۔ نئی نئی رنگین تصویروں پر فنی نگاہ ڈالی لیکن جب یورپ سے ہندوستان لوٹے تو ان لب تشنہ پر یہ شعر مچل رہا تھا

پھر یہ غوغا ہے کہ لا ساقی شراب خانہ ساز :: دل کے ہنگامے مئے مفت نے کر ڈالے خموش

یہاں آتے ہی پھر اُن کا ذوقِ مشرق کے سیلاب رنگ میں ہچکولے کھانے لگا۔ موصوف کبھی کبھی اپنے رنگین رشحاتِ قلم سے جدید اردو کے صفحوں کو نوازا کرتے ہیں۔ اس قسط میں وہ قارئین کو غالب کے نگارخانۂ سخن کی رنگین تصویروں سے متعارف کر رہے ہیں۔ اختر امام صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ یورپ کی رنگین دنیا میں بھی غالب جیسے مصورِ جذبات و حقائق کو نہ بھولے۔ ادارہ

طالب العلمی کے دوران میں مجھ کو ایک بار سوئٹزرلینڈ کے دلکش اور کشمیر صفت مشہر لوکارنو (Locarno) میں چند دن گذارنے پڑے میری "غالب شناسی" غالباً اسی نزہت آفریں اور سرسبز و شاداب سرزمین کی پیداوار ہے۔ دیسے "ہندستان کی الہامی کتاب" کا مطالعہ بار بار کیا تھا مگر پھر بھی مرزا کے دلکش نقش و نگار اور ذہنی لطافتوں پر باریک سی نقاب پڑی ہی رہی۔ رنگ، خوشبو، شوخی اور بہ حیثیت مجموعی مطالعۂ فطرت غالب کے یہاں اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں، میں نے ایک بار جو تاک جھانک کر دیکھا تو "برقِ نظارہ سوز سے آنکھیں چکا چوند نہیں ہوئیں اور غالب کی "رنگا رنگ بزمِ آرائیاں" دیکھ لیں —— تو سنئے اسی زمانہ کی یادگار یہ چند تصویریں ہیں جو آپ کے نگارخانے میں تحفتہً لایا ہوں۔

سورج ڈوب چکا تھا اور جھیل کے گرد پہاڑوں پر جو خوشنما عمارتیں تھیں وہاں برقی قمقمے جگمگا رہے تھے، میں جھیل میں چند احباب کے ساتھ ایک کشتی پر گنگناتا ہوا چلا جا رہا تھا —— چلا جا رہا تھا۔ دوستوں کے قہقہے، معطر لباس، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہنس پڑنے والی بے حجابیاں اور اس پس منظر کے ساتھ گوئٹے (Gothe) کے

"Nur wer die sehnsucht Kennt
Weiss-was ich Leide"

پر منچلے احباب تبصرہ کر رہے تھے، میں نے کہا گوئٹے نے غلط نہیں کہا تھا "اے سعدی! اے عطار! اے حافظ! کہاں ہو آؤ اور دیکھو کہ تمہارا ایک جانی زندانِ غم میں اسیر برلن میں شیراز کے پھولوں کے لیے تڑپ رہا ہے" اس شاعر کو کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا تھا کہ اسی کی روح مشرق میں لفظ کے روپ میں جلوہ گر رہ چکی ہے، خیر یہ تو گوئٹے کا حسن بیان ہوگا مگر یہ تو ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ دنیا کے تقریباً تمام بڑے شاعر ایک ہی فضا میں پرواز کرتے ہیں۔ تمام سماجی بندشیں ٹوٹ جاتی ہیں اور لسانیاتی اختلاف کے باوجود ایک ہی تخیلی مرکز پر جمع ہو جاتے ہیں، دور کیوں جائیے ہو شیراز کے اسی فطرت نگار سعدی ہی کو لو وہ ایک جگہ اپنا ساز اس طرح چھیڑتا ہے

"شب فراق کے داند کہ تا سحر چند است   مگر کسیکہ بہ زندان عشق در بند است"

اب اس شعر کو دہلی کے اس البیلے اور رنگیلے شاعر کے اس شعر سے ملاؤ جس پر ابھی ہم تبصرہ کر رہے تھے ۔ ناؤ نا نوش شیشہ بیلی چلی جا رہی تھی اور لوکارنو کے جھیل میں ایک غیر طرحی بین الاقوامی مشاعرہ منایا جا رہا تھا مجھکو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت ساری کائنات "فرش سے تا عرش" "موجِ رنگ" کے طوفان میں غرق ہے اور اسی سرمستی میں حجابات کے سارے پردے چاک کر ڈالنا چاہتی ہے اسی کیفیت کے عالم میں جو گردن اٹھائی اور گرد و پیش کے پہاڑوں کو دیکھا تو ایسا معلوم ہوا کہ آج ہماری خاطر پہاڑوں پر چراغاں ہے اور پانی پر متحرک باغ جھلملا رہے ہیں۔ یہ نظارہ اس درجہ دلکش اور نشہ آور تھا کہ چند لمحوں کے لیے میں اس شیش محل میں کھو سا گیا۔ مگر اسی لذت کے

ساتھ ایک انوکھا تخیل دماغ میں رونما ہوا۔ وہ یہ کہ اس جنت نگاہ جی بھر کو ایک بار جی بھر نہ دیکھوں بلکہ رفتہ رفتہ ٹھہر ٹھہر کر دیکھتا رہوں، تاکہ یہ حسیاتی تماشا یکبارگی نہ ختم ہو جائے۔ جیسے بچے اپنے منہ کی مٹھائیوں کو مزے لے لے کر چوستے رہتے ہیں اور چبا کر فوراً کھا نہیں جاتے۔ میں نادانستہ طور پر اسی جذبہ کے تحت خیام کی زبان میں" اندکے خوردگہہ گہہ خورد" پر عمل کر رہا تھا ــــ دوستوں کے فقرے بدستور چست ہوتے رہے، سطح آب پر شیریں قہقہے بلند ہوتے رہے اور اسطرح ہم لوگ جوانی کی ناؤ کو مسرت وانبساط کے دھاروں پر کھیتے رہے ــــ!

کوئی ایک ہفتہ بعد جو لوکارنو سے مغربی یورپ واپس آیا تو وہ "چراغاں" دماغ میں اب تک روشن تھے، حسن اتفاق یہ کہ اسی زمانہ میں یونیورسٹی لائبریری کے "اردو شعبہ" میں ایک دن جانا ہوا۔ اردو کتابوں کو دیکھتا چلا جا رہا تھا کہ غالب پر نظر پڑی میں نے کہا کہ لاؤ آج یہی رہے۔ اپنی قیامگاہ پہنچکر میں نے فرصت کے لمحات کو وقف غالب کر دیا۔ اتفاق یہ کہ علی الشپ جو دیوان کھولا تو ایک غزل کا مطلع نکلا:-

"دیکھنا قسمت اکہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے میں اسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے"

اس سے پہلے بیسیوں بار یہ شعر سن چکا تھا مگر آج کا مزا ہی دوسرا تھا، مجھکو ایسا معلوم ہوا کہ میرے گذشتہ ہفتہ کے نظارہ کی یہ لاجواب نفسیاتی تشریح ہے۔ شاعر اعظم! تو نے ساری "بلا قسمت" کے سر تھوپ دی اور پھر "آپ اپنے پہ رشک" ــــ اے سبحان اللہ! دلی تو کتنی خوش نصیب ہے کہ تیرے ایک گوشہ میں یہ فطرت نگار نکتہ رس اپنے "گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج" ہوتا رہا۔ اور سوئٹزر لینڈ کے خوبصورت شہر! اے کارنوا تجھ پر سلامتی ہو کہ تو نے ایک عشرتناک رات کے ذریعہ، اپنے جلوۂ چراغاں سے، مجھکو غالب کے دل تک پہنچا دیا۔ دنیا کے بلند پایہ فطرت نگار شعرا کی طرح غالب کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ ایک ہی شعر میں مختلف تخیل کو پیش کر دیتا ہے۔ اس طرح گویا غالب اقبال کی زبان سے کہتے ہیں:

"ہیں ہزاروں اس کے پہلو، رنگ ہر پہلو کا اور سینہ میں ہیرا کوئی ترشا ہوا رکھتا ہوں میں"

اور غالباً حافظ کیطرح غالب کی یہ جامعیت اور مشرقی شعرا سے زیادہ نمایاں ہے۔ انسانی قلب مختلف واردات کا مسکن بنتا رہتا ہے اور ہم جس وقت جس جذبہ سے متاثر رہتے ہیں۔ اسی عینک سے کائنات کو نادانستہ طور پر دیکھتے رہتے ہیں۔ گورستان سے لوٹتے وقت انسانی زندگی کی بے بضاعتی اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری زندگی کے دردناک مناظر راشد الخیری اور شوپنہاوار (Schopenhauer) کے دلوں پر قاتی اثرات کے تحت ایک گہرا نقش چھوڑ گئے۔ جو قنوطیت سے دور بھاگنے کی کوششیں کرتے ہیں وہ کائنات کے ہر ذرہ میں مسرت ڈھونڈتے ہیں اور خیام اور ولہلم بش (Wilhelm Busch) کے رنگ محلوں میں رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ ہماری زندگی صرف یکطرفہ جذبہ سے متاثر ہو کر موت تک اسی کیف کے راگ گاتی رہے؟ میرے خیال میں اس محدود نظریہ سے زندگی کی جذباتی وسعت تنگ ہو جاتی ہے اور ہم بھانڈ یا پیشہ ور ماتم کرنیوالے بن جاتے ہیں۔ غالب نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو نزدیک سے دیکھا اور اس کو یقین ہو گیا کہ یہ متضاد خوشرنگ شیشوں سے مزین ہے اور "شکست" سے پہلے اسی طرح نت نئے جلوے دکھاتی رہے گی اور اسی مناسبت سے اس نے یہ نغمہ بلند کیا:-

"غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک"

غالب کی دنیا دو رنگی ہے ایک تو یہی مادی، جس کی آغوش میں کرۂ ارضی، ستیارے، سورج، چاند، اور فطرت کے تمام خوبصورت نظارے موجود ہیں اور دوسری تصورات کی دنیا ــــ یہ وہ دنیا ہے جس کو ہم حکیم آئنسٹائن کی طرح حدود میں مقید نہیں کر سکتے، اس کی رعنائیاں شادابی بہاریں اور رنگوں کے کھیل، ہم صرف دماغ کے ذریعہ دیکھ سکتے ہیں ان آنکھوں کے ذریعہ نہیں۔ عام شعرا دنیائے آب وگل میں پھنس کر رہجاتے ہیں اور اس اعتبار سے ان کے بہترین محاکات زیادہ سے زیادہ ایک اچھے مصور کا شاہکار سمجھے جاتے ہیں گویا ان کے گیت متحرک تصاویر ہیں مگر غالب کا اچھوتا تخیل "عرش سے پرے" پہنچ جاتا ہے۔ میں یہاں پر ان مشاہدہ فطرت کا تذکرہ نہیں کروں گا جن کا تعلق ہمارے گردوپیش کے دلخوش کن یا دردانگیز مناظر سے ہے بلکہ صرف ان جلووں جو تصورات کے رنگ محل میں جھلملا رہے ہیں۔ یہاں بھی غالب اور شعرا کی طرح (جو کبھی کبھی پرواز کی کوشش کرتے ہیں) صرف خیالستان کا ہی ہو کر نہیں رہ جاتا ہے بلکہ تخیلی اور مادی دنیا میں ایک باہمی ربط قائم کر دیتا ہے۔ اس طرح غالب کے پڑھنے والے کبھی کبھی خود شاعر کے ساتھ مادی گزرگاہ سے خیال کی منزل تک باسانی پہنچ جاتے ہیں اور پھر جب شوق نظاروں سے دماغوں کو تراوت بخشتے ہیں

مرزا کا ایک مشہور مطلع ہے

"مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے — جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے"

پہلا مصرع صاف ہے جس میں محبوب کو مدعو کرنے کی لطیف تمنا پوشیدہ ہے مگر دوسرے میں جو بزم آرائیوں کے لیے اہتمام کیا جا رہا ہے اس کا جواب اردو تو اردو، فارسی اور تمام امیر آریائی زبانوں میں شاید ہی مشکل سے مل سکے کم از کم المانوی، فرانسیسی اور انگریزی ادب میں تو اس نوع کا کوئی تصور پیش نہیں کیا جا سکا۔ سرخ انگوری شراب جو "یار" کی طرف بڑھائی جائیگی اس کے نور سے بزم اس طرح جگمگا اٹھیگی جیسے بیسیوں چراغ قرینے سے جھلملا رہے ہوں۔ پھر "جوشِ قدح" نے تصور کو جو پرواز بخشی ہے وہ ترجمہ یا توضیح سے بے نیاز ہے کبھی کبھی لطیفہ کی طرح تشریح سے حسنِ شعر خاک میں ملتا ہے۔ شراب کے رنگا رنگ جلووں کو غالب نے جس جس طرح پر دکھایا ہے ان سے بے پئے ہم دماغی نشاط حاصل کرنے لگتے ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

"موجۂ گل سے چراغاں ہے گذرگاہِ خیال — ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب"

بہار کی شان میں دنیا کے تقریباً تمام شعراء نے رنگ برنگ کے گل کھلائے ہیں اور جہاں تک محاکات کا تعلق ہے، حقیقت یہ ہے کہ فارسی میں حافظ اور نظیری، عربی میں الصنوبری اور ابن زیدون، انگریزی میں ورڈسورتھ اور کیٹس، المانوی میں گوئٹے اور شلر اور سنسکرت میں کالی داس اور بھوبھوتی نے جو بہاریہ مناظر دکھائے ہیں، ان کا عطر غالب کا ایک شعر قرار دیا جا سکتا ہے

"ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف — اڑتے ہوئے الجھتے ہیں، مرغِ چمن کے پاؤں"

بہار کی مخمور فضا میں، مرغِ چمن جو اڑنا چاہتا ہے تو رنگا رنگ پھولوں، اور شاخ در شاخ بیلوں میں الجھ جاتا ہے، ان بظاہر سیدھے سادے لفظوں کی تہہ میں جو بہار کی دلکش رعنائیاں پوشیدہ ہیں ان کا اندازہ کچھ وہی کر سکتا ہے جسنے کبھی اطالیہ، کشمیر اور پلنگ کی چمن بدوش بہاریں دیکھی ہوں جہاں "بوئے گل سے نفس بادِ صبا عطر آگیں" ہو جاتی ہے۔ تاہم جہانگیر کی زبان میں "برسات جو ہندوستان کی بہار ہے" ہی سے تصور کو چند لمحوں کے لیے سرسبز و شاداب بنا لیجیے اور پھر اس سبز آئینہ میں ساون بھادوں کی خنک اور شباب پرور نظاروں کے دلکش نظارے دیکھیے اجنتا، چین اور اطالیہ کے رنگ دنیا بھر میں مشہور ہیں، میر حسن دہلوی نے مثنوی بدرِ منیر میں اور میر انیس لکھنوی نے اپنے مراثی میں بہار کی زیبائش کے لیے جو رنگ استعمال کیے ہیں وہ خالص ہندوستانی رنگ ہیں۔ تخیل کے بادشاہ اقبال نے ساقی نامہ کے ایک بہاریہ شعر

جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں — لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں

میں جو رنگ بھر دیئے ہیں ان سے میر حسن اور انیس کے رنگ بہت مدھم پڑ گئے ہیں اور پھر کمال یہ ہے کہ مصور کا قلم چند ہی خطوط کھینچ کر تماشائیوں کے لیے لا انتہا معنی چھوڑ گیا۔ اب غالب کے رنگوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالیے۔ مرزا کے نقوش میں شوخ رنگ بھی ہیں اور ہلکے بھی، مگر وہ جب استعمال کیے گئے، تو معنی مسرت میں اضافہ کے لیے۔ کالی داس کی طرح غالب اپنی داستان حیات فطرت کے زیر سایہ ٹھنڈی چھاؤں، دریا کے کنارے، تاروں بھری رات، صحرا، گھنگھور گھٹاؤں اور "سبزہ گل کے تلے" سناتا ہے۔ اور یہ فطری مناظر اس کے اشعار کے لیے ایک صدائے بازگشت یا "پس منظر" کا کام دیتے ہیں۔ مرزا غالب کے یہاں فطرت کے یہی رنگ جلوہ گر ہیں مگر ان کے نگارخانے میں یہ متناسب رنگ متحرک نظر آتے ہیں، حسن تشبیہ، حلاوتِ زبان اور وسعتِ فکر نے ان بے جان رنگوں میں زندگی پیدا کر دی ہے۔

جو تھا سو "موجِ رنگ" کے دھوکے میں مر گیا — اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل!

اور پھر دوسری جگہ "فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا" علامہ ابن رشیق نے "قراضۃ الذہب" اور "العمدہ" میں متحرک تشبیہوں کو صنعتِ شاعری میں ایک خاص اہمیت دی ہے۔ اور یہ صنعت مرزا کے یہاں خود چلی آتی ہے لائی نہیں جاتی ہے۔ میرا مقصد یہاں پر اس نوع کے ان تمام اشعار کو جمع کرنا نہیں ہے بلکہ صرف اشاروں سے آپ کو اس "گنجفہ باز خیال" کی طرف رجوع کرنا ہے مثلاً

"رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے — نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں" یا

"دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا — موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی"

ہجر کی شام ایک تیرہ بخت عاشق کے لیے بلا ہوتی ہے، یہ ناگن بری طرح ڈستی ہے اور اس وقت خیال یار سے دل و دماغ محشرستان بیقراری بن جاتے ہیں۔ وارفتہ عاشق لیٹے لیٹے سوچتا ہے، اس وقت وہ شوخ زینت محفل ہوگا، شراب کے دور چل رہے ہوں گے۔ آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہیں، زیر تبسم اور پھر ان رنگ رلیوں کے بعد آفتاب حسن، محمد حسین آزاد کی اصطلاح میں "شبستان راحت میں غروب" ہوگا۔ ادھر وہ میٹھی نیند کے بے پروا مزے اور ادھر "یاں سر پہ شور بے خوابی سے ہے دیوار جو" — حسن و عشق کے یہ متضاد جذبات ہر ملک کی شاعری میں بیتابانہ طور پر تڑپ رہے ہیں۔ نظیری نیشاپوری کی وہ مشہور غزل جس کا مطلع یہ ہے

نظر ابجا بر وصیا و در قفا خفتہ است اجل رسیدہ چہ داند بلا کی خفتہ است

اسی کیفیت کی آئینہ دار ہے۔ میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ اگر نظیری کی اس معرکۃ الآرا غزل کا ایک شعر نظر انداز کر دیا جائے یعنی

"شب امید بہ از صبح عید میگذرد کہ آشنا بہ تمنائے آشنا خفتہ است"

تو پھر غالب کی غزل جس کا مطلع ہے۔

شب کہ برق سوز دل سے زہرۂ ابر آب تھا شعلۂ جوالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

کا مقابلہ غالباً (باستثنائے چینی شاعری اور حافظ شیرازی) دنیا کی امیر ترین شاعری سے بلا احساس کمتری کیا جا سکتا ہے خصوصاً اس شاعر اعظم کا یہ شعر

"واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال یاں ہجوم اشک میں تار نگہ نایاب تھا"

اور پھر یہ خوش رنگ امتیاز!

"جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو یاں رواں مژگان چشم تر سے خون ناب تھا"

کیا حسرتناک مقابلہ ہے اور مصرعہ اولیٰ نے جو پس منظر پیش کیا ہے وہ باوجود شگفتہ لہلہاتے ہوئے سرخ پھولوں کے انتہائی یاس انگیز اور دردناک ہے۔ ایک اور بے پناہ غزل میں اسی قسم کی اداسی اور یاس آمیز سکینیت کی تصویر اس مصور نے کھینچی ہے۔

"ہوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں"

ذرا چند لمحوں کے لیے گرد و پیش کی اشیا سے بے خبر ہو کر آنکھیں تو بند کر لیجئے اور ان دو شمعوں پر نظر تو ڈالیے جو خون رو رہی ہیں — اف رے بیکسی! مصور متحرک خیال کو خاموش نقوش اور رنگوں سے ظاہر کرتا ہے۔ اور ان کو سمجھنے کے لیے تصویر پرست اور تصویر میں ایک گہری مفاہمت ہونی چاہئے غالباً وہی شعوری رابطہ جو لیونارڈو ڈا ونچی (Leonardo Da Vinci) کی مونا لیزا (Mona Lisa) اور میکائیل انجلو (Michael Angelo) کے "موسیٰ" میں مضمر ہے۔ اس حقیقت سے ہمیں انکار نہیں کہ ہم اپنے ماحول کے مطابق "حسن" رنگی تناسب اور شعر و نغمہ کو جانچتے ہیں اور ہمارا انسانی ذوق ایک اضافی حیثیت رکھتا ہے لیکن مرزا کے لطیف فن میں ایک کائناتی تخاطب ہے۔

حسن اور رنگ سے مرزا کے "جنت نگاہ" کا تصور متعین کیا جا سکتا ہے۔ "فردوس گوش" سے اس وقت بحث نہیں کروں گا کیونکہ حسن ظن کی بنا پر

"واں تو میرے نالہ کو بھی اعتبار نغمہ ہے"

بلکہ اس وقت دیکھنا یہ ہے کہ خوشبو سے کس حد تک مرزا کا دماغ بسا ہوا ہے۔ اردو ادب میں "حسن" "نغمہ" "شراب" اور قدرت کے دلکش نظارے تو اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ جلوہ فرما ہیں مگر جذبات کو تیز کرنے کے لیے بہت کم شعرا یا ادیب نے خوشبو سے کام لیا ہے۔ وحید کڑا مانکپوری کا یہ شعر میں رائن لینڈ اور پیرس میں اکثر گنگنایا کرتا تھا

"مضطرب اسی کوچہ کی صورت اپنا صرا بھی کہاں کھولے ہیں گیسو یار نے خوشبو کہاں تک ہے"

اس شعر میں بالواسطہ بھی سویان (Swedenborg) کا پس منظر اور داخلی کیف مضمر ہے۔ اردو کے علاوہ مشرقی ادب میں خوشبو کی اہمیت کافی رہی ہے اور غالباً جسم نازنین کی خوشبو سے اس باب کا آغاز ہوتا ہے। कामसूत्रम् کا ماستر میں لکھا ہے کہ پدمنی کے جسم سے کنول کی خوشبو آتی ہے اور ایک بازاری عورت کے جسم سے مچھلی کی سی۔ اس طرح رفتہ رفتہ دوشیزگی اور خوشبو کا چولی دامن کا ساتھ ہو گیا۔ یہ بھی ایک دلچسپ تخیلی اتفاق ہے کہ ہندوستان کی شاداب سرزمین سے دور، بہت دور، عرب کے ریگستانی شعرا نے اسلام سے بہت پہلے

جسم نازنین اور خوشبو کے رو ابط کو بخوبی ظاہر کیا ہے امرؤالقیس جو ان تمام جاہلی شعرا کا سرتاج ہے، اپنے معلقہ کے ابتدائی حصہ میں ام الحویرث اور ام الرباب کا ذکر چھیڑتے ہوئے کہتا ہے

اذا قامتا تضوع المسک منہما　　نسیم الصبا جارت بریا القرنفل

جب وہ کھڑی ہوتی تھی تو ان کی مانگوں سے مشک جھلکتی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نسیم سحری لونگ کی خوشبو سے بسی ہوئی ہے۔ ایک تندرست دوشیزہ کے جسم سے لونگ کی خوشبو کا آنا ـــ اس کی شوخ نزاکتوں کو غالباً فرائڈ (Freud) اور ہاوے لاک ایلس (Havelock Ellis) زیادہ سمجھا سکتے ہیں۔ ایک اور مایۂ ناز جاہلی عرب نابغہ اپنی محبوبۂ دلنواز نُعم کے بارے میں فخریہ طور پر کہتا ہے۔

والطیب یزدادطیباً ان یکون بہا　　فی جید واضحۃ الخدین معطا

(خوشبو اس کے جسم سے مس کرنے کے بعد اور معطر ہو جاتی ہے۔ چور کی گردن اور معطر رخساروں کو چھونے کے بعد)

عبرانی زبان کا ایک آدی شاعر عجیب والہانہ رنگ میں ایک معشوقہ کی زبان سے خیالات ادا کرتا ہے

"میرا معشوق (وہ یہ راگ چھیڑتی ہے) میرے لیے مشک کا طبلہ ہے
جو میرے سینوں کے درمیان معطر ہے
میرا معشوق، حنا کا وہ پھول ہے
جو "اِن گیدی" کے باغیچہ میں کھلتا ہے"

آریائی اور سامی ادبیات کے علاوہ منگولی ادب بھی ان سدا بہار پھولوں سے معطر ہے۔ فرانسیسی زبان کے ایک ادبی رسالے (Mercure de France No 9 1901) میں ایک بار ایک چینی ناٹک موسوم بہ "یو چاؤ کی الوداع" کا فرانسیسی ترجمہ شائع ہوا تھا جس آزاد ترجمہ ملاحظہ ہو:

"جب میں کوہ چاؤ کی جھاڑیوں تک چڑھ چکتا ہوں تو بھی اے پیاری! تیرے معطر لبوں کی سطح تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس سے پہلے کہ نسیم سحری تیری بغلی خوشبو مجھ تک لائے، مجھ کو عرش تک پہنچ جانا چاہیئے!"

چینی شاعر اس کے بعد کہتا ہے کہ میری ہونیوالی ساس نے ان گیتوں کو سن کر کہا کہ "یہ کون خیال کر سکتا تھا کہ میری لڑکی کے بغلوں میں ایسی خوشبو بسی ہوئی ہے"

آئیے اب چند لمحوں کے لیے "کوہ چاؤ" کو الوداع کہیں اور "اجڑی ہوئی دلی" پہنچیں جہاں خود مرزا کی زبان میں

"اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب"

جب شاعر اعظم نے ہوش سنبھالا تو اس وقت لال قلعہ کی رونق تقریباً رخصت ہو چکی تھی، سیاسی اور اقتصادی ضعف نے چمن زاروں کو ویرانہ بنا دیا تھا۔ ایسے وقت میں شعرا کی غزلیں باسی پھولوں سے منظم ہوتی ہیں مگر غالب کے دل میں جو امید زندہ تھی وہ گرد و پیش کے مردہ ماحول سے بے نیاز تھی، دلی کی گلیاں ان کے سامنے دھندلی پڑتی چلی گئیں اور مستقبل نشاط افزا نظارے پیش کرتا چلا گیا اور زندگی کے اسی تصور نے غالب کو اپنے تمام معاصرین ہی نہیں بلکہ دنیا کے بڑے شعرا کی صف میں ایک ممتاز جگہ دی ہے

مرزا کے عطر میں بوئے کفن نہیں پائیں گے کیونکہ وہ یاسیات کی دنیا سے اس طرح گذر جاتے ہیں کہ انہیں بازگشت کی فرصت ہی نہیں ملتی ان کی خوشبو میں نشاط انگیز دنیا ہوتی ہے مگر نفسیات کا یہ ماہر اشارتاً کسی خوشبو کا ذکر کر کے آگے کو گذر جاتا ہے۔ پڑھنے والا مئے تقریر میں دو آتشہ کا مزا پاتا ہے اور اس طرح تخیل تمام زمینی مسرتوں سے لذت یاب ہونے لگتا ہے ارشاد ہوتا ہے

"کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں　　آنے لگی ہے نکہت گل سے حیا مجھے"

دوسری جگہ شاعر مشرق کی مشہور تاریخی حسینہ، مصر کی زلیخا پر اپنی محبوبہ دلنواز کو ایک انوکھے اور لطیف طریقہ سے ترجیح دیتا ہے۔

"ابھی آتی ہے بو بالش سے اس کی زلف مشکیں کی　　ہماری دید کو خواب زلیخا عار بستر ہے"

یہاں پر لفظ "اٹھی" میں جو دنیائے کیف مضمر ہے اس نے خوشبو، اہمیت کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔ بہت مدت بعد جانفیب جاگے تو یاد کے "فرقِ ناز" نے تکیہ کو نوازا، جس سے "بالش" معطر ہو گیا، تو ایسی صورت میں زلیخا کا خواب میں آنا بستر کی توہین نہیں تو اور کیا ہے۔

بعض منچلے ممکن ہے کہ دیوان غالب میں "اصغر علی محمد علی" ڈھونڈیں تو انہیں مایوسی ہوگی کیونکہ خوشبو سے مرزا کا مقصد عطریات کی فہرست پیش کرنا نہیں ہے بلکہ رخشِ ذہن کے لیے ایک تازیانہ لگاتا ہے

مرزا کا طائرِ خیال شالامار اور نشاط باغ ہی کی جانفزا خوشبو تک نہیں رہ جاتا ہے۔ بلکہ کائنات کی ساری لطافتیں، وہ تمام کچی کلیاں اور وہ کھلے پھول، جو سر سبز و شاداب وسعتوں کی زینت ہیں سب احاطہ پرواز میں شامل ہیں

"دماغ عطر پیراہن نہیں ہے ۔۔۔ غم آوارگیہائے صبا کیا؟"

سید اختر امام۔ ایم اے (علیگ)

غزل

جلد ساقی ہو دورِ جامِ شراب ۔۔۔ گردشِ چرخ سے ہوں خانہ خراب

وصف سے بے نیاز حسنِ شباب ۔۔۔ صورتِ آفتابِ عالم تاب

اُف تری مستیوں کی ارزانی ۔۔۔ اُف گراں مائگی جوشِ شباب

اُف تغافل شعاریاں تیری ۔۔۔ زندگانی مری ہوئی ہے خراب

کاش ملجاتے تیرا نقشِ قدم ۔۔۔ آرزوئے سجود ہے بے تاب

جاں ستاں ہوگئی ہے مہجوری ۔۔۔ زندگی اپنی خود ہے مجھکو عذاب

وہ ملا مجھکو حسنِ عالم گیر ۔۔۔ جس کا کونین میں نہیں ہے جواب

سببِ عفوِ معصیت کو ڈھونڈ ۔۔۔ کہ یہ دنیا ہے عالمِ اسباب

نگہِ مست نے تری مجھ کو ۔۔۔ کر دیا بے نیازِ بادۂ ناب

کس کا افسانہ سُن رہا ہوں میں ۔۔۔ چشم سے اڑ گیا ہے طائرِ خواب

دیکھ لی بے ثباتی دنیا کی ۔۔۔ بحرِ عالم میں بن کے چشمِ حباب

طبعِ جدّت پسند اپنی سلیم

آسماں سے زمین لائی شتاب

سلیم فہمی

دو باب کا مختصر ڈرامہ

"زن مرید"

اپنے ایک زن مرید دوست کے نام معذرت کے ساتھ

افرادِ ڈرامہ

۱۔ پنڈت روپ لال چند
۲۔ پنڈتانی ــ پنڈت روپ لال کی بیوی
۳۔ درگاداس۔ پنڈت روپ لال کا دوست
۴۔ کملا دیوی پنڈت روپ لال کی لڑکی
۵۔ ایک نوجوان
۶۔ ایک چھوٹا بچہ
۷۔ موتی ــ پنڈت روپ لال کا کتا

باب پہلا

منظر:۔ ایک غریبانہ گھر کا کمرہ۔ وقت:۔ شام

(سب سے پہلے ایک کتے کے بھونکنے کی آواز آتی ہے، پھر دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے، جس پر پنڈتانی (جو کمرے میں بیٹھی ہے) چلا کر پوچھتی ہے)

پنڈتانی:۔ کون ہے؟

(کمرے کے باہر سے دھیمی سی آواز آتی ہے)

پنڈت:۔ پنڈتانی جی۔ ہم ہیں پنڈت روپ لال چند۔ دروازہ کھولئے گا

پنڈتانی:۔ ہوں۔ اچھا۔ خیر تو۔ ابھی دروازہ کھولتی ہوں۔ (اٹھ کر دروازہ کی طرف جاتی ہے، اور دروازہ کھولتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کے کھانسنے کی آواز آتی ہے۔ جب وہ کھانس چکتا ہے، تو کمرے کے اندر سے ایک ننھے بچے کے رونے بسورنے کی آواز آتی ہے۔ اور پنڈت روپ لال چند کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ اور پھر کھانستا ہے۔)

پنڈتانی:۔ (کرخت آواز سے) ہے ہے۔ ہے ہائے موئے پنڈت۔ آگئے تم اتنی دیر کر کے، اور وہ بھی خالی ہاتھ۔ بھگوان تمہارا ناس کرے آج سویرے تم کو گھر سے باہر بھیجا تھا کہ کچھ کما دھما کر لاؤ۔ پر میرا کی ماری کی ایسی قسمت کہاں کہ کوئی دن ایسا آتا۔ جو تم نکھٹو ہاتھ پاؤں ہلاتے اور محنت مزدوری کر کے چار پیسے گھر میں لاتے۔ تم ہی کہو آخر ہر روز گھر میں کھانے کو کہاں سے آئے۔ یہ بیچاری لڑکی کملا بھی کہتی تھی۔ کہ آج ہمارے پتا مٹھائی لائیں گے۔ مٹھائی کیلئے وہ ابھی رو رہی تھی۔ اور میرا تو کہنا ہی کیا ہے۔ تمہاری کمائی سے آج تک میں نے ایک ساڑی بھی نہیں مول لی

پنڈت:۔ (جھجکتے ہوئے رک رک کر بولنے کی کوشش کرتا ہے) مگر پنڈتانی ــ سنو ــ سنو تو ــ!

پنڈتانی:۔ (اس کی بات کاٹ کر) ارے میں کیا سنوں، تمہارا سر۔ سناؤ جا کر اپنے اُن یاروں دوستوں کو، جن کے پاس سارا سارا دن بیٹھ کر تم گپ کرتے ہو، کچھ اور سنو گے میرے منہ سے؟ لو سنو۔ تمہارے ہونے سے میرے کرم بھی پھوٹ گئے۔ کیا تم مجھے اس لیے بیاہ کر لائے تھے کہ مجھے کھانے کو کچھ نہ دو گے نہ حلوہ نہ پوری نہ مٹھائی۔ نہ پھل۔ میں ایسا جانتی، تو یہاں کبھی نہ آتی۔ ہے نرنکار۔ کیا ساری دنیا میں میرا پتی بننے کیلئے یہی ایک مردوا رہ گیا تھا۔ جی چاہتا ہے کہ میں سر پٹخ کے مر جاؤں۔ تم کو شرم نہیں آتی۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ حلوہ پوری لے کر گھر آؤ گے

پنڈت:۔ میں بھول گیا

پنڈتانی:۔ نگوڑے۔ تم نہیں بھولے۔ بھول گئی میں۔ جو تمہارے ساتھ بیاہ کر لیا۔ کیا لاکھ مرد سے نہ پالا پڑا تھا۔ سو رہی تم جیسے

کیا رہے ہو؟

پنڈت :۔ (ڈرتے ہوئے پھر بولنے کی کوشش کرتا ہے) بات یہ ہے مگر۔۔۔!

پنڈتانی :۔ (غصہ میں اُس کو ٹوک کر) اگر مگر کے بچے۔ تم نے مجھ کو برباد کر دیا۔ بھگوان تمہارا بھی ناس کرے۔ نہ تو من تیل ہوگا۔ نہ رادھا ناچیگی۔ پھر نہ تم ہوگے۔ اور نہ مجھے تمہارا جھنجھٹ ہوگا۔ بس جاؤ۔ میں ایسوں کی جورو نہیں۔ ہٹو۔ دور ہو۔

پنڈت :۔ ارے باپ (آگے کی طرف سرکتے اور منہ سے بڑبڑانے کی آواز آتی ہے پھر صاف آواز میں وہ یوں بولتا ہے) اچھا یہ بات ہے، تو یہ لو میں جاتا ہوں۔

پنڈتانی :۔ (غصہ اور تیز ہو جاتا ہے) کلموئے۔ اب جا کہاں رہے ہو۔ آہ تم کتنے ڈھیٹ ہو۔ تم نے مجھے کتنا دکھ دے رکھا ہے کبھی سکھ کا سانس نہیں ملتا۔ میں یہ کہتی ہوں۔ آج تم سے چار پیسے کی مٹھائی نہ لائی گئی؟

پنڈت :۔ دام جو نہ تھے۔

پنڈتانی :۔ ادھار بھی نہ لاسکے۔ واہ رے مردوئے۔ میں مرد ہوتی تو کتنی مٹھائی مول کر یا ادھار بھی لے آتی۔

درگاداس :۔ (کمرے کے باہر سے آواز آتی ہے) "پنڈت روپ لال" "پنڈت روپ لال"

پنڈتانی :۔ کون ہے؟

درگاداس :۔ میں ہوں درگاداس۔ پنڈت روپ لال کا دوست

پنڈتانی :۔ اجی۔ میں کہتی ہوں۔ آپ دن بھر موئے پنڈت کے پیچھے کیوں پڑے رہتے ہیں۔ کوئی گھڑی تو اس کی جان چھوڑ دیجیے اجی جائیے آپ۔ ابھی وہ گھر میں نہیں ہے، اور ہاں یہاں آکر آپ اِس طرح مت چلایا کیجئے۔

درگاداس :۔ (باہر ہی سے بھنائی ہوئی آواز میں) اچھا۔ بہت اچھا (چلا جاتا ہے)

پنڈتانی :۔ (پنڈت سے) دیکھا۔ دن رات بس یہی چکر ہے۔ مجھے دنڈر کا ہے، تم اپنی ساری کمائی اِنہی لوگوں کو کھلاتے ہوگے اب اگر پھر یہ یہاں آئے تو میں جھاڑو لے کر ان سے سب پوچھونگی

پنڈت :۔ میں کہتا ہوں۔ پنڈتانی جی۔ یہ آپ کو ہو کیا گیا؟

پنڈتانی :۔ بس چپ رہو۔ مجھے "آپ" "تاپ" کچھ مت بولو۔ بس جاؤ ہٹو۔ سامنے سے دور ہو۔

پنڈت :۔ بابا رے بابا (یہ کہہ کر پنڈت کمرے سے باہر چلا جاتا ہے اور کچھ دور تک وہ اسی طرح گنگناتا ہوا چلتا رہتا ہے۔ تھوڑی دور جاکر راستے میں اس کا دوست درگاداس اُس کو دیکھ کر کھانستا ہے۔ اور پھر پنڈت کے کندھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے اور اس کو ٹھٹھا کرتے ہوئے پوچھتا ہے)

درگاداس :۔ ارے بھئی پنڈت۔ آج تم اتنے اُداس کیوں ہو؟ کیا بات ہے، آج تمہارا منہ اتنا لٹکا ہوا کیوں ہے؟

پنڈت :۔ ارے بھائی (آہ بھرتے ہوئے) آہ کیا بتاؤں۔ بتانے کی بات نہیں

درگاداس :۔ ہیں۔ کیا ہوا۔ ہم بھی تو کچھ سنیں۔

پنڈت :۔ تم کیا سنوگے۔ اور ہم کیا سنائینگے۔ اتنی سی تو بات ہے کہ ابھی ابھی پنڈتانی نے میری بری گت بنائی ہے۔ اور مجھے گھر سے باہر نکال دیا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ۔ کہ میرا منہ لٹکا ہوا نہ ہو، تو کیونکر نہ ہو۔ سویرے شام مجھے اُس کی ڈانٹ پھٹکار سننے کے سوا اور کیا کام ہے جبھی تو میں آپ لوگوں کے پاس جا بیٹھتا ہوں۔ آج پنڈتانی نے مجھے اس بات کا بھی طعنہ دیا۔ جب تم نے آکر مجھے گھر پر پکارا تھا۔ تو میں گھر ہی میں تھا۔ پر پنڈتانی کے ڈر سے میں کیسے بولتا۔ اُس کی عادت ہی کچھ ایسی ہے!

درگاداس :۔ چھی چھی۔ واہ بھئی۔ پنڈت تم تو نرے زن مرید ہو۔ آگے بھی تم کئی بار اپنی "چہیتی" پنڈتانی کی شکایت کرتے تھے۔ مگر اب، تو حد ہو گئی کہ اس نے تم کو گھر سے نکال باہر کیا۔ بہ واہ رے بھولے بھالے پنڈت۔ تم یہ کہہ کر ٹال رہے ہو کہ اسکی عادت ہی کچھ ایسی ہے۔ جبکہ آخر جورو ہوتی ہے۔ اُسے اپنے جی کو ایسے الٹے ہاتھوں نہ لینا چاہیئے۔ چھی چھی چھی۔

پنڈت :۔ ہاں تم کہتے تو ٹھیک ہو۔ پر وہ تو مجھ سے پیار کی کوئی بات ہی نہیں کرتی۔ جب دیکھو۔ مٹھائی۔ حلوہ۔ پوری۔ کچوری۔ یہی سب مانگتی ہے

درگاداس :۔ تم اس کو کسی طرح قابو میں نہیں لا سکتے۔

پنڈت :۔ ارے بھائی۔ میری تو کوئی گھات نہیں چلتی

درگاداس :۔ (کھلکھلا کر ہنستا ہے) اچھا تو چلو۔ ہمارے ساتھ چلو۔

ہم دونوں پہاڑی پر سیر کیلئے چلیں۔ وہاں چل کر تمہارا
من بہل جائیگا۔

پنڈت :۔ اچھا چلو۔ (کچھ سوچ کر چند سکنڈ کے بعد) ہم کب تک
لوٹ سکیں گے؟ بھئی بات یہ ہے کہ پنڈتانی سے مجھے بہت
ڈر لگتا ہے۔ کہیں پھر وہ بگڑ گئی

درگاداس :۔ واہ رے پنڈت۔ تم سچ مچ اپنی جورو کے غلام ہو بڑے
اچنبھے کی بات ہے کہ تم نے اپنی ساری عمر اپنی استری کا
نوکر بن کر کیونکر گذار دی۔

پنڈت :۔ بھئی کیا بتاؤں۔

درگاداس :۔ واہ یہ بھی ایک ہی کہی۔ اچھا۔ بولو۔ پہاڑی پر چلوگے
یا نہیں؟

پنڈت :۔ ہاں۔ ہاں۔ کیوں نہیں۔ چلو تم آگے چلو۔
(یہ کہہ کر دونوں چل پڑتے ہیں۔ اور پنڈت کا کتا "موتی"
بھی بھونکتا ہوا اُن کے پیچھے پیچھے جاتا ہے۔ کچھ دور جا کر
وہ سب ٹھیر جاتے ہیں

درگاداس :۔ اے لو۔ پہاڑی آگئی

پنڈت :۔ اچھا۔ پر مجھے بہت زور کی پیاس لگ رہی ہے۔ اگر
یہاں کہیں تھوڑا سا پانی پینے کے لیے مل جائے۔ تو بڑی
اچھی بات ہے۔

درگاداس :۔ بہت اچھا۔ وہ دیکھو سامنے پانی کی ٹھلیا بھری پڑی
ہے۔ اس میں پانی لے کر پی لو

(پنڈت ٹھلیا میں سے پانی ایک برتن میں انڈیل کر غٹ
غٹ کر کے پی جاتا ہے)

پنڈت :۔ ارے یار۔ درگاداس۔ اس کا مزا تو خراب ۔ کا ہے
اور ابھی میری پیاس بھی نہیں بجھی۔ تھوڑا پانی اور پی لوں
(پھر وہ ٹھلیا سے پانی لے کر پیتا ہے) اہا! یہ تو بہت اچھا پانی
ہے۔ پانی کیا۔ یہ تو امرت معلوم ہوتا ہے۔ اور ابھی تو مجھے
اور پیاس لگ رہی ہے۔ تھوڑا پانی اور پی لوں (یہ کہہ کر
وہ پھر ٹھلیا سے پانی لے کر پینے لگتا ہے اور جب کہ خالی ٹھلیا
کو چھوڑ کر الگ ہٹ کر بیٹھ جاتا ہے۔ شراب اسے بہ
بہت جلد اپنا اثر کرتی ہے۔ اور پنڈت بے ہوش سا
ہو جاتا ہے۔ لڑھک کر گر پڑتا ہے اور سو جاتا ہے)

درگاداس :۔ (اُسے پکارتے ہوئے) پنڈت روپ لال۔ روپ لال ارے
روپ لال!! (کچھ جواب نہیں ملتا) ارے پنڈت، تم سو گئے ہو گیا؟
واہ واہ! اور اب جاگنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ کہیں پنڈتانی
کے ڈر سے ہارٹ فیل نہیں ہو گیا۔ اچھا۔ تم سوؤ۔ ہم جاتے ہیں
(چلا جاتا ہے)

باب دوسرا

(وقفہ :۔ بیس برس کے بعد)

پنڈت :۔ (انگڑائی لے کر نیند سے جاگتے ہوئے) ارے جاگ گیا ہوں!
ہو گیا؟ سورج نکل آیا۔ نہیں، نہیں، یہ تو دوپہر ہو رہی ہے (زبان
پلٹتے ہوئے) اچھا۔ اب میں گھر چلنا چاہئے۔ شاید اب
پنڈتانی کے غصے کا پارہ کچھ کم ہو گیا ہوگا (یہ کہہ وہ اُٹھ جاتا
ہے، اور وہاں سے چل پڑتا ہے)

(تھوڑی دور تک وہ جاتا ہے۔ پھر پ ۔ ت بہت سے
لوگوں کے بولنے کی آوازیں آتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے
گویا یہ جگہ شہر کا بازار ہے۔ وہاں بہت سے لوگ پنڈت
کو دیکھ کر ہنس پڑتے ہیں)

ایک نوجوان :۔ بابا۔ تم کون دیس کے رہنے والے ہو۔ یہ تمہاری داڑھی
ڈیڑھ فٹ لمبی کیوں ہو رہی ہے۔ کیا تم بہروپئے ہو۔ یا کوئی
خفیہ جاسوس، آخر تم نے یہ کیا ڈھونگ رچایا ہے کہ تم نے اتنی
لانبی داڑھی لگا رکھی ہے؟

پنڈت :۔ (سخت گھبراہٹ سے بھرائی ہوئی آواز میں) رجی۔ مہاراج
کیا میری داڑھی ڈیڑھ فٹ لانبی ہے؟۔ ارے ہاں سچ مچ
(وہ اپنے ہاتھ سے داڑھی چھو کر دیکھتا ہے) یہ کیا مصیبت
ہے۔ کیا ایک ہی رات میں میری داڑھی اتنی لانبی ہو گئی۔ میں
تو یہاں اپنے دوستوں کو ملنے آیا ہوں۔

نوجوان :۔ دوست؟ کیسے دوست؟ اُن کے نام کیا ہیں؟

پنڈت :۔ ایک کا نام درگاداس ہے

نوجوان :۔ او ہو درگاداس۔ وہ اٹھارہ سال ہوئے مر گئے۔

پنڈت :۔ ہرے رام کب مر گئے! ابھی کل تو وہ میرے ساتھ پہاڑی
پر گئے تھے۔ اتنی جلدی مر گئے!

نوجوان :۔ ہم کہتے ہیں کہ اٹھارہ سال ہو گئے۔ تم اسے جلدی کہتے ہو

میرے تم ہو کون؟

پنڈت :- کیا بتاؤں۔ کیا یہاں پنڈت روپ لال کو کوئی بھی نہیں جانتا؟

نوجوان :- (حیران ہوکر۔ یہ نام دہراتے ہوئے) کون، پنڈت روپ لال؟ مگر تمہارا نام کیا ہے؟

پنڈت :- میں کیا بتاؤں۔ میرا ہی نام پنڈت روپ لال ہے۔ کل میں تھوڑی دیر کے لیے ورلا داس کے ساتھ پہاڑی پر سیر کیلئے گیا تھا۔ وہاں مجھے تھوڑی دیر کے لیے نیند آگئی۔ مگر ایک ہی رات میں ساری دنیا بدل گئی۔

نوجوان :- بابا۔ تم کہہ کیا رہے ہو؟

(اتنے میں ایک نوجوان عورت آتی ہے۔ اس کی گود میں ایک چھوٹا بچہ ہے، جو بوڑھے پنڈت کی ڈیڑھ فٹ لامبی داڑھی دیکھ کر رونے لگتا ہے۔ یہ عورت (جو اس بچے کی ماں ہے) اس کو تھپک کر چپ کراتی ہے)

عورت :- بیٹا۔ روپ ناتھ۔ چپ ہو جاؤ۔ یہ لانبی داڑھی والے بابا تم کو کچھ نہیں کہیں گے۔

(عورت کے منہ سے بچے کا یہ نام سن کر بوڑھا پنڈت چونک پڑتا ہے)

پنڈت :- اے دیوی۔ تمہارا کیا نام ہے؟

عورت :- میرا نام کملا ہے

پنڈت :- اور تمہارے باپ کا نام کیا ہے؟

عورت :- آہ، میرے پتا جی! اُن کا نام پنڈت روپ لال چند تھا اُن ہی کے نام پر ہم نے اس بچے کا نام بھی رکھا ہے۔ پر میرے پتا جی تو بیس برس سے پردیس گئے ہوئے ہیں۔ وہ اب تک واپس نہیں آئے۔ کیا جانے اب وہ جیتے ہیں یا مر گئے۔

پنڈت :- ارے، نہیں نہیں۔ میں تو ابھی جیتا ہوں۔ مگر یہ بتاؤ تمہاری ماتا کہاں ہے؟

عورت :- ماتا جی چار سال ہوئے مر گئیں۔

پنڈت :- (خوش ہوکر) سچ کہو۔ کیا وہ مر گئی۔ اچھا۔ تو بیٹی سنو میں ہی تمہارا باپ پنڈت روپ لال چند ہوں۔ لیکن شاید اب میں بہت بدل گیا ہوں، اور یہاں اب مجھے کوئی بھی نہیں پہچانتا

عورت :- (تعجب اور خوشی سے) پتا جی۔ پتا جی۔ پر آپ اتنے سمے تک کہاں تھے؟ پورے بیس سال آپ کہاں رہے؟

پنڈت :- کہیں نہیں بیٹی۔ میں وہاں اُس پہاڑی پر کچھ دیر کے لیے سو گیا تھا۔ مگر ہیں، کیا بیس برس بیت گئے اور میں بیس برس سوتا رہا۔ تو شاید کسی نے مجھ پر جادو کر دیا ہوگا۔ بیس برس آدمی کیسے سو سکتا ہے۔ اچنبھا مجھ کو بھی تھا۔ کہ ساری دنیا کیسے بدل گئی۔ اور تو اور۔ میری داڑھی بھی ڈیڑھ فٹ لانبی ہوگئی۔ بیس برس میں کیا داڑھی ڈیڑھ فٹ بڑھ جاتی ہے۔ اچھا۔ پرماتما کا اتنا تو شکر ہے، کہ پنڈتانی تو مر گئی ہے، کیونکہ مجھے اُس سے بہت ڈر لگتا تھا۔

(ماخوذ)

عبدالحی

قدیم ہندوستان کے زیورات

ہندوستان میں زیورات پہننے کا شوق آج سے نہیں بلکہ زمانہ قدیم سے ہے۔ اور اگر انصاف سے دیکھا جائے تو زیورات کے موجودہ طرزوں میں زمانہ قدیم کے رواج و استعمال کی جھلک اب بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً تازہ پھولوں یا بیجوں کے ہار پہننے کا شوق آج سے کئی ہزار برس پہلے بھی پایا جاتا تھا اور آج بھی پایا جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ساخت یعنی بناوٹ میں فرق ضرور ہو گیا ہے۔ لیکن ناموں میں ہنوز اُسی زمانہ کی یادگار موجود ہے۔ "چمپا کلی"، "موہن مالا" وغیرہ ناموں پر اس زاویہ سے نظر ڈالیے تو آپ پر یہ حقیقت آشکار ہو جائیگی کہ یہ نام آج سے کئی ہزار سال پہلے بھی مستعمل تھے۔ یہانتک کہ پانینی نے اپنی گرامر میں بھی ذکر کیا ہے۔

ہندوستانیوں کی طرح دنیا میں شاید ہی کوئی قوم زیورات سے اتنی محبت کرتی ہو۔ یہاں جس طرح بیوی کو نان و نفقہ دینا ایک مذہبی فرض تصور کیا جاتا ہے اُسی طرح اُسے زیورات سے آراستہ رکھنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ ایک عورت کا زیور کے بغیر رہنا منحوس نہیں تو معیوب ضرور ہے۔ وہ اپنے شوہر کے سامنے زیورات کے بغیر نہیں آتی ہاں اس کی عدم موجودگی یا اُس حالت میں جبکہ وہ سفر میں ہو عارضی طور پر "زیورات" نہ پہنے تو کوئی ہرج نہیں۔ شوہر کی موت کے بعد وہ انہیں ہمیشہ کے لیے ترک کر دیتی ہے۔

زیورات پہن کر ایک ہندوستانی عورت جو فخر و غرور محسوس کرتی ہے اس کا صحیح اندازہ اُسی کو ہو سکتا ہے جو خود عورت ہو اور اُسکی پیدائش و تربیت ہندوستان اور اس کی مخصوص روایات کے ماحول میں ہوئی ہو۔ وہی عورت جان سکتی ہے کہ قدم قدم پر پازیب کے چھم چھم کرنے۔ کان کے بُندے کو جھُلانے اور بازو بند کو چھونے سے ہندوستانی عورت کتنی خوش ہوتی ہے؟!

حال ہی میں "اردو شاعری" پر ایک مغرب دوست نقاد کی کتاب پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ موصوف کا اعتراض ہے (اور ایک حد تک بجا بھی ہے) کہ اردو شاعری میں صنائع و بدائع کا اس مبالغہ کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے کہ بسا اوقات مضمون کا حسن بڑھنے کے بجائے ماند پڑ جاتا ہے۔ اس کی مثال میں انھوں نے ہندوستانی عورتوں کے زیور پہننے کا بھی ذکر کیا ہے۔ موصوف کا کہنا یہ ہے کہ ہندوستانی عورتیں زیور کے منشاء سے بالکل واقفیت نہیں رکھتیں۔ وہ صرف بدن کے ہر عضو کو چاندی سونے سے ڈھک لینے کی خواہش رکھتی ہیں۔ چنانچہ ان کے زیورات سے اُن کی شخصیت اُبھرنے کے بجائے دب جاتی ہے۔ ایک نقاد موصوف ہی پر نہیں بلکہ بہت سے لوگ ہیں جو اُس کے "مذاق زیور" کو جاہلانہ نہیں تو طفلانہ کہتے ہیں۔ مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں یقین ہے کہ عورت اپنے زیورات کا بہت ستھرا مذاق رکھتی ہے

نقاشی اور سنگتراشی کے پرانے نمونوں کو دیکھا جائے تو ایک چیز بالخصوص نمایاں نظر آتی ہے کہ ان میں کپڑوں کے ساتھ زیورات کو دکھانے میں بڑی احتیاط اور چابکدستی سے کام لیا گیا ہے۔ اسی طرح پرانی شاعری میں بھی راجاؤں۔ ساتھیوں امراء اور عوام کے زیورات۔ محلوں اور مندروں کی آرائش کے سامان۔ ہاتھی۔ گھوڑے اور بیلوں کے ساز وغیرہ کی تفصیل کے ساتھ تصویر کشی کی گئی ہے

شمالی ہندوستان میں ایک عام رواج یہ بھی ہے کہ جنگلی درندوں مثلاً شیر۔ چیتے وغیرہ کے پنجے اور دانت لیکر سونے چاندی میں جڑاتے ہیں اور پھر انہیں تعویذ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اعتقاد یہ ہے کہ اس طرح ہر بدی بالخصوص جو درندوں سے متعلق ہو دور رہتی ہے اسلیے عام طور پر یہ تعویذ بچوں کے جسم پر کسی ہار یا بازو بند کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ ان تعویذوں کے پہننے سے بچوں میں وہی بہادری۔ ہمت اور پھرتی پیدا ہو جائیگی۔ آج بھی شکار سے شوق رکھنے والے مکانات پر شیر اور چیتے کی کھالیں رکھتے ہیں اور ہر دیکھنے والے کو بزبان خموشی اپنی بہادری کا قصہ سناتے ہیں۔ پرانے زمانے کا انسان اگر اپنے شکار کا کوئی عضو سونے چاندی میں منڈھا کر اپنی بیوی کو پہننے کے لیے دینے کا عادی رہا ہو تو کیا برائی ہوئی؟

زیورات۔ سونے چاندی ہی کے مسود سمجھے جاتے ہیں حتیٰ کہ چاند دیکھنے کے بعد سونے یا چاندی کا دیکھنا بہت ہی مبارک خیال

پایا جاتا ہے۔ ایک بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ پرانے آثار میں نہ صرف دیوتا اور مورتیاں زیورسے آراستہ نظر آتی ہیں۔ بلکہ راجہ نواب اور بہت سے راجپوت سردار بھی ہیرے جواہرات سے جڑی ہوئی پگڑی پہنے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ مغل بادشاہوں کو بالخصوص ان کا بے حد شوق تھا۔ یہ بادشاہ بہت سے موتیوں کے ہار جن کے بیچ میں یا ایک "مدور یا بیضوی آویزہ" ہوتا تھا پہنتے تھے اور مرکزی آویزہ کے اندر کوئی بہت بڑا ہیرا یا لعل ہوتا تھا۔ اکبر۔ جہانگیر اور محمد شاہ کانوں میں مُندرے پہننے کے عادی تھے۔ جہانگیر اور شاہجہاں اپنی پگڑیوں میں موتی ٹانکتے اور دوسرے بادشاہ موتی کی لڑیاں لپیٹتے تھے۔ یہ رواج آج بھی باقی ہے۔ جب کسی ریاست میں تخت نشینی کا موقع آتا ہے تو "دولت اعلیٰ" کی طرف سے اسے "خلعت" ملتا ہے یعنی عمدہ پوشاک۔ اسلحہ اور زیورات۔ بلکہ ابھی کچھ دنوں ہوئے کہ درباروں میں ریاستیں برطانوی افسروں کو بھی انہیں "مراحم خسروانہ" سے سرفراز کرتی تھیں

آج کل بھی نواب اور راجہ قیمتی قیمتی زیورات استعمال کرتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنی پگڑیوں میں کلغی لگاتے ہیں کچھ موتیوں کی لڑی۔ یا ہیرا وغیرہ ٹانک لیتے ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ زیورات کا استعمال مرد اس زمانہ میں بھی کرتے ہیں۔ اب عورتیں رہ گئیں۔ اُن کا ذکر ہی کیا خواہ غریب ہو خواہ امیر زیور کا شوق سب کو یکساں ہے۔ زیورات اس کی نظر میں اس کی دولت "استری دھن" ہیں۔ آج کل شادیوں کی فضول خرچی اور والدین کی پریشانی پر اعتراضاً رائے زنی کی جاتی ہے اور ایک لحاظ سے یہ اعتراض صحیح بھی ہے۔ مگر ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ شادی کے اخراجات کا معتد بہ حصہ لڑکی کے جہیز میں (جس میں زیور شامل ہوتا ہے) صرف ہوتا ہے۔ یہ زیورات نہ صرف شوہر کے گھر میں اُس کی عزت بڑھاتے ہیں بلکہ ضرورت کے وقت کام بھی آتے ہیں اور اس کے بعد اس کی اولاد کو منتقل ہو جاتے ہیں

پرانے زمانے میں عورت کے لیے زیورات ہر عضو کے ہوتے تھے مگر اب ان میں بیشتر اُٹھ گیے ہیں۔ سر۔ کان۔ بازو۔ گردن کلائی۔ پیر۔ غرض ہر مقام کے لیے ایک زیور ہوتا تھا۔ مثلاً سر کے لیے "ٹیک" ہوتا اس سے ورت کی بھی پہچان ہوتی۔ کانوں میں "کرن پھول" "مونی" اور "کنڈل" پہنے جاتے تھے۔ ان میں کرن پھول آج بھی باقی ہے۔ ناک کے لیے "نتھ" یا "نکلس" ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ لونگ یعنی ناک کی کیل بہت مقبول تھی اور اس کی مقبولیت کا ہنوز وہی عالم ہے۔ گردن کے لیے "پنچ مینا" اور "چندن ہار" بہت رائج تھے ان کے علاوہ بنے ہوئے تاروں اور موتیوں کے ہار بھی استعمال ہوتے تھے۔ کلائی میں "ٹوما" "پہونچی" "گوکھرو" "چمپئی" پہننے کا رواج تھا۔ ان کے ماسوا "چھلا" "انگوٹھی" "آرسی" پہننے کا شوق بھی تھا۔ قدیم ہندستان کی عورتیں پیروں میں زیورات پہننے کی بھی شائق تھیں۔ ان میں "پازیب" "سن کلا" اور رواج میں بہت مشہور تھے۔ یہ زیورات اب بھی بمبئی پریسیڈنسی کی عورتوں میں بہت مقبول ہے

آج کل جو زیورات مقبول ہیں۔ وہ قدیم زمانے کے زیورات سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ ان کی نزاکت ان کے باریک کام اور ان کے بناوٹ میں بھی عموماً مشابہت پائی جاتی ہے جس کی خاص وجہ یہ ہے عورت کی فطرت صدیاں گذر جانے کے بعد بھی ویسی ہی ہے۔ البتہ مغرب کا اثر بڑھ رہا ہے جس کی بنا پر زیورات کی ہیئت بدلتی جا رہی ہے۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ یہ نہایت قابل افسوس بات ہے کہ ہم تقلید کے سیلاب میں بہہ کر اپنی شخصی اور تمدنی خصوصیات کو بھی ضائع کرتے جا رہے ہیں۔ آج مغربی تقلید نے ہمارے زیورات کے اسٹائل میں عجیب خلل پیدا کر دیا ہے۔ وہ توازن اور تناسب جو ہندستانی زیورات کی خصوصیات تھی اب مٹتا جا رہا ہے۔ اور ڈیزائن تو بد تر ہو گیے ہیں۔ اُن سے بنانے اور بنوانے والے کے دماغی تذبذب کا پتہ چلتا ہے۔ زیادہ افسوس اس امر کا ہے کہ سودیشی تحریک بھی اس صنعت کو فروغ دینے کے لیے کچھ نہ کر سکی۔ مغربی تعلیم نے ہمارے دماغوں کو اتنا متاثر کر دیا ہے کہ ہم "نیم حکیم" ہو کر رہ گیے۔ پورے مغربی ہو نہیں سکتے۔ اور پورے ہندستانی بنگیے نہیں۔ ایک قسم کا گڑبڑ ہے جو ہماری ذہنیت پر طاری ہو گیا اور ادب۔ آرٹ۔ صنعت۔ غرض ہر مظاہر زندگی میں یہی "گڑبڑ" نظر آتا ہے

میں یہ نہیں کہتی کہ پرانے ڈیزائن پھر سے رائج کیے جائیں کیونکہ وہ اپنے دور کے ساتھ ختم ہو گیے اب اُن کے احیا سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہندستانی تمدن اور تہذیب کو سامنے رکھتے ہوئے خالص ہندستانی زیور اب بھی بنائے جا سکتے ہیں

آخر زیور کا مقصد کیا ہے؟ آرائش۔ سنگار۔ اس سلسلہ میں بھی بہت سی باتوں کا لحاظ ضروری ہے۔ مثلاً لباس کا۔ کیونکہ لباس اور زیور کا تعلق بہت ہی قریبی ہے۔ یہی دونوں مل کر بدن کے حسن کو ابھارتے اور اس کے نقائص کو دور کرتے ہیں۔ مغربی عورت کا لباس ہمارے لباس سے کہیں مختلف ہوتا ہے۔ اس کے کئی اعضا ایسے برہنہ ہوتے ہیں جسے ہندستانی عورت کبھی برہنہ کرنا گوارا نہیں کرے گی اس کے علاوہ شرم وحیا کا معیار بھی زیورات کے انتخاب میں بہت کام کرتا ہے۔ مغربی عورت سینہ تک بے لباس ہوسکتی ہے اور نظروں کو متوجہ کرنے کے لیے ایک پتلا، سنہرا ہار یا لاکٹ پہننا اس کے نزدیک کافی ہوتا ہے۔ ہندوستانی عورت اس کی تقلید میں بے لباس تو نہیں ہوسکتی مگر اکثر خواتین اُسی قسم کا ہار یا لاکٹ پہننا بڑی روشن خیالی سمجھتی ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ کتنی بڑی حماقت ہے اسی طرح اور بھی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں

زیور کا تعلق جسمانی ساخت سے بھی ہوتا ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک خاص زیور ایک عورت پر بھلا معلوم ہوتا ہے مگر دوسری پر اتنا زیب نہیں دیتا۔ اس لیے زیورات میں اپنی جسمانی اور جمالیاتی ضروریات کا لحاظ کرنا ہی دانشمندی ہے

میں ہر لحاظ سے زیور پہننے کی حامی نہیں ہوں اور یہ آج کل ہو بھی نہیں سکتا۔ مگر پرانے زمانہ کی عورتوں کو میں قابل معافی سمجھتی ہوں اس کی سب سے بڑی وجہ اُس زمانہ کے حالات تھے۔ ہندستان اس وقت زرخیز ملک تھا۔ ملک کی پیداوار ملک ہی کے لیے تھی۔ درآمد برآمد کے جھگڑے نہ تھے اور رعایا خوش حال تھی۔ مگر نہ بنک تھے نہ بنکنگ کا کوئی طریقہ تھا۔ اسی لیے چاندی سونے کی افراط سے یہی فائدہ اٹھایا جاتا تھا کہ ان کے زیور بنا لیے جائیں۔ اور زیورات کی قسمیں جتنی بھی ہوسکیں اختراع ہوتی گئیں۔ چنانچہ سر سے پیر تک زیور سے لدی ہوئی ایک عورت کو دیکھ کر یہ رائے ظاہر کی جاتی تھی کہ "فلاں کی بہو بہت خوشحال ہے" یعنی زیورات کی کثرت سے مقصود اظہار دولت ہوتا تھا۔ اضافۂ حسن کا تصور۔ زیورات کے ساتھ قدیم زمانہ میں وابستہ نہ تھا۔

اس باب میں میرا عقیدہ ہے کہ صرف پبلک جگہوں میں یعنی ان تقریبوں میں جہاں مجمع ہوتا ہوگا۔ مثلاً شادی۔ بیاہ وغیرہ ہی میں عورتیں سر سے پیر تک زیور پہن کر جاتی ہوں گی۔ گھر میں اپنے شوہر کے سامنے صرف وہی زیورات پہنتی ہوں گی جن سے ان کے خیال میں واقعی حسن میں چار چاند لگتا ہوگا۔ کیونکہ شوہر کے سوا ہندوستانی عورت اپنے حسن کی نمائش کسی غیر کے سامنے کرے گا نہ پہلے خواب دیکھتی تھی نہ اب دیکھتی ہے۔ سوائے ان مغرب زدہ لڑکیوں کے جو ہندوستان میں سانس لیتی ہیں اور لندن میں جیتی ہیں ـــ اسی لیے کسی کا یہ کہنا کہ ہندوستانی عورت زیورات پہننے کا سلیقہ نہیں رکھتی، زبردستی ہوگی ـــ اس اعتراض کے معنی یہ ہیں کہ معترض ہندستانی عورت کی فطرت سے ناواقف ہے

بیگم محمد علیخاں۔ کلکتہ

بنگالی سے

باغی کا پانچواں خط

از شاعرِ انقلاب قاضی نذرالاسلام۔ ترجمہ محمد یونس احمر

بانکوڑہ

۲۴۔ جنوری۔ وقت شام

عزیزی نورالہدیٰ!

جب تمہارا کوئی خط میرے پاس آتا ہے تو بورڈنگ میں ہڑبونگ مچ جاتی ہے اور یہاں کے نوجوان شاعر مزاج طلبا بڑی خوشی سے اسے سنتے ہیں اور کہتے ہیں تم اس شگفتہ کلی کے مانند ہو جو ابھی شبنم پاکر کھل کھلا اٹھی ہے۔ پھر یہ بات بھی سچ ہے کہ اگر تمہیں روبی بابو کی طرح تو بالا اثر دعا تو کم از کم دنیا کی آنکھوں میں تابندہ تاروں کی طرح ہمیشہ چمکتے رہوگے۔ لیکن اگر تم بہانہ مانو تو میں کہوں گا کہ تمہیں شاعر ہونا زیب نہیں دیتا بلکہ تمہیں بندر ہونا چاہئے تھا! بدقسمتی سے جس کی فطرت بندر کی طرح چلبلی ہو آخر اس کا تخیل شاعرانہ کیسے ہو سکتا ہے —— میں برابر کہتا آیا ہوں اور آج بھی کہوں گا کہ اگر تمہاری قسمت میں ادب کا شہسوار ہونا لکھا نہیں ہے تو ادب کے گاڑیبان ضرور ہوگے۔ یہ بھی کہوں گا کہ اگر تم شاعر نہیں ہوئے تو حرج نہیں بندر تو ضرور رہنا ہی ہوگا۔

لیکن میری شاعری میں کسی کو ذرہ برابر بھی کلام نہیں۔ میں نے اپنے اشعار میں آسمان کے ٹمٹمانے والے تاروں کی حقیقی روشنیاں پرو دی ہیں اور مینا بدوش آنکھوں کی مستیاں ان میں جذب کر ڈالی ہیں۔ تخیل کی سبک خرامیاں مجھ سے آنکھ مچولی کھیلتی ہیں اور چھلکتے ہوئے ساغر میں انگوری شراب کی دلفریبیاں مجھے اپنے اندر ڈبو دیتی ہیں۔ نورالہدیٰ تم کہاں اور میں کہاں ع

چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک!

دیکھو! بارش کے بڑے بڑے سنگریزے خاموش ہوگئے، فطرت کی حسین راہیں ان میں تیر رہی ہیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے دھوکا ہوتا ہے کہ جیسے ایک رقاصہ اشنان کرکے اٹھی ہے اور اس کی باریک ساری جسم میں جذب ہوکر شباب کو اور بے چین کر رہی ہے۔ اور جب ہوا کے دوش پر چھوٹے چھوٹے قطرے میرے چہرے کو نم کردیتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی دوشیزہ اپنی چکیلی سیاہ لٹوں کے پانی کو تولیہ سے خشک کر رہی ہے اور اسی کے باریک باریک سرد قطرے میری آنکھوں کے سامنے جیسے مکڑی کا جالا بُن رہے ہیں۔ پھر جب سیاہ بادلوں میں بجلیوں کا پے درپے قافلہ اپنی حسین شکل دکھاتا ہوا گذرتا ہے تو گمان ہوتا ہے کوئی نئی نویلی دلہن سہاگ رات میں یکایک گدگدی پاکر مسکرا رہی ہے —— غرض فضا کا ذرہ ذرہ نشاط و عیش میں ڈوبا ہوا ہے!

نورالہدیٰ! —— دیکھا تم نے میری شاعری! میں تمہاری طرح ادنیٰ شاعر نہیں ہوں۔ لیکن مقامِ افسوس ہے کسی نے اب تک میری قدر نہیں کی۔ یہ تو مجھے معلوم ہی ہے کہ جب میں اس دنیا میں نہیں رہوں گا اس وقت عوام الناس میری فطری شاعری کی قدر کریں گے۔ یہ سن کر شاید تم دل ہی دل میں ہنس رہے ہوگے کہ میں ہوائی قلعے تعمیر کر رہا ہوں۔ نہیں بھائی —— حقیقت یہ ہے کہ اس گونگے بہرے دیس میں بھلا شاعروں کی قدر کہاں۔ دور کیوں جاؤ ایک نمایاں مثال تمہارے سامنے ہی ہے —— روبی بابو کی شاعری کی قدر یورپ اور امریکہ والوں نے کی۔ ان لوگوں نے ان کی جتنی ہمت افزائی کی کیا ہمارے دیس نے بھی ایسا کیا۔ بھلا جو دیس غلاموں، اپاہجوں اور جاہلوں سے بھرا ہو وہاں شاعری کی قدر خاک ہوگی یہاں تو زندگی قائم رکھنے کے لیے صرف کھانا چاہیے کھانا۔ غلام ہندوستان نے اپنی خودداری تک کو چند سکے کے عوض میں فروخت کر ڈالا۔ دوسری بات

یہ بھی ہے کہ زیادہ قدر و منزلت اسی کی ہوتی ہے۔ جو دنیا داروں سے دور رہ کر اپنے خیالات کی جولانیاں دکھا رہے۔ یہ بات تو قطعی ناممکن ہے کہ دنیا داروں کے ارد گرد رہ کر کوئی مشہور ہو جائے۔

اس غلام آباد ہندستان میں جب کوئی لکھنا شروع کرتا ہے اور اس کے خیالات کسی پرچے میں شائع ہو جاتے ہیں تو لوگوں کی پیشانی پر بل پڑ جاتا ہے، حیرت سے اس کی طرف تکنے لگتے ہیں۔ کہتے ہیں اتنا بڑا چھوکرا اور قلم میں اتنی روانی۔ ناممکن بالکل ناممکن۔ اس سلسلے میں اپنا ایک واقعہ مجھے یاد آگیا۔ سنو ــــ ایک مرتبہ کسی مشہور ادبی رسالے میں میرا ایک افسانہ شائع ہوا۔ اتفاق سے میرے ایک دوست کی نظر اس پر پڑ گئی۔ اب کیا تھا ــــ میرے پاس دوڑے ہوئے آئے اور متحیر نگاہوں سے مجھے گھورنے لگے جیسے ان کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی ہو پھر بولے ــــ "لعنت ہے تمہیں: بڑے چلے افسانہ نگاری کرنے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں تمام کاغذات نذر آتش کر دیتا۔ دیکھا نور الہدیٰ اگر یہ بیوقوف ذرا بھی نہیں سوچتے کہ جس طرح آتش فشاں کے پھٹنے سے ساری مادی اشیا نکل کر بکھر جاتی ہے بالکل اسی طرح خیالات کاغذ میں پھیل جاتے ہیں۔

یہاں تک تو بیکار باتیں میں نے رقم کر ڈالیں۔ اب بتاؤ سپاہیانہ زندگی کس طرح گذر رہی ہے؟ ایسی زندگی بسر کرنے کے لیے تم جیسے آہنی انسان موزوں ہو۔ نرم چمڑے رکھنے والے کا تو شاید ایک ہی دن میں کچومر نکل جائے۔ کیوں درست ہے نا؟

کئی دن ہوئے بہن نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر مجھے برا معلوم نہ ہو تو میں محترمہ صوفیہ کے ساتھ جلد از جلد شادی کر لوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بات سن کر میرے دل کو بہت زیادہ مسرت ہوئی اور میں پھولے نہ سماتا۔ بلکہ انور کا منہ بند کرنے کے لیے یہ اچھا حربہ ہاتھ آیا تھا۔ کیونکہ جب سے اس نے میری بھابی کے ساتھ شادی کی ہے خلاف رسم اور خلاف قانون مجھے "سالا" کہہ کر ہر جگہ ہر انجمن میں ہر محفل میں لوگوں کے سامنے بے عزت کرنے سے باز نہیں آتا۔ لیکن اب چونکہ اس کی بہن سے میری نسبت پکی ہو چکی ہے اس لیے اب اس کی زبان میں بھی قفل پڑ گیا ہے۔ سنا ہے صوفیہ نہایت حسین ہے۔ اس کی میخانہ بدوش آنکھوں میں ہر وقت شراب کیف کی مستیاں لہراتی ہیں اور چال میں ہزاروں گھنگھروؤں کی جھنکاریں رقص کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے پتلے ہونٹوں کے تحت ایک سیاہ تل اور ستم توڑتا ہے بھائی۔ ایک دن کی بات ہے کہ راہ چلتے اس سے آنکھ لڑ گئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرا اٹھی تھی۔ اس دن سے آج تک اس کا وہی پاک تبسم میرے دل و جگر کے ٹکڑے کر رہا ہے نہیں معلوم جب وہ میری آنکھوں کے سامنے آئیگی تو میرا کیا حال ہوگا۔

میں نے لکھنے کو تمام باتیں لکھ دیں لیکن مجھے خوف ہے کہ تمہیں اس کے اندر دلچسپی شاید ہی معلوم ہوگی۔ تمہارے دماغ اور رگ رگ میں تو صرف انتقام، انتقام کی چنگاریاں سلگ رہی ہیں۔ تم نے اسی انتقام کی پیاس بجھانے کے لیے گھر بار کو تیاگ دیدیا۔ آہ! بھائی یقین مانو تمہارے چلے جانے کے بعد سے تمام لوگوں کے چہرے اداس ہو گئے ہیں۔ نہ گاؤں میں وہ پہلی سی دلکشی رہی اور نہ ہنسی مذاق میں وہ ظرافت۔ گاؤں اور گاؤں والے کے لیے تمہارا وجود میرے سے بھی زیادہ قیمتی تھا اور اب تو خاموشی بھیانک مرگھٹ معلوم ہوتا ہے۔ وہ بھی کیا دن تھے جب ہم ایک ساتھ کھاتے، ایک ساتھ اسکول جاتے اور ایک ساتھ گھر واپس آتے تھے۔ ان گئی گذری باتوں کو یاد کر کے کلیجہ منہ کو آتا ہے اور آنکھوں تلے تاریکیاں پھیل جاتی ہیں۔ تمہاری ظرافت اور تمہاری شیریں باتیں ایک خواب و خیال سی معلوم ہو رہی ہیں۔ کاش تم ہیں اس طرح چھوڑ کر نہ جاتے۔

جب میں تمہارے مکان میں تنہا جاتا ہوں تو بہن اور اماں دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی ہیں اور ان کی آنکھوں میں وہ نقشہ کھنچ جاتا ہے جب ہم ایک ساتھ اسکول سے گھر واپس آتے تھے۔

تمہیں شاید یاد ہوگا کہ ہم دونوں گاؤں میں "ظریف" مشہور تھے۔ اور ہماری اسی ظرافت کی وجہ سے لوگوں نے "ملا دو پیانہ" کا لقب دیدیا تھا۔ لیکن جب سے تم چلے گئے مجھے سب "ملا ایک پیانہ" کہہ کر پکارتے ہیں۔

اچھا چھوڑو ان باتوں کو ــــ بھائی نور الہدیٰ! سچ کہتا ہوں مجھے عہد ماضی کی ساری باتیں یاد آتی رہتی ہیں لیکن ہنس کر چھپانے کی کوشش کرتا ہوں تاکہ تمہیں سن کر دکھ نہ ہو۔

اب پڑھنے لکھنے سے بھی طبیعت اچاٹ ہو گئی۔ دل ہر وقت اداس اداس رہتا ہے۔ بعد ازاں کیا کہوں۔ اچھا شام ہو چلی رخصت ہوتا ہوں دیکھو مجھے بھول نا مت بھائی!

تمہارا بھائی
منور

کئی دن سے

کس دکھ میں ہوا ہے دوست ہمارے کئی دن سے
احباب بھی غمگین ہیں تمہارے کئی دن سے

کیا بات ہے؟ بھاتی نہیں کیوں صحبت یاراں؟
رہتے ہو کنارے ہی کنارے کئی دن سے

اترے ہوئے چہرے سے ہم آغوش ہے کیوں گرد؟
رخسار بھی ہیں زرد تمہارے کئی دن سے

خاکی سی نظر آتی ہے کپڑوں کی سفیدی
ہیں جسم پہ کیا سارے کے سارے کئی دن سے؟

پیراہن بدرنگ کے ٹوٹے ہوئے تکمے
کرتے ہیں خطرناک اشارے کئی دن سے

الجھے ہوئے بالوں کو میسر نہیں شانہ
پھٹکا نہیں کیوں پاس تمہارے کئی دن سے؟

ٹکرایا ہے سینے سے بھلا کون سا طوفان
ہیں تیز بہت سانسوں کے دھارے کئی دن سے

چلتی ہوئی ہر سانس میں دل بھرتا ہے سسکی
لب ہلتے نہیں کرب کے مارے کئی دن سے

یک لخت ہے موقوف وہ بحثوں کی لڑائی
جیتے کئی دن سے ہو نہ ہارے کئی دن سے

وہ ہلتے ہوئے ہونٹ جو تھے روح ظرافت
آزردۂ گفتار ہیں پیارے کئی دن سے

کیوں شانۂ تخئیل سے لیلیٰ سخن کے
گیسو بھی نہیں، تم نے سنوارے کئی دن سے؟

اصنام معانی کے قدم ہائے حسیں پر
الفاظ کے کیوں پھول نہ وارے کئی دن سے

کیا ہو گئی وہ گرمی احساس جوانی؟
انفاس ہیں کیوں سرد تمہارے کئی دن سے

کس شعلۂ سرکش نے ہے کی دل میں بغاوت؟
آنکھوں سے نکلتے ہیں شرارے کئی دن سے

کیا دل پہ پڑا بوجھ کہ مایوس نگاہیں
اٹھتی ہی نہیں شرم کے مارے کئی دن سے؟

کس ماہ رخ خلوتیِ پردہ کے غم میں
آنکھوں سے برستے ہیں ستارے کئی دن سے؟

کس منزلِ محرومیِ تقدیر میں ہو تم؟
اٹھتے نہیں کیوں پاؤں تمہارے کئی دن سے؟

کس سلسلہ میں یاس کی تکمیل ہوئی ہے؟
کیا ہو گئے سب جی کے سہارے کئی دن سے؟

پرویز خدا کے لیے اب جی کو سنبھالو
پاگل سے نظر آتے ہو پیارے کئی دن سے

منڈالے کا سوداگر

موجودہ جنگ کے پیش نظر زمانہ ایک نازک دور سے گذر رہا تھا۔ سکھ اور چین کے دن بیت گئے۔ جنگ کے جہنمی شعلے ہر جگہ بھڑک رہے تھے۔ اطمینان اور سکون والی دنیا کا ہر فرد اپنی بربادی کا ڈراؤنا خواب دیکھ رہا تھا۔ اسی دور میں منڈالے کا ایک تاجر شیخ محمد اوقاتِ فرصت میں اپنی بیش بہا پونجی کو جس کو اس نے قوت شاقہ سے حاصل کیا تھا، ہیروں اور سونے میں تبدیل کر ڈالا تاکہ جس وقت بھگڈر مچی ہو اس وقت اسے بہ آسانی اپنے وطن ہندوستان لے جاسکے۔ وہ کمر باندھے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے تیاری کا کوئی مظاہرہ نہ کیا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ جب تک صورت حال نہایت خطرناک نہ ہوجائے اس وقت تک وہ اپنی تجارت کو فروغ دیتا رہے۔ اور اپنی جائے اقامت سے علیحدہ نہ ہو۔ لیکن چند دنوں کے بعد اس نے کسی قدر عجلت سے کام لینا چاہا۔ وقت سے پہلے اُسے بھگڈر کا پڑی۔ اُسے یہ معلوم کر کے نہایت افسوس ہوا کہ اس کی ساری تیاریاں بیکار اور فضول ثابت ہوگئیں۔ راہ میں بھاگنے والوں پر آفتوں کا سیلاب ٹوٹ پڑا۔ لوٹ، مار، ڈاکہ، فساد اور عصمت دری وغیرہ جیسے سفاکانہ غیر انسانی جرائم کے واقعات آئے دن اس کے گوش گذار ہونے لگے۔ اُس کی ہمت ساتھ نہ دیتی تھی کہ اپنی اُس بیش بہا پونجی کے ساتھ سفر کرے اور خدا نخواستہ راستے میں قزاقوں جیسے درندے کی مانند ہی شکار بن جائے۔

شیخ کو جب کبھی اہم مسئلے کی گتھی سلجھانا پڑتی اور دماغی قوت کی ضرورت ہوتی تو وہ اپنے محب ہم پیشہ اور ہم وطن سلیمان سے صلاح اور مشورہ لیا کرتا اور مسئلے کو حل کرنے کی کوششیں کرتا۔ سلیمان نے تجارت سے کافی دولت حاصل کی تھی۔ حسب معمول اس مرتبہ بھی شیخ نے صلاح اور مشورہ کی غرض سے اپنے رفیق سے ملاقات کی۔ صاحب سلامت کے بعد دونوں سوداگروں نے اس اہم مسئلے اور پرخطر راہوں اور وادیوں میں انسانیت سوز مظالم پر جو قزاق اور مال و دولت کے بھوکے درندے غریب مسافر اور بھاگنے والوں پر توڑا کرتے تھے، کافی روشنی ڈالی۔

آنے والی بلاؤں کو چشم تصور سے دیکھتے ہوئے شیخ نے اپنے دوست سے دریافت کیا کہ "اس سلسلے میں تمہاری کیا رائے ہے" سلیمان نے اپنی حکمت عملی پر ناز کرتے ہوئے کہا "میرے پاس جو کچھ ہے وہ صرف مدفون خزانہ ہے۔ جب بلائیں ٹل جائیں گی تو میں واپس آکر اُنہیں نکال لوں گا" شیخ کو اس کے دقیانوسی خیالات سے سخت ناامیدی ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اپنی عقل کی تیزی سے کوئی عقلمندانہ تجویز پیش کرے گا۔ اس نے اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا "فرض کرو تم واپس نہ آئے اور بعید از امکان نہیں۔ اگر واپس آ بھی گئے اور اس خزانۂ مدفون کی شناخت نہ ہوسکی تو پھر تمہارا کیا حشر ہوگا۔ اس گفتگو کے بعد سلیمان شش و پنج میں پڑ گیا۔ اس نے شیخ سے دریافت کیا "آخر تمہارا کیا ارادہ ہے" شیخ نے جواب دیا "کاش اگر مجھے اس کا کافی علم ہوتا کہ کیا کرنا چاہئے اور کیونکر مشکلات حل ہونگی تو میں جھک مارنے کو تم تک کیوں آتا۔ ہاں ایک بات یقینی اور لازمی ہے کہ میں اپنے خزانے کو ایک احمق کی طرح دفن نہ کروں گا۔

شیخ نے گھر کی راہ لی وہ تفکرات کی دریا میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک راستے کے کونے پر ایک فقیر سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ وہ چیتھڑوں میں لپٹا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ایک ڈھول تھا۔ اس کے بائیں پاؤں کے وزنی ہونے کی وجہ سے بڑی دقتوں کے ساتھ قدم اٹھا رہا تھا۔ اور مرض فیل پا میں مبتلا تھا۔ تاجر کو ایک عمدہ تجویز سوجھی وہ کچھ سمجھ کر فقیر کے نزدیک ٹھہر گیا۔ فقیر نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہ دولتمند تاجر کی نگاہ لطف اس کے ہمدردانہ اقدام کے لیے تیار ہے ڈھول بجانا شروع کر دیا۔ تاجر نے کہا "کیا تم میرے ہمراہ (راستے کی طرف دکھاتے ہوئے جہاں اس کا مکان ہے) اتنی دور تک چل سکتے ہو۔ خدا کے نیک بندے کوشش کرو۔ میں تمہیں اچھی طرح کھلاؤں گا اور شب باشی کی جگہ بھی دونگا"۔

فقیر نے بدگمانی کی نظر سے سوداگر کو دیکھا اور ڈھول کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ احساس کرتے ہوئے کہ تاجر کو اس سے دلی ہمدردی ہے اور اُس کی مدد کو آمادہ ہے اس نے کہا "میں ایک ہندوستانی ہوں اور آپ کی تقلید کرنے کو ہر طرح تیار ہوں۔ تاجر فقیر کے شامل گھر پہنچا۔ کی وہاں بڑی آؤ بھگت کی گئی۔

تاجر نے فقیر سے سوال کیا "تم کہتے ہو کہ میں ہندوستانی ہوں تو کیا تمہاری دلی خواہش نہیں کہ تم اپنے پیارے وطن کو لوٹ جاؤ۔ فقیر نے اپنے دل کو ٹٹولنا شروع کیا کہ آیا حقیقتاً اُسے ایسی تمنا ہے یا نہیں۔ فقیر (گفتگو کرتے وقت اُس کی نگاہ بائیں پاؤں کے ورم پر گڑی تھی) "یہاں سے ہندوستان کی خشکی کی راہ نہایت تکلیف دہ اور پرخطر ہے۔ اگر میں عزم سفر کروں تو ممکن ہے کہ اپنی جان پر آبنے۔"

تاجر۔ "یہ سفر تمہارے لیے اُس وقت مضر ثابت ہوگی اگر تمہیں پاپیادہ چلنا پڑے۔ لیکن اگر کاندھوں پر تمہیں سفر کرایا جائے؟"

فقیر نے حیرت اور فرط مسرت سے تاجر کی طرف دیکھا۔

تاجر۔ "میں تم سے مذاق نہیں کر رہا ہوں واقعی میرا مصمم ارادہ ہے کہ اس تجویز کو عملی جامہ پہناؤں اس میں ایک بہت بڑے مقصد کا راز پنہاں ہے۔" ابھی تاجر کی زبان سے پورے طور سے یہ جملے ادا بھی نہ ہوئے تھے کہ فقیر نے دروازے کی راہ لی۔ تاجر نے دونوں ہاتھوں سے اسے پکڑ کر زبردستی اپنے نزدیک بٹھالیا۔ تاجر نے فقیر کو یوں مخاطب کیا "فرشتہ خصلت انسان احمق نہ بنو۔ یہ تو آپس کے فائدے کی بات ہے۔ تم میرے کام آسکتے ہو کیونکہ تمہارا بایاں پاؤں پھولا ہوا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ تم صرف ایک ہی پاؤں سے معذور ہو جس کی مجھے سخت ضرورت تھی خدا کے نیک بندے یقین کامل رکھو کہ تمہیں میں اور میرے پانچ رازداں کارندے اپنے کاندھوں پر بہ آسانی یہاں سے چاٹگام تک لیجائیں گے۔

دوسرے دن پو پھٹتے ہی منڈالے سے قریب بیس میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی ٹولی نظر آئی جو چھ آدمیوں پر مشتمل تھی۔ اور اس فقیر کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے دشوار گذار راہوں سے سفر کر رہی تھی۔ یہ چھ انسان پھٹے پرانے اور کثیف کپڑوں میں ملبوس تھے۔ فقیر میں کوئی نمایاں فرق نہ تھا کل تک جس حالت میں تھا وہی کیفیت اب بھی تھی۔ ہاں فرق تھا تو صرف اس قدر کہ دایاں پاؤں بھی کافی سوج گیا اور یہ بائیں پاؤں سے کہیں زیادہ وزنی معلوم ہونے لگا۔ دائیں پاؤں کے زخموں کی اچھی طرح مرہم پٹی کی گئی تھی۔ کپڑوں کے اوپر سے خون کے دھبے بھی نظر آرہے تھے فقیر کے ہاتھوں میں ڈھول تھا، ایسا معلوم ہورہا تھا کہ وہ بھی فقیر کے جسم اور روح کا ایک جزو ہے۔

یہ چھوٹی سی ٹولی ایک متانت کے ساتھ اپنے سفر کی منزلیں طے کر رہی تھی۔ راہگیروں کی نگاہوں میں یہ لوگ یاس و حسرت کے مجسمے نظر آرہے تھے۔ فقیر کے پاؤں، اٹھانے والے کے سینہ سے لٹکے ہوئے تھے اور بایاں پاؤں جس میں مرہم و پٹی کی گئی تھی اس کو دونوں ہاتھوں سے شیخ نے پکڑ رکھا تھا اور اُس کی اس طرح حفاظت کر رہا تھا جیسے کہ کوئی ہیرے اور جواہر بھرے تھیلے کی کیا کرتا ہے۔ جس کی بھی نگاہیں ان پر پڑتیں وہ انہیں ایک معذور درویش کا فرمانبردار اور معتقد سمجھتا اسی طرح اطمینان اور امن کی سانس لیتے ہوئے یہ لوگ دن اور رات سفر کی منزلیں جنگل اور بیابانوں کے درمیان سے قطع کر رہے تھے۔ جب یہ رہروان منزل خستہ اور چور ہو جاتے تو فقیر گا بجا کر انہیں تازہ دم کر دیا کرتا۔ آج انکا دوسرا دن تھا کہ ایک بھیانک جنگل میں قدم رکھا تھا۔ ابھی تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ ان لوگوں کو ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے روکا۔ سردار اُن کے سامنے آیا اور تلاشی لی۔ فقیر کی کثیف و غلیظ مرہم پٹی کی طرف نظر کرتے ہوئے نہایت حقیرانہ انداز سے تھوکا اور یوں ہمکلام ہوا۔ "یہ کون جہاں پناہ ہیں جن کی تم سواری بنے ہو۔" شیخ نے اول تو بعد تعظیم و تکریم اس زخمی قدم کو بوسہ دیا (جسے وہ دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے تھا) اور پھر سردار کی طرف مخاطب ہوکر کہا "یہ ہمارے پیر و مرشد ہیں اور ہم لوگوں کا عزم بیت اللہ کا ہے۔" سردار نے حکم دیا "اُسے زمین پر لٹادو اس کی زخموں کی بو سے میرا دماغ پھٹا جارہا ہے۔" ان لوگوں نے فوراً تعمیل حکم کی اور فقیر کو فرش خاک پر لٹا دیا۔ ان کو معلوم تھا کہ تلاشی لی جائے گی تلاشی کے اثنا میں فقیر نے ڈھول بجانا اور حمد گانا شروع کر دیا۔ جائزہ لاحاصل ثابت ہوا سوائے ان کوڑیوں کے جو ٹنکے پاس تھیں اور کچھ نہ نکل سکا۔ سردار نے کوڑیوں کو انکی طرف پھینکتے ہوئے تنفر کی نگاہ سے دیکھا اور کہا "میرا خیال صحیح نکلا کہ تم لوگ محض بھیک منگے ہو۔" ان کی جماعت میں سے ایک نے کہا "مجھے تو شک ہے کہ یہ بھیک منگے ہیں مگر کہیں وہ شخص جس کے پاؤں وزنی ہیں ان کا خزانچی تو نہ بنا ہوا ہو۔" ان کی باتوں نے سردار کے کان کھڑے کر دیئے۔ تیکھی اور غور کی نظروں سے فقیر کی طرف دیکھا جو اس وقت تک گانے اور بجانے میں یوں منہمک تھا کہ اسے احساس بھی نہ ہوا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔

ڈاکوؤں کے سردار نے کہا "میں اس غلاظت سے پر اور تعفن والے شیطان کے نزدیک جانا نہیں چاہتا۔" اس نے شک کرنیوالے شخص کی جانب مخاطب ہوکر "تم جاؤ اور اس کی تلاشی لو۔" وہ ڈاکو فقیر کی طرف بڑھا اور فقیر نے خوب مضبوطی کے ساتھ ڈھول کو تھام لیا گویا یہی اس کی پونجی تھی۔ ڈاکو نے اس کے چیتھڑوں کی تلاشی لیتے ہوئے کہا "مجھے تمہارے اس فقیرانہ ڈھول کی ضرورت نہیں۔" تلاشی کے وقت جتنی مرتبہ

ڈاکو کی نظریں فقیر کے بوسیدہ اور غلیظ پاؤں پر پڑتیں وہ تھوکتا رہتا۔ آخر کار تھک کر ناامید ہو گیا اور اپنے سردار کے پاس واپس آکر کہا "آپ کا خیال صحیح ہے یہ نرے بھیک منگے ہیں۔"

شیخ نے ابھی تک اطمینان کی سانس بھی نہ لی تھی کہ اس کی نظر اچانک سلیمان پر پڑی جو اپنے سر پر ایک ٹوکرا لیے ہوئے نمودار ہوا۔ فرزاق وہاں موجود تھے۔ اگر سلیمان ذرہ برابر بھی ان کو اشارہ کر دیتا تو شیخ کی ساری امیدوں پر پانی پھر جاتا۔ شیخ سلیمان کو دنیا بھر میں سب سے بڑا احمق سمجھا ہوا تھا اس نے خیال کیا کہ اس ٹوکرے میں وہ تمام ہیرے اور جواہر ہیں جنہیں زمین میں دفن کیا تھا نکال کر رکھ لیے ہیں۔ سلیمان کی نظر اب تک فتنہ و شر کے ان علمبرداروں پر نہیں پڑی تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھے شیخ کو دیکھ رہا تھا اور شیخ کے اوسان خطا کر گیے تھے۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ اتنے میں فوراً رہزن سلیمان کی طرف مخاطب ہوئے۔ آنکھیں چار ہوتے ہی سلیمان نے ٹوکرے کو سر سے اتار کر آہستہ سے نیچے رکھ دیا۔ اپنے بازو میں ایک تھیلی لٹکی ہوئی تھی اس میں سے تمرلی نکال کر وہ خاص راگ چھیڑا جس سے سانپ مست ہو جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ ٹوکرے کے ڈھکنے کو کھول دیا۔ اس میں سے ایک آن بان کے ساتھ کو بہانے سر نکالا اور سپیرے کے راگ کو سن کر جھومنے لگا۔ اس تماشے کو دیکھ کر شیخ انگشت بدنداں رہ گیا۔ اس کے جاننے کی چنداں کوشش نہ کی کہ سلیمان جیسا ایک جوہری ایک رات کیونکر پکا سپیرا بن گیا۔ ڈاکوؤں نے ان کا پیچھا چھوڑا۔ یہ لوگ اپنی منزل مقصود کی طرف روانہ ہو گیے۔

ان لوگوں نے منزل مقصود کی جستجو میں چند دنوں تک خوفناک جنگلوں وادیوں اور پہاڑوں کی خاک چھانی۔ درمیان سفر میں انتہائی تکلیف سے ان کو دوچار ہونا پڑا۔ بھوک اور پیاس کی وہ شدت اور تکلیف کہ خدا کی پناہ۔ ہنگام مسافرت میں شیخ کے ایک ساتھی نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

ان صعوبتوں کو جھیلنے کے بعد زندگی موت کے مرادف تھی مصیبتوں نے شیخ کے دل میں دولت کی الفت کو دوچند کر دیا۔ وہ اس سرمایہ کی اپنی جان سے بڑھ کر حفاظت کرنے لگا۔ فقیر حد سے زیادہ شاد و خرم تھا۔ دن بدن جس قدر وہ اپنے وطن سے نزدیک ہوتا جاتا تھا اسی قدر اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ وہ ہمہ تن ڈھول بجانے اور بھجن گانے میں مصروف رہتا۔

آخر کار کامیابی کی جھلک نظر آنے لگی شیخ کی کشتی امید ساحل مقصود سے ٹکرانے لگی۔ ہفتوں کی مسافت کی بعد شیخ اپنے چار ساتھیوں اور فقیر کے ہمراہ چاٹگام کے قرب و جوار میں پہنچا۔ یہاں سب لوگوں کو اطمینان نصیب ہوا اور دو چار دن آرام کی ٹھانی۔ دوران گفتگو میں شیخ نے (فقیر کے زخم والے پیر کو دیکھتے ہوئے) فخریہ انداز میں کہا "لیٹرے خوب احمق بنے۔ اب ہم لوگ خطرے سے محفوظ ہیں اور میرے جواہرات بھی" فقیر نے مسکراتے ہوئے کہا "میرا ڈھول بھی بچ گیا" اسی اثنا میں ایک آواز اور بھی سنائی دی "میرے سانپ بھی خطرے سے محفوظ ہیں" شیخ نے سلیمان کی آواز پہچان لی۔ بنفس نفیس متکلم کو دیکھا وہ سر پر اسی ٹوکرے کو لیے ہوئے حاضر تھا۔ شیخ نے دریافت کیا "آپ نے یہ دھج کیوں اختیار کی، آپ سپیرا کیونکر بن گیے؟" سلیمان: ایک ایک سپیرے سے جس سے میری دوکان میں ملاقات ہوئی تھی میں نے تمام چیزیں جو اس کے پاس رہتی ہیں خرید لی تھیں۔ اس کے پاس دو زہر کے بنے ہوئے سانپ تھے جو اندر سے کھوکھلے تھے۔ اس نے ٹوکرے کے ڈھکنے کو اٹھایا اور کھلونے کی قسم کے دو سانپ باہر نکالے۔

شیخ۔ "مگر بڑے وزنی معلوم ہوتے ہیں۔"

سلیمان "تو کیا سونے اور جواہر وزنی نہیں ہوتے؟"

شیخ۔ آپ نے خوب چال چلی" (دل ہی دل میں اپنے آپ کو ملامت کر رہا تھا اور سلیمان کی عقل و دانش کی داد دے رہا تھا جس کام کے لیے اس کو اتنی تکلیف اور مصیبت برداشت کرنی پڑی سلیمان نے بحسن و خوبی انجام دیا) میں بھی بوقت تمام کسی طرح اپنے مقصد میں کامیاب ہوا اس کا جملہ اختتام کو نہ پہنچا تھا کہ اس نے فقیر کے دونوں پاؤں کی پٹی کھولی۔ اس کے اندر سے ایک تھیلی نکالی جس میں قیمتی سونے اور جواہر بھرے تھے۔ دونوں پھولے نہ سماتے تھے کہ اتنے میں سلیمان نے غور اور تعجب خیز نظروں سے فقیر کی طرف دیکھا اور دریافت کیا "یہ کون ہے؟"

شیخ۔ (مسکراتے ہوئے) ایک فقیر ہے جس سے میری ملاقات مخذاہے کے ایک راستہ میں ہوئی تھی

سلیمان۔ فقیر جہنم واصل ہو اگر میری آنکھیں مجھے دھوکا نہیں دے رہی ہیں تو یہ فقیر نہیں ہے بلکہ پچ کا رخان ہے شیخ اور تک ساتھی کے قتل

سے طوطے اڑ گئے

شیخ۔ (نہایت دھیمی آواز سے) کیا آپ ہی وہ مشہور و معروف رنگون کے ملک التجار ہیں؟

پنج کار خاں نے صرف ہلکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا

شیخ۔ (حیرت کی نظر سے) آپ نے اپنی دولت کیا کی؟

پنج کار خاں نے آہستہ سے ڈھول کو اٹھایا اور اس کی رسیوں کو ڈھیلی کرنا شروع کر دیا۔ دونوں طرف کے چمڑوں کو علیحدہ کر دیا اور اندر کے خول کو دکھایا۔ خول میں رال جمے ہوئے تھے اس میں کثرت سے بیش بہا قیمتی ہیرے اور موتی چپکے ہوئے تھے۔ ان کی آب و تاب سے سب کی آنکھیں خیرہ ہو جا رہی تھیں۔

ترجمہ ایم ظہور احسن قاضی

غزل

رات اک مخصوص حسیں رقص پیمانہ ہوا
جو نہ ہونا تھا وہی اے پیر میخانہ ہوا
حسن رنگ عشق کا اس وقت دیوانہ ہوا
جب گزر کر حد سے حرف شوق افسانہ ہوا
کوئی خود بیں کوئی وقف طوف بتخانہ ہوا
اور میں دور عبودیت کا پیمانہ ہوا
زندگی میں مظہر اسرار تھا میرا وجود
موت کی آغوش میں آتے ہی افسانہ ہوا
لٹ چکی تھی دولت دیدار ہنگامہ تھا ختم
پاشکستہ جب شریک بزم جانانہ ہوا
امتحانگاہ وفا میں شعلہ ہائے شوق کا
عشق پروانہ بنا یا حسن دیوانہ ہوا
ظرف بن جاتا ہے ٹھوکر کھا کے پائے نازکی
ساغر دل اس طرح چھلکا کہ میخانہ ہوا
طنز ہی سے کیوں نہ ہو لیکن حدیث شوق میں
تم نے جو ٹکڑا لگایا جان افسانہ ہوا
جرم دل کیونکر گیا اس کی کسی کو کیا خبر
مجھ کو کب دنیا نے دیکھا جب میں دیوانہ ہوا

جرم محمد آبادی

غزل

محبت آرزومند محبت ہے۔ جہاں میں ہوں
یہی وہ حسن ہے جس کی حکومت ہے جہاں میں ہوں
کبھی تقدیر گر۔ تدبیر ہو جائے تو ہو جائے
ابھی تدبیر۔ تقدیر پر شکایت ہے۔ جہاں میں ہوں
ستم یہ ہے جوانی بھی مشقت سے گریزاں ہے
جسے کہتے ہیں جینا اک مصیبت ہے جہاں میں ہوں
کہیں یہ آرزو برہم نہ کر دے حسن بدظن کو
تمناؤں میں؟ اس کی بھی رعایت ہے جہاں میں ہوں
زباں پر نعرہ ہائے حریت رک رک کے آتے ہیں
غلامی کا گلے میں طوق لعنت ہے جہاں میں ہوں
یہاں نفسانیت پرور ہیں شیخ و برہمن دونوں
زیادہ مذہب کم آدمیت ہے جہاں میں ہوں
فروغ حسن کو حسن نظر سے اور بھڑکانا
یہی آنکھوں کی اے خواجہ سعادت ہے جہاں میں ہوں

خواجہ قدوائی

"شمع حرم"

سیدہ نواب فاطمہ جعفر صاحبہ

فروغِ جوش نہیں، آمدِ بہار نہیں
ہماری بیکسیٔ شوق کا شمار نہیں

تم آؤ آؤ نہ آؤ کہ اب ہو خود مختار
تمہارے وعدۂ رنگیں کا اعتبار نہیں

کہا جو ہم نے کہ الفت ہے ہمکو تو بولے
کہ لاکھ بار نہیں ہے نہیں ہزار نہیں

ہمارے شوق و محبت کی لاکھ دو خبریں
زمانہ لاکھ کہے انکو اعتبار نہیں

تو ہی بتا کہ بھلا کیا کریں محبت میں
نگہ پہ زور نہیں دل پہ اختیار نہیں

تمام شب ہی تڑپتے ہوئے گذرتی ہے
قسم خدا کی مرے دل کو اب قرار نہیں

نہ آئے کوئی تو تصویر بھیج دے ہم کو
خزاں ہی ہم کو بھلی ہے اگر بہار نہیں

جذبات راحت

نگاہیں رنگئی ہیں حسرتوں کا ترجمان ہو کر
ہماری بے زبانی کارفرما ہے زباں ہو کر

تمہارے لطف نے مارا مجھے نامہرباں ہو کر
زمیں نے پیس ڈالا طعنۂ حسرت آسماں ہو کر

میری خرمن کو بجلی کے لپک سے جو بچاتے تھے
انہیں نے خاک کر ڈالا ہے برق ناگہاں ہو کر

جسے نغمہ سمجھتے ہو یہ ماتم ہے تمنا دل کا
ذرا سمجھو تو کیا کہتی ہیں مجھ پر نوحہ خواں ہو کر

وہ نغمہ جن کو ہر ناشاد سن کر شاد ہوتا ہے
دماغ و دل میں وہ میرے پہنچتے ہیں فغاں ہو کر

ہزار آزادیاں صیاد ایسی قید پر صدقے
کہ میں نے پالیا سب یہاں بے خانماں ہو کر

سمائے ہیں میری آنکھوں میں جلوے دونوں عالم کے
کہاں تم چھپکے بیٹھو گے بھلا مجھ سے نہاں ہو کر

لکھا تھا خون سے میں نے جسے قاتل کے دامن پر
شفق دہرا رہی ہے وہ کہانی خونچکاں ہو کر

لیا صبر و سکوں میرا دیا دردِ جگر مجھکو
کیا برتاؤ اچھا تم نے میرے مہرباں ہو کر

خوشا قسمت کے ہر موقع معقد آزمائی کا
بسر ہو زندگی راحت کا صرف امتحاں ہو کر

راحت

خاندانی نسخہ

دریائے گنگا کے کنارے مرزاپور نام کی ایک بستی واقع ہے۔ کوئی ہزار یا پانچسو کی آبادی ہوگی۔ یہاں پر ایک ادھیڑ عمر کے حکیم صاحب بھی رہتے تھے۔ علمیت تو کچھ زیادہ نہیں ہاں تجربہ کافی تھا۔ طبابت کا کام بڑے مزے سے چل رہا تھا۔ نہ کوئی رقیب نہ کوئی حاسد۔ آس پاس کے تمام مواضع میں واحد حکیم تھے اور حکیم بھی مانے ہوئے۔ کہا گیا ہے کہ فلک ناہنجار کو کسی کی خوشحالی و کامیابی نہیں بھاتی۔ چنانچہ حکیم صاحب کو بھی اُس نے آنکھیں دکھانا شروع کر دیں۔

ایک صبح کی بات ہے کہ حکیم صاحب نماز سے فارغ ہو کر وظیفہ پڑھنے کو بیٹھے ہی تھے کہ کلو حجام ایک طرف آکر بیٹھ گیا۔ یوں تو کلو ہر روز آپ کے ہاں آتا اور بستی بھر کی تازہ بتازہ خبریں سنایا کرتا تھا۔ مگر آج اس قدر سویرے آنے کا مقصد حکیم صاحب کی سمجھ میں نہ آیا۔ تن تنہا آدمی ہونے کی وجہ سے اُس کے گھر میں کسی شخص کے بیمار ہو جانے کی بات تو ہو ہی نہیں سکتی تھی اور خود اچھا بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ خیر جو باعث بھی ہو۔ حکیم صاحب نے جلد از جلد وظیفہ ختم کر کے، آنے کی وجہ پوچھی۔

کلو نے جواب دیا۔ "حضور کوئی خاص بات تو نہیں۔ کل شام کو ہم لوگ مکھیا جی کی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک نوجوان ڈاکٹر کسی بڑے آدمی کا سفارشی خط لیکر مکھیا جی کی خدمت میں آیا اور ڈاکٹر خانہ کھولنے کی اجازت چاہی۔ مکھیا جی کو بھی بجز ہاں کر لینے کے اور کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ کیونکہ ڈاکٹر جس شخص کی سفارشی چٹھی لایا تھا وہ بہت بڑا کانگرسی نیتا (لیڈر) ہے۔ اب تو اس بستی میں ایک ڈاکٹر خانہ بھی کھل جائیگا۔ آپ تو پہلے ہی بیماروں کے کم آنے کی شاکی ہیں مریض اب تو اور بھی کم آئیں گے۔ بس آپ کو یہی اطلاع دینے آیا تھا۔

حکیم صاحب پر ایک بجلی سی گر گئی۔ مگر آپ نے جھوٹی ہنسی ہنسکر کلو میاں کو ڈھارس بندھائی کہ ہمارے جیتے جی تو اس بستی میں کسی اور حکیم یا ڈاکٹر کی حکمت نہیں چلے گی۔ چنانچہ جھٹ پٹ کپڑے بدلے اور مکھیا جی سے ملنے کے لیے روانہ ہوگئے۔

کلو سچ کہتا تھا۔ واقعی کل ایک ڈاکٹر ایک بڑے کانگرسی لیڈر کا سفارشی خط لیکر اس گاؤں میں آیا تھا اور مکھیا جی کے لیے بجز "ہاں" کرنے کے اور کوئی راہ بھی نہ تھی۔ اب انگریزوں کے بعد ہندوستان میں سب سے بڑی ہستی کانگرس کی ہے کس کی ہمت ہے کہ کوئی آدمی اُس کی یا اُس کے کسی لیڈر کی بات کو رد کر سکے۔

مکھیا جی نے حکیم صاحب کو رقعہ دکھلانے کے بعد جواب دیا۔ "حکیم صاحب میں نے منتری (سکریٹری کانگرس کمیٹی) کی بات رکھنے کے لیے ہاں ضرور کر دی ہے مگر آپ اطمینان رکھیں کہ ڈاکٹر صاحب کی ڈاکٹری اس بستی میں زیادہ دن نہیں چلے گی۔ وہ چھوکرا ہے اور دیہاتی زندگی سے بالکل بے خبر۔ کہتا ہے کہ اکثر ڈاکٹر شہروں میں دوکانیں کھولتے ہیں لیکن میں ان کے برعکس دیس کی سیوا کیلئے دیہات میں ہی دکان کھولنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ دیہات ہی ہمارے ملک کا دل ہیں۔ ان کا دکھ دور کرنا سارے ملک کا دکھ دور کرنا ہے۔ حکیم صاحب نے سیوا کا نام سن کر مکھیا جی سے کہا۔ "خیر بھائی وہ جس ارادے سے بھی آنا چاہتا ہو آئے۔ آپ صرف اِس بات کا دھیان رکھیے گا کہ بندہ اور اس کا خاندان کئی پشتوں سے آپ لوگوں کی سیوا کرتا چلا آرہا ہے۔ اب آپ لوگ کہیں اپنے پرانے سیوک کو دھکے مار کر بستی سے نکال نہ دیجئے گا۔ بس میں آپ سے یہی گذارش کرنے آیا ہوں۔" مکھیا جی نے جب بار بار حکیم صاحب کو تسلی دی تو حکیم صاحب کو کسی قدر اطمینان ہوا اور اپنے گھر لوٹ آئے۔

ڈاکٹر صاحب آئے اور بڑے طمطراق و ساز و سامان کے ساتھ آئے۔ صرف بیماریوں کے چارٹ ہی اتنے زیادہ اور اس قدر بڑے تھے کہ بھلے چنگے انسان کو بھی انہیں دیکھ کر اس بات کا یقین ہو جاتا تھا کہ اُس میں ضرور کوئی نہ کوئی بیماری ہے۔ دواؤں کی چھوٹی بڑی شیشیاں ہزاروں کی تعداد میں تھیں اور سب کی سب الماریوں میں بڑے قرینے سے سجا کر رکھی گئی تھیں۔

پہلے دو تین ہفتے تو ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں زیادہ مریض نہ آئے اور آنے والوں میں سے بھی زیادہ تر تعداد ان لوگوں کی تھی جنہیں خود حکیم صاحب نے آزمائش کیلئے بھیجا تھا۔ ہاں دیکھنے والوں کا ضرور تانتا بندھا رہتا تھا۔ بال بچے تو ہر وقت ڈاکٹر صاحب کی دوکان پر موجود اور ان کی حرکات و سکنات کا غائر نظروں سے مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ ڈاکٹر صاحب کا دواخانہ مرجع خلائق بننے لگا۔ کیونکہ ہومیو پیتھک ہونے کی وجہ سے دوائیاں ازحد

اور سستی بھی تھیں

ہمارے حکیم صاحب کو کچھ عرصہ پہلے ایک حکیم دوست نے مشورہ دیا تھا کہ میاں تھوڑی بہت ہومیوپیتھی سیکھ لو اور ایلوپیتھی کی مشہور دوائیاں بھی اپنے پاس رکھ لو کیونکہ زمانہ اور اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کا مذاق بھی بدل گیا ہے۔ اب لوگ ہمارے تنقیہ وغیرہ کو اتنا پسند نہیں کرتے۔ مگر تعصب کا برا ہو کہ حکیم صاحب کو یہ مخلصانہ مشورہ اچھا نہ لگا اور آپ نے اُسے یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ میاں خود تمہیں ہی یونانی طریقۂ علاج پسند نہیں ورنہ ایلوپیتھی اور ہومیوپیتھی کی تعریف آپ کی زبان سے کبھی نہیں نکلتی۔ جناب عالی یہ تو وہ طریقۂ علاج ہے جو ہزارہا سال سے چلا آرہا ہے اور جس میں سیکڑوں ہزاروں حکما و اطبا کے تجربات درج ہیں۔ اگر پہلے زمانوں میں یونانی طریقۂ علاج لوگوں کی صحت و تندرستی کو برقرار رکھ سکتا تھا تو اب بھی رکھ سکتا ہے کیا لوگوں کے بدن کی بناوٹ یا ساخت بھی بدل گئی ہے؟ مگر اب مخالف ڈاکٹر کو کامیاب دیکھ کر حکیم صاحب کا دل بار بار خود کو ملامت کر رہا تھا اور کہتا تھا کہ کاش اُس وقت میں نے اُس دوست کا مشورہ مان لیا ہوتا۔ اگر میں نے بھی کچھ ہومیوپیتھی سیکھ لی ہوتی تو آج اس لونڈے (ڈاکٹر) کی اس بستی میں دال نہ گلتی۔ کئی مرتبہ اُس کے دل میں آیا کہ کلکتہ وغیرہ جا کر کچھ دن ہومیوپیتھی کی تعلیم حاصل کرے لیکن بستی کو چھوڑ کر جانے میں بھی مخالفین کی ہنسی کا ڈر تھا۔ مجبوراً کتابوں ہی پر اکتفا کرنا پڑا اور ہومیوپیتھی اور ایلوپیتھی کی چند ایک کتابیں بڑے غور و خوض سے پڑھنے لگے۔

ہم پہلے بھی ذکر کر آئے ہیں کہ مرزاپور دریائے گنگا کے کنارے آباد ہے۔ دریاؤں کے کنارے کی آبادیوں میں مگرمچھوں کا آنا اور مال مویشی کا اتلاف کرنا کوئی انوکھی بات نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو تشریف لائے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ ایک مگرمچھ بھی مرزاپور میں آبرا جا اور قصبہ کے موٹے جانوروں پر اپنے ہاتھ صاف کرنے لگا۔ پہلے پہل تو لوگوں نے زیادہ توجہ مبذول نہ کی لیکن جب ایک دن ایک دودھ دینے والی جوان گائے پانی پینے کے دوران میں پانی میں گھسیٹ لی گئی تو لوگوں کو پہلی مرتبہ اس امر کا احساس ہوا کہ کوئی خطرناک مگرمچھ آگیا ہے اگر وقت پر تدارک نہ کیا گیا تو یہ موذی جانور کسی انسان کو بھی اپنے ظالم پیٹ کا شکار بنا لیگا۔ چنانچہ پنچایت بلائی گئی۔

پشت ہا پشت سے پنچایت کو اس معاملہ میں صرف اس قدر کام کرنا پڑتا تھا کہ وہ دو تین مرغیاں خرید کر کے بستی کے حکیم صاحب کی نذر کرتے اور حکیم صاحب ان مرغیوں کے پیٹ میں کوئی دوا بھر کر پانی میں چھوڑ دیتے تھے اور ان مرغیوں کو کھا لینے کے بعد مگرمچھ خود بخود پانی سے باہر نکل پڑتا، اور وہ لوگ اسے کلہاڑیاں گنڈا سے اور لاٹھیاں وغیرہ مار مار کر ہمیشہ کی نیند سلا دیتے۔ چنانچہ کچھ مرغیاں چندہ کر کے خرید لی گئیں اور لوگ انہیں ہاتھ میں لیکر حکیم صاحب کے در دولت پر حاضر ہوئے۔ مگر حکیم صاحب نے ایکے دوا دینے سے صاف انکار کر دیا۔ آپ کا عذر یہ تھا کہ جب لوگ دوسری بیماریوں کی دوائی ڈاکٹر صاحب سے لیتے ہیں تو پھر اس بیماری کی دوائی حکیم صاحب سے کیوں لینے آئے۔ یہ دوائی بھی انہیں ڈاکٹر صاحب سے لینا چاہیئے۔

پنچایت نے لاکھ منت سماجت کی مگر حکیم صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔ مجبور ہو کر سب آدمی اپنے اپنے لاٹھی ڈنڈے سنبھالے ڈاکٹر صاحب کی طرف روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب دواخانہ کے باہر آرام کرسی بچھائے بڑے غور سے کوئی ڈاکٹری کی کتاب پڑھ رہے تھے۔ پکے فرش پر لاٹھیوں کے پڑنے کی آواز سن کر پہلے تو گھبرا گئے۔ مگر لوگوں کے چہرے دیکھ کر کچھ مطمئن ہو گئے۔ جب سب کے سب چاروں طرف بیٹھ گئے تو ڈاکٹر صاحب نے کنھیا جی سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ مہاشے جی کیسے آنا ہوا؟ خیریت تو ہے!

کنھیا جی نے جواب دیا "جناب ڈاکٹر صاحب! آپ کو معلوم ہے کہ گھاٹ پر ایک مگرمچھ آگیا ہے۔ پہلے جب کبھی ایسی آفت نازل ہوتی تھی تو ہم لوگ اس کی دوائی حکیم صاحب سے لیا کرتے تھے۔ مگر اب انھوں نے یہ کہہ کر دوائی دینے سے صاف انکار کر دیا ہے کہ اس مرض کی دوا بھی آپ لوگ ڈاکٹر صاحب سے لو۔ اب ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں مہربانی فرما کر ہمیں آج ہی مگرمچھ کی دوائی دیدیجئے۔ دیر ہو جانے کی صورت میں کسی آدمی کی جان کے چلے جانے کا ڈر ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے پاس بہت سی دوائیاں تھیں لیکن مگرمچھوں کے مارنے کے لیے تو اُن کے پاس کچھ نہ تھا۔ انھوں نے آج تک یہی سن رکھا تھا کہ مگرمچھ کو گولی سے مارا جاسکتا ہے۔ بہت سوچ بچار کے بعد آپ نے جواب دیا مگرمچھ مارنا ہم لوگوں کا کام نہیں لیکن اگر آپ لوگ مُصر ہیں تو میں کسی شکاری کی خدمات حاصل کر کے مگرمچھ کو مروا دونگا۔ مگر اس کام میں کچھ دن لگیں گے۔

اس جواب کے سنتے ہی دیہاتیوں یکزبان ہو کر کہا بس رہنے دیجئے صاحب! آپ کی ڈاکٹری کا بھاؤ معلوم ہو گیا اگر آپ واقعی پڑھے

پر کسی شہر میں دوکان کھولتے۔ ہماری آپ سے اب بھی یہی گذارش ہے کہ یا تو مگرمچھ کی دوائی دیجئے یا پھر بستی کے بھولے بھالے لوگوں کا پیچھا چھوڑ کر بستی سے آج ہی کوچ کر جائیے، تاکہ ہم لوگ اپنے پرانے اچھے حکیم سے دوائی لیکر مگرمچھ کا تو جلد از جلد خاتمہ کردیں۔ ڈاکٹر صاحب لوگوں کی لال پیلی آنکھیں دیکھیں تو تھرّا اٹھے اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے بولے۔ اچھ... چھا بھ... بھائیو! اگر آپ لوگوں کی یہی مرضی تو میں چلا ہی جاؤنگا۔

دوسرے دن ادھر ڈاکٹر صاحب اپنا سامان لدوا رہے تھے اور ادھر دریا کے کنارے لوگوں کا میلا لگا ہوا تھا۔ آس پاس کی بستیوں کے لوگ ہاتھوں میں کلہاڑیاں اور ڈنڈے وغیرہ لیے ادھر ادھر نظریں دوڑا رہے تھے کہ کہیں مگرمچھ تو پانی سے باہر نہیں نکلا۔ جیسے ہی ڈاکٹر صاحب ٹھیلا روانہ ہوا ویسے ہی ایک زور کی صدا بلند ہوئی کہ لو بھائی مگرمچھ پانی سے نکل آیا ہے۔ ہوشیار ہو تیار ہو جاؤ اور سب لوگ اپنی اپنی کلہاڑیاں ڈنڈے لیکر اُس پر پل پڑے اور اس کا کام تمام کردیا۔

قارئین کرام! آپ لوگ اپنے دل ہی دل میں پوچھتے ہونگے کہ آخر وہ کونسی عجیب و غریب چیز یا دوائی ہے جسے کھا کر مگرمچھ پانی سے باہر نکل آتا ہے۔ لو سنو میں آپ کو بتلاتا ہوں۔ حکیم صاحب نے (جواب ڈاکٹر بن گیے ہیں اور اپنے بیٹے کو بھی ڈاکٹری کی تعلیم دلا رہے ہیں) ایک دن مجھے اپنا یہ خاندانی نسخہ بتلایا اور اس بات کی بھی اجازت دی کہ اُسے عام کردوں۔ کیونکہ اب انہیں اس کے چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

امید ہے کہ آپ لوگ ان بجھے چونے کے خواص سے ناواقف نہیں۔ جب اس پر پانی ڈالا جاتا ہے تو اس سے گرمی اور جوش پیدا ہوتا ہے۔ حکیم صاحب مرغیوں کی کھال میں ان بجھا چونا بھر کر دریا میں چھوڑ دیتے تھے۔ بھوکا مگرمچھ انہیں صحیح و سالم نگل جاتا۔ پیٹ میں جاتے ہی اس کے معدہ میں آگ سی بھڑک اٹھتی جسے بجھانے کے لیے وہ کافی مقدار میں پانی پی جاتا۔ مگر نتیجہ اور بھی خراب نکلتا اور وہ مجبوراً پانی سے باہر نکل بھاگتا۔ جہاں پر تاک میں بیٹھے ہوئے لوگ اُس کا کام تمام کر دیتے تھے۔

سید علی ملتانی (منشی فاضل)

وارداتِ عزیز

میرے دل میں کون اس انداز سے مستور ہے
گوشہ گوشہ خلد ساماں ذرہ ذرہ طور ہے

اے خوشا جذب تصور اے زہے تاثیر ہجر
اب کوئی نزدیک میرے ہے نہ مجھ سے دور ہے

ہم کو سب کچھ ہے گوارا زندگی بھی موت بھی
اے نگاہ ناز جاناں تجھ کو کیا منظور ہے

ہائے ری مجبوریاں زحمت کشان ہجر کی
غم ہی جی بھر کے ہیں مل جائے کب مقدور ہے

ہم وفا کرنے پہ بھی مجرم ہیں اور بدنام ہیں
وہ جفا کرنے پہ بھی مقبول ہے مشہور ہے

آج وہ کافر حسین آنکھیں بھی ہیں لبریز اشک
عشق تو مجبور تھا کیا حسن بھی مجبور ہے

جان پر جو کچھ بھی گذرے لب ہلا سکتا نہیں
عشق کی دنیا میں اے ناصح عجب دستور ہے

اٹھ چکے سب پردہ ہائے شرم روئے حسن سے
لیکن اب تک بیچ میں حائل حجاب نور ہے

ہر نظر محدود جلوہ، ہر نفس پابند شوق
عشق کو آزاد کیا کہیئے بہت مجبور ہے

اے نگاہ لطف جاناں مزاج دل نہ پوچھ
تیری اک ہلکی سی جنبش میں یہ شیشہ چور ہے

نحن اقرب پر مرا ایمان ہے لیکن عزیزؔ
اس قدر نزدیک ہونے پر بھی کوئی دور ہے

عزیزؔ بنگلوری

افسانہ نہیں

میں افسانہ نگار نہیں ہوں۔ لیکن مجھے افسانہ نگاری کا خبط ضرور ہے۔ ایک دن شام کو میں اسی جنون کے زیر اثر بالی گنج لیک (LAKE) کے کنارے ایک بنچ پر جا بیٹھا۔ ہاتھ میں چند کتابیں اور کچھ سفید کاغذ تھے۔ کتابوں کو بنچ پر رکھ کر میں سر جھکائے یہی سوچ رہا تھا کہ کیا لکھا جائے۔ لیکن دماغ تھا کہ مجھے تنہا چھوڑ کر کہیں ہوا کھانے چلا گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آیا لکھوں تو کیا لکھوں۔ میں انہی خیالات میں غرق تھا کہ سامنے والی سڑک پر ایک ٹیکسی آکر رکی۔ اور اس میں سے ایک حسینہ زرق برق ساڑی زیب تن کیے ہوئے اُتری اور ڈرائیور کو رخصت کر کے پارک میں ادھر ادھر چہل قدمی کرنے لگی۔ میں نے بھی دو ایک دفعہ اُس پر دُزدیدہ نگاہ ڈالی وہ موجودہ تہذیب کا مکمل نمونہ تھی۔ یعنی نہ سر پہ آنچل نہ رخ پر پردہ۔ ٹیڑھی مانگ۔ لبوں پہ سُرخی۔ رخساروں پر پاؤڈر۔ ناخن رنگے ہوئے۔ ایک ہاتھ میں چھتری اور دوسرے میں وینٹی بیگ (VANITY BAG) غرضیکہ پوری فیشن ایبل۔ اِس کے علاوہ شوخ اور بے باک۔ حجاب سے کوسوں دور۔ ہر ایک انداز سے مغربیت ٹپک رہی تھی۔ لیکن خدا جانے کس کا انتظار تھا کہ متلاشی نگاہیں سامنے کی تمام سڑکوں کی پیمائش کر رہی تھیں۔ سڑک پر سے گذرنے والے دل پھینک حضرات حسینہ کو دیکھتے ہی ایک آدھ ٹھنڈی سانس لیے بغیر نہ رہتے۔ ایک شریف زادے نے تو اپنی کار وہیں سڑک کے کنارے کھڑی کر دی اور وہیں چہل قدمی میں مصروف ہوگئے۔ ایک پوری ڈبیہ سگریٹ کی پھونک ڈالی۔ کئی مرتبہ چھینکے لیکن حسینہ کی طرف سے نگاہ کرم کی تائید نہ ہونے پر اپنا سا منہ لیکر چلدیئے۔ وقت بہت گذر چکا تھا۔ لیکن تا حال کوئی بھی حسینہ کی منتظر نگاہوں کو ٹھنڈک پہنچانے کا باعث نہ ہو سکا۔ آفتاب نے بھی اِس قسم کے حیا سوز نظاروں سے شرم کے مارے اپنا منہ چھپا لیا۔ اور رات کی تاریکی نے مارے غیرت کے گنہگار انسانوں کی حرکات پر آہستہ آہستہ پردہ ڈالنا شروع کر دیا تھا۔

اب اُس ماہرو کو میں نے اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ اُس نے پرے قریب آکر کہا "کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں"

میں نے کتابیں اٹھاتے ہوئے جواب دیا "بشوق"

چونکہ وقت کافی گذر گیا تھا۔ اور بلیک آؤٹ (BLACK OUT) ہونے کی وجہ سے سڑکوں پر بھی کافی روشنی نہیں تھی۔ میں نے کتابیں سنبھالیں اور وہاں سے چلنے ہی کی ٹھانی۔

میں جونہی اُٹھا اُس حسینہ نے نہایت بے تکلفی سے پوچھا "کیا میرا یہاں بیٹھنا آپ کو ناگوار گذرا ہے؟"

میں نے جواب دیا "جی بالکل نہیں۔ چونکہ وقت ہوگیا ہے اس لیے میں اب جانا ہی چاہتا ہوں"

یہ سنتے ہی وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور پوچھا "اب آپ کہاں جائیں گے"

میں نے کہا "دھرمتلہ"

اُس نے بھی دھرمتلہ ہی جانے کی خواہش ظاہر کی اور ہم دونوں وہاں سے ساتھ ہو لیے۔ تھوڑی دور آکر ایک گھوڑا گاڑی لی۔ کوچوان نے دیکھتے ہی کہا "رپن اسٹریٹ بابو۔ یا بو بہو بازار"

میں نے کہا "کمبخت ہمیں دھرمتلہ جانا ہے"

اُس نے کہا "بیٹھیے حضور۔ بیس آنے انعام ملنا چاہیئے"

خیر ہم گاڑی میں بیٹھ گئے اور حسینہ نے سلسلۂ گفتگو اس طرح شروع کیا "آپ کیا کام کرتے ہیں؟ آپ کا نام کیا ہے؟ آپ کہاں رہتے ہیں؟ یہ کتابیں کیسی ہیں؟ آپ کاغذ کیوں لیے ہوئے ہیں؟ آپ پارک میں کس دھن میں بیٹھے تھے؟" وغیرہ وغیرہ۔ میں بھی ہر ایک سوال کا ایک مختصر جواب دیتا گیا۔ اور پارک میں تنہا بیٹھنے کی وجہ یہ بتائی کہ میں کوئی افسانہ لکھنے کی غرض سے بیٹھا تھا۔ خیالات کے یکسو نہ ہونے کے علاوہ معاملات کچھ ایسے درپیش تھے کہ افسانہ کا عنوان تک بھی تجویز نہ کر سکا۔

اب اُس نے نہایت سنجیدگی سے کہا "آپ تو آپ افسانہ نویس ہیں"

میں نے دریافت کیا "محترمہ آپ کون ہیں ؟ آپ نے اپنے متعلق تو کچھ فرمایا ہی نہیں"

اُس نے میرے سوال کا جواب دیئے بغیر پوچھا "آخر وہ کون سے معاملات درپیش تھے۔ جنہوں نے آپ کے افسانہ لکھنے میں مداخلت کی"

میں نے جواباً کہا کہ "میں خیالات کی یکسوئی حاصل نہ کر سکا۔ یہی وجہ تھی کہ میں کچھ نہ لکھ سکا اور بس"

اِس مختصر سی ملاقات اور گفتگو سے ہی مجھے اُس محترمہ سے کچھ اُنس سا ہو گیا اور شاید کچھ حد تک انہیں بھی . . . . . . اسی لیے میں اُن کے متعلق کچھ اور جاننے کے لیے بہت بے چین تھا۔

اب دھرم تلہ قریب آ رہا تھا اور اُس نے دوران گفتگو میں کہا "اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو ایک افسانہ لکھنے میں مدد دے سکتی ہوں۔ میری زندگی بذات خود ایک افسانہ ہے میں آپ بیتی سناؤں گی اور آپ اُسے افسانہ تصور کر لیجئے گا" اُس کی زبان سے یہ الفاظ کچھ ایسا اثر لیکر نکلے کہ میں اُس کی آپ بیتی سننے کے لیے بے چین ہو گیا۔ لیکن دل میں یہ کھٹکا بھی تھا کہ خدا جانے اس میں کیا بھید ہے۔ وہ مجھے اپنی آپ بیتی کیوں سنانا چاہتی ہے۔ اُسے مجھ سے کیوں اتنی ہمدردی ہے کہ وہ میرا افسانہ مکمل کرانے کے لیے اس حد تک بے اختیار ہے۔

میں یہی سوچ رہا تھا کہ کوچوان بولا "بابوجی دھرم تلہ" اُس کو پیسے دیکر ہم لوگ دائیں ہاتھ کے فٹ پاتھ پر ہو گئے۔ وائٹ وے (WHITE AWAY) کمپنی سے کچھ آگے بڑھ کر غالباً گرانڈ اسٹریٹ کے موڑ پر ہی پہنچے ہونگے کہ میں نے کہا "اچھا میں رخصت چاہتا ہوں۔ یہ میرا پتہ ہے امید ہے آپ اپنی آپ بیتی روانہ فرما کر شکریہ کا موقعہ دیں گی" لیکن اُس نے بہت اصرار کیا کہ میں سامنے والی بلڈنگ کے بالائی کمرے میں رہتی ہوں۔ میرے اور میری ملازمہ کے سوا وہاں اور کوئی نہیں۔ آپ تشریف لائیے۔ جہاں تک ممکن ہو سکا آپ کو کوئی تکلیف نہ ہونے دیں گی میں بھی عرصے سے ایک ایسے آدمی کی تلاش میں تھی۔ جو میری دکھ بھری کہانی کان لگا کر سنے۔ لیکن مجھے آج سے پیشتر کبھی ایسا موقعہ نصیب نہیں ہوا کہ میں کسی کو اپنی رام کہانی سنانے کی جرات کر سکوں اور نہ ہی میں نے کسی کے دل میں یہ کہانی سننے کی خواہش محسوس کی ہے اور نہ ہی کسی نے میری سرگذشت کی بازپرس کی ہے۔

خیر میں حوصلہ کر کے اُس کے پیچھے ہو لیا اور ہم دونوں مکان کی بالائی منزل پر ایک آراستہ و پیراستہ کمرے میں داخل ہوئے۔ مجھے اُس نے سامنے کی آرام کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا اور خود اندر کپڑے بدلنے کے لیے چلی گئی۔ اُس کی واپسی پر ملازمہ کھانا لے کر آئی اور مجھے بھی بصد مجبوری اُسی میز پر کھانا کھانے پر رضامند ہونا پڑا۔ میں کھانا کھا رہا تھا۔ لیکن میری نگاہیں کمرے کی ہر ایک چیز کا معائنہ کر رہی تھیں اور دل و دماغ اس کی زندگی کے تصورات کی تصویر کشی کر رہے تھے۔ کھانے سے فراغت پاتے ہی اُس نے میری طرف سگریٹ کی ڈبیہ بڑھائی اور کہا "لیجئے آپ سگریٹ پیجئے اور میں آپ کو وہ کہانی سناتی ہوں جس کو سن کر آپ کو مجھ سے ہمدردی ہی نہیں بلکہ ممکن ہے نفرت بھی ہو جائے۔ لیکن آپ نہایت غور کے بعد یہ نتیجہ اخذ کر لیں گے کہ اس میں میرے قصور کے علاوہ زیادہ ذمہ داری اُس سوسائٹی پر ہے جو قانون قدرت کے خلاف رسم و رواج وضع کرتی ہے۔

"میں امرتسر کے ایک ڈاکٹر کی لڑکی ہوں۔ ان کا شمار شہر کے معزز ترین اشخاص میں ہے اور شہر کی اکثر انجمنوں کے سربرآوردہ ممبر ہونے کا بھی انہیں فخر حاصل ہے۔ ہم لوگ ذات پات کے لحاظ سے بھی فوقیت رکھتے ہیں۔ میری شادی جس کا مفہوم تا حال میں بھی نہ سمجھ سکی جیسا کہ سنا گیا ہے کہ میری ساتویں سالگرہ کے چند دنوں بعد ایک شریف گھرانے کے معصوم لڑکے سے ہوئی تھی لیکن شاید کمسنی کی وجہ سے مجھے اُن کے ہاں رہنے کا اتفاق نہ ہوا۔ اور میرے پتی شومئی قسمت سے شادی کے ٹھیک چھ ماہ بعد شادی کے اصلی معنوں کو سمجھے بغیر میرے ماتھے پر بیوہ ہونے کا ٹیکہ لگا کر اور ماتا پتا کو داغ مفارقت دیتے ہوئے دوسری دنیا کو سدھارے

"میرے پتی کی اِس بے وقت موت کا رنج ان کے والدین کے علاوہ ہمارے گھر میں بھی صد درجہ محسوس کیا گیا۔ اب میں بیوہ تھی لڑکپن میں لفظ "بیوہ" میری غیر معمولی توجہ کا موضوع نہ بن سکا۔ اور نہ ہی میں نے کبھی اس کی اصلیت سمجھنے کی پریشانی اٹھائی تھی۔ لیکن جوں جوں دن گذرتے گئے مجھے اِس لفظ "بیوہ" کی آہستہ آہستہ اصلیت معلوم ہونے لگی۔ نہایت غور کے بعد میں یہ محسوس کرتی تھی کہ کنبے کے ہر فرد کی نگاہیں مجھ سے کچھ حقیر ہیں اور گھر کے تمام افراد حتیٰ کہ ماں باپ تک بھی در پردہ مجھے اپنے دیگر بچوں سے ذرا حقیر خیال کرتے ہیں۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ اِس کمسنی میں بیوہ ہو جانا

میرے پچھلے جنم کے برے اعمال کا نتیجہ تھا۔ میں رات دن سوچتی لیکن سمجھ میں نہ آتا کہ آخر مجھ سے وہ کون سی غلطی سرزد ہوئی ہے جس کی بدولت مجھے دنیا کے عیش و عشرت اور ناز و نعم سے محروم رکھا جاتا تھا۔ مجھے تنہائی میں ایسا معلوم ہوتا جیسا کہ کمرے کے در و دیوار اور اس کی دیگر اشیا تک بھی میری ذات سے متنفر ہیں۔ مجھے دنیا کی مصنوعی آسائشوں کے علاوہ قدرتی آسائشوں سے بھی بے بہرہ رکھا جاتا تھا۔ میرے لیے کسی مجلس و تقریب میں بھی جانے کی اجازت نہ تھی۔ اس مہذب ملک میں ایک بیوہ کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے اور جو فرائض اُس کے سپرد کیے جاتے ہیں وہ کسی بیان کے محتاج نہیں۔

اب میری عمر چودہ برس کی تھی۔ اور مجھے اس بے بس زندگی کا احساس ہوتے صرف دو سال ہی ہوئے ہونگے۔ یہ زندگی میرے لیے بھیانک اور اس کا مستقبل نہایت تاریک تھا۔ میں اپنے بازوؤں کو اس قدر طاقتور نہ سمجھتی تھی جو زندگی کی اس ڈولتی ہوئی کشتی کو صحیح و سلامت پار لگا سکیں۔

میں اپنی عمر کی دوسری عزیز و اقربا کو دیکھتی۔ کبھی کبھی اپنی بچپن کی سہیلیوں پر نظر پڑ جاتی جس میں سے اب اکثر کی شادی ہو چکی تھی اور وہ دنیا کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ میں دل مسوس کر رہ جاتی اور سوائے اس کے کہ اپنی بدنصیبی پر دو چار آنسو بہاؤں اور کچھ نہ کر سکتی تھی۔

جیسا کہ مشہور ہے "جوانی دیوانی ہوتی ہے"، اب مجھ میں کچھ دیوانگی کے آثار نمودار ہوئے۔ مجھے ہر راستہ چلنے والے نوجوانوں سے خواہ مخواہ ایک قسم کی ہمدردی سی ہو جاتی۔ اسی گروہ میں ہمارے پڑوسی کا لڑکا پریم بھی تھا۔ یہ لوگ اچھوت تھے۔ اکثر کہا جاتا ہے۔ اچھوتوں میں حسن نہیں ہوتا۔ لیکن پریم بہت حسین تھا یا یوں سمجھیے کہ وہ اپنے میلے کچیلے کپڑوں میں بھی کم از کم مجھے ضرور حسین دکھائی دیتا تھا۔ مجھے اُس سے بھی کچھ ہمدردی سی تھی۔ وہ جب ہماری گلی میں سے گذرتا۔ میں کسی نہ کسی بہانے سے ضرور اُسے دیکھا کرتی۔ اور کبھی کبھی وہ بھی . . . . . . بدقسمتی سے جس دن اُسے نہ دیکھ پاتی اپنے دل میں کچھ اضطراب اور بے چینی سی محسوس کرتی۔ یہ نظر بازی کا کھیل آخر یہاں تک پہنچ گیا کہ ہمیں ایک دوسرے کے سامنے لب کشائی تک پہ مجبور ہونا پڑا اور ملاقاتوں کی اوقات تک مقرر ہونے لگے اور ملاقاتوں کی زیادتی نے رفتہ رفتہ محبت کی صورت اختیار کر لی۔ اور بڑھتی ہوئی محبت ہی عشق کہلاتی ہے۔

مشہور ہے "عشق اندھا ہوتا ہے اور عاشق پاگل"۔ ہم دو پاگل عشق کے اندھیرے میں اس غلطی کے مرتکب ہوئے جس کے احساس کے بعد بصد سوسائٹی کے قانون کو توڑتے ہوئے مجھے پریم سے شادی کرنے کی التجا کرنی پڑی۔ لیکن پریم کو مجھ سے محبت تو ضرور تھی۔ لیکن سماج کے رواج کو توڑنے کی جرأت نہ رکھتا تھا۔ سوسائٹی کے قانون کی آڑ میں شادی سے مجبوری ظاہر کی۔ یہ سنتے ہی میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ میری دنیا اندھیر ہو گئی۔ میں یہ سوچنے سے قاصر تھی کہ آخر کیا کروں۔ مجھے معلوم تھا کہ میرا اور اس گھر میں ٹھہرنا میرے والدین اور خاندان کے لیے نہایت بدنامی کا باعث ہوگا اور میری سیاہ کاریوں کا پردہ کھل جائیگا۔ اُسی رات کو موقعہ غنیمت سمجھتے ہوئے میں گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ اسٹیشن چند ہی منٹوں کا راستہ تھا۔ تھوڑے سے پیسے بھی پاس تھے۔ جالندھر کا ٹکٹ خریدا۔ گاڑی تیار تھی۔ چپکے سے زنانہ ڈبے میں بیٹھ گئی۔ سیٹی کی آواز آئی اور گاڑی چل دی۔ اسٹیشن کی بتیاں ایک ایک کر کے ختم ہو گئیں۔ دور شہر میں کہیں کہیں بجلی کی بتی دکھائی دیتی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں امرتسر کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہا۔ سناٹے کا عالم تھا۔ گاڑی رات کی تاریکی کو چیرتی ہوئی پوری رفتار سے اپنی منزل مقصود پر پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی اور میں سر جھکائے اسی فکر میں تھی کہ آخر جاؤں گی کہاں؟ یہ سوچتے سوچتے جالندھر آ گیا۔ ریلوے کا کوئی ملازم "جالندھر سٹی" "جالندھر سٹی" چلا رہا تھا۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ یہ جگہ میرے لیے بالکل اجنبی تھی۔ کوئی جان نہ پہچان۔ اُترنے کی ہمت نہ کر سکی۔ آخر یہی سوچ کر بیٹھ گئی کہ صبح دیکھا جائیگا۔ اسی فکر میں بیٹھے بیٹھے صبح ہو گئی۔ گاڑی دہلی کے بہت قریب پہنچ گئی تھی۔ ریلوے لائن کی دونوں طرف عالیشان عمارات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور چند ہی منٹوں میں گاڑی دہلی کے اسٹیشن پر جا رکی۔ مسافروں کی اس قدر بھیڑ تھی کہ پلیٹ فارم پر تل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ میں بہت کشمکش و پیچ کے بعد اتری۔ تمام مسافر اپنا سامان اُتارنے چڑھانے میں مصروف تھے۔ میرے پاس تو کچھ تھا ہی نہیں۔ میں نے باہر جانے کے راستے کا رخ کیا۔ ابھی دور ہی تھی کہ ٹکٹ کلکٹر بابو نے نظریں میرے چہرے پہ گاڑ دیں اور میں جونہی گیٹ کے پاس پہنچی۔ اُس نے کہا "آپ کا ٹکٹ"۔ میں نے ذرا مسکرا کر کہا "پیچھے بابو آتے ہیں" اور باہر کی طرف جنگلے کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ بابو صاحب ٹکٹ لے رہے تھے۔ اور گاہے گاہے میری طرف نظر اٹھا کر دیکھ لیتے تھے۔ غالباً اس خیال سے کہ میں کہیں چل نہ دوں یا کسی اور خیال سے دیکھ جاتیں . . . . . . اور میں موقعہ کی تاک میں تھی کہ جونہی اُن کی چوک کے میں کھسکوں۔ ایسا ہی ہوا۔ مسافروں کی بھیڑ زیادہ ہو گئی اور وہ اس قدر مشغول ہو گئے کہ میرا شاید اُنہیں خیال ہی نہیں رہا۔ اور میں جلدی سے "نو دو گیارہ" اسٹیشن سے نکلتے ہی تانگے والوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا "بیٹھیے، اِدھر آئیے"۔ "آئیے جی چاندنی چوک گھنٹہ گھر" دوسرے نے کہا "آئیے، چاوڑی چار آنے"۔ مختلف قسم کی آوازیں آ رہی تھیں اور

تھی کہ بے حس و حرکت سب کا منہ تک رہی تھی۔ اتنے میں ایک پولیس والا آیا اور اُس نے پوچھا۔ آپ کہاں جائیں گی۔ میں نے جواب دیا
"میرے ساتھی پیچھے رہ گئے ہیں۔ غالباً دوسری گاڑی سے آئیں گے۔ میں یہاں اُن کا انتظار کروں گی۔"

سپاہی نے پوچھا "کہاں رہ گئے ہیں؟"

میں نے جواب دیا "انبالہ"

وہ سوچ کر کہنے لگا "انبالہ سے آنے والی کالکا میل یہاں شام کو آئے گی۔ آپ دن بھر کہاں رہیں گی؟ اور یہ گلی کباڑی اور تانگے والے بہت بدمعاش ہوتے ہیں۔ آپ کو دن بھر پریشان کرتے رہیں گے۔ آئیے میں آپ کو محفوظ جگہ پر بٹھا دیتا ہوں۔ اور شام کو گاڑی کے وقت پر آکر اپنے ساتھیوں کو ڈھونڈ لینا۔"

میں اس قدر بھولی بھالی نہ تھی جس قدر سپاہی نے مجھے سمجھا تھا۔ میں نے اُس کی نظروں کے آئینے سے اُس کی اندرونی خواہشات کا اچھی طرح مطالعہ کر لیا تھا۔ میں گناہ کی لذت سے لطف اندوز ہو چکی تھی حجاب نے آہستہ آہستہ نفرت کی وجہ سے مجھ سے کنارہ کشی کر لی تھی۔ میرا اور کوئی ٹھکانہ بھی نہ تھا۔ اس لیے اس کے ساتھ ہو لی۔ وہ مجھے اسٹیشن سے تھوڑی دور لے جا کر ایک کمرے میں بٹھا باہر سے دروازہ بند کرتے ہوئے واپس چلا گیا۔ میں اس چھوٹے سے کمرے میں بیٹھی اپنی زندگی کی گزشتہ سیاہ کاریوں پر آنسو بہا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلنے کی آواز سنتے ہی میں نے آنسو پونچھ لیے اور اُسی سپاہی کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ اب اس نے نہایت ہمدردی سے مختلف سوالات پوچھنے شروع کیے میں کون تھی۔ کہاں سے آئی۔ کہاں جاؤں گی وغیرہ وغیرہ۔ میں اس کے ہر سوال کا جھوٹ سچ جو منہ میں آیا جواب دیتی گئی۔ ہاں اتنا ضرور بتایا کہ میرا یہاں کوئی ٹھکانہ نہیں ہے اور آپ کی اس ہمدردی کی بہت شکرگزار ہوں۔"

اُس نے تھوڑی دیر کچھ سوچنے کے بعد جواب دیا "آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کے رہنے سہنے کا خاطر خواہ بندوبست کر دوں گا۔ لیکن اس کے عوض ...."

میں اُس کا مطلب سمجھ گئی اور ایک بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ مجبوراً رضامندی ظاہر کی۔ نفسانی خواہشات کے غلام نے ہمدردی کے پردے میں اپنے جذبات کو عملی جامہ پہنایا اور دوبارہ دروازہ بند کر کے کہیں چلا گیا۔ کوئی آدھ گھنٹہ گزرا ہو گا۔ وہ ایک عمر رسیدہ لیکن شوقین مزاج عورت کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ محترمہ آکر میرے پاس بیٹھ گئی اور نہایت شستہ الفاظ اور محبت بھرے کلمات میں میرا مزاج پرسی کے بعد میری حالت پر افسوس کرنے لگی اور دوران گفتگو میں کہا "بیٹی تم میرے ہاں رہو۔ تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دوں گی۔ میری ایک ہی لڑکی تھی چند ماہ ہوئے مجھے داغ جدائی دیکر اس جہان سے رخصت ہو گئی ہے۔ تم اُس کی جیتی جاگتی تصویر معلوم ہوتی ہو۔ میں تمہیں اُسی نظر سے دیکھوں گی جس سے اپنی لڑکی کو دیکھتی تھی۔" اتنے میں کوچوان نے باہر سے آواز دی اور ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ وہاں سے روانہ ہو گئیں تھوڑی ہی دیر بعد گاڑی رُکی اور محترمہ نے "آؤ بیٹی" کہہ کر ایک زینے کا رخ کیا۔ اور میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ایک بالائی کمرے میں داخل ہوئی "یہ تمہارا ٹھکانہ ہے۔ تم اس کو اپنا ہی گھر سمجھو" کہتے ہوئے اُس نے مجھے اندرونی کمرے میں بچھے ہوئے پلنگ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں چونکہ بہت تھکاوٹ محسوس کر رہی تھی۔ پلنگ پر لیٹ گئی۔ لیٹے لیٹے اچانک میری نظر باہر کے برآمدے میں بیٹھی ہوئی تین چار نوجوان عورتوں پر پڑی جن کے بدن کا تو تو لہو کا نام نہیں۔ وہ اپنے زرد اور بے رونق چہروں کو غازہ اور دوسرے لوازمات سے بارونق بنانے میں مشغول تھیں۔ میری دھرم ماتا جس نے مجھے اپنی بیٹی کی طرح رکھنے کا وعدہ کیا تھا کمرے میں موجود نہ تھی، اور باقی عورتوں سے تعارف نہ ہونے کی وجہ سے میں کوئی بات کرنے کی جرات نہ کر سکی۔ وہ بھی میری طرف جھانک جھانک کر آپس میں بات کر رہی تھیں۔ اس حسن آرائی کے بعد اُن میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی کرسی لی اور سڑک کے بالمقابل کھڑکیوں میں جہاں سامنے سے گزرنے والے ہر ایک راہگیر کی نظر بآسانی پہنچ سکتی تھی جلوہ افروز ہو گئیں شام ہو چکی تھی۔ ہر ایک کھڑکی کے سامنے بجلی کا ایک ایک لیمپ روشن کر دیا گیا تھا جو کہ شاید ان کے مصنوعی حسن کو دوبالا کرنے کی غرض سے لگائے گئے تھے۔ یہ حالات دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ یہ میری دھرم ماتا کا مکان نہیں بلکہ عصمت فروشوں کی دوکان ہے۔ خیر میں اندر بیٹھی ہوئی یہ تمام سماں دیکھ رہی تھی، سامنے کی سڑک پر چند ایک شوقین مزاج حضرات ہمارے بالاخانہ کی طرف ٹکٹکی باندھے بے حس و حرکت کھڑے تھے

اور میری عصمت فروش بہنوں کی نگاہیں اُنہیں دعوت گناہ دے رہی تھیں۔ میری دھرم ماتا جو کہ اس جگہ ایک کامیاب ڈائرکٹریس (Directress) کی حیثیت رکھتی تھی۔ ان کو ہاتھوں سے اشارے کرنے تک کو مجبور کر رہی تھی۔ اور ان کی مجال ہی کیا تھی کہ دھرم ماتا کے حکم کی تعمیل نہ ہو۔

گھبرا رہی بھی تھی لیکن اس منزل کو تا حال نہیں پہنچی تھی۔ حالات کو دیکھ کر کسی کا یہ قول "India is proud of such women but" یعنی ہندوستان یہاں کی نسوانیت پر فخر کر سکتا ہے" مشکوک معلوم ہونے لگا۔ میں دل ہی دل میں نادم اور شرمندہ ہو رہی تھی۔ مجھے اس جگہ کی حیاسوز۔ عصمت فروشی اور اخلاق سے گری ہوئی زندگی سے نفرت ہو رہی تھی۔ باوجود ان تمام احساسات کے میں یہاں رہنے پر مجبور تھی۔ کیونکہ اس مہذب دنیا کی کوئی سوسائٹی مجھ پاپی کو پناہ نہیں دے سکتی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے مکان کے زینے پر آدمیوں کا تانتا لگ گیا اور سوسائٹی کے قانون ساز اور علمبردار حضرات جو دن کی روشنی میں اخلاق۔ آزادی انسانیت۔ قومیت۔ وطنیت اور جمہوریت کا پرچار کرتے رہتے ہیں، رات کی تاریکی کے پردے میں یکے بعد دیگرے بازاری اور فاحشہ عورتوں کے کوٹھوں پر اپنی نفسانی خواہشات کی پیاس بجھاتے نظر آتے ہیں۔ لالہ جی ہیں کہ سر تا پا کھدر پہنے ماتھے پر تلک لگائے حاضر ہیں۔ مولوی صاحب ہیں کہ اپنی نورانی داڑھی سمیت ترکی ٹوپی اور شیروانی زیب تن کیے ہوئے یہاں کی رونق بڑھا رہے ہیں۔ رائے صاحب اور خان بہادر جو کہ دن بھر گورنمنٹ اور سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں میں خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کی الجھن میں رہتے ہیں اس وقت دماغی توازن کے لیے یا مشغلے اور پاس ٹائم (Pass time) کی غرض سے ان عورتوں سے جن کی حقیقت کاغذ کے پھولوں کے مانند ہے اپنی انتہائی محبت کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں

ادھر میری دھرم ماتا جو کہ یہاں "بڑی بی" مشہور ہیں۔ میری دلجوئی میں مصروف تھیں۔ انھوں نے میرے حالات نہایت ہمدردی سے مفصل طور پر معلوم کیے اور اس کے بعد اسقاط حمل کا بندوبست کیا گیا۔ چند دنوں کی علالت کے بعد میں تندرست ہو گئی۔

اب شاید نیا شکار ہونے کی وجہ سے ہر آنے والے کی حریص نگاہیں میرے چہرے پر پڑتیں۔ اور بڑی بی باہر جا کر آہستہ سے کہہ دیتیں۔ معاف کیجیے گا یہ فلاں صاحب کی داشتہ ہیں۔ دوسرے سے کہہ دیتیں کہ برا نہ مانیے گا۔ اسے فلاں صاحب کے علاوہ کسی کے سامنے آنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر وہ سُن لینگے تو ہماری اس شہر میں گذر نہ ہو سکے گی۔ اچھا جب آپ مجبور کرتے ہیں تو میں کوشش کروں گی لیکن یاد رکھیے گا "پرائیوٹ ہے پرائیوٹ" یہ سودا آپ لوگوں کے بس کا معلوم نہیں ہوتا۔ وغیرہ وغیرہ

دو چار دن کی ہوا بندی کے بعد بڑی بی جو کہ بہلانے پھسلانے میں اپنی مثال آپ ہی تھی مجھے بھی اُسی گروہ میں شامل کرنے میں کامیاب ہو گئیں اور میں نے بھی بعد مجبوری اس زندگی کو قبول ہی کر لیا۔ شہر کے اکثر باشندے موجودہ جنگ کی بے چینی کی وجہ سے اپنے اہل و عیال کو ارد گرد کے دیہاتوں اور قصبوں میں منتقل کر چکے تھے۔ اور شہر میں فوجی سپاہیوں کی ہر وقت بھیڑ بھاڑ رہتی تھی۔ بڑی بی کی آمدنی دن دوگنی اور رات چوگنی ہو رہی تھی۔ لیکن میں اور میری ہم پیشہ بہنیں محض خورد و نوش اور جائے رہائش کی سہولت پر ہی اکتفا کیے ہوئے تھیں۔ یہی وجہ ہے بہت دنوں تک بڑی بی کا ساتھ نہ دے سکی اور آخر کار وہاں سے آکر دال منڈی بنارس میں قیام کیا اور باضابطہ قانون حکومت ہند وہاں کاروبار شروع کیا۔ لیکن میری برادری جو کہ میری آمد سے پیشتر وہاں اسی شغل میں مشغول تھی۔ میرا وہاں آنا گوارا نہ کر سکی۔ مجھے ہر طرح سے تکلیف پہنچانے کی کوشش کرتی رہی۔ میری رقیب وہاں قدیم پیشہ ہونے کی وجہ سے کچھ بارسوخ بھی تھیں۔ اس لیے مجھے مجبوراً وہاں بوریا بستر باندھنا پڑا۔ ہندوستان کے مختلف شہروں کا اسی فکر میں چکر کاٹ کر اب کلکتہ میں مقیم ہوں۔ لیکن اب میں اُسی تصویر کا دوسرا رخ پیش کر رہی ہوں وہ یہ کہ پارکوں میں جا کر گھومنا سینما ہال کے سامنے چہل قدمی کرنا۔ ریسٹورنٹ اور ہوٹلوں میں ایک پیالی چائے کے بہانے گھنٹوں بیٹھے رہنا۔ باہر سے آنیوالی مشہور گاڑیوں کے اوقات پر ایک آنہ کا پلیٹ فارم ٹکٹ لیکر اجنبی مسافروں پر ڈورے ڈالنا وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح ایک دو بھولے بھٹکے ہاتھ لگ ہی جاتے ہیں۔ اور یہی میری گذر اوقات ہے۔

یہاں آکر میرا افسانہ ختم ہوتا ہے لیکن میں آپ پر واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ میں اس فضا میں اپنے آپ کو خوش حال یا خوش نصیب نہیں سمجھتی۔ جب میں اپنے افعال پر غور کرتی ہوں۔ تو میری اپنی ضمیر مجھ پر لعنت بھیجتا ہے۔ اس میں میرا قصور ضرور ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ سوسائٹی کے بے تو اصول اور سماج کے رسم و رواج ہے جنہوں نے مجھے بے حیا زندگی بسر کرنے پر آمادہ و مجبور کیا۔

گمنام کلکتہ

راگ کھمّاج ترتالہ

بندش از محمد حسین خسرو بی۔ اے

آپ مشرقی بنگالہ کے ضلع نپارہ شہر کملہ کے ایک شریف و قدیم مسلم خاندان کے چشم و چراغ ہیں عمر قریب ۲۴ سال کی ہے۔ گریجویٹ ہیں۔ بی ایل بنگال کوآپریٹیو ڈیپارٹمنٹ کے ایک افسر ہیں شمالی ہند کی موسیقی میں ماشاء اللہ دستگاہ کامل رکھتے ہیں۔ بندش۔ ایجاد۔ اختراع میں بھی ید طولیٰ حاصل ہے۔ یہ کہنا شاید بیجا نہ ہوگا کہ گائک کے علاوہ ان کو نائک کا درجہ حاصل ہے۔ ہندی شاعری بھی ایک حد تک اچھی کر لیتے ہیں۔ اگر ان کو خسرو ئے دوراں کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ ——— ادارہ

(ٹھمری)

استائی :۔ تمرے کرم تمرے رحم برسے ہم پر سائیں تم بن کون کو پوجیں
اور سہارے کن سے مانگیں اے جگ کے پالن ہار

انترہ :۔ ہم کو چلاؤ سیدھی ڈگر پر دھو لوگن کی جو تم پھل پائے ایسے نہو
کو پتھ گامی جن پر تم بیزار اے کرپا کرن ہار

دھی نا سا ما	گی رے سا نی	سا رے سا نا	دھی پا گی ما
ت م رے ک	ر م ت م	رے ر ح م	ب ر سے -
نا دھی - نی	سا - گی رے	سا - گی گی	ما پا گی ما
ہ م - پ	ت - سا -	ین ت م	ب ن کو -
رے گا سا رے	نی سا نی سا	. رے سا نا .	نا نا نا سے
ن کو پو -	جیں - آ و	. ر س ھا .	ے - کی ن
سا رے نی سا	دھی نا گا - رے	سا - دھی نا	سا گی پا
سے ماں . گیں	آ ے ج گ	کے - پا ل	ن ھا ر
سا سا سا سا	سا رے گی رے گی	ما - ما ما	گی پا گی ما
ھ م کو ج	لا ت لو	سی - دھی ڈ	گ ر ب ر
گی گی رے گی	ماں پا گی ما	رے گا سا رے	نی سا گی رے
د ھو لو گ	ن کی جو پ	ت م پھ ل	پا ے اے -
گی نی سا	نا دھی نی سا	- سا سا رے	نی سا نا رے
سے ن ہو	کو پ ٹھ گا	- می ج ن	پ ر ت م
سا رے نی سا	دھی نا گا را	سا - دھی نا	سا گی - ما
سبے - زا ر	اے - کر -	پا - کر ر	ن ھا - ر

تیور سُر :۔ رے۔ گی۔ می۔ دھی۔ نی
کومل سُر :۔ را۔ گا۔ ما۔ دھا۔ نا

راگ "حجاز" یا "حجیج"

موسیقی جیسا لطیف فن مسلمانوں کے عہد عروج میں رئیسوں اور نوابوں کا سرمایۂ ذوق تھا۔ لیکن دولت کے جاتے ہی یہ بھی رخصت ہو گیا آج کل مسلمانوں کے متمول اور معزز طبقے میں بہت کم ہی لوگ ایسے ملیں گے جن کو اس فن سے کسی قسم کا لگاؤ ہو۔

جناب امیر الاسلام صاحب انکم ٹیکس افسر کلکتہ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ آپ اعلیٰ تعلیم یافتہ متمول اور ایک اونچے خاندان کے رکن ہونیکے باوجود فن موسیقی سے گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ موصوف ایک خوش گو شاعر بھی ہیں۔ موصوف نے جدید اردو کے لیے موسیقی پر چھوٹے چھوٹے مقالوں کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ ادارہ ممنون ہے۔

ٹھاٹھ بسنت بکھاری۔ یعنی اروہی یا چڑھاؤ:۔ سا رے گا ما پا دھا نا سا۔ اوروہی یا اُتار:۔ سا نا دھا پا ما گا رے سا (نوٹ:۔ رے گا ما دھا نا کومل پردے ہیں اور رے گا ما دھا نی پردے ہیں) وادی یا خاص سر بمنزل بادشاہ ۔ دھا۔ سمووادی سُر بمنزل وزیر۔ سا

پکڑ یا خاص تان۔ گی ما پا رے (اس تان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ ایک قسم کا بھیروں کی ہے)

کہا جاتا ہے کہ یہ راگ ان چار راگوں میں شامل ہے یعنی ۔ عراق ۔ عشاق ۔ حجاز اور حسینی

یہ راگ بھیروں اور بھیرویں کے ملاپ سے بنا ہے اس کا پورب انگ یعنی "سا رے گا ما" بھیروں کا ہے اور اتر رنگ یعنی "پا دھا نا سا" بھیرویں کا ہے۔ یہ راگ بہت کم گایا جاتا ہے

غزل

(۲) موت سی اب ہے زندگی دل کی (۱) کیسی مرجھائی ہے کلی دل کی
(۲) وہ ذرا مائل کرم جو ہوے (۱) ہمت اب حد سے بڑھ چلی دل کی
(۲) کچھ سناؤ نئی وہ کہتے ہیں (۱) ہے کہانی سنی ہوئی دل کی
(۲) سر پہ سہرا چڑھا ہے حرماں کا (۱) میری حسرت دلہن بنی دل کی
(۲) اب ہے آرام اس کی قسمت میں (۱) حد سے حالت گذر گئی دل کی
(۲) کیسے آنسو ہیں پونچھ بھی ڈالو (۱) تم نہ کرنا کہیں ہنسی دل کی
(۲) کیا جلاؤں میں پھر بجھا دوگے (۱) شمع یوں بارہا بجھی دل کی
(۲) کہتے ہیں اور کیا ہمیں کوئی ذکر (۱) جب سناتے ہو تو وہی دل کی
(۲) کیا پڑی تھی انہیں جو پوچھتے وہ (۱) بات دل ہی میں رہ گئی دل کی
(۲) دل کی دھڑکن سے بھی ہے رنج انہیں (۱) میرے مولےٰ یہ بے بسی دل کی
(۲) بندۂ بے درم ہوں وحشت کا (۱) جس نے جب بات کی کہی دل کی
(۲) ہوئی مدت کہ مٹ چکا ہے اسیر (۱) اب بھی حسرت نہیں مٹی دل کی

(نوٹ) اس غزل کو حجاز راگ میں مرقومہ ذیل نوٹیشن پر باندھا گیا ہے)

غزل۔ راگ حجاز۔ تال کہروا (ماترہ)

تالی خالی تالی سم تالی خالی تالی سم تالی خالی تالی سم

استھائی:۔ (۱) پا۔ ما گی رے سا۔ سا گی۔ ما پا دھا نا سا ۔ نا دھا پا ما گی ما ۔ ۔ ۔

مو۔ ت سی ۔ اب ہے زندگی ۔ د گی دل کی ۔ ۔ ۔

انترہ:۔ (۲) پا۔ دھا ما پا دھا نا سا۔ رے سا نا دھا پا ما۔ ما پا دھا پا ما گی ما پا رے۔ سا

سر پہ سہ را ۔ ۔ چ ڑھا ۔ ہے ۔ حر۔ ماں ۔ ۔ ۔ کا ۔ ۔

ستان

ایک رات —— ایک نقاد کی نظر میں

شالیمار پکچرس کی پیشکش ایک رات، اس وقت ریکسی اور منار میں چل رہی ہے جسے مسٹر ڈبلو زیڈ احمد نے ڈائرکٹ کیا ہے، ہدایت بھی اچھی کی، تصویر من حیث المجموع بہت اچھی ہے، اور بعض لحاظ سے نہایت، قابل تعریف

ہدایت :۔ مسٹر ڈبلو زیڈ احمد نے اس فلم میں نفسیات کا خاص طور پر لحاظ رکھا ہے۔ ہدایت میں شاذ و نادر ہی کہیں خامی پائی جائیگی، انھوں نے جس نوع تمام جزئیات کا لحاظ رکھا ہے، وہ لاریب، لائق آفریں ہے

کہانی :۔ کہانی بھی مسٹر ڈبلو زیڈ احمد ہی کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے معاشی زندگی کا خاکہ مکمل طور پر اس فلم میں جس طرح پیش کیا گیا ہے، اس لحاظ سے ایک مدت تک یہ ناموزفلوں کے دوش بدوش رکھے جانے کی مستحق ہے، کہانی نہایت دلچسپ نتیجہ خیز، اور روزمرہ کے خانگی زندگی کے واقعات سے پُر ہے، عموماً فلموں کی کہانیاں کچھ یونہی سی ہوا کرتی ہیں۔ نفسیات سے انہیں دور کا بھی لگاؤ نہیں ہوتا، اور جس زندگی کا مرقع وہ پیش کرتی ہیں۔ اصلیت سے بہت دور ہوتی ہے، ساری کہانی مزخرفات کا مجموعہ، اور تصنع کا طومار ہوا کرتی ہے۔ انجام زیادہ تر خوش آئند ہوا کرتا ہے جس میں کہانی کے تسلسل اور ربط کی بجائے عوام کے رجحان طبع کا لحاظ رکھا جاتا ہے، یعنی عوام عام طور پر ٹریجیڈی دیکھنا پسند نہیں کرتے، اس لیے ہر فلم کی کہانی کا انجام، اکثر انہی کے ذوق اور پسند کے مطابق ہوا کرتا ہے۔ اس کہانی کا انجام بھی اگرچہ نیک ہے، لیکن اس سے قصہ کے ربط اور تسلسل پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ واقعات کی کڑی دیکھتے ہوئے نتیجہ خود بخود مستنبط ہوتا ہے، زبردستی نیک نہیں بنایا جاتا۔

مکالمہ :۔ مکالمہ ملک کے مشہور ادیب مسٹر صلاح الدین کی قلمکاری کا مرہون منت ہے۔ موصوف اردو کے ایک موقر اور بلند پایہ رسالہ "ادبی دنیا" لاہور کے ایڈیٹر بھی ہیں۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے، غالباً موصوف پہلی بار مکالمہ کی تلوار لے کر فلم کے میدان میں کودے ہیں۔ اس لحاظ سے مکالمہ کی نسبت کوئی فیصلہ لگانا اپنی بدذوقی کا ثبوت دینا ہے، زیر بحث فلم کا مکالمہ نہ صرف یہ کہ نہایت، صاف، شستہ اور بامحاورہ زبان میں ہے بلکہ اس میں ایک ایسی زبان کی حلاوت پائی جاتی ہے، جو خالص اردو کہے جانے کی مستحق ہے، یہ وہ زبان ہے، جو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے اور جسے ہر طبقہ و ملت کا انسان بآسانی سمجھ لیتا ہے، نہ اس میں غیر مانوس فارسی ترکیبیں ہیں، نہ ٹھوس اور ثقیل ہندی و سنسکرت کے الفاظ، روزمرہ کی بولی ہے، اور نہایت پیاری ۔ اگر فلم ساز حضرات اسی طرح ملک کے مشہور ادیبوں کے خدمات حاصل کرتے رہا کریں تو ان کی انڈسٹری تھوڑے ہی دنوں میں بام عروج پر پہنچ جائے۔

گانے ۔ پنڈت اندرجیت شرما کے ہندی گانے ملک کے موقر اخبار و رسالوں میں اکثر شائع ہوا کرتے ہیں جسے ارباب ذوق بہت پسند کرتے ہیں، اس فلم کے گانے انہی کے تصنیف کردہ ہیں۔ گانے اپنی جگہ بالکل درست، میٹھے، اور باموقع ہیں، مگر ان کی دھن، تال اور سُر میں کوئی دلکشی نہیں پائی گئی، نہ اس کی صدابندی ہی کچھ اچھی تھی، یہ قصور گانے، اور گانے والوں کا نہیں، بلکہ میوزک ڈائرکٹر کا ہے۔ اس فلم کے گانے سامعہ کو کچھ زیادہ پسند نہ آئے، اگر اس کمزور پہلو کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی تو فلم سو فیصدی کامیاب ہوتا۔

فوٹوگرافی —— بلاشبہ نہایت اعلیٰ درجے کی ہے۔ ایسی بہترین فوٹوگرافی کسی اور پکچر میں کم دیکھنے میں آئی۔

صدابندی :۔ کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہی۔ خصوصاً گانوں کی آواز تو بالکل ہی کم سننے میں آئی۔ الفاظ صاف صاف سنائی نہیں پڑے اس مد میں یقیناً بے احتیاطی سے کام لیا گیا۔

اداکاری :۔ فلم کی کامیابی یا ناکامی، اداکاروں پر موقوف رہا کرتی ہے۔ اس لحاظ سے فلم ساز اداکاروں کے انتخاب میں بڑی جانفشانی دکھلاتے ہیں۔ ہم خوش ہیں کہ اس فلم میں اداکاروں کا انتخاب غلط نہیں کیا گیا، پرتھوی راج نے ہیرو (ڈاکٹر) کا پارٹ نہایت کامیابی سے انجام دیا، مبارک نے سیٹھ لچھمی داس کا کام بہت اچھا کیا، اسی طرح کے ان سنگھ نے راجہ بہادر ہمت سنگھ کا ایسا عمدہ

اورفطری پارٹ کیا کہ بے اختیار تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔

نینا ـــ جہاں تک ہماری یاد کام کرتی ہے، نینا نے اس فلم میں پہلی مرتبہ کام کیا ہے، لیکن اس کی اداکارانہ شان دیکھتے ہوئے ایک لمحہ کے لیے بھی دل یہ قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتا کہ یہ حسین ساحرہ پہلی دفعہ اپنی افیون طرازنہ اداکاری دکھا رہی ہے، ایک گھریلو لڑکی جو نسوانی حیا، شرم اور حجاب ہونا چاہیئے، وہ اس نے بدرجہ اتم دکھا دیا، اس کی شوخی اس کی حیا، اس کا انداز ـــ بے پناہ ـــ اس کی اداکاری ایک قیامت، اور اس کا حسن ایک سیلاب نور ہے، جو معاً دل و دماغ کو روشن کر دیتا ہے، اس کا لب و لہجہ، اس کی طرز و ادا، صاف صاف غمازی کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے کہ میری پرورش کسی اعلیٰ گھرانے میں ہوئی ہے، سچ تو یہ ہے کہ نینا اپنی فطری اداکاری کی وجہ سے فلم میں شروع سے آخر تک چھائی ہوئی ہے، اگر اس کا وجود نہ ہوتا تو ہم بلاخوف تردید یہ کہینگے کہ پوری تصویر ایک عکس بے معنی ہو کر رہ جاتی۔

ضمنی اداکاروں میں گلاب، ایچ پرکاش، ممتاز، فیروزہ، راجکماری سکلا اور دیگر ہم بھی خاص تذکرہ کے مستحق ہیں۔

اس فلم میں جو ایک بات پسند نہیں، وہ بے موقعہ گانوں کی بھرمار ہے، مگر ابھی ہندوستان کی فلم انڈسٹری اس منزل سے دور ہے جہاں معاشری تمثیلیں صرف معاشری طور پر دکھائی جاتی ہیں اور جس میں تصنع کا شائبہ تک نہیں۔ ہندوستانی پبلک کا مذاق ابھی اتنا بلند نہیں ہوا کہ وہ کسی بے گانے والے فلم کی سرپرستی کر سکیں، وہ صنعت سے بڑھ کر اپنے دل و نگاہ اور سامعہ کی غذا تلاش کرتے ہیں اور جب اس میں انہیں ناکامی ہوتی ہے، تو وہ ایسی فلموں کی کامیابی پر بھی مہر ناکامی ثبت کر دیتے ہیں۔

ا ـ ہ

نقد و نظر

شاہ نعمت اللہ ولی :- ان کی سوانح عمری اور ان کی مشہور پیشین گوئی قیامت کا بیان مع نمونہ کلام "

مرتبہ - ام - اے حفیظ صاحب - مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڈھ - قیمت ۱۴ار (راج نرائن سنگھ - درگاہ شاہ ارزاں - ڈاکخانہ ہند و بینک سے مل سکتی ہے)

ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے شاہ نعمت اللہ کا نام نیا نہیں ہے - اُن کے قصیدۂ قیامت سے ہر شخص واقف ہے - مگر کم ہی ایسے لوگ ہونگے جو شاہ صاحب کے حالات اور کمالات سے صحیح طور پر باخبر ہیں - اسی بے خبری کی وجہ سے اب تک اُن کے مروج قصیدۂ قیامت کی صحت پر بھی کبھی غور نہیں کیا گیا - ام - اے حفیظ صاحب نے یہ کتاب لکھ کر ایک بہت بڑی کمی پوری کی اور جہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق ہے مذہبی خدمت انجام دی ہے - کیونکہ اس میں محققانہ طور پر تذکروں اور تاریخوں کی چھان بین کے بعد شاہ صاحب کے مستند حالات زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی علمی اور مذہبی سرگرمیوں کو بالتفصیل بیان کیا ہے - چونکہ موصوف نے سوانح عمری کی ترتیب کے ساتھ اس کا تاریخی پس منظر بھی نمایاں کر دیا ہے اس لیے شاہ صاحب کی شخصیت کو سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی بلکہ ان کی روشنی میں ہم ایک حد تک ان کی تصنیفات کے محرکات کو بھی سمجھ لیتے ہیں - یہ کتاب علمی انداز پر تحقیق و تفحص اور حوالوں کے ساتھ لکھی گئی ہے - اس لیے نہ صرف "قصیدۂ قیامت" کے معتقدین بلکہ طالب علموں کے لیے بھی بہت مفید ہے

حفیظ صاحب نے "قصیدۂ قیامت" پر ایک علیحدہ باب میں بحث کی ہے اور ان کے اصلی قصیدہ "در اظہار لطیفے : رموزات و مکاشفات بر سبیل کنایات" کو درج کر کے بتایا ہے کہ دوسرے قصیدے بھی اُن کے نام سے منسوب ہیں مگر وہ نہ صرف الحاقی ہیں بلکہ ان میں تاریخی غلطیوں کی بھی بھرمار ہے - ہندوستانی مسلمان جس قصیدے سے زیادہ واقف ہیں ان کی نسبت مرتب موصوف کا خیال یہ ہے :-

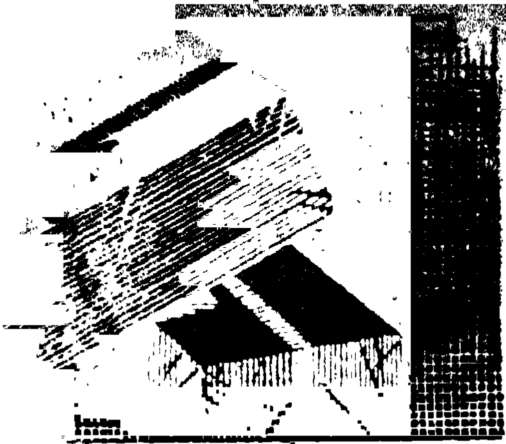
علاوہ ازیں ایک دوسرا قصیدہ بھی شاہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے جس میں سلطان مشرق کے آنے کی خبر دی گئی ہے اگرچہ یہ قصیدہ نہ تو ان کے دیوان میں پایا جاتا ہے نہ کسی تذکرہ میں اس کی طرف اشارہ ہے - شاہ کا قصیدہ جیسا آیات قرآنی و احادیث نبوی پر مشتمل ہے ویسا ہی یہ قصیدہ تاریخی غلطیوں سے لبریز ہے

راست گویم بادشاہے در جہاں پیدا شود :: نام او تیمور شد صاحب قران پیدا شود - واللہ اعلم بالصواب - و الیہ المرجع والمآب

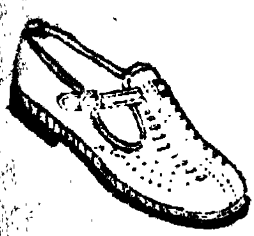
لیکن مجھے مؤلف کتاب سے اس بارے میں اتفاق نہیں کہ وہ شاہ رحمۃ اللہ علیہ کو حقیقت میں شیعہ اسمٰعیلی سمجھے ہوئے ہیں لیکن اس کا انھوں نے کوئی بین ثبوت پیش نہیں کیا ہے - بہت سارے سنی بزرگان دین ایسے بھی گذرے ہیں جو محبت و توقیر میں جناب امیر علیہ السلام سے غلو رکھتے تھے جیسے امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ - ایک جماعت صوفیوں کی ائمہ اثنا عشری کو مانے والی بھی گزری ہے اور موجود بھی ہے مثلاً حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی؟ جو خیالات سید رحمۃ اللہ علیہ کے کتاب ہذا میں پیش کیے گئے ہیں ان کی روشنی میں شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ کے فتوی کے مطابق وہ شیعہ نہیں بلکہ اہل السنت والجماعت ہی سمجھے جائینگے - دوسری قابل اعتراض بات کتاب میں یہ ہے کہ حضرت میر کلال رحمۃ اللہ علیہ پر حسد کا الزام لگایا گیا ہے - حالانکہ بہت بڑے پائے کے بزرگ گذرے ہیں اور اکثر جماعت صوفیہ عالم ان کی معتقد ہے - ایسے بزرگ کے متعلق ایسی بات بلا تحقیق دوسری کتاب سے نقل کر کے لکھ دینا بہت بڑی غلطی ہے

ادب لطیف کا افسانہ نمبر :- ترقی پسند افسانہ نگاروں کی نگارشِ جمیل کا ایک مختصر سا مرقع، ادب لطیف کے افسانہ نمبر میں پیش کیا گیا ہے، بعض افسانے اپنی نوعیت کے لحاظ سے درجہ اول میں رکھے جانے کے مستحق ہیں اور بعض ایسے ہیں جو کسی درجے میں بھی نہیں آتے - زبان اور بیان کے لحاظ سے کوئی افسانہ ایسا نہیں جو کمل معیار پر اتر سکے - لب و لہجہ میں کہ خاص دخل معلوم ہوتا ہے اور زیادہ تر افسانے اس مجلہ میں ایسے ہیں جن سے کوئی خاص نتیجہ مترتب نہیں کیا گیا - اور پس منظر کی تفصیل میں فاضل افسانہ نگاروں نے افسانے کی روح پر کوئی توجہ نہیں دی، اور نہ اس کے انجام کی طرف دھیان دیا - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ نگار افسانہ لکھتے لکھتے یکایک اس سے اکتا گیا ہے اور وہیں اسے ختم کر دیا ہے - ان باتوں سے قطع نظر یہ افسانہ نمبر اچھا ہے اور محنت کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے -

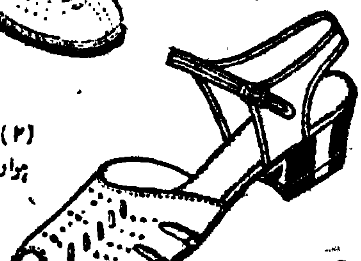
ع - ح



تہوار کے موقع پر



(۱) بچوں کے لیے اسٹراپ
والے سوراخ دار جوتے



(۲) عورتوں کے
ہوا دار سینڈل



(۳) بوٹ

Bata

تیس برس کی محنت کا نتیجہ

عید کے قبل عید کے مال اسباب مہیا کیجئے
شاید عید کے عین وقت میں بعض بعض چیزیں
نہ بھی ملیں۔

- عورتوں کی نہایت عمدہ ساڑی
- عورتوں کی بلوز
- عورتوں کی جوتیاں
- عورتوں کے پوڈر
- بالوں کے خوشبودار تیل

واصل ملاّ اینڈ سنس

TELE. READYWEAR

PHONE CAL 4078

نمبر ۸۔ وھرمتلہ اسٹریٹ کلکتہ
تعطیل جمعرات کے تمام دن اور جمعہ کو دوپہر تک

۱۱۱۔ وھرمتلہ اسٹریٹ۔ کلکتہ
تمام دن اور منگل کو دوپہر تک

REG. No. C. 2533
JADIDURDU
36, MARSDEN St. CALCUTTA

قواعد وضوابط

(۱) رسالہ ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو شایع ہوا کرے گا۔ خریداروں کو چاہئے کہ رسالہ ۱۵ تاریخ تک نہ ملنے پر دفتر سے طلب کریں

(۲) اہل قلم حضرات سے درخواست ہے کہ وہ مضامین مہینے کی ۱۵ تاریخ تک ایڈیٹر کے نام بھیجدیں

(۳) مضامین صاف اور شستہ تحریر ہوں

(۴) وہی مضمون پرچہ میں شایع ہوسکتا ہے جو معیار ادب و اخلاق سے گرا نہ ہو۔

(۵) دل آزار و فرقہ دارانہ مضامین نیز سیاسی مضامین شایع کرنا پرچہ کی پالیسی کے خلاف ہے۔

(۶) نمونہ کا پرچہ مفت نہیں بلکہ ۳؍ کا ٹکٹ آنے پر بھیجا جائیگا

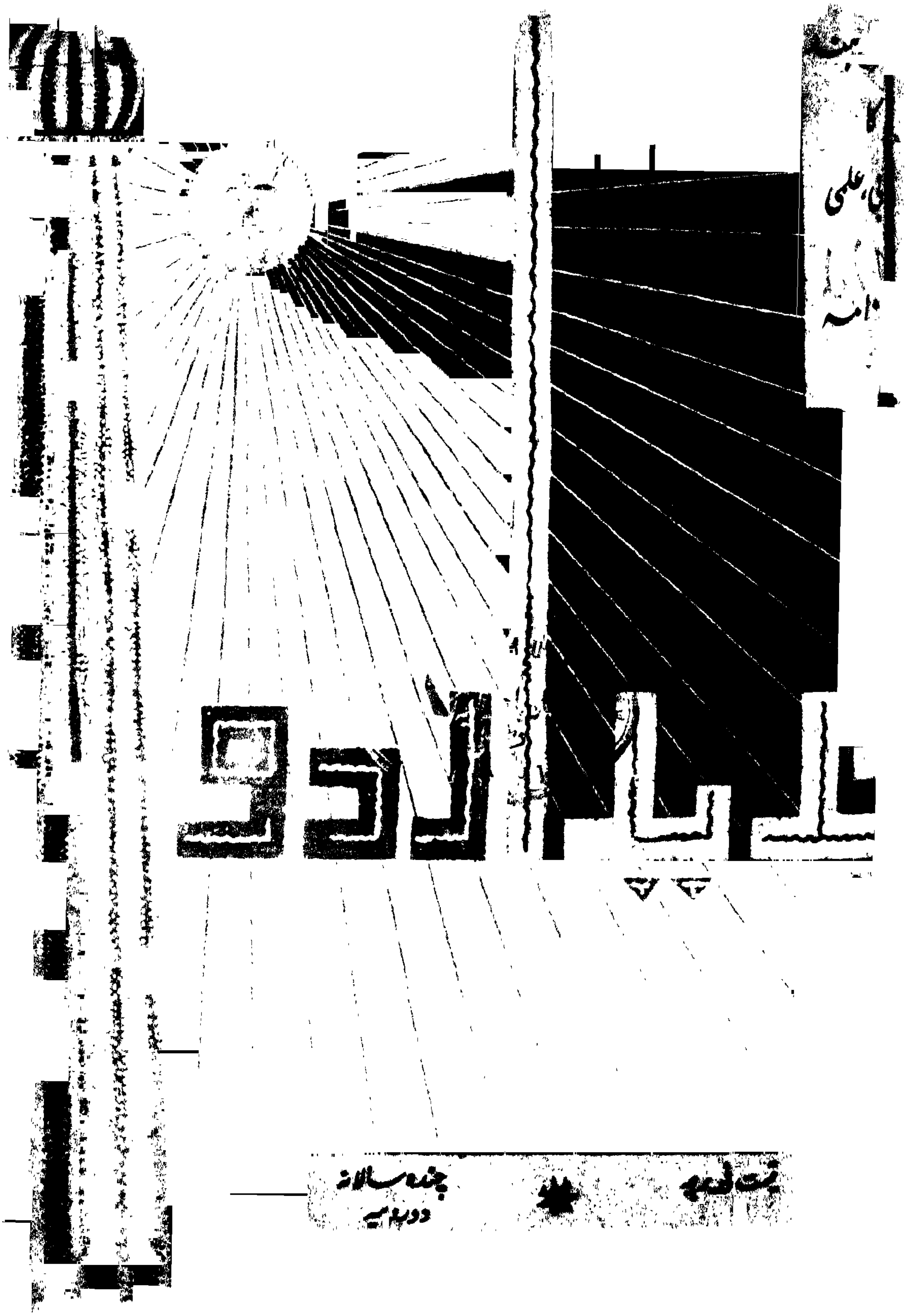
(۷) جواب کے لیے جوابی کارڈ یا اسٹامپ کا آنا ضروری ہے

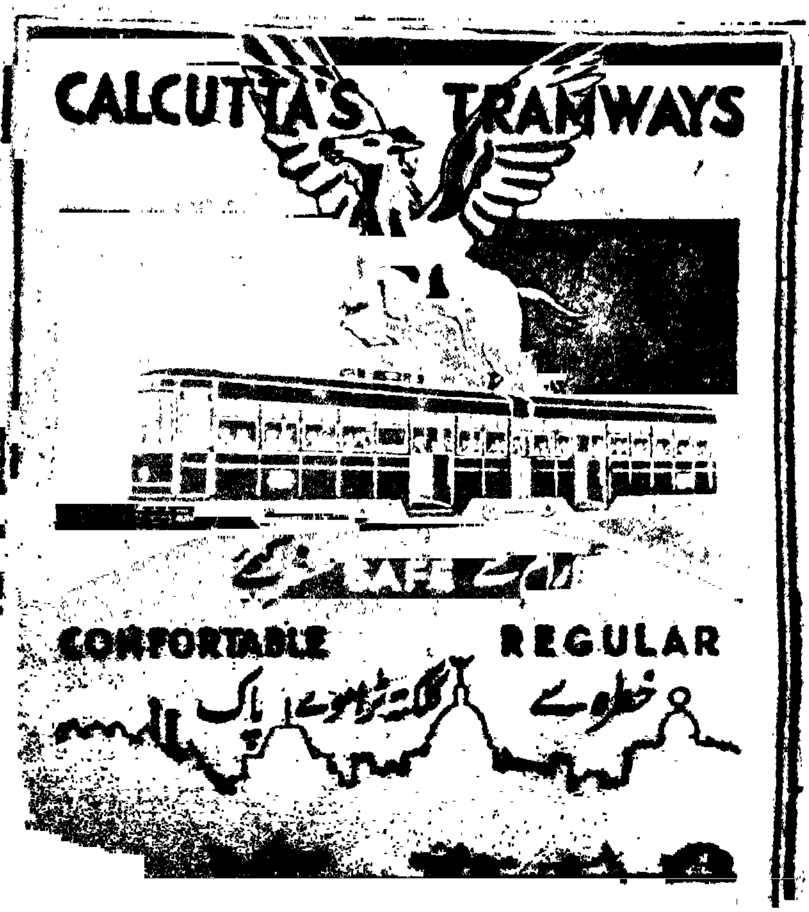
(۸) خط وکتابت و ترسیل زر کا پتہ : منیجر جدید اردو ۳۶ مارسڈن اسٹریٹ۔ کلکتہ

(۹) کاروباری حضرات اشتہار کے لیے منیجر سے خط وکتابت کریں۔

(۱۰) سالانہ چندہ صرف دو روپیہ (عـ۲) غیر ممالک کیلئے ۵ شلنگ

اے۔ جلیل۔ منیجر جدید اردو نمبر ۳۶۔ مارسڈن اسٹریٹ۔ کلکتہ


علمی
چنده سالانه



CALCUTTA'S TRAMWAYS
COMFORTABLE
REGULAR

مدیر مسئول
پرویز شاہدی
مدیر اعزازی
ایم ظہور احسن قاضی

جدید اردو کلکتہ

جنوری سنہ ۱۹۴۳ء

چندہ سالانہ دو روپیہ
" ششماہی ایک روپیہ چار آنہ
فی پرچہ ۳/

جلد ۶ | نمبر ۱

فہرست مضامین

[illegible] کلکتہ [illegible] سے شائع کیا

شذرات

کلکتہ کی بم باری:- وہ وقت نامبارک جس کا وحشت انگیز اور ہراس بدامن انتظار دسمبر ۴۱ء سے کیا جا رہا تھا، وہ لمحہ ہلاکت آفریں جس سے دوچار ہونے کے لیے کلکتہ مجبور تھا اب اپنی تمام نحوستوں اور بدشگونیوں کے ساتھ اس شہر پر بلا کی صورت میں نازل ہو گیا ہے۔ ہندوستان کے بلند آہنگ ہمدردان زرد روئے اپنی مہیب ہمدردیوں اور خونخوارانہ محبتوں سے دوسرے ملکوں، مشرقی بنگال، آسام، مدراس وغیرہ کو مستفید کرکے کلکتہ کو بھی نوازنا شروع کر دیا ہے۔

۲۰- دسمبر ۴۲ء یعنی عید قرباں کی دوسری رات کو جب یازدہ روزہ چاند اپنی دودھ جیسی سفید روشنی ہر طرف بکھیر رہا تھا۔ جس وقت جگمگاتے ہوئے تارے اپنی انفرادی تنک تابی کو فراموش کرکے دریائے نور کے خنک اور لطیف تلاطم میں ہچکولے کھا رہے تھے اسی رات کے ٹھیک دس بجنے کے بیس منٹ پر خطرے کی سیٹی نے اپنی جگر خراش آواز بلند کی، مہیب آواز کی سفاک لہریں فضا میں اپنا عفریتی رقص دکھا کر تھم گئیں۔ اس سے پہلے بھی ان سیٹیوں نے دیر تک خطروں سے آگاہ کیا تھا لیکن کبھی خطرے نے حقیقت کی صورت نہیں اختیار کی تھی۔ مگر یہ رات اپنی نوعیت میں بالکل مختلف تھی یعنی گھنٹی بجنے کے ایک گھنٹہ بعد "عروس ایشیا" اور فخر مشرق قوم کے عقابان ہلاکت نے اپنے آہنی پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے کلکتہ اور قرب وجوار شہر کو لرزہ براندام کرنا شروع کر دیا۔ بم برس برس کے پھٹنے لگے۔ لوگ سہمے ہوئے گھروں میں پناہ لیے جان کی خیر مناتے رہے۔ عید قرباں کی دعوتیں، تہنیتیں، ملاقاتیں، خوشیاں سب کی سب تہذیب وتمدن کے ماتم میں سیہ پوش ہو گئیں۔ صبح کو نقصانات کے حالات معلوم ہوئے۔ نقصانات بالکل معمولی اور ناقابل اعتنا تھے۔ دو راتیں اور بھی اسی طرح گذریں۔ چوتھی رات بے کیف تھی۔ پانچویں شب کو پھر بموں کی بارش ہونے لگی۔ ان بم باریوں نے اور کچھ ہو نہ ہو یہ تو ضرور ثابت کر دیا ہے کہ کلکتہ کے دفاعی انتظامات جاپان کے لیے ہمت شکن اور حوصلہ فرسا ثابت ہو رہے ہیں۔ راتوں کو چوروں کی طرح چھپ کر آنا اور بم برسا کر بھاگ جانا ظاہر کر رہا ہے کہ ان بہادروں کی بہادری کافی حد تک پروپیگنڈے کی رہین منت ہے۔ دن کی بمباریاں محور کے ایشیائی رکن کے لیے مفید تو کجا مضر ثابت ہوتیں۔ دوسری چیز اور بھی واضح ہو رہی ہے وہ یہ کہ تحریری اعلانوں، فضائی نشروں اور مبلغین جاپان کی تبلیغوں سے ہندوستان اور ہندوستانیوں کے لیے جو شدت ہمدردی مترشح ہوتی تھی اس کا کہیں بھی وجود نہیں۔ ہندوستانی سمجھ گئے اور اچھی طرح سمجھ گئے ہیں کہ یہ ملکوں کو نگل جانے والے بھیڑیئے ہندوستان کو بھی اسی رحم کا مستحق سمجھتے ہیں جس سے دوسرے دوسرے ملکوں کو شرف اندوز ہونے کا موقع دیتے رہے ہیں۔ کلکتہ کی بم باریوں نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ بم برسانے والے شہری آبادی کے ساتھ کوئی رعایت کرنا نہیں چاہتے۔ یہ بات بھی اب کسی ثبوت کی محتاج نہیں کہ ان کی مشہور نشانہ بازی افسانہ ہی افسانہ ہے۔ ان پیہم اور متواتر بمباریوں میں زیادہ تر نقصان شہری آبادی کا ہوا ہے اگرچہ وہ کسی توجہ کا مستحق نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ کلکتہ سے گھبرا کر لوگ بھاگنے لگے ہیں، شہر سے اسٹیشن تک پناہ خواہوں کا ایک تانتا بندھا ہوا ہے۔ گاڑیوں کی کم تعداد جب ان لوگوں کو مایوس کر دیتی ہے تو وہ پیادہ ہی روانہ ہو جاتے ہیں۔ عارضی طور پر بعض بعض ہوٹلوں اور دوکانوں کے بند ہونے اور لوگوں کے بھاگنے سے یہاں کچھ ابتری تو ضرور پھیل گئی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ چیزیں صرف ہنگامی ہیں۔ اس وقت عوام غور وفکر سے نہیں بلکہ اپنی جبلتوں سے کام لے رہے ہیں ورنہ اگر اپنے گذشتہ سال کے تلخ تجربوں کو یاد کریں تو اس طرح بھاگنے کی خرابی کسی تشریح کی محتاج نہیں رہیگی۔ دشمن بمباریوں سے کلکتہ کو ختم نہیں کر سکتے۔ یہاں دشمنوں کی فوج کسی صورت میں بھی داخل نہیں ہو سکتی۔ چند مکانوں کو منہدم کر لیں، چند جانیں برباد کر دیں لیکن جاپانی کلکتہ کو غارت نہیں کر سکتے کلکتہ کو غارت کرنے کی قیمت اُن کی پوری سلطنت ادا نہیں کر سکتی۔

اس وقت علم اخلاق اور علم النفس میں کشاکش ہو رہی ہے ادھر غلط خوف اور ہراس کا جذبہ لوگوں کے کلکتہ سے بھاگ جانے پر مجبور کر رہا ہے اور ادھر فرض کا احساس ذی شعور افراد کے پاؤں پکڑ رہا ہے۔ دیکھیے فتح کس کو ہوتی ہے۔ اخلاقی محاسن اگر نفسی انتشارات سے دب گئے تو یہ بڑی کمزوری

مفتوح و مغلوب ہوگئی۔ یہ اعصاب کی جنگ ہے۔ دشمن ہماری ہمت اور قوت ارادی پر حملے کر رہے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارا دل سپر ڈال دے۔ مجھے اور میرے جیسے اکثر لوگوں کو تو لطف آرہا ہے۔ یقین کیجئے کہ وہ تجربہ جس سے اب تک ہم لوگ محروم تھے آج اتفاق سے حاصل ہو رہا ہے۔ یہ تجربہ ہماری زندگی کی تعمیر میں کافی مدد پہنچائے گا۔ خود غرضی، بزدلی، لالچ وغیرہ جیسے ہیمانہ جذبوں کو کچل کر ہمارے کارواں ارتقا کو خود اعتمادی، دلیری اور خلق دوستی کی منزل تک لے جائے گا۔ سچ پوچھئے تو زندگی اسی کا نام ہے، ہر طرف ایک ہلچل، ہر جگہ ایک حرکت۔ سکون و جمود کی زندگی سے موت بہتر ہے۔ بس ہوا۔

اگر غم لشکر انگیزد کہ خونِ عاشقاں ریزد　　من و ساقی بہم سازیم و بنیادش بر اندازیم

جدید اردو کا مستقبل:۔ دوسرے مقاموں کے لوگ تصور نہیں کر سکتے کہ ہم لوگوں نے کسی طرح اس انتشار اور ابتری میں ماہ رواں کا رسالہ مرتب کیا۔ اس بھگدڑ نے ہم باری سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ کاغذ کی گرانی تو خیر تھی ہی اب حالات کا کیا علاج؟ ادارہ بیک وقت اور بذات خود مطبع کاتب کاغذ فروش وغیرہ بن نہیں سکتا اور لوگ ہیں کہ بھاگتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ کیا کیا جائے کچھ سمجھ میں نہیں آتا اگر حالات کی رفتار یہی رہی یا اس سے بھی کچھ زیادہ تیز ہوگئی تو جدید اردو اس مدت انتشار تک ارباب ذوق کی خدمت سے معذور رہیگا۔ ہم لوگ انتہائی کوشش سے کام رہے ہیں کہ جہاں تک بھی ممکن ہو حالات سے مغلوب نہ ہوں لیکن جب

"اس کی بھی جان جاتی ہے جس کی قضا نہ ہو"

کا عالم ہے تو پھر بھاگنے والوں کو کیونکر روکوں اور حالات پر کیسے قابو پاؤں۔ اگر اس مہینے کے بعد دوسری قسط نہ نکل سکی تو سمجھ لیجئے کہ کوئی ایسی ہی صورت حال ہوگی جس پر ہم لوگ غالب نہ آسکے ہونگے۔

پرویز شاہدی

رفتار وقت

سال ۱۹۴۲ء رخصت ہوگیا۔ لیکن بے شک و شبہ یہ سال، عالمگیر مصیبتوں، ہولناکیوں، بربادیوں اور تباہ کاریوں کا تھا۔ تا حال تاریخ عالم میں یہ سال اپنی مثال آپ پیش کر رہا ہے

۱۹۴۳ء کا آغاز ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس سال کا انجام کیا ہوگا۔ آثار تو کچھ اچھے نظر نہیں آتے۔ مصیبتوں کے دل بادل ساری دنیا پر چھائے ہوئے ہیں لوگ ڈرے ہوئے سراسیمہ اور پریشان ہیں۔ اللہ اپنا فضل کرے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہمت نہ ہاریں اور ثابت قدم رہیں اور اس بات پر یقین رکھیں کہ والعاقبۃ للمتقین

اس سال سے جدید اردو کی صحافتی زندگی کا بھی چھٹا سال شروع ہوتا ہے جو انتشار دہر اور انقلابات زمانہ سے بچتا بچا تا ۱۹۴۳ء میں قدم رکھ رہا ہے۔ اس پانچ سال کی مدت میں نہ جانے کتنی ہمت شکن مواقع پیش آئے اور کن کن دشوار گذار اور خار دار وادیوں سے بھی گذرنا پڑا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ بہت ساری مجبوریوں کے باوجود اب تک یہ رسالہ زندہ اور سلامت ہے۔ ادارہ جدید اردو اپنے اسی عزم و استقلال کے ساتھ اپنا فرض انجام دے رہا ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ارباب ذوق اس دور انتشار میں ادبی رسالوں کی نفسی اہمیت کو محسوس کرکے ہمدردی اور ادب نوازی کا ثبوت پیش کریں۔ میخانۂ روزگار میں ابتری پھیلے تو پھیلے ہماری زبان پر تو یہی ہونا چاہئے کہ:۔

ساقی بنور بادہ بر افروز جام ما　　مطرب بگو کہ کار جہاں شد بکام ما

عبد الجلیل

...وجدی

1

کون کہتا ہے کہ تدبیر لیے پھرتی ہے
ہم کو تو گردشِ تقدیر لیے پھرتی ہے

وحشتِ زلف گرہ گیر لیے پھرتی ہے
جا بجا پاؤں کی زنجیر لیے پھرتی ہے

شب کے اندھیارے میں رہتا ہے تصور جس کا
ہمیں وہ چاند سی تصویر لیے پھرتی ہے

عشق میں دشت و بیاباں پہ ہے قبضہ تیرا
قیس تجھکو تری جاگیر لیے پھرتی ہے

2

اللہ رے برق پاشیاں ان کے جمال کی
سینے آگ سی ہے برابر لگی ہوئی

اس شوخی نظر سے مجھے دیکھتے رہے
ہونٹوں پہ مسکراہٹیں چتون کھنچی ہوئی

لب ہائے احمریں پہ تبسم کی لرزشیں
بیتاب کر نہ ڈالیں یہ کلیاں کھلی ہوئی

آنے سے ان کے جھوم گئی ہے فضائے دل
کب سے تھیں فرشِ راہ میں نظریں بچھی ہوئی

نغمہ لکھنوی

غزل

غم و شادی سے بالا ہے دلِ نا آشنا میرا
زیاں و سود سے آزاد ہے ہر مدعا میرا

نمائش زہد و تقویٰ کی، پرستش جاہ و ثروت کی
یہ سب بیکار ہے، میرے لیے بس ہے خدا میرا

مسلماں حکمرانی کے لیے آیا ہے دنیا میں
کہیں شرِ عدو سے بھی دبا ہے حوصلہ میرا

بہ ظاہر کچھ نہیں ہوں پر حقیقت میں سبھی کچھ ہوں
زمانہ دیکھ لیگا خود کہ کیا ہے مرتبہ میرا

امید و بیم سے بے لاگ ہیں میری تمنائیں
کبھی شرمندۂ معنی نہ ہوگا مدعا میرا

مسلمانو یہ کشتی ہے حوادث کے تھپیڑوں میں
خدا سمجھے اگر اب بھی نہ سمجھا ناخدا میرا

مسلمانوں کی دنیا میں تلاطم ہے، تصادم ہے
خدا ہی جانتا ہے کیا کریگا رہنما میرا

میں اپنے جذبِ دل سے فتنۂ شر کو مٹا دونگا
میں دنیا کو دکھا دونگا جو کچھ ہے معجزہ میرا

تقدس میں ترے، زاہد ریاکاری بھی شامل ہے
خودی کا بت ترے دل میں ہی اور لب پر خدا میرا

مظفر شوکتِ اسلام کا حامی ہوں عالم میں
مسلماں کی حکومت پھر ہو، یہ ہے مدعا میرا

مظفر الدین

عیدری یونین کلکتہ

کے

نویں جلسہ میں کمیٹی کے صدر عالیجناب لفٹنٹ کرنل نواب عبدالکریم خاں عرف پرنس دلن کی

صدارتی تقریر

نواب عبدالکریم خاں عرف پرنس دلن برادر والئی ریاست رام پور کا اسم گرامی ہندوستان میں کسی مزید تعارف کا محتاج نہیں۔ نواب صاحب کی بلندی ذوق کا ثبوت وہ ادبی صحبتیں ہیں جو ان کی سرپرستی میں اکثر رام پور میں منعقد ہوا کرتی تھیں کلکتہ کا آل انڈیا مشاعرہ منعقدہ ۱۳ جنوری ۱۹۴۱ء اپنا ایک تاریخی نقش چھوڑ گیا ہے۔ جن لوگوں کو موقع ملا ہے کہ نواب صاحب کو قریب سے دیکھیں وہ جانتے ہیں کہ آپ میں خلق، انکسار اور ادبی ذوق کہاں تک ہے

عیدری یونین کمیٹی کے افراد مبارکباد کے مستحق ہیں کہ صدر کیلئے ان کی نظر انتخاب نواب صاحب پر پڑی۔

جناب صدر، معزز حاضرین و مہمانان محترم:

عیدری یونین کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ اپنی اور کمیٹی کی طرف سے آپ حضرات کا انتہائی خلوص اور دلی مسرت کے ساتھ خیر مقدم کروں۔

عید الاضحیٰ مسلمانوں کیلئے نہ صرف خوشی کا دن بلکہ ایک ایسی عظیم الشان قربانی کی یادگار ہے کہ جس پر انکی تمام مذہبی اور اخلاقی خصوصیات کی بنیاد قائم ہے، جس پر خود اسلام کی حقیقی تعلیم کا انحصار ہے۔ یہ موقعہ اس پیغمبر خدا حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی اس تسلیم و رضا کو یاد دلاتا ہے جب اللہ کے نبی نے بشریت کیخلاف اپنے رب کی مرضی اور خوشنودی کیلئے حضرت اسمٰعیل جیسے محبوب بیٹے کو قربان گاہ میں لا کھڑا کیا اور بندہ و خالق کے ابدی رشتہ کو قائم اور واضح کردیا۔ مگر شاید یہ اجتماع اس موضوع پر تفصیلی بحث کا متحمل نہ ہوسکے اور نہ دراصل اپنے کو اس کا اہل سمجھتا ہوں۔ یہ موقعہ ایک خوشی کا موقعہ ہے اور اس خوشی میں نہ صرف مسلمان بلکہ ہمارے غیر مسلم احباب بھی شامل ہیں۔ لہذا میں موضوع سخن بدلنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

شاید آپ حضرات کو علم ہے کہ جشن عیدری یونین کلکتہ کی معاشرتی زندگی میں ایک نئی سی چیز ہے۔ صرف آٹھ نو سال کا عرصہ ہوا جب عیدری یونین کلکتہ کا پہلا جشن نہایت تزک و احتشام کیساتھ کلکتہ میدان میں منایا گیا۔ اس کے بعد بھی یہ جشن بڑی حسن و خوبی کے ساتھ میدان ہی کی پرفضا وسعتوں میں ہوتا رہا ہے۔ مجھے معذرت کرنی ہے کہ اس سال جنگ اور دوسرے وجوہ سے جشن میدان میں نہ ہوسکا۔ مجھے امید ہے کہ ہمارے احباب ہماری مجبوریوں پر نظر کرتے ہوئے اس معذرت کو قبول فرمائیں گے۔ مگر باوجود ان مجبوریوں کے ہم نے ان جلسوں کی نہ صرف مسلم احباب ہی کو دعوت دی جاتی ہے بلکہ غیر مسلم احباب کو بھی۔ مجھے اس وقت انتہائی مسرت ہے کہ اس جشن میں ہمارے عزیز غیر مسلم احباب کی کافی جماعت ہماری خوشی میں شریک ہے۔ میں اپنے غیر مسلم دوستوں کا اپنی طرف سے اور اپنی کمیٹی کی طرف سے تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں انکی یہ شرکت خاص اہمیت رکھتی ہے

حضرات! مسلمانوں کا مذہب، ان کی سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی تربیت پر حاوی ہے۔ ہماری شریعت نہ صرف قانون ہے، بلکہ ہماری زندگی کا دستور العمل ہے، نیز جماعتی آزادی بھی اسی طرح ضروری ہے، جیسے ملکی آزادی، اور مجھے یقین ہے کہ اس خیال میں غیر مسلم بھائی بھی میرے ہمنوا ہونگے، یہ امر بھی واضح ہے کہ ملکی آزادی اسی حالت میں ہوسکتی ہے جبکہ جماعتی و انفرادی آزادی پر کوئی زد نہ آئے اور ساتھ ہی ساتھ ہمسایہ اقوام سے برادرانہ تعلقات کا قائم رہنا ضروری ہے لیکن جب قوموں میں باہمی اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں تو وہ علیحدگی کا مطالبہ کرتی ہیں اس مطالبہ کی بنیاد جماعتی نظام کا تحفظ و آزادی ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ جس طرح آج جشن عید میں مسلم و غیر مسلم بھائی بھائی کی طرح شریک ہیں۔ اسی طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی ایک دوسرے کے شریک نہ ہوں

آخر میں دست بستہ درخواست ہے کہ اگر انتظام میں کوئی کوتاہی ہوئی ہو تو آپ حضرات معاف فرمائیں یہ جناب خان صاحب احمد رشید سکریٹری کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ باوجود مشکلات کے آج ہم لوگ یہاں جشن عیدری یونین منا رہے ہیں جس کیلئے میں ان کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں

غزل

خبر اتنی تو ہے جھونکے ترے بادِ خزاں پہنچے
خدا معلوم تنکے آشیانے کے کہاں پہنچے

ہزاروں ہو گیے بسمل لیئے تیر و کماں پہنچے
چلے ناوک پہ ناوک لیں پہنچے تم جہاں پہنچے

حرم ناآشنا تھا کیا دلِ کفر آشنا اپنا
خدا والے گیئے کعبے کو ہم کوئے بتاں پہنچے

جہاں ساقی کا اپنے نام لیکر بیٹھ جائیں ہم
وہیں شیشہ وہیں ساغر وہیں مے کی دکاں پہنچے

ہزاروں مرحلے طے ہو گیے اک جام میں ساقی
سلامت تیرا میخانہ کہاں سے ہم کہاں پہنچے

کرم کر پھونکدے اے برق تو تنکے نشیمن کے
اسیروں تک اڑکر سرگذشتِ آشیاں پہنچے

مبارک ہے تمہارا استفیض فیضِ روحانی
یہ فیض اُس کو ہمیشہ بلبلِ ہندوستاں پہنچے

مبارک عظیم آبادی

غزل

خیالِ بادۂ کوثر کا جو دیوانہ ہے ساقی
ترے جامِ سرور آور سے وہ بیگانہ ہی ساقی

سکھائی آہ و زاری قلقلِ مینا نے کیوں ہم کو
سبق گردش کا کیوں دیتا ترا پیمانہ ہی ساقی

نہ غم دوزخ کا ہے اسمیں نہ جنت کا خیال اسمیں
حدودِ دہر سے باہر ترا میخانہ ہی ساقی

طوافِ کعبہ و بتخانہ کا مقصد میں کیا جانوں
مرا مسجود تو سنگِ درِ میخانہ ہی ساقی

ہی بزمِ شیخ کیا ہیم وہ جا کی اک قیامت ہے
اثر صحبت کا تیری جراَتِ رندانہ ہے ساقی

کلیمِ طور کا قصہ نہایت شوق افزا ہے
مگر اِس سے کہیں دلکش مرا افسانہ ہی ساقی

صراحی، کوزہ، خم، بوتل ہیں بت سب مے پرستوں کے
ترا میخانہ کیا رندوں کا بتخانہ ہے ساقی

میر فیصل

دو خط

حسن و عشق

سوالِ عشق:- اوصاف ظاہری کو قیام ابدی حاصل نہیں۔ ان کا ردّ و بدل لابدی ہے مشاہدہ اس کا بہترین ثبوت ہے۔ ارتقا و تنزل دوش بدوش مصروف عمل ہیں۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ عقل ترقی کرتی ہے تو حافظہ کمزور ہوتا جاتا ہے۔ استثنائی صورت میں وجود کا اثبات، قانون کو جھٹلاتا نہیں بلکہ صداقت ظاہر کرتا ہے۔ مستثنیات ہی بھولے بھٹکوں کی راہنمائی کرتی ہیں اور محسوس کراتی ہیں کہ انھوں نے ترقی و تنزل کس پہلو سے کیا ہے سب ہی بہر رنگ یکساں ہوتے تو احساس خامی و ترقی مفقود ہوتا۔

تمہیں اپنے نظریہ میں تبدیلی گوارا نہ ہو تو اس کا علاج نہیں ورنہ واقعات کی روشنی میں یہی نظر آئیگا کہ کل من علیہا فان۔ اس دنیائے فانی میں ہر چیز اصول فنا کے ماتحت جلوہ گر ہوئی ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے اور علم سائنس میں یدطولیٰ حاصل کر چکا ہے۔ اپنے نئے نئے تجربات سے وہ اپنے ہم جنسوں کو ورطۂ حیرت میں ڈالدیتا ہے مگر جہاں وہ اپنی بے بسی اور عجز کا اقرار کرنے پر مجبور ہے وہ مسئلہ حیات و ممات ہے۔ اور تم شاید حیران ہوا گر میں کہوں کہ موت بھی رحمت خداوندی ہے۔ لاریب انہی رحمتوں میں سے ایک بہت بڑی رحمت موت ہے۔ موت یا فنا کے ساتھ ہر چیز کی ترقی وابستہ ہے۔ خود محبت کی بنیاد موت پر ہے۔ موت اگر ہمارے پیاروں کو اپنے بے رحم و جابر پنجوں میں نہ لیتی تو وہی پیارے خار کی طرح آنکھوں میں کھٹکتے۔ ارتقا کا دروازہ مسدود ہو جاتا اور دنیا موجودہ ایجادات کی حامل نہ ہوتی۔ موت اگر باعث رنج و غم ہے تو زندگی بخش بھی ہے۔ کیا تمہیں انکار ہے کہ خدشۂ جدائی وجہ قیام محبت نہیں؟ جدائی یا فنا کا خوف معدوم ہو جائے تو سکون و اطمینان نصیب ہو جائے اور اطمینان و قرار نام ہے محبت کی موت کا۔ محبت اس نام سے ناآشنا ہے۔ اضطرابی و بے تابی تخلیق محبت کے سب سے بڑے اجزا ہیں۔ سیماب وار تڑپنے والوں نے محبت کو نشو و نما دی ہے۔

تم کہہ سکتے ہو کہ یہ کرشمہ حسن ہے عشق نہیں۔ مگر مجھے اس سے اختلاف ہے تم سطحی نظر سے حالات کا مطالعہ کرتے ہو اور یہی وجہ ہے کہ تم اس نتیجہ پر پہنچے کہ اگر حسن جور و جفا سے ہاتھ اٹھا لیتا تو عاشق کی بے تابی سکون میں تبدیل ہو کر محبت کو فنا کے گھاٹ اتار دیتی۔ بادی النظر میں تمہارا استدلال بہت معقول نظر آتا ہے اور ہر مبتدی شاید فریب کھا جائے لیکن غور تو کرو جس کھیتی کی آبیاری مطلقاً ترک کر دی جائے کیا وہ کبھی پھول پھل سکتی ہے۔ اور اگر یہی مان لیا جائے کہ عشق کو حسن ہی جوان کرتا ہے تو اس میں بھی جور و جفا کی نسبت وفا و اعتنا کا زیادہ دخل ہوتا ہے۔ کامل مایوسی کسی کو زندہ نہیں رکھ سکتی اور عشق بھی امید وفا پر ہی مراحل شباب طے کرتا ہے۔ یہ مثال میرے نزدیک ادنیٰ قسم کی محبت کی ہے۔

دراصل ہوتا یوں ہے کہ عشق سب سے پہلے اپنا انتخاب کرتا ہے حسن بذات خود کوئی شے نہیں۔ ہر عاشق کی نظر انتخاب فریق ثانی کو محبوبیت کا مقام عطا کرتی ہے ورنہ یہ ایسا مقام نہیں ہے جسے حسن اپنی کسی جوہر یا خوبی سے حاصل کر سکتا ہو۔ لیلیٰ جیسی سیاہ فام کو انتہائی ارفع و اعلیٰ مقام محبوبیت عطا کیا تو کس نے؟ نگاہ قیس نے۔ عشق نے جسے اپنے لیے پسند کر لیا وہ محبوب و حسین ہے اور جو نظر انتخاب سے گر رہا وہ اپنی ہزار ہا خوبیوں کے باوجود اس مقام سے محروم رہا۔ کیا کوئی حسین دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ خود بخود مقام محبوبیت پر پہنچ گیا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو خاص قسم کے خط و خال اور رنگ کا نام حسن ہوتا اور پھر شاید چند حسین دنیا میں نظر آتے۔ یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ یہ عشق کی وسیع النظری کا کرشمہ ہے کہ دنیا کی ہر قوم ہر ملک اور ہر طبقہ میں حسین نظر آتے ہیں اور عشق کا حسن پر یہ احسان عظیم ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے حسینوں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے جس نقش و نگار کو چاہے خطاب حسن عطا کرتا ہے۔

اس سے اور آگے بڑھو تو تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ یہ محض فریب ہے کہ حسن کی بے اعتنائی عشق کو بے قرار کرتی ہے۔ بلکہ واقعہ بالکل برعکس ہے

عشق کی اپنی روز افزوں ترقی عاشق کو مضطرب و بیقرار بنائے رکھتی ہے عاشق خود اپنی ہی آگ میں جل رہا ہوتا ہے۔ آتشِ عشق اُسے تڑپاتی ہے حسن کا جورو جفا دونوں اس کے لیے بے معنی ہیں۔ میرے نزدیک تو حسن کی بے چارگی قابلِ رحم ہے۔ ہر عاشق خود اپنے عشق کے ہاتھوں دھوکہ کھاتا ہے وہ اپنے مقامِ عشق سے ناواقف ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر اُسے محبوب کا ایک آدھ دفعہ دیکھنا نصیب ہو جائے تو اُس کی آگ ٹھنڈی ہو جائے گی لیکن یہ میسر آ جانے پر مطالبۂ عشق بڑھتا ہے اور مزید قرب پر مصر ہوتا ہے۔ یہ بھی ہو جائے تو ہر وقت اپنے محبوب کو اپنی نظروں کے سامنے رکھنے کی آرزو اُبھر آتی ہے اور عشق کی جو آرزو بھی ابھرے گی وہ دب نہیں سکتی اگر ادھوری رہیگی تو تڑپائے گی اور پوری ہوگی تو اُس سے بڑی قدر و جگہ لے لیگی۔ حتی کہ "من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی" والا مقام بھی نصیب ہو جائے تو آتشِ عشق ٹھنڈی نہیں ہوتی بلکہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ محبوب اگر خالی دیوار کیطرف بھی بھولے سے دیکھ رہا ہوگا تو عشق مچل جائیگا کہ یہ لمحہ اُس کی طرف کیوں نہ دیکھا گیا اُسے دیوار جیسی بے حس چیز سے رقابت پیدا ہو جاتی ہے۔ عشق عملاً یہ چاہتا ہے کہ محبوب میری آنکھوں سے دیکھے میرے کانوں سے سنے میری زبان سے بولے میرے قدموں سے چلے اور اگر یہ بھی ممکن ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ عشق اس سے بھی آگے بڑھتا۔ اب ذرا سوچو کس قدر غلط ہے تمہارا نظریہ کہ بے تابی و اضطراب کرشمۂ حسن کی ایجاد ہیں۔ وہ کون سے عشاق تھے جن سے اُن کے محبوبوں نے بے وفائی کی۔ حسن تو بے قدر و قیمت ہوتا ہے جب تک کسی چاہنے والے کی نظر اُسے نوازے نہیں۔ حسن حسن ہی نہیں کہلاتا جب تک حضرت عشق اُس کی طرف توجہ نہیں فرماتے تو آیا یہ باور کیا جا سکتا کہ حسن عشق سے بے وفائی کرے۔ اصل واقعہ یوں ہے کہ حسن جذبات تشکر سے لبریز عشق کی آواز کیطرف بڑھتا ہے مگر جس برق رفتاری سے عشق ترقی کرتا ہے حسن مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اپنی تمام کوششوں کے باوجود سبک رفتار حسن پیچھے رہ جاتا ہے یہی برق رفتاری عشق بے تابی و بے قراری کی موجب ہوتی ہے میں ان دونوں امور کو خود تمہارے عمل سے ثابت کر دیتا ہوں تمہیں علم نہ تھا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تم نے بے دھڑک کہدیا کہ مجھے تمہارے احساسات کی قدر نہیں تمہارا وجود اور عدم   میرے لیے برابر ہے مگر کہو تو جب تمہیں یہ علم ہوا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور ابھی شاید تمہیں یقین نہ تھا بلکہ اشتباہ ہی تھا تو تم اس تلاش میں رہنے لگے کہ موقعہ ملنے پر اپنے تشکر و امتنان کا اظہار محبت و وفا کے رنگ میں کردو۔ یہ کیوں؟ آخر مجھ میں کیا تبدیلی واقع ہو گئی تھی۔ یہی نا کہ تم جان گئے تھے کہ میری نظر نے تمہیں انتخاب کر لیا ہے۔ پھر تمہیں یاد ہے تمہارے التفات کے باوجود مجھے ہمیشہ تم سے شکایت رہتی تھی۔ تم نے اور التفات سے کام لینا شروع کر دیا مگر میری شکایات بڑھتی چلی گئیں ؎

ہر آن ایک تازہ شکایت ہے آپ سے   اللہ مجھ کو کتنی محبت ہے آپ سے

زبان رُکتی تھی تو آنسوؤں کی بارش تمہارے چہرے اور سینے کو تر کر دیتی تھی اور تم نے کئی دفعہ کہا کہ تم سے محبت تو کرتا ہوں اور کیا کروں خدارا انصاف سے کہو کیا یہ اقرار عجز نہ تھا کہ اس دوڑ میں تم میرے ساتھ پورے نہیں اُتر سکتے اور اب جو تم تھک کر ہار گئے ہو تو میری نگاہ میں تمہارے اوصاف پر موت وارد ہو گئی ہے لیکن عرفِ عام میں تمہاری اسی سرد مہری کو جو مایوسی کا نتیجہ ہے جور و جفا کہا جائیگا حسن جب اپنی شکستِ عشق کی دوڑ کے معاملہ میں تسلیم کرتا ہے تو مایوس ہو کر کنارہ کر جاتا ہے اور وہ اس کی عارضی موت ہوتی ہے جب تک دوسری نظرِ التفات اُسے از سرِ نو زندہ نہیں کرتی۔ اور عشق جب اپنے محبوب کی محبت یا جستجو میں حدِ امکان سے گزر جاتا ہے تو اصطلاحِ عام میں اسے مر جانا کہتے ہیں مرتے دونوں ہیں مگر کس قدر اختلاف ہے دونوں موتوں میں۔ غرور حسن کو ٹھیس لگنے سے مرنے والا پھر شاید ہی زندہ ہوتا ہو۔ کیونکہ وہ ہمیشہ اعترافِ شکست لیے ہوتا ہے اور عشق میں مرنے والا ملند پرواز ہوتا چلا جاتا ہے

میری دانست میں تمہیں یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ حسن پر ابدی موت کیسے وارد ہوتی ہے اور عشق ہر کربلا کے بعد کیسے زندہ ہوتا ہے نیز ردِعمل حسن کے لیے کس قدر تلخ اور عشق کے لیے خوش کن ہوتا ہے تمہیں صرف بوالہوس اور عاشق میں تمیز کرنا میسر ہو جائے تو تم بہت جلد میرے نظریے کے قائل ہو جاؤ۔ رفتارِ زمانہ نے اگر تمہاری آنکھیں ایسے وقت میں کھولیں جبکہ تم تلافی نہ کر سکے تو کیا فائدہ؟ اور اگر تم نے تسلیم کر لیا کہ حسنِ ظاہری اور بوالہوسی دونوں کو بقا نہیں تو شاید کسی کے صدق و خلاص کو نعمت خداوندی یقین کر کے اسے اپنانے کی سعی کرو۔ تمہارے خط و خال سے ہی نہیں تم سے محبت ہے۔ تمہارے نقش و نگار اسبابِ محبت تو ہو سکتے ہیں مگر منزلِ مقصود محبت نہیں

اب تم نے یہ کہا کہ عشق تعین خط و خال سے بے نیاز ہے جسے چاہے اپنی نظر انتخاب سے خطاب حسن عطا کرے۔ چہ خوب۔ تو پھر آہو چشم اور صراحی دار گردن۔ اور نازک کمر کی احتیاج کیوں ہے کسی نیل چشم کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان کیوں نہیں ہوتے۔ بھدی کمر اور بھینسا دار گردن کو کبھی سراپا ستم ظریفی ملاحظہ ہو فرماتے ہیں کہ عشق اندھا ہے اس نابینائی پر ہزاروں بینائیاں نثار کہ آواز تک میں شیریں اور لوچ کی چاہت ہوتی ہے۔ سرو قد کے متمنی حتیٰ کہ رفتار میں ہزاروں فتنے پیدا ہوتے دیکھنے کے خواہشمند عشق کو اندھا قرار دیں۔ فریب خوردہ میں ہوں کہ تم میرے محسن احسان فراموش تم کہتے ہو کہ عشق جسے چاہتا ہے حسینوں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے ورنہ حسن اپنی ہزار خوبیوں کے باوجود یہ مقام حاصل کرنے سے قاصر محض ہے۔ حقائق سے آنکھیں بند کر لینے سے اصلیت نہیں چھپتی۔ یہ واقعہ ہے کہ تخلیق عشق محتاج حسن ہے۔ محبت و عشق سے نا آشنا انسان پر جب حسن وار کرتا ہے تو وہ اپنے دل میں خلش محسوس کرتا ہے وہی خلش حسن کی بے نیازی سے نشو و نما پا کر مقام عشق حاصل کرتی ہے اور یہی بے نیازی اور جور و جفا جسے تم حسن کی موت قرار دیتے ہو عشق کی زندگی کو برقرار رکھتی ہے۔ عاشق حرص و ہوا کا بندہ اپنی خواہشات نفسانی کی تکمیل چاہتا ہے لیکن جانتے ہو اگر محبوب تمہاری تمام خواہشات کو پورا کر دے تو تمہاری آتش عشق یوں سرد ہو جائے کہ چنگاری تک باقی نہ رہے کیا قیس و زلیخا اور چند ایسے افراد کے سوا کسی اور کو اپنے محبوب سے عشق نہ تھا۔ پھر کیوں وہ قعر گمنامی میں زندگی کے سفر کو طے کر گئے۔ یہی نا کہ التفات حسن نے ان کو بے نیاز آہ و بکا اور مستغنی نالہ و شیون کر دیا تھا اور انہیں داخل سکون و اطمینان پا کر خاموشی کی نیند سلا دیا۔ خلقت عشق ہی نہیں بلکہ حیات و ممات عشق حسن کرشمہ ساز کی محتاج ہیں۔ عشق گدائے لم یزل کی طرح حسن کا بھکاری رہتا ہے اور حسن جسے چاہتا ہے وفا و جفا سے موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے جور و ستم سے زندہ رکھتا ہے۔ اس لیے کوئی صانع اپنی صنعت کا محتاج نہیں۔ وہ جب چاہے ایک سے ایک بہتر کھلونا اپنی دلچسپی کے لیے بنا لیتا ہے۔ دیگر عشاق کے مانند تم بھی غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہو کہ تم نے حسن پر احسان کیا ہے اور اس کے صلہ میں حسن کو پابہ زنجیر اپنے آستانہ پر تکمیل خواہشات کے لیے وقف دیکھنا چاہتے ہو۔ ارے نادان سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں حسن ہر قید و بند سے آزاد اپنی من مانی کرتا ہے۔ اُسے کبھی واہمہ بھی نہیں گزرا کہ اس کا صید وحشی اُس کے چنگل سے بھاگ نکلیگا اور یہی باعث ہے کہ وہ ہر عاشق کو آزاد چھوڑتے ہوئے بھی یقین رکھتا ہے کہ عشق کی جبین نیاز آستانہ حسن سے الگ ہونے کی قدرت نہیں رکھتی۔ کبھی تم نے غور کیا کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ عشق کو اپنی کسی حرکت اور فعل پر قابو نہیں ہوتا حسن نے ایک دفعہ تملک کر لیا نہ کر لیا پھر عشق تمہاری ناصحانہ گزارشات سے بے پرواہ غیر ارادی و بے اختیاری رنگ میں حسن کے قدموں میں آ رہتا ہے۔ تم لاکھ سمجھاؤ دل بیقرار ایک نہیں سنتا۔ تمہیں اب بھی باور نہ ہو تو دل کو تاثرات حسن سے آزاد تو کر دکھلاؤ۔ اسی پر دعویٰ تھا کہ حسن ایجاد عشق ہے۔ میرے بھولے محسن! جس فعل میں تمہارے ارادے کا دخل نہیں اُس فعل کے تم مختار کیسے کہلا سکتے ہو۔ جس بات نے تمہیں دھوکہ دیا ہے وہ حسن کی مختلف رنگوں میں جلوہ گری ہے ورنہ عشق کی نظر انتخاب ہی موجد حسن ہوتی تو یک یک شمع پر ہزاروں اور لاکھوں پروانے جانیں نثار نہ کرتے۔ یہ اجتماع دلیل ہے خود مختاری قیام حسن کی۔ حسن اگر اپنی طاقت و قدرت سے واقف نہ ہوتا تو مقام بے نیازی حاصل نہ کرتا۔ عشق اسی لیے بے نیاز نہیں کہ وہ محتاج ہے۔ حسن جدھر نظر اٹھاتا ہے عشق کو سر نیاز خم کیے پاتا ہے۔ خدا لگتی کہنا یہ احتیاج ہے یا استغنا۔

معلوم ہوتا ہے تمہارا مطالعہ حسن بہت ہی محدود ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ حسن پیچیدہ تر کام واقع ہوا ہے۔ تنگ نظر عشق وسیع دامن حسن کے مقابلے کی کیا تاب لائیگا۔ حسن اپنی آب و تاب سے جسے تاکتا ہے تیر نظر کا گھائل کر دیتا ہے لیکن ہوس صید بجائے ٹھنڈی ہونے کے تیز تر ہوتی چلی جاتی ہے یہ درست ہے کہ مست شباب حسن مجبور نہیں کہ وہ اپنے کشتوں کی دلنوازی کرے اور یہ استغنا قدرت نے حسن کی فطرت میں ودیعت کر رکھا ہے

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام — کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

عشق کی ابتلا ہی کیا ہے۔ گھٹنوں کے بل چلنے والے طفل کی طرح چلنے کی سعی میں جو گرا تو وہیں تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا بس پھر نہ اٹھ سکا علاوہ تنگی داماں ہونے بھی تنگ نظر عشق اگر جہاں گرے وہاں کا ہو کر ختم ہو جائے، تو قصور کس کا ہے اور پھر تم تو اتنے احسان فراموش ہو کہ تمہاری حالت زار پر جو کبھی حسن نے رحم کھایا اور تمہیں نگاہ کرم کی بھیک دی تو تم نے اسے کرشمہ عشق سے تعبیر کیا۔ اور اگر حسن بے نیاز نے تمہیں آستانہ عقیدت کرنے کی غرض سے

غزل

جب بھی ترا گل بوٹا اے دیدہ تر دیکھا
یا دل کا لہو نکلا یا خون جگر دیکھا

روپوش تھا وہ جلوہ یہ سچ ہے مگر دیکھا
اس دل نے گواہی دی جس سمت اُدھر دیکھا

دنیائے محبت میں یہ طرفہ اثر دیکھا
بیدار رہے شب بھر اور خواب سحر دیکھا

قربانِ سکونِ دل اس چشم مروت پر
اک تیر لگا آکر جب تم نے ادھر دیکھا

دل لوٹ لیا لاکھوں ویراں کیے پہلو
اک حشر ہوا برپا ظالم نے جدھر دیکھا

پلٹیں یہ نگاہیں جب ٹکرا کے حجابوں سے
پھولوں سے بھرا ہم نے داماں نظر دیکھا

مجبوریٔ دل کی بھی قیمت ہے کوئی ناصح
وہ جلوہ قیامت تھا یہ سچ ہے مگر دیکھا

کیا گذری ترے دل پر کیا تجھکو نظر آیا
جب تو نے خود آئینہ اے آئینہ گر دیکھا

یہ عام شکائت ہے اے حضرت نظارہ
ہم نے تو جسے دیکھا برباد نظر دیکھا

انجامِ غم فرقت معراج نہ کچھ پوچھو
شب بھر جو نہ دیکھا تھا وہ وقت سحر دیکھا

معراج لکھنوی

غزل

خندہ زن مجھ پہ ہے کیوں شیخ ثواب آلودہ
اُس کی پیری بھی تو آخر ہے شباب آلودہ

دل بیزار کو ہے ایسی خدائی کی تلاش
بندگی جس میں ہو لیکن نہ حساب آلودہ

ساقیٔ مست کی گفتار کا عالم۔ توبہ
لبِ نازک پہ ہیں الفاظ شراب آلودہ

خرد و ہوش کو تعلیم جنوں دیتی ہے
چشم بیدار تری جو کہ ہے خواب آلودہ

خوئے نیرنگ پسندی سے دوبالا ہے جمال
لطف کچھ اور بڑھا ہو کے عتاب آلودہ

بوئے گل رنگ کی شوخی میں چھپائے نہ چھپی
حسن پھر حسن ہے ہو لاکھ حجاب آلودہ

عشق سمجھائے کسے حکمت اسرار حیات
عقل اسے [illegible] خواہ [illegible] آلودہ

[illegible] روانی

غریب

رام پور ایک چھوٹا سا گاؤں تھا مگر بہت ہی خوشنما اور دلفریب، چاروں طرف پہاڑ کے اونچی اونچی دیواروں میں گھرا ہوا یہ گاؤں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی معشوق اپنے عاشق سے ہم آغوش ہو اور خاص کر برسات میں تو اور بھی دلکش اور پُر فضا معلوم ہوتا تھا۔ آسمان پر چھائے ہوئے کالے کالے بادل ملہار گا رہے تھے۔ رام پور کے پُر شباب سینے سے بے باک موجیں اٹھکھیلیاں کر رہی تھیں۔ شیرازی شباب کا سا کیف آور تندرستی اور انار کی سی سرخ رنگ نوخیز دوشیزہ ایک سفید چٹان پہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے جسم کے ہر حصہ سے عالم شباب کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ زلفیں ناگن کی طرح کچھ شانوں پر لٹک رہی تھیں اور کچھ مہتابی چہرہ کی بلائیں بھی لے رہی تھیں۔ باد تند کے خوشگوار جھونکے کبھی کبھی اس نازک اندام دوشیزہ کو چھیڑ کر پریشان کر جایا کرتے تھے۔ کبھی اُس کے زلفوں کو چھوتے و بکھیرتے ہوتے۔ اور کبھی اس کے آنچل کو سر سے کھینچتے ہوئے تیزی سے ادھر سے اُدھر نکل جایا کرتے تھے۔ بیچاری بالوں کو سنوارتے سنوارتے پریشان پریشان ہو جاتی۔ آخر دوشیزہ بیٹھی بیٹھی گھبرا گئی۔ آنچل سر پر کھینچتی ہوئی ایک آہ سرد بھر کر بولی۔ آج بہت دیر ہوئی اور اٹھنا ہی چاہتی تھی کہ پیچھے سے کسی نے اُس کی آنکھیں بند کر لیں۔ دوشیزہ چونک اٹھی۔ کون! امر؟

یہ اُس نوجوان کا نام تھا

جاؤ میں تم سے نہیں بولتی

امر بھی ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ رنگ گورا بدن چھریرا اور پھرتیلا۔ قد موزوں۔ کالے کالے گھنگھریالے بال آنکھیں بڑی بڑی جسم میں ایک خاص طرح کی کشش تھی

امر: کیوں شیلا۔ نہیں نہیں پھر بھولا۔ نرگس۔ کیا تم میرے دیر سے آنے پر ناراض ہو گئیں؟"

امر نے شیلا کا نام نرگس رکھا تھا اُس کی نرگسی آنکھوں کی وجہ سے

شیلا: "کیوں نہیں۔ دیکھو میں کتنی دیر سے تمہاری راہ دیکھ رہی تھی۔ اب میں بھی کل سے دیر میں آیا کروں گی۔ دیکھوں تو تمہیں کیسا معلوم ہوتا ہے"

امر: "نہ آؤ۔ تمہیں بلاتا ہی کون ہے؟"

شیلا: اچھا!

مگر یہ باتیں شیلا کے دل میں تیر سی لگیں۔ اُس کے نرگسی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔ امر نے اُس کے آنسوؤں کو نہ دیکھا تھا اُس نے پیچھے اپنے دونوں بازوؤں میں شیلا کو کھینچتے ہوئے اُس کے رخ گلگوں کا بوسہ لے لیا مگر ساتھ ہی اُس کے چہرے کو دیکھ کر گھبرا گیا

"بھلا تم روتی کیوں ہو؟"

"خود تو ایسی ویسی باتیں بولتے ہیں اور خود ہی پوچھتے بھی ہیں کہ روتی کیوں ہو جیسے کچھ جانتے ہی نہ ہوں"۔ شیلا نے یہ باتیں کچھ ایسے بھولے پن اور معصومانہ انداز سے کہیں کہ امر بے تاب ہو گیا۔

امر: (شیلا کا منہ چومتے ہوئے) کیا تم میری باتوں سے ناراض ہو گئیں شیلا۔ اچھا اب کبھی میں اس طرح سے تمہیں نہ چھیڑا کروں گا۔ میں تو تمہیں صرف چڑھانے کے خیال سے اس طرح کی باتیں کیا کرتا ہوں۔ مگر تم ہو کہ برا مان جاتی ہو۔ اچھا بھائی جانے دو ان باتوں کو۔ تم ہی بڑی سہی۔ میں اپنی غلطی کیلئے معافی مانگے لیتا ہوں۔

کچھ اس طرح سے امر نے منہ سکوڑ کر کہا کہ شیلا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ تھوڑی دیر ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر یکایک امر نے چونک کر کہا "شیلا آج مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے اُف بہت دیر ہو گئی۔ اب چلو۔

آفتاب غروب ہو رہا تھا ... پورب کی جانب کچھ گھٹا اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے ... آسمان کو اپنے سیاہ دامن سے

سکا۔ ایا ہوا نے بھی اپنے قدم بڑھائے۔ آج شیلا باغ سے بہت سا پھول توڑ لائی تھی اور بڑے شوق سے اس کا مالا گوندھ رہی تھی۔ کس کے لیے؟ وہ اپنے .... آسمان اور ہوا کے رنگت دیکھ کر اس کی رنگین طبیعت نے بھی کروٹ لی۔ بہت سے خیالات نے بیک وقت ہی اگر اس کے دل میں آہستہ آہستہ چٹکیاں لینی شروع کیں۔ شوقی دارماں نے بھی اُس کی طبیعت کو گدگدایا اور وہ گنگنانے لگی۔

"مت بول پپیہا پی کی بولی۔ کیوں پیا کی یاد دلائے۔
تو کیا جانے پریت اگن کو۔ کون تجھے سمجھائے۔
پی پی بولے تو من مانا۔ ڈال ڈال اڑ جائے
مت بول پپیہا پی کی بولی

مالا گوندھنا ختم ہوا اور ساتھ ساتھ گانا بھی۔ مالا گوندھنے اور گانے میں اپنے آپ کو شیلا کچھ ایسا کھو بیٹھی تھی کہ امر کا آنا بھی اُسے نہ معلوم ہوا وہ کب آیا اور کتنی دیر کھڑا رہا۔ گانا ختم ہونے پر شیلا ایک انگڑائی لیتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ مڑ کر دیکھا تو امر پیچھے کی چٹان پر بیٹھا ہوا تھا۔

شیلا۔ "تم آگئے امر؟

امر۔ میں تو بہت دیر کا آیا ہوا ہوں

شیلا۔ تم نے مجھے پکارا کیوں نہیں؟

امر۔ اس لیے کہ ....

شیلا۔ اس لیے کیا

امر۔ میں نے سوچا کہ آپ کے کاموں میں کیوں دخل دوں۔ اگر کہیں ناراض ہو گئیں تو .... چونکہ آپ کو بگڑنا بہت جلد آتا ہے نہ؟

شیلا۔ دیکھو امر تمہاری ہر وقت ایسی باتیں مجھے پسند نہیں۔ جب دیکھو آپ جناب حضور کی باتیں مجھے نہیں بھاتیں۔

امر۔ دیکھو اسی لیے تو میں نے پہلے ہی کہا کہ تم کو بگڑنے کی زیادہ عادت ہے اور مجھے ....

شیلا۔ اور مجھے کیا؟

امر۔ مجھے چھیڑنے کی۔

شیلا۔ چھیڑنے میں تمہیں کیا ملتا ہے؟

امر۔ بہت کچھ! جب تم غصہ ہو جاتی ہو تو مجھے تمہاری صورت بھلی معلوم ہوتی ہے

شیلا۔ اچھا! یہ بات ہے تو اب میں کبھی غصہ ہی نہ ہوا کروں گی۔

امر۔ دیکھا جائے گا۔ مگر شیلا یہ تو بتاؤ کہ مالا تم نے کس کے لیے گوندھی ہے

شیلا۔ کسی کے لیے بھی نہیں۔

امر۔ تو لاؤ مجھے دے دو

شیلا۔ تمہیں کیوں دینے لگی۔ اتنی مفت؟ کیا تمہارے لیے تیار کی ہے؟ مجھے خود ہی کام ہے۔ یہ مالا میں نے اپنے دیوتا کے لیے گوندھی ہے۔

امر۔ میں بھی تو کسی دیوی کے لیے ہی مانگ رہا ہوں

شیلا۔ بازار سے کیوں نہیں لے آتے۔

امر۔ تم ہی بیچ ڈالو

شیلا۔ مجھے کیا غرض پڑی ہے کہ میں اُسے بیچوں۔ یوں مانگو تو اُسے دے سکتی ہوں مگر ایک شرط ہے

امر۔ وہ کیا

شیلا۔ پہلے اپنی آنکھیں بند کر لو۔ بعد میں شرط بتاؤں گی

امر نے آنکھیں بند کر لیں۔ شیلا نے ہار امر کے گلے میں ڈال دیا۔

شیلا۔ گھٹنے ٹیک، آنکھیں بند کر ہاتھ جوڑ کر اُس کے قدموں کے پاس بیٹھ گئی۔ امر نے ہار کے پڑتے ہی آنکھیں کھول دیں۔

"یہ کیسا شیلا؟"

"کچھ نہیں۔ میں نے دیوتا کے لیے ہار گوندھا تھا اُسے پہنا دیا۔ اب یہ تمہارا ہے۔"

امر نے شیلا کا ہاتھ پکڑ کر اوپر اٹھایا اپنے بازوؤں میں لٹاتے ہوئے ہار کا آدھا حصہ شیلا کے گلے میں ڈال دیا۔ شیلا اب کوئی ہم دونوں کو اس دنیا سے الگ نہیں کر سکتا ہے۔

شیلا کی آنکھوں سے محبت اور خوشی کے آنسو ٹپک پڑے۔ ہوا زور سے چلنے لگی ڈالیاں آپس میں جھک کر گلے ملنے لگیں۔ بلبل ترانے گانے لگے۔ آسمان سے چھوٹی چھوٹی بوندیں گرنے لگیں گویا ان دو بے قرار دلوں کی محبت پہ مبارکباد دے رہی ہوں

(۳)

صبح چھ بج چکے تھے۔ مگر شیلا اب تک خوابِ غفلت سے بیدار نہیں ہوئی تھی۔ آفتاب عالم تاب کا دورِ حکومت پردۂ دنیا پر شروع ہو چکا تھا۔ مگر اس حسینہ کے لیے گویا ابھی تک صبح ہی نہ ہوئی تھی۔ آفتاب کے سنہری شعاعیں اس کے مہتابی چہرے پر روشن دانوں سے چھن چھن کر پڑ رہی تھی نیم صبح کے ہلکے ہلکے جھونکے اُسے لوریاں دے دے کر جگا رہے تھے۔

دیر تک سوتے دیکھ کر ماں نے آواز دی۔ شیلا۔ شیلا۔ آج تو سوتی ہی رہ گئی۔

شیلا۔ (جاگ کر) کیا ماتا جی۔ آئی۔ اور ایک سستی بھری انگڑائی لیتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ اور ضروری کاموں سے فارغ ہو کر اپنی سہیلی اُرملا کے یہاں چلی گئی۔

(۴)

"تو کیا تم ضد ہی پکڑے رہو گے؟"

"ہاں۔"

سوامی! تم جانتے ہو کہ شیلا امر کو کتنا چاہتی ہے جس وقت اسے ایسا معلوم ہوگا کہ اس کی شادی کسی اور سے ہو رہی ہے تو اس وقت اس کی کیا حالت ہوگی۔

ہاں! میں جانتا ہوں اور خوب اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ اس کی کیا حالت ہوگی۔ مگر پھر بھی میں ایسا کرنے پر مجبور ہوں۔ آنکھ رہتے ہوئے میں اُسے بھاڑ میں جھونک دینا نہیں چاہتا۔ کشور بھی کوئی برا لڑکا نہیں ہے۔ خوبصورت اور پڑھا لکھا ہوشیار ہے۔ دولت بھی کافی ہے اور ساتھ ساتھ۔ . . . رہی امر کی محبت! وہ بھی شادی ہو جانے کے بعد رفتہ رفتہ بھول ہی جائے گی۔ دنیا میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے آخر کسی کے لیے کوئی مر تو نہیں جاتا۔

ٹھیک ہے سوامی! مگر پھر بھی میں کہتی ہوں کہ شیلا کی جان کے پیچھے نہ پڑو۔ میری گود خالی نہ کرو۔ میں مانتی ہوں کہ امر غریب ہے۔ تو کیا ہوا۔ آخر تمہاری یہ دولت کس کے لیے ہے؟ کوئی دوسرا تو وارث ہے نہیں؟

"گویا تمہارا یہ مطلب ہے کہ میں شیلا کی جان کا دشمن ہوں۔ باپ کے بجائے جلاد ہوں۔ شیلا کی محبت جتنی ہے وہ تمہیں ہی ہے اور میں تو . . . . . .

نہیں نہیں سوامی! میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے۔ میں صرف اس لیے ایسا کہتی ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا نتیجہ برا ہو۔ ایک بچپن کی محبت ہے امسال تو امر نے بھی میٹرک پاس کیا ہے کوئی نوکری مل ہی جائے گی۔ رہیں دکھ سکھ کی باتیں۔ یہ تو قسمت کی بات ہے۔ اگر تم کسی امیر کے گھر اسے دیدو۔ مگر اس کی قسمت میں تکلیف ہی لکھی ہو تو وہی ہو کر رہے گی۔

"جہالت کی باتیں نہ کرو۔ میں بھی کچھ سوچ سمجھ کر ہی ایسا کر رہا ہوں۔ زبان دیکر بات پکی کر آیا ہوں۔ اب کچھ کیے نہیں ہو سکتا۔

"ہائے سوامی! یہ تم نے کیا کیا؟

"بولنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے جو کچھ کیا اچھا ہی کیا ہے۔

(۵)

امر شیلا کی بہت دیر سے راہ دیکھ رہا تھا۔ اُس کی بے چینی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں بے تابی سے اس کا انتظار کر رہی تھیں ٹہلتے ٹہلتے وہ اکتا کر بیٹھ رہا۔ تھوڑی دیر بعد شیلا آئی مگر آج شیلا میں وہ شوخی نہ تھی وہ شرارت نہ تھی۔ آج شیلا بہت مغموم تھی اور اس کا پھول سا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ قدم بہت ہی آہستہ آہستہ پڑ رہے تھے۔

امر اس کی یہ حالت دیکھتے ہی بے چین ہو گیا۔

امر۔ کیسی طبیعت ہے شیلا؟ کیا ہوا ہے؟ ایسی کیوں ہو رہی ہو؟

مگر شیلا نے کوئی جواب نہ دیا اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے

امر۔ آخر کچھ بتلاؤ بھی تو سہی کیوں ہو میری طبیعت بہت گھبرا رہی ہے

شیلا اور بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ جتنی ہی روتی تھی امر اتنا ہی بیتاب ہوتا جا رہا تھا۔ امر کے بہت کہنے پر شیلا کے آنسو کچھ رُکے۔ امر نے پھر پوچھا
شیلا نے اپنے کو بہت سنبھال کر جواب دیا "میری شادی پتا جی نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " اور آگے نہ بول سکی۔ حلق میں کانٹے چبھنے لگے۔ وہ اور بھی زور سے روتے لگی۔

امر شادی کا لفظ سن کر چونک پڑا جس طرح یکایک کسی پر بجلی ٹوٹ کر گر پڑے اور وہ بے جان ہو جائے۔ ٹھیک وہی حالت امر کی تھی۔ وہ پاگل کی طرح اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تلووں سے زمین کو مسلتے ہوئے اس نے پوچھا: "تمہیں کیسے معلوم ہوا شیلا؟"

"میں آج اُرملا کے یہاں گئی ہوئی تھی۔ وہاں سے آنے پر میں ماتا جی کو آنگن میں نہ پا کر اُن کے کمرہ کی طرف جا رہی تھی کہ پتا جی کی آواز سن کر میں باہر ہی کھڑی ہو گئی"
ساری باتیں جو کچھ بھی شیلا نے اپنے پتا کے منہ سے سنی تھی وہ سب امر سے بیان کر دیں۔

امر سوچنے لگا۔ میں غریب ہوں اس لیے شیلا کے پانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ امر نے آج محسوس کیا کہ غربت دنیا میں ایک بہت ہی بری چیز ہے اس نے اس بات کا آج تک خواب میں بھی خیال نہ کیا تھا۔ گو اس کی ماں نے اسے بہت ہی تکلیف سے پالا پوسا اور بہت ہی مصیبتوں سے پڑھایا لکھایا تھا۔ کاش کہ آج اس کا باپ زندہ ہوتا تو شاید اتنی تکلیف اُس کی ماں کو نہ اٹھانی پڑتی۔ مگر امر اس پر بھی بہت خوش تھا وہ اپنے کو بہت ہی خوش قسمت سمجھتا تھا چونکہ وہ کسی اور ہی دنیا میں تھا۔ اس کی دنیا ایک نرالی ہی دنیا تھی جس میں صرف شیلا اور وہ تھا۔ مگر آہ آج اس کی خیالی دنیا مٹ گئی۔ اس نے سمجھا کہ وہ ایک سنہرا خواب دیکھ رہا تھا جو کہ آنکھیں کھلتے ہی غائب ہو گیا، اس کا شیشۂ دل چور چور ہو گیا اُس کی امیدیں مٹ گئیں۔ اس کی حسرتیں خاک میں مل گئیں۔ امر کی حالت خراب ہونے لگی۔ اُس کا دماغ چکر کھانے لگا۔ اس نے شیلا سے کہا:

"اچھا شیلا! تم جہاں بھی رہو خوش رہو۔ ایشور تمہیں ہمیشہ خوش و تندرست رکھے۔ میری یہی دعا ہے کہ تم پھولو پھلو۔ میں غریب ہوں اس لیے تمہیں نہ پا سکا شیلا! تم مجھے بھول جانے کی کوشش کرنا گھبرانا نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " امر اور آگے نہ بول سکا۔ کلیجہ تھام کر بیٹھ گیا۔

شیلا۔ میرے امر! تمہاری شیلا جس کی ایک بار ہو چکی اُسی کی ہے اور رہے گی دوسرے کی نہیں! ہندو عورتیں ایک ہی بار شادی کیا کرتی ہیں دوبارہ نہیں۔ پھر میری تو شادی ہو چکی ہے اب دوسری کیسے کر سکتی ہوں امر؟

امر۔ پاگل نہ ہو شیلا! پتا جی جو بھی کہتے ہیں اُسے مان لو۔ وہ تمہارے بھلے ہی کے لیے کہتے ہیں۔

شیلا۔ ہو گا۔

امر۔ اچھا! اب میں جاتا ہوں۔ میری طبیعت اچھی نہیں معلوم ہو رہی ہے

(۶)

آج آننت بابو کی لڑکی کی شادی ہے۔ بارات بڑی دھوم دھام سے دروازہ لگی۔ روشنی کا خوب انتظام ہے۔ باجے بھی تین چار قسم کے تھے موٹر ہاتھی گھوڑے بھی تھے۔ باہر مردوں کا مجمع۔ اندر عورتوں کے گانے سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ شیلا دلہن بنی ایک کوٹھری میں خاموش بیٹھی تھی اُس کی آنکھوں سے اشک جاری تھے کہ اُس کی سکھی اُرملا اُس کے پاس آئی۔ اُرملا کو دیکھتے ہی اُس نے آہستہ سے پوچھا۔

"آج امر کی کیسی طبیعت ہے بہن؟"

"آج تو ان کو غذا بھی دی گئی ہے مگر مجھے ان کی حالت اچھی نہیں نظر آتی"

"ایسا نہ کہو بہن اف آج میں نے پندرہ بیس روز سے انہیں دیکھا بھی نہیں ہے۔ اب تو پتا جی نے میرا گھر سے یکدم نکلنا ہی بند کرا دیا ہے"
شیلا کچھ اور بولنا چاہتی تھی مگر کسی کے آ جانے سے چپ ہو گئی۔ اُس کی ماں نے اُسے آ کر بتلایا کہ شادی کا لگن رات کو دو بجے پڑتا ہے۔ پھر چلی گئی۔

(۷)

رات اندھیری تھی۔ سڑکیں سنسان۔ ایسی ہی حالت میں شیلا اکیلے امر کے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ وہاں پہنچ کر وہ امر کی کوٹھری میں گئی مگر امر موجود نہ تھا۔ اس کی ماں سو رہی تھی۔ شیلا پاگلوں کی طرح اس جگہ گئی جہاں وہ دونوں اکثر بیٹھا کرتے تھے اس نے دور سے ہی دیکھا کہ امر چبوترہ پر سر ٹیکے بیٹھا ہوا ہے جہاں لکھا تھا نرگس۔ وہ چلا پڑی "تم یہاں آئی امر؟" مگر اُسے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی کہہ رہا ہے بیکار۔ شیلا امر کے پاس گئی مگر وقت نکل جانے کے بعد۔ اس نے امر کو پایا مگر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

شیلا بلک پڑی۔ اس کے کانوں نے سنا کوئی کہہ رہا ہے "میں غریب تھا شیلا اس لیے تمہیں نہ پا سکا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"
شیلا یکایک بول اٹھی "شیلا جس کی ہو چکی اُسی کی ہے اور اُسی کی رہے گی امر۔ ہندو عورتیں ایک ہی بار شادی کیا کرتی ہیں دوبارہ نہیں میرے دیوتا"
شیلا نے امر کے سر کو گود میں لیا اور اپنے آنچل کو اُس کے دھوتی کے سرے سے باندھا اور ایشور کو گواہ رکھ کر کہا: "ہے ایشور! تو گواہ رہنا امر میرے پتی تھے وہ اب چلے ہیں۔ ذرا ٹھہر جاؤ۔ میں بھی آتی تمہارے پاس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" وہ آہستہ سے امر پر جھک پڑی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

رموز سخن

پریشاں رنگ و بو آلودۂ شبنم ہوتی جاتی ہے
چمن میں ایک اک شئے مائل رم ہوتی جاتی ہے

نکلتے جاتے ہیں ارماں تڑپ کم ہوتی جاتی ہے
مسرت اہل دل کو موجب غم ہوتی جاتی ہے

نہ پوچھو انقلابوں سے ہے کیسی کیف زا دنیا
سراپا گردش پیمانۂ جم ہوتی جاتی ہے

ذرا بدلے تو رت تقوی ہے اور خمیازۂ توبہ
قسم کھائی ہوئی حق میں مرے سم ہوتی جاتی ہے

تجلیات کا طوفاں ہے آب و تاب کا عالم
تری تصویر آشوب دو عالم ہوتی جاتی ہے

کسی کی چٹکیوں نے کھینچ لیں پھانسیں کچھ ارماں کی
جو پہلو میں خلش رہتی تھی اب کم ہوتی جاتی ہے

نہیں وجہ سکون ذوق ایذا دوست جز ایذا
نمک پاشی خلیج زخم و مرہم ہوتی جاتی ہے

نہ گھبرا ابتلائے نزع دہ دیکھ آگئی منزل
ہر اک ہچکی صدائے خیر مقدم ہوتی جاتی ہے

گلہ صدق طلب کا، ہم سے درگاہ اجابت کو
ہمیں شکوہ، کہ تاثیر دعا کم ہوتی جاتی ہے

ہمیں تم کیا، غم عہد شباب ایسا ہی ہوتا ہے
کہ پشت آسمان پیر تک خم ہوتی جاتی ہے

مری تر جاگی سوز ندامت ہے ترے ہاتھوں
کہ دامن سوکھنے تک آستیں نم ہوتی جاتی ہے

کمالی رعب سے عرض تمنا بن نہیں پڑتی
جہاں تک شرح کی جاتی ہے مبہم ہوتی جاتی ہے

کمالی

خدائے لم یزل سے

چھوٹی سی التجا ہے۔ ادنیٰ سا مدعا ہے
سننا پڑیگا تجھکو گر تو مرا خدا ہے

ہنگام بیکسی ہے۔ تیرا ہی آسرا ہے
ہے ناز مجھکو تجھپر تو میرا کبریا ہے

سوکھے ہوئے ہیں آنسو فریاد ہیں نہ شیون
دم ہے کہ فرط غم سے سینے میں گھٹ رہا ہے

ہر درد لا دوا کا اک چارہ ساز تو ہے
اور تیری رحمتوں کی کچھ حد نہ انتہا ہے

ارمان دل ہزاروں پامال ہو چکے ہیں
جلدی مجھے تو دیدے اس کی اگر رضا ہے

جس دل میں آرزوئیں بھرتی تھیں خون بن کر
رنج و بلا میں ہر دم وہ دل گھرا ہوا ہے

تاروں کی روشنی میں آتی ہے شام غربت
عشرت نصیبیوں کا امکان مٹ چکا ہے

بانی ہے وہ دعا کا۔ تاثیر بھی وہ دے گا
مخفی نہ کہہ زیادہ وہ خود ہی جانتا ہے

صالحہ بیگم مخفی

عید اور محشر جذبات

وہ عید کا دن تھا ـــ سال بھر کی عید کا ـــ اپنوں بیگانوں سے ملنے ـــ ہاں گلے ملنے کا دن ـــ بھولے بسروں کی یاد تازہ کرنے اور عزیز و اقربا کے ساتھ مل بیٹھنے کی گھڑی ـــ محلے کی گلیوں کوچوں کو عطر کی خوشبو سے مملو کر دینے کی ساعت ـــ سلام پر سلام کیے جانے اور دعاؤں پر دعائیں جوڑنے کا روز ـــ مگر کن کے لیے؟ ـــ ان کے لیے جو وطن کی سرزمین مقدس پر خویش و اقارب کے پہلو بہ پہلو زندگی اور زندہ دلی کی داد دے رہے ہوں ـــ ایک دور از وطن ـــ خانماں برباد اور تنہا سا فرد شت غربت کے لیے کیا خاک کیف انگیز ثابت ہو تا جس کو عید کی تقریب سعید تو الگ، رہی کہ اس کا مدار ہی اقربا کی دید پر ہے ـــ صرف وطن کا تصور ہی آٹھ آٹھ آنسو رلانے کو کافی ہو۔

وہ فوجی آدمی تھا ـــ اسے وطن چھوڑے ہوئے کافی دن بیت چکے تھے۔ اس وقت اُس کی رجمنٹ مصر کے محاذ پر روسیوں کے مقابلے میں موت اور زیست کی بازی لگائے ہوئی تھی لیکن جنگ کے خاتمے کی کوئی امید، فتح و نصرت کی کوئی جھلک، اور آفتاب کامرانی کی کوئی کرن جنگ کی اس دھواں دھار فضا کے کسی گوشے سے تا ہنوز پھوٹنے نہ پائی تھی، بساط زندگی کی اس تگ و دو میں یہ کہنا سخت مشکل تھا کہ کب کس کی حیات کا پانسہ پلٹ جائے اور وطن کی مقدس سرزمین اسے اپنے دامن میں پناہ دے بھی سکے یا نہیں ـــ

یہ احساس غربت ہی مسافر کے رونے کے لیے کچھ کم نہ تھا گو ایک فوجی آدمی کے واسطے بے وطنی کوئی نئی چیز نہیں ہوتی۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی اور رستا ہوا زخم بھی پھوٹ نہ بہے ـــ اور وہ رضا کار فوجی تھا ہی کب؟ ـــ معیشت کے ہاتھوں مجبور ہو کر تو اس نے اس قتل و خون کی گرم بازاری میں قدم رکھا تھا ـــ!! بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے ـــ عید کی مایوسیوں کی اتھاہ ندی اشکوں کی کفیل تھی ـــ آنسوؤں کی کیا کمی ہو سکتی تھی! ـــ رویا اور پھوٹ پھوٹ کر رویا ـــ یہاں تک کہ اس کے قمیص کا دامن اور آستینیں بالکل بھیگ گئیں۔

وہ عید کا دن تھا: ہاں عید کا دن ـــ مہمانی اور میزبانی کا دن ـــ مسافر کے خانۂ دل میں بھی کچھ مہمان آ دھمکے تھے ـــ یعنی! حسرت ـــ یاس ـــ حرماں ـــ اس کے نہاں خانہ دل میں میزبانی کرتا کون؟ ـــ دل؟ ـــ خود جسے وطن کی یاد آٹھوں پہر خون کے آنسو رلا رہی ہو ـــ وہ دل جو آزادی و سکون کی روح پرور فضا میں پل کر جواں ہوا اور اب غلامی اور انتشار کے ماحول میں جکڑا ہوا ضعیفی کے دن گذار رہا ہو۔ ـــ افسوس! غربت اور دشت وحشت کی مسموم ہوا کے ناخوشگوار جھونکوں نے اسے اس قدر بےحس بنا دیا تھا کہ اس کے ان مہمانوں کو بھی ایک نگاہ التفات کی آرزو لیے ہوئے واپس لوٹ جانا پڑا ـــ لوٹ جانا پڑا اور عید کے دن!... اللہ رے بے بسی!!

مسافر کی عید اور وطن سے دور ـــ عزیزوں سے دور ـــ گھر سے دور ـــ کالے کوسوں پرے باعث مسرت کیا ہوتی، وجہ غمگینی ضرور ہوئی ـــ وہ نہا دھو کر عید گاہ کی طرف جا رہا تھا ـــ مصری بچوں کی ایک ٹولی تیز تیز قدم اٹھائے اس کے سامنے سے گذر رہی تھی اور اس کا طائر خیال اپنے گاؤں کی اس جھونپڑی کی طرف پرواز کرنے لگا تھا جس میں کبھی مسافر کا مسکن تھا ـــ اس کی للچائی ہوئی آنکھیں ان ننھے ننھے معصوم حسینوں کو ڈھونڈنے لگیں جو تفکرات عالم کے بے پناہ شور و شیون سے قطعاً آزاد ہو کر عید کے بھڑکیلے اور نئے کپڑوں میں ملبوس اپنے ننھے ننھے ہاتھ اٹھا اٹھا کر سلام کر رہے ہوں اور انعام کے طور پر ان کے بزرگ ایک چھوٹی موٹی رقم دیتے ہوں۔ برابر وہ خود بھی تو ان بچوں کو کچھ دیا ہی کرتا تھا۔ کئی دفعہ مسافر کا ہاتھ خود بخود اس کی پتلون کی جیبوں میں چلا چلا گیا ـــ شاید عیدی کی ایک حقیر سی رقم نکالنے کے لیے مگر ہر ہر دفعہ اس کی مٹھیاں بھینچ بھینچ کر باہر نکل آیا کیں ـــ وہاں تھا ہی کون جسے عیدی دی جاتی ـــ یہ اسے بعد میں یاد آیا ـــ اس کی نگاہیں اس شریک دنیا کی اس پتلی کو بھی ہر چہار جانب تلاش کرنے لگی تھیں جو اپنے نرم و نازک ہاتھوں کو عید کے دھلے ہوئے کپڑوں میں لپٹائے منائے اس کے بچوں کو عید گاہ کے لیے تیار کر رہی ہو گی ـــ اور تصور ہی تصور میں مسافر نے دیکھا کہ

اس کی شریک حیات کے باریک دوپٹے میں سے وہ بڑی بڑی آنکھیں ——— نرگسی نمناک آنکھیں اس کی راہ تک رہی تھیں ——— ہاں کیا نہیں کیا معلوم تھا کہ اس کی واپسی کا انحصار ہی فتح و نصرت پر ہے ——— بے ساختہ مسافر کے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھ گئے ——— شاید وہ دعا مانگ رہا تھا ——— "خداوندا! اس خاموش بے بس مخلوق کو حوصلۂ ضبط و تحمل عطا فرما ——— کیا خاک خوشی محسوس کرتی ہوگی جب اس کا سہاگ خطرے میں ہو۔ آج جانے اس نے سنگھار بھی کیا ہوگا یا نہیں؟ ——— اس خیال کے آتے ہی مسافر کے کلیجے پر گھونسا سا لگا اور بے اختیار اس کی آنکھیں پھر نمناک ہو گئیں ———

ابھی وہ آستینوں سے آنسو خشک کر ہی رہا تھا کہ پیچھے سے نمازیوں کا ایک زبردست ریلا آیا۔ کاندھوں اور کہنیوں کے مسلسل دھکوں نے اسے اپنی رو میں آگے بڑھا دیا۔ اسی طرح کہاں سے کہاں تک وہ دھکے کھاتا رہا یہ اسے خود بھی معلوم نہیں کر سکا۔ لیکن جب ایک جگہ پہنچ کر اس کے قدم سست پڑ گئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ عیدگاہ پہنچ چکا تھا ———

ذرا سی دیر میں صفیں سیدھی کی گئیں ——— نماز ادا ہوئی اور خطبہ پڑھا جانے لگا۔ خطبے کے ختم ہونے سے ذرا پہلے ہی اس نے دیکھا کہ لوگ اپنے اپنے دوستوں کو تاکنے لگے تھے ——— وہ خوب سمجھ رہا تھا کیوں! ——— خطبہ ختم ہوا اور لوگ اپنے عزیزوں دوستوں اور آشناؤں سے ہنس ہنس کر گلے ملنے لگے ——— مدتوں کے بچھڑے عید کے روز مل رہے تھے ——— ایک دوسرے کے گلے اس طرح سے مل رہے تھے جیسے تفریق اور دوئی کا سوال ہی فنا کر دینا چاہتے ہوں ——— تمام عیدگاہ اسی قسم کے دل خوش کن مناظر سے بھری پڑی تھی مسافر کا نہ کوئی آشنا تھا نہ کوئی عزیز ——— وہ کس کو گلے لگاتا ——— کون اس کے گلے لگتا ——— بارہا اپنے قریب سے گزرتا ہوا دیکھ کر وہ کسی کی طرف لپکتا لیکن ہر بار اس کے ہاتھ پہلے ہی پہلے سمٹ کر سینے سے آ لگتے اور وہ ہاتھوں سے دل پکڑ کر رہ جاتا۔

اللہ رے بے بسی! ——— ہاتھ پہلے کسی کو آغوش میں لینے کے لیے سمٹے اور اسی کی چھاتی سے آ لگے! ——— کسی جان نصیب کی عید اس سے زیادہ اور کیا ہوتی؟ ——— اس کی آنکھیں جانب وطن دوڑ گئیں ——— دوڑتی ہی گئیں اور لمحوں تک دوڑا کیں ——— میدانوں ہی میدانوں ——— ریگستانوں ہی ریگستانوں، بہت دور، فضائے وحشت کے اختتام پر خطرناک وادیوں کو چیرتی پھاڑتی خارطوم کے اونچے اونچے پہاڑوں سے جا ٹکرائیں۔ یہاں پہنچ کر انہیں بھی رکنا ہی پڑا ——— ٹھہر گئیں رکیں اور دوڑیں ——— دوڑیں اور پھر رکیں ——— ہر طرف مایوسی ہی مایوسی۔ چہار جانب حسرت ہی حسرت۔ آخر آنکھیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں ——— جیسے وہ کہہ رہا ہو ——— "خداوندا! اپنے اس مجبور بندے پر کرم فرما ——— فتح و نصرت سے ہمکنار کر ....." دفعتاً اس کے کانوں نے ایک سریلی آواز سنی "عید مبارک!" وہ پلٹ پڑا۔ سامنے کی قطار میں اس نے دیکھا، ایک نوجوان خوش پوش جوڑا عید کی مسرتوں سے ہمکنار ہو رہا تھا۔ مسافر کو بھی کوئی یاد آنے لگا۔ اس کے ہونٹوں میں ہلکی ہلکی جنبش ہونے لگی اور دھیمی دھیمی آواز میں اس کے منہ سے "عید مبارک" نکلنے لگا۔

وہ سینے پر ہاتھ باندھے آہستہ آہستہ ایک طرف کو چلا جا رہا تھا ——— اسے خود بھی معلوم نہیں کہاں۔ بہت دور تک آواز بتدریج گھٹتی ہوئی سنائی دیتی رہی۔ پھر مدھم گنگناہٹ میں تبدیل ہو کر فضا میں کھو گئی ——— شاید وہ دشت و جبل کو "عید مبارک" کہتا جا رہا تھا۔ مسافر کی اس مبارکباد کا جواب اپنی ہی صدائے بازگشت کے سوا کسی سے بھی نہ ملا۔

ہوا سائیں سائیں چل رہی تھی۔ افق مشرق سیاہ ہوتا جا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ دنیا تاریک ہو گئی اور مسافر روپوش، خدا جانے کہاں ———

عید کے دن جس کو غربت میں وطن یاد آ گیا
رہ گیا اپنے گلے میں ڈال کر بانہیں غریب (آہی)

مرد علی

غزل

رخصت اے ہمدم کہ صحرا کی ہوا پھر آگئی ‖ گھر ہے زنداں خانۂ دل پر اداسی چھا گئی
آبلہ پائی کا دل کو شوق پھر پیدا ہو ‖ خار زارِ راہِ الفت کی ہوا پھر بھا گئی
پھر فضائے دہر دیتی ہے صلائے میکشی ‖ میکدہ پر ساتیا اودی گھٹا پھر چھا گئی
خندۂ گل نے دیا چاک گریباں کا پیام ‖ مژدہ اے دستِ جنوں فصلِ بہاری آگئی
بادۂ گلگوں کی صورت اشکِ خوں بہنے لگے ‖ نرگسِ مخمورِ ساقی جب مجھے یاد آگئی
وسعتِ کونین میرے گوشۂ دل پر نثار ‖ کچھ نہیں درکار جب تیری تمنا آگئی
آپنے زحمت تو کی لیکن بہت تاخیر سے ‖ شامِ غم کے جاگنے والے کو اب نیند آگئی
کس قیامت کی کشش ہے اس نگاہِ ناز میں ‖ اک اشارے میں ہمیشہ کے لیے تڑپا گئی
لالہ و گل میں کہاں رنگینیِ خونِ وفا ‖ فصلِ گل تیرے شہیدِ ناز سے شرما گئی

کیسی میٹھی نیند سویا ہے کہ اٹھتا ہی نہیں
قبر پر احسن وہ آئے یا قیامت آگئی

احسن طباطبائی

غزل

چمن میرا نہ گل میرا نہ سبزہ آشنا میرا ‖ خدا معلوم پھر گلگشت سے مقصد ہے کیا میرا
یہ کس نے برسرِ محفل کیا تھا تذکرہ میرا ‖ کہ اہلِ شوق چرچا کر رہے ہیں جابجا میرا
کروں میں عرضِ حال اپنا تو آخر کس بھروسے پر ‖ کہ وہ بیدرد ہو سکتا نہیں دردآشنا میرا
تجاہل نے کبھی روکا کبھی بیگانہ خوئی نے ‖ بتاؤ تم نے کس دن غور سے قصہ سنا میرا
خموشی پردہ دارِ رازِ دل ہے تو سہی لیکن ‖ نگاہ آشنا سے کیا چھپیگا مدعا میرا
یہاں تک دور آتے آتے مے کا ختم ہو جانا ‖ ترے میخانہ میں ساقی مگر حصہ نہ تھا میرا
یہ اک انداز تھا طرزِ جفا کی داد دینے کا ‖ منغص ہو گئے تم سنکے کیوں ذکرِ وفا میرا
جو دنیا ہو تری شانِ کریمی بے طلب دیدے ‖ اب اس کی کیا ضرورت ہے اٹھے دستِ دعا میرا

مسیحائی کا دعویٰ چارہ فرما کو مبارک ہو
[illegible]

اختر حسن اختر

انگریزی نظم کا ترجمہ

روح کا فلسفہ

ای ایڈیسن، مترجمہ محمد یونس احمر

ازمنہ قدیم میں اہل یونان کا یہ عقیدہ تھا کہ جب انسان موت کی آغوش میں ابدی نیند سو جاتا ہے تو اس کی روح بھی ہمیشہ کیلئے موت کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے اور اس طرح انسان دوبارہ زندگی حاصل نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن افلاطون جو یونان کا بہت بڑا فلاسفر، حکیم اور مدبر تھا اور جس کی پیدائش جاہلوں کے ماحول میں ہوئی تھی ہمارے سامنے ایک بہت بڑا نظریہ پیش کر گیا ہے اس نے اپنی خداداد ذہانت سے روح کے فلسفہ کو پایہ ثبوت تک پہنچا دیا ہے کہ انسان کو جب موت آتی ہے تو صرف اس کا جسم بے حس و حرکت ہو جاتا ہے لیکن اس کی روح دنیا میں پرواز کر جاتی ہے اور ہمیشہ صحیح و سلامت رہتی ہے۔ یہاں بھی افلاطون نے فلسفہ روح پر کیا عمدہ بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح انسانی روح مرنے کے بعد زندہ رہتی ہے ——— مترجم

(افلاطون ہاتھ میں ایک کتاب لئے کر جوش و خروش سے کہہ رہا ہے)

پلیٹو: یہ ہو کر رہے گا ——— تمہارے دلائل سچے ہیں! لیکن یہ خوش آئند

اُمیدیں، مسرور کن خواہشیں اور ابدی زندگی کب اور کہاں پوری ہوگی؟

——— یہ پوشیدہ ہولناکیاں اور اندرونی تکلیفیں کب ختم ہونگی؟

——— روح میں متزلزل کیفیتیں کیوں پیدا ہو جاتی ہیں؟

——— تباہی و انہدام سے کیوں کانپ اٹھتی ہیں؟

——— یہ خدائی طاقت ہے جو ہمارے قلب کو جنبش دیتی ہے!

——— یہ خود خدا ہے جو آئندہ زندگی کا تصور ہمارے دماغ میں بسا رہا

ہے! یہ مالک ارض و سما ہے جو حیات ابدی کا اشارہ کر رہا ہے!

ابدی اور لازوال زندگی!

——— اس میں خوشی و غم کے دریا موجزن ہیں۔

——— ہم لوگوں کو کن کن منازل سے گذرنا پڑے گا؟ ہم لوگوں کے سامنے

کس قسم کے مناظر اور تبدیلیاں نمودار ہونگی؟

کشادہ اور تنگ اُمیدیں

میرے سامنے ہیں ——— لیکن دیر کا سایہ اور رات کی

تاریکی اس پر پردہ ڈال دے گی!

——— یہاں میں تھوڑی دیر کے لئے رک جاؤں گا ———

——— اگر جو یہاں قوت طاقت، رعب و حشمت ہے (جہاں فطرت

اپنے تمام کام کی انجام دہی میں چلا اٹھتی ہے) تو اُسے ہم پیزگاروں اور زاہدوں

سے خوش ہونا چاہئے

——— وہ چیز ضرور ابدی مسرت کی جھلک اپنے اندر محسوس کریگی۔

جس چیز کو خدا پیار اور افلاس کی نظروں سے دیکھتا ہے!

——— لیکن دنیا اور دنیا کی تمام نیرنگیاں سیزر کو کیوں سونپ دی

گئی ہیں؟

——— ان خیالات سے میرے دماغ کے اجزا منتشر ہو رہے ہیں!

(تلوار پر ہاتھ رکھتے ہوئے)

——— اب مجھ میں دوہری قوت آگئی!

——— زندگی و موت ——— زہر مہرہ اور تریاق ——— دونوں کے دونوں

میرے پیش نظر ہیں!

——— یہ چیزیں ایک ہی منٹ کے اندر میرا خاتمہ کر دیں گی! لیکن یہ کتاب

مجھے بتاتی ہے کہ میں کبھی نہیں مرونگا!

——— روح ایسا کرنے سے مسکراتی ہے!

——— تلوار کھینچنے پر کھل کھلا کر ہنس پڑتی ہے اور جنگ کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے

——— ستارے افسردہ ہو کر آسمان سے ٹوٹ کر گر جائیں گے ——— سورج

کی لمعانیت ماند پڑ جائے، فطرت کی رنگینیاں سیاہ کوئلہ میں تبدیل ہو جائیں

——— لیکن روح ہمیشہ شباب و رعنائی کی آغوش میں اٹھکیلیاں کرتی

رہیگی، تمام عناصر کے جھگڑے سے محفوظ رہیگی، ایک ایک لمحے کی تباہی
اور دنیا کی ہونا کی سے بے پرواہ رہیگی!
لیکن اس وزنی اور بھاری چیز کا کیا مطلب ہے جو مجھ سے آویزاں
ہے؟ یہ سستی و کاہلی ہے جو تمام اعضا میں سرایت کر گئی ہے!
فطرت کی ستم ظریفی اور تباہی سب کی سب غائب ہو جائیگی!
—— دوبارہ پھر میں کہتا ہوں کہ میری روح اپنی تمام قوت و طاقت

کے ساتھ قفس عنصری سے پرواز کر جائیگی —— اور وہ سری جہاں؟
تکلیف و مصیبت کا عنصر بالکل نہیں ہے! تو زندگی پیدا کرے گی!
گناہ اور تکلیفیں انسان کے آرام و راحت کو معطل
کر سکتی ہیں لیکن میں ان باتوں سے بالکل نہیں ڈرتا —— میں
تو صرف نیند یا موت کو اپنے لیے انتخاب کرتا ہوں
(انگریزی سے)

راگ سورداس ملار یا سور ملار

(از مسٹر اے اسلام آمیر انکم ٹیکس افسر و سابق جائنٹ ایڈیٹر میوزک آف انڈیا)

(نوٹیشن کے اشارات کے لیے مسٹر محمد حسین خسرو کی تضمین بھٹیالی آئندہ قسط میں دیکھیئے)

یہ راگ سارنگ اور ملار کے ملاپ کا روپ ہے۔ اس کا سروپ اوڈو کھاڈو یا اوڈو سمپورن ہے یعنی اروہی میں پانچ سُر لگتے ہیں گا اور دھی ورجت ہیں اور امروہی میں ایک مت سے گا ورجت ہے دوسرے مت سے کوئی سُر ورجت یا غائب نہیں۔ یہ کافی ٹھاٹھ کا راگ ہے۔ اس کا وادی ما یا کسی کے مت میں پا ہے اور سموادی سا ہے

اس راگ کو اکبر بادشاہ کے زمانہ میں بابا سورداس نے اختراع کیا تھا۔ اسمیں ملار راگ ایسے جھلکتا ہے سا۔ رے ما۔ ماپا۔ ما۔ رے مارے پا۔ مارے۔ سا
یہ تان بار بار آتا ہے۔ سا، ما اور پا یہ تینوں سروں کا پھیلاوا ہے یعنی ان ہی سروں کو زیادہ دکھایا جاتا ہے اور تان پلٹے جاتے ہیں، اس میں ماپانی سا رے نا۔
ما۔ نادھی پا یا سا ناماپا۔ ما۔ نادھی پا یہ تان خاص ہیں۔ نادھی پا یہ تان لیتے وقت دھی کو بالکل ملانا نہیں چاہیئے ناماپا کی تان بہت ہی میٹھی اور خوبصورت ہے
اس کے انترے کا اٹھاؤ سارنگ کی طرح ہے۔ ماپا۔ نی سا۔ سا۔ رے نی سا۔ ایسا اکثر ہوتا ہے۔ اس راگ کا پھیلاؤ تینوں سپتکوں پر ہوتا ہے۔ یہ
برسات کا موسمی راگ ہے اور اس موسم میں ہر وقت گایا جاتا ہے۔ ویسے تو اس کو دوپہر کو سارنگ کے وقت گاتے ہیں۔ اگر گا کا استعمال ہو تو خیال کا تماکے
ایسی تان ہوگی۔ سا۔ رے نا۔ ماپا۔ ما۔ نادھی پا۔ مارے۔ سارے پاگا۔ مارے۔ سا۔ اس میں دھی یا مارے کی میند اور تان سورٹھ سی ہوتی ہے
اروہی:۔ سا۔ رے مارے۔ ماپا۔ نی۔ اوروہی:۔ سا۔ ناپا۔ ما۔ نادھی پا۔ مارے سا۔ یا سا۔ نادھی پا۔ مارے سا
پکڑ:۔ یا خاص تان۔ سا۔ رے ما۔ پاما۔ نادھی پا۔ مارے سا

ہندی نظم:۔ از امیر۔ **راگ سور ملار۔ تال تتالہ (۱۶ ماترہ)** (یہ گیت کلکتہ ریڈیو میں مسٹر خسرو و مسز حسنہ بانو خاں نے گائی تھی)

باد ر جھو لے بوندن جھولے :: رس متواری ساون جھولے
امنگ بھری ہے سب مدھماتی :: یاد تمہاری ساجن جھولے
مورواپکارے آؤ آؤ :: کان میں تیری آون جھولے
پی کے پریم کی مدھوا پی کر :: پینگن لے کر تن من جھولے

+	۳	۰	۱
سا - سا نی با - د ر	سا رے رے سا نا جھو - لے -	دھی - دھی ما بوں د ن	دھی - پا جھو لے
پا نا پا ما رس م ت	رے رے وا ری	رے ما پا نا سا - ون	دھی ما پا جھو - لے
ما ما پا پا مور وا پ	سا - سا کا - رے	رے نی سا آ - ؤ	رے نی سا آ - ؤ
نی سا رے نا کا - ن میں	رے - سا تے ری	نا - دھی ما آ - ون	دھی - پا جھو لے
نا سا رے پا ا منگ بھر	نا رے رے ری ہے	گا رے سا نا سب م دھ	رے - سا ما - تی
سا رے ما پا یا - د	دھی - دھی ری	نا دھی پا ما سا - ج ن	دھی پا جھو لے
رے - رے - [illegible]	سا نا پا پا [illegible]	ما پا سا [illegible]	رے نی سا [illegible]
نی سا رے ما [illegible]	رے - سا لے - کر	نا نا دھی ما تن م ن	دھی پا جھو لے

التجا

حقیر

۳۰۔ دسمبر سے اس وقت تک چاندنی راتوں کی اوٹ سے جاپانی بھیڑیوں نے کلکتہ پر متعدد ہوائی حملے کیے لیکن کچھ بگاڑ نہ سکے۔ جیسا کہ میں شذرات میں لکھ چکا ہوں میرا یہ خیال نہیں کہ لوگ جاپانیوں کی ہوائی آتش بازی سے ڈر کر یہاں سے بھاگ جائیں میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس وقت ہر شخص کو عزم و ہمت سے کام لینا چاہیے لیکن عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کا مقام خطر میں ٹھہرنا اور صوبائی حکومت کے لیے مصیبت بن جانا کسی طرح اچھا نہیں سمجھا جا سکتا۔

میرے ایک سی پی کے دوست جو عرصہ دراز تک کلکتہ کا نمک کھا چکے ہیں اِن دنوں اپنی معاشی مجبوری کی سزا بھگتنے کیلئے یہاں سے ہزاروں میل دور پھینک دیے گئے ہیں۔ اُن کی "جنت حیات" یہیں ہے۔ وہ بمباری کی خبر سن کر یہاں چلے آئے ہیں۔ یہ نظم انہیں کے جذبات کی ترجمانی کر رہی ہے۔

مقام دہشت و جائے خطر ہے کلکتہ
مصیبتوں کے لیے رہگذر ہے کلکتہ
فدائے جنگ کے زیر نظر ہے کلکتہ
خبر بھی ہے کہ اہم کس قدر ہے کلکتہ
ذرا شعور سے لو کام، غور فرماؤ
یہاں سے دور خدا کیلئے چلی جاؤ

فضائے شہر ہے اب شعلہ بار، دیکھو تو
ہوا لپکتی ہے بے اختیار دیکھو تو
ہے آگ رقص میں پروانہ وار دیکھو تو
برس رہے ہیں وہ بم بار بار دیکھو تو
فضول ضد سے نہ جلتی پہ تیل برساؤ
یہاں سے دور خدا کے لیے چلی جاؤ

ہے چاندیا کسی دیو سیہ کا کاسۂ سر
کہ تاجِ قہر ہے ضحاک کا ضیا گستر
سیاہ آنکھوں سے روتے ہیں انجم و اختر
بنی ہے روشنی آفات کے لیے زیور
سجا دلوں پہ بلاؤں کی غور فرماؤ
یہاں سے دور خدا کے لیے چلی جاؤ

کٹورا چاند کا زہر آب کا ہے پیمانہ
روپہلی چاندنی ہے تلخیوں کا افسانہ
شباب پر ہے بلاؤں کا رقص مستانہ
فلک نے کھول دیا ہے ستم کا میخانہ
اٹھاؤ سازِ خرد، گیت عقل کے گاؤ
یہاں سے دور خدا کے لیے چلی جاؤ

کہاں کا لطف ستمگر ہیں چاندنی راتیں
دہکتی آگ کی چادر ہیں چاندنی راتیں
بلا و قہر کا بستر ہیں چاندنی راتیں
اندھیری راتوں سے بدتر ہیں چاندنی راتیں
اب آنکھیں کھول کے دیکھو، نگاہ دوڑاؤ
یہاں سے دور خدا کے لیے چلی جاؤ

لگی ہے آگ زمیں میں ہیں مشتعل تارے
فلک کے رنگ ستم سے ہیں منفعل تارے
ہیں ماہتاب کے پردے میں مضمحل تارے
کسی غریب کے ہیں ریزہ ہائے دل تارے
تڑپ رہی ہے فضا درد کرب سے، آؤ
یہاں سے دور خدا کیلئے چلی جاؤ

ستاروں کا نہیں کوئی شمار، جانے دو
برسے ہیں بکھرے ہوئے دانہ وار، جانے دو
تقیر صید میں لیل و نہار، جانے دو
نہ کھیلو اب مہ و خور کا شکار، جانے دو
برا یہ وقت ہے، دامِ نظر نہ پھیلاؤ
یہاں سے دور خدا کے لیے چلی جاؤ

مہیب کتنی یہ جُھنیاگری فضا کی ہے
ربابِ قہر ہے جو موج بھی ہوا کی ہے
جگر خراش صدا مطرب جفا کی ہے
ہٹاؤ کان کہ یہ راگنی بلا کی ہے
دھمک بموں کی قیامت ہی، ہوش میں آؤ
یہاں سے دور خدا کیلئے چلی جاؤ

ربابِ وقت سے کیا تلخ لے نکلتی ہے
اک ایک تار میں فریاد سی مچلتی ہے
وہ راگنی دلِ مریخ میں جو پلتی ہے
غضب ہے بربطِ ناہید سے اُبلتی ہے
فریبِ حُسنِ سماعت نہ پے بہ پے کھاؤ
یہاں سے دور خدا کے لیے چلی جاؤ

زباں پہ ہے کہ نہیں ہندیوں کے ہم دشمن
دکھا رہے ہیں سیاست کا پیچ و خم دشمن
نشانہ بازی مگر جانتے ہیں کم دشمن
کہ شہریوں پہ بھی برسا رہے ہیں بم دشمن
نہ ریڈیو پہ سنی بات دھیان میں لاؤ
یہاں سے دور خدا کیلئے چلی جاؤ

یہ مانتا ہوں کہ وہ دن کو آ نہیں سکتے
جو آ بھی جائیں تو ہمت دکھا نہیں سکتے
دفاعی نظم کی قوت گھٹا نہیں سکتے
ہوائی توپوں سے آنکھیں ملا نہیں سکتے
خطر کا شب کو تو امکاں ہے، دل کو سمجھاؤ
یہاں سے دور خدا کے لیے چلی جاؤ

نہیں ہو مرد کہ تم جھیل لو اک اک آفت
حنائی ہاتھوں میں سختی کہاں، کہاں قوت
حیا کا حکم یہی ہے چھپی رہے ہمت
سمجھ لو خوب کہ عورت ہو مشرقی عورت
نسائیت کا کرو پاس کچھ تو شرماؤ
یہاں سے دور خدا کے لیے چلی جاؤ

نہیں کرم پہ اسے اختیار چھوڑو بھی
سماج کا ہے ستم ہی شعار چھوڑو بھی
اِدھر ہے کنبہ اُدھر رشتہ دار چھوڑو بھی
ہے مشکلوں کی کھڑی اک قطار چھوڑو بھی
رکاوٹیں ہیں خیالی نہ ان سے گھبراؤ
یہاں سے دور خدا کے لیے چلی جاؤ

فرازِ کوہِ تصنع پہ جلوہ گر ہو تم
درونِ آئینۂ برف خود نگر ہو تم
تکلفات کے یخ بستہ اوج پر ہو تم
علوئے سوزِ محبت سے بے خبر ہو تم
روایتوں کی بلندی سے اب اُتر آؤ
یہاں سے دور خدا کیلئے چلی جاؤ

کھنچیگی تیغِ عداوت شعار خوب کہی
کرے گا مشقِ ستم روزگار خوب کہی
بُرا کہینگے تمہیں رشتہ دار، خوب کہی
اُٹھا سکو گی نہ طعنوں کے بار خوب کہی
سمجھ چکا ہوں میں مجھے نہ اور سمجھاؤ
یہاں سے دور خدا کیلئے چلی جاؤ

یہ جانتا ہوں کہ گُل پیرہن ہے کلکتہ
تمہارے دم سے حریفِ چمن ہے کلکتہ
کلام اس میں نہیں انجمن ہے کلکتہ
یہ مانتا ہوں تمہارا وطن ہے کلکتہ
مگر وطن کی جو حالت ہے دل کو سمجھاؤ
یہاں سے دور خدا کے لیے چلی جاؤ

میں جانتا ہوں مرے ساتھ چل نہیں سکتیں
مری اُمید کے سانچے میں ڈھل نہیں سکتیں
حدودِ شرم سے باہر نکل نہیں سکتیں
تم اپنی رسم و روایت بدل نہیں سکتیں
پھر اس کو چھوڑ و کہیں اور عقل دوڑاؤ
یہاں سے دور خدا کے لیے چلی جاؤ

بُرا نہ مانو تو میرا وطن بُرا کیا ہے
وہاں حقیر کا گھر ایک جھونپڑا سا ہے
مرے عزیزوں کو بھی دید کی تمنا ہے
اک ایک روزنِ در چشمِ شوقِ مو سا ہے
اب اپنے رُخ سے حیا کی نقاب سرکاؤ
یہاں سے دور خدا کے لیے چلی جاؤ

سمجھ چکے ہیں مری وجہ یاس گھر والے
کہ ہیں بڑے ہی طبیعت شناس گھر والے
مرے جنون کا کرتے ہیں پاس گھر والے
تمہیں نہ دیکھ سکینگے اُداس گھر والے
انہیں بھی اپنا سمجھ لو کرم یہ فرماؤ
یہاں سے دور خدا کیلئے چلی جاؤ

قصیدہ جوش میں خوش آمدید کا سننا
زبان سے در و دیوار کی دعا سننا
سرور و کیف میں ڈوبی ہوئی صدا سننا
مرے عزیزوں کی آوازِ مرحبا سننا
خیال دل میں نہ بیگانگی کا کچھ لاؤ
یہاں سے دور خدا کے لیے چلی جاؤ

ہوائیں بر ربطِ زلف سیہ بجائیں گی
فضائیں سازِ تمنا پہ گیت گائیں گی
ادائیں جلووں کی اک انجمن سجائیں گی
نگاہیں عارضِ روشن سے جگمگائیں گی
چراغِ حُسنِ فروزاں سے نور برساؤ
یہاں سے دور خدا کے لیے چلی جاؤ

مرے مکان میں رہنا اگر نہیں اچھا || تو میرے دیس میں ہی دوسرا بھی مل سکتا
جو میری وجہ سے میرا وطن بھی ہے رسوا || تو خیر ڈھونڈو کہیں اور ہی مقام اپنا
مگر ٹھہر کے یہاں اب مجھے نہ تڑپاؤ
یہاں سے دور خدا کیلئے چلی جاؤ

خیال ہے کہ تمہارے اُجالی ذات مری || تمہاری ذات میں سمٹی ہے کائنات مری
تمہیں ہو بلاشبہ جنت حیات مری || میں ہاتھ جوڑتا ہوں مان بھی لو بات مری
یہ التجا ہے حقیر التجا نہ ٹھکراؤ

اُردو شاعری پر ایک نظر

از کلیم الدین احمد۔ بی۔ اے (کیمبرج)۔ پروفیسر ادب انگریزی۔ پٹنہ کالج
قیمت درج نہیں۔ عظیم پبلشنگ ہاؤس۔ بانکی پور، پٹنہ سے مل سکتی ہے

کلیم صاحب کی یہ کتاب اُردو شاعری سے ذوق رکھنے والے حضرات کے لیے فکر و خیال کی نئی نئی راہیں کھول کر اُنہیں مسلّمہ اور پارینہ قدروں کو از سرِ نو آنکنے پر مجبور کرے گی کیونکہ مصنف نے اس میں اردو شاعری کی خامیوں کی طرف بلکہ بالواسطہ اردو تنقید کی جانب بھی ذی فہم اصحاب کی توجہ مبذول کیا ہے۔ صاحبِ مقدمہ کے الفاظ میں "یہ کتاب دراصل ان حضرات کے لیے لکھی گئی ہے جو اسے متانت اور سکونِ قلب کے ساتھ پڑھ کر اگر انہیں کسی خیال سے اختلاف ہے تو اس کا سنجیدگی کے ساتھ جواب دیں اور اگر اتفاق ہے تو اس کی راہبری سے مستفید ہوں" اتنا ہی نہیں بلکہ وہ ہمیں مزید یقین دلاتے ہیں "اس مقالہ کا مقصد نہ بیجا نکتہ چینی ہے۔ نہ بال کی کھال کھینچ کر مصنف کو ذکاوت و فراست کا ثبوت دینا ہے۔ جن اصول کی میزان پہ اردو شاعری کو تولا گیا ہے وہ بھی خود ساختہ نہیں۔ یہ معیار تمام متمدن دنیا میں تسلیم کر لیے گئے ہیں۔ ان کا تعلق اُن جذبات سے ہے جو ہمیشہ ہزاروں نیرنگیوں میں یکرنگی کا جلوہ دکھاتے ہیں۔ توجہ بنیادی عناصرِ شاعری کی طرف مبذول کی گئی ہے اور اگر کہیں جزئیات پر بحث ہے تو اُنہیں جزوی صورت میں پیش کیا گیا ہے"

صاحبِ مقدمہ نے اسی سلسلہ میں ایک صفائی پیش کی ہے "یہ مقالہ اصنافِ شاعری کی تنقید ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ نہیں اس لیے بہت سے شعرا کا تذکرہ بالکل نہیں اگرچہ اردو ادب میں وہ کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ غزل کو نسبتاً زیادہ جگہ دی گئی ہے۔ کیونکہ اردو شعرا کا رجحان اُس طرف زیادہ ہے" اور یہ حقیقت ہے کیونکہ کتاب کے دونوں حصوں میں یعنی حصۂ اول جو قدیم شاعری پر محیط ہے اور حصۂ دوم جس میں جدید شاعری پر بحث ہے۔ زیادہ التفات غزل ہی کی طرف رہا ہے۔ دوسرے اصنافِ شاعری کی طرف نظر کی ضرور گئی ہے مگر کلیم صاحب نے اُن کی جانچ تول میں موازنہ اور مقابلہ کے لیے غزل ہی کو سامنے رکھا ہے۔ اور ہر جگہ وہ ایک ہی نتیجہ پر پہنچے ہیں جو صاحبِ مقدمہ کے الفاظ میں مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔ "اردو شعرا کے تخیل میں بالطبع انتشار ہے۔ اُن کے احساسات کا دائرہ تنگ ہے۔ وہ ایک جذبہ سے پورے طور پر لطف اندوز نہیں ہو سکتے اور نہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ بے صبری کے ساتھ ایک خیال سے دوسرے بے ربط خیال کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور سب سے بڑا نقص ان کی ذہنیت میں یہ ہے کہ وہ اخلاقی مسائل۔ فلسفیانہ یا تصوفانہ خیالات اور جذبات کے مختلف الطبع ہونے کو نہیں پہچان سکتے۔ ساتھ ساتھ غزل میں تکرارِ صوت مطلع و مقطع کی موجودگی سے ظاہری تناسب اور صورتِ تکمیل نظر آتی ہے جس سے شاعر کی خواہشِ صناعی کی آسودگی ہوتی ہے"

غزل کے انتشارِ خیالات پر بحث کرنے کے بعد مصنف نے مسلسل غزل کا بھی ذکر کیا ہے اور غالب کی مشہور غزل ——— مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے ——— کا حوالہ دیکر یوں رائے دی ہے "یہ نفسِ مضمون واحد ہے جس کا اوّل مصرع میں مکمل اظہار ہے۔ ——— دل کو پھر ہوس ہے کہ عشق کی کاوشوں اور دل فریبیوں سے لطف اندوز ہو۔ اسی کا مختلف طرز میں اظہار ہے۔ ... حسن ہے تو محض لفظی اور ساری تحسین دقتِ جدّتِ طرازی ہے۔ یہ سوال بھی پیدا نہیں ہوتا کہ شاعر کو اس نظم میں کسی تجربہ کا اظہار مقصود بھی ہے کہ

نہیں ہے۔ ایک دوسری غزل (از خواجہ میر درد) جس کا مطلع یہ ہے۔

کاش تا شمع نہ ہوتا گذر پروانہ　　　تم نے کیا قہر کیا بال و پر پروانہ

ان کی نظروں میں ایک ہی خیال کا بار بار اعادہ" نہیں۔ پھر بھی اس غزل کی مثال اُن کے خیال میں پچی کاری کی سی ہے مختلف ٹکڑے جڑے ہوئے نظر آتے ہیں اور ایک قسم کا تناسب اور حسن پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن وہ مطابقت کہاں جو کسی حسین گلاب کے مختلف اجزا میں ہوتی ہے۔ وہ ربط کہاں جو اُس کے رنگ و بو میں ہوتا ہے ـــ اُن کا فیصلہ ہے کہ" یہ چیز نظم میں ملتی ہے مگر مربوط غزل میں میسر نہیں ہو سکتی"۔ـــ

قطعہ ایک جُدا صنف کی حیثیت سے بلند ترین شاعری کا وسیلہ بن سکتا تھا مگر اردو شعرا نے ایسے قطعات جو غزل سے علیٰحدہ لکھے گئے ہیں یا تہنیت میں لکھے گئے ہیں یا تاریخ کے طور پر یا کسی خاص موقع سے وابستہ۔ کلیم صاحب کا نظریۂ شاعری آسان الفاظ میں یہ ہے کہ اشعار پڑھ کر کوئی مکمل تجربہ دماغ و تخیل پر نقش ہو جائے۔ اور وہ اسی لیے ذوق کے اس قطعہ کے متعلق لکھتے ہیں

کہوں کیا ذوقؔ احوال شبِ ہجر　　　کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے۔

اگر یہ کامیاب ہوتا اور اگر اردو شعرا اس قسم کے کامیاب قطعوں پر اس توجہ کا عشر عشیر بھی صرف کرتے جو اُنھوں نے صنف غزل پر قربان کر دی تو غالباً اردو شاعری کی ترقی زود تر ہوتی۔ غالبؔ کے قطعہ " اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل" کی شوکت کے وہ قائل ہیں مگر چاہتے ہیں کہ اخلاقی مضامین کے علاوہ شخصی مشاہدہ یا ذاتی تجربہ بھی قطعہ کا موضوع بنایا جاوے

کلیم صاحب کو قصیدہ۔ مثنوی۔ مرثیہ۔ غرض ہر صنف شاعری میں اُسی ربط و تسلسل کی تلاش ہے جس کو وہ اُس مطابقت کے مثل سمجھتے ہیں جو کسی حسین گلاب کے مختلف اجزا میں ہوتی ہے۔ اور اس میں انھیں ناکامی ہوتی ہے چنانچہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ" روح شاعر ہنوز گریزاں ہے" اور ان کی یہ کتاب اس یاس انگیز جملہ پر ختم ہوتی ہے " اردو شاعری کا مستقبل امید افزا نظر نہیں آتا " مصنف نے جس لیاقت اور وضاحت کے ساتھ اپنے خیالات کو پیش کیا ہے ہم ان کی دیانت یا اُن کے اخلاص پر شبہ نہیں کر سکتے۔ جدید شاعری کے رجحانات کا جو تجزیہ انھوں نے کیا ہے وہ بالکل درست اور بے کم و کاست جائز ہے۔ اور شاعری میں ربط و تسلسل کا تلازمہ بھی ان کی زبردستی نہیں۔ مگر کہنا یہ ہے کہ غزل کے علاوہ قصیدہ۔ مرثیہ اور بالخصوص مثنوی اور قطعہ ـــ مزید بر ان نظموں میں مربوط اور بزرگ شاعری ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔ یہ تو وہ خود تسلیم کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اردو شعرا اس صلاحیت کو اپنے مصرف میں نہ لا سکے۔ تاہم اگر انھیں اس طرف مائل کیا جائے تو اردو شاعری کا مستقبل ہرگز یاس انگیز نہیں کہا جا سکتا۔ صاحب مقدمہ کی زبان میں یہ کتاب " اصنافِ شاعری کی تنقید ہے۔ اردو شعرا کی تاریخ نہیں " اور اصناف میں صرف ایک صنف یعنی غزل ایسی بر آمد ہوئی ہے جو بلند ترین شاعری کا وسیلۂ اظہار نہیں بن سکتی۔ باقی تمام اصناف پر ایسا الزام عائد نہیں ہوا ہے۔ اس لیے چونکہ اب تک مثنوی یا قطعہ۔ یا مرثیہ میں مشاہدات یا تجربات کو صداقت اور ربط کے ساتھ بدرجۂ اتم پیش نہیں کیا گیا۔ اردو شاعری کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا ـــ دراصل یہ نقص اردو شعرا کا ہے نہ کہ اردو شاعری کا ـــ رہ گئی غزل۔ اس کے اشعار میں ربط کی تلاش سعی لاحاصل ہے اور میرے خیال میں اس کا حسن انتشار ہی میں ہے۔ مربوط اور مکمل تصویر کشی کے لیے دوسرے اصناف شاعری موجود نہ ہوتے اور اردو شاعری کی کائنات صرف غزل ہی تک محدود ہوتی تو اس اعتراض کی روشنی میں تدارک یا تغیر کو سوچنا ضروری ہو جاتا مگر انکی موجودگی میں یہ درد سر ہی کہلائیگا ـــ کنایہ اور تصریح کے فرق کو کلیم صاحب خوب سمجھتے ہونگے اور وہ اس سے بھی بے خبر نہ ہونگے کہ بعض اوقات " جلوہ " کے بجائے " جھلک " ہی انسان کو بسمل کر دیتی ہے۔ اس لیے غزل کی مختصر ماجرائی اور بوقلمونی پر متاسف ہونے کی ضرورت نہیں بشرطیکہ یہ ہے کہ غزل میں جن مضامین کی " جھلک " ہو وہ واقعی حسین اور دلکش ہوں۔ اور حسن اور دل کشی کی سچی تصویر کسی اندرونی جذبہ سے مجبور ہوئے بغیر نصیب نہیں ہو سکتی۔

اردو شعرا کو اسی لیے یہ ذہن نشین کر لینے کی ضرورت ہے کہ وہ شاعری اور نظم کے صحیح مفہوم کو سمجھیں۔ شاعر کے لیے جو اوصاف لازمی ہیں وہ حاصل کریں یعنی قوت حاسہ۔ تخیل، ادراک ظاہری و باطنی دنیا کا مشاہدہ۔ سچے فطری حسیات و تصورات۔ شخصی تجربات کو اپنے ماحول

اپنے مذاق کا لحاظ رکھتے ہوئے ترجمانی کریں۔ کورانہ اور ان کی پسند میں لکیر کے فقیر نہ بنیں بلکہ اس میں قوت اختراع سے کام لیں۔ نئے نئے بنوایجاد کریں یا کسی مغربی ادب سے حاصل کریں۔ جذبات محض، خیالات محض کو تخیلی تجربہ کی شکل میں تبدیل کرنے کی عادت ڈالیں۔ یہ کہنا انتہائی کم ظرفیت کا ثبوت دینا ہوگا کہ اردو میں بلند اور برتر شاعری کی گنجائش نہیں

مصنف نے اس کتاب میں "گل و نغمہ" (از ڈاکٹر عظیم الدین احمد۔ پٹنہ) کی بہت تعریف کی ہے "اس کی اشاعت سے اردو شاعری میں ایک نئے اور خوشگوار باب کا اضافہ ہوتا ہے" "یہ شاعر کی آزادی فکر اور قوت اختراع کا محکم ثبوت ہیں" وغیرہ وغیرہ قسم کے جملے اس کی شان میں ملتے ہیں۔ افسوس ہے کہ راقم الحروف کو "گل و نغمہ" کے مطالعہ کا شرف نصیب نہیں ہوا اور اس کتاب میں چند ہی اقتباسات ہیں۔ اس لیے ممکن ہے میری رائے نامکمل مواد کی بنا پر بالکل صحیح نہ ہو۔ جو اقتباسات اس کتاب میں ہیں۔ ڈاکٹر عظیم الدین کی فکر رسا اور صداقت اظہار پر دلالت کرنے کے باوجود انہیں اردو شعرا کی صف میں وہ جگہ نہیں دلا سکتے جس کے کلیم صاحب دعویدار نظر آتے ہیں ——— "وہ برسات اور شاعر" میں حقیقی زمین کی مدد سے عرض مطلب کی کوشش بے شک قابل داد ہے مگر آخری شعر میں جو دعائیہ رنگ اختیار کیا گیا ہے وہ اتنا ہی بھدّا ہے جتنا کہ شوق کی نظم "پھول کی فریاد" میں آخری حصہ کی اخلاقیت

کہے یہ کون کہ اللہ سے ڈر۔ او گل چیں ——— یہ بے زباں ہے نہ اس پر ستم کراے گل چیں
وہ کیا سنے گا اسے کوڑیوں کی لالچ ہے ——— طمع ہے سخت بری چیز۔ شوق یہ سچ ہے

طبیعت کو منغض کردیتی ہے ——— اسی طرح "سفر لندن" کے یہ اشعار بھی قابل توجہ ہیں۔

سمندر کی وہ لغزش اور فلک کی اُسپہ خاموشی ——— وہ شب کی چاندنی۔ تاروں کا سکتہ۔ خود فراموشی
ہمارے ساتھیوں کی عیش کوشی اور مے نوشی ——— مجھے یاں ضعف۔ غفلت سر میں چکر۔ اور مدہوشی
کہاں کا عیش کس کو چین اب کیسی تن آسانی ——— غریبی۔ بےکسی۔ تنہائی۔ بیماری۔ گران جانی

کلیم صاحب اسے بحری سفر کے غیر عادی لوگوں کی مشکل کا شاعرانہ پیرایہ میں بیان کیا جانا تصور کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کی تشریح بالکل ظاہر ہے بلکہ یہ گرانی اور نامکمل عرض مطلب جو بالخصوص آخری شعر سے عیاں اور جو وزن کی موجودگی کا نتیجہ ہے۔ نثر میں نہ دکھائی دیتا ——— کلیم صاحب پھر بھی ان نظموں کو ظاہری و باطنی حسن کی نایاب "مثالیں" ہی سمجھتے ہیں ——— "تعارف" میں بخط جلی اعلان کیا گیا ہے کہ اس کتاب میں شعرا کے کلام پر ناقدانہ بحث کی گئی ہے اور وہ بھی انفرادی یا شخصی حیثیت سے نہیں۔ مگر کتاب کے اس باب سے "تنقید" کے ساتھ ساتھ "سعادت" بھی ٹپکتی ہے اور ہمیں حیرت ہے کہ کلیم صاحب اپنے والد ماجد کی اس تخلیق میں نہ صرف جذب ہوگئے ہیں بلکہ اس میں کسی نقص و خامی کا احساس ہی نہیں کرسکتے ان کی شخصیت بزرگ۔ اور انکی ذہنیت بلند۔ وہ اس کتاب میں جذب ہوکر بھی اس سے الگ رہ سکتے اور اسکی خامیوں کو آشکار کرسکتے تھے۔

الغرض "اردو شاعری پر ایک نظر" ایک وسیع کتاب ہے جس کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں ہوگا۔ کلیم الدین صاحب قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے ایسی پرمغز تصنیف اہل ذوق کے سامنے پیش کی۔ کیا ہی اچھا ہو کہ صاحب مقدمہ پروفیسر فضل الرحمن بھی اس معاہدہ کی ایفا کا خیال کریں جو لندن میں انھوں نے کلیم سے کیا تھا ——— کلیم نے شاعری کی تنقید کا جو ذمہ لیا تھا وہ پورا کردیا۔ اب نثر پر لکھنے کا وعدہ پروفیسر صاحب کا پورا کرنا چاہئے ——— اس طرح اردو ادب کی اصلاح کا ایک خاکہ تیار ہو جائیگا۔

خواجہ قدوائی

"گفتو بائے" ——— ماہانہ رسالہ قیمت فی پرچہ دو آنے۔ ایڈیٹر دیپ نرائن مٹھولیا۔ مقام اشاعت: ۔ ۳ کارنوالس اسٹریٹ۔ کلکتہ

تقریباً ایک سال سے ہندی کا مذکورہ بالا ماہانہ رسالہ آسمان صحافت سے برابر جلوہ گر ہو رہا ہے۔ ماہ رواں کا پرچہ ہمارے پیش نظر ہے۔ ہم نے اس کے مضامین، افسانے اور نظموں کا مطالعہ کیا۔ لکھنے والوں میں سے بابو کے پی لسبت رام جی، پنڈت دیپ مٹھولیا، جناب کانتا اور مشہور و معروف شیام اور بی بی... ادبی حلقوں میں کافی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی کے مضامین ہیں۔ اگر ناقدانہ نظر سے دیکھا جائے تو زبان میں بہت سی خامیاں نظر آئیں گی۔ مثلاً دو تین مضمون نگاروں نے اپنے مضامین میں سنسکرت کے الفاظ اس طرح زبردستی ٹھونسے ہیں کہ ہماری ہندی کا گلا گھونٹ ڈالا ہے۔ ہماری رائے میں زبان زیادہ سے زیادہ آسان اور عام فہم ہونا چاہئے تاکہ... ایسے ہندی سے ذوق رکھنے والے حضرات رسالہ "گفتو بائے" کی سرپرستی کرکے اسے کامیاب بنانے کی کوشش کرینگے

"کلکتہ یونیورسٹی"

میرے خیال میں ہندوستان بھر میں شاید کلکتہ یونیورسٹی ہی ایک ایسی یونیورسٹی ہے، جہاں اردو، برائے نام رکھی گئی ہے۔ جو کورس بھی ہے انگریزی میں۔ اردو، ہندی برائے نام۔ ہونا یہ چاہئے تھا کہ اردو، ہندی اور بنگالی میں تمام کورس ہوتا اور انگریزی برائے نام ہوتی۔

اس کے علاوہ اردو، ہندی (اور بنگلہ میں معلوم نہیں) کے کورس میں صرف دو یا تین کتابیں رکھی گئیں ہیں۔ برعکس اس کے انگریزی ادب میں چھ یا سات کتابیں ہیں۔ غریب طالب علم اس کو رٹتے رٹتے تھک جاتا اور بقول ملیح آبادی ایڈیٹر روزانہ "ہند" "انگریزی درسگاہوں میں لڑکوں کے دماغوں پر اس قدر بوجھ ڈال دیا جاتا ہے کہ وہ باسانی برداشت نہیں کرسکتے۔ بہت سے تپ دق کا شکار ہو جاتے ہیں اور اکثر زندگی بھر کے لیے دماغی کمزوری میں مبتلا رہتے ہیں "یورپ اور امریکا کی یونیورسٹیوں کا نصاب بہت ہلکا ہے . . . . لیکن ہندوستانی یونیورسٹیوں میں بکثرت علوم اور بے شمار کتابوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ طالب علم اگر کسی ایک کتاب میں فیل ہو جائے تو اسے مجبور کیا جاتا ہے کہ سال بھر تک پھر انہی رٹی ہوئی چیزوں کو رٹے جنہیں وہ پورے بارہ مہینے رٹ کر خستہ اور ہلکان ہو چکا ہے۔

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ انگریزی ادب پر اس قدر کیوں توجہ دی گئی ہے۔ ہونا یہ چاہئے تھا کہ ملک ہندوستان کے اسکول اور کالجوں میں انگریزی کا ایک یا دو کتابیں ہوتی اور ہندوستانی زبان میں اس سے زیادہ۔ اور بقول صاحب موصوف کے "اجنبی زبان کے ذریعے کوئی قوم بھی تعلیم یافتہ نہیں بن سکتی۔ لیکن بدبخت ہندوستان کو مجبور کر دیا گیا کہ انگریزی زبان ہی کے ذریعہ تعلیم حاصل کرے"

آج ہمارے طالب علموں کو چھٹے درجہ سے لیکر دسویں تک تاریخ، جغرافیہ، جیومیٹری اور الجبرا تو ہندوستانی زبان میں پڑھایا جاتا ہے لیکن امتحان میں پرچہ انگریزی زبان میں ملتا ہے۔ اس سے طالب علم اچھی طرح سمجھ نہیں سکتا۔ تو پھر کیوں نہ پرچہ بھی اُسی زبان میں آئے۔ جس زبان میں کہ اس کو تعلیم دی گئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اردو کے پرچہ میں بھی جابجا انگریزی کے جملے نظر آئیں گے۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا اردو ادب میں ایسے جملے نہیں ہیں کہ جس کی جگہ انگریزی کے جملے ٹھونسے جاتے ہیں۔ افسوس کہ کسی نے اس کی طرف خیال نہیں کیا اور نہ ہی طالب علموں نے اس کے خلاف آواز بلند کی۔

طالب علموں کی تکلیف اور اردو داں حضرات سے اپیل

کلکتہ یونیورسٹی کی اکثر انگریزی کتابوں کے نوٹ صرف بنگالی زبان میں ملیں گے۔ مثال کے طور پر انگریزی نظم اور نثر کے نوٹ کو لے لیجئے (Notes on English Prose and Poems) ایک وہ طالب علم جو بنگلہ جانتا ہے زیادہ نمبر لائیگا بہ نسبت اس طالب علم کے جو اردو جانتا ہے۔ کیونکہ نظم اور نثر کے نوٹ سوائے بنگالی زبان کے اور کسی زبان میں نہیں۔

ضرورت ہے اس بات کی کہ ایک انگریزی نظم اور نثر کے نوٹ اردو زبان میں بھی لکھے جائیں جس سے اردو داں طالب علم بھی اچھی طرح سمجھ سکیں اور اچھے نمبروں سے پاس ہوں۔ مگر ابھی تک بازار میں اس قسم کی کوئی بھی کتاب نہیں۔

خدا کرے کہ طالب علم اور ساتھ ساتھ مولف حضرات اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے کوئی نہ کوئی اردو کی ترقی کے لیے کوشش کریں

ایم انصاف الدین

میرے اندھیرے دل کا اجالا کب ہوگا

فلمستان

"نئی دنیا" ایک نقاد کی نظر میں!

کسی بھی فلم پر تنقید کرنا آجکل کی تجارت پرست اور خوشامد پسند دنیا میں ممکن نہیں —— اور سچ تو یہ ہے کہ اصول پرست نقاد بھی ہمارے ہاں بہت کم ہیں۔ ہر شخص کی رائے —— بلکہ دماغ پر بھی —— ذاتی مفاد کا بھوت سوار ہے اور یہ بھوت نہ اخلاص کے سامنے جھکتا ہے نہ اصول کی پروا کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں تنقید کا مفہوم بدل کر تعریف یا مخالفت کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

لیکن ہندوستان بھر میں "جدید اردو" ہی ایک ایسا پرچہ ہے جس نے صحافت کے بلند ترین معیار کو ہمیشہ سامنے رکھا ہے اور جدید اردو کے تنقید نگاروں کو اپنی خصوصیت پر ناز ہے کہ ان کے ذہن اور قلم نے ذاتی مفاد کے اندھے بہرے بھوت سے کامیاب مقابلہ کیا ہے۔

جب سے ہم نے یہ سلسلہ مضامین شروع کیا ہے بے شمار فلمیں آئیں اور چلی گئیں۔ بعض ایسی فلمیں جن پر کچھ لکھنے کی ہم نے ضرورت ہی نہیں سمجھی اور پبلک نے ان کا نام تک فراموش کر کے ہمارے طرز عمل کی تائید کی اور بعض ایسی بھی فلمیں جن پر ہم نے تنقیدی مضمون لکھے اور وہ اب تک لوگوں کے ذہن میں محفوظ ہیں اس میں شک نہیں کہ بعض فلموں کو پبلک نے غلط اہمیت دی اور بعض اچھی فلموں سے بے اعتنائی برتی لیکن یہ حقیقت بہرحال مسلم ہے کہ فلمی تنقید نگاری میں جدید اردو نے ایک خاص معیار قائم کیا ہے اور قارئین، ہمارے معاصر اور خود فلم کمپنیاں "پردیسی" "معصوم" "اجالا" "چورنگی" "پڑوسی" اور "ایک رات" پر تنقیدوں کی صحیح قدر وقیمت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔

آج پھر ہم اپنا فرض انجام دینے آئے ہیں اور غیر ارادی طور پر یہ چند سطریں لکھ گئے ہیں۔ ہمارا مقصد ڈھا بول بولنا نہیں ہے ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ تنقید نگاری کتنا مشکل فن ہے اور کامیابی کے اصولوں سے ناواقف سرمایہ داروں کے ہاتھوں مالی نقصان اٹھا کر بھی ہم نے تنقید نگاری کو صحافتی اصولوں کے ساتھ چلانے کی کوشش کر کے یقیناً ایک مثال قائم کی ہے

"نیا سنسار" ہمارے ملک کی فلمی تاریخ کا روشن ترین باب ہے اور اس فلم کی کہانی کو ہم نے سب سے زیادہ ترقی یافتہ کہانی کی شکل میں دیکھا ہے "نیا سنسار" کے مصنف خواجہ احمد عباس کی دوسری کہانی "نئی دنیا" ہے جسے مسٹر کاردار نے فلمی جامہ پہنایا ہے۔

"نیا سنسار" اور "نئی دنیا" ہم معنی الفاظ ہیں لیکن ہمیں خوشی ہے کہ ہندوستانی صنعت فلم سازی کی دیرینہ روایات کو ان میں دہرایا نہیں گیا اور "نئی دنیا" کی ہر چیز "نیا سنسار" سے مختلف ہے

اور سب سے نمایاں فرق دونوں میں یہ ہے کہ "نیا سنسار" میں افسانہ نمایاں ہے لیکن "نئی دنیا" میں کردار افسانے پر بھی چھائے ہوئے ہیں

نئی دنیا ایک سبق آموز اور دلچسپ ڈرامہ ہے۔ ڈرامے کے افراد ہیں سیٹھ دولت رام، ان کی لڑکی سادھنا، سیٹھ جی کا منیجر شرما، ٹیکسیوں کا ٹھیکیدار اکبر بھائی، بیکار گریجویٹ وسنت اور سادھنا کی سہیلی مالتی۔

وسنت گریجویٹ ہے، روشن مستقبل کی امید میں اپنی زندگی کے سولہ سال اور والدین کی بہت سی دولت اس محکمے کی نذر کر چکا ہے جہاں بیکار پیدا کیے جاتے ہیں اور اب وہ مکمل بیکار ہے!

لیکن اس میں وہ جھوٹا غرور اور باطل زعم موجود نہیں ہے جو خاندانی وجاہت اور تعلیمی اسناد سے پیدا ہوتا ہے چنانچہ وہ کوئی بھی ایسی ملازمت کرنے پر آمادہ ہے جو اسے مل سکے حتیٰ کہ ٹیکسی ڈرائیوری بھی!

اکبر بھائی بہت نیک دل اور وفا پرست آدمی ہیں۔ اور وہ وسنت کو ایک ٹیکسی چلانے کے لیے دے دیتے ہیں

[illegible]

نئی نئی ترکیبیں بتا کر اُلو بنایا کرتا ہے

اور اُس کی نئی تجویز یہ ہے کہ سب ٹیکسیاں ضبط کرلی جائیں۔ سادھنا، امیر باپ کی اکلوتی لڑکی ہے، دولتمند سماج میں پلی بڑھی ہے "فیشن ایبل سوسائٹی کی تیتریوں" میں سے ایک ہے لیکن فطری طور پر غریبوں سے دلچسپی رکھتی اور اُن کی زندگی، اُن کا رہن سہن حتی کہ اُن کا لباس بھی اُسے پسند ہے اور وہ "فینسی جلسوں" میں جاتے وقت غریبوں ہی جیسے پھٹے پرانے کپڑے بھی پہن لیا کرتی ہے۔

اور شرما سے تو اُسے بڑی نفرت ہے حالانکہ سیٹھ جی شرما جی کو اپنا داماد بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ایک روز وہ شرما کے معاملے میں سیٹھ جی سے لڑ پڑتی ہے اور وہی پھٹے پرانے کپڑے پہنے سڑک پر ایک ٹیکسی پر جا بیٹھ رہتی ہے — ٹیکسی ڈرائیور وجے سے وہ کہتی ہے کہ میں ایک غریب لڑکی ہوں اور ایک بدمعاش میرا پیچھا کر رہا ہے مجھے بچاؤ!

وجے کے دل میں پہلے ہی سے ایک مبہم تصویر موجود تھی، ہر نوجوان کی طرح وہ بھی ازدواجی زندگی کا خواب دیکھتا رہتا تھا اور اُس کے خوابوں کی ملکہ ایک ایسی غریب لڑکی تھی جو لاوارث مگر بے حد حسین ہے اور سادھنا کے حالات سن کر وہ محسوس کرتا ہے جیسے اُس کے خوابوں کی مجسم تعبیر اس کے سامنے ہے!

مغربی طرز کے ایسے اجتماع جہاں لوگ عجیب عجیب وضع کے بھیس بدل کر جاتے ہیں، سادھنا، اپنی سہیلی مالتی کے یہاں رہنے لگتی ہے اور وجے سے اس کا میل جول بڑھنے لگتا ہے لیکن وہ بدستور ایک غریب لڑکی ہی بنی رہتی ہے اور یہاں مصنف کا بیدار ذہن ہمیں ایک تلخ حقیقت سے دوچار کرتا ہے وہ سرمایہ داری کے ایک بھیانک فریب "غریبوں کی سکھی زندگی" کی فریب دہ روایت کا گلا گھونٹتے ہوئے کہتا ہے "یہ جھوٹ ہے کہ غریبوں کو اُن کے جھونپڑوں میں بڑا سکھ ملتا ہے۔

ان کا جی بھی چاہتا ہے کہ اُن کے رہنے کے لیے عالیشان محل، سیر کے لیے گاڑیاں، بیٹھنے کے لیے صوفے، پہننے کے لیے خوبصورت قیمتی لباس اور کھانے کے لیے انواع اقسام کے کھانے ہوں!

جس آدمی کا پیٹ خالی ہو اور جن کے سامنے اُس کے جگر کے ٹکڑے بھوک سے تڑپ تڑپ کر جان دے رہے ہوں وہ ایک ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر آرام کی نیند کیسے سو سکتا ہے؟"

اکبر بھائی خوش ہیں کہ انہیں بھابھی مل جانے والی ہے، وجے پھولا نہیں سماتا کہ وہ اپنی تلاش میں کامیاب رہا، اُس کے خوابوں کی تعبیر اُسے مل گئی، سادھنا مسرور ہے کہ وجے اس کی پسند کے عین مطابق ہے لیکن سیٹھ جی کے ہاں سادھنا کے کھو جانے کی وجہ سے ماتم سا بپا ہے اور اُسے ڈھونڈ لانے والے کے لیے دو ہزار روپیہ کا انعام مقرر ہو چکا ہے۔

یکایک وجے کو معلوم ہوتا ہے کہ سادھنا اُسے دھوکہ دیتی رہی ہے اور وہ سیٹھ جی کی لڑکی ہے اُس کا خیال ہے کہ اُس کے جذبات سے کھیلا گیا ہے چنانچہ وہ سادھنا کو سیٹھ جی کے پاس پہنچا دیتا ہے اور انعام کی رقم لینے سے انکار کر دیتا ہے۔

سادھنا تو وجے کو خود غرض اور دولت کا پجاری سمجھنے لگتی ہے لیکن ایک روز دفعتاً اسے معلوم ہوتا ہے کہ وجے نے ایک پیسہ بھی نہیں لیا اور وہ وجے سے صلح کی کوشش کرتی ہے مگر وجے اُسے اپنی دنیا دکھانے اپنی قیامگاہ پر لے جاتا ہے جہاں ٹوٹا پھوٹا سامان، گندہ کمرہ، پٹرول اور موبل آئل کی بدبو، اور اپنی اس کی سند دکھا کر طنز کے نشتر چلانے لگتا ہے سیٹھ جی بھی پوشیدہ طور پر اُن کے پیچھے پیچھے جا پہنچے تھے وہ یہ سب باتیں سن کر بہت متاثر ہوتے ہیں لیکن وجے اور سادھنا جب باہر نکلتے ہیں تو گھبراہٹ میں سیٹھ جی اندر ہی رہ جاتے ہیں اور اکبر بھائی کے آنے پر انہیں بھیس بدل کر چوکیدار کا پارٹ ادا کرنا پڑتا ہے۔ وہ اپنا نام رامو بتاتے ہیں اور اکبر بھائی کے ساتھ ہی رہنے لگتے ہیں۔

سیٹھ جی کے غائب ہو جانے کی وجہ سے سادھنا بہت پریشان ہے اور سیٹھ جی خفیہ طور پر یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ شرما انہیں دھوکہ دے رہا ہے اور سادھنا سے محض اُس کی دولت کے لیے شادی کرنا چاہتا ہے۔

چھڑا لیتا ہے، سُشما گرفتار ہوتا ہے اور سادھنا کو وجے سے بیاہ دیا جاتا ہے —— بس یہ ہے کہانی کا خلاصہ!

اس فلم کے مکالمے اور گانے خوب ہیں اس پہ تنقید کی ضرورت نہیں، البتہ ڈائرکشن میں بعض معمولی خامیاں رہ گئی ہیں۔ مثلاً بوٹ پالش والے کا گانا فلم کی حقائق آفریں فضا سے کچھ الگ الگ سا محسوس ہوتا ہے۔ اس تصنع کی بہرحال ضرورت نہ تھی!

دوسری خامی یہ ہے کہ فلم کے آخر میں محض پبلک کو متاثر کرنے کے لیے سُشما کو گرفتار کرا دیا گیا ہے حالانکہ قانون کی نظر میں وہ مجرم ہرگز نہیں۔ یہ خواہ مخواہ کی گرفتاری بے معنی اور معیوب ہے۔

تیسری خامی کی طرف ہم مضمون کے آخر میں اشارہ کریں گے —— اس فلم کی سب سے نمایاں خوبی اِس کے کردار ہیں اور اِس سلسلے میں ہم کسی قدر تفصیل سے کام لیں گے۔

منظر خاں —— ملک کا یہ مایۂ ناز اداکار، اس فلم کا اہم کردار ہے اور اس کا کام جس طرح ہر فلم میں تعریف سے بالاتر ہوتا ہے اسی طرح اس میں بھی سیٹھ جی اور بعد میں "رام چوہدری" کے روپ میں بہت خوب ہے۔ خصوصاً "رامو" کا پارٹ ادا کرتے ہوئے منظر خاں نے اپنے آرٹ کو جن بلندیوں پر پہنچا دیا ہے وہ ایک یادگار شے ہوگی لیکن . . . . ؟

واسطی —— نے اکبر بھائی کے روپ میں ساحین کو کچھ ایسا مبہوت کر دیا ہے کہ ہم یہ فیصلہ ہی نہیں کر سکتے کہ منظر خاں کا کام اچھا ہے یا واسطی کا؟ یوں تو واسطی نے پہلے بھی کئی فلموں میں کام کیا ہے اور خوب کیا ہے لیکن اس فلم میں اُس کا آرٹ اتنی بلندی پر جا پہنچا ہے کہ ہم سوچتے ہیں شاید منظر خاں کے "پڑوسی" کی طرح اسے بھی ایسا موقع پھر کبھی نہ مل سکے!

اکبر بھائی کے کردار میں، لائق مصنف نے ایک بہت ہی اہم ضروری اور مؤثر پیغام اِس طرح سمو دیا ہے کہ ہمارا ذہن فوراً اسے قبول کر لیتا ہے۔ اکبر بھائی اور اُس کے ساتھی ہم مذہب نہیں ہیں لیکن اُن کا باہمی سلوک ہندو مسلم بھائی چارے کا ایک ناقابلِ فراموش نمونہ ہے اور خوشی کی بات ہے کہ اس پیغام کو لفظی پروپیگنڈے اور پھسپھسے لیکچروں کا تختۂ مشق بنانے کی بجائے عملی شکل میں پیش کیا گیا ہے —— اور ہمیں یقین ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کے مخالف بھی اس سے متاثر ہوں گے اور ان کے متعصبانہ خیالات کی بنیادیں کھوکھلی ہونے لگیں گی۔

خواجہ احمد عباس کی طرح دوسرے لکھنے والوں کو انسانی ذہن اور نفسیات کی اِن باریکیوں پر خاص دھیان دینا چاہیئے۔ لفظی پروپیگنڈہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک ایک اچھی مثال سامنے نہ ہو۔

ہری شیو دیسائی —— نے شرما کا پارٹ بڑی خوبی سے انجام دیا ہے خصوصاً مکالمہ بولنے میں کمال کر دیا ہے لیکن شرابی کا پارٹ ادا کرتے ہوئے وہ کچھ بہک گیا ہے اس حد تک "اوور ایکٹنگ" کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ حقائق سے دور جانے کی ضرورت اُسی وقت محسوس ہو سکتی ہے جبکہ فلم میں سنجیدگی کی کمی ہو یا اداکار اپنی کمزوریاں چھپانا چاہے —— اور ہمارے خیال میں یہ فلم اِن کمزوریوں سے پاک ہے۔

بجے راج —— نے وجے کا پارٹ ادا کیا ہے اور بحیثیت مجموعی وہ کامیاب رہا ہے اس کے کام میں کوئی خاص نقص نہ ہوتے ہوئے بھی، اُسے وہ کامیابی کبھی نصیب نہ ہوئی جو اُس کے ہمعصروں کے حصے میں بارہا آ چکی ہے —— نہ جانے اِس کی کیا وجہ ہے؟ تاہم اس کا کام بے عیب ہے۔

سوبھانا سمرتھ —— سادھنا کے روپ میں آئی ہے اور بجے راج ہی کی طرح اپنے کام میں کامیاب رہتے ہوئے بھی قبولِ عام حاصل نہیں کر سکی اس کی اداکاری میں عمومیت کا رنگ غالب ہے اور انفرادیت اب تک پیدا نہیں ہوئی۔

ممکن ہے بعض "من چلوں" کو اس کی شکل و صورت، خصوصاً آنکھوں پر اعتراض ہو لیکن ہم اس خامی کو —— اگر واقعی یہ خامی ہے —— زیادہ اہم نہیں سمجھتے اس کے باوجود ہمارا خیال یہ ہے کہ اس کی جگہ کوئی دوسری ہیروئن ہوتی تو اداکاری کا معیار کچھ اور بلند ہوتا۔

مدھوگی آنندی —— تو اسے ایک ہندوستانی لڑکی کے روپ میں دیکھنا بھی ہم گوارا نہیں کر سکتے چہ جائیکہ اسے اتنا نمایاں پارٹ دیا جائے اس نے جن جسمانی حرکات کی نمائش کی ہے اور الفاظ و معانی کی جو وحشی پلیک ہے اسے ذوقِ سلیم کبھی گوارا نہیں کر سکتا —— اور پھر جس کام کے لیے اچھی اچھی ہندوستانی لڑکیاں مل سکتی ہیں اس کے لیے ایک غیر ہندوستانی رقاصہ کو منتخب کرنا، ڈائرکٹر کے حسنِ انتخاب کی کوئی اچھی مثال نہیں ہے۔

اس کے باوجود فلم میں بے شمار خوبیاں موجود ہیں اور ہم خواجہ احمد عباس، مسٹر کاردار اور سرکو پروڈکشنز کو ان کی متفقہ کوششوں کی کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں ہمیں یقین ہے کہ [illegible] سینما بینوں کے اسرار [illegible] کامیابی سے چلیگی اور سرکو پروڈکشنز ہر لحاظ سے [illegible]

JADIDURDU

36, MARSDEN ST. CALCUTTA

قواعد وضوابط

یہ رسالہ ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوا کرے گا۔ خریداروں کو چاہئے کہ رسالہ ۱۵ تاریخ تک نہ ملنے پر دفتر سے طلب کریں۔

اہل قلم حضرات سے درخواست ہے کہ وہ مضامین مہینے کی ۱۵ تاریخ تک اڈیٹر کے نام بھیجدیں

مضامین صاف اور شستہ تحریر ہوں

وہی مضمون پرچہ میں شائع ہوسکتا ہے جو معیار ادب و اخلاق سے گرا نہ ہو۔

دل آزار و فرقہ وارانہ مضامین نیز سیاسی مضامین شائع کرنا پرچہ کی پالیسی کیخلاف ہے۔

نمونہ کا پرچہ مفت نہیں بلکہ ۲/ کا ٹکٹ آنے پر بھیجا جائیگا۔

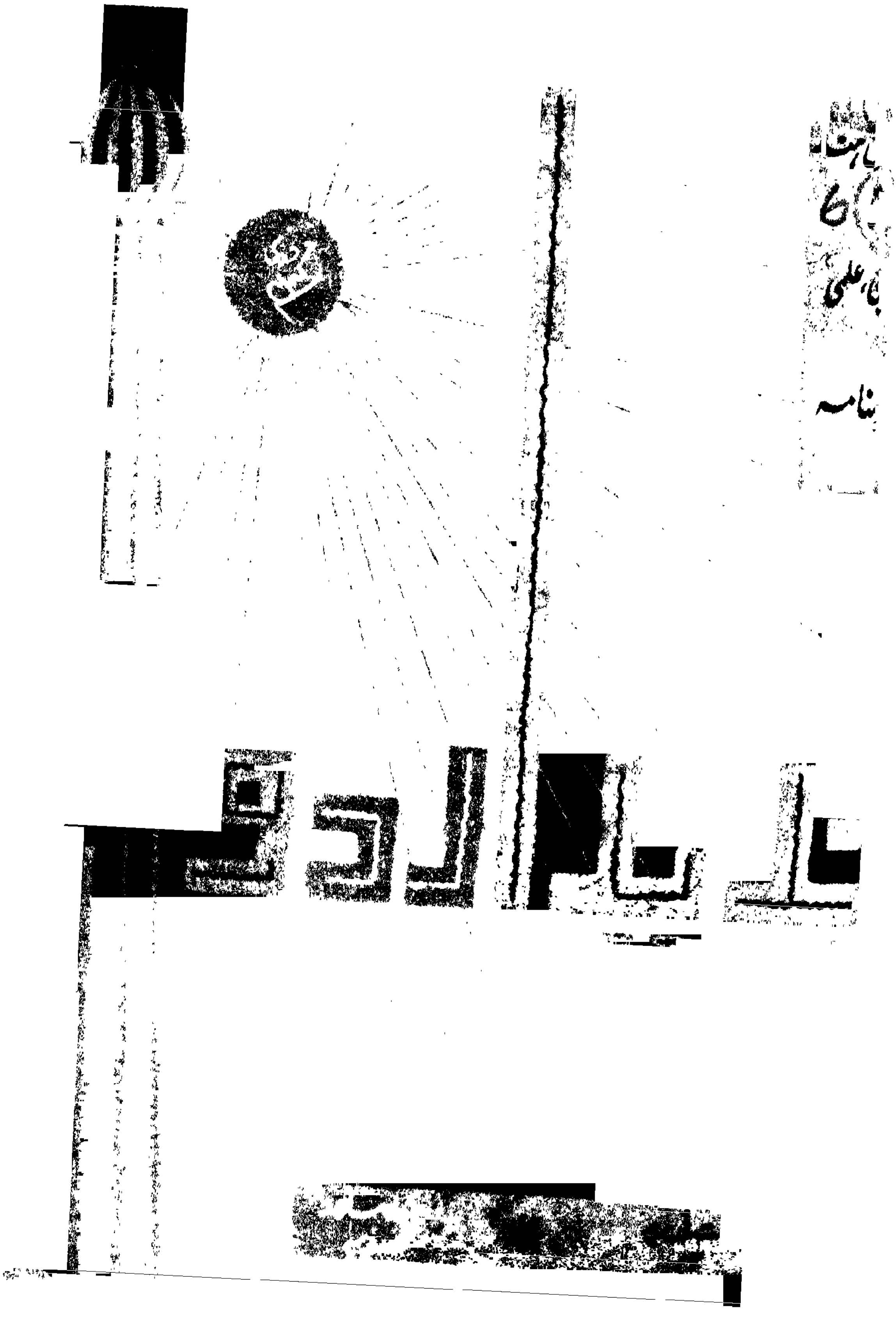
جواب کے لیے جوابی کارڈ یا اسٹامپ کا آنا ضروری ہے۔

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:۔ منیجر جدید اردو ۳۶ مارسڈن اسٹریٹ۔ کلکتہ

کاروباری حضرات اشتہار کیلئے منیجر سے خط و کتابت کریں۔

سالانہ چندہ صرف دو روپیہ (عہ) غیر ممالک کیلئے ۵ شلنگ

جلیل۔ منیجر جدید اردو نمبر ۳۶۔ مارسڈن اسٹریٹ۔ کلکتہ


علی
نامہ



CALCUTTA'S TRAMWAYS
آرام سے سفر کیجیے
SAFE
CONFORTABLE
REGULAR
کلکتہ ٹراموے خطرہ سے پاک

مدیر مسئول
پرویز شاہدی

مدیر اعزازی
ایم ظہور احسن قاضی

جدید اردو کلکتہ

فروری سنہ ۴۳ء

چندہ سالانہ دو روپیہ
ششماہی ایک روپیہ چار آنہ
فی پرچہ
۳؍

جلد ۶ — نمبر ۲

فہرست مضامین

شذرات

دعوتِ جنگ:۔ جنگ کی پھیلائی ہوئی عالمگیر ابتری مسلّم، وقتِ سفّاک کی خونخوار کروٹیں لاریب، پھر بھی ارتقائے ذہن و روح کا تقاضا یہ ہے کہ ہم لوگ انتشار کے روح فرسا طوفان میں اپنی اپنی فکری سنجیدگی کا چراغ روشن رکھیں۔ جذبات ہراس و خوف کی آندھیوں نے اگر ہماری شمعِ شعور کو بجھا دیا تو پھر ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آئے گا۔ یہ سیاہی جنگ کے شعلہ بار بادلوں سے زیادہ بھیانک اور ڈراونی ہوگی۔ مصائب کی برسات میں مفتیِ عقل کا فتویٰ ہمیشہ یہی رہا ہے اور رہتی دنیا تک یہی رہنا بھی چاہئے کہ جہاں تک ہو سکے ذوقِ سلیم اور سنجیدگیِ فکر کے خم پہ خم لنڈھائے جائیں اور خانشِ سرور و کیف سے موسم کی داد دی جائے۔ ہر چند یہ ایک نفسی حقیقت ہے کہ جب طوفانِ حوادث کی سرکشی ناگوار حد تک شدت اختیار کر لیتی ہے تو اُس وقت دل کے اضطراب و انتشار میں دماغ بھی اپنا سکون کھو دیتا ہے اور انسان کی جبلّی حیوانیت اس کے عنصرِ انسانیت پر غالب آجاتی ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ناسازگار حالات سے شکست ہی مان لینا مناسب اور بہتر ہوگا۔ انسان دنیا میں ہرگز اس لیے نہیں آیا ہے کہ وہ اپنی جبلتوں کا غلام بنا رہے اور اپنے انسانی عنصر کو اپنے حیوانی عنصر سے مغلوب رکھے۔ غور کر کے دیکھئے تو صاف نظر آئیگا کہ ہر انسان کی فطرت بذاتِ خود ایک وسیع میدانِ جنگ ہے جس میں حیوانیت اور انسانیت کے درمیان ایک مسلسل اور لامتناہی جنگ جاری ہے۔ شکست و فتح کا کوئی قطعی فیصلہ نہ کبھی پہلے ہوا تھا اور نہ ابھی ہونے کی امید ہے۔ البتہ کبھی کبھی بادبانِ اخلاق اور سرلشکرانِ اصلاح کی مہارتِ فنِ حرب اور حسنِ سرداری انسانیت کو فتح کی ایک دھندلی تصویر دکھاتی رہی ہے اور حیوانیت کبھی کبھی اپنے محاذ سے پیچھے بھی ہٹ گئی ہے لیکن مجموعی حیثیت سے جنگ کے نقشے میں کوئی دیرپا تبدیلی اب تک پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ اب ضرورت ہے اس کی کہ ہم لوگ ارتقائے اخلاقی و تزکیۂ نفس کے سلاح خانے سے وہ تلواریں چن کر لائیں جن پر علمائے اخلاق ہمیشہ صیقل کرتے چلے آرہے ہیں۔ اگر ان تلواروں سے ہم کام لیتے رہیں تو وہ زمانہ دور نہیں جب حیوانیت کو سر جھکا لینا پڑے گا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ زندگی کی بنیاد صرف طاقت اور قوت پر ہے۔ جو طاقتور ہے وہ حقیقی معنوں میں زندہ ہے ورنہ ایک سانس لیتی ہوئی لاش یا ایک حرکت کرتا ہوا جسدِ بے روح۔ جس طرح بھی ممکن ہو ہم لوگوں کو چاہئے کہ اپنے اندر طاقت پیدا کریں، ایسی طاقت جو دل کو مضبوطی اور ہمت کو جوانی بخشے، ایسی طاقت جس کے آئینے میں اخلاقی توانائی اور شعوری قوت کے جلوے رقصاں نظر آئیں۔ ہم لوگوں کا فرض ہے کہ ان ناسازگار حالات میں بھی اپنے نفسِ سرکش سے جنگ جاری رکھیں اور اس طاقت سے جو اخلاقی اور روحانی ارتقا سے پیدا ہوتی ہے کام لے کر اپنی حیوانیت کو راہِ گریز اختیار کرنے پر مجبور کر دیں۔ ہم کو ایسی طاقت کی ضرورت نہیں جو صرف ہمارے جسم کو توانائی اور ہماری مادیت کو زور بخشے بلکہ ضرورت ہے ایسی طاقت کی جو ظاہری قوت کی ساتھ ساتھ باطنی قوت کی بھی ضامن ہو۔ مادی طاقتیں آپس میں ٹکرا کر فنا ہو سکتی ہیں۔ لیکن اخلاقی اور روحانی طاقت کسی حال میں بھی برباد نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ انسان خود برباد نہ کر دینا چاہے۔ متمدن قوموں کی طاقت آزمائیاں جس بھیانہ حد تک پہنچ گئی ہیں وہ مزید تشریح و تفصیل کی محتاج نہیں۔ ان طاقتوں کے تصادم میں حیوانیت کے اجزائے ترکیبی ایک دوسرے سے برسرِ پیکار نظر آرہے ہیں، انسانیت کے قدم اکھڑ رہے ہیں اور اگر اس وقت بھی اخلاقی اسلحوں سے کام نہ لیا گیا تو ایک مدتِ مدید تک کے لیے انسانیت اپنے ہمزاد دشمن کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہیگی۔

اس وقت جنگ اپنے شباب پر آرہی ہے۔ اس کے شباب میں ہلاکتوں اور مصیبتوں کے جلوے صاف نظر آرہے ہیں۔ محفلِ آب و گل کے گوشے گوشے میں موت اپنا بھیانک ناچ دکھا رہی ہے جدھر دیکھئے ایک ابتری، جس طرف نظر اٹھائیے ایک انتشار۔ انسانی زندگی جنگ کے بازار میں تو ہے کے ایک معمولی ٹکڑے سے بھی زیادہ قیمت نہیں رکھتی۔ قریب قریب ساری دنیا اس جنگِ عظیم میں حصہ لے رہی ہے۔ ایسے ہمارا بھی فرض ہے کہ ہندوستان والے آگے بڑھیں اور اپنی بہادری کے جوہر دکھائیں۔ اگر ... ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے

ہم لوگ اب تک غیر مسلح ہیں تو کیا ہوا ہمارے پاس اخلاقی اور روحانی اسلحے تو موجود ہیں۔ وقت جب جنگ کا تقاضا ہی کر رہا ہے تو پھر ہم کیوں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔ جب ہم مادی محاذوں پر جنگ نہیں کر سکتے تو اپنے اپنے دل ہی کے میدان جنگ میں اپنے نفسی اضطراب و انتشار کے ساتھ نبرد آزمائی کریں اور اپنے ان ازلی دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار دیں۔ دماغ و روح جاری مدد کو تیار ہیں بشرطیکہ ہم اُن سے مدد چاہیں، پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم لوگ ان حالات میں بھی اپنی فطری کمزوری پر غالب نہ آجائیں اور بے رحم وقت کے ہاتھوں سے اپنے سکون کی وہ دولت واپس نہ لیں جس کو ظالم لوٹے لیے جا رہا ہے۔

جنگ اور ادب:۔ مجھے اکثر ایسے حضرات سے گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے جو جذبۂ خوف و ہراس سے اس حد تک مغلوب ہو چکے ہیں کہ ان کے نزدیک ان حالات میں ادب و زبان کی خدمت کرنا سعی لاحاصل ہی نہیں ہے بلکہ اقدام خودکشی کے مترادف ہے۔ ان میں سے بعض مخلصوں نے فرمایا کہ "جان ہے تو جہان ہے پیارے" کلکتہ میں کیوں جان دے رہے ہو؟ اس وقت جبکہ ہر جگہ زندگی اور موت کا مسئلہ درپیش ہے تو تم ترتیب رسالہ اور ادبی خدمت جیسے غیر ضروری کاموں میں کیوں وقت برباد کر رہے ہو۔ اس وقت کس کو فرصت ہے کہ تمہارا رسالہ پڑھے اور ادیبوں کی صناعی کی داد دے۔" میں ان لوگوں کو کیا جواب دیتا۔ دہشت نے اُن کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور کانوں میں روئی ٹھونس دی ہے، بیچارے دیکھیں کیا اور سنیں کیا؟ یہ کچھ انہیں پر موقوف نہیں، سیلاب جنگ کے دھارے جب سے مشرقی ہندوستان کی دیواروں سے ٹکرانے لگے ہیں اسی وقت سے اکثر جذبات کی رو میں بہہ جانے والے افراد مضحکہ انگیز حد تک حیران اور پریشان ہو رہے ہیں وہ یہ نہیں جانتے کہ انتشار کا زمانہ بھی فنون لطیفہ اور ادب کے لیے سازگار ہی ہوتا ہے، وہ یہ نہیں سمجھتے کہ روزگار کی نامساعد گردشیں بھی اکثر حسن پیدا کر جاتی ہیں۔ دنیا کی ادبی تاریخوں کا اگر مطالعہ کریں تو وہ خود سمجھ جائیں گے کہ ادب کی کشتی پراگندگی اور سراسیمگی کے سیلاب میں کس طرح سرکش دھاروں سے کھیلتی رہی ہے۔ اس مطالعہ سے اُن کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ادیبوں اور شاعروں نے کیونکر اپنے اپنے قلم کی جنبشوں سے تلواروں کی دھار موڑ دی اور کیسے اُن کی روانیوں کو خامۂ سحر آفریں کی جولانیوں سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جب انسانی دل و دماغ حقائق زندگی کی تلخیوں سے دور بھاگنا چاہتے ہیں تو اُن کو فنون لطیفہ کے دامن کے سوا کہیں بھی سچی پناہ نہیں ملتی بالخصوص ادب تو سکون نوازی اور تسکین بخشی میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ ارباب نظر اور علمائے نفس اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب زمانہ اپنی جہان آشوب گردشوں سے کام لیتا ہے تو انسانی دل و دماغ کو کہیں بھی امن و امان کی جگہ نظر نہیں آتی۔ ہر طرف سے سکون اور اطمینان کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں، زندگی بدحواسی کی شدت میں اپنا مقصد بھول جاتی ہے اور تمام فلسفۂ تخلیق حیات کو ایک حادثۂ ناگہاں سے تعبیر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، سارا نظام عالم ایک دفتر بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس وقت اگر انسانی روحوں کی کوئی بھی دستگیری کر سکتا ہے تو صرف روحانی پیشوا یا کوئی نبض شناس ادیب یا شاعر۔ روحانی پیشوا کی طرح ادیب و شاعر بھی مادی قدروں کی بے مائیگی پر زور دیتا اور روحانی قدروں کی اہمیت کو روشن کرتا ہے۔ دونوں ہی عالم اجسام کے حیوانی نظام سے بیزاری ظاہر کر کے روحوں کو تصور سکون سے آشنا ہونے کا موقع دیتے ہیں، دونوں ہی نفرت کی گرم بازاری میں جنس اخوت کی ارزانی کا جلوہ دکھاتے ہیں، دونوں ہی کے ارباب پیام و ہر لبط ہدایت سے محبت کے ابدی نغموں کی بارش ہونے لگتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بدحواس رو میں ؎

گر بادِ فتنہ ہر دو جہاں را بہم زند ما و چراغ چشم و رہِ انتظار دوست

کا سُر الاپنے لگتی ہیں اور کافی مدت تک کے لیے سازِ حیات کی بدآہنگی کا سدِّ باب ہو جاتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ بادیانِ طریقت کی ہدایتوں اور ادیب و شاعر کی صناعیوں میں انتشار روزگار کی ایسی ایسی تصویریں نظر آنے لگتی ہیں جو حقیقی ہونے کے باوجود بھیانک نہیں کہی جا سکتیں۔ حالات سے دونوں ہی کے پیام متاثر ہوتے ہیں مگر اس طرح کہ اُن میں ہر جگہ لطافت ہی لطافت کا جلوہ دکھائی دینے لگتا ہے۔

ہم لوگ جس عبوری دور سے گذر رہے ہیں وہ مایوس کن ہونے کے ساتھ ساتھ اُمید افزا بھی ہے۔ وقت آگیا ہے کہ روایات کہن کی

کمزور عمارت کو جو ماضی و حال کی کھوکھلی بنیادوں پر کھڑی ہے جب ضرورت ڈھا کر نئے حقائق کی زمین میں مستقبل کے فلک بوس قلعے کی بنا ڈالیں۔ اگر حالات نے مسیحائی سے کام لیا تو بستر علالت پر دم توڑتا ہوا ہمارا ادب اور اس کے آئینے میں جھلکتی ہوئی ہماری مصنوعی اور بیمار زندگی صحت سے ہم آغوش ہو جائیگی۔ جنگ کے بخشے ہوئے جدید رجحانات ہماری زندگی اور ادب کو توانائی بخشینگے اور وہ کمزوری جس پر وقت کی نگاہ تنقید ہمیشہ پڑتی رہی ہے۔ ایک خوش آئند طاقت سے بدل جائے گی۔ ان حالات میں ادبی رسالوں کا یہ فرض ہے کہ اپنی کشتی کو ہمت و عزم کے دھارے پر کھیتے رہیں۔ جتنا انتشار بڑھے اتنا ہی جوش عمل سے بھی کام لیتے رہیں

نوا را تلخ ترمی زن چو ذوق نغمہ کم یابی حدی را تیز ترمی خواں چو محمل را گراں بینی

پرویز شاہدی

رفتار وقت

اتحادی طاقتیں اب تک صرف اپنی اپنی مدافعت سے کام لیتی رہی ہیں جس کی وجہ سے اتحادیوں کو کافی نقصان برداشت کرنے پڑے اگر ان تمام نقصانات کا شمار کیا جائے تو ایک لمبی فہرست تیار ہو سکتی ہے۔ لیکن اب اتحادی طاقتیں ہر طرح اپنے کیل کانٹے سے درست مضبوط اور طاقتور نظر آ رہی ہیں چنانچہ اب ان کا جارحانہ حملہ بھی ہر محاذ پر شروع ہو گیا ہے اور ہر طرف اتحادیوں کی پیش قدمی بھی جاری ہے تمام اتحادی طاقتیں اپنی اپنی قوتوں کے بڑھانے میں بہت زیادہ مصروف کار ہیں، بالخصوص امریکہ وہ تو اتنی زیادہ مقدار میں سامان حرب تیار کر رہا ہے کہ اپنے علاوہ اور اتحادیوں کو بھی امداد پہنچا رہا ہے۔ گو محوری فتوحات اور اس کے وسائل پر بھی غور کیا جائے تو وہ بھی بالکل کمزور نظر نہیں آتے، کچھ کمی ضرور پیدا ہو گئی ہے۔ اصل لحاظ سے بیشک اصل جنگ اب شروع ہوئی ہے۔ ایسی صورت میں گذشتہ سال جن تباہ کاریوں بربادیوں اور مصیبتوں سے اطراف عالم کو دو چار ہونا پڑا ہے، ان کو آنے والی مصیبتوں کے مقابلہ میں یقیناً بھول جانا پڑے گا، یوں تو کئی سال سے یہ عالمگیر جنگ بہت سارے ملکوں اور بڑے شہروں کو نذر آتش کر کے انہیں مکمل طور پر برباد کر چکی ہے، اور اب نہیں کہا جا سکتا ہے کہ بقیہ کن کن ملکوں کو جنگ کے شعلوں میں جھلسنا پڑیگا، ممکن ہے کہ جنگ کی تیزی مزید شدت اختیار کرے۔ اگر جنگ کی موجودہ اخراجات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ جنگ کتنے وسیع پیمانے پر لڑی جا رہی ہے۔ امریکہ کا ۲۲ کروڑ ڈالر کے حساب سے اور انگلستان کا تقریباً ۲ کروڑ پونڈ کے حساب سے اور ہندوستان کا تقریباً ایک کروڑ ۱۴ لاکھ روپیہ کے حساب سے یومیہ خرچ ہو رہا ہے یعنی اس وقت گذشتہ جنگ عظیم سے ۲½ گنا زیادہ خرچ ہو رہا ہے

۱۹۴۲ء کے اخیر تک مشرقی دنیا جاپان کے آگے کمزور معلوم ہوتی تھی اور مغربی دنیا جرمنوں کے آگے۔ لیکن اگست ۱۹۴۲ء میں امریکہ نے بحرالکاہل جزیرہ سلیمان میں اپنی زبردست فوجیں اتار دیں۔ پھر نومبر ۱۹۴۲ء میں امریکہ نے بحر اوقیانوس کو پار کر کے شمالی مغربی افریقا میں فوجیں اتار دیں۔

روسی فوجوں کو نومبر ۱۹۴۲ء کے شروع سے برابر کامیابی ہو رہی ہے۔ جرمنوں کو ہر محاذ پر نقصان اٹھا کر پیچھے ہٹنا پڑ رہا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ روسیوں نے جس حب الوطنی کی خاطر اسٹالین گراڈ میں حیرت انگیز جرأت، سر فروشی اور جانبازی کا ثبوت پیش کیا ہے کہ اس طرح کی مثال غالباً تاریخ عالم میں ملنا مشکل ہے کہ کسی قوم نے اس بہادری اور بے جگری کے ساتھ اپنے ملک کے لیے قربانی دی ہو۔ روسیوں نے صرف اسٹالین گراڈ میں ایک ایک انچ زمین کی خاطر اپنے ہزاروں فرزندوں کے خون بہائے، اپنے لاکھوں جانباز سپاہیوں کو قربان کر دیا۔ ان کے کشتوں کے پشتے لگا دیئے صرف ایک [illegible] اس شہر کی حفاظت کی خاطر بازاروں، گلیوں، مکانوں، [illegible] کے اندر اور

اس کے چھت پر جنگ کی اور ایسی زبردست جنگ کہ جس کی تصور سے انسان کا دل کانپ اٹھے، اور جس بے جگری دلیری اور جانبازی سے جرمن سیلاب سے ٹکر لئے ہیں کہ اس کا اندازہ لگانا دشوار ہی نہیں بلکہ مشکل ہے، یہ جنگ گھنٹہ دو گھنٹہ کی جنگ نہ تھی بلکہ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک ۲۴ گھنٹہ مسلسل ایک ماہ سے زیادہ سخت سے سخت مقابلہ کرتے رہے۔ جہاں تک جرمنوں سے بھی ہوسکا اپنی پوری طاقت سے اسٹالن گراڈ کو حاصل کرنے کے لیے زور خرچ کیا لیکن پھر بھی انہیں صرف مایوس ہی ہونا نہیں پڑا۔ بلکہ اس بازی میں انہیں کافی نقصان اٹھا کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ یہ ماننا پڑے گا کہ ایسی بہادر قوم کو شکست دینا ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔

خبروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ روسی محاذ جنگ پر ماہ اکتوبر کے اخیر سے جرمن فوجیں ہر جگہ پر نقصان اٹھا کر پیچھے ہٹتی جاری ہیں اور روسی فوجیں بڑھ بڑھ کر سخت حملہ آور ہو رہی ہیں، اکثر محاذ پر جرمنی فوجیں بہت ابتری سے بھاگیں یا گرفتار ہوگئیں جس سے بے شمار مال غنیمت بھی روسیوں کے ہاتھ آئے اس سے کسی کے شکست اور فتح کا اندازہ لگانا مشکل ہے جب سردی کا زمانہ آتا ہے تو روسی فوجیں جرمن فوجوں پر غالب آتی ہیں اور ان کو پیچھے کی طرف ہٹانا شروع کردیتی ہیں۔ اور جب گرمی کا زمانہ آتا ہے تو پھر جرمن فوجیں بڑھنا شروع کردیتی ہیں۔ گویا روسی محاذ جنگ پر کبڈی ہو رہی ہے۔ کبھی یہ بھسنڈی ہو جاتے ہیں اور کبھی وہ۔ دیکھیے میلا کون مارتا ہے۔

تقریباً چھ ماہ سے بحر الکاہل میں جزائر سلیمان اور نیوگنی کے اطراف میں امریکن اور اسٹریلوی فوجیں جاپانیوں کو سخت نقصان پہنچا رہی ہیں اس درمیان میں کئی مرتبہ بحری اور فضائی معرکہ آرائی ہوئی جس میں زیادہ تر نقصانات جاپانیوں کو اٹھانے پڑے ہیں جس سے کہ اُن کے دانت کھٹے ہوگئے

نومبر ۱۹۴۲ء سے افریقہ کے محاذ پر بھی اتحادیوں کو بہت سارے فتوحات حاصل ہوئے ہیں گویا ٹیونس کے سوا اس وقت پورا افریقا گویا اتحادیوں کے ہاتھ میں ہے۔

موجودہ جنگ میں سب سے زیادہ بظاہر نقصان اب تک فرانس کا ہوا ہے، کون سمجھ سکتا تھا کہ اتنی بڑی عظیم الشان سلطنت دیکھتے دیکھتے یوں بیکسی اور بے بسی میں مبتلا ہو جائے گی۔ کون سمجھ سکتا تھا کہ وہ فرانس جو آج سے سو سال قبل پورے دنیا کو فتح کرنے کی ہمت کرچکا تھا آج وہ خود دوسروں کے رحم و کرم کا محتاج بن جائے گا۔ نومبر ۱۹۴۲ء میں جرمنی فوجیں پورے فرانس پر یہ کہتی ہوئی چھا گئیں کہ اب مجھے فرانسی گورنمنٹ پر بھروسہ نہیں رہا، اور وہ سب معاہدے اب ختم ہوگئے جو جرمنی اور فرانس کے درمیان غیر جانب داری کا ہوا تھا۔ لہذا اب فرانسیسی پارلیمنٹ میں جرمنی مشیر کار رہنا لازمی ہے، گویا اس وقت پورا فرانس جرمن کے قبضہ میں چلا گیا، اسی کے نوآبادیات کے بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوکر تقسیم ہوگئے مغربی افریقہ "شام" شمالی افریقہ کا کچھ حصہ اور جزیرہ مڈغاسکر برطانیہ کے قبضہ میں، الجیریا، مراکش اور امریکہ کے نزدیک جو جزیرے فرانس کے نوآبادیات تھے وہ امریکہ کے قبضہ میں۔ جنوبی افریقہ اور مشرقی افریقا کے نوآبادیات جنرل ڈیگال کے قبضہ میں، مشرقی ایشیا، فرانسی ہندی چین پر جاپانیوں کا قبضہ ہوگیا۔

عبد الجلیل

محمود النساء ہومیوپیتھک چیریٹیبل ڈسپنسری کی سالانہ رپورٹ سنہ ۱۹۴۲ء

نمبر ۳۳ مارسڈن اسٹریٹ۔ کلکتہ

مرد مریضوں کی تعداد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۲۴۵	پریسیڈنٹ۔ محمود النساء بیگم۔ سکریٹری غلام محمد صاحب
عورت " " " ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۳۵۳۶	کمیٹی ممبر۔ اسعد اوحید فاروقی۔ فزیشن۔ ڈاکٹر ایچ حید ایچ ام ڈی
بچوں " " " ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۰۱۶	سرجنٹ ڈاکٹر ایس ایم علی L.C.P.S.R.R.P. نرس۔ انگی زبیدہ انھوٹی
۷۷۹۷	

نوٹ:۔ عورتوں کے لیے خاص انتظام ہے۔ وقت صبح ۷ بجے سے ۱۱ بجے تک

نغمۂ وحشت

جو حق پوچھو کتابِ آرزو کا حرفِ باطل ہوں
مٹا دیں کیوں نہ وہ مجھکو، مٹا دینے کے قابل ہوں

خفا تم جرمِ الفت پر خجل میں جرمِ الفت سے
نہ تم ملنے پر آمادہ نہ میں ملنے کے قابل ہوں

تڑپتا ہوں جو میں تو لوٹ جاتا ہے مرا قاتل
شکار افگن کا منظورِ نظر وہ صیدِ بسمل ہوں

مری حیرت نتیجہ ہے تری رنگیں ادائی کا
تری محفل میں اک تصویر ہوں اور زیبِ محفل ہوں

نظر جس نے اٹھا کر بھی نہ دیکھا ہو مری جانب
عجب مشکل میں ہوں کیونکر کہوں میں اُس کا بسمل ہوں

تبسّم زیرِ لب اُن سے مُکر جانے کو کہتا ہے
نگاہِ ناز لیکن صاف کہتی ہے کہ قاتل ہوں

سراپا آرزو تھا ایک دن اُس کی سزا یہ ہے
مُرقّعِ یاس کا ہوں داستانِ حسرتِ دل ہوں

غزل اپنی کہاں ہے قابلِ بزمِ طرب وحشتؔ
کہ ہر ہر شعر کہتا ہے صدائے گریۂ دل ہوں

رضا علی وحشتؔ

مولانا رومی کے سوانح حیات پر ایک نظر

اسلامی تصوف کی تاریخ میں مولانا جلال الدین رومی کا اسم گرامی نہایت روشن اور نمایاں ہے ان کی شاعری میں تصوف اپنی چند در چند خصوصیتوں اور رعنائیوں کے ساتھ انتہائی نقطۂ عروج پر جلوہ ریز ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی ادبیات میں دو اور بھی ایسے جلیل المرتبت صوفی شاعر موجود ہیں جو دنیائے تصوف میں مابہ الامتیاز خصائص کے حامل ہیں مگر ان کا موازنہ و مقابلہ مولانا رومی سے کرنا اپنی بدذوقی کی کھلی دلیل ہے۔ بلاشبہ حافظ کی شاعری میں بے شمار غمگسارانہ باریکیاں اور تخیل و تصور کی لطافتیں پائی جاتی ہیں مگر ان کا دامن تصوف شباب و شراب کی بدمستیوں سے منزا و مبرا نہیں رہا عمر خیام کی شاعری بھی زندگی کو دعوت ناو نوش دیتی ہے لیکن مولانا رومی کی شاعری میں تصوف سے عود و عنبر کی ایک فردوسی خوشبو پھوٹی پڑتی ہے جس سے روح و مذہب کے مزاج کو فرحت و پاکیزگی حاصل ہوتی ہے اور اس اعتبار سے مولانا رومی کو تصوف کی روشنی میں اسلام کا بہترین ترجمان کہا جائے تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا

مولانا رومی بلخ کے ایک معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد ماجد مولینا بہاؤالدین بلخ ہی میں رہتے تھے اور ان کی بزرگی و خدا ترسی کی بنا پر ہر فرقے کے لوگ ان سے خاص ارادت و عقیدت سے پیش آتے تھے۔ شاہِ بلخ ان کے اخلاق حمیدہ اور اوصاف حمیدہ سے اتنا متاثر ہوا کہ وہ اپنی دختر نیک اختر کو ان کی زوجیت میں دے کر بہت مسرور و محظوظ ہوا۔ اگرچہ وہ اب فرمانروائے بلخ کے داماد تھے، مگر انھوں نے درباری زندگی کی عشرت کوشیوں اور تعیش زائیوں کی طرف کبھی بھول کر بھی اعتنا نہ کیا۔ وہ ہمیشہ فقر و فاقہ ہی پر شاکر و صابر رہے جو ایک برگزیدہ بندے کی حقیقی شان ہے۔ ایک طرف داماد کا یہ عالم تھا، دوسری طرف خسر جاہ و اقتدار کے نشہ میں چور تھا۔ اس لیے شاہ انہیں اپنے دباؤ میں رکھنا چاہتا تھا۔ یہ صورت حال مولانا بہاؤالدین کی برداشت سے باہر تھی۔ چنانچہ خسر اور داماد کے طبعی تضاد کا نتیجہ یہ نکلا کہ آخر الذکر اول الذکر کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔ شاہ کو یقین تھا کہ مولانا بہاؤالدین کی موجودگی میں وہ اپنی آمرانہ حکمت عملی کو بروئے کار نہیں لا سکتا، اس لیے وہ مولانا ممدوح کو پایہ تخت سے باہر رکھنے کی غرض سے در پردہ ساز باز کرنے لگا۔ جب مولانا بہاؤالدین کو شاہ کے اس ارادہ کا علم ہوا تو وہ از خود پایہ تخت سے باہر چلے گئے۔ لوگ مصر ہوئے کہ ہمیں چھوڑ کر نہ جائیے مولانا بہاؤالدین نے جواب میں کہا کہ کوئی بھی خود دار اور غیور صوفی ایک مطلق العنان اور ضدی حکمران کے زیر سایہ نہیں رہ سکتا۔ اس وقت مولانا رومی کی عمر چھ سال کی تھی۔ بچپن ہی میں ان کے بشرہ سے ایک غیر معمولی نابغہ کے آثار ہویدا تھے۔ اسی درمیان میں ایک مرتبہ انہیں شہرۂ آفاق صوفی شاعر شیخ فریدالدین عطار نے دیکھا تو یہ پیشین گوئی کی تھی کہ یہ بچہ ایک نہ ایک دن ضرور بڑا آدمی ہوگا اور وہ پیشین گوئی اپنے معنوی لحاظ سے حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ ایک عرصہ تک ایشیائے کوچک کے مختلف شہروں میں مارے مارے پھرنے کے بعد مولانا بہاؤالدین بالآخر بغداد پہنچے جو اس وقت اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا۔ یہاں آنے پر انہیں چنگیز خاں کے ہاتھوں بلخ کی تباہی و بربادی کی خبر پہنچی۔ چنانچہ انھوں نے بغداد ہی میں زیادہ بود و باش اختیار کرلی اور لوگ ان کے تصوف و عرفان سے فیض یاب ہونے لگے۔ ان کے مکان پر شہر کی کل سربرآوردہ ہستیاں جو علما، صوفیا، رؤسا اور امرا پر مشتمل تھیں ہمہ دم جمع رہتیں اور مولانا نے موصوف کے علوم ربانی سے بقدر پیمانہ تخیل بہرہ اندوز ہوتیں۔ بغداد سے طبیعت سیر ہوگئی تو مولانا بہاؤالدین نے لارندہ کا سفر اختیار کیا۔ مصائب و ابتلا کے اس پورے عرصہ میں مولانا رومی ہمیشہ اپنے والد کے ہمراہ رہے قریباً بیس سال کی سن میں مولانا رومی کی شادی سمرقند کے ایک ممتاز گھرانے میں ہوئی۔ زوجہ کا نام جوہر خاتون اور خسر کا نام شرف الدین تھا۔

ابتدائی تعلیم: — مولانا رومی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی۔ تصوف سے ذوق و انہماک بھی میراث پدری تھا۔ پھر وہ مولانا سید برہان الدین کی اتالیقی میں چلے آئے جو اپنے علم و فضل کے لیے بہت معروف تھے۔ والد کی وفات کے بعد مولانا رومی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے خاطر شام چلے گئے۔ اس وقت دمشق اور حلب ہر قسم کے علوم و فنون مشتاقان کا منبع تھے۔ الہٰیات، ادبیات اور فلسفہ و منطق وغیرہ کے زبردست مراکز

تھے۔ پہلے وہ الیپو کے دارالاقامہ میں اقامت گزیں ہوئے اور وہاں کے ایک مشہور مدرسہ میں داخل ہوگئے۔ تھوڑے ہی دنوں میں انھوں نے عربی، فقہ، قرآن اور اس کی تفسیر میں ایک حیرت انگیز دستگاہ حاصل کرلی اور ان کی ذہانت وفطانت اور لیاقت وذکاوت کا جابجا چرچا ہونے لگا جب کوئی پیچیدہ مسئلہ لوگوں کو درپیش ہوتا تو وہ فوراً مولانا رومی سے رجوع کرتے اور تشفی بخش حل پاکر واپس جاتے۔ شہر کے اکثر فضلاء علما مختلف موضوعات پر بحث وتمحیص کرنے کے لیے مولانا رومی کے پاس آتے اور ان کی طلاقت ولسانی اور فراوانی علم وفضل دیکھ کر دنگ رہ جاتے۔ ایک مدت تک انھوں نے دمشق کی جامعہ میں بھی اپنی تشنگی علم بجھائی۔ علم ظاہری سے فارغ التحصیل ہوکر وہ اب علم باطنی کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس راہ میں شہرۂ مشہور مرشد مولانا برہان الدین نے ان کی دستگیری کی۔ اب تک مولانا رومی علوم وفنون حاصل کرتے رہے تھے مگر ان سے ان کی روح کی تسکین ذرہ بھر بھی نہیں ہوئی تھی —— یہ پرآشوب دنیا جہاں انسان چرند پرند کی سی زندگی گزارتا ہے، جہاں فتنہ وفساد انسان کی روحانی عظمت وحشمت کو نیست ونابود کرتا ہے، جہاں ظاہرداری ہی سب کچھ ہے اور روح کچھ بھی نہیں جہاں محبت وخلوص اور تقدس وبزرگی کی جگہ شیطانی حرص وآز اور اہرمنی ہوا وہوس کی حکومت قائم ہے —— مولانا کو ایسی دنیا سے سخت تنفر تھا اور وہ ایک ایسی دنیا کی تخلیق کرنا چاہتے جہاں پاک محبت کا دور دورہ ہو —— ان کی بے قرار روح ایک بلند آئیڈیل کی تلاش میں تھی —— حسن ومحبت کا آئیڈیل۔ سلوک وشغل کی ابتداء کے بعد آہستہ آہستہ انھوں نے اپنے آپ کو وادی تصوف کی پرپیچ راہوں میں گم کردیا اور ایک زمانہ کی ریاضت ومشقت کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ تصوف ہی اس دکھ بھری دنیا کے مصائب وآلام کا واحد علاج ہے۔ اسلام کی سنگلاخ زمین پر انھوں نے تصوف کا تخم بویا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ تخم تکلفات وتوہمات کے آہنی حصار کو توڑتا ہوا ایک خوبصورت اور چھتنار درخت کی شکل میں نمودار ہوگیا جس کی آشتی ومحبت سے لبریز گھنیری شاخ کرۂ ارض پر سایہ افگن ہوگئی۔ ایک صوفی باصفا کا منتہائے نظر دنیا میں قادر مطلق کے اشارہ چشم کے عین مطابق ہوتا ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ مولانا رومی ادبیات، فنون لطیفہ، فلسفہ ومنطق اور الوہیات پر عبور رکھتے تھے۔ انھوں نے شام کی متعدد جامعات میں معلمی وارشادی کے فرائض بھی انجام دیئے اور ان کے شاگردوں کی تعداد چار پانچ سو تک پہنچتی ہے۔ وہ اکثر علمی وادبی جلسوں کی صدارت کے لیے مدعو کیے جاتے اور سامعین وحاضرین تصوف، مذہب اور فلسفہ پر ان کے بیش بہا خیالات سے ازحد متمتع ومستفید ہوتے تھے، مگر وہ ان چیزوں سے مطمئن نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس قبیل کی سب چیزیں دوسروں کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ ان کی تخلیق کسی دوسرے مقصد کی تکمیل کے لیے ہوئی ہے۔ یوں ان کی دماغی کیفیت روز بروز بدلتی جارہی تھی۔ انہیں ایسی دنیا کے خواب وجلوے نظر آتے تھے جو روحانیت کے فیوض وبرکات سے معمور تھی۔

ایک دن حسن اتفاق سے ان کی نظر کے سامنے حیات انسانی کا ایک ایسا باب خود بخود کھل گیا جس سے ان کی زندگی کی کایا پلٹ گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ مولانا رومی کی ملاقات اس وقت کے سب سے مشہور صوفی حضرت شمس التبریز سے ہوگئی اور ان کی ملاقات سے مولانا رومی اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کی زندگی کے دھارے دفعتہً دوسری طرف مڑ گئے۔ رفتہ رفتہ ملاقات بڑھتی گئی اور مولانا رومی اثر گیر ہوتے گئے۔ ایک روز کا ذکر ہے مولانا رومی مذہبی کتب کے مطالعہ میں ہمہ تن مستغرق تھے۔ ان کے گرد وپیش بہت سی کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ اسی وقت حضرت شمس ادھر سے گزر ہوا۔ انھوں نے مولانا رومی سے پوچھا "یہ سب کیا کتابیں ہیں؟" "بہت قیمتی کتابیں ہیں۔ شاید آپ ان کی قدر وقیمت کا اندازہ نہ لگا سکیں" مولانا رومی نے جواب دیا۔ مولانا رومی نے جوں ہی یہ جملہ پورا کیا کہ کیا دیکھتے ہیں وہ سب کتابیں جو ادھر ادھر پڑی ہوئی تھیں جلنے لگیں۔ مولانا رومی نے حیرت زدہ ہوکر پوچھا "یہ کیا؟" حضرت شمس التبریز نے جواب دیا "شاید تم اس معمہ کو حل نہ کرسکو" اس واقعہ سے مولانا رومی نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ دنیا میں بہت سی ایسی چیزیں بھی ہیں جنھیں کتابیں نہیں بتا سکتیں۔ اس بات نے ان کے دل پر اتنا گہرا اثر کیا کہ ان کے لیے گھر کی چاردیواریوں میں رہنا دوبھر ہوگیا۔ انھوں نے کتابوں سے منہ موڑ لیا اور ایک روز گھربار چھوڑ کر اس مرد خدا کی کھوج میں نکل پڑے جس نے ان کے دماغ کو جڑ سے ہلادیا تھا۔ ایک مدت کی جستجو وتفحص کے بعد آخر کار حضرت شمس التبریز ملے اور مولانا رومی ان کی شاگردی اختیار کرلی۔

شاعرانہ قوت:۔ مولانا رومی کے دل میں ایک حیرت انگیز شاعرانہ قوت مضمر تھی۔ اب تک اسے دل کی گہرائیوں سے نکل کر منظر عام پر آنے کی راہ نہ ملی تھی۔ لیکن حضرت شمس التبریز کی صحبت نے مولانا رومی پر کچھ ایسا اثر کیا کہ ان کی شاعرانہ استعداد وقوت سیلاب کی طرح امڈ نکلی

مولانا رومی کی پوری زندگی حضرت شمس کے پرتو کی آماجگاہ ہے۔ حضرت شمس کی موت کے بعد مولانا رومی کی زندگی بالکل ویران و سنسان ہوگئی اور انتہائی کوششوں کے باوصف ان کی یاد کو اپنی لوحِ دل سے کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی نہ محو کر سکے۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ مولانا رومی یوں گھومتے گھامتے ایک سونار کی دوکان پر آنکلے جس کا نام صلاح الدین تھا۔ سونار اپنے کمرے میں زیور وغیرہ بنانے میں مصروف تھا اس کی ہتھوڑی کی متصل ضرب سے ارگرد ایک موسیقی سی پیدا ہوگئی تھی اور مولانا رومی اس دلخوش کن آواز سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ ان کی زبان سے شعروں کا تانتا بندھ گیا۔ سونار نے مولانا کی یہ کیفیت دیکھی تو وہ اور تندہی سے سونے پر ضربیں لگانے لگا گو ایسا کرنے میں انکا کافی سونا ضائع ہو گیا۔ آخر کار جب اس سے ضبط نہ ہو سکا تو وہ اٹھا اور نہایت عقیدتمندانہ طریقہ سے مولانا رومی کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس وقت وفورِ جذبات میں مولانا رومی کی زبان سے ایک شعر نکلا جس کا مطلب یہ ہے "اس دوکان سے ایک قیمتی ہیرا نکلا اس کی صورت دلستان اور اس کا دل درد مند ہے اور وہ بذاتِ خود ارفع و اعلیٰ ہے۔

سونار مولانا رومی کی بزرگی اور شریف النفسی کا اتنا دلدادہ ہوا کہ وہ اپنا کاروبار ترک کر ان کے ہمراہ ہوگیا۔ مولانا رومی بھی اس سونار سے خاص طور پر محبت و شفقت سے پیش آتے تھے۔ اگرچہ مولانا رومی کے دوسرے شاگرد اس طرزِ سلوک سے حسد کرتے تھے۔ مگر انھوں نے اپنی روش میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ یہ سلسلہ اسی وقت ختم ہوا جبکہ صلاح الدین اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ صلاح الدین کے انتقال کے بعد ایک دوسرا شاگرد مسمیٰ حسام الدین مولانا رومی کا معتمد اور معاون کار ہوا۔ مولانا کو اس شخص پر اتنا اعتبار تھا کہ انھوں نے اس کے اوصاف پر متعدد غزلیں لکھیں اور مثنوی مولانا ئے روم دراصل اسی شخص کی فرمائش کا رہین منت ہے۔

امتدادِ زمانہ مولانا رومی کے ایامِ حیات کو رفتہ رفتہ کم کرتا گیا اور وہ دفعتہً سخت بیمار پڑ گیے۔ ارادت کیشوں نے لاکھ کہا کہ دوا دارو کیجیے مگر وہ انکار ہی کرتے رہے۔ جب کوئی طبیب ان کے پاس آتا تو کہتے "میں اس دنیا میں کب تک مہمان رہوں گا؟" جب ان کے مریدوں کی صحتیابی کے لیے دعا مانگتے تو چیخ اٹھتے "کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جو پردہ حجاب عاشق و معشوق کے درمیان حائل ہے وہ کبھی نہ اٹھے؟ تمہیں نہیں معلوم کہ کتنا عظیم الشان بادشاہ میرے دل کا مہمان ہے! میرے چہرے کی زردی نہ دیکھو۔ میرے پاؤں اتنے مضبوط ہیں جتنے لوہے" مولانا رومی کی علالت کی خبر سنکر اکنافِ عالم سے لوگ جوق در جوق آخری زیارت کے لیے آنے لگے۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ کا جانشین کون ہوگا۔ انھوں نے حسام الدین کا نام لیا حالانکہ ان کی بھی اولاد تھی۔ دنیا اسلام کا یہ بے نظیر صوفی شاعر پچاس سال کی عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

ایک زبردست بزرگ۔ مولانا رومی اپنے اواخر زندگی میں دنیا بھر میں مشہور و معروف ہو چکے تھے۔ ان کے گرد و پیش لاکھوں مریدوں اور ارادت مندوں کا ہجوم ہر وقت لگا رہتا اور ان کے چشمۂ فیوض و برکات سے ہر شخص بہرہ یاب ہوتا مثل صوبہ دار معین الدین پروانہ بھی جو سلجوقی حکومت کا واحد مالک مختار تھا مولانا رومی کے عقیدتمندوں میں سے تھا اور ان سے علوم روحانی حاصل کیا کرتا تھا۔ پروفیسر براؤن کے قول کے مطابق مولانا رومی ایران کے ان معدودے چند شعراء میں سے تھے جنہیں چشم فلک سیکڑوں سال چکر کھانے کے بعد دیکھتی ہے۔ ایک روایت مشہور ہے کہ جب تک مولانا رومی جذب و وجد کی حالت میں نہ ہوتے، وہ ایک شعر بھی موزوں نہیں کر سکتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے مکان میں ایک ستون تھا۔ جب مولانا جلوۂ الٰہی سے بہرہ اندوز ہوتے تو ان پر بیہوشی کی کیفیت طاری ہو جاتی اور جب ہوش و حواس کچھ بجا ہوتے تو وہ اس ستون کی گرد چکر کاٹتے اور ان کی زبان سے شعروں کی بارش ہونے لگتی اور ان کے شاگرد ان شعروں کو کاغذ پر لکھتے جاتے۔ مولانا رومی کے متعلق پروفیسر نکلسن کے خیالات قابل مطالعہ ہیں وہ یوں رقمطراز ہیں:

"علوِ تخیل اور شکوہ بیان کے لحاظ سے مولانا رومی کا کوئی مد مقابل نہیں۔ یکے بعد دیگرے وہ ایسے ایسے بلند و بلیغ خیالات اپنے شعروں میں ظاہر کرتے جاتے ہیں کہ تعجب ہوتا ہے۔ تخیلات کی دل آویزی شعر میں اتنی رفعت پیدا کر دیتی کہ وہ آسمان کی بلندیوں سے چمک کرتے دکھائی دیتے ہیں۔۔۔"

مولانا رومی کی شاعری پر نقد و تبصرہ کرنا آسان بات نہیں اور نہ ہی اس مقالے کا یہ مقصد ہے۔ بہرحال مولانا رومی کے حالات زندگی پر اس مختصر تبصرہ سے ان کی حقیقی عظمت و بزرگی کسی حد تک معلوم ہو جاتی ہے۔

نوشتہ:- رضا علی کریم ایم۔اے، بی۔ایل۔ ترجمہ:- افسر ماہ پوری

زنجیریں

اور آدمی نے آنسو پونچھتے ہوئے مجھے رخصت کیا۔ اور پھر بڑھ کر جلدی سے اس نے میرا دامن تھام لیا اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھو، جلدی لوٹ تو آؤ گے۔ میری روح مضطرب تو رہے گی اور خطرے سے بچنے کی ہر ممکن کوشش تو کرو گے نا"

اور میں نے قسم کھا کر اس کی تسلی کر دی اور جب وہ حسرت بھری نگاہوں سے میرے ٹم ٹم کو دیکھ رہی تھی تو میرے دل نے چاہا کہ میں ایک ہی جست میں اس کے پاس پہنچ جاؤں اور ٹم ٹم والے سے کہہ دوں۔ لو یہ کرائے کے پیسے۔ اب میں نہیں جاتا۔ پر یکایک "نیکودم" کی بات یاد آگئی ——— میرے دوست، موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے۔ موت ایک رحمت ہے۔ اس سے تم ہراساں مت ہو، ہمت بلند رکھو اور مصیبتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرو" میری نگاہیں روحی سے ہٹ کر خود بخود نگوں ہو گئیں اور میں خیالات میں کھویا اسٹیشن پہنچ گیا۔

روحی میری زندگی کی ساتھی تھی۔ ایسی ساتھی جس نے کڑی سے کڑی مصیبتوں میں بھی میرا ساتھ دیا ہے اور ہمیشہ میری ہمت افزائی کرتی رہی ہے وہ ایام! اف زندگی کے وہ درد بھرے دن مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ جب دو سال تک میں بیکار رہا تھا اور تلاش معاش میں اپنی بچی کھچی پونجی بھی لٹا کر مفلس بن گیا تھا۔ لیکن مجھے کامیابی نہ ہوئی تھی۔ ہم نے کتنی راتیں بے آب و دانہ گذار دی تھیں۔ پناہ بخدا! ان راتوں کی یاد اب بھی جب کبھی میرے دماغ میں آ جاتی ہے تو میں کانپ اٹھتا ہوں۔ زندگی کے ایسے کٹھن دنوں میں بھی روحی نے میری حوصلہ افزائی کی اور میری اداسی کو میٹھی میٹھی محبت بھری باتوں سے دور کرتی رہی۔ غیر تو غیر اپنے بھی ہماری مجبوریوں کو دیکھ کر قہقہہ لگاتے تھے۔ ہنستے تھے۔ کہتے تھے ——— کل ہی اسے نوکری کہاں ملے گی۔ دوسرا بولتا ——— جاہل ہے یہاں۔ تیسرے روحی کے باپ کو مخاطب کر کے کہتے ——— زاہد تمہیں کیا سوجھی تھی کہ اپنی بیٹی کو کوئیں میں ڈھکیل دیا۔ کوئی دوسرا لڑکا نہ ملا تھا کیا؟

ان جانکاہ باتوں سے میری آنکھوں سے آنسو نکل نکل پڑتے اور میں اپنے مجبوری پر جب کف افسوس ملتا ہوتا تو وہ روحی ہوتی جو آ کر میرے آنسو پونچھتی۔ مجھے تسلی دیتی۔ کہتی ——— مصیبتوں میں مرد رویا نہیں کرتے اور اس کی باتوں سے میری روح کو تسکین ہو جاتی۔ اور پھر اپنے اندر غیر معمولی حوصلہ، ہمت اور جوش پاتا۔ اور میں جب بھی کبھی ان گذری ہوئی باتوں کو سوچتا ہوں تو میری رگ رگ میں روحی کی محبت موجزن ہو جاتی ہے ——— کتنی اچھی ساتھی ہے وہ میری! میرا تو اس پر یقین ہے کہ میں روحی کے بغیر ایک قدم چل نہیں سکتا۔ میرے اعضا مفلوج ہو جائیں گے، میری ہمت پست ہو جائے گی اور میری امنگوں پر اوس پڑ جائے گا۔

اور جب میں "کوہ سلطان" پہنچا تو نیکودم مارے خوشی کے مجھ سے لپٹ پڑا۔ اور کہنے لگا کہ میں نے سمجھا تھا کہ میری باتوں کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اب تم نہیں آؤ گے۔ پر تم آ گئے۔ بڑی خوشی ہوئی مجھے۔ نیکودم میرا سچا دوست ہے۔ بڑا محبت گذار، بے لوث، ہم سات برس کے تھے کہ ہم دونوں ایک ہی اسکول میں داخل ہوئے۔ اور پھر کالج کی زندگی تک ساتھ ساتھ رہے۔ اور قسمت کی بات کہ نیکودم ہی کی معاونت سے اسی آفس میں میری تقرری بھی ہو گئی۔ اور ہم دونوں پھر ساتھ رہنے لگے۔

ایک سال بعد ہم دونوں کا تبادلہ "کوہ سلطان" سے ایران ہو گیا۔ اس عرصے میں برابر روحی کے خطوط آتے رہے۔ خط و کتابت ہی پر ہماری مسرتوں کا انحصار تھا۔ خط ہی ہماری زندگی کے لیے سرمایۂ شادمانی تھا۔ میری آنکھیں ہر دم اور ہر دن بے قراری سے ڈاکیے کی منتظر رہتیں۔ اور اپنے محبوب کے خط کو پا کر خوشی سے چمکنے لگتیں۔

زندگی کے دن اسی طرح ہوا کے دوش پر اڑتے چلے گئے اور تین سال کے بعد آج روحی کا ایسا خط آیا ہے کہ میرا دل بے چین ہے میرا دماغ معطل ہو گیا ہے میں پریشان ہوں وہ لکھتی ہے۔

جنگ کی بھیانک اور ہیبتناک خبروں سے میرا دل از حد ملول ہے۔ تمہارا خیال اور تمہارا ہی تصور ہر دم میری نگاہوں تلے گھومتا رہتا ہے اب تم آؤ جلد چلے آؤ تمہیں دیکھے بغیر اب میں دیوانی ہو جاؤں گی۔ پاگل سچ مچ پاگل۔ میری نگاہیں پیاسی ہیں —— ہاں صرف تمہیں دیکھنے کو مضطرب ہیں۔ میرا دل ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا ہے۔ تم آؤ خدا را جلد چلے آؤ۔ تمہارے بغیر زندگی کی ہر شام اور ہر دن اداس سا ہے صبح اٹھتے ہی جب تمہاری پیاری تصویر پر میری نگاہ پڑتی ہے تو یقین مانو میرا دل بےکل ہو جاتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ دوڑ کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں۔ کاش میرے پر ہوتے! اپنی مجبوریوں پر میری آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں اور پھر آنسو کے موٹے موٹے قطرے پٹ پٹ میرے دامن میں گر گر کر جذب ہونے لگتے ہیں۔ کاش اس وقت میری بے بسی تم دیکھ سکتے! - آؤ میرے نشاط قلب، آؤ میری آنکھیں تمہاری راہ تک رہی ہیں۔ میرا دل بے چین ہے۔ آؤ۔ اب دیر نہ کرو۔ ورنہ روحی کا دم گھٹ گھٹ کر نکل جائیگا پھر تم روحی کو دیکھ نہ پاؤگے"

میں سوچتا ہوں چلا جاؤں۔ اجازت نہ ملے تو بھاگ کر۔ پر نیکو دم کہتا ہے —— ایسا کام کبھی نہ کرنا تم "باؤنڈ" پر دستخط کر چکے ہو۔ ہاتھوں میں ہتکڑیاں لگ جائیں گی۔ سزا ہوگی۔ نوکری سے ہاتھ دھونا ہوگا۔ پھر وہی بیکاری ہوگی اور مصائب کی گھٹا ٹوپ تیرگی۔ ذلت ہوگی اور اقربا کے دلشکن الفاظ۔ اور ہمسایوں کے جانگسل طعنے۔ جانا سراسر حماقت ہے۔ اور اب تو تھوڑے دن رہ گئے ہیں"

اور میرا دل ان زنجیروں کو کاٹ دینے کو چاہتا ہے۔ معبود، آخر میں کیا کروں —— یہ مجبوریاں یہ زنجیریں!

رابطہ ہاشمی

سانحہ ارتحال

آہ! اکمل علی اکمل، گذشتہ ماہ آپ کی ناگہانی موت ایک ایسی موت ہے کہ جس پر جتنا بھی ماتم اور افسوس کیا جائے کم ہے، آپ کی جدائی سے صوبہ بنگالہ ایک بہت بڑی کمی محسوس کر رہا ہے۔ مرحوم کا تعلق کلکتہ کے پرانے اور معزز خاندان سے تھا۔ آپ اس صوبہ کے ان قابل قدر ہستیوں میں سے تھے جن پر ہم لوگوں کو ناز تھا، آپ علامہ شمس مرحوم کے خاص شاگردوں میں سے تھے، اور خاں بہادر حضرت رضا علی وحشت کے استاد بھائی۔ مرحوم سے زندگی بھر برادرانہ تعلقات قائم رہے اس خصوصیت کی وجہ کر ان تعلقات کا اثر یہ ہوا کہ ان دونوں حضرات کے شاگردوں میں بھی برادرانہ محبت قائم ہے، شاعری میں بھی ان کا نام نامی خان بہادر کے ساتھ ساتھ سارے بنگال میں روشن ہوا اور اہل بنگالہ ہمیشہ عزت اور احترام کرتے رہے۔ آپ کا کلام اکثر رسالہ جدید اردو میں شائع ہوتا رہا ہے۔ آپ کے کلام میں زبان کی بندش، چستی، صفائی اور بلند خیالی نمایاں حیثیت رکھتی ہے، اور ہر شعر کیف میں ڈوبا ہوا، جذبات کی آئینہ داری کرتا ہے، مرحوم ذوق نواسنجی کے علاوہ ایک خلق، انکسار اور محبت اور مروت کے مجسمہ تھے۔ مرحوم کی کمی سے ادبی حلقوں میں ایک بہت بڑی کمی محسوس کی جاری ہے۔ ہم لوگوں کی دعا رہے کہ مرحوم کی روح کو سکون اور ان کے متعلقین کو صبر جمیل عطا کرے

قاضی ظہور احسن

میرا بچہ

موسلا دھار بارش ہو کر ابھی ابھی تھمی، ندی نالے بہنے لگے، خشک کھیتوں میں جان پڑ گئی، پودوں کی سبز سبز چکنی چکنی پتیوں پر آفتابی شعاعیں رقص کر رہی تھیں، اور سفید سفید بادل کے گالوں کا عکس نالوں کے مٹیلے پانی پر بھلا لگ رہا تھا۔ گڑھوں کے پانی کی سطحوں پر دھیمی دھیمی ہوا کی رو سے جو ہلکی ہلکی موجیں بن جاتیں ایسی معلوم ہو رہی تھیں گویا ننھے ننھے دانے لہرا رہے ہیں دھیرے دھیرے ہوا کی رفتار میں اضافہ ہو رہا تھا پھر کچھ بوندا باندی ہونے لگی، دیہاتیوں کے چھوٹے چھوٹے ننگے بچے جو خوشی میں باہر نکل آئے تھے پھر گھروں میں جا گھسے۔ مینڈک بھی خوب زور زور سے ٹرانے لگے

مسور کے کھیت کے کنارے والے پیپل کے درخت پر طوطے کا ایک گھونسلہ تھا، طوطا طوطی بارش کی وجہ سے ابتک گھونسلہ ہی میں پناہ گزیں تھے۔ اتفاقاً کہیں سے ایک طوطے کا بچہ راستہ بھٹک کر اڑتا ہوا ادھر چلا آیا اور گھونسلہ دیکھ کر گھس پڑا۔ سچ ہے جس قدر جنس اناث میں شرم و حیا ہوتی ہے اتنی ہی محبت بھی ہوتی ہے۔ فوراً طوطی نے اس بچہ کو اپنے آغوش محبت میں لے لیا، طوطا بھی جوش خوشی میں اس کی چونچ میں چونچ ڈال کر ٹیں ٹیں کرنے لگا۔ کچھ وقفہ کے بعد جب بچہ کافی حرارت پا چکا تو باہر نکلا۔ طوطا طوطی وفور مسرت میں خوب زور زور سے ٹیں ٹیں کرنے لگے۔

ابھی نصف گھنٹہ بھی باقی نہیں گذرا تھا کہ کسی طرف سے ایک اور طوطی اڑتی ہوئی آئی اور اپنے بچہ کو گھونسلہ میں دیکھ کر بے دھڑک داخل ہو گئی اور بچہ کو کھینچنے لگی۔ اِس طرف سے دونوں طوطا طوطی بھی بچہ کو کھینچنے لگے۔ اسی طرح پانچ سات منٹ کھینچا تانی رہی جب نووارد طوطی کا بس نہ چلا تو وہ گھونسلہ سے نکل کر ٹیں ٹیں کرتی ہوئی درخت کے اطراف اڑنے لگی۔ ان کی آن میں بے شمار طوطے جمع ہو گئے اور سب کے سب شور مچانے لگے لیکن کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ گھونسلہ میں داخل ہو کر بچہ کو نکال لائے۔ پہلی والی طوطی گھونسلہ کی لب پر ڈائن کی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک اور طوطا آیا اور نووارد طوطی کے ساتھ گھونسلہ کی ایک قریب تر شاخ پر بیٹھ گیا۔ دونوں تھم تھم کر ٹیں ٹیں کرنے لگے گویا کہہ رہے تھے "خدارا ہمارا بچہ دیدو، ہم تم سے عاجزی کرتے ہیں۔ تمہارے پاؤں پڑتے ہیں خدا کے لیے ہم پر ترس کھاؤ، یہ ہمارا بچہ ہے صرف ایک بچہ، خدارا ہمارا بچہ واپس کر دو۔" ڈائن طوطی ان کی فریاد اس طرح بیٹھی سن رہی تھی جیسے کتا اپنے مالک کے مکان کی ڈیوڑھی پر حق وفاداری ادا کر رہا ہو۔

کتنی ہی زبردست آگ بھڑک رہا ہو لیکن کبھی نہ کبھی اس کا سرد ہو جانا ضروری ہے جتنا زندگی کو موت۔ بہت دیر کے بعد کہیں اس ڈائن طوطی کا دل پسیجا۔ وہ اڑ کر ان دونوں کے پاس گئی اور اپنے ساتھ انہیں گھونسلہ میں لے آئی۔ کچھ دیر چاروں ٹیں ٹیں کرتے رہے پھر دونوں اپنے بچہ کو لے کر اس طرح اڑے جیسے قیدی سپاہی کی گرفت سے نکل کر بھاگ جاتا ہے، اور یہ دونوں انہیں دزدیدہ نگاہوں سے تکتے رہ گئے۔

یہ سب واقعہ چھوٹے، گاؤں کی اپلے فروش کندن کا چھوکرا اپنے دالان میں چھپا چھپا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اس پر اثر نظارے سے اس دیہاتی لڑکے کا بھی دل بھر آیا اور ڈائن طوطی کی سینہ زوری پر غصہ سے بیتاب ہو کر گھونسلہ پر پتھر پھینکنے لگا۔ گھبرا کر دونوں طوطا طوطی شور و غل مچا کر اڑ گیے۔ پھر وہ اپنے میلے کرتے کی آستین سے منہ پونچھتا ہوا گھر کے اندر چلا گیا۔ کندن ایک بوسیدہ حصیر پر لیٹی ہوئی تھی، چھوٹے بھی ویسے چھوٹے منہ اس کے پہلو میں لیٹ گیا

ڈاکٹر محمود علی شہر کے بہترین ڈاکٹر تھے، آپ کی شہرت کا ڈھنڈورہ دور دور تک پٹ چکا تھا۔ آپ جس نیک نیتی سے مریضوں کا علاج کرتے اتنی ہی خدا نے آپکے ہاتھوں میں شفابخشی دی تھی۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب مریض آپ کی ڈیوڑھی پر بیٹھے نہ ہوتے۔ اکثر آپ غریبوں سے کچھ نہ لیتے اس طرح اور بھی آپ کی شہرت کا طوطی بولنے لگا تھا۔ خدا نے آپ کو سب کچھ دے رکھا تھا، دولت و ثروت

آپ کے قدم چوم رہی تھیں۔ لیکن آپ کے اولاد نہ تھی سے دے کے جو ایک لڑکا بھی تھا جس کی پرورش ہزار ناز و نعم سے کی تھی وہ بھی کہیں بدقسمتی سے کہیں غائب ہو رہا۔ ہزار تلاش کی لاکھ خاک چھانی لیکن نہ ملنا تھا نہ ملا۔ پھر اس کے بعد خدا نے نعمتِ اولاد سے محروم ہی کر دیا۔

ایک دن ڈاکٹر صاحب اپنے دیوان خانے میں صوفے پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ دھواں نقرئی دائرے بناتا سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا اوپر چلا جا رہا تھا۔ مقابل کے صوفے پر منور حسین کاظمی اُن کے ایک قریبی دوست بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی نظریں چھت پر جمی ہوئی تھیں جہاں دھوئیں کے نقرئی دائرے اپنی پناہ گاہ بنا رہے تھے۔ اسی طرح کوئی پندرہ منٹ گذر گئے ہنوز کمرے میں ایک جمود طاری تھا۔

"کاظمی صاحب" ڈاکٹر محمود نے مہرِ سکوت کو توڑتے ہوئے کہا "بھئی ملازم کی بڑی تکلیف ہے، ہو سکے تو کہیں سے بندوبست کر دیجیے نا، شہر کے ملازموں سے تو بھر پا گئے، اگر ہو سکے تو اپنے گاؤں ہی کا کوئی لڑکا لا دیجیے کیونکہ گاؤں کے لڑکے اکثر نیک ہوا کرتے ہیں ۔۔۔ اور آپ نے وعدہ بھی کیا تھا کیوں؟"

"ڈاکٹر صاحب حقیقت یہ ہے کہ" کاظمی نے حقہ کی نے اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا "جس طرح آپ کے شہر میں ملازموں کی قلت ہے اسی طرح گاؤں میں بھی ہے، آپ خوب واقف ہیں کہ شہری بچوں کی طرح گاؤں کے بچے وقت کو فضول نہیں گنواتے وہ کچھ نہ کچھ کام کرتے ہی رہتے ہیں۔ خیر اگر آپ کو زیادہ تکلیف ہے تو کوشش کیے دیتا ہوں"

"ہاں بھئی ضرور کوشش کیجیے گا!" ڈاکٹر نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

"جی ہاں میں تو حتی الامکان کوشش کروں گا پھر آپ کی قسمت"

"جی بھول لیجیے گا نہیں۔ آپ بھولنے میں بھی بہت مشاق ہیں"

"نہیں نہیں بھولوں گا کیسے، ارے بھئی میرے مکان ہی کے قریب ایک اُپلے فروش ضعیفہ کا چھوکرا ہے واقعی بڑا نیک اور جفاکش لڑکا ہے۔ اگر قسمت سے آ گیا تو ضرور لے آؤنگا۔ آپ تردد نہ کریں"

"اگر مگر والی بات نہیں ضرور لائیگا" ڈاکٹر نے ذرا زور دیکر کہا۔

"زبردستی؟"

"جی ہاں زبردستی" ڈاکٹر مسکرا دیئے۔

"اچھا بھائی"

"ہاں ۔۔۔ تو آپ گاؤں کب تشریف لے جا رہے ہیں؟"

ڈاکٹر نے حقہ کی چلم کو پھونکتے ہوئے کہا۔

"رات ہی کے گاڑی سے چلنے کا ارادہ ہے اور سنا ہے زیادہ بارش کی وجہ سے فصل کچھ خراب ہوئی جا رہی ہے، چل کر کچھ انتظام کرنا ہی ہوگا"

"جی ہاں"

کچھ دیر کے لیے سارا کمرہ پھر خاموش ہو گیا۔

"اچھا اب اجازت" کاظمی نے مہرِ خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا

"خدا حافظ"

"خدا حافظ، لیکن میری نہ بھولیے گا ۔۔۔ ضرور"

چھوٹے کو ڈاکٹر محمود کے یہاں آئے ہوئے آج پانچ ہفتے ہو رہے تھے۔ ڈاکٹرنی اور ڈاکٹر چھوٹے سے نہایت خوش تھے کیونکہ لڑکا کم سخن اور کام میں رتن تھا اور ہمیشہ قبل از حکم کام کر لیتا۔

آج شام مطلع کچھ صاف نہیں تھا گاہے گاہے ہوا کے خنک جھونکے چل رہے تھے، بارش ہونے کے آثار نمایاں ہو رہے تھے چھوٹے گھر میں نہیں تھا شاید سودا سلف لانے کی غرض سے بازار گیا تھا۔ ڈاکٹرنی اور ڈاکٹر بڑے کمرے میں چائے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹرنی نے ڈاکٹر سے کہا

"کیوں آپ نے کبھی غور کیا؟"

"کیا؟" ڈاکٹر سراسیمہ ہو گئے

"چھوٹے بالکل ہمارے معصوم علی کی طرح معلوم ہوتا ہے نا مجھے کچھ احتمال سا ہو رہا ہے، کہیں یہی معصوم علی تو نہیں ہے!"

"ہاں، میں بھی یہی کہنے والا تھا" ڈاکٹر نے متفق ہو کر کہا

"اور عمر کے لحاظ سے بھی اتنا ہی بڑا ہے"

"اور ناک نقشہ بھی ملتا جلتا ہے" ڈاکٹر نے فوراً کہا "وہی بڑی بڑی آنکھیں، بھرے بھرے رخسار، کلی جیسی ناک اور گھونگھر والے بال"

"جی ہاں ۔۔۔ اچھا کسی بہانے آج اُس سے پوچھا جائے" ڈاکٹرنی نے کچھ سوچ کر کہا۔

"نہیں، میں پوچھوں گا اُس سے"

"نہیں میں پوچھوں گی"

سے پھر بھی تم ہی پوچھ لینا، ایک ہی بات ناک آگے سے پکڑ لیں یا پیچھے سے؟"

سلسلۂ گفتگو جاری تھا کہ چھوٹے آ گیا۔ اُسے دیکھ کر دونوں خاموش ہو گئے۔ کچھ دقفہ بعد ڈاکٹرنی نے کہا۔

"چھوٹے! سامان رکھ کر ادھر آؤ۔"

چھوٹے باورچی خانے میں سودے کی تھیلی رکھ کر آیا اور ڈاکٹرنی کے روبرو دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹرنی نے پھر کہا۔

چھوٹے میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں وہ یہ کہ" وہ رک گئیں پھر بولیں "تمہارے اس نام کے علاوہ کوئی اور نام بھی ہے؟"

"جی نہیں اماں" وہ نہایت نرم لہجہ میں بولا "کیوں کیا بات ہے اماں؟"

"بیٹا بات ——" وہ سوچنے لگیں "بات اصل یہ ہے کہ میرا ایک بچہ تھا معصوم علی، بالکل تمہاری طرح، اُسے گم ہوئے آج کوئی کوئی سات سال کا عرصہ ہو رہا ہے لاکھ جستجو کی پر کہیں نہ پتہ چلا لیکن تم میرے معصوم کے رنگ و روپ میں نظر آ رہے ہو ——" ڈاکٹرنی کی آواز رک گئی۔

"جی!!!" وہ بالکل سراسیمہ ہو گیا، اُس کے دیدے بڑے بڑے ہو گئے۔ دفعتہً اس کی نظریں ماضی کے بکھرے ہوئے اوراق پر پڑیں وہ سوچنے لگا "واقعہ ہے ایک دن میں نے اپنی بڈھی اماں سے پوچھا تھا اماں جان تم کیوں اس قدر دکھ بھرتی ہو؟ تو اس نے جواب دیا، بیٹا اگر محنت کروں تو ہمیں کون کھانے کو دیگا!"

میں نے پھر پوچھا "میرے ابا کیوں نہیں کماتے؟"

وہ رونے لگیں زار زار رونے لگیں بولیں "اگر وہ ہوتے تو یہ ظلم آسمان ہماری ننھی بستی پر کیوں مسکراتا۔"

میں پھر بسورتے ہوئے پوچھا "تم تو کہہ رہی تھیں تمہارے ابا جان ہیں، خدا انہیں خضر کی عمر عطا کرے؟"

وہ بولیں "بیٹا میں تم سے کیا چھپاؤں جو حقیقت ہے کہے دیتی ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ تم ایک شہری ڈاکٹر کے چشم و چراغ ہو، وہ اب تک بقید حیات ہیں اور تمہاری اماں بھی۔ آج سے سات بہار قبل تم محرم کے تماشے میں بھٹک گئے تھے اور میں تم کو پا گئی اور اپنے گاؤں لے آئی۔ پھر خیال کیا کہ ان کا بچہ انہیں دے آؤں لیکن میری بے لوث محبت نے ساتھ نہیں دیا۔ میرے بھی ایک بچہ تھا بالکل تم جیسا اس لیے میں نے تمہیں رکھ لیا اور سمجھ لیا کہ اب میرا بچہ میری زندگی اور میری آس سب کچھ تم ہی ہو۔

"گاؤں میں تمہاری اماں اُپلے فروخت کرتی ہیں؟" ڈاکٹرنی نے چھوٹے کا پردۂ تخیل چاک چاک کر دیا۔ وہ چونک سا گیا جیسے کوئی اونگھتے کو کوہنی مار کر چونکا دے۔

"جی ہاں" وہ بولا "وہ اُپلے بیچتی ہیں۔"

"اور تمہارے ابا کیا کرتے ہیں؟"

اُس کے دل کو ایک دھکا سا لگا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کی گردن میں ہاتھ دے کر تنگ و تاریک غار میں دھکیل دیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ وہ رونے لگا۔ یہ دیکھ کر ڈاکٹر ڈاکٹرنی پر خفا ہوئے اور بولے "یہ تم ہمیشہ ملازموں کو مجبور کرتی رہتی ہو۔ جاؤ چھوٹے تم اپنا کام کرو بیٹا۔"

چھوٹے چپ چاپ برآمدے میں چلا آیا اور ایک گوشے میں کھڑا ہو کر دل ہی دل میں کہنے لگا "یا اللہ ان کے حسن سلوک اور محبت آمیز گفتگو سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہی میرے حقیقی ماں باپ ہیں۔ اور پھر ڈاکٹرنی بھی کتنی مہربان ہیں جو کھاتی ہیں وہ مجھے دیتی ہیں اور مجھے ایک لمحہ نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیتیں، اور ڈاکٹر مجھے روز انہ پیسے دیا کرتے ہیں۔ ہو نہو یہی میرے ماں باپ ہیں۔ اب میں انہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا —— لیکن میری بڈھی اماں، وہ تو میرے بغیر رو رو کر جان دیدیگی اول تو مجھے آنے ہی نہیں دیتی تھیں۔ خیر اسے بھی یہیں بلا لوں گا۔ سچ پوچھئے تو وہی میری حقیقی ماں ہیں۔ اسی نے مجھے اپنی جانفشانی سے اتنا بڑا کیا ورنہ میں آج کہاں ہوتا۔ دنیا میں میرا نشان بھی نہیں ہوتا۔"

یہی سوچتا ہوا کھڑا تھا کہ ڈاکٹرنی اور ڈاکٹر بڑے دروازے سے نکلے اور شام کی تفریح کے لیے چل دیئے۔ چھوٹے انہیں دیکھ کر جھٹ دروازے کی اوٹ میں چھپ گیا۔

چھوٹے اپنی بڈھی اماں سے ملنے کے لیے ہر ہفتہ گاؤں چلا جاتا تھا کیونکہ بغیر ایک دوسرے کو دیکھے انہیں ایک ایک لمحہ انتہائی غیر دلچسپ معلوم ہوتا۔ چھوٹے جب ماں کی خدمت میں حاضر ہوتا تو ماں اسے بھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیتی اور پیاروں سے گال لال لال کر دیتی۔ وہ اس قدر خوش ہوتی جیسے ایک اندھا آنکھیں ملنے کے بعد خوش ہوتا ہے پھر وہ مطابق حیثیت بیٹے کو کھلاتی پلاتی۔ چھوٹے بھی ماں کے لیے شہر سے

کچھ نہ کچھ لاتا ۔ اس طرح متعدد مہینے گذر گئے

آج چھو نے چار ہفتوں سے گاؤں نہیں جا رہا تھا کیونکہ اُسے ڈاکٹر اور ڈاکٹرنی جانے سے منع کرتے اور لالچ دلاسے دے کر روک لیتے تھے ۔ وہ بھی محبت کے زیر اثر رک جاتا ۔ اس درمیان میں گاؤں سے اس کے نام کئی ایک چٹھیاں آچکی تھیں کہ بڈھی اماں تمہاری فرقت میں بے حال ہو رہی ہے ۔ خدا کے لیے تم ایک مرتبہ ضرور آؤ لیکن چھوٹے مجبور تھا اسے جانے کی اجازت نہ تھی ۔ ایک دن کسی نے اسے گاؤں سے آکر کہدیا کہ تمہاری اماں سخت بیمار ہے اور تمہیں یاد کرکے رو رہی ہے تم ضرور جاؤ ورنہ تمہاری جدائی کے صدمہ میں وہ دم توڑ دیگی یہ سنتے ہی چھوٹے ماہی بے آب کی طرح مضطرب ہو گیا اور موقع غنیمت پاکر فرار ہو گیا

جب وہ گاؤں پہنچا تو دیکھا دو عورتیں جن کی شکلوں سے افسردگی ٹپک رہی تھی، گھر میں گھس رہی تھیں وہ ہانپتا کانپتا دیوانوں کی طرح بے دھڑک گھر میں داخل ہوا ۔ گاؤں کی تمام عورتیں بڈھی اماں کے گرد بیٹھی تھیں اور سب کے چہرے باسی پھول کی طرح کمھلائے سرہانے عود بتیاں جل رہی تھیں ۔ اس وقت بڑھیا کی حالت نہایت ابتر تھی ۔ دیدے کھڑے ہو گئے تھے ۔ چھوٹے یہ عالم دیکھ کر تاب نہ لا سکا اور "میری اماں" کہہ کر دھڑام سے گر پڑا اور ماں کے سینے پر سر رکھ کر زار و قطار رونے لگا ۔ بوڑھیا کنون کے خشک حلق سے ایک مردہ چیخ نکلی "میرا بچہ" تیز تند ہوا کا ایک جھونکا آیا اور تمام عود بتیاں یکلخت گر کر بجھ گئیں ۔

چھوٹے نے اب قسم کھائی کہ وہ پھر کبھی شہر نہ جائیگا ۔ وہ اسی گاؤں میں پیدا ہوا اور اسی گاؤں کی مٹی میں دفن ہوگا

خواجہ عبدالرزاق کھڑگپوری

ایک شام

ایک اُداس اور غمگین شام کو جب سورج اپنی آخری کرن کوٹے کر دور پہاڑی کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ شفق مغرب میں پھیلی ہوئی تھی۔ جیسے انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی ہو۔ ننگے لُنڈ مُنڈ درختوں پر چیخ پکار میں مشغول تھے۔

میں اس اداس شام کو ندی کے کنارے ایک پتھر پر مغموم و پریشان بیٹھا غور کر رہا تھا۔ انسانی زندگی ہے — یہ زندگی — یہ مکر و فریب پُر زندگی — یہ لڑائی جھگڑے کی دنیا — یہ فساد اور قتل و غارت کی زندگی — یہ زندگی ایسی کیوں ہے؟ — یہاں شانتی اور اطمینان کیوں نہیں؟ یہاں محبت اخوت اور ہمدردی کیوں مفقود ہے۔

میں سوچ رہا تھا۔ کہ یکایک درختوں میں سے ہوتی ہوئی ایک آواز آئی — نسوانی آواز — آواز سریلی تھی مگر مغموم — جیسے ستار پر دکھ بھرا گیت چھڑا ہو۔ میں نے دیکھا دور درختوں میں ایک سایہ حرکت کر رہا تھا — وہ ادھر ہی کو آ رہا تھا — آواز خاموش ہوگئی۔ سائے نے سائے کو دیکھ لیا — وہ ایک عورت تھی — عورت۔ میں نے اُسے دیکھا بہت قریب سے — وہ میرے بالکل قریب تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے — درد و غم کے آئینے — اس کی آنکھیں سرخ تھیں — چہرے پر حزن و ملال چھایا ہوا تھا۔

"اسے دیکھا" اس نے غمگین اور درد بھری آواز میں کہا "جس کی تلاش میں میں دنیا کے گوشے گوشے کو چھان چکی ہوں"

"نہیں" اور میرا سر جھک گیا۔ جیسے یہ کہہ کر میں بہت شرمندہ ہوں۔ میں اس کے چہرے کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

وہ یہ سن کر چلی گئی۔ اور جنگل میں غائب ہوگئی۔ فضا بالکل خاموش تھی۔ رات نے اپنا جال دنیا پر ڈال دیا۔ میں سوچنے لگا۔ پریشان و مغموم۔ میں خیالات کی دنیا میں ڈوب گیا

وہ اپنے محبوب کی تلاش میں اتنی سرگرداں۔ اتنی تلاش و جستجو کے باوجود وہ مل نہ سکا۔ کیا اسے محبت نہیں۔ پھر دونوں ایک دوسرے سے اتنے دور — یہ دوری کیسی — میں یہی سوچتا رہا جس نے میری پریشانی میں اور اضافہ کیا — اتنے میں ہلکی ہلکی روشنی ہوئی — اب رات اپنا جال لپیٹ رہی تھی۔ اور دن سورج کے گھوڑے پر سوار کسی کی تلاش میں دوڑا چلا آ رہا تھا — میں سر جھکائے پریشانی کو دور کرنے کے لیے ندی میں پاؤں ڈالے بیٹھا تھا۔ مجھے اپنے پاس آہٹ سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک نوجوان میرے پاس کھڑا تھا۔ وہ اُداس و غمگین تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے — میں اس کی پریشانی دیکھ کر اپنا غم بھول گیا۔ کیا مجھ سے بھی زیادہ غمگین لوگ اس دنیا میں بستے ہیں۔ اس نے ایک آہ بھر کر پوچھا۔ "کیا تم نے اسے دیکھا ہے۔ جو دنیا کی ہر چیز سے حسین ہے۔ جس سے میں پریم کرتا ہوں۔ اور اُسے مجھ سے محبت ہے۔ ہماری محبت بہت پرانی ہے لیکن اب وہ کہیں چلی گئی ہے۔ معلوم نہیں کہاں؟ — میں نے دنیا (جنگل) کا چپہ چپہ ڈھونڈ ڈالا۔ مگر میں اسے نہ پا سکا۔ کیا میں اب اسے حاصل نہ کر سکوں گا؟"

میرے منہ سے نکلا "تلاش"۔ یاس اور رنج — ستار ہا۔ آواز خاموش ہوگئی۔ میں نے دیکھا وہ جا چکا تھا اور دور پگڈنڈی پر کوئی سفید سفید چیز حرکت کر رہی تھی۔

میں جان گیا — یہ دونوں محبوب جنگل میں ملے مگر اندھیرے کی وجہ سے ایک دوسرے کو پہچان نہ سکے۔ پاس سے گزر گئے مگر احساس تک نہ ہوا — ان کی بینائی پر اندھیرا غالب آگیا۔

یکایک میرے دماغ میں خیال آیا۔ نتیجہ تھا صحیح اور ٹھیک — ہم سب ہی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں مگر ہماری محبت کو خود غرضی لیے ہوتی ہے۔ یہ غرض اندھیرے کی طرح محبت کو چھپا لیتی ہے — ہم کسی کو بھی محبت نہیں کرتے۔ ہم اپنی غرض کو محبت کا نام دے کر سمجھتے ہیں۔ یہ خود غرضی — ان کے بیچ میں پڑ گئی ہے۔ خود غرضی آنکھوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ یہ غرض —

محمد ابراہیم متعلم ایف اے جامعہ

زل

پیکر مہر و وفا محو جفا ہو گیا
دیکھتے ہی دیکھتے حشر بپا ہو گیا

دل گیا صبر و سکوں مجھ سے جدا ہو گیا
ملتے ہی ان سے نگاہ آہ یہ کیا ہو گیا

حسرت دیدار کی داد عنایت ہوئی
چھپ کے مرے دل میں وہ جلوہ نما ہو گیا

ناز کے بدلے حیا لطف کے بدلے ستم
خیر سے اب وہ جواں نام خدا ہو گیا

بنکے تماشائی آپ آئے مجھے دیکھنے
خیر کسی طرح سے نالہ رسا ہو گیا

دل میں پھر احساسِ غم آپ نے پیدا کیا
پوچھنے سے آپ کے درد سوا ہو گیا

پرسشِ احوال کا یہ عجب انداز ہے
مجھ سے وہ کہنے لگے آپ کو کیا ہو گیا

جذبۂ دل تو بتا اس کا سبب کیا ہوا
مجھ کو نہیں کچھ پتہ کیوں وہ خفا ہو گیا

نبض پہ بیمار کی شوخ نے رکھا جو ہاتھ
درد کی لذت ملی اور سوا ہو گیا

وعدہ فراموش نے پھر کوئی وعدہ کیا
شوق کا طوفان پھر دل میں بپا ہو گیا

مضطرب و بیقرار خود ہی بنایا اسے
اور پھر احسن سے وہ خود ہی خفا ہو گیا

سن احسن طباطبائی

ایسا نہ ہونا تھا

امنتا الہ العالمین ایسا نہ ہونا تھا
ہزاروں آستاں اور اک جبیں ایسا نہ ہونا تھا

لسم رنگ و بو۔ دنیا۔ فدائے رنگ و بو انساں
مکاں ایسا جو ہونا تھا مکیں۔ ایسا نہ ہونا تھا

لک کو تو نے رفعت خیر بخشی تھی تو بخشی تھی
مگر طعنہ بہ پستیِ زمیں۔ ایسا نہ ہونا تھا

زادستِ کرم اور کوئی لبریز اور کوئی خالی
نہیں ایسا نہ ہونا تھا نہیں۔ ایسا نہ ہونا تھا

ہیں ہر قطرۂ خوں اشک بن بن کر ٹپک جائے
کہیں ہر قطرہ ہو رنگ آفریں۔ ایسا نہ ہونا تھا

دلِ پُر شوق تو محروم۔ اور جیب گراں محرم
کہاں ایسا نہیں ہوتا۔ کہیں ایسا نہ ہونا تھا

یہ مانا ترکِ دنیا۔ دین میں تیرے نہیں خواجہ
مگر دنیا ہی خود بن جائے دیں۔ ایسا نہ ہونا تھا

خواجہ قدرانی

چند لمحے علامہ اقبالؒ کے ساتھ

آسماں سو سال چکر کھائیگا   جب کوئی اقبال بن کر آئیگا

"جدید اردو" کے گزشتہ شمارہ میں مندرجہ بالا موضوع پر جو تاثرات شائع ہوئے تھے ان کے متعلق متعدد احباب اور کرمفرماؤں نے گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے، جس کے لیے میں سراپا تشکر و امتنان ہوں۔ بعض اصحاب کا یہ بھی مشورہ کیا بلکہ اصرار ہے، کہ چونکہ "اقبالؒ" کا بہت قریب سے مطالعہ کرنے کا مجھے موقع ملا ہے، اس لیے علامہ مرحوم کی زندگی کی روشنی میں آپکے کلام و فلسفہ پر میں ایک مبسوط کتاب شائع کروں۔ لیکن میرا کیا منہ ہے، کہ میں "ترجمان ملت بیضا" اور "دانندہ اسرار" کے گہرے فلسفہ کو سمجھ سکوں۔ مجھ ناچیز کی انتہائی کوشش یہی ہے کہ ہماری موجودہ نسل کے دانشمند حضرت علامہ مرحوم کی بلند شخصیت کی کما حقہ قدر و منزلت کر سکیں، اور اپنے دل کی عمیق ترین گہرائیوں میں یہ محسوس کریں کہ اقبالؒ کا کلام نری شاعری ہی نہیں۔ بلکہ ایک خاص پیغام اور درس کا حامل ہے۔ پس اسی لحاظ سے میرا یہ کہنا ہے کہ اقبالؒ صرف ایک بڑا شاعر ہی نہیں، بلکہ اس دور کا سب سے بڑا "پیغامبر" بھی ہے کیونکہ وہ ایک خاص مشن اور مقصد لے کر آیا تھا۔ اور بہت حد تک اس مشن کو پورا کر کے دنیا سے گیا ——— بس میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ برائے خدا میرے کرم فرما اس مشن کو بخوبی سمجھ لیں، اور اپنے دل میں جگہ دیں اگر وہ ایسا کریں گے، تو میں یہ سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔ اور زیر خاک علامہ مرحوم کی روح بھی خوش ہوگی۔ کہ چمن کے جن بوٹوں کو "جگر کا خون دے دے کر" مرحوم نے پالا تھا وہ اب پھل پھول رہے ہیں۔

قبل اس کے کہ ہم علامہ مرحوم کے سوانح حیات کی روشنی میں آپ کے کلام و فلسفہ پر ایک چھچلتی ہوئی نظر ڈالیں۔ برائے خدا مجھے اپنے جگر سے ایک نہایت اذیت رساں پیوست شدہ تیر بھی نکال لینے دیجئے، جس کے نکل جانے سے شاید میرا غم کسی حد تک غلط ہو جائے۔ کیونکہ اقبال کی ذات سے جو والہانہ شیفتگی اور محبت اور وابستگی مجھے رہی ہے۔ اس کے پیش نظر میں ہر صبح و مسا اُس گزشتہ غمناک اور اندوہگیں یوم کے دردناک واقعات کی دھندلی سی تصویر نہیں، بلکہ متحرک فلم دیکھتا ہوں، آج کئی سال گذر جانے کے بعد بھی اپنے تصور میں علامہ مرحوم کی نعش ایک جم غفیر کے درمیان گوشۂ لحد میں اُتارتے اور سپرد خاک کرتے دیکھتا ہوں، تو سر سے پاؤں تک کانپ اٹھتا ہوں۔ سارا بدن لرزنے لگتا ہے، اللہ اللہ یہ انجام ہستی ہے ع ہے، بے نظام ہستی ناپائیدار کا"

۲۱-اپریل ۱۹۳۸ء جمعرات کے دن صبح کے پانچ بجے علامہ اقبال کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اور مرحوم اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کو سدھارے۔ میں اُس روز لاہور ہی میں مقیم تھا، اور صبح سویرے باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ جونہی میں نے جانگداز اور اندوہناک خبر سنی، تو ہر چند مجھے علامہ مرحوم کی علالت کا پہلے سے علم تھا۔ لیکن پھر بھی مجھے یقین نہ آیا۔ بھلا میں کیونکر باور کر سکتا تھا۔ کہ ایسی شخصیت جس کی ملک و قوم کو اشد ضرورت تھی، ہم سے ہمیشہ کیلئے جدا ہو جائے ——— تاریخ اسلام شاہد ہے کہ جب فخر کائنات شاہ دو جہاں آنحضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا، تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جوش محبت و عقیدت میں اس قدر آپے سے باہر ہوئے کہ آپ نے برہنہ خنجر ہاتھ میں لے کر لوگوں کو للکار کر پکارا کہ جو شخص کہیگا کہ آنحضرت کا وصال ہو گیا۔ میں اس شخص کا سر فوراً تن سے جدا کر دوں گا ——— بعینہ یہی حال میرا تھا میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی شخص بھی علامہ مرحوم کے انتقال پر ملال کی خبر مجھے سنائے۔

الغرض یہ روح فرسا خبر سننے پر بھی جب مجھے یقین نہ ہوا (حالانکہ موت کی خبر شاذ و نادر ہی جھوٹی ہوتی ہے) تو میں لپک کر ٹیلیفون پر گیا اور ایک مقامی روزنامہ اخبار کے دفتر سے ٹیلیفون پر دریافت کیا۔ ٹیلیفون پر بھی میرے منہ سے الفاظ رک رک کر نکل رہے تھے، میں جنون

تھا کہ کن لفظوں میں پوچھوں کہ علامہ اقبال جی کیسے ہیں، بمشکل اتنا منہ سے نکلا "علامہ اقبال کیا خدا نخواستہ ......" پھر زبان گنگ ہوگئی! اُدھر سے جواب ملا "جی ہاں !" ـــــ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ میرا مفہوم سمجھ گیے۔ اتنا سننا تھا کہ ٹیلیفون کا رسیور یونہی میز پر پھینک کر گاڑی لیکر علامہ کی کوٹھی واقع میورروڈ پہنچا، مگر آہ۔ میرا دل بیٹھا جا رہا تھا، آنکھوں میں آنسو تھے، لب پر آہ! دیکھتا کیا ہوں کہ وہاں پہلے ہی سے لوگ کافی تعداد میں موجود ہیں۔ رو رہے ہیں، چلا رہے ہیں، ہائے افسوس، وائے افسوس! وہ خبر جسے میں ایک غلط افواہ سمجھ رہا تھا۔ بالکل صحیح تھی، ع

"میں ہی دیوانہ تھا یا سارا جہاں دیوانہ تھا"

علامہ مرحوم کی نعش ابھی اسی کمرے میں تھی۔ جہاں اپنی ۔ نے اپنی زندگی کے آخری لمحے گذارے تھے، موت سے ہمکنار ہونے کے بعد بھی آپ کی نورانی چہرے سے شرافت، حمیت، ہمدردی اور شفقت ٹپکتی تھی۔ اور دل کو آپ کی طرف کشش ہوتی تھی، یہ خیال یا مشاہدہ صرف میرا ہی نہ تھا۔ بلکہ اس وقت جو شخص بھی دیکھ رہا تھا۔ اس کا یہی کہنا تھا کہ "علامہ کے چہرے پر اب بھی نور برس رہا ہے"

تھوڑی دیر کے بعد کمرے سے باہر نکلا، تو دیکھا کہ زائرین کا تانتا بندھ گیا ہے۔ جو شخص بھی سانحۂ ارتحال کی خبر سنتا تھا۔ سیدھا وہاں پہنچتا چند گھڑیوں کے اندر ہی سارے کا سارا لاہور "جاوید منزل" پر آکر مجتمع ہوگیا۔ ادھر اُدھر چند لوگ علامہ مرحوم کا ایک فارسی قطع لکھے اور دہرا رہے تھے جس کے متعلق وہ یہ کہہ رہے تھے کہ وصال سے چند منٹ پیشتر آپ نے یہ قطعہ پڑھا تھا ع

سرودِ رفتہ باز آید کہ نآید؟ نسیمے از حجاز آید کہ نآید؟

سر آمد روزگارے ایں فقیرے دگر دانائے راز آید کہ نآید؟

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ موت سے ہم آغوش ہونے سے قبل آپ نے اپنا وہ شعر پڑھا۔ جو میں پچھلی مرتبہ درج کر چکا ہوں، اور اب پھر دوبارہ ذیل میں درج کرتا ہوں، مگر ایسا کرنے سے قبل میں یہ معلوم کرانا بھی ضروری سمجھتا ہوں، کہ انگلستان کے مایہ ناز فلسفی ادیب و شاعر طامس ہارڈی کے متعلق مشہور ہے کہ اُس نے مرنے سے چند لمحے قبل عمر خیام کی ایک مشہور و معروف رباعی کے ایک انگریزی ترجمہ شدہ حصہ کو پڑھوایا، اور دم توڑ دیا۔ مگر مشرق و مغرب کا فرق اِس سے اور بھی زیادہ نمایاں ہے، کہ اقبال، نڈر اور بے باک اقبال نے فرشتۂ اجل کو لبیک کہنے سے پہلے اپنا یہ لاجواب شعر پڑھا

نشانِ مردِ مومن با تو گو یم چو مرگ آید تبسم بر لب اوست"

بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ علامہ اقبال کے انتقال پر ملال کے بعد چند ہی گھنٹوں کے اندر پورے شہر لاہور میں صف ماتم بچھ گئی، سرکاری دفاتر اسکول، کالج، دوکان، مکان بند کرکے سب لوگ علامہ مرحوم کی کوٹھی پر کشاں کشاں آرہے تھے۔ راستہ، سڑک، میدان، صحن غرضیکہ چاروں طرف لوگوں کا بے پناہ سیلاب اُمڈا چلا آرہا تھا، جگہ بہ جگہ سے پھولوں کے بڑے بڑے گلدستے آرہے تھے، جن میں ہز ایکسیلنسی گورنر پنجاب اور ہز ہائی نس نواب بہاولپور کے ارسال کردہ خاص طور پر ممتاز تھے۔

کوئی تیسرے پہر جنازہ اٹھایا گیا۔ کونسی آنکھ تھی جو اُس وقت آنسوؤں سے تر نہ تھی، کونسا دل تھا، جو اس وقت زخمی نہ تھا۔ کونسا شخص تھا جس نے جنازہ کو کندھا نہیں دیا۔ لوگ ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ مگر جنازہ سے کندھا نہیں ہٹاتے تھے اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ ع

"عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے"

میں نے برسوں پہلے سے ایک مشہور مقالہ سن رکھا تھا کہ "مرگِ عالم مرگِ عالم" لیکن اس کی حقیقت و اصلیت میں نے اُس روز اپنی آنکھوں سے دیکھی جب ایک جہان کو اس طرح گریہ کناں دیکھا۔ اس قدر جم غفیر اور انبوہ کثیر میں نے اپنے لاہور کے پندرہ سالہ قیام میں کبھی نہیں دیکھا اور میرا تو کہنا ہی کیا ہے۔ لاہور کے بڑے بوڑھوں کی زبانی میں نے سنا کہ انھوں نے اپنی پوری زندگی میں آدمیوں سے لہریں مارتا ہوا اتنا بے پناہ سمندر کبھی نہیں دیکھا اور کمال یہ تھا کہ تمام لوگ انتہائی محبت و عقیدت کے ساتھ علامہ مرحوم کے اشعار و اقوال زریں دہرا رہے تھے جن میں وزرائے حکومت پنجاب، ہائی کورٹ کے جج، حکام، گورنمنٹ اور شہر بھر کے معزز حضرات بلا امتیاز ملت و مذہب اور نسل و رنگ، ہندو، مسلمان سکھ، انگریز غرضیکہ تمام لوگ جنازے کو اپنے کندھوں پر اٹھائے یا اُس کے ہمراہ جا رہے تھے۔ آدمیوں کے اس بے پناہ طوفان میں بہت سے

لوگوں کی ٹوپیاں اور پگڑیاں سر سے گر پڑیں، پاؤں سے جوتے اتر گئے، تمازتِ آفتاب اور شدت گرمی کی بھی پرواہ نہ کرتے ہوئے شیدایانِ اقبال پروانہ وار گر رہے تھے۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی تھی، مگر مشتاقانِ جمال آگے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

مجھے اب تک ٹھیک یاد ہے کہ ایک نہایت عمر رسیدہ بزرگ (جو اپنی ضعیفی اور نقاہت کے باوجود علامہ کے جنازہ کی معیت کو فروری اور موجب فخر سمجھ رہے تھے) راستہ میں فرمانے لگے، "میں علامہ کی طالب علمی کے زمانہ سے ان کو جانتا ہوں، اور ان کے کلام سے ہمیشہ متاثر ہوتا رہا ہوں"، پھر وہ کہنے لگے کہ مجھے وہ دن بھی یاد ہیں۔ جب علامہ نے "شکوہ" اور "جواب شکوہ" جیسی نظمیں اسی لاہور کی سرزمین پر پہلی سنائی تھیں، اور بالخصوص وہ نظم بعنوان "ایک آرزو" بھی کس قدر سیدھی سادی اور انسانی جذبات کی کی صحیح ترجمانی کرتی ہے، جس کا پہلا مصرعہ ہے

"دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب"

القصہ اس وقت میں نے بغور سے دیکھا اور سنا کہ بہت سے لوگوں کی زبان پر یاس و حسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ علامہ مرحوم کے متعدد اشعار رواں تھے۔ مجھے معاً یاد آیا کہ انگلستان میں جب وہاں کے ادیب و شاعر طامس ہارڈی کی موت وقوع پذیر ہوئی تھی، اور اس کے جنازہ کے ہمراہ لوگوں کا بے پناہ ہجوم تھا تو لوگ بعینہٖ اسی طرح ہارڈی کا کلام جھوم جھوم کر پڑھتے جاتے تھے۔ یا اس کے پیش کردہ زندہ جاوید کردار مثلاً ٹیس اور جوڈ وغیرہ کو حسرت و یاس کے ملے جلے جذبات کے ساتھ یاد کرتے جاتے تھے۔

بہت دیر بعد گیے جنازہ شاہی مسجد پہنچا، اور اس تاریخی اور عالیشان مسجد کے صدر دروازہ کے بائیں جانب علامہ مرحوم کا جسدِ خاکی سپرد خاک کر دیا گیا۔ آہ! وہ منظر کس قدر جگر گداز تھا جب علامہ اقبال کے رخِ انور کا آخری دیدار ہوا، اور پھر وہ ہماری آنکھوں سے ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو گیے۔

عبد الحیٔ

غزل

دشتِ جنوں میں دل کو ہے فکرِ بقا عبث
اس سرزمیں میں کرنا ہے خوفِ فنا عبث

عالم وہ ہے کہ ہو گی دعا و دوا عبث
دامن کی دیر سے ہیں مجھے وہ ہوا عبث

تخییل سے نصیب ہیں آزادیاں اسے
سرکار کو ہے فکر اسیرِ بلا عبث

ایسا نہ ہو کہ ذوقِ ستم سے ہو اجتناب
اس جور آشنا سے ہے ذکرِ وفا عبث

خارِ جنوں نے چلنے سے مجبور کر دیا
لائی ہے آج ان کا پیام اے صبا عبث

رنگنے کو ہاتھ خونِ شہیدوں کا کم نہ تھا
بندہ نواز کرتے ہیں خونِ حنا عبث

اشکِ مسیح سے جو افاقہ نہ ہو سکا
تجویز کر رہے ہو طبیبو دوا عبث

جب اعتراف ہم کو خود اپنی خطا پہ تھا
ہم سے خفا ہوئے ہو تم اے دلربا عبث

ہے آشنا ازل سے ترے حسن کا سلیم
اب اس سے کر رہا ہے تو شرم و حیا عبث

الٰہی

سلیم الٰہی۔

غزل

طائرِ دل ہوا شکار کس کی نگاہ ناز کا
آج جو ہمنوا بنا بلبلِ غم نواز کا

قصۂ عشق غزنوی ہے نہ نشاں ایاز کا
نقشِ حقیقت آگیا رنگ مٹا مجاز کا

حالِ مریضِ عشق کیا یاس سے ہمکنار ہے
نبض تک آکے ہٹ گیا ہاتھ جو چارہ ساز کا

محملِ دل کو چھوڑ کر دیدۂ خود نما میں آ
میری جبینِ شوق کو حوصلہ ہے نیاز کا

اپنی خودی کے ساتھ ہی فصلِ دوئی بھی مٹ گیا
مستِ مئے الست کو ہوش کہاں نماز کا

کیفِ دلِ وفا سرشت لب سے ہو کیسے آشنا
نغمہ ہو راز دار کیا آتشِ عشق ساز کا

حاصلِ کشمکش ہو صبر کاش کہیں جو ٹوٹ جائے
دستِ طلب سے سلسلہ دامنِ حرص و آز کا

گلشنِ بے ثبات میں موسمِ گل کی یاد کا
لذتِ غم بنی سبب نوحۂ جاں گداز کا

کوئی طلب میں طور پر کوئی دنیٰ کا رازدار
وہ بھی ادا نیاز کی اور یہ رنگ ناز کا

حوصلہ مشتِ خاک کا، سکتہ ہے عقل و ہوش کو
خانۂ دل ہو جلوہ گاہ حسنِ ازل کے راز کا

روح کا ربط جسم سے بیخود زار جب نہ ہو
سایہ نہ سر سے ہو جدا رحمتِ کارساز کا

بیخود

غزل

اسیرِ نازِ بتاں، بندۂ خدا ہوں میں
زمانہ بھر کی محبت کا آشنا ہوں میں

فریبِ وعدۂ تازہ نہ دے مجھے ظالم
کہ تیرے پہلے ہی وعدہ میں کھو گیا ہوں میں

کسی کے جلوۂ رنگیں کی دلکشی بے سود
اب اُن منازلِ حیرت سے بڑھ گیا ہوں میں

مری نگاہ میں اب ہیچ ہیں ترے جلوے
کہ آپ اپنی تصوّر میں کھو چکا ہوں میں

مرے خیال کی بیباک رفعتیں! توبہ
مقامِ قدس سے بھی اور بڑھ گیا ہوں میں

ادب ہے دیکھ ادب سے کہ دیکھنے والے
کسی کے جلوۂ رنگیں کا آئینہ ہوں میں

فریب خوردۂ صد آرزو نہیں قیصری
کہ آپ اپنی حقیقت کو جانتا ہوں میں

جاوید قیصری

اے عورت کیا تیرا نام خودداری ہے؟

قطب، رشید، قادر، میں اور نہ جانے کون کون لوگ آتش دان بہل کیبنے کی اوپر کی منزل پر چائے نوشی میں مصروف تھے۔ مختلف عنوانات یکے بعد دیگرے ہمارے بحث وخیال آرائی کا مواد فراہم کر رہے تھے۔ کافی دیر تک موضوع بحث وتمحیص رہنے کے بعد ہر ایک عنوان دوسرے کو اپنی جگہ پر ہماری بحث میں ایندھن کی طرح چھوڑ کر رخصت ہو رہا تھا۔ فنون لطیفہ، فلسفہ، حیات، سیاست، معاشرت، غرضیکہ تمام قسم کے موضوعات مملول ہو کر ہی ہیں پہلے کی طرح تشنہ کام اور جنگ لفظی کیلئے قبل سے زیادہ تازہ دم چھوڑ کر رخصت ہوئے یہاں تک کہ آخر میں کبھی نہ سلجھنے والا موضوع "عورت" اب ہمارے بحث وخیال آرائی کا عنوان تھا۔

مجھے خوب یاد ہے اس عنوان کے زیر بحث آتے ہی ہر شخص میں زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور اس عقدۂ لاینحل کو کھولنے میں ہر ایک ایڑی چوٹی کا زور صرف کرنے لگا۔ پھر نہ پوچھئے چائے اور کٹلٹ کی بھرمار اور سگار وسگریٹ کے دھویں سے سارا کمرہ دھواں دھار ہو رہا تھا۔ احباب کی کبھی فرداً فرداً اور اکثر یکبارگی گرج سے سارا کمرہ گونج اٹھتا تھا۔ کوئی تو عورت کی تعریف وتوصیف سازی میں آسمان وزمین کے قلابے ملا رہا تھا، کوئی عورت کو غرور ونخوت کا مجسمہ ثابت کرنا چاہتا تھا، کوئی اُسے عفت وعصمت کی دیوی اور کوئی چار پیسے میں بازار سے خریدے ہوئے کھلونے سے زیادہ وقعت نہ دینا چاہتا تھا کہ جب جی چاہا قیمت دیکر خرید لیا پھر کھیلتے کھیلتے جب طبیعت سیر ہوگئی کھلونے کی طرح توڑ پھوڑ کر پھینک دیا۔ غرض جتنے لوگ تھے اُتنی ہی رائے تھیں اور ہر شخص اپنی رائے کو منوانے کے لیے مضبوط سے مضبوط دلیل کام میں لا رہا تھا۔

ہر شخص تو اپنی قادر الکلامی کی داد لینے اور اپنی رائے کی گرانی ثابت کرنے میں ہمہ تن محو تھا کسی ایک کی نظر دوسرے کی طرف نہ جاتی تھی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے یا کیا سوچ رہا ہے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ قادر ان دادیوں اور بحثوں کے اتار چڑھاؤ اور حجت ومباحثہ کے تھپیڑوں سے دور اپنی کرسی پر ہمہ تن گوش بنا بیٹھا تھا۔ وہ بحث کے مد وجزر اور الفاظ کے طوفان خیز سیلاب سے [illegible] کھڑا تھا بظاہر وہ [illegible] خیال میں کھویا ہوا تھا۔ میں نے سب سے پہلے قطب کی توجہ اُس کی طرف مبذول کرائی پھر تو گویا خود ہی اُس نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا چنانچہ اب عورت سے ہٹ کر قادر ہمارا موضوع بحث تھا۔ ہر طرف سے سوالات کی بوچھاڑ اُس پر پڑنے لگی کوئی کہہ رہا تھا "کیوں بھائی قادر کس خیال میں کھوئے ہو؟" کوئی کہہ رہا تھا "بھائی عورتوں سے اتنی بھی بے نیازی اچھی نہیں" کوئی بول رہا تھا "بھائی اگر اس صنف لطیف سے اتنی ہی بیزاری تھی تو تمہیں تارک الدنیا ہو کر جنگلوں میں پناہ لینا چاہیئے تھا" غرضیکہ جتنی منہ اتنی ہی باتیں تھیں اور بیچارہ قادر اس بوچھاڑ کو سنبھالے نہ سنبھال سکتا تھا۔

میں قادر کو ایک زمانے سے جانتا تھا لیکن اس کی پچھلی زندگی کیسی تھی کیا تھی ہم میں سے کوئی بھی واقف نہ تھا۔ ہم لوگ صرف اس قدر جانتے تھے کہ قادر کلکتہ کے ایک مقامی اسکول میں معلم کی حیثیت سے کچھ سالوں سے کام کر رہا ہے۔ وہ بیکر لین میں ایک بیرونی کمرہ میں مقیم تھا۔ اس کے اسکول سے فرصت کے لمحات اکثر ہمارے ہی ساتھ خوش گپیوں اور سیر وتفریح میں صرف ہوتے۔ نہ تو کبھی ہم میں اُس کے پچھلے حالات جاننے کی کرید پیدا ہوئی اور نہ کبھی اُس نے اپنے عزیز واقارب کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت محسوس کی تھی۔ ہاں اتنا ہم لوگ ضرور محسوس کرتے تھے کہ وہ قریب قریب ہر موضوع پر کچھ نہ کچھ اپنی رائے کا اظہار کرتا۔ لیکن جب کبھی کسی عورت (مخصوص یا عام) کی بحث چھڑ جاتی تو وہ سکوت پذیر ہو جاتا۔ خیر ابتک ہم لوگ اُس کی اس مصلحت آمیز سکوت اور درویشانہ بے نیازی کو کوئی اہمیت نہ دے سکے تھے لیکن آج کی بات ہی کچھ اور تھی آج ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ احباب نے فیصلہ کن انداز میں اُس کے اس قسم کی سکوت کو توڑ دینے کا تہیہ کر لیا ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کسی طرح آج ہم لوگوں کے نرغے سے بچ کر نہیں نکل سکتا تھا۔

میں نے یکبارگی سب کو خاموش کرتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے قادر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "بھائی قادر یہ تو بتاؤ کہ آخر تم کو عورت سے چڑ کیوں ہے۔ کیا واقعی تمہیں اس صنف لطیف سے نفرت ہے یا یہ محض یہ تمہاری محبت کا ہی ڈھنگ ہے۔ ہیں جبکہ تم مخلص اور گہرے دوست سمجھتے ہو تو پھر ہمیں اس [illegible] رکھنے میں [illegible]

کو اس لائق ہی نہیں سمجھتے کہ کسی کی باصفات ذات کا تذکرہ قبل کرو۔ میری باتوں کو سن کر قادر پہلے سے بھی زیادہ گمبھیر ہوگیا، لیکن دفعتاً مہرِ سکوت کو توڑتے ہوئے اس نے مجھے مخاطب کیا۔

"بھائی احسان تم یہ کیا کہہ رہے ہو۔ ممکن ہے تمہیں یقین نہ ہو لیکن میں ذاتِ باری کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم لوگوں کی وقعت میرے دل میں بہت زیادہ ہے کسی قدر اس کے بیان کی ضرورت نہیں لیکن میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اگر تم جیسے مخلص اور درد مند دوستوں کی صحبت مجھے کلکتہ میں میسر نہ ہوتی تو میں واقعی تارک الدنیا ہونے پر مجبور ہو جاتا۔ پھر میرا مسکن آج کسی پہاڑ کی وادی ہوتی یا وہ دنیا کی آبادی سے دور کسی جنگل کا کنارہ۔"

ہم لوگوں میں جو اس سے قبل چہل اور طنز کے آڑے ترچھے وار چل رہے تھے وہ یکلخت موقوف ہوگئے۔ ہر شخص اپنی جگہ حیران و ششدر بیٹھا تھا۔ کوئی بھی گفتگو کے اس قدر سنجیدہ رخ اختیار کر لینے کا خیال اپنے ذہن میں نہیں لا سکتا تھا۔ گویا اب قادر کی مہرِ سکوت دوسرے کے لبوں پر قفل کے زیر و بم اور گوناگوں شور و شغب سے ایک دیوار قہقہہ بنا ہوا تھا وہاں اگر ابھی کسی کی نکتائی کی کلپ بھی زمین پر گر پڑتی تو ہر شخص کے کانوں میں کھٹ سے اُس کی ٹنک محسوس ہوتی۔ اس مہرِ سکوت کو توڑنیکا سہرا اس دفعہ قطب کے سر رہا اُس نے ذرا متانت کے ساتھ زبردستی مسکراہٹ کی آمیزش کرتے ہوئے سلسلۂ گفتگو کو یوں جاری کیا:

"بھائی قادر یہی تو ہم لوگ جاننا چاہتے ہیں کہ تم تارک الدنیا ہونے پر کیوں مجبور ہو رہے تھے۔ آخر تم کسی پہاڑ کی وادی یا کسی جنگل کے کنارہ کو اپنے قدم سے زینت بخشنے کے لیے کیوں پریشان تھے!"

قادر (جو ابھی تک ہم لوگوں کو تم کہہ کر مخاطب کر رہا تھا) یکایک بول اٹھا "آپ لوگ مجھ سے اگر یہ نہ پوچھتے تو بہتر ہوتا لیکن خیر جب آپ لوگوں کا اصرار اتنا بڑھا ہوا ہے تو پھر یہی وہ سب کچھ کر ڈالنے کے لیے خود کو ایسا ہی مجبور پاتا ہوں جس طرح کہ اس سے قبل ان باتوں کو چھپانے میں اپنی کامیابی سمجھتا تھا۔ یا دوسرے لفظوں میں جن باتوں کو بھلا دینے میں آپ لوگوں کی دلچسپ صحبت نے مجھے ایک حد تک کامیاب بنا دیا تھا۔"

میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "بھائی قادر خدا کے واسطے تم ہم لوگوں کو غیر نہ سمجھو۔ ہم لوگوں کا اصرار صرف بنا بریں ہے کہ تم سے سچی محبت ہے ورنہ تمہارے نجی معاملات میں ہم لوگ اس قدر دلچسپی نہ لیتے۔ خدا کیلیے ہم لوگوں کو آپ کہہ کر مخاطب نہ کرو۔ کاش ہم لوگ تمہارے کچھ کام آ سکتے۔"

قادر۔ خیر اب ایسا ہی ہوگا۔ تم جو کام آنے کے بارے میں کہتے ہو تو میں نے تم لوگوں سے قبل ہی عرض کیا کہ تم لوگ مجھ پر اس سے بڑھ کر اور کیا احسان کر سکتے ہو کہ مجھے ایک نئی زندگی بخشی۔ میں سچ کہتا ہوں کہ جب تم لوگوں کی دلچسپ آفریں گفتگو سنتا ہوں تو میں اپنے تمام پچھلے غم و اندوہ کو بھول جاتا ہوں اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ مجھے بھی زندہ رہنے کا حق حاصل ہے اور میں بھی زندہ لوگوں کی طرح سانس لے رہا ہوں۔

رشید (دل برداشتہ ہو کر) بھئی خدا کیواسطے کہو بھی کہ کیا بات ہے کیوں خواہ مخواہ ہمارے آتشِ شوق کو اور تیز کیے جا رہے ہو۔ پہلے یہ کہو کہ تمہاری عورت کے بارے میں کیا رائے ہے پھر اپنی پردرد کہانی سنانا۔"

قادر۔ (زبردستی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) عورت کے بارے میں میری رائے؟ اگر میں یہ کہوں کہ تم سب لوگوں کی رایوں سے میں اختلاف کرتا ہوں تو کیا یہ کہنا کافی نہ ہوگا۔ لیکن میں اس قسم کی رائے کا اظہار کم سے کم اب میرے لیے مناسب نہ ہوگا۔ تم پھر یہ کہو گے کہ پہیلیاں بجھانا چھوڑ دو۔ خیر عورت کے بارے میں میری مختصر رائے یہ ہے "عورت خودداری کا مجسمہ ہے" اور میری یہ رائے کسی سے استفادہ یا زندگی پر ایک چھچھلتی نظر رکھنے کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی زندگی کے بعض ناقابلِ فراموش واقعات پر مبنی ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ تم لوگوں کا عورت کے متعلق کہاں تک تجربہ ہے۔ لیکن اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ عورت کو تم میں سے کسی نے بھی قریب سے مطالعہ کرنے کی کوشش نہیں کی ہے اگر کسی نے کی بھی ہے تو صرف سطحی طور پر۔ تمہاری گفتگو بتاتی ہے کہ تم میں سے ہر ایک اُس کے چند خوبیوں یا چند خامیوں کے بھول بھلیاں میں اُلجھ کر رہ گیا ہے اور اسی لیے تم میں کوئی بھی عورت کے متعلق ٹھوس رائے دینے سے قاصر ہے۔ جو یہ کہتا ہے کہ عورت صرف عصمت و عفت کی ایک دیوی ہے وہ غلطی پر ہے اور جس کی یہ رائے ہے کہ وہ بازار سے خرید کیے ہوئے ایک دلچسپ کھلونے کے مترادف ہے وہ بھی کسی غلط فہمی کا شکار ہے میں اپنی زندگی کے تمام تجربات کو اکٹھا کر کے یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ عورت خودداری کا مجسمہ ہے، اور بس۔ میری اس رائے سے تمہیں کسی اس طرح کی غلط فہمی میں نہ پڑ جانا چاہیئے کہ میں نے بہت سی عورتوں کے بعد یہ جذبۂ نایاب حاصل کیا ہے۔ نہیں زندگی میں میرا واسطہ صرف دو عورتوں سے پڑا ایک تو وہ عورت جسے سماج نے میری بیوی بنا کر میرے سپرد کیا اور دوسری وہ عورت جسے میں نے سماج کو ٹھکرا کر حاصل کیا۔ یہ دونوں عورتیں ایک دوسرے سے جدا [illegible]

مشترک تھی اور وہ تھی خودداری، اور صرف خودداری"

ہم لوگ سب کے سب ہمہ تن گوش بنے بیٹھے تھے۔ ہر شخص دم بخود تھا کسی کے جوتے کھسکانے یا کروٹ تک بدلنے کی آواز آ رہی تھی۔ سب کے کانوں میں صرف قادر ہی کے الفاظ "خودداری" اور "عورت" گونج رہے تھے۔ قادر ابھی سلگائے ہوئے سگار کا ایک لمبا کش لیکر پھر یوں گویا ہوا

شاید تم میں سے کوئی بھی میری زندگی کے پچھلے واقعات سے آگاہ نہیں ہے کیونکہ تم میں سے ہر ایک کے ساتھ میری ملاقات کلکتہ ہی میں ہوئی ہے اور میں نے آج تک اپنی پچھلی زندگی کے واقعات بیان نہیں کیے۔ اس میں میری کوشش کا صرف یہاں تک حصہ تھا کہ میں اُن واقعات کو بھلا دینا چاہتا تھا ہمیشہ کیلئے کالعدم کر دینا چاہتا تھا۔ مگر تم لوگوں کی آج کی گرما گرم بحث نے انہیں پھر سے تازہ تا دم کر دیا ہے اور وہ میرے دماغ کے پردوں پر یکے بعد دیگرے فلم کی طرح ابھر رہے ہیں۔ میں اُسی طرح تم لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہوں"

"تمہیں یہ سنکر رنج ہوگا کہ میں ایک خوشحال گھرانے کا فرد تھا میرے والدین کا گرچہ آج انتقال ہو چکا ہے لیکن وہ کافی متمول اور دوراندیش لوگ تھے انھوں نے مجھے اعلیٰ تعلیم دلائی تھی یہ اُن کی تعلیم ہی کا نتیجہ تھا کہ میں آسانی کے ساتھ انڈین فورسٹ سروس میں آگیا تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جبکہ میری عمر چوبیس سال کی تھی۔ میری پہلی تقرری جلپائی گوڑی کے جنگلات میں ہوئی۔ میری شادی ملازمت پانے کے قبل ہو چکی تھی۔ میری بیوی ایک معزز گھرانے کی فرد تھی یہ اور بات تھی کہ میری شادی میں میرے والدین ہی سب کچھ تھے اُنھوں نے لڑکی پسند کی اور مجھے کسی قسم کی پسند و ناپسندیدگی کا اظہار کیے بغیر اُسے اپنی بیوی تسلیم کرنا پڑا۔ اُس میں جتنی کچھ بھی خوبیاں کیوں نہ ہوں مگر میری نظر میں وہ کبھی نہ بھائی اُس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں نے اُسے منتخب نہیں کیا تھا اُسے میں اپنے والدین کی بہو تسلیم کرتا تھا لیکن اپنی بیوی تسلیم کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتا تھا۔ لیکن پھر بھی میری بچپن سے اس قسم کی تربیت ہوئی تھی کہ میں کسی قسم کے اعتراض کے بغیر اس کے ساتھ پوری زندگی بسر کر دیتا اگر ایک خاص واقعہ میری زندگی میں ظہور پذیر نہ ہوتا۔ میں نے اپنی بیوی کے ساتھ چار سال تک نہایت ہی خوشگوار زندگی بسر کی۔ اس اثنا میں میری ایک بچی اور دو بچے بھی پیدا ہوئے۔ اس درمیان میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا۔ مرنے کے وقت انہیں پورا بھروسہ تھا کہ ہماری زندگی کی گاڑی اب کسی قسم کے روڑے اور کھائی سے نہیں اٹک سکتی اُن کے خیال میں ہم دونوں میاں بیوی زندگی کے ایسے شاہراہ پر چل پڑے تھے جس کے متعلق جانتے بوجھتے دیکھ لی تھی کہ وہ راستہ پر امن ہے۔ کہیں بھی خطرات و مشکلات کا سامنا نہیں ہے چنانچہ اُن کی موت مطمئن موت تھی لیکن اُنہیں کیا معلوم تھا کہ آزمائے ہوئے راستے بھی بعض اوقات خطرناک شکل اختیار کر لیتے ہیں

"ہاں مجھے خوب یاد ہے کہ یہ ۱۹۳۲ء کا سال تھا جبکہ میں ہیڈکوارٹرز سے دور دورے پر روانہ ہوا تھا۔ میں نے اپنی بیوی اور بچوں کو ہیڈکوارٹرز ہی پر چھوڑ دیا تھا کیونکہ جنگلات کا دورہ بہت خطرناک ہوتا ہے اور وہ بھی بھوٹان کی ترائی کے جنگلات! معاذ اللہ! ان دوروں کے اثنا میں مجھے کچھ دن وادی میں ٹھہر جانا پڑا کیونکہ مجھے کچھ ضروری رپورٹ اور چٹھیاں لکھنی تھیں۔ یہاں میں ایک ڈاک بنگلہ میں اترا۔ ڈاک بنگلہ ایک نہایت ہی پرفضا مقام میں ایک اونچے ٹیلے پر واقع تھا نیچے ایک چھوٹا سا جھرنا بل کھاتا ہوا بہت دور نکل گیا تھا۔ گرچہ قبل صرف چند روز یہاں قیام کرنے کا ارادہ تھا لیکن کچھ تو جگہ کی دلکشی اور کچھ اور وجوہ کی بنا پر مجھے اپنے قیام کو طول دینا پڑا۔ میں روز صبح کے وقت اٹھ کر ٹیلہ کے کنارے کھڑے ہو کر جھرنے کے پانی کو بل کھاتا ہوا نیچے اترتا دیکھتا۔ جس وقت صبح سویرے آفتاب کی پہلی کرنوں کے ساتھ کھیلتا ہوا نیچے کی پیچ در پیچ گھاٹیوں سے گزرتا ہوا دور جنگلوں میں غائب ہو جاتا تو مجھے بہت پر کیف معلوم ہوتا تھا۔ شام کے وقت بھی اکثر یہی شغل جاری رہتا۔ اور تو اس طرح ڈاک بنگلہ میں کوئی دوسرے لوگ قیام پذیر نہ تھے۔ آس پاس سوائے پہاڑ اور جنگل کے اور کچھ نظر بھی نہ آتا تھا۔ ہاں البتہ کچھ پہاڑی لوگوں کی جھونپڑیاں اِدھر اُدھر بکھری نظر آتی تھیں جن کی عورتیں روزانہ صبح کے وقت جھرنے سے پانی لینے کے لیے ٹیلہ کے نیچے گھاٹ پر آتیں اور اپنی پہاڑی زبان میں گپ شپ کرتی ہوئی چلی جاتیں مجھے ان سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی اس لیے اکثر اُن کی موجودگی بھی میرے لیے گویا ان کی غیر موجودگی کا مترادف ہوتی۔ البتہ ایکدن میں نے ایک عجیب منظر اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا۔

جہاں تک میرا خیال ہے یہ شام کا وقت تھا۔ آفتاب اپنی آخری شعاعوں کو فضا کے حوالہ کرتا ہوا ٹیلہ کے دامن میں پناہ لینے کے لیے بیقرار نظر آتا تھا۔ اُس کی آخری کرنیں جھرنے کے پانی سے کھیلتی ہوئی غائب ہو جانا چاہتی تھیں۔ فضا پر ابھی تاریکی کا تسلط نہیں ہوا تھا کہ یکایک میری نظر ٹیلہ کے نیچے ایک چٹان پر پڑی۔ جھرنا کا پانی چٹان کو مس کرتا ہوا نیچے اترتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک عورت [illegible]

پاؤں میں شلوار پہنے اور شانوں پر دوپٹہ ڈالے ٹھیک چٹان کے اُس سرے پر جہاں سے کہ جھرنا کا پانی چٹان کو چھوتا ہوا گذر گیا تھا پاؤں لٹکائے بیٹھی چمکدار اور شفاف پانی سے کھیل رہی ہے مجھے یہ منظر بہت سہانا نظر آیا میں بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کب تک لیکن میری محویت اُس وقت دور ہوئی جبکہ فضا پر ہر طرف تاریکی چھا رہی تھی اور سوائے پانی کے اوپر سے زور زور سے گرنے کے اور کسی چیز کا احساس تک باقی نہیں رہا یہاں تک کہ اُس ماہ پیکر کے بارے میں بھی کچھ نہ جان سکا کہ وہ کدھر فضا کی تاریکی میں غائب ہو گئی۔ ایسا محسوس ہوا کہ وہ ایک بن دیوی تھی جو بن ہی میں غائب ہو گئی۔ خیر زیادہ کرید کیے بغیر اپنے کمرہ میں واپس آیا اور کچھ معمول سے سویرے ہی سو رہا۔

علی الصباح آفتاب طلوع ہونے سے قبل ہی میری آنکھ کھلی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو صبح صادق کی دھیمی روشنی چاروں طرف پھیل رہی تھی اور ہر طرف درختوں پر سے چڑیوں کے چہچہانے کی سامعہ نواز آواز کانوں میں آ رہی تھی۔ میں انگڑائی لیتا ہوا چارپائی پر اٹھ بیٹھا۔ بیرا کو پکارا اُسے میرے اتنے سویرے بیدار ہو جانے پر تعجب سا ہوا لیکن جلد جلد چائے تیار کر کے لایا اور میں چائے پی کر شب خوابی کے لباس ہی میں اپنے کمرہ سے باہر نکل گیا نہ جانے کیوں میں کشاں کشاں میں جھرنے کی طرف اس قدر سویرے ہی اُسی حالت میں نکل پڑا۔ ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ دیکھا نیچے کی طرف سے ایک نہایت ہی دلفریب چیز ایک پرکیف ساری میں لپٹی ہوئی چڑھائی کی طرف اٹھتی ہوئی نظر پڑی، معاً کل شام کی بن دیوی کا واقعہ یاد پڑا مگر وہاں تو شلوار اور دوپٹہ تھا اور یہاں یہ پیچ در پیچ ساری۔ کچھ عقل کام نہ کرتی تھی، وہ اوپر کی طرف اٹھتی گئی یہاں تک کہ ٹھیک میرے پاس سے ہو کر وہ یکایک گذر گئی۔ قریب سے جو میں نے اُس حسن جہاں سوز کو دیکھا تو تم لوگوں کو یقین نہیں آئیگا میں بے ہوش ہوتے ہوتے سنبھلا۔ پھر اس خیال نے کہ شاید کل شام ہی کی طرح وہ پھر مجھے تشنہ کام چھوڑ کر چل دے۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل پڑا "بن دیوی!" وہ تیکھی چتون سے مسکرا کر میری طرف نظر پاشی کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی اور میں وہاں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ ڈاک بنگلہ ہی کی طرف جاتی ہوئی پھولوں اور پودوں کے کنج میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

"اُس روز میں اپنے کمرے میں واپس آ کر بستر پر پھر لیٹ رہا۔ آج کچھ کام کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ ٹھیک دس بجے کے قریب میرے اردلی نے دروازے سے جھانکا میں نے ڈانٹ کر اس سے کہہ جاؤ آج تیری ضرورت نہیں ہے۔ جا کر سو رہو۔ اسے بھی آج تعجب ہوگا کہ میں جو اس قدر سخت گیر افسر تھا کہ چھٹی کے دنوں میں بھی اسے چھٹی دینے کا روادار نہیں ہوتا آج کیوں اُسے اس طرح واپس کر رہا ہوں جبکہ کل ہی اُسے میں نے تاکید کر دی تھی۔ آج دس بجے ٹھیک پہلوال کے جنگلوں کے معائنہ کے لیے روانہ ہونا ہے۔ خیر اسی طرح میں دن بھر اپنے کمرے میں رہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کروں عجیب مخمصہ میں تھا۔ رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ اگر وہ غارتگر ایمان واقعی 'بن دیوی' نہیں تو آخر ہے کون؟ کہاں رہتی ہے؟ کدھر جاتی ہے؟ کیا کرتی ہے؟ صبح و شام جھرنے کے پاس نظر آتی ہے اُس کے علاوہ وقتوں میں وہ کہاں رہتی ہے۔ انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں قریب چار بجے میں نے ڈاک بنگلہ کے مالی کو بلوا بھیجا میں اس ڈاک بنگلہ میں اکثر قیام پذیر ہوا تھا۔ مگر مالی سے کبھی مجھے کوئی ایسی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی کہ اُسے بلواتا۔ وہ کبھی کبھی نظر پڑنے سے سر پٹ کھڑا ہو کر سلام کرتا مگر میں کسی توجہ کے بغیر اس کے پاس سے صرف معمولی طور پر گردن کو بل دیتا ہوا گذر جاتا۔ آج جو میں نے اُسے یکایک اس طرح بلوا بھیجا تو وہ ہانپتا کانپتا کمرہ کے دروازے سے ایک دور کا سلام کیا میں نے نرمی کے ساتھ اُسے کمرہ کے اندر چلے آنے کو کہا۔ وہ پہلے تو ذرا ہچکچایا پھر قریب میں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں نے دریافت کیا۔ ارے اس ڈاک بنگلہ میں آج کل اور کون ہے یا کسی صاحب نے قریب ہی کوئی کوٹھی بنوائی ہے؟"

مالی: "حضور! یہاں ایک سپرنٹنڈ بابو ڈاک بنگلہ کے اُتر کے کنارے کے کمروں میں کئی دنوں سے اُترے ہیں۔"

میں: "کیا وہ اکیلے ہیں؟"

مالی: "نہیں حضور۔ اُن کے ساتھ اُن کی میم صاحبہ بھی ہیں، وہ جب یہاں آتے ہیں تو میم صاحب بھی آتی ہیں۔"

"خیر مالی کو تو رخصت کیا اور میں کپڑے وغیرہ پہن سپرنٹنڈنٹ صاحب کی کھوج میں نکلا

میرا خیال ہے کہ شاید جگہ کے پر فضا ہونے کے باعث گورنمنٹ نے دور دور تک کوئی آبادی نہ ہونے کے باوجود بھی یہاں پر اتنا لمبا چوڑا بنگلہ تعمیر کیا ہے۔ ورنہ اردگرد کے حالات کے پیش نظر تو اتنے لمبے چوڑے ڈاک بنگلے کی ضرورت نہ تھی۔ ایک مسطح پہاڑ کے ٹیلے پر جہاں قدرتی طور پھولوں اور پودوں کے کنج [illegible] بکھری ہوئی جا[illegible] ڈاک بنگلہ کمرہ [illegible] جگہ جگہ [illegible]

ہیں۔ پھر ایک عمارت سے دوسری کی طرف جانے کے لئے خوشنما روشیں بنی ہوئی ہیں جس کے دونوں طرف قسم قسم کے پھولوں کی کیاریاں لگی ہوئی ہیں بہت دور تک ان خوبصورت روشوں کے بیچ اور متعدد پھولوں اور پودوں کے کنجوں سے گزرنے کے بعد ایک چھوٹے سے بنگلہ کے کنارے دو چار اردلی اور کانسٹبل جیسے لوگوں پر نظر پڑی۔ مجھے قریب دیکھ کر انھوں نے سلام کیا۔ پھر میں نے دریافت کیا۔ "دل! تمہارا صاحب کیا گھر کے اندر ہے؟"

ایک اردلی "جی حضور صاحب ابھی باہر سے آیا ہے!"

میں "دل۔ تم اپنا صاحب کو ہمارا کارڈ دکھاؤ۔ ہم اُن سے ملنا مانگتا ہے"

اُسے پولس افسروں کی سخت گیری کے باوجود انکار کی ہمت نہ ہوئی اور نہایت ادب سے کارڈ لیکر اندر داخل ہوا۔ میں نے پہلے تو ایک سخت ڈانٹ کی آواز سنی۔ پھر تھوڑی دیر بعد اردلی نے باہر آکر کہا "حضور صاحب آپ کو اندر بلاتا ہے"

میں اندر جاکر ملاقات کے کمرہ میں بیٹھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد زبردستی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے سپرنٹنڈنٹ صاحب وہاں نازل ہوئے میں نے کہا "معاف کیجئیگا میں ناحق آپ کو تکلیف دی لیکن آپ تو جانتے ہیں ہم جنگل جنگل گھومنے والے لوگوں کو جب کبھی کسی شریف آدمی کا پتہ چل جاتا ہے تو زبردستی ملاقات کرنی پڑتی ہے۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب نے معذرت پیش کرتے ہوئے کہا "نہیں نہیں یہ تو خوشی کی بات ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ بھی آجکل یہاں مقیم ہیں نہیں تو میں خود آپ کو تکلیف دیتا"

ان کی گفتگو سے یہ پتہ چلا کہ وہ پولیس سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ جلپائی گوڑی ان کا بھی ہیڈکوارٹر ہے اُن کا اسم گرامی حمید صاحب ہے، وہ یہاں دو چار دنوں سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ قریب ہی کسی اہم تحقیقات کے سلسلہ میں آئے ہیں۔ دریافت کرنے پر یہ بھی بتایا کہ اُن کی بیگم صاحبہ بھی ساتھ ہیں۔ جو اور کبھی اُن کے ساتھ دورے پر آئیں یا نہ آئیں لیکن کم سے کم دارجلنگ آنے کے وقت اُن کے گلے کی ہار ہو جاتی ہیں۔ حمید صاحب کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ فطرت کی طرف سے ایک شاعرانہ ذوق لیکر پیدا ہوئی ہیں اور نہ جانے کیوں وہ دارجی کے کنج اور گھاٹیوں کے پہاڑی لوگوں کی بولی ... سے یہاں کی دیہاتی اور جڑ عورتوں ... وغیرہ

تیر اب یقین ہوگیا تھا کہ وہ بن دیوی اور اصل ہے کون؟ وقت زیادہ ہو رہا تھا اور زیادہ دیر اُن کو تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا اور یہ امید بھی تھی کہ اگر بن دیوی سے یہاں نہیں تو کم سے کم جھرنے کے پاس تو ضرور ملاقات ہوگی اس لیے میں نے رخصت حاصل کی اور بظاہر اپنے بنگلہ کی طرف لیکن در اصل راستہ کاٹ کر جھرنے کی طرف مڑ گیا۔ وہاں بہت دیر تک ادھر ادھر منڈلاتا رہا لیکن آج بن دیوی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ شاید بن دیوتا نے اسے باہر نکلنے کی اجازت نہ دی ہو جب اسی طرح چہل قدمی کرتے ہوئے کافی اندھیرا ہو گیا تو میں مجبوراً اپنے بنگلہ کی طرف چل پڑا اور آج بھی بغیر کچھ کام کیے بستر پر جا لیٹا۔ میں لیٹا تو تھا شاید اس امید میں کہ علی الصباح بن دیوی سے ملاقات ہو سکے لیکن باوجود سلیپنگ ٹیبلٹ کھا کے زیادہ رات تک نیند نہ آئی اور آئی کب جب صبح ہونیوالی تھی اس لیے اس دن صبح کی سیر گویا ملتوی رہی۔

دوسرے دن جب نیند ٹوٹی تو آفتاب کافی بلندی پر پہنچ چکا تھا گھڑی میں دس بجے تھے۔ میں نے اٹھ کر غسل وغیرہ سے فراغت حاصل کی۔ اردلی کو حمید صاحب کے بنگلہ پر بھیجا۔ معلوم ہوا کہ حمید صاحب صبح اپنے مسئلے کے سلسلے کے تحقیقات پر نکل چکے ہیں۔ اب مجھ میں انتظار کی تاب نہ تھی جھٹ لباس تبدیل کر حمید صاحب کے بنگلہ کی طرف روانہ ہوا۔ ہوا بہت دیر انتظار کے بعد ایک خانساماں نے نکل کر کہا کہ صاحب اندر نہیں ہیں۔ میں اب کیا کر سکتا تھا۔ اُسے میں کس طرح سمجھاتا کہ صاحب اندر نہیں ہیں اسی لیے تو میں آیا تھا اب جبکہ خود سے اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتا تو اور کیا کرتا ناچار واپس آنے ہی والا تھا کہ یکایک قریب کی جھاڑیوں سے ٹھیک ویسے دوپٹہ سرسرانے کی آواز کان میں پڑی، میں نے خانساماں سے "اچھا صاحب کو، آنے سے خبر کر دینا" کہہ کر جھاڑی کی طرف لپکا۔ دور تک بھاگم بھاگ کے بعد یکایک دیکھا کہ "بن دیوی" میرے سامنے کھڑی ہے۔ پھر قریب جانے کی ہمت نہ ہوئی" یہاں قادر تھوڑی دیر کھنکھارنے کے لیے رکا۔

ہم لوگ قادر کے بیان کو کچھ اس طرح سن رہے تھے کہ وقت کے گزرنے کا کسی کو احساس تک نہ تھا۔ ہر شخص اپنی جگہ ساکت و صامت ہمہ تن گوش بنا بیٹھا تھا۔ ہم سے ہر ایک جو خود کو تنقید و تبصرہ کا بادشاہ سمجھتا تھا اس وقت سب کی تنقیدی قوت گویا سلب ہو چکی تھی جہاں دو لفظ بھی بغیر اعتراض کے کوئی سننے کا روادار نہ تھا۔ وہاں گھنٹوں کسی کی رام کہانی اس طرح بت بنا سنتا جا رہا تھا صرف سنتا ہی نہیں

بلکہ قادر کے منہ سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو شیرینی کی حلاوت کی طرح ہر شخص کانوں کی راہ سے پی جاتا چاہتا تھا۔ اُس کے علاوہ سب کے بشرو سے یہ بھی مترشح تھا کہ ہر شخص اپنی جگہ قادر کے بارے میں اپنی رائے میں تبدیلی کر رہا ہے۔ کہاں تو قادر کو لوگ زاہدِ خشک اور نہ جانے کیا کیا کہہ کر پکارتے تھے مگر یہاں تو اس کی مستحسن گفتگو نے سب کو گویا ایک چلّو پانی میں ڈبو دیا تھی۔ تھوڑی دیر دم لینے کے بعد قادر پھر اس طرح گویا ہوا۔

تم لوگوں کو تعجب ہوگا کہ میں جو اتنے ذمہ دارانہ عہدہ پر ممتاز تھا جس نے اتنی اعلیٰ تعلیم پائی تھی جس کے والدین اس قدر شریف اور غیور واقع ہوئے تھے وہ کس طرح ایک عورت کی معمولی عشوہ طرازی سے اس قدر جلد اس طرح گھائل ہی نہیں بلکہ پاگل ہو سکتا ہے اور وہ بھی جبکہ وہ عورت اسی کی طرح ایک ذمہ دار افسر کی بیوی ہونے کا فخر رکھتی ہے۔ یہ بات سوچ کر اس وقت مجھے بھی تعجب ہوتا ہے یا اگر یہ واقعات کسی اور شخص کے متعلق سنتا تو شاید مجھے بھی تم ہی لوگوں کی طرح حیرت و نفرت ہوتی لیکن اس کی توجیہ سوائے اس کے اور کچھ میرے پاس نہیں کہ میں اس رومان انگیز فضا میں اُس رومان خیز ساحرہ کے آگے بالکل بے بس ہوگیا تھا۔ میں خود کو اپنے فرائض کو، اپنی ذمہ داریوں کو آہستہ آہستہ بھولتا جا رہا تھا۔ ہر وقت جی چاہتا تھا کہ اس 'جل پری' کی کھوج میں بن بن بھٹکتا پھروں۔ خیر اُس روز بھی اُس سے کسی قسم کی کوئی بات چیت نہ ہونے پائی اُس نے مجھے دیکھا یا نہیں یہ بھی نہیں کہہ سکتا۔ اب لیکن میرا یہ روز کا معمول تھا کہ صبح و شام اُسے چشمہ کے پاس تو یقینی دیکھتا۔ لیکن اس کے علاوہ اپنے تمام کام کاج چھوڑ کر کنج اور گھاٹیوں میں بھی دن بھر اُس کی تلاش میں رہتا اگر حمید صاحب بنگلہ پر رہے تو پھر میں مگر جب کبھی وہ دورہ پر رہے تو اس سے ملاقات ہو لی لازمی تھی لیکن مجھے یاد ہے وہ میری طرف کوئی توجہ نہیں کرتی اور نہ وہ مجھ سے بھاگ کر چھپنے ہی کی کوشش کرتی۔ یہی حالت ایک عرصہ تک رہی۔ یہانتک کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

"یوں تو حمید صاحب کے بعد میں ملاقات کے بعد اکثر ملاقاتیں ہوتی گئی تھیں۔ میں اُن کے بنگلہ پر اکثر جایا کرتا تھا اور موقع ملنے سے وہ بھی میرے بنگلہ پر چلے آتے ہیں۔ یوں تو پولیس کے آدمی ہمیشہ لٹھ کو جیسے معلوم ہوتے ہیں لیکن آج کل وہ معمول سے بھی زیادہ بھیانک معلوم ہوتے تھے۔ میرے وہم و گمان میں یہ بات نہ آسکتی تھی کہ آخر اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے چنانچہ ایک دن جبکہ میں اُن کے بنگلہ کی طرف سے گذر رہا تھا تو میں نے اندر سے سخت چیخ و پکار کی آواز سنی مگر اندر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ باہر ہی باہر

گھومتا گھامتا اپنے بنگلے کی طرف واپس چلا آیا۔ اُس روز رات بھر عجیب بے چینی سی رہی۔ کسی طرح نیند نہ آئی اور نہ طبیعت ہی کو سکون میسر ہوا۔ صبح اُٹھ غسل وغیرہ سے فارغ ہو سیدھا حمید صاحب کے بنگلہ پر جا کر دم لیا۔ وہاں دیکھا کہ باہر میں کوئی نہیں ہے لیکن باہر سے تالہ بھی بند نہیں۔ کچھ دیر دستک دینے کے بعد وہی خانساماں نکلا اور نکلتے ہی کہا "صاحب کل شام کے وقت یہاں سے چلے گئے"

میں "تم اکیلے یہاں کیا کر رہے ہو"

وہ "بیگم صاحبہ جو یہاں ہیں"

میں "تو بیگم صاحبہ نہیں گئیں۔ کیا حمید صاحب جلد لوٹ آنیوالے ہیں"

وہ "یہ میں کچھ نہیں جانتا حضور" یہ کہہ کر پھر اندر چلا گیا۔

حمید صاحب کے جانے کی خبر سن کر جو معمولی سی امید بندھی تھی کہ آج شاید ملاقات کی کوئی صورت نکل سکے۔ اُس کے روکھے پیکھے جواب سے وہ بھی پوری ہوتی نظر نہیں آئی۔ میں واپس ہی لوٹنے والا تھا کہ خانساماں نے پھر اندر سے آکر مجھے یہ پیغام دیا۔ "آپ ملاقات کے کمرہ میں بیٹھیے"۔ میں ایک سناٹے میں آگیا۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا بلکہ بدن کا تمام خون جیسے غائب ہو چکا ہو، خیر میں وہاں جا بیٹھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ وہی "بن دیوی" بل کھاتی ہوئی ایک نہایت ہی نفیس ساری میں ملبوس سامنے کے زینہ سے نیچے اتر رہی ہے۔ میں مارے بوکھلاہٹ کے اپنی جگہ سے اٹھ بھی نہ سکا۔ یہانتک کہ وہ نیچے اتر کر میز کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ اب میں پریشان تھا کہ کہوں تو کیا کہوں، کس طرح اُسے سمجھاؤں کہ میں اُس سے نہیں صرف حمید صاحب سے ملنے آیا تھا۔ خیر میری اس پریشانی کو شاید وہ مجھ سے زیادہ سمجھتی تھی۔ اس نے سلسلۂ گفتگو کو خود ہی اس طرح چھیڑا۔

وہ "آپ شاید حمید صاحب سے ملنے آئے تھے لیکن آپ کو یہ سن کر رنج ہوگا کہ وہ کل شام کی گاڑی سے واپس ہیڈ کوارٹرز چلے گئے ہیں"

میں "پھر شاید وہ جلد ہی لوٹینگے نہیں تو آپ ......"

وہ "(بات کاٹ کر) کیوں مجھے یہاں اکیلی دیکھ کر آپ کو تعجب ہو رہا ہے لیکن آپ جانتے نہیں کہ زندگی میں کوئی کسی کا ساتھی نہیں حمید صاحب کو اگر ضرورت پڑے گی تو ممکن ہے یہاں جلد ہی آئیں لیکن میرے لیے اُنہیں یہاں آنے کی ضرورت نہیں پڑے گی"

مجھے معاً کل والے شور اور پکار کی بات یاد پڑی اور فوراً کچھ یاں گذرا کہ کل میاں بیوی میں جھگڑا ہوا ہے اس پر حمید صاحب تو غصہ

میں کل چہ روانہ ہوگئے اور بیگم صاحبہ بھی غصہ میں اکھڑی اکھڑی باتیں کرتی ہیں۔ میں نے ذرا دلیری کو کام میں لاتے ہوئے کہا: "میاں بیوی میں تو اکثر اسی قسم کے جھگڑے ہو جاتے ہیں۔ ان باتوں سے ہمت نہیں ہارنی چاہئے۔"

وہ: "میاں بیوی کے جھگڑے؟ یعنی؟ آپ کا اس سے کیا مطلب ہے؟"

میں: "یہی کہ دنیا آپ کو بیگم حمید کے نام سے کیا نہیں جانتی؟"

وہ: "بیگم حمید؟ اگر دنیا مجھے اس نام سے جانتی ہے تو دنیا اندھی اور بہری ہے۔ میرا نام رقیہ ہے۔ آپ جائیے اور دنیا والوں کے کانوں میں زور زور سے یہ چلا کر کہئے کہ میں بیگم حمید نہیں بلکہ رقیہ اور صرف رقیہ ہوں۔"

"میں نے زیادہ دیر وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ معذرت طلب کرتا ہوا یہ کہہ کر وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا: "میرا خیال ہے آپ کی طبیعت اچھی نہیں۔ انشاء اللہ موقع ملنے سے پھر ملاقات کروں گا۔"

وہ مجھے روکنے کی کوئی کوشش کیے بغیر "اچھی بات ہے" کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور مجھے باہر کے دروازے تک آ کر چھوڑ گئی۔

"اُس دن میں رات بھر عجیب اضطراب کے عالم میں رہا۔ ہر وقت بیگم حمید عرف رقیہ کا خیال ستاتا رہا۔ جتنا زیادہ اس معاملہ پر غور کرتا اتنا ہی پریشانی بڑھتی ہی جاتی۔ میں ہر طرح یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا کہ اگر بیگم صاحبہ بیگم حمید نہیں تو اور کیا ہو سکتی ہیں لیکن یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی کہ اگر وہ واقعی بیگم حمید ہیں تو اس سے اُنہیں انکار کیوں ہے۔ میاں بیوی میں جھگڑے تو اکثر ہوا کرتے ہیں۔ ایسی باتوں سے میاں بیوی کے رشتے تو نہیں ٹوٹ جاتے اس کے علاوہ حمید صاحب نے خود اُنہیں بیگم حمید کے نام سے بارہا یاد کیا تھا اور دنیا بھی ان کو اسی نام سے جانتی تھی لیکن ان تمام غور و خوض کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکا۔ آخر میں میں ان باتوں کو انسانی فطرت کے تنوع اور دنیاوی معاملات کی پیچیدگیوں پر محمول کر کے سو گیا۔

"صبح اٹھا تو طبیعت میں قدرے گرانی تھی۔ دل پریشان تھا دماغ کی بھی عجیب اپاہج کی سی کیفیت تھی۔ رہ رہ کر دل میں یہ خیال آتا تھا کہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر میں حمید صاحب کی موجودگی ہی میں ڈاک بنگلہ کے قیام کو چھوڑ دیتا۔ اب خواہ مخواہ ایک نئی مصیبت میں پھنس گیا۔ ایسی حالت میں اخلاقاً کس طرح گوارا کر سکتا تھا کہ بیگم حمید عرف رقیہ صاحبہ کو تن تنہا ان پردیسیوں کے ملک میں چھوڑ کر چلا جاؤں۔ کیسا ایسا کرنے سے مجھے اطمینان ہو سکے گا۔ تن بتقدیر کپڑے بدل بدلا کر سویرے ہی حمید صاحب کے بنگلہ پر آ دھمکا۔ علاوہ بہت سی باتوں کے یہ امر بھی غور طلب تھا کہ شاید

رات کی تاریکی اور سکوت نے بیگم حمید عرف رقیہ کے دل و دماغ پر اچھا اثر کیا ہوگا۔ یعنی وہ کل کی سی بہکی بہکی باتیں نہ کریں گی۔ آج جیسے ہی دروازے پر پہنچا بیگم حمید نے خود سے دروازہ کھولا اور مجھے ملاقات کے کمرہ میں لیجاتے ہوئے کہنے لگیں "مجھے یقین تھا کہ آج صبح اٹھ کر سب سے پہلے آپ میرے یہاں آنیکا کام انجام دیں گے۔"

میں ذرا شرما سا گیا پھر بھی ہمت کر کے یہ جواب دیا:

"ہاں! دیکھئے نہ آپ کی موجودہ مصیبت نے مجھے بہت زیادہ متاثر کر دیا ہے آخر انسان کا کچھ اخلاقی فرض بھی تو ہوتا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ کس قسم کی خدمت کے لیے خود کو پیش کروں پھر بھی یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اگر کوئی خدمت بھی آپ نے میرے سپرد کی تو میں اس میں اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔"

رقیہ: "میری مصیبت نے آپ کو متاثر کر دیا ہے؟ لیکن میں خود کو کسی مصیبت میں نہیں پاتی۔ شاید آپ کا اشارہ حمید صاحب کا مجھے اکیلی چھوڑ کر چلے جانے کی طرف ہے لیکن یہ تو کوئی مصیبت نہیں یہ تو ایک آزادی ہے۔ کسی کی گرفت سے آزاد ہونا تو خوشی کی بات ہے نہ کہ مصیبت؟ آپ جو خدمت کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو خیر یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے۔ میں بھلا صنف قوی سے کیا خدمت لے سکتی ہوں۔ البتہ ہم لوگ، عورتیں، آپ لوگوں کی خدمت کے واسطے پیدا ہوئی ہیں اور آپ کے وہم کے مطابق ہماری خدمت پوری نہ ہو سکی تو پھر ٹھکرا کر چلدینا تو یہ آپ لوگوں کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔"

میں: "نہیں نہیں میں اس خیال کا آدمی نہیں میں تو جہاں تک سماجی حیثیت کا تعلق رکھتا ہوں۔ دونوں صنفوں میں کوئی تفریق نہیں کرتا۔ دونوں کی حیثیت میری نظر میں برابر اور مساویانہ ہے۔"

" رقیہ: "اگر واقعی ایسی بات ہے تو آپ ہی کے لیے آپ جیسے لوگ اس دھرتی پر کتنے ہیں؟"

میں: "ہاں جب تک مرد اور عورتوں میں تعلیم عام نہ ہوگی وہ تو ایک دوسرے کی قدر نہ کر سکیں گے۔"

رقیہ: "خیر ان باتوں کو جانے دیجئے۔ اس قسم کی ناصحانہ باتوں سے طبیعت کو مالش ہونے لگتی ہے۔ آپ جو آج آئے تو اچھا ہی ہوا، میں آج ہی یہاں سے چلی جانیوالی ہوں۔ اور میں چاہتی تھی کہ جانے کے قبل آپ سے ملاقات ہو سکے۔"

میں: "کیوں؟ کیا بات ہے؟ آخر کہاں جانے کا قصد ہے؟"

رقیہ: "ابھی تو سیدھی دارجلنگ جاؤں گی۔ پھر وہاں پہنچ کر ٹھیک کروں گی۔"

میں: "کیا وہاں آپ کے کوئی رشتہ دار ہیں جہاں جانا چاہتی ہیں؟"

رقیہ: "نہیں۔ رشتہ دار وہاں نہیں ملیں گے اس لیے تو وہاں جانے کا قصد ہے۔"

"میں اس دلفریب عورت کو ایک دم نہیں کچھ سکا لیکن اس جواب کے سوا مجھے اور کچھ نہ بن پڑا۔ اگر کوئی مضائقہ نہ ہو تو کیا میں آپ کی ہمنوائی کر سکتا ہوں؟"

رقیہ: "آپ کا ایسا خیال ہے تو بظاہر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"اگر شکار خود جال میں پھنس جانا چاہتا ہو تو پھر شکاری اُسے ہاتھ سے کیوں جانے دے۔ اب یہ فیصلہ تم لوگوں کے ہاتھ میں ہے کہ شکاری کون تھا اور شکار کون؟"

چنانچہ میں اسی دن رقیہ کے ساتھ قادری سے دارجلنگ روانہ ہو گیا۔ وہاں ہم دونوں ایک شاندار ہوٹل میں شاندار طریقہ سے اترے۔ وہ چار روز پُرتکلف طور پر ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کے بعد ایک دن شام کی سیر سے واپس آتے ہی باتوں ہی باتوں میں حمید صاحب اور ان کی پچھلی زندگی کے بارے میں سوالات کیے لیکن عرصہ تک وہ اس قسم کی باتوں سے پہلو تہی کرتی رہی۔ میں بھی نوراً طرح دیتا گیا۔ لیکن آخر میں اس طرح تذبذب کے عالم میں اُس کے ساتھ کب تک رہتا۔ چنانچہ میں اکثر اب اس طرح کی باتیں چھیڑ دیتا اور ہمیشہ وہ اسے ادھر اُدھر کی باتوں میں ٹالتی رہتی یہاں تک کہ ایک دن میرے لگاتار اصرار سے تنگ آکر اُس نے مجھے سخت لہجہ میں مخاطب کیا۔ "اگر آپ میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو پھر اس قسم کی فضول باتوں کو چھوڑ دیں۔ نہیں تو مجھے آپ کی کوئی پروا نہیں۔ میں حمید صاحب کی کون تھی میرے کوئی عزیز یا رشتہ دار ہیں یا نہیں، میں کون ہوں کیا ہوں، اس قسم کی باتیں جان کر آپ کا کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اور نہ مجھے آپ کہنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ میں گذری ہوئی باتوں کے ذکر کرنے یا انہیں سوچ سوچ کر کڑھنے کو گناہ عظیم سمجھتا ہوں۔ میں ماضی کی پرستار نہیں صرف حال کی پجارن ہوں۔ مستقبل چونکہ نامعلوم ہے اس لیے اس کے متعلق میری کوئی رائے نہیں!"

"یا اللہ! یہ عورت کیا چاہتی ہے۔ کیوں وہ خود بھی پریشان ہوتی ہے اور دوسروں کو بھی پاگل کیے ہوئے ہے میں سمجھنے سے قاصر تھا۔ میرے لیے یہی دو صورتیں تھیں یا تو اُس کے شرائط پر چلوں اور اُس کے ساتھ ساتھ کے چکر میں گرتا جاؤں اور اپنا اخلاقی فرض انجام دوں یا اُسے چھوڑ کے اپنے اہل و عیال، اپنی عزت و آبرو اور نام و نمود کی دنیا میں واپس چلا جاؤں میں کسی بات کو سوچنے اور سمجھنے کا اہل ہی نہ رہا تھا۔ اس لیے کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکا۔ اور اسی طرح دن، اور ہفتے گذرنے لگے۔ تم لوگ اپنے دل میں یہ سوچ رہے ہو گے کہ اس وقت کیا بیوی بچے، عہدہ، خاندانی وقار کسی چیز کا خیال مجھے نہ ستاتا تھا۔ تو ان سب باتوں کے جواب میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس ساحرہ کے دام میں میں اس درجہ بے بس ہو چکا تھا کہ خود کو بھی بھول گیا تھا۔ چنانچہ میرا اصلی نام اُس سے قبل ابوریحان تھا اور دارجلنگ آکر میں شہاب کے نام سے مشہور تھا۔"

سبھوں نے (ایک ساتھ قطع کلام کرتے ہوئے) "تو قادر تمہارا اصلی نام نہیں؟"

قادر: "نہیں کلکتہ کی زندگی میری تیسری زندگی ہے، اس لیے یہ میرا تیسرا نام ہے۔ خیر تو دارجلنگ میں ابوریحان سے بدل کر شہاب ہو چکا تھا اور ایک عجیب عالم میں تھا۔ بس اگر زندگی کا کوئی واحد مقصد رہ گیا تھا تو صرف یہ کہ میں اُس دلفریب ساحرہ کی دلجوئی کرتا رہوں اور اُس کی خوشی میں اپنی سب سے بڑی خوشی سمجھوں۔ کچھ زمانہ اسی طرح حیص بیص اور اضطراب و کشمکش میں گذارنے کے بعد شاید یہ نیک والدین کی تربیت کا ہی اثر تھا کہ میں نے رقیہ کے سامنے ڈرتے ڈرتے ایک تجویز پیش کی۔

میں: "اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات عرض کروں؟"

رقیہ: "نہیں برا ماننے کی کیا بات ہے، فرمائیے کیا بات ہے؟"

میں: "میرے خیال میں ہم دونوں کا اس طرح رہنا اچھا نہیں کیا ہم آپس میں شادی نہیں کر سکتے۔"

"میری اس تجویز کو سن کر پہلے تو وہ کچھ دیر خاموش ہوئی پھر یوں گویا ہوئی: "شاید آپ مجھ سے شادی اس لیے کرنا چاہتے ہیں کہ آپ مجھ سے جدا نہیں کر دو سکتے۔ شادی کر لینے کے بعد آپ کا یہ خیال ہو گا کہ حمید صاحب کی طرح آپ بھی مجھ پر حکومت جتانے کا اختیار حاصل کر لیں گے۔"

میں: "نہیں نہیں۔ حکومت جتانا تو بڑی بات ہے اگر آپ مجھے اس حالت میں بھی ایک خادم سمجھتی رہیں تو یہی میرے لیے سب کچھ ہے"

میری اس بات کا تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن چند دنوں کے بعد ہم دونوں شادی شدہ میاں بیوی تھے۔

شادی کے بعد ہم دونوں نے دارجلنگ سے کلکتہ آکر ایک مکان

ں اتر منہ … کے اکثر تاریخی اور صحت بخش مقامات کی سیر کی
ید عرصہ تک متعدد شہروں میں رہے یہاں تک کہ اسی سیر و تفریح میں
ریب قریب آٹھ نو سال کا زمانہ چشم زدن میں گذر گیا۔ لیکن رقیہ کی جوع الارض
اگ کہیں ماند نہیں پڑتی تھی۔ چنانچہ آخر میں ہم لوگ منصوری سے روانہ ہوئے
یہاں آکر معلوم ہوا کہ وہاں سے سینتیس میل کے فاصلے پر ایک خوبصورت پہاڑی
دامن میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جہاں کے قدرتی مناظر بہت روح افزا
ور پر کیف ہے۔ رقیہ کا اصرار ہوا کہ وہاں چلیں۔ میں اسے وہاں لے گیا
س گاؤں کا نام چھپا گڑھی تھا وہاں پہنچ کر واقعی یہ محسوس ہوا کہ صفحۂ زمین
سب سے دلفریب مقام میں پہنچ گیا ہوں۔ میرا خیال ہوا کہ چونکہ عام
ہراہ سے ہٹ کر یہ گاؤں بسا ہوا ہے اسی لیے عام سیاحوں کی نظر
یہاں تک نہیں پہنچی ہے ورنہ وہ ہر لحاظ سے گلشن ارم کا نمونہ ہونے کے لائق
ہے۔ رقیہ کی طبیعت یہاں بہت لگ گئی اس نے بہت زیادہ اس مقام کو
پسند کیا۔ کئی مہینے گذر گئے لیکن وہ یہاں سے واپس چلنے کا نام تک نہیں
لیتی تھی۔ میں نے جبکہ قبل اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کیا تھا تو بھلا اب
یسے اس طرح کی جرأت کرتا۔ چنانچہ ہم وہاں دل کھول کر رہے۔ وہ دن دن
ادھر اُدھر ٹہلتی رہتی، نہ جانے وہ کیا تلاش کرتی تھی اور نہ پاتی تھی۔ ایک ایک
دلفریب مقام کی وہ بار بار سیر کرتی پھر بھی سیر نہ ہوتی وہاں اس کی کیا کیفیت
تھی میں بیان نہیں کر سکتا۔ وہ گویا ایک انسانی شکل میں سیماب کا مجسمہ تھی جسے
کسی کروٹ چین نہ تھا۔ کبھی جھرنے کا پانی پیتی۔ کبھی پھولوں کی کنج میں چڑیوں کا
گانا سنتی کبھی پہاڑ کی دلکش اونچائی کی طرف اوپر دوڑتی ہوئی چلی جاتی۔
مجھے بعض وقت ایسا معلوم ہوتا کہ چھپا گڑھی کی فضا میں اب تک صرف رقیہ
کی کمی تھی سو قدرت نے وہ اب پوری کر دی تھی۔ چنانچہ ایک دن ایسا ہوا کہ
وہ پہاڑ کی اونچائی سے آبشار کے پانی کے ساتھ دوڑتی ہوئی نیچے کی طرف
آرہی تھی کہ یکایک اس کا پاؤں پھسلا اور تقریباً چار سو فٹ کی بلندی سے
لڑھکتی ہوئی آبشار کے پانی میں گری میں ایک چیخ کے ساتھ اس کی
طرف لپکا لیکن آبشار کے شفاف پانی نے اسے ہمیشہ کے لیے ایک خوشگوار
نیند میں سلا دیا تھا۔ اب رقیہ کہاں تھی

رقیہ کی موت کے بعد میری حالت پاگلوں جیسی ہوگئی۔ میں عرصہ تک
چھپا گڑھی کی خاک کو نہ چھوڑ سکا۔ دن رات اُنہی آبشاروں پتھریلے مقامات اور
گنجان کنجوں کے پاس بھٹکتا رہتا جہاں جہاں رقیہ ہمیشہ آیا جایا کرتی۔ کبھی
یہ محسوس ہوتا کہ وہ وہاں ہے اُسی جا اس پیڑ کی جھاڑی کے پیچھے میرا انتظار
کر رہی ہے۔ میں دوڑ کر رقیہ رقیہ چلاتا وہاں جاتا لیکن اُسے نہ پاتا۔ کبھی
معلوم ہوتا کہ رقیہ اُس زیتون کے درخت پر چڑھ کر اُس کے شاخوں میں
چھپ گئی ہے تاکہ میں اُسے تلاش کروں اور نہ پاؤں۔ لیکن میں روز
اسی طرح ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تھک جاتا مگر رقیہ کہیں نہ ملتی۔

اس طرح کی کیفیت کچھ عرصہ تک جاری رہی پھر ایسا محسوس ہونے
لگا کہ میں ایک گہرے خواب سے جاگ رہا ہوں اور آنکھوں کے سامنے بعض
دبیز پردے آہستہ آہستہ ہٹ رہے ہوں۔ پھر آہستہ آہستہ بیوی بچے
محبت، خاندانی وقار سب کا خیال پاگل بنانے لگا۔ کشاں کشاں میں چھپا گڑھی
سے اپنی بیوی بچوں کی کھوج میں روانہ ہوا۔ پہلے وہاں سے سیدھا جاپانی گوڑی
پہنچا وہاں باوجود تحقیق و تفتیش کے کچھ پتہ نہ چل سکا۔ پھر جہاں جہاں اُن کے
متعلق خبر پانے کی امید ہو سکتی تھی سب جگہوں کی خاک چھانتا ہوا اپنے آبائی
وطن میں پہنچا یہاں آکر معلوم ہوا کہ وہ لوگ میرے آبائی مکان میں مقیم ہیں
یہ سن کر طبیعت میں ایک زندگی بخش امنگ پیدا ہوئی۔ دل ہچکولے کھانے لگا
میں بہت خوش تھا کہ ایک بہت بڑی دولت جسے میں نے اپنی ناعاقبت اندیشی
کے سبب یوں رائیگاں کر دی تھی وہ پھر مجھے یکایک اسی شکل میں حاصل ہونے والی
تھی۔ میں تیز قدم بڑھاتا دل میں ہزاروں ارمانوں اور آرزوؤں کی پرورش
کرتا اپنے آبائی مکان پر آیا۔ دیکھا دو نہایت ہی وجیہہ بچے باہر دہلیز میں کتابوں
کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ یہ میرے نونہال ہیں۔ یہی جی چاہتا تھا کہ
بڑھ کر بغیر کچھ پوچھے اپنے کلیجے سے لگا لوں۔ دہلیز میں قدم رکھتے ہی دونوں بچے
اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے شریف آدمی کہہ کر ایک کرسی خالی کر دی اور بیٹھنے
کے لیے درخواست کی۔ میں نے اُن سے کہا اپنی اماں سے جا کر کہو کہ ابا آئے ہیں
ان لوگوں کو یقین نہ آتا تھا پھر بھی بہت زیادہ خوش ہو کر اندر جا کر اپنی ماں کو
میرا پیغام پہنچایا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد خبر لے کر آیا کہ میرے ابا کا انتقال ہو چکا
ہے۔ وہ اب کیسے واپس آ سکتے ہیں۔ میں نے پھر ان سے یہ درخواست کی کہ اپنی
اماں سے جا کر کہو کہ باہر ایک شریف آدمی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس بار اُن کی
ماں کا جواب تھا کہ وہ غیر مردوں سے نہیں مل سکتیں۔ میں یہ جواب سن کر ششدر رہ گیا۔
اب دنیا میری آنکھوں کے سامنے اندھیری تھی۔ تمام شوق اور ولولے ماند پڑ گیے دل میں ایک ہوک
اٹھی تھی کہ دوڑ کر اس دیوی کے قدموں پر سر رکھ دوں اور بخشیے کہوں لیکن پھر کچھ سوچ کر
ایسا کرنے سے باز رہا۔ اس کے بعد مختلف جگہوں کی خاک چھانتا ہوا آخر کار یہاں پہنچا اور یہاں
جس حالت میں ہوں کیا کہتا ہوں شاید مجھ سے زیادہ تم لوگ خود جانتے ہو۔ یہاں
پہنچ کر تا در کیا سگی خاموش ہو گیا۔ ہر شخص پر ایک عجوبگی کی کیفیت طاری تھی

دھن بھٹیالی یا بھٹیاری۔ ایک انتہائی شیریں و مست کن راگ

(از سنگیت نائک مسٹر محمد حسین خسرو بی۔اے)

دکومل یا اُتری سُریں۔ رے گا ما دھا نا + تیور یا چڑھی سُریں: رے گا ما پا دھا نی۔ پہلے یا اُتری یا ادارا سپتک کے سُر کے نیچے نشان ہے جیسے نی دھا پا ما وغیرہ۔ دوسرے یا درمیان یا مدارا سپتک کے سُر میں کوئی نشانی نہیں ہے جیسے سا رے گا ما پا دھا نی وغیرہ تیسرے یا چڑھے یا تارا سپتک کے سُر کے اوپر نشان ہے جیسے سا رے گا ما وغیرہ۔ دو یا زیادہ سُریں ایک ہی ماترہ یا وقفہ کے اندر ہے نیچے قوس ہوگا جیسے رے گا ما پا دھا وغیرہ ایک سُر سے دوسرے سُر تک میںڈ ہو اوپر قوس ہوگا جیسے ما رے پا وغیرہ۔ ایک سُر پر ایک یا دو سُروں کا کن ہوں تو کن والے سُر اوپر لکھے جائیں گے جیسے رے ما رے ما پا۔ سر تال۔ + تیسری تال۔ ۳ خالی تالی۔ ۵ پہلی تال۔ ۱)

بھٹیاری راگ مشرقی بنگال کے دیہاتیوں کا اور علی الخصوص ملاحوں کے گیتوں کا خاص دھن ہے۔ موسیقی کے اصطلاح میں یہ ملا دل ٹھاٹھ کا بھٹیار راگ یا مشرقی بنگال کا مانند ہے مگر ضروری امر ہے کہ ان دونوں سے کچھ فرق ہے۔

اروہی یا چڑھاؤ۔ سا رے ما پا دھی نی سا۔ اوروہی یا اتار۔ سا نی دھی پا دھی نا دھی پا ما گی رے گی سا۔ وادی۔ گی سموادی۔ دھی۔ وقت۔ ہر وقت خاص تان یا پکڑ۔ دھی۔ دھی دھی پا دھی نا نا۔ دھی پا ما گی رے۔ گی رے سا

ذیل کی ہندی گیت مشرقی بنگال کے ملاحوں کی مخصوص زبان میں مشہور و معروف شاعر جناب پروفیسر حسیم الدین صاحب ایم اے کی ایک گیت کا لفظی ترجمہ ہے۔ اسکو گانے سے مشرقی بنگال کے دریا اور انہیں جو کشتیاں خصوصاً جو شام کے وقت بادبان لگائے ہوئے چلتی ہیں ان سبھوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ جاتا ہے۔ ذیل کی گیت بزم احباب کے جلسہ میں گائی گئی تھی اور بہت ہی پسند کی گئی تھی۔

گیت

تم ڈھلتے دن کو نیّا چلاؤ رے۔ کون طرف ہے بھرپا ہمرے گمبھیر ندی کے کھیویا۔ اگلے دیس کی موہن مایا۔ جا کے کارن رو دوت جیا ما
ہوا میں چھپ کر کون گئیاں۔ ہم کو کرت اشارا ہمرے گمبھیر ندی کے کھیویا۔ اگلے بانک پہ اس ندی کے سندھوا کا ہے دیس
کیلا پتا کی ہوا سے دو لے اس کا کیس۔ پان ڈولے اس کا کیس۔ کیوائن ہے موری گھریا۔ رو کے مرتا اک دھجا گا رے
رہ رہ جیتو دلاوے ایسے۔ برست موری انکھیا۔ ہمرے گمبھیر ندی کے کھیویا۔

دھن بھٹیاری۔ تال کہروا (۸ ماترہ)

+ ۳ ۰ ۱ + ۳ ۰ ۱	+ ۳ ۰ ۱ + ۳ ۰ ۱
- - - پا دھی پا سا۔ پا۔ سا۔ سا [illegible] دن کو	پا پا پا دھی پا پا پا پا گی پا ما۔ گی رے سا رے [illegible]
پا۔ نی سا نی دھا پا - پا دھی - پا دھی پا [illegible]	گی - - ما گی رے سا رے سا رے سا رے سا - - رے گی [illegible]
ما پا ما - گی - - دھی دھی دھی دھی دھی دھی - دھی - [illegible]	سا رے سا . . . . پا دھی آ - - - - - - ت م
ما پا ما گی رے سا رے گی - ما گی رے رے گی [illegible]	سا سا ما۔ ما۔ ما پا پا - نا دھی۔ پا پا اگ لے بان کو پہ اس - ن دی کے
سا رے سا . - رے گی سا رے سا . . . پا دھی دی - پا آ - آ - - - ت م	پا نی نی سا نی دھی دھی نی دھا پا . . . . [illegible]
پا پا پا - دھی۔ گی گی سا۔ رے گی رے سا سا [illegible]	دھی - دھی - دھی - دھی - پا - دھی پا ما ما - [illegible]
سا سا سا۔ سا۔ سا۔ نی۔ نی سا نی دھی پا [illegible]	پا۔ پا دھی پا۔ ما پا گی - - گی ما - پا [illegible]
دھی دھی دھی دھی دھی۔ دھی۔ پا - - دھی پا - ما [illegible]	گی - گی ما گی رے رے گی سا - سا - - - [illegible]

باقی = اگلے دیس کا موہن مایا وغیرہ کے سر ہوں گے تا۔

6 (2)

REGD C 2535

JADID URDU

36 MARSDEN ST CALCUTTA

قواعد و ضوابط

(۱) رسالہ ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوا کرے گا۔ خریداروں کو چاہئے کہ رسالہ ۱۵ تاریخ تک نہ ملنے پر دفتر سے طلب کریں۔

(۲) اہل قلم حضرات سے درخواست ہے کہ وہ مضامین مہینے کی ۱۵ تاریخ تک اڈیٹر کے نام بھیجدیں

(۳) مضامین صاف اور شستہ تحریر ہوں

(۴) وہی مضمون پرچہ میں شائع ہو سکتا ہے جو معیار ادب و اخلاق سے گرا نہ ہو۔

(۵) دل آزار و فرقہ وارانہ مضامین نیز سیاسی مضامین شائع کرنا پرچہ کی پالیسی کیخلاف ہے

(۶) نمونہ کا پرچہ مفت نہیں بلکہ ۲۰/ کا ٹکٹ آنے پر بھیجا جائیگا۔

(۷) جواب کے لیے جوابی کارڈ یا اسٹامپ کا آنا ضروری ہے۔

(۸) خط وکتابت و ترسیل زر کا پتہ: منیجر جدید اردو ۳۶ مارسڈن اسٹریٹ کلکتہ

(۹) کاروباری حضرات اشتہار کیلئے منیجر سے خط وکتابت کریں۔

(۱۰) سالانہ چندہ صرف دو روپیہ (۲/) غیر ممالک کیلئے ۵ شلنگ

اے جلیل، منیجر جدید اردو نمبر ۳۶ مارسڈن اسٹریٹ کلکتہ

مشرقی ہند

کا

ادبی، علمی

ماہنامہ

چندہ سالانہ

مدیر مسئول:- پرویز شاہدی
مدیر اعزازی:- ایم ظہور احسن قاضی

جدید اردو

مارچ ۱۹۴۳ء

چندہ سالانہ دو روپیہ
ششماہی ایک روپیہ چار آنہ
فی پرچہ ۳/

جلد ۶ — نمبر ۳

فہرست مضامین

نقالوں سے ہشیار

REGISTERED TRADE MARK

زردہ کے انتخاب میں غلطی نہ کرنا

جب تم میرے لئے زردہ خریدو تو اصلی نکٹائی مارکہ زردہ نہ بھولو، اس لئے ک
ج کل بازار میں لوگ جعلی مال بنا کر دھوکہ دینے لگے ہیں۔ ان کے دھوکے میں
آنا، نکٹائی مارکہ زردہ، نکٹائی مارکہ کیسر بلاس، نکٹائی مارکہ قوام
ر الائچی دانہ خریدتے وقت محمد مصطفےٰ احسین کا نام اور نکٹائی مارک
ضرور دیکھ لیا کریں

مالک کارخانہ

محمد مصطفےٰ احسین نکٹائی مارکہ زردہ فیکٹری ہوڑہ روڈ، ہوڑہ کلکتہ

شاخیں

۵۷ کلایو اسٹریٹ کلکتہ - ۱۱ آرسکن روڈ بمبئی - ۵۷/۱ کیننگ اسٹریٹ، کلکتہ

شذرات

مہاتما گاندھی: گاندھی جی نے اپنی اور دیگر ارکان کانگریس کی گرفتاری کے سلسلے میں چھ مہینے کے بعد صدائے احتجاج بلند کی۔ وائسرائے اور گاندھی جی کے درمیان جو خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا اس سے مسائل کی پیچیدگی میں کوئی کمی پیدا نہ ہو سکی۔ گاندھی جی نے حسب اعلان ۱۰ فروری سے ۳ مارچ تک کیلئے فاقہ شروع کر دیا۔ فاقے کی مدت یقینی صرف گاندھی پرستوں اور کانگریسیوں میں نہیں بلکہ سارے ہندوستان کے لئے ہراس آفریں اور یاس انگیز تھی۔ اس درمیان میں گاندھی جی کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی، سنبھلی، بگڑی، بگڑی سنبھلی۔ امید تو ہے کہ گاندھی جی کی کشتی حیات خود آفریدہ گرداب سے نکل آئے گی۔ اور ہندوستان کے بے چین دل کی دھڑکنوں میں کچھ کمی پیدا ہو جائے گی۔ لیکن ابھی چند دن اور باقی ہیں۔ خدا جانے اس ختم میعاد تک ان کی زندگی کس طرف پہلو بدلتی ہے۔ ہندوستان کے مختلف سیاسی اور غیر سیاسی گروہوں نے وائسرائے بہادر اور وزیر اعظم برطانیہ سے متحدہ طور پر درخواست کی کہ گاندھی جی کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا جائے۔ یہ امر قابل افسوس ہے کہ حالات کے مطالعے نے اجازت نہ دی کہ وزیر اعظم برطانیہ ہندوستان کی اس التجا کو قبول فرما سکیں۔ حکومت ہند نے اگست ۴۲ء کے بعد والے ملکی ہنگاموں اور فسادوں کا الزام کانگریس والوں اور گاندھی جی کے سر دھر رہا ہے۔ الزام کی صحت اور عدم صحت کا فیصلہ کون کرے؟ اس کو میں موضوع بحث سے خارج سمجھتا ہوں۔ اس وقت صرف سوال یہ ہے کہ گاندھی جی کی عظمت اور بلندی کا لحاظ کرتے ہوئے ان کے بڑھاپے کو بھوک اور کمزوری کی تکلیف سے ہر چند اس کے ذمہ دار وہ خود ہی کیوں نہ ہوں، نجات دینا کہاں تک ہندوستان اور جنگ کی کوششوں کے سلسلے میں مہلک یا مفید ہوگا۔ اس کا جواب حکومت ہند اور سلطنت برطانیہ دونوں نے ایک ہی دیا ہے۔ یعنی موجودہ حالات میں گاندھی جی کو رہا نہیں کیا جا سکتا۔ اب ہندوستان کے لئے سوائے اس کے کوئی چارۂ کار نہیں کہ گاندھی جی کی زندگی کے لئے دُعا کرے۔ گاندھی جی کے عقائد سے اختلاف رکھنے والے حضرات بھی گاندھی جی کے ساتھ وہ بھی ایسی حالت میں ہمدردی کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ادارہ جدید اردو بھی ہندوستان کے مختلف سیاسی اور غیر سیاسی اداروں کے ساتھ ہم آواز ہو کر افسوس اور ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

جمشید پور کا مشاعرہ: تقریب قریب تین برس پہلے بھی مجھے جمشید پور کی بزم سخن میں شریک ہونے کا موقع ملا تھا۔ شرکائے بزم اور شعرائے شہر کی خوش ذوقی کے نقوش ہمیشہ ہی تازہ رہے۔ جناب افضل صاحب پھلواری نے اس کے بعد مجھے کئی بار وہاں کی محفل ادب سے فیضیاب ہونے کا موقع دینا چاہا۔ لیکن میں اپنی کم فرصتی اور بدقسمتی سے محروم رہ گیا۔ لیکن اس مرتبہ جمشید پور کے ارباب ذوق اور افضل صاحب کے خلوص نے مجھے وہاں کھینچ ہی لیا۔ مشاعرہ ۶ فروری ۴۳ء نغنشٹے چودھری عبداللہ خاں کے دولتکدے پر منعقد ہونے والا تھا۔ پانچویں فروری کی رات کو پہونچ گیا۔ عبداللہ صاحب سے کبھی کا تعارف نہ تھا۔ لیکن مجھے اب تک حیرت ہے کہ کیوں ان کے دولت خانے پر پہونچنے اور ان سے کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد ہی اجنبیت کا نام و نشان باقی نہ رہا۔ چودھری صاحب کی بلندی ذوق، خوش کلامی اور خوش اخلاقی نے مجھے اپنے آپ کو ان سے بہت قریب محسوس کرنے پر مجبور کر دیا۔ اور شاید ہمیشہ ہی ایک طرح کی یگانگی محسوس کروں گا۔ ان کے حسن اخلاق کے تفصیلی بیان سے ایک رسمی تصنع مترشح ہوتا۔ اس کو قارئین خوش ذوق کے تصور کے لئے چھوڑ دیتا ہوں۔

۶ فروری ۴۳ء کی رات کو ۹ بجے مشاعرہ شروع ہوا۔ دو طرحیں دی گئی تھیں۔ بہت کامیاب غزلیں سننے میں آئیں۔ کہنہ مشق اساتذہ فن کے علاوہ نوجوان شعراء نے اپنے برجستہ شعروں سے محفل کو مسرور اور انبساط کا جلوہ دکھایا۔ تفصیل بہت طول ہو جائے گی۔

اس لئے مختصرًا اور مجملًا یہ کہدینا کافی ہو کہ مشاعرہ کی کامیابی بہت زیادہ قابل تحسین تھی۔ اور اس کامیابی کے آئینے میں چودھری عبداللہ خاں صاحب کی روشن طبعی، بلند فکری اور مخلصانہ اخلاق کے جلوے نمایاں تھے۔ خدا اس ذوق کو قائم رکھے۔ مجھے اس کا مزدور احساس ہو کہ میری نا اہلی مسند صدارت کی زینت نہ بن سکی۔ لیکن الامر فوق الادب کا خیال مجھے خاموش کر دینے کے لئے کافی تھا۔

میں وہاں سے ۸ رفروری کی صبح کو رخصت ہو کر لوٹ آیا۔ کئی ہفتے گذر چکے ہیں لیکن ابھی تک چودھری صاحب اکثر یاد آیا کرتے ہیں جناب افضل کو تو میں کبھی بھولا ہی نہیں تھا جو ان کے اس وقت یاد آنے کا سوال پیدا ہو۔ اس مرتبہ چند حضرات مخلص اور خوش ذوق سے تعارف حاصل کرنے کا موقع ملا وہ بھی یاد آ رہے ہیں۔

پرویز شاہدی

رفتارِ وقت

ہندوستان:۔ موجودہ دور میں قحط سالی چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ روز بروز قیمتوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جس کی وجہ کر ملک کے گوشہ گوشہ میں انتشار اور بے چینی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس قحط کا اثر صرف غلّے ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ تمام چیزیں جو انسانی ضرورتوں کے لئے لازمی اور ضروری ہیں۔ اور جن پر انسانی زندگی کا انحصار ہے۔ ان تمام چیزوں کی قیمت اس سرعت سے بڑھ رہی ہے کہ صبح کچھ بھاؤ ہے تو شام کچھ اور، گویا نہ اس کی کوئی حد ہے نہ انتہا۔ اگر یہی لیل و نہار رہے تو پھر وہ دن بھی دور نہیں کہ ہندوستان کی تہائی آبادی کو درخت کی پتیوں سے پیٹ بھرنا پڑے گا۔ اس وقت یہ بھی عجب نہیں کہ پتیوں کے حاصل کرنے میں بھی بھاری قیمت ادا کرنی ہو۔

اس وقت کلکتہ میں خالص گیہوں کا آٹا تو ملنا مشکل ہے۔ لیکن جو کچھ بھی مل جاتا ہے اس کی موجودہ قیمت چودہ آنہ سیر ہے دال ارہر آٹھ آنہ سیر۔ چاول معمولی قسم آٹھ آنہ سیر۔

کپڑے کی گرانی بھی کچھ کم نہیں ہے۔ وہ کپڑا جو تین سال قبل تین آنہ اور چار آنہ گز لوگ گھر بیٹھے خرید لیا کرتے تھے۔ اس وقت وہی کپڑا بازار میں تلاش کرنے کے بعد مشکلوں سے روپیہ سوا روپیہ گز دستیاب ہوتا ہے۔ حالانکہ اس وقت ہندوستان میں سوتی کپڑے کے کارخانے کم نہیں ہیں۔ اور ان تمام کارخانوں میں دن رات کام ہو رہا ہے۔ لیکن پھر بھی بازار میں آگ کا مول ہے۔ اگر اسی طرح کپڑوں کی قیمت بڑھتی رہی تو پھر کیا ہوگا؟ کیا لوگوں کو تن ڈھانکنے کے لئے کپڑے بھی میسر نہ ہوں گے۔ انسانی زندگی کی زبون حالی کا یہ بدترین دور ہوگا۔

کاغذ کا قحط تو ہونا لازمی ہے۔ جبکہ حکومت ہند خود ہندوستان کے کاغذ ساز کمپنیوں سے ۹۰ فی صدی کاغذ اپنے لئے رکھتی ہے اور باقی دس فی صدی میں پورا ہندوستان، اب غور فرمائیے اونٹ کے منہ میں زیرہ۔ کتنا سنجیدہ مذاق ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ حکومت سختی اور درشتی کے ساتھ نظم مملکت اور رائین معدلت قائم رکھنا چاہتی ہے۔ بہر تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔

عبدالجلیل

غزل

زباں زباں نہ رہی اور بیاں بیاں نہ رہا
وہ سننے آتے ہیں جب لطفِ داستاں نہ رہا

ہجومِ شوق میں کھوئی ہوئی تمنّائیں
وہ ابتدائے محبّت کا اب سماں نہ رہا

کسی نے رکھ دیا چہرے کو آگ میں جیسے
کبھی مژہ پہ اگر اشکِ خوں فشاں نہ رہا

نہ اب وہ شورِ محبت نہ اب وہ دل والے
متاعِ درد تھی جس میں وہ کارواں نہ رہا

دلِ خراب کی حسرت پرستیاں نہ گئیں
وہ میرے حال پہ کس روز مہرباں نہ رہا

سجودِ شوق کی بے ربطیاں خدا کی پناہ
مری جبیں کے مقابل وہ آستاں نہ رہا

مٹا مٹا کے مجھے غم نہیں ہے مٹنے کا
رہا رہا نہ رہا نقش رائگاں نہ رہا

بہار آئی ہے ایسی بہار کیا کیجئے
چمن میں اہلِ چمن کا جب آشیاں نہ رہا

غرورِ حسن تھا آغوشِ خاکساری میں
جب اپنی ہستی موہوم کا نشاں نہ رہا

خطا معاف گماں کینہ پروری کا ہے
کہ امتحاں کی حدوں میں اب امتحاں نہ رہا

رہی ہے دل وہی لغزات کی فراوانی
حریفِ معنیٔ رنگیں مگر بیاں نہ رہا

یہ سوچنا تھا اثرؔ عرضِ حال سے پہلے
وہ سرگراں تو نہیں ہے جو بدگماں نہ رہا

اثرؔ لکھنوی

اعتراف نوروز

پیاری خاتون! کتنا سہانا وقت ہے، آج میں پھر یہاں موجود ہوں، آپ کے پاس، نرم و گرم اور آرام دہ کرسی پر بیٹھا، فکر و پریشانی سے کوسوں دور۔ مجھے اطمینان قلب حاصل ہے اور میں نت نئی دلچسپ اور پرسکون باتیں کر رہا ہوں، شکر ہے تعطیلات کی گرم بازاری اور پرشور زمانہ ختم ہو گیا۔ آپ کو میرے لیے فرصت کے لمحات حاصل ہو گئے، اُف یہ کرسمس کا زمانہ اور اُس کے ہنگامے! میرا تو عقیدہ ہے شیطان نے یہ خاص کر ہمارے — ہم غیر شادی شدہ اور مجرد لوگوں کے ستانے کے لیے ہی اس کی تخلیق کی ہے، تاکہ ہماری "خانہ ویرانی" اور اُجڑے گھروں کی تاریکئ حیات ہم پر بے طرح اثر انداز ہو اور ہم کو بیکل بنائے۔ جن باتوں میں دوسرے مسرت و انبساط حاصل کرتے ہیں وہی ہمارے لیے کس قدر اذیت رساں اور تکلیف دہ ثابت ہوتی ہیں، اس میں شبہ نہیں ہم سے ہر شخص تجرد اور تنہائی کی سوزش نہیں محسوس کرتا، کیونکہ دوسروں کو خوش کرنے کی خوشی ہی ہم میں سے بہتیروں کو شگفتہ بنائے رکھتی ہے۔ لیکن دوسروں کی شادمانی میں حصہ لینے کی مسرت خاص کچھ تو اس سبب سے تلخ بن جاتی ہے جب خود ہم اپنی حیات پر تنقید کرتے ہیں اور پھر اُس میں سیکڑوں طنز میں بجھے ہوئے سہمین نشتر نظر آتے ہیں اور کچھ ان ترش خواہشات کے باعث جسے میں بجائے "غم خانہ" کے "شادی کی تڑپ" سے موسوم کر سکتا ہوں۔

میں کیوں نہ حاضر ہو سکا، اور میں نے کیوں نہ اپنا دل آپ کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ آپ یہی دریافت کرتی ہیں نا؟ آپ! ایک ہمدرد اور مہربانی سے لبریز روح!! جو دلجوئی اور دلدہی میں اتنی ہی دریادل واقع ہوئی ہیں جتنی بہتری آپ کی صنف سے تعلق رکھنے والی بغض اور عناد پھیلانے میں۔ لیکن آہ آپ دیکھیں گی بات زیادہ آسان نہیں۔ آپ جانتی ہیں؟ اسپیڈل اپنے ساحرانہ مکالمہ "طیور تنہا" میں جو آپ نے میرے دل کا صحیح اندازہ لگا کر مجھے تعطیل کے تیسرے دن بھیجا ہے، کیا کہتا ہے، اُس کا قول ہے "ایک حقیقی اور سچا مجرد شخص تسلی یا تشفی کا محتاج نہیں ہوتا، ایک دفعہ جب وہ غم سے آشنا ہو جاتا ہے تو اُسے اپنے غم کی پرورش میں راحت حاصل ہونے لگتی ہے۔

اسپیڈل کے "طیور تنہا" کے علاوہ دنیا میں ایک جنس مسلمہ ضعیف العمر مجرد لوگوں کی بھی ہے، یہی خاندانی دوست و احباب — میرا مطلب خاندانوں کے تباہ کرنے والے ان پیشہ ور مجرموں سے نہیں ہے جو دلوں میں بری نیتوں کو چھپا کر آتش دان کے گرد و پیش بیٹھتے ہیں اور مکر و فریب سے ایک خاندان کے دل میں جگہ بنا لیتے ہیں، بلکہ میری مراد بوڑھے پارسا چچاؤں سے ہے — یہی والدوں کے اسکول کے گہرے دوست و احباب — جو بچوں کو اپنے گھٹنوں پر بٹھا کر کھلاتے اور شام کے اخباروں میں چھپے ہوئے افسانے بڑے ادب اور احترام کے ساتھ اُن کی ماؤں کو سناتے ہیں — اور غیر شائستہ قطعوں اور پاروں کو نظر انداز کر کے۔

میں ایسے بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں جن کی ساری زندگی ایک خاندان سے دوستانہ تعارف حاصل ہو جانے کے بعد ہمیشہ اُسی کی خدمت میں کٹی، ایسے لوگ جو بلا کسی غرض اور مقصد کے ایک عورت کی جان نواز ہستی کے نزدیک بیٹھ کر اپنے ایام گزارتے ہیں — دل ہی دل میں اُس کی پرستش کرتے ہوئے۔

آپ شکی مزاج واقع ہوئی ہیں؟ "ارمانوں سے خالی" ہونے پر آپ کو اعتراض ہے، ہے نا؟ ممکن ہے آپ کا خیال صحیح ہو، بزدل سے بزدل انسان کے دل میں بھی حیوانی خواہشات کے جذبہ کا نہ ہونا ممکن نہیں۔ لیکن وہ ایک ایسا جذبہ ہوتا ہے جو عمداً اور جبراً دبا کر رکھا جاتا ہے۔

جی چاہتا ہے آپ کے سامنے اس کی بابت ایک مثال پیش کروں، اور دو عالی خاندان بوڑھوں کے درمیان آج ہی کی طرح نوروز کی رات کو جو گفتگو ہوئی بیان کروں۔ لیکن آپ مجھ سے یہ ہرگز دریافت نہ کریں کہ میں نے ان کی باتیں کیسے سنیں، اور آپ خود بھی اسے کسی اور کو نہ سنائیں گا۔

۔ عزت سے اعتشہ و رہا

پس منظر کے لیے اپنے دماغ میں ایک خاکہ قائم کیجیے، ایک اونچی چھت کا کمرہ، قدیم ساز و سامان سے آراستہ، چھت سے معلق ایک سبز فانوس ـــــ ایسا کہ مٹی کے تیل کے زمانہ سے پہلے ہمارے آبا و اجداد استعمال میں لاتے جس سے بنفشہ شعاعیں پھوٹ پھوٹ کر ایک گول میز کو نمایاں کر رہی ہوں، میز پر سفید پوش پڑا ہے اور نوروز کے پنچ کے لیے اشیا رکھی ہیں، بیچ میں آہستہ آہستہ تیل کے چند قطرے پھیلتے جا رہے ہیں۔ میرے یہ دونوں عالی خاندان بوڑھے ایسی جگہ بیٹھے ہیں کہ بنفشہ روشنی ان کے نصف حصوں پر پڑ رہی ہے، گزرے ہوئے زمانہ کے آثار شکستہ دونوں اداس اور لرزاں اپنے اپنے ڈوبے ہوئے ہیں۔ دونوں کے جھری دار چہرے اور دھندلی آنکھیں سامنے کھلی ہیں ان میں سے ایک ـــــ میزبان کسی زمانہ میں فوج میں رہ چکا ہے، اس کا اندازہ اس کے موزوں کرسی ہوئی پٹیاں، بل کھائی ہوئی مونچھوں اور کرختگی سے کھچی ہوئی ابرو سے پہلے ہی نظر میں بخوبی ہو جاتا ہے۔ وہ لڑھکنے والی کرسی پر بے تکے پن سے بیٹھا ہے، اور اسٹرنگ کے دستہ کو ایک خمدار چھڑی کے مانند مٹھیوں میں پکڑے ہوئے ہے۔ وہ بالکل بے حس و حرکت بیٹھا ہے، بس صرف اس کا منہ چل رہا ہے، دوسرا جو اس کے پاس صوفہ پر بیٹھا ہے، دبلا پتلا طویل القامت شخص ہے۔ اس کے کندھے سکڑے ہوئے اور ایک متفکر سا معلوم ہوتا ہے۔ زاویہ نما اور کشادہ پیشانی والا، وہ ایک لمبے پائپ سے دھویں کے پچھے اڑا رہا ہے جو عنقریب بجھنے والا ہے، برف کی طرح سفید چھلے دار بال اس کے چہرہ کو رونق بخش رہے ہیں، اس کی خشک اور چکنی جلد کی انگنت جھرّیوں سے ایک ملائم اور خاموش تبسم عیاں ہے جو صرف تپاک کی آشتی ہی ایک بوڑھے کے چہرہ پر پیدا کر سکتی ہے۔ دونوں خاموش بیٹھے ہیں۔ خاموشی میں آپ جلتے ہوئے تیل اور تمباکو کے اس ابلنے کی ملی جلی آواز سن سکتے ہیں، اسی وقت دیوار پر آویزاں گھڑی تاریکی سے گھر گھرائی اور گیارہ بجا دیئے۔

"اسی وقت تو تم ملو پنچ کشید کرتے ہو؟" متفکر کی آواز آہستگی سے گونجی، اس میں کپکپی تھی۔

"ہاں یہی وقت ہے" دوسرا بولا۔ اس کی آواز میں سختی تھی، فوجی تحکمانہ درشتگی کی علامت

"میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا" مہمان نے سلسلہ کلام جاری کیا "ان کی عدم موجودگی اس قدر غم انگیز اور دلگداز ہو گی"

میزبان نے صرف سر ہلا دیا اور منہ چلائے گیا۔

"انھوں نے چوالیس بار ہمیں نوروز کا پنچ پلایا"

"ٹھیک ہے" بوڑھے سپاہی نے کہا "جب سے میں برلن میں مقیم ہوں اور تم ہمارے یہاں آنے لگے ہو"

"پار سال اس وقت" مہمان کہتا رہا "ہم تینوں اکٹھا تھے کس قدر خوشی برس رہی تھی، وہ یہاں آرام کرسی پر بیٹھی پال کے بڑے لڑکے کے لیے موزہ بن رہی تھیں اور بہت تیزی کے ساتھ، وہ کہتی تھیں موزہ بارہ بجے تیار ہو جانا چاہیئے، اور وہ ہو بھی گیے تھے۔ پھر ہم نے پنچ پیے تھے اور بڑی فراغت سے موت و حیات کے مسئلہ پر گفتگو کرتے رہے تھے، اس کے دو ماہ بعد وہ سچ مچ اللہ کو پیاری ہو گئیں اور قبرستان جا بسیں۔ تمہیں معلوم ہو گا "تخئیل کی جادو وانی" میری ایک تصنیف ہے۔ تمہیں وہ قطعی پسند نہ تھی، اور جب سے تمہاری بیوی سدھاریں میرا دل بھی اس سے اُچاٹ ہو گیا، اور سچ تو یہ ہے اب تخئیل کی مجھے رتی برابر پروا نہیں۔

"ہاں وہ نیکبخت اور خدمت گذار عورت تھیں" مرحومہ کے شوہر نے کہا "وہ میری بڑی خدمت کرتیں، جب مجھے تڑکے پانچ بجے باہر جانا پڑتا تو وہ مجھ سے پہلے ہی اٹھ بیٹھا کرتیں اور مجھے گھر سے نکلنے سے پہلے نفیس قہوہ کا پیالہ پلا دیا کرتیں، اس میں شک نہیں انہیں کچھ کمزوریاں بھی تھیں ـــــ ایک دفعہ تمہارے ساتھ بحث میں الجھ پڑی تھیں، ـــــ وہ!"

"بس تم نے انہیں سمجھا نہ تھا" مہمان بڑبڑایا، دبی ہوئی ناراضگی سے اس کے لب لرز گیے، پھر بھی وہ اپنے دوست کو یاس انگیز نرم نگاہوں سے دیکھتا رہا، گویا اس کی روح کسی جرم کی اذیت محسوس کر رہی تھی۔

قدرے خاموشی طاری رہی پھر وہ بولا۔

"ذرا سنتے ہو، مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے، کسی کیا ہے کبھی ہی پڑے گی، وہ مجھے [illegible]

اس کے کہے بغیر شاید قبر میں بھی نہیں جا سکتا،

"پھر کہہ ڈالو نا؟" فرانز نے کرسی پر جھک کر پائپ اٹھاتے اور اُسے تمباکو سے بھرتے ہوئے کہا

"ایکدفعہ ——— ایکدفعہ ——— ایک واقعہ پیش آگیا تھا ——— میرے اور ——— تمہاری بیوی کے درمیان"

"مذاق نہ کرو ڈوک" فرانز بولا۔

"میں اس وقت مذاق نہیں کر رہا ہوں بلکہ بالکل سچ کہہ رہا ہوں فرانز، چالیس سال کے زاید عرصہ سے تو میں اسے دل میں چھپائے ہوئے ہوں، اب مجھ سے نہیں رہا جاتا، اب وقت آگیا ہے کہ یہ راز کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کروں"

"تمہارا مطلب یہ ہے کہ میری بیوی نے مجھ سے بیوفائی کی" بوڑھا سپاہی غصہ سے چیخا۔

"شرم کرو، شرم کرو" فیلسوف نے یاس انگیز مسکراہٹ سے کہا

فرانز کچھ دیر بڑبڑاتا اور ہونٹ چباتا رہا، پھر اس نے پائپ سلگا لیا۔

"نہیں وہ فرشتہ تھیں فرشتہ، میں تو کہونگا کہ فرشتہ سے بھی زیادہ پاک" فیلسوف کہتا گیا،

"مجرم میں اور تم ہو، سنو"

تینتالیس سال پہلے کی بات ہے، تم اس وقت برلن میں کپتانی کے عہدے پر فائز تھے۔ اور میں یونیورسٹی میں درس دیتا تھا، تمہیں تو یاد ہوگا اُس زمانہ میں تم کتنے نک چڑھے اور وحشی تھے"

"ہوں" فرانز غرایا اور اپنی مونچھوں کو بل دینے کے لیے ہاتھ اُٹھا لے گیا۔

"ایک حسین جمیلہ، اس کی بڑی بڑی رس بھری آنکھیں اور سفید موتی جیسے دانت تمہیں یاد ہیں"

"ہاں خوب یاد ہے، وہ بیانکا تھی" ایک خفیف سی مسکراہٹ بوڑھے کے زمانہ دیکھے کرخت چہرہ پر دوڑ گئی" ارے وہ تو بڑوں بڑوں کے کان کاٹتی تھی"

تم نے اپنے بیوی کے ساتھ بیوفائی کی اور یہ بات ان پر واضح ہوگئی، اس کے باوجود کبھی بھی ان کی زبان پر حرف شکایت نہ آیا، اور وہ خاموشی کے ساتھ اپنا غم برداشت کرتی رہی۔ تم نے اس کا اندازہ نہیں لگایا، لیکن میں اُن کے غم سے واقف ہوگیا تھا، وہ پہلی عورت تھیں جن سے ماں کے مرنے کے بعد مجھے واقفیت حاصل ہوئی تھی، وہ میری زندگی میں جگمگاتے ہوئے ستارہ کی طرح داخل ہوئیں اور میں اُنہیں اُسی طرح دیکھتا رہا جس طرح ایک جگمگاتے ہوئے ستارہ کو دیکھا جاتا ہے۔ آخرش ایک دن ہمت سے کام لے کر اُن کے روگ کی وجہ سے دریافت ہی کر بیٹھا وہ مسکرا پڑی تھیں اور اُنھوں نے کہا تھا کہ ابھی ان کی تندرستی ٹھیک نہیں ہوئی، تمہیں شاید یاد ہو یہ بات پال کی پیدائش کے کچھ ہی دنوں بعد رونما ہوئی تھی، پھر شب نوروز آئی ——— آج سے ٹھیک تینتالیس سال پہلے کی یہی شب میں حسب معمول تقریباً آٹھ بجے تمہارے یہاں آگیا تھا، وہ کڑھائی میں مصروف تھیں، میں بیٹھ کر کتاب سنانے لگا، اس طرح ہم تمہاری راہ تک رہے تھے، گھنٹے یکے بعد دیگرے گزرنے لگے، لیکن تمہیں آنا تھا نہ آئے، میں نے دیکھا ایک اضطرابی کیفیت ان پر مسلط ہوتی جارہی ہے، اور بے چینی کے عالم میں اُن کا جسم کانپنے لگا ہے، میرے اوپر بھی لرزہ طاری ہوگیا، مجھے معلوم تھا تمہاری آمد میں کونسی چیز حائل ہے، میں ڈر بھی رہا تھا کہ کہیں تم بارہ بجے کے وقت کو اُس عورت کے بازوؤں میں نہ فراموش کردو، اب بارہ بجنے ہی والے تھے، اُنھوں نے کاڑھنا بند کردیا، میرا پڑھنا بھی ختم ہوگیا، ایک وحشتناک سکوت ہم پر طاری ہوگیا، اتنے میں اُن کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں، اور قطرات اشک کشیدہ کاری میں جذب ہونے لگے، مجھ سے ضبط نہ ہوسکا، میں ایکدم کھڑا ہوگیا، اور تم کو لانے کے لیے باہر بھاگنا چاہ رہا تھا ——— مجھ میں اُس وقت اتنی سکت پیدا ہوگئی تھی کہ تم کو اُس عورت کے بازوؤں سے چھڑا لاتا ——— لیکن اُسی ساعت وہ بھی اس نشست سے کود میں جس پر میں اس وقت بیٹھا ہوں۔

"کہاں چلے؟" وہ چیخیں، اُن کے چہرہ پر ناقابل فہم غم تھا۔

"فرانز کی تلاش میں" میں بولا

اس پر وہ چلا کر بولیں "خدا کے لیے آپ نہ جائیے، کم از کم آپ تو میرے ساتھ ٹھہریئے، مجھے تنہا نہ چھوڑیئے، یہ کہتے کہتے وہ میرے بالکل قریب آگئیں یہاں تک کہ اُن کے ہاتھ میرے کندھوں پر اور آنسوؤں سے تر چہرہ میرے سینے میں چھپ گیا، میرا سارا جسم کانپنے لگا، اس سے پہلے کبھی کوئی عورت مجھ سے اتنی قریب ہوئی تھی، لیکن میرے قدم ڈگمگائے نہیں اور میں اُن کو دلاسہ دینے لگا، اُف اُس وقت انہیں اس کی کتنی شدید ضرورت تھی، اس کے بعد ہی تم آگئے، تم نے میری بوکھلاہٹ نہیں دیکھی، تمہارے رخسارے دمک رہے تھے، آنکھیں محبت میں مخمور تھیں، اس نوروز کی شب نے مجھ میں انقلاب پیدا کر دیا، میں گھبرایا گھبرایا اور کھویا کھویا سا رہنے لگا —— کیونکہ ان کی نرم باہیں میری گردن کو مس کر چکی تھیں، ان کی عنبر بار زلفوں کی خوشبو میرے دماغ میں سرایت کر چکی تھی، ستارہ آسمان سے زمین پر آرہا اور بجائے اس کے صرف عورت رہ گئی تھی —— ہاں عورت حسین و جمیل، محبت کی باس سے مہکتی ہوئی۔

میں جانتا تھا میری نظروں میں شوق اور بیتابی جھلکنے لگتی ہے، میں اپنے کو ملامت کرتا، مکار اور فریبی گردان کر نفریں کرتا، اپنے ضمیر کی تسلی کے لیے میں نے کچھ کفارہ بھی ادا کرنا چاہا، اور تم کو تمہاری محبوبہ سے الگ کرنے کی ٹھانی، خوش قسمتی سے اس وقت میرے پاس کچھ رقم موجود تھی جو ورثہ میں مجھے ملی تھی، اور وہ اس رقم پر اکتفا بھی کر بیٹھی —— اور . . . .

"خدا کی پناہ" سپاہی بیچ میں بولا "آپ ہی نے بانیکا کو ورغلا کر مجھ سے علٰحدہ کرا دیا، اور اُس سے خط لکھوایا تھا، اوہ! اُس شکستہ دل کے ساتھ وہ میری محبت سے کفارہ کش ہوئی ہے۔ ان تمام باتوں کے آپ ہی ذمہ دار ہیں"

ہاں اس کا الزام میرے ہی سر ہے، لیکن سنو بھی تو، مجھے امید تھی میں ذرہ سے دماغی سکون حاصل کر سکوں گا، لیکن میں غلطی پر تھا، وحشیانہ خیالات میرے دل و دماغ کو بھڑکاتے، گمراہ کرتے اور بدتر بناتے رہتے، میں نے اپنے کو سرگرمی کے ساتھ محنت و مشقت میں غرق اور جہالت میں فنا کر دیا۔ یہی وقت تھا جبکہ اپنی کتاب "تخئیل کی جادوانی" کا اصل موضوع میرے ذہن میں آیا۔ اس سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا، اور مجھے کسی کل قرار حاصل نہ ہو سکا، اسی طرح ایک سال گذر گیا، اور دوسرا نوروز آن پہنچا۔ میں پھر ان کے قریب اسی جگہ بیٹھا تھا، اس دفعہ تم گھر پر تھے، لیکن کلب وغیرہ میں جشن منانے کی خوشی سے تھک کر چور ہو گئے تھے اور دوسرے کمرہ میں صوفہ پر پڑے سو رہے تھے میں یہاں بیٹھا ان کے زرد چہرہ کو تک رہا تھا کہ ایکا ایکی سال گذشتہ کا واقعہ میری آنکھوں میں پھرنے لگا اور مجھے بے طرح ستانے لگا، میرے سوئے ہوئے جذبات بیدار ہونے لگے، خوابیدہ تمنائیں ابھرنے لگیں، میں یہ چاہنے لگا کہ اُن کا سر اپنے سینہ پر ایک دفعہ اور رکھا دیکھوں، انہیں ایکبار اور چوموں، انجام کا مجھے کچھ بھی خوف نہ تھا، اس وقت میں ہر بات جھیلنے کو تیار تھا، دفعتاً ہماری نظریں چار ہو گئیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن پر بھی بجنسہٖ وہی کیفیت طاری ہے، میں زیادہ برداشت نہ کر سکا، اُٹھ کر اُن کے قدموں پر جا گرا اور اپنے تپتے ہوئے چہرہ کو اُن کی گود میں چھپا دیا۔

ایک دو گھڑی میں اُسی حالت سے ساکت و صامت پڑا رہا ہوں گا کہ ان کا ٹھنڈا ہاتھ میرے سر پر شفقت سے پھرنے لگا اور بڑی نرمی اور پیار سے وہ بولیں "آپ کو سنبھلنا چاہیئے"

ہاں مجھے سنبھلنا چاہیئے اور اُس شخص کے ساتھ بیوفائی نہ کرنا چاہیئے جو مجھ پر اعتماد کیے ہوئے دوسرے کمرہ میں بے فکر سو رہا ہے یہ خیال آنا تھا کہ میں جھپٹ کر علٰحدہ ہو گیا اور خوف و سراسیمگی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا، انھوں نے میز پر سے ایک کتاب اٹھا کر مجھے پکڑا دی، میں اُن کا مقصد سمجھ گیا اور کتاب یونہی ایک جگہ سے کھول کر اندھا دھند پڑھنے لگا، مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں، بس حروف میری آنکھوں میں ناچ رہے تھے، رفتہ رفتہ میرا ہیجان کم ہو گیا، جب بارہ بجے اور تم آنکھوں میں نیند سجائے کمرہ میں "نیا سال مبارک" کہتے ہوئے داخل ہوئے تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ گناہ کا لمحہ مجھ سے پیچھے بہت دور رہ گیا، اب ایسے زمانہ میں جس کو گذرے ہوئے سالہا سال بیت گئے ہوں!

اُس وقت سے میں خاموش رہنے لگا، مجھے معلوم ہو گیا تھا وہ مجھ سے محبت نہیں کرتیں، اور مجھے اُن سے سوائے رحم، ترس اور مہربانی کے کچھ نہیں مل سکتا، سال گذرتے گئے، تمہارے بچے بڑے ہو گئے، ان کی شادیاں بھی ہو گئیں، ہم تینوں بھی بوڑھے ہو گئے، تم نے کبھی

پیچھا کرنا ترک کر دیا۔ اور میری طرح ایک عورت کے التفات پر قانع ہو کر زندگی کے دن گذارنے لگے، میں اُن کی محبت بھلا نہ سکا، یہ میرے لیے قطعی ناممکن تھا، بس محبت نے دوسری صورت اختیار کر لی تھی۔ دنیاوی اور نفسانی خواہشات ختم ہو گئیں، اور اُن کی جگہ روحانی محبت نے لے لی، تم جب ہمیں محبت پر حکیمانہ گفتگو کرتے، دیکھتے تو اکثر ہنسا کرتے، لیکن اگر تم کبھی اس راز کو سمجھتے کہ میری اور ان کی روحیں مل کر ایک ہو گئی ہیں، تو رشک اور رقابت سے جلنے بھننے لگتے، اب وہ مر چکی ہیں، شاید اگلے سال تک ہم بھی اُن کے نقش قدم پر چل چکے ہوں گے، اسی لیے تو میرے لیے یہ وقت بہت اہم ہے اور میں اپنا راز کھول کر اپنے کو نجات حاصل کرا رہا ہوں، اور تم سے کہہ رہا ہوں، فرانز عزیز! یکدم مجھ سے تمہارا قصور ہو گیا، مجھے معاف کر دو!!

اس نے اپنا ہاتھ دوست کی طرف بڑھا دیا، لیکن اُس نے تنگ مزاجی سے جواب دیا "لغو، بیکار! کیسا قصور، کاہے کی معافی، تمہارا یہ اعتراف، تمہارا یہ راز مجھے برسوں سے معلوم ہے، چالیس سال ہوئے وہ خود مجھ سے سب کچھ کہہ چکی ہیں اور اب میں تمہیں بتلاتا ہوں کہ بوڑھے ہونے تک میں کیوں عورتوں کے پیچھے مارا مارا پھرا کرتا تھا، جب انہیں نے مجھ سے یہ واقعہ بیان کیا تو یہ بھی کہدیا تھا کہ صرف تم ہی وہ شخص ہو جسے وہ چاہتی ہیں"

میہمان پر سکتہ پڑ گیا، اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور میزبان پر جم کر رہ گئیں

اسی وقت گھڑی نے گھبرا گھبرا کر بارہ بجا دیئے۔

موہنی، ایم، اے

نغمۂ دل

نغمۂ دل سنائیں ہم دونوں
کیف و مستی لٹائیں ہم دونوں

پریم کا گیت گائیں ہم دونوں
بربطِ دل بجائیں ہم دونوں

پھول بن کر رہیں گلستاں میں
قمریاں بن کے گائیں ہم دونوں

غرق ہو جائے پاپ کی دنیا
اتنے آنسو بہائیں ہم دونوں

راہ الفت میں خود فنا ہو کر
رازِ الفت بتائیں ہم دونوں

زندگی کی سیاہ راتوں میں
مشعلِ دل جلائیں ہم دونوں

خوب ہے اختری کا یہ نغمہ
جھوم کر آؤ گائیں ہم دونوں

اختری خاتون

اُمّید

اِک طلسم روح فرسا ہے حجاب ہست و بود — پھر بھی دلکش ہے حیاتِ چند روزہ کی نمود
قیدِ ہستی گو وبالِ جاں ہے انساں کے لئے — ہر دلِ پر درد حسرت کش ہے درماں کیلئے
رشتۂ ارماں ہے پیغامِ بہارِ رنگ‌زاں — جانفزا ہیں کس قدر امید کی گلکاریاں
خارزارِ زیست میں آتی ہے یوں فصلِ بہار — گلشنِ ہستی میں ہوتا ہے تمنا کا نکھار
آرزو کی ضو نے غمخانوں کو روشن کردیا — دہر کا ظلمتکدہ وادیٔ ایمن کردیا
سوزِ غم کم کردیا خستگیٔ دل کے لئے — شمعِ تاباں بن گئی ہستی کی محفل کے لئے
گمرہوں کے واسطے خضرِ طریقت بن گئی — خفتہ بختوں کے لئے نورِ ہدایت بن گئی

خرمنِ غم کے لئے برقِ تپاں امید ہے
زیست کی تاریکیوں میں ضوفشاں امید ہے

یاس کی ظلمت میں اِک شمعِ فروزاں ہے امید — شامِ غم کیواسطے صبحِ درخشاں ہے امید
غم نصیبوں کے لئے دلکش نظارہ ہے امید — ڈوبنے والوں کو تنکے کا سہارا ہے امید
فاقہ کش بندوں کی مظلوموں کی دولت ہے امید — اور مریضوں کے لئے پیغامِ صحت ہے امید
غمزدوں کی مشکلوں کو اس نے آساں کردیا — خارزارِ زیست کو رشکِ گلستاں کردیا
بیکسوں کے واسطے سامانِ تسکیں بن گئی — صیدِ غم زخمی کیا بازوئے شاہی بن گئی
بیدلی میں بھی پیامِ جانفزا امید ہے — نامرادوں کے لئے عنوانِ صبحِ عید ہے
شامِ غم میں پھوٹتی ہے جب کرن امید کی — جگمگاتی ہے نگاہِ یاس میں بھی روشنی

زندگی کا آسرا اَحسن فقط اُمید ہے
رنجِ محرومی نہ کر نزدیک صبحِ عید ہے

سیّد محمد اَحسن طباطبائی

بنگالی سے

تنہائی

زندگی کے درخت میں اب تک پھل پکا نہیں ہے۔

صرف پتیاں ہی نظر آرہی ہیں۔ لیکن ان پر بھی زردی سی چھاگئی ہے کتنی خوبصورتی و نزاکت کے ساتھ غنچے پھوٹنے والے تھے۔ انکے ننھے ننھے نازک پتے روشنی میں درخشاں معلوم ہو رہے تھے۔ میں نے پتیوں کو عطرِ گلاب سے بھر دینے کی کوشش کی تھی ـــــ لیکن افسوس پوری نہ ہوسکی۔

زندگی کی کشتی کا لنگر اب تک اٹھایا نہیں گیا ہے۔

مشرق سے ہوا کے نرم و نازک جھونکے نغمات قدس میں ملکر بہ رہے ہیں۔ اس کی شیریں خوشبو دل کو معطر کر رہی ہے ـــــ ساتھ ہی موسیقی کی روح پرور تان ہچکولے کھا رہی ہے۔ میری کشتی بھی اسی موسیقی کی تان میں محو ہو کر دھیرے دھیرے بہہ رہی ہے ـــ!

میں بےچین ہو رہا ہوں ـــ اس ہوا نے میرے دل کے درد کو جدا کر دیا ہے ـــ اب مجھ میں کشتی کھینے کی طاقت نہیں رہی ـــ!

میری زندگی کی مٹی کو کسی نے بھی قابل زراعت نہیں بنایا ـــ وہ ایک ریگستان کی طرح پڑی ہے۔ کسی نے اسے پانی سے سیراب تک نہیں کیا۔ اسے بسانے کیلئے کسی نے محنت نہیں کی ـــ تخم ریزی بھی نہیں کی۔ تمام انسان اپنے شانہ پر پرچم لیکر چل رہے ہیں۔ انہیں دوسروں کی سلامتی پرواہ نہیں ـــ!

مجھے خوف معلوم ہو رہا ہے ـــ کیونکہ زندگی کی اداس شام میری طرف بڑھ رہی ہے۔ سیاہ اور بھیانک چادر تانے ہوئے میرے دل کو ڈرا رہی ہے۔ اسکے بعد ہی رات آئیگی ـــ میں ان تمام باتوں سے منہ موڑ کر تنہا کھڑا ہوں ـــ اُف رے تنہائی!

دیپ نرائن مٹھولیا

شکست احساس

افسانہ

کیا تم یقین کروگے دوست! کہ میرے تصورات کا وہ پرشکوہ محل آج مٹی کا ایک ڈھیر بن چکا ہے جس کی سربلندی پر خود مجھے حیرت تھی!

میرا وہ راز آج کسی کے لئے بھی راز نہیں رہا۔ جسے میں نے تم سے بھی چھپا رکھا تھا!!

میرا وہ یقین اور بھروسہ آج ختم ہو گیا ہے۔ جسے میں اپنا ایمان سمجھتا تھا ـــــ اور مجھے "اس" سے نفرت ہو گئی ہے۔ جس کی میں پوجا کرتا تھا!!!

مشاہدے نے احساس کو شکست دیدی ہے دوست! تلخ حقائق نے رنگین تصورات کی دنیا ہی اُجاڑ دی ہے۔

میرے ناتواں جسم میں آج وہ روح موجود نہیں جسکے بل پر میرا احساس زندہ اور بیدار تھا۔ میری حسرتوں، آرزوؤں، اور تمناؤں نے قبل از وقت ہی دم توڑ دیا ہے۔ اور تمہارا وہ جمال آج ایک بے معنی وجود بنکر رہ گیا ہے، جسے تم نہ جانے کیا کیا سمجھے تھے!

تمہارے پیہم اصرار کے باوجود میں نے اس بات کو تم سے چھپائے رکھا ہے لیکن آج ....؟

آج جبکہ سب ہی لوگ مجھے احمق سمجھ رہے ہیں اپنی "حماقتوں" کو "راز" کہکر ان پر پردہ ڈالنے کی کوشش سے کیا حاصل؟

تمہیں اُس بات سے بےخبر کیوں رکھوں جسے سب لوگ جان چکے ہیں؟

تمہارے خیال میں میں خشک فلسفی تھا ـــ محبت سے ناآشنا ـــ حالانکہ یہ غلط تھا۔

فطرت کی اس انمول نعمت ۔۔۔۔ سے نفرت کہوں یا انسانی کمزوری؟ ۔۔۔۔ ہے میرا دل ناآشنا نہیں تھا۔ میں بھی محبت کرتا تھا مگر میری محبت عام لوگوں کی طرح "صبح شام کا کھیل" نہیں تھا۔ میں نہ تو جی بہلانے کے لئے محبت کرتا تھا، نہ رومان پرستی کا جھوٹا مظاہرہ کرنے کے لئے محبت۔ میرے لئے "زندگی کی روح" تھی ۔۔۔۔ اور زندہ روح وہی ہے جو "معصوم" بھی ہو!

میں اس زمانے میں بھی "اس" سے محبت کرتا تھا جب تم زاہد خشک کہکر میرا مذاق اڑایا کرتے تھے، مگر معاف کرنا دوستو! میں محبت کو نمائش کی چیز نہیں سمجھتا ۔۔۔۔ میں نے تم لوگوں کے مذاق کا نشانہ بننا منظور کر لیا۔ مگر "اسے" بدنام کرنا گوارا نہ کر سکا۔

میری محبت مدتوں قائم رہی۔ اور میں سمجھتا رہا کہ "وہ" بھی مجھے پوری شدت سے چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے کبھی اپنی محبت کو معصیت سے آلودہ کرنا نہیں چاہا۔ میں جانتا تھا کہ نفسانیت کی آگ اس وقت تک نہیں بھڑکتی جب تک محبت کی راہ میں کوئی رکاوٹ ڈال نہ دی جائے ۔۔۔۔ ان پابندیوں کو توڑنے پر مجبور نہ کر دیا جائے جنہیں توڑنا کوئی شریف آدمی گوارا نہیں کر سکتا!

میرے خیال میں اس تڑپ، خلش اور کشش ہی کا نام محبت تھا۔ جو حصولِ مقصد سے دُور رہ کر ہی نصیب ہو سکتی ہے ۔۔۔۔ چنانچہ اس سے دور رہ کر بھی، میں اس کی محبت کی دولت سے مالا مال تھا ۔۔۔۔ لیکن ....؟؟؟

پیارے دوست! کیا تم نے کبھی اس لمحے کا تصور کیا ہے جب کسی کو انتہائی بلندی پر چڑھا کر دھکا دے دیا جائے؟ یا ایک پیاسے کو پانی کے لئے ترسا ترسا کر آخر زہر پلا دیا جائے؟ ۔۔۔۔ شاید تم نے یہ سب کبھی نہ سوچا ہوگا۔ مگر مجھ پر تو یہ بیت چکی ہے۔

میرے دل میں تو ابھی تلخ حقائق کے خونیں نشتر بار بار چبھتے ہیں پھر بھلا وہ رات مجھے کیسے بھول سکتی ہے؟

اس رات نہ جانے کیوں میرا دل بہت بے قرار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے دل پر منوں بوجھ لاد دیا ہے۔ یا جیسے کوئی میری بہت ہی قیمتی شئے کھو گئی ہے۔ اور دل خود بخود بھرا آ رہا ہے۔

آخر میں نے اس کے ہاں جانے کا ارادہ کر لیا۔ اور روانہ ہو گیا۔ میں نے کوٹھی کا بیرونی پھاٹک کھولا اور دبے پاؤں باغیچے کی ایک روش پر چلنے لگا ۔۔۔۔ میں چاہتا تھا کہ اچانک اس کے کمرے میں پہونچکر اسے حیرت میں ڈال دوں۔

دفعتًہ اس کا مترنم قہقہہ سنائی دیا ہو، میں نے سوچا غالبًا اس نے مجھے چوروں کی طرح چلتے دیکھ لیا ہے۔ چنانچہ میں آواز کی طرف لپکا۔ مگر چند گز چلنے کے بعد میرے قدم خود بخود رک گئے ۔۔۔۔!

گلاب کے ایک گھنے پودے کے نیچے جہاں چاند کی زرد سی روشنی، گویا دم توڑ رہی تھی ۔۔۔۔ "وہ" کسی کی آغوش میں پڑی تھی۔ اور "اس" کے ہونٹوں پر ۔۔۔۔! ۔۔۔۔ میں سنبھل نہ سکا۔ اور دہشت زدہ ہو کر پیچھے ہٹ آیا اور ....!

میں نے محسوس کیا جیسے بے شمار زہریلی ناگنیں میرا پیچھا کر رہی ہیں!!!

معلوم نہیں کیسے اور کب میں مکان پر پہونچا اور اس کے بعد میری کیا حالت ہوئی؟

صرف اتنا یاد ہے کہ میرے ہاتھ میں ایک پرانا رسالہ تھا اور سامنے آگ کے سرخ شعلوں میں، میرے ایک افسانے کا عنوان چمک رہا تھا ۔۔۔۔ "وفا کی دیوی"

(شریف چکرالی)

کلام مغبون

(۱)

[illegible]

(۲)

[illegible]

میں ہرگز گدھا نہیں ہوں

بڑی بی! ــ "بڑی بی!" ــ آواز کے ختم ہوتے ہی بڑی بی کمرے میں تھیں۔

بھدی ــ بے ڈیل ــ اپنے آپ سے باتیں کرنے والی ــ یہ اس کی پرانی ملازمہ تھی۔ جو زندگی کی دردناکیوں سے مجسم ہونے سے تھی ــ معلوم نہیں کبھی کبھی اس کے آنسو جھریوں کے بنے بنائے راستوں پر بہ نکلتے تھے۔ مالک گہری سوچ میں تھا اس کی ایک ٹانگ غیر ارادی طور پر حرکت کر رہی تھی بڑھی خادمہ دروازے میں سے داخل ہونے سے پہلے بلائے جانے کا مقصد جانتی تھی۔ اس نے بغیر زبان ہلائے ہاتھ ناشتہ کی کشتی کی طرف بڑھا دئے ــ مالک ناشتہ کر چکا تھا۔ پانچ بسکٹوں میں سے ڈیڑھ بچا ہوا تھا۔ اور بسکٹوں کی پلیٹ میں کچھ چورا بکھرا ہوا تھا۔

وہ کمرے سے چلی گئی۔ اب وہ اکیلا تھا۔ چند ناول رفاقت کے منتظر تھے۔ تکان اور کوفت بہت بڑھ گئی تھی ــ آہ زندگی کتنی مشکل ہے ــ! سردیوں کے موسم میں صبح دس بجے کے بعد اس غریب کو بستر سے اٹھنے کے لئے بھی کافی زور لگانا پڑتا تھا ــ پھر یہ مرحلہ طے ہوتا تو آنکھیں اعلان جنگ کر دیتیں ــ ہم نہیں کھلتیں! ہم نہیں کھلنا چاہتیں: ابھی بہت سویرا ہے۔ اور وہ انہیں کشتیوں میں رات کے آرام سے حاصل ہوئی ساری طاقت ضائع کر بیٹھا تھا۔

یہ ریلوے آفس کا کلرک تھا۔ اور اب کچھ عرصے متواتر پندرہ پندرہ دن کی چھٹی لیتا جا رہا تھا: تاکہ اپنی صحت کو بحال کر لے ــ اس کی صحت یوں تو بھلی چنگی تھی لیکن اس رحمدل ڈاکٹر نے ہر پندرہ دن کے بعد اس کی پیش کردہ فیس پر رحم کھاتے ہوئے بیماری کا سرٹیفکٹ دے دیا کرتا تھا۔

یہ چاندی اور سونے کی ٹکلیاں اور یہ رنگین بلاکوں سے چھپے ہوئے کاغذ بڑے خطرناک امراض پیدا کرنے والے جراثیم ہیں ــــ اور ڈاکٹر نے معلوم کر لیا تھا کہ کلرک کی جیب کو رسولی میں بدل کر انھوں نے اپنا اڈا جما لیا ہے۔ لہٰذا اسے اپنے زیر علاج رکھ لیا۔ بس ہر پندرہ دن کے بعد ان کی جیب کا غیر مرئی اپریشن ہوتا تھا۔ اور خطرناک قسم کا گندہ مواد ــ ہاتھ پاؤں کا میل ــ گاڑھے پسینے کی کمائی ــ کا ایک حصہ خارج کر دیا جاتا تھا۔

غریب طبقہ کو دولت سے پیدا ہونے والے سارے امراض سے محفوظ رکھنے کی پوری پوری کوشش دنیا کی ہر سوسائٹی میں ہوتی ہے۔ لیکن "جبل الطارق" قسم کے سیٹھ پورے طور پر خطرے سے باہر ہوتے ہیں۔ وہ وراثتی اور اکتسابی سے دولت کے بیماروں کو خود بیماری بن جاتے ہیں۔

چٹان کی طرح کا جسم رکھنے والا کلرک بیوی بچے نہ ہونے کی وجہ سے ابھی تک متوسط طبقے میں شامل نہ تھا ــ ورنہ دراصل تو وہ غریب ہی تھا۔ خیر تو ان دنوں وہ تندرستی کے مرض میں مبتلا تھا ــ صبح جاگنے کے بعد ہاتھ منہ دھونے ناشتہ کرنے اور دو تین سگریٹ سلگا چکنے کے بعد اس کا بدن الگ دماغ الگ تھک کر چور ہو جاتا ہے ــ کہئے! اب بھی اسے ذرا دیر کے لئے تفریح کا حق حاصل نہیں؟ ــ آپ نہ مانیں تو نہ سہی! اسے تو اپنے حق کا لحاظ ہے ــ وہ تو اپنے فرض کو پورا کرے گا۔ اس نے ناولوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور ایک ضخیم ناول کھولا۔ ابتک اس نے اکیاسی صفحے چند دنوں کی عرق ریزی سے دیکھ لئے تھے۔ جس ورق سے اب اسے اپنا مطالعہ شروع کرنا تھا اس کا ایک کونہ دہرایا گیا تھا ــــ وہ سنجیدہ آدمی تھا۔ وہ مطالعہ کرتے وقت شور کو نا پسند کرتا تھا۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس کے تنفس کی کرخت آواز مخل انداز ہوتی تھی۔ اسے اپنے سانس پر غصہ آجاتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی صورت نکل آئے کہ سانس لئے بغیر جیا جا سکے۔ وہ بگڑ کے کبھی کبھی سانس کو سینے میں اس ارادے سے روک لیتا تھا کہ بس اب ختم۔ لیکن پھر انجام کار زور سے ایک "خوں" ہوتی اور پھیپھڑے اتنے زور سے ہوا کو نکالتے کہ کمرے کی ہوا میں اس "ہوائی حملے کے الارم" سے زلزلہ سا آجاتا تھا۔ اس قسم کے عملی تجربات کی وجہ سے اس کا مطالعہ تیز رفتار نہ تھا۔ وہ گلی انسان بھی بننا چاہتا تھا نہ کتاب کا کیڑا ہو جانے سے کیا حاصل! کتاب پڑھتے پڑھتے اسے اونگھ سی آگئی۔ اس کا سر

جھکتا چلا جا رہا تھا۔ ابھی کرسی کے بازو سے ٹکرانے نہیں پایا تھا کہ گلی میں ایک مختصر سا دھماکہ ہوا۔ دھماکے سے وہ چونک گیا۔ دیکھا تو وہ گلی میں ایک گھڑے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے اور بہتا ہوا پانی نظر آیا۔ بہشتی کچھ بڑبڑاتا ہوا جا رہا تھا۔ آگے آگے گدھا، گدھے کی پیٹھ پر پانی کی مشک —— لیکن آج اس کا سر گھڑے سے خالی تھا۔

کلرک نے ناول رکھ دیا —— اور خیال کیا کہ انسان کی شان ابھی نہیں ہے کہ وہ مفکر نہ ہو۔ کچھ سوچ کچھ سمجھ کچھ غور و خوض کرے اور تحقیق کی نگاہ سے ہر چیز کو دیکھے چنانچہ وہ سوچتے سوچتے اس نتیجہ پر پہنچا کہ —— اس بہشتی کا سر آج پہلی دفعہ گھڑے سے خالی دیکھا گیا ہے۔ اگرچہ اسکے گدھے کی پیٹھ مشک سے خالی نہیں ہو سکی —— یہی بہشتی، اس کا گدھا اور یہ گلی، سردیاں ہوں، گرمیاں ہوں، اتوار ہو، جمعرات ہو، مہینے کی یکم ہو یا ستائیسویں ۱۹۳۰ء ہو یا ۱۹۴۲ء عید ہو یا محرم —— وہی بہشتی اور وہی گدھا۔

اس بہشتی کی زندگی کیسی ہوگی، پانی کا کام کتنی درجے بھیگی ہوئی اور —— زندگی! زندگی ہر روز کہیں آدھی رات کو اٹھنا، گدھے کو تیار کرنا اور نل کے سر پر سوار ہو جاتا ایک گھڑا اور ایک مشک —— ایک بہشتی اور ایک گدھا —— ہر روز یہاں سے گذرتے ہیں کئی کئی بار گذرتے ہیں ایک ہی جیسے حالات کے ساتھ بالکل نہ بدلنے والے حالات!

اسے خیال آ رہا تھا کہ گدھا بیچارہ دبلا پتلا ہے مگر باہمت ہے۔ آدھی رات سے پانی ڈھونا شروع کرتا ہے پانی ڈھونے ڈھوتے دن کے گیارہ بج جاتے ہیں گیارہ بجے اور اسے ایک آدھ گھنٹے کی چھٹی ملی جیکی ہوئی بھوک کی نگاہیں جب سبز سبز چارے پر پڑتی ہونگی تو ساری مشقت بھول جاتی ہوگی۔ چارے کی جو تھوڑی سی مقدار اسکے نصیب میں ہوتی ہے اسے ٹھکانے لگانے کے بعد وہ پھر اپنے فرض کیلئے کمربستہ ہو جاتا ہے۔ اب غذا قوت میں بدلتی رہیگی اور قوت پانی ڈھونے میں استعمال ہوگی۔ اور پانی ڈھونے سے پھر غذا حاصل ہوگی۔ یہ زندگی کے پہئے کی گردش ہے —— نہیں معلوم چارہ کھانا اس کا مقصد زندگی ہے۔ یا پانی ڈھونا۔ یہ مجھے کیا معلوم ہوگا اس کے مالک کو بھی معلوم نہیں بلکہ خود اس کو بھی معلوم نہیں —— اس کے مالک کا بھی وہی پروگرام ہے گیارہ بجے تک پانی ڈھونا پھر روکھے سوکھے چند لقمے حلق سے اتار لینا —— پھر گدھے کے قریب ذرا دیر کیلئے دھوپ میں پڑے رہنا —— اور پھر وہی گھڑا اور وہی بہشتی! ——

روٹی کھانا اور پانی ڈھونا —— وہ بہشتی اس وقت سامنے ہو تو پوچھوں کہ تو جو سانس لیتا ہے چلتا پھرتا ہے۔ اور بہشتی بنا ہوا ہے۔ کیا تیرا مقصود؟ —— کیا ہیں تیرے وجود کے معنے؟ —— اور یقیناً وہ اپنے گدھے کی طرح کوئی جواب نہ دے سکے۔ وہ اپنے گدھے سے بہتر ہے ہی کہاں وہ بھی تو ایک حیوان ہے —— ایک گدھا ہی ہے انسان نام کا حیوان بہشتی نام کا گدھا! —— وہی چکر قوت سے غذا، غذا سے قوت۔ مرغی سے انڈے انڈے سے مرغی۔

یہاں پہنچکر وہ بیٹھے بیٹھے چونک سا گیا۔ اس نے گھبراہٹ میں ادھر ادھر دیکھا دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ دراصل معاً اسے یہ خیال آ گیا تھا کہ میں بھی تو گدھے سے بہتر نہیں ہوں بہشتی کے گدھے کا دو ٹانگوں والا بھائی۔

انسان کبھی کبھی اپنے اوپر بھی تنقید کر گذرتا ہے۔ بڑی دلچسپ ہوتی ہے تنقید لیکن اس سے کوئی دوسرا لطف نہیں لے سکتا۔ ہر آدمی اپنے متعلق ایک خاص رائے رکھتا ہے۔ یہ رائے بار ہا بدلتی ہے۔ لیکن ایک نہ ایک رائے بہرحال برقرار ضرور رہتی ہے۔ یہ رائے اپنے آپ سے بھی زیادہ پرائیویٹ ہوتی ہے۔ بار ہا آدمی کی نگاہ نادانستہ طور پر اپنی گھناؤنی شخصیت پر جا پڑتی ہے۔ لیکن وہ "غض بصر" کر لیتا ہے —— اپنے آپ کو خود اپنے آپ سے چھپاتا ہے۔ تو دوسروں کو کیا دکھائے گا۔

کلرک کو اپنے غلط انداز فکر پر غصہ آ گیا۔ اس نے حواس کو مجتمع کر کے اپنے اوپر تحقیقی نظر ڈالی کچھ سوچا اور بے آوازی سے بڑبڑایا کہ میں ہرگز گدھا نہیں ہوں —— وہ سوچ رہا تھا کہ گدھے کی ٹانگیں چار ہوتی ہیں لیکن اس کی ٹانگیں یقیناً دو ہیں اس نے باری باری اپنی ٹانگوں کو آگے بڑھا کر حرکت دیکر اور ٹٹول کر دیکھا وہ دو ہی تھیں، پھر اس کا ہاتھ اتفاقاً اپنے ایک کان سے جا لگا۔ یہ بھی بالکل چھوٹے چھوٹے، نازک نازک اور خوبصورت قسم کے انسانی کان تھے۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ وہ گدھا نہیں ہے۔ وہ جھلا رہا تھا کہ میں نے آپ اپنی توہین کیوں کی۔ مجھے اپنے آپ سے معافی مانگنی چاہئے —— مگر پھر اسے خیال آیا کہ جب میری زندگی بھی اسی طرح بے مصرف ہے جس طرح بہشتی کی، اور بہشتی کے گدھے کی۔ میری کائنات بھی کھانے کمانے تک ہی محدود ہے۔ تو میں اپنے آپ کو بہتر کیوں سمجھتا ہوں آخر وہ اپنی ذہنی کشمکش سے تنگ آ گیا اور اس نے عقلی دلائل سے الگ ہو کر آمرانہ انداز میں فیصلہ کر دیا کہ ممکن ہے میں انسان نہیں ہوں گا۔ لیکن میں ہرگز گدھا نہیں ہوں۔ کیونکہ یہ میں ہوں —— لوگ بہت سارے مسائل کو اسی طرح حل کیا کرتے ہیں۔ آخری الفاظ بد حواسی میں دماغ سے اس کی زبان پر منتقل ہو گئے —— اس نعرے کے ساتھ ہی بڑھیا کمرے میں داخل ہوئی اور گ

دیوی

مندر کے چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پجاریوں کے اژدہام سے لوگ آپس میں دھکے کھا رہے تھے۔ مقدس مندر میں ایک بت رکھا ہوا تھا جس کی پرستش کے لئے لوگ آ جا رہے تھے۔ سیتلا مندر کے نظارے سے جہاں مرد و عورت محض دکھاوے کی عبادت کے لئے جوق جوق جاتے ہیں۔ بارہا لطف اٹھاتا رہا۔ اور جب کبھی میں مندر کے قریب جاتا تو صرف اپنی آنکھوں کو خوبصورت اور حسین نظاروں سے شادکام کرتا اور بعض اوقات کسی کو بیش بہا ساڑھی میں ملبوس دیکھکر اپنے دل کی کمزوری کو محسوس کرتا۔ خاصکر اس وقت جبکہ ایک کمسن اور معصوم پجارن اپنے گداز جسم، چاند سا چہرہ، نازک اور رنگین لب، طلسمی آنکھیں اور گورے گورے رخسار پر سیاہ زلفوں کو بکھیر کر اپنی ایک خاص ادا سے بت کے سامنے ہاتھ جوڑ کر دوزانوں ہو جاتی تو میرا سر بھی اس کو دیکھتے ہی خود بخود نیچے کی طرف جھک جاتا۔

میں اپنی قسمت سے کھیل رہا تھا۔ ایک روز میرے دل میں اس کو دیکھتے ہی درد سا محسوس ہوا۔ گلا خشک ہوا جا رہا تھا۔ وہ مندر میں مذہبی الفاظ زیر لب گنگناتی رہی۔ میں نے بے ہوشی کے عالم میں اسے "دیوی" کہکر پکارا۔ اس نے ایک یا دو بار اپنی ترچھی نظر سے میرے دل کو مجروح کیا۔ لیکن اس کی نگاہ بے کوث تھی۔ اس کی نظر میں کوئی پیام نہ تھا بلکہ لاپرواہی۔

آرتی شروع ہوا۔ (بھجن ختم ہونے کے بعد جو گیت گایا جاتا ہے اُسے آرتی کہتے ہیں) میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھ پر گھبراہٹ سی طاری تھی۔ اور دل دھڑک رہا تھا لیکن اس نے میرا کوئی خیال نہ کیا۔ وہ اپنے ایشور کے دھیان میں اس قدر محو تھی کہ نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکی۔ وہ اس پاک اور مقدس جگہ کی بت بنی ہوئی تھی۔ پوجا ختم ہوا، اور تمام پجاری مقدس اپنے اپنے لوٹے میں پانی لینے کو آگے بڑھے۔ میں بھی پانی لینے کو جھکا۔ اس وقت ہم دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ دل نے خوشی محسوس کی۔ لیکن فوراً یہ مسرت فنا ہو گئی۔ پاک اور مقدس پانی دیوتا پر چھڑکا گیا۔ میں سراپا تصویر بنا ہوا تھا اور اسی عالم میں میرے ہاتھوں سے چند قطرہ پانی زمین پر گر پڑا۔ اتنے میں پنڈت آہستہ آہستہ کہنے لگا "امرت جل پھینک دیا گیا ہے۔ شگون خراب ہے"!

پنڈت کے اس چھوٹے سے جملے نے میری اس بے بہا کیفیت کو خوف سے بدل دیا۔ ناامیدی کے خیالات دل و دماغ میں گردش کرنے لگے۔ میں وہاں کھڑا پنڈت کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ اور نہ معلوم وہ تقدس مآب کس وقت وہاں سے غائب ہو گئی۔ میرے قدم ستون کی طرح ایک ہی جگہ جمے رہے۔ یہاں تک کہ مندر پجاریوں سے خالی ہو گیا۔ جہاں ایک گھنٹہ قبل پجاریوں کی گنگناہٹ سے فضا گونج رہی تھی اب وہاں بالکل سکوت طاری تھا۔ صرف چند پھیری کرنے والوں کی آواز فضا کی خاموشی کو پریشان کر رہی تھی۔ اور میں اسی طرح کھڑا سوچ رہا تھا۔ لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ کونسا خیال تھا۔

ـــ "تم کیسے ہو رمیش؟" میں چونک کر پیچھے کی طرف مڑا ہی تھا کہ۔ پھر سوال ہوا "تم اس قدر سست کیوں ہو؟" وہ مندر کے بوڑھے سادھو تھے۔ جن کے ساتھ ہمارے خاندانی تعلقات دوستانہ تھے۔ اور اس لئے میں انہیں بابو جی کہا کرتا۔ میں فوراً ان کی تعظیم کے لئے آگے بڑھا۔ اپنی حالت کو بھی سنبھالنے کی کوشش کی ـــــ "کس چنتا میں ہو بیٹا؟" انہوں نے دوبارہ پوچھا "بابو جی"۔ میں نے جواب دیا "کوئی چنتا نہیں بابو جی"۔ !ـــــ

"لیکن تم یہاں ہو اس حالت میں۔ ضرور کسی کشمکش میں پڑے ہو"۔ میں نے اپنی پریشانی کو پوشیدہ رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ لیکن بے سود۔ میری زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ کہ اتنے میں انہوں نے پھر مایوسانہ انداز میں کہا۔ خیر! اگر تم اپنے بابو جی کو کہنا نہیں چاہتے تو مجھے بھی ضد نہیں کروں گا۔ لیکن اگر کوئی پوشیدہ بات ہے تو ـــــ" اس نے پورا جملہ ختم بھی نہیں کیا تھا کہ وہی پنڈت جس نے مقدس پانی تقسیم کرتے وقت بدشگونی کا خوف دیا تھا

قریب آکر کہنے لگا۔" گروجی۔ مجھے تمام واقعات معلوم ہیں۔ یہ نوجوان دزدیدہ نگاہوں سے شاما کو دیکھ رہا تھا۔" سادھو کی شکل فوراً دوسرے رنگ میں تبدیل ہوگئی۔ کیونکہ وہ بھی اس کو جانتا تھا۔ ایک منٹ تک سادھو بالکل سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور پھر پنڈت کو، اس کے بعد فرش زمین پر نظر گرائے خاموش کھڑا دل میں شاما شاما کرتا رہا۔ کچھ وقفہ کے بعد سادھو نے قفل سکوت توڑتے ہوئے کہا۔" بال رام (پنڈت کا نام تھا) اچھا تم جاؤ۔" اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہوا۔ "رمیش تم اس لڑکی سے کس طرح واقف ہوئے؟" میں نے چونک کر سر اٹھایا۔ اور کانپتے ہوئے کہا۔" میں نے اسے یہیں مندر میں دیکھا ہے۔ اور کئی روز سے جان پہچان ہے ـــ لیکن بابوجی ـــ کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ وہ بدچلن ہے؟" سادھو نے سر کو جنبش دے کر نفی میں جواب دیا ـــ "تو پھر آپ ـــ" "نہیں"، اس نے میری بات کو کاٹتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اسکے بارے میں پوچھنے سے کیا فائدہ، تم وعدہ کرو کہ اس سے پھر دوبارہ نہیں ملوگے" ـــ "لیکن بابوجی! مجھے اس کی وجہ معلوم ہونی چاہئے۔ آخر کیوں نہیں"۔ میں نے مایوس کن الفاظ میں کہا ـــــ "تم وعدہ کرو رمیش۔ تمہاری بھلائی کے لئے کہتا ہوں"۔ میں اس کے اصرار سے آتش زیر پا ہونے لگا اور سختی کے ساتھ اس سے یوں مخاطب ہوا۔" مجھے وجہ ضرور معلوم ہونی چاہئے بابوجی۔ آپ ہمارے تعلقات کو توڑنے کی کوشش نہ کریں۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اور بہت زیادہ ـــــ" یہ سنتے ہی وہ لال پیلے ہو کر کہنے لگے۔ "اگر تم خوش رہنا چاہتے ہو تو اسے بھول جاؤ رمیش۔ تم دونوں مل کر آپس میں نہیں رہ سکتے۔" اب میں نے دیکھا کہ معاملہ خراب ہے۔ نرمی سے دریافت کیا۔" کیا وہ مالدار ہے بابوجی ـــ؟" "نہیں"۔ "تو کیا نیچ قوم سے ہے"؟ ـــ "نہیں"۔ ہر بات پر نہیں، نہیں تو آخر کیا برائی ہے۔ مجھے اس کے نہیں نہیں پر اور زیادہ غصہ آنے لگا۔ اور طیش میں آکر صاف صاف کہدیا کہ اگر اس میں کوئی عیب نہیں تو میرے اختیار سے باہر ہے کہ میں اسے بھول جاؤں۔ اور اس کے پاس سے چلا گیا۔

دن کی روشنی شام کے دھندلکے میں تبدیل ہو کر شب کی تاریکی میں کھو گئی۔ میں شاما کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ مجھے کچھ یاد نہیں کہ میری آنکھیں کس وقت بند ہوئیں۔ لیکن جب میری آنکھیں وا ہوئیں تو اس وقت کافی روشنی پھیل چکی تھی۔ سورج کی تیز کرنیں دریچہ سے گذر کر کمرہ کو منور کر رہی تھیں۔ میں فوراً مندر کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب وہاں پہونچا تو پجاریوں کے گروہ میں وہی حسین و جمیل مورت استادہ کسی کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے اشارہ کیا۔ اس کی نظر میری طرف اٹھی۔ لیکن دوشیزگی کی حیا اور لوگوں کے ہجوم نے اسے میری طرف ملتفت نہ ہونے دیا۔ اس نے مجھے کئی بار گھور گھور کر دیکھا۔ وہ دیکھ رہی تھی ـــ دیکھکر مسکرا رہی تھی۔ اور مسکراتے ہوئے لوگوں کی نظر بچاکر دوسری طرف جہاں کوئی نہ دیکھ سکے۔ جا کھڑی ہوئی ـــــ "نمستے!" میں نے اس کے قریب جاکر دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ شاما کچھ لمحہ سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ پھر سکوت کو توڑتے ہوئے۔ "نمستے" کہکر جواب دیا۔" ایک بات پوچھوں شاما؟" ـــــ "لیکن لوگ ہمیں دیکھ لیں گے۔" اس نے کہا۔" ذرا دیکھو تو سہی کہ ہم دونوں کتنے فاصلہ پر کھڑے ہیں۔ ہمیں کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا" ـــ "اگر کوئی ہمیں اس طرح دیکھ لے تو پھر غضب ہو جائے گا"۔ یہ کہتے ہوئے وہ مندر کی طرف چلی گئی۔ پوجا ختم ہونے کے بعد پجاری سب اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ اور شاما بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ میری نظروں سے پوشیدہ ہو گئی۔

گرمی کا موسم آیا۔ مندر میں پجاریوں نے آنا جانا کم کر دیا۔ صرف شام کے وقت ان لوگوں کا ہنگامہ ہو جایا کرتا۔ میں صبح کے وقت اپنے کالج کے راستہ پر شاما سے ملتا وہ "کنارٹ کالج" میں پڑھتی تھی۔ ادھر ادھر کی باتوں سے دل بہلاتا۔ اور کبھی کبھی ہم دونوں شب کی تاریکی میں لوگوں کی نظر سے بچتے بچاتے سینما دیکھ آتے۔

چونکہ میں مذہبی معاملہ میں حد سے زیادہ کور واقع ہوا تھا اور یہی وجہ تھی کہ جب کبھی مجھ پر کسی قسم کا واقعہ رونما ہوتا تو کوئی نہ کوئی مصیبت آن پڑتی۔ ایک دن یہی ہوا کہ جب میں کالج سے واپس آکر گھر کے صحن سے گذر رہا تھا ایک کالی بلی میرے سامنے سے گذری۔ میرے دماغ میں فوراً یہ خیال پیدا ہوا کہ کوئی خطرہ ہونے والا ہے۔ دل بیٹھا جا رہا تھا۔ عین اسی وقت شاما یاد آئی۔ اپنی کتابیں میز پر رکھکر شاما سے ملاقات کو جو نہی کھوکی

طرف چلا کہ پتا نے اپنے کمرے سے مجھے آواز دی۔ میرا دل دھک سے ہو گیا۔ کیونکہ خلاف معمول واقعہ تھا۔ کلیجہ بلیوں اچھلنے لگا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کمرہ کی طرف قدم بڑھایا۔ پاس پہنچکر وہاں کا منظر دیکھتے ہی ہاتھ کے طوطے اڑ گئے۔ سادھو، ماتا اور پتا بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ اور پتا غصّہ میں آنکھیں لال پیلی کئے گھورے تھے۔ سادھو کا حاضر ہونا۔ اور پتا کو خفگی کی حالت میں دیکھکر میرے دماغ میں معًا یہ خیال پیدا ہوا کہ ہو نہ ہو حزبیب شاما ہی کے بارے میں کوئی بات ضرور ہے۔ میرے دماغ میں طرح طرح کے خیالات گردش کر رہے تھے۔ کہ اتنے میں "بیٹھ جاؤ" سادھو کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ اور گذشتہ واقعات مجھے سنانے لگا — "رمیش تم اپنے پتا سے منّت و سماجت کرو کہ تمہارے گناہ کو معاف کر دیں"۔ اس کے بعد کمرہ میں خاموشی چھا گئی — "گناہ —"! میں نے تعجب سے کہا "مجھ سے کون سا گناہ سرزد ہوا ہے جس کی آپ کو شکایت ہے؟" — میں نے شکایت کی ہے؟ سادھو نے غصّہ میں کہا "کیا تم اس لڑکی سے محبت نہیں کرتے۔ آوارہ اور ناپاک شاما سے —؟" "ہاں۔ میں محبت کرتا ہوں۔ لیکن —" میں نے غصّہ کو ضبط کیا — "میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بہت شوخ اور بدزبان ہوئے جا رہے ہو"۔ میری طرف دیکھتے ہوئے کرخت آواز میں کہنے لگا — "کیا تمہیں اپنے خاندان کی بدنامی کا کوئی دھیان نہیں — بےشرم، بےحیا — تم اپنے گناہ میں پورے خاندان کو غرق کرنا چاہتے ہو — گنہگار — بدکار" "میں گنہگار نہیں اور نہ شاما"۔ میں نے جوش میں دلیری سے جواب دیا: "محبت ہر آدمی کے دل میں ہوتی ہے۔ جس کے دل میں محبت کا جذبہ نہیں وہ انسانیت سے خارج ہے۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور سچی محبت — سچی محبت"۔ سادھو نے گرجتے ہوئے کہا "میں تمہارے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں ایک دن پنڈت نے بھی تمہیں اس آوارہ لڑکی کو گھور گھور کر دیکھتے ہوئے دیکھا ہے۔ تم جانتے ہو رمیش کہ کسی غیر استری کو اس طرح دیکھنا گناہ ہے" — "گناہ —! کیسا گناہ؟" میں نے سوال کیا — "گناہ — پاپ ہے — پاپ! اور ہر طرح کی برائی"۔ سادھو نے میرے پتا کی طرف گھورتے ہوئے کہا — "اگر سچی محبت" میں نے آپے سے باہر ہو کر کہا "اگر سچی محبت اور بے لوث نگاہ پاپ ہے، تو پھر اس جگت میں کس سے پاپ نہیں ہوتا، سبھی پاپی ہیں۔ مگر پاپ کو پاپ سمجھکر اس پر پشیمان ہونا اور پُن کو پُن جانکر اس میں ایک خوشی محسوس کرنا دل کی سچائی کی نشانی ہے"۔ میرے ان الفاظ کو سُنکر سبھوں کو سکتہ ہو گیا۔ سادھو کچھ اور زیادہ کہنا چاہتا تھا لیکن صرف "وہ لڑکی" کہکر رُک گیا۔ شاید کوئی اور بات تھی۔ جس کے اظہار میں وہ جھجک گیا۔ اور باتیں بدل کر یوں کہنے لگا۔ "رمیش بہت اچھا لڑکا ہے۔ اب سنبھل جائے گا۔ میں اسے راہ راست پر لے آؤں گا" — "لیکن گرو جی" پتا بھی نرمی سے کہنے لگے۔ "مجھے اس سے ایسی امید نہیں تھی۔ اس زمانے کی اولاد کو اپنی اور اپنے خاندان کے ننگ و ناموس کی پرواہ نہیں ہوتی۔ پھر میری طرف مخاطب ہو کر "رمیش میں نے تمہاری پرورش کی، ناز و نعم میں رکھا، پڑھایا لکھایا۔ کیوں، اور کس لئے؟ کیا اسی دن کے لئے کہ آگے چلکر بدچلن ہو جاؤ؟ کیا اسی لئے کہ اپنے خاندان کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ لگاؤ؟ — افسوس —"! میں نے اس وقت خاموش رہنا بہتر سمجھا۔ اور اٹھکر باہر جانے ہی کو تھا کہ پتا جی نے پھر کہنا شروع کیا۔ "سانپ بہت ہی خوبصورت ہوتا ہے۔ جانتے ہو رمیش؟ لیکن اس کا چمکدار پوست اس کے زہر کو نہیں مار سکتا۔ اس کی فطرت میں ہے کہ جسے چاہے ڈس دے ٹھیک اسی طرح ایک غیر عورت جو گرچہ دیکھنے میں معصوم اور بھولی بھالی معلوم ہوتی ہو۔ لیکن اپنی فطرت سے کبھی باز نہیں آ سکتی"۔

اب میں سوچ رہا تھا کہ آخر پتا جی کو کیا جواب دوں۔ ایک طرف شاما کی محبت، دوسری طرف پتا کی اطاعت میرے دل میں اس کی محبت گھر کر چکی تھی۔ وہ میری اور میں اس کا ہو چکا تھا۔ اس وقت مجھ پر جو گذر رہا تھا۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ میں بہت مایوس ہو کر وہاں سے اٹھا اور اپنے ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ میں اسی خیال میں کھویا ہوا تھا کہ پتا کو کس طرح تسلّی دوں۔ کبھی شاما کی یاد دل کو بےچین کرتی۔ اور کبھی پتا کے وہ الفاظ کہ سانپ اور عورت کی خصلت میں کوئی فرق نہیں — کیا تم اس لڑکی سے ملکر اپنے خاندان کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگانا چاہتے ہو — میرے کانوں میں بازگشت کر رہی تھی۔ عجب کشمکش میں تھا۔ رات اختر شماری میں گذرتی اور دن سوچ فکر میں ختم ہو جاتا۔ لیکن دل ہے کہ شاما کو نہیں بھلاتا۔ اور پتا کے سوال کا جواب بھی ذہن میں نہیں آتا۔ لیکن پتا کے الفاظ "عورت اپنی خصلت سے باز نہیں آ سکتی"۔ میرے دل پر نقش کر گئے تھے۔ میں اس کو حقیقت کی کسوٹی پر پرکھنے کا مشتاق اور شاما کی ملاقات کا آرزومند ہو گیا۔

چند روز میں شاما سے نہیں مل سکا۔ کئی دن بعد جب میں اس کے مکان کی طرف گیا تو میرے ہوش اڑ گئے۔ اس کا دروازہ مقفّل تھا۔ ایک ضعیف عورت اُدھر سے گذر رہی تھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ مجسٹریٹ کے حکم سے اپنا مکان چھوڑ کر مسوری چلی گئی ہے۔ "مجسٹریٹ" میں نے دل میں کہا۔ "ضرور میرے پتا کی کارروائی ہے۔ وہ بھی تو مجسٹریٹ ہیں۔" اور مایوسی کی حالت میں گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ دو دن بعد میرا نوکر دروازہ پر دستک دیتے ہوئے ہاتھ میں ایک لفافہ لئے اندر داخل ہوا۔ میں دیکھتے ہی خوشی سے اچھل پڑا۔ "شاید شاما کا خط ہے۔" میرے منہ سے بے ساختہ ہی نکلا۔ اس کے بعد مہر پر نظر پڑی۔ "مسوری" لکھا تھا۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُسے چاک کیا۔ اور حسرت بھری نظروں سے پڑھنے لگا۔

مسوری
۲۴/اکتوبر ۲۶ء

نمستے ــــ! پیارے فالگا تمہیں سب کچھ معلوم ہو گیا ہوگا۔ رمیش! میں کسی کو بدنام کرنا نہیں چاہتی۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں اور ہمیشہ کرتی رہوں گی۔ لیکن ــــ! لیکن ــــ!! رمیش میری خاطر اپنے پتا کو ناراض نہ کرو۔ انہیں تم سے شکایت ہے۔ اُن کی خوشی تمہارے لئے باعث فخر ہوگی ــــ اور ــــ اور میرے لئے بھی۔ مجھے وشواش ہے کہ تم مجھے بھول جانے کی کوشش کروگے۔

تمہاری شاما

اب میرے دل میں یہ کھلبلی پیدا ہونے لگی کہ کب کالج کی تعطیل ہو کہ مسوری جا کر اپنی شاما سے جا ملوں۔ پھر یہ خیال پیدا ہوتا کہ اس نے تو اپنا پتہ نہیں بتایا۔ مسوری کے کس کونے میں مقیم ہے۔ اسی خیال میں کھویا کھویا سا رہتا۔ اور کبھی اس کے خط کو بار بار پڑھ کر پھولا نہیں سماتا۔ ایک روز ــــ ہفتہ ــــ دو ہفتہ۔ آخر مہینہ بھی گذر گیا۔ اور میرے تعطیل کا وقت آ گیا۔ میں اپنے پتا سے سیر کی غرض سے فرصت لیکر سیدھا مسوری جا پہونچا۔

کرسمس کا زمانہ، مسوری دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ جہاں دیکھو روشنی، قسم قسم کی خوشنما بجلیاں، قمقمے اور بڑے بڑے امیروں کے مکانات پھول پتوں سے آراستہ تھے۔ میں شاما کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھومتا لیکن شاما نہ ملی۔ ملنے کی امید میں ہر روز چاروں طرف گشت لگاتا۔ آج نہیں کل، کل نہیں پرسوں ملیگی۔ اور ضرور ملیگی۔ اسی طرح دن پر دن گذر گئے۔ ایک روز میں لاہور جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ شاما کی یاد میرے دل میں چٹکیاں لینے لگی۔ اور جانے کا خیال دل سے نکال دیا۔ شام کے وقت ہر روز کی طرح گھومنے چلا گیا۔ جب میں سیر سے واپس آیا تو کمرہ میں ایک لفافہ پڑا پایا۔ خط کیا تھا موت کا پیغام تھا۔ "میں اس اولاد کا چہرہ دوبارہ دیکھنا نہیں چاہتا۔ جو اپنے پتا کو دھوکہ دے۔ تم اس قدر بے حیا اور نڈر ہو گئے کہ مجھکو فریب دے کر اس لڑکی کی تلاش میں دن دن بھر خانہ بدوش کی طرح مارے مارے پھرتے ہو ــــ آج سے نہ میں تمہارا پتا۔ اور نہ تم میرے پُتر ــــ میں اب تمہاری محبت اور پیار بھلانے کی کوشش کروں گا۔ اور یہی جانوں گا کہ دنیا میں میری کوئی اولاد ہی نہیں ــــ" میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ سر چکرانے لگا۔ اور اسی حالت میں مجھے نیند آ گئی۔

وقت گذرتا گیا لیکن شاما کہیں نہ ملی۔ اسی دوران میں میرے پتا کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب میرا کوئی نہ تھا۔ ماتا جی کو مسوری آنے سے پہلے ایشور نے اس سنسار سے اٹھا لیا تھا۔ اس لئے میں مسوری میں ایک جگہ نوکری کرنے لگا۔ کام سے فارغ ہو کر فرصت کے وقت خانہ بدوشوں کی طرح اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا۔ ایک روز شاما کے خیال میں محو راستے سے گذر رہا تھا کہ موٹر کی گھڑگھڑاہٹ نے چونکا دیا۔ پلٹ کر جو دیکھا تو ایک افسردہ چہرہ، بیش بہا ساڑی میں ملبوس، پیچھے تکیہ کئے خاموش بیٹھی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ میری شاما تھی۔ دوسرے روز میں اسی جگہ گاڑی کے انتظار میں کھڑا رہا۔ موٹر آئی اور پاس سے گذر گئی۔ اب میں اچھی طرح پہچان گیا۔ میں اسی جگہ بُت بنا کھڑا رہا جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو

شام ہو چلی تھی۔ سورج افق میں منہ چھپا رہا تھا۔ اور چاند اپنے چہرہ سے نقاب آہستہ آہستہ اٹھا کر کرۂ زمین پر اپنی روشنی پھیلا رہا تھا ستارے استقبال کے لئے شام ہی سے آسمان پر جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ میں اپنے کمرہ کو واپس آیا۔ طرح طرح کے خیالات دماغ میں گردش کرنے لگے۔ کہ کسی کی آہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک شخص ہاتھ میں لفافہ لئے کھڑا ہے۔ میں نے بڑھ کر لفافہ لیا اور پڑھنے لگا۔

پیارے رمیش! میں کئی بار تمہیں دیکھ چکی ہوں۔ اپنے نوکر کو پیچھے لگا کر تمہارا پتہ معلوم کر لیا تھا۔ میرے یہاں چائے کی دعوت ہے۔ تم یہ خیال نہ کرو کہ بہت سے لوگ ہوں گے۔ نہیں رمیش! صرف تم اور میں ـــــ میں آج شام کو ۹ بجے سوری بلڈنگ میں انتظار کروں گی۔

تمہاری شاما

ابھی نو بجنے کو کئی گھنٹے باقی تھے۔ میں بےچینی سے وقت کا انتظار کرنے لگا۔ جی تو یہی چاہتا تھا کہ گھڑی کی سوئی تیز کر دوں۔ لیکن پھر خیال ہوا کہ شاما کے پاس بھی گھڑی ہو گی تو ـــــ وقت کاٹنے کے لئے کمرہ میں ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ٹہل لگاتا رہا۔ گھڑیال نے سات بجائے آٹھ ـــ پھر نو ـــ نو کا بجنا تھا کہ میں زینہ سے بڑی تیزی سے اُترا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ایک کشش ہے جو مجھے کھینچے لئے جا رہی ہے۔ جب قریب پہونچا تو ایک عالیشان کوٹھی نظر آئی۔ "سوری بلڈنگ" دیکھا۔ وہی قاصد قبل سے میرے انتظار میں کھڑا راستہ تک رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی "آئیے بابو جی" کہتے ہوئے زینہ پر سے ہوتا ہوا ایک کمرہ میں لے گیا۔

کمرہ بہت قرینہ سے سجا ہوا تھا۔ چاروں طرف قیمتی قدآدم تصاویر اور آئینے دیواروں پر لگے ہوئے تھے۔ فرش پر لچکدار صوفے، پلنگ، فینسی اور صاف ستھرے میز کرسیاں اپنی اپنی جگہ پر رکھی ہوئی تھیں۔ میں کمرہ کے ہر چیز کو ایک ایک کر کے دیکھ رہا تھا۔ کہ اچانک میری نظر ایک تصویر پر جا پڑی۔ وہ میری ہی تصویر تھی، میں اسے دیکھتا رہا۔ نظر ابتک اسی پر جمی ہوئی تھی کہ اتنے میں کمرہ کا دوسرا دروازہ کھلا اور سامنے کا رنگین پردہ ہٹا۔ شاما کھڑی مسکرا رہی تھی۔ نظر ملتے ہی دوڑی آئی اور مجھ سے چمٹ گئی۔ دونوں کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو موتی کی طرح چمکنے لگے۔ "آج میں بہت خوش ہوں رمیش ـــ" شاما خاموشی کو دور کرتی ہوئی بولی ـــ "لیکن شاما ـــ کیا تم ابتک مجھ سے محبت کرتی ہو؟ کہتا ہوا میز پر بیٹھ گیا۔ شاما کچھ دیر میری طرف بنظر عمیق دیکھ کر بولی۔ "رمیش اگر برا نہ مانو تو ایک بات کہوں ـــ" "کہو شاما۔ اگر میں تمہاری باتوں سے نفرت کرتا تو تم مجھے دوبارہ نہیں دیکھ سکتیں۔ تمہاری اور صرف تمہاری ہی خاطر اپنے ماتا پتا کی باتوں کو ٹھکرا دیا ـــ" "لیکن ـــ" اس نے بہت مایوس ہو کر کہا ـــ "لیکن میری داستان سننے کے بعد تم مجھے حقارت کی نظر سے دیکھنے لگو گے ـــ" "نہیں شاما" میں نے الفاظ پر زور دے کر کہا۔ "میں سوگند کھا کر کہتا ہوں شاما کہ میں اپنی زندگی تمہاری خاطر وقف کر چکا ہوں"۔ اس کو کچھ کچھ یقین سا ہوا۔ اور کہنے لگی "سنو رمیش"۔ بڑی افسردہ اور مدھم آواز میں کہہ کر چند منٹ کے لئے خاموش ہو گئی۔ اور پھر مخاطب ہوئی "جب میں بالکل چھوٹی کوئی سات آٹھ سال کی تھی کہ پتا جی مجھ سے جدا ہو گئے۔ ماتا بالکل بے آکاش کے نیچے اس خود غرض سنسار میں بے سہارا ہو گئیں۔ قریب کے ہوٹل میں مصالحہ پیس کر اور پلیٹ وغیرہ دھو کر چار سال تک میری پرورش کرتی رہی جوانی دیوانی ـــ عمر اس وقت کوئی بیس اکیس کی تھی۔ پیسے کو بہت چاہتی تھی۔ اور کیوں نہ چاہے۔ دنیا اسی پر جان دیتی ہے۔ ہوٹل والا میری ماتا کو پیسے کا لالچ دینے لگا۔ اسی لالچ میں ماتا نے سوری میں پوشیدہ طور پر طوائف کا پیشہ اختیار کر لیا۔ لیکن چند ماہ بعد اس نے غلیظ اور گھمسان آبادی میں رہنا پسند نہ کیا۔ مجھے یہاں چھوڑ کر لاہور چلی گئی۔ اور دو سال تک ہر مہینہ خرچ بھیجتی رہی۔ وہاں کے مندر میں وہ ہر روز پوجا کیلئے جاتی۔ رفتہ رفتہ سادھو سے جان پہچان ہو گئی۔ لیکن یہ راز سادھو پر بھی افشا ہو گیا۔ ماتا شرم سے پھر گجرات چلی گئی۔ لیکن مجھے نہیں معلوم تھا۔ جب میرا اسکول پوجا میں بند ہوا تو میں لاہور چلی گئی۔ وہاں ماتا کو نہ پا کر سادھو سے دریافت کیا تو یہ معلوم ہوا کہ وہ گجرات چلی گئی ہے۔ سادھو پر تو ماتا کا راز کھل ہی چکا تھا اس لئے وہ تمہیں مجھ سے ملنے کو روکتے تھے۔ جب ہم دونوں کی محبت اس پر ظاہر ہو گئی تو تمہارے پتا نے جو کہ ایک مجسٹریٹ تھے

میرے اصلی مقام (مسوری) واپس جانے کو مجبور کیا۔ لیکن تم دشواش کرو رتیش! کہ مجھے اتنی مہلت نہیں دی گئی کہ تمہیں ایک نظر دیکھ لیتی اور اپنی مجبوری دیپتہ سے آگاہ کر دیتی۔ لیکن بھگوان کی مرضی کو کون روک سکتا ہے۔ آخر ہم دونوں کی محبت ایک دوسرے سے آ ملی ـــــ لیکن رتیش! اس کے بعد ماتا جی کا کوئی پتہ نہ لگا۔ ایشور انہیں شانتی دے۔ اس نے میری زندگی گزارنے کے لئے یہ مکان جس میں ہم بیٹھے ہیں۔ پتا کے مرنے کے بعد بنوایا تھا۔ اتنا کہکر وہ خاموش ہو گئی۔ جب میں نے نظر اٹھایا تو دیکھا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے۔ میں نے بہت کچھ دلاسا دیا اور کہا "لیکن تم تو پاک دامن ہو شاما"۔ بڑی دیر کے بعد جب اس کی ہچکی بند ہوئی تو نوکر کو چائے لانے کا حکم دیا۔ چائے پینے کے بعد میں شاما سے وقتی طور پر جدا ہو گیا۔ لیکن دوسرے روز ہم دونوں کی شادی ہو گئی۔

چونکہ میرے بھی ماتا پتا مر چکے تھے۔ اس لئے گرمی میں لاہور ہوا کی تبدیلی کی غرض سے گیا ہوا تھا۔ شاما کی سہیلیاں اس سے روز ملنے آتیں۔ ان لوگوں کو شادی کے متعلق معلوم ہو گیا۔ یہاں تک کہ سادھو اور پنڈت کو بھی خبر پہونچ گئی۔ ایک روز ہم دونوں مندر میں گئے تو دیکھا کہ سادھو اور پنڈت غضب آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ مجھے ان لوگوں پر بہت زوروں سے ہنسی آئی۔ تمام پجاری میری طرف مبہوت ہو کر دیکھنے لگے۔ میں شاما کو ساتھ لیکر "نمستے گروجی" کہتا ہوا مندر سے باہر نکل آیا۔

محمد علی قیصر انصاری

غزل ۱۹۳۳ء

شکستہ سازِ ہستی میں مرے اک سوز پنہاں ہے ‖ مرا تاریک مستقبل خود ایک ماہِ درخشاں ہے

بلاؤں سے ہویدا صورتِ عیشِ فراواں ہے ‖ شبِ فرقت کی وادی میں نمودِ صبحِ خنداں ہے

مری خاموش راتوں میں سکونِ قلبِ مضطر ہے ‖ مرے پُرشور نالوں میں مسرت آج رقصاں ہے

مرے بے کیف لمحوں میں ہجومِ شادمانی ہے ‖ مرے دلسوز نغموں میں ترنم آج خنداں ہے

مری تاریک دنیا میں ضیا باری ہے رحمت کی ‖ مرے ٹوٹے ہوئے دل میں وفورِ شوقِ مہماں ہے

مجھے شامِ مصیبت اب نویدِ صبحِ عشرت ہے ‖ مرے ظلمتکدے میں ضو فشاں اب مہرِ تاباں ہے

دیارِ مرگ میں اب پھر شمیمِ زندگی آئی ‖ کہ ہنگامِ نزع میں آج وہ مائل بہ درماں ہے

نرالی شان میں اختر ہے شکووں کی یہ عریانی
یوں روداد ستم کہکر تخیل خود پشیماں ہے

از سعیدہ خاتون (زوجہ پروفیسر عبدالرحیم)

گاتا - دادرا نعتیہ

غزل

شاخ گل پر یہ شور ہزار ہے — باغ وحدت میں آئی بہار ہے
سارے جلووں میں ایک ہی شرار ہے — طائروں میں بھی اک ہی پکار ہے
زار یہ دل ہے یا دل نزار ہے — اپنے پیارے نبی پر نثار ہے
عرش پر دم میں کیسے پہونچ گیا — دیکھئے تو یہ کیسا سوار... ہے
نور سینا سے زائد برستا ہے — کوہ فاراں سے بڑھکر مزار ہے
اب دم ہے لبوں پر تو جلد آ — بس فقط تیرا ہی انتظار ہے
دونوں عالم میں کوئی نہ پائے گا — میری نظروں میں ایسا نگار ہے
ابر رحمت کے چھینٹے ہیں خوب ہی — دیکھو رحمت کی پڑتی پھوار ہے

تھک گیا یہ سفر دور کا سلیم
سر پر گیا کم گناہوں کا بار ہے

سلیم فہمی

ایک بنگلہ گیت کا ترجمہ

اندھیاری رات کے دامن میں رچکے سے آکر من مندر میں
جو دل کی باتیں بول گئے تھے۔ آج مجھے سب یاد آتی ہیں
اس دن میرے نینوں میں۔ کتنے میٹھے سپنے آئے
جوہی، بیلا کتنے ہیں پھول۔ باغ میں کھل کھل ہنستے تھے
پریم دیا اس دن جو جلی تھی۔ دھیرے دھیرے بجھنے لگی ہے
گیت مرا آہ! واپس آیا۔ کوئی نہیں ہے پوچھنے والا
پھاگن کی پھر رتیاں آئیں۔ پریم کا دیپ نہیں پر جلتا
آکاش پہ تارے کھل نکلے۔ میں جاگ رہی ہوں ان کے سنگ

خالدہ خورجمیل

"سائے"

زندگی کے وہ دن! وہ خوشگوار ایام! اب بھی ان کی یاد سے میرا دل بھر آتا ہے۔ آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے ہیں ان کی یاد ایک مستقل چبھن سی بن کر رہ گئی ہے۔ جو ہر دم میرے دل کو بیتاب اور بے کل کئے رہتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہاں گئے وہ دن! وہ لوگ! اور دل کہتا ہے ——— ارے احمق، دن ڈھل گئے نا۔ اب سائے کہاں ملیں گے تجھے۔ تیرگی میں سائے بھی تو ساتھ چھوڑ دیا کرتے ہیں ——— وہ دن میری نگاہوں میں اس طرح گھومتے ہیں جیسے وہ دن بیتے نہیں ہیں۔ میں ان ہی ایام میں گھوم پھر رہا ہوں۔ سانس لے رہا ہوں۔ وہی ان تو ہیں، وہی لوگ تو۔ یہ تو اسلم صاحب! اور یہ اپنے اطہر۔ اور یہ میرے گہرے دوست غضنفر علی کتنے مخلص ہیں یہ میرے دوست! میری زندگی کے رفیق۔ اف! زندگی ان کے بغیر گذرے گی کس طرح! اور پھر میرا تصور ماضی کے ایک اور رنگین ورق کو الٹ دیتا ہے ——— ہاں آج دعوت ہے۔ میرے تینوں دوست ادھر اُدھر سرگرم کار ہیں۔ دیکھنا اطہر کوئی شکایت ہونے نہ پائے۔ محفل رقص و سرود جاری ہے۔ ہر طرف ہما ہمی ہے۔ اور میری ثنا خوانی ہر طرف ہر کی زبان پر جاری ہے۔ واہ نجمی صاحب — واہ واہ۔ اور اسی طرح ماضی کے تمام پردے ایک ایک کرکے میری نگاہوں کے سامنے اٹھتے جاتے ہیں۔ اور میں گم صم، بت بنا سینما کے پردۂ سیمیں کی طرح ایک ایک پردے پر اپنے ماضی کے نقوش کو مرتسم پاتا ہوں۔ یہ نقوش میری حیات کے بہت اہم اجزا ہیں۔ انہیں میں کس طرح بھول جاؤں! یہ میرے بس کی بھی تو بات نہیں، لوگ کہتے ہیں! ——— نجمی کا دماغ الٹ گیا ہے۔ اور کیسے نہ دماغ خراب ہو بیچارے کا۔ اتنی بڑی دولت پلک جھپکتے فنا ہوگئی۔ اور اس کا اثر اس کے دماغ پر نہ پڑے تعجب وہ بچ کیسے رہا ہے۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ اس کے گہرے دوستوں نے بھی جو ہر دم جان سپاری کا دعوٰی کیا کرتے تھے کیسی آنکھیں پھیر لی ہیں۔

لوگوں کی باتوں کو بس خاموشی سے سنتا ہوں۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہیں۔ اور پھر کوئی بھولی بسری بات میرے دماغ کے پردے پر اُجاگر ہو جاتی ہے۔ اس پردے پر میں اپنے دوست خان بہادر غضنفر علی کو دیکھتا ہوں جو مجھے کہہ رہے ہیں۔ زندگی میں ایسی صحبتیں کہاں ملتی ہیں۔

یہ ہم جنس، رنگیں محفلیں، یہ قہقہے، یہ طرب و نشاط، یہی تو زندگی ہے، اسی کا نام تو حیات ہے۔ اور اس کے بعد بھی آپ ہی آپ اسی پردے پر ایسے نقوش بھی ابھرتے نظر آتے ہیں۔ جن کو دیکھ کر میرا دل لرز جاتا ہے۔ کانپ اٹھتا ہے۔ تجارت کی تباہی، تمام اشیاء پر مہاجنوں کا تسلّط۔ اور پھر اُف! غضنفر علی کی طعن آمیز مسکراہٹ، جھوٹی تسلی۔ میں ان باتوں کو خود سے نہیں سوچتا۔ یہ خیالات اور یہ تصورات آپ ہی آپ بیٹھے ہوئے یکے بعد دیگرے ترتیب وار نظروں تلے گذرتے چلے جاتے ہیں۔ اور میں مدہوش ٹکٹکی باندھے انہیں دیکھتا چلا جاتا ہوں۔

کل میرے بڑے داماد منشی علی کریم آئے۔ کہنے لگے حضور، آپ ہمت سے کام لیں۔ تجارت خراب ہوگئی۔ تو پرواہ کا ہے کی میرے پاس ردی کے زیورات ہیں۔ جن کی قیمت آج کل دو ہزار سے کم نہ ہوں گی۔ آپ انہیں کو لیکر پھر تجارت شروع کیجئے۔ پھر خدا دے گا میں تو پہلے ہی خائف تھا کہ یہ غضنفر اور اسلم جتنے ہیں ظاہر میں جی حضور کہتے ہیں۔ جی بھائی کہتے ہیں۔ پر باطن اللہ کا ایک ہے ان کی باتیں ظاہر میں میٹھی ہوتی تھیں۔ پر حضورات کی شیرینیت میں زہر کی آمیزش تھی۔ پر تو میں پہلے ہی سے جانتا تھا۔ اور آپ کو

یاد ہوگا کہ میں نے دبے لفظوں میں آپ کو سمجھایا بھی تھا، پر آپ نہ مانے۔ آپ نے اسی غصہ میں اپنی بیٹی کو گھر سے نکل جانے کو کہا۔ پر حقیقت عیاں ہو کر رہتی ہے۔ آپ نے میرے خلاف تمام باتیں پھیلائیں۔ پر میں خاموش رہ گیا۔

اور انہوں نے زیورات کے صندوق میرے سامنے رکھدئے، میں بے اختیار ہوگیا۔ میری ہچکی بندھ گئی۔ میں ان سے لپٹ گیا میں نے کہا معاف کردو میرے عزیز۔ میں نے تمہارا بہت دل دکھایا۔ میں نے اب تک تم لوگوں کے ساتھ بہت ظلم کیا اور میرے حیرت کی انتہا نہ رہی جبکہ علی کریم نے میرے قدموں کو چوم لیا۔ اور بولے آپ بزرگ ہیں آپ نے غلطی کی۔ کی۔ اب اس پر تاسف بے کار ہے میں نے سچے دل سے معاف کر دیا۔ میں نے انہیں زیورات تو باصرار واپس کر دئے۔ وہ کچھ ملول سے ہوگئے۔ اور پھر انہوں نے کچھ سوچا اور ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

میری غم آلود زندگی کے دن اسی طرح سوچ وبچار میں گذر رہے تھے۔ کہ یکایک میری نگاہ ایک اشتہار پر پڑی۔ "بجی اینڈ کو" اور تفصیل معلوم کرنے کے بعد میں انگشت بدنداں رہ گیا ——— علی کریم نے اپنی زیورات کو فروخت کرکے میرے نام پر ایک تجارت کی بنیاد ڈال دی تھی۔ اور ماضی کے واقعات نے ایک بار پھر شدّت سے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور میں مدہوش سا ہوگیا۔ پچھلے تمام واقعات ایک ایک کرکے یاد آنے لگے۔ علی کریم کے ساتھ بد سلوکی۔ اپنی بیٹی روحی کو گھر سے نکل جانے کو کہنا۔ علی کریم کی شکایات۔ پناہ بخدا! میرا دل رنج وغم میں ڈوب گیا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اور میں دنیا ومافیہا سے بے خبر سا ماضی پر آنسو بہاتا رہا ——— بہاتا رہا تاآنکہ روحی نے میرے کندھوں پر اپنے محبت بھرے ہاتھوں کو رکھدیا اور اپنے دامن سے آنسو پونچھتی ہوئی بولی ———

آپ نہیں جانتے کہ دن کے ڈھل جانے کے بعد جب تیرگی سارے عالم پر محیط ہوجاتی ہے تو سائے بھی غائب ہوجاتے ہیں۔ آپ ان دوستوں پر کتنا غم کریں گے۔ اب اپنے آنسو پونچھ ڈالئے۔ اور میں جو ہوں ایک صحیح معنوں میں دولت اور اس نے مسکرا دیا۔ اور میں نے دیکھا کہ روحی کی ان بڑی بڑی ہرن جیسی آنکھوں میں محبت کی بے پناہ موجیں متلاطم ہیں۔ اور میں نے اپنے تمام رنج وملال کو پرے پھینک کر، اپنے آپ کو ان موجوں کے سپرد کر دیا۔

ربط ہاشمی

رُباعیات

کہتے ہو غلط کہ رشکِ جنت ہے سماج
انساں کے لئے خدا کی نعمت ہے سماج
جلتے ہوئے دو دلوں کو دیکھا ہے کبھی؟
ہشیار کہ دوزخ مصیبت ہے سماج

دنیا کی یہ رسم یہ روایت توبہ
ابنائے زماں کی یہ شرارت توبہ
معصوم دلوں کی بھی محبت ہے گناہ
توبہ توبہ جہان نفرت توبہ

پرویز شاہدی

محبّت کا تحفہ

اس کے ڈرائنگ روم میں ایک خوبصورت پھولوں کا گلدستہ اپنی ہمہ رعنائیوں کے ساتھ جلوہ نما تھا۔ لوگ برابر اسے دیکھتے، وہ ویسا ہی شاداب تھا۔ سب محوحیرت تھے کہ یہ مُرجھاتا کیوں نہیں۔ کسی نے کہا کہ "یہ بہشتی پودے کا پھول ہے۔" بعض نے کہا کہ یہ کوئی طلسم! اکثر نے کہا یہ کوئی لافانی شے ہے۔ بعض نے کہا کیا یہ تحفہ بہاریں ہے!

شاعر اسے غم والم کا پیام سمجھ رہے تھے۔ خوش وخرم لوگ اسے مسرّت وخوشی کا مجموعہ تصور کرتے، دنیا اسے ایک عجیب تماشا خیال کر رہی تھی۔ لیکن اصل راز کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا۔ وہ ایک محبت کا تحفہ تھا جو محمود نے اپنی پیاری صبیحہ کو دیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے سے محبّت وخلوص کا عہد کیا تھا۔ اور اس پر وہ ثابت قدم تھے۔ اس لئے صرف ان دونوں کی نظروں میں شاداب نہیں بلکہ دنیا والوں نے بھی انہیں ہمیشہ شاداب دیکھا۔ نورانی فرشتے اس کی حفاظت کرتے اور محبّت کے پھولوں کو مُرجھانے نہیں دیتے۔

مسز محمد علی خاںؒ

جذبات دل

اے فلک وہ بحر خوبی کا شناور کیا ہوا
قلزم وحلم وحیا کا تھا جو گوہر کیا ہوا

جس کے جلوں سے تھا دل روشن وہ دلبر کیا ہوا
وہ سپہر حسن کا ماہ منور کیا ہوا

میرے دل کا چاند یارب چھپ گیا زیر زمیں
رونق بزم تمنا ہوگئی خلوت نشیں

میری دنیا ہے اندھیری روشنی باقی نہیں
بزم والو وہ جمال شمع پرور کیا ہوا

کیوں گلستان جہاں پر چھاگئی غم کی گھٹا
سنبل پیچاں نے بال اپنا پریشاں کردیا

غم میں تیرے چشم نرگس خاک اُڑاتی ہے صبا
گلکدے کا میرے یارب وہ گل تر کیا ہوا

روز وشب ہے اب حلیمہ خستہ دل کی یہ دُعا
مغفرت کر اس کی یارب بہر شاہ کربلا

گلشن فردوس میں مسکن ہو اس مرحوم کا
صبر پس ماندوں کو اس کی کر عطا اے کبریا

حلیمہ بشارت

مصوّر

مصوّر ہر روز ریحانہ کی جھونپڑی کے قریب سے سمندر کے ساحل پر قدرت کے بے بہا لطافتوں کو اپنی سحر زا انگلیوں سے صفحۂ قرطاس پر قلمبند کرنے جاتا۔ مصور آرٹ و نقاشی کے لئے اپنے وقت کا خدا تھا۔ اس کی انگلیوں کی ہر جنبش ایک لافانی شاہکار پیش کرتی۔ صرف اپنے لئے ہی نہیں بلکہ دنیا کے لئے۔

مگر وہ ہر صبح کو ریحانہ کو اپنا منتظر پاتا۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رقص کرتی ہوئی اور حسرت و یاس کی تصویر مصوّر کی بھی نگاہیں اس پر پڑتیں اور ایک نامعلوم کھچاؤ محسوس کرتا۔

کیا وہ مجھ سے محبت کرتی ہے؟ مصوّر دل میں سوچا کرتا۔

آخر کار ایک روز ریحانہ نے مصوّر کو روک لیا۔ مصوّر تصویرِ حیرت بنا کھڑا تھا۔ دونوں خاموش۔

کیا آپ مجھے نوکر رکھیں گے۔ ریحانہ نے جھجکتے ہوئے خاموشی کو توڑا۔

نوکر ــــ اور تمہیں ــــ آخر کیوں ــــ کیا ....؟

جی نہیں اپنے شوہر کے ساتھ آرام سے ہوں۔

پھر نوکری کرنے کا جنون کیوں ہے۔

میں بہت غریب ہوں، آپ کی نقاشی کا اُجرت دینا میرے بس کی بات نہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آیا تمہارا مطلب۔" مصوّر نے تحیر زا نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔"

میں آپ کی نوکری کروں گی اور آپ اس کے عوض میری ایک تصویر اتار دیں گے۔ میں بہت ممنون ہوں گی۔" ریحانہ نے تشکر کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

آخر تم تصویر اتروانے کے لئے اس قدر بے قرار کیوں ہو۔

یوں ہی ــــ میں چاہتی ہوں کہ اگر مر گئی تو اپنے شوہر کے لئے ایک یادگار چھوڑ جاؤں، کیونکہ ہم دونوں آپس میں بیحد محبت کرتے ہیں۔" اس نے انگلی دانتوں میں دبا لیا۔ اور امید و بیم کے عالم میں بت بنی کھڑی تھی۔

بھولی ــــ ہم تیرا مدّعا پورا کر دیں گے۔ آزردہ نہ ہو، مجھے تم سے دلی محبّت ہے۔ اس لئے تحفہ کے طور پر تمہاری تصویر تمہیں پیش کروں گا۔ بلا اجرت، انکار تو نہیں ہے۔

ریحانہ کی آنکھوں میں مسرّت کھیلنے لگی ــــ مصوّر نے نہایت کاوش کے ساتھ اس کی تصویر اتاری۔ جسے ریحانہ دیکھکر بہت خوش ہوئی۔

مصوّر عرصہ کے بعد بازار سے گذر رہا تھا۔ اس کی نظر پرانی چیزوں کی دکان پر پڑی۔ وہ ٹھٹک گیا ــــ ریحانہ کی تصویر مٹی کے بکھرے ہوئے واقعات سامنے رقص کرنے لگے۔

کاش! انسان وقت کی رفتار کو پیچھے کی طرف لوٹا سکتا

مصوّر نے تصویر خرید لیا اور ریحانہ کو دینے کی غرض سے اس کے گھر گیا مگر مصوّر کو بہت دُکھ ہوا۔ کیونکہ عرصہ ہوا ریحانہ مرچکی تھی اور اس کے شوہر نے نئی بیوی کی ضد سے تصویر گھر سے نکال پھینکا تھا۔ مصور کو ایسی محبت سے نفرت ہوگئی۔

تصویر کو اپنے نگارخانے میں نمایاں جگہ پر آویزاں کر دیا۔ تصویر اپنی سابق حالت میں تھی۔ صرف ہونٹوں پر سُرخی بہت زیادہ تھی۔ شاید تصویر کو زندگی بخشنے کے لئے ریحانہ نے اپنے خون سے رنگا تھا۔

مصوّر کو رفتہ رفتہ تصویر سے اُنس سا ہوگیا۔ وہ ہر وقت تصویر کو دیکھا کرتا۔ بے جان تصویر سے باتیں کرنے کیلئے مچلا کرتا۔ وہ چاہتا تھا کہ تصویر میں حرکت ہو۔ اور بول سکے۔ اس سے باتیں کروں اور کرتا جاؤں۔ اس کو پیار کروں اور کرتا رہوں بعض وقت مصور کو ایسا محسوس ہوتا کہ ریحانہ حرکت کرنا چاہتی ہے، اسکے خون آلود ہونٹ ہل رہے ہیں ——— مصوّر خوشی میں چیخ اٹھتا۔

بولو ریحانہ، بولو، میں تم سے باتیں کرنے کے لئے بے قرار ہوں۔ آہ! تمہاری طویل خاموشی جان لیوا ثابت ہو رہی ہے۔ ——— کاش! تم ایک بار حرکت کرسکتیں۔ صرف ایک بار بول سکتیں۔ پھر دیکھتی کہ میں کس قدر تمہاری تصویریں بناتا۔ صرف تصویر ہی نہیں بلکہ شہرت کا لافانی تاج تمہارے سر پر رکھدیتا۔

مصوّر کی بے قراری تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ اس کا ادراک تصویر کا حسن ڈھونڈنے کے بجائے جبانیت کی تلاش میں کھویا کھویا رہنے لگا۔ کیونکہ محبت کا دیوتا اپنا تیر اس کے دل میں پیوست کرچکا تھا۔ لہٰذا خیال کی یکسوئی جنون اور مکمل جنون کی صورت اختیار کرتی گئی اور وہ اپنے کو تصویر میں جذب کر دینے کے لئے بیتاب رہنے لگا۔ اس کی اس دیوانگی نے اس کے احساس کو اس قدر متاثر کرلیا تھا کہ وہ اپنے کو روز بروز عالم تصویر میں تحلیل ہوتے ہوئے محسوس کرتا۔ اس کو مسرت ہوتی۔ ناقابل فراموش! اور وہ زیادہ سے زیادہ تصویر کے قریب ہوتا گیا ——— یہاں تک کہ ایک صبح لوگوں نے مصوّر کو مردہ پایا۔ تصویر کا شیشہ چور چور تھا۔ اور مصوّر تصویر پر سر رکھّے سو رہا تھا۔ ابدی نیند۔

عشرت انصاری۔

غزل

لب خاموش رعب حسن سے کب کھل سکا میرا
فقط رنگ پریدہ حال دل کہتا رہا میرا

عدو کی بزم میں وہ سُن رہے ہیں ماجرا میرا
الٰہی ہو نہ ظاہر مدعی پر مدعا میرا

معاف اے رہبر راہ محبت لغزشیں میری
ہے راہ و رسم منزل سے قدم ناآشنا میرا

جدا بھی سب سے سب کے ساتھ بھی پیدا بھی پنہاں بھی
عجب بیگانہ وش ہے شوخ عالم آشنا میرا

گوارا ہو نہ کیونکر تلخ کامی سعی باطل کی
مری ناکامیوں سے شاد ہو جب آشنا میرا

کسی کو میں سناؤں حال کیا سیل حوادث کا
سفینہ جب کنارے پر قضا را آلگا میرا

ہے پاس خاطر نازک کسی کا ورنہ اے وامق
فغاں ہے بے اثر میری نہ نالہ نارسا میرا

بدیع الزماں وامق

تحفۂ عید قرباں

یہ ضحیٰ کی عید کا روز ہے میرے دل کو ذبح کیا گیا
میری حسرتوں پہ چھری چلی میرے دل کو ذبح کیا گیا

دل زار صابر صد بلا کسی دن بھی شاد نہ ہو سکا
مگر آج طرفہ ستم ہوا میرے دل کو ذبح کیا گیا

میرے دل کی قبر بنی نہیں۔ نہ کسی نے فاتحہ تک پڑھی
نہ کسی نے دی اسے کچھ دُعا میرے دل کو ذبح کیا گیا

کوئی حسرتوں کو بھی پوچھتا! ذبح ہونے والے کی یا خدا
یہ عجب طرح کا ثواب تھا میرے دل کو ذبح کیا گیا

کوئی ہے کہ میرا بھی غم کرے۔ میرے دل کا دل سے الم کرے
میرے ساتھ مل کے کرے بُکا میرے دل کو ذبح کیا گیا

میری زندگی کی یہ عید تھی۔ جو نصیب سے مجھے مل گئی
ملا آج دل کا یہ مدعا۔ میرے دل کو ذبح کیا گیا

یہ صدائے شورش باد ہو۔ یہ طرب یہ کیفیت سبو
اسی حال و قال کے وقت میں میرے دل کو ذبح کیا گیا

کوئی کاش میری بھی سن سکے میرے دل کے قتل کی داد دے
میرے خون کا مجھے دے بہا میرے دل کو ذبح کیا گیا

یہی غرض ہے یا خدا تجھے واسطہ ہے خلیل کا
اسے دے شرف تو قبول کا میرے دل کو ذبح کیا گیا

تیرا حال سب کو رلائے گا۔ نہ لکھ اب تو مخفی غم نوا!
میرا دل شہید ستم ہوا میرے دل کو ذبح کیا گیا

صالحہ بیگم مخفی

ریشماں

ریشماں کے متعلق میں کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ بلکہ میں تو اس نام سے بھی آشنا نہ ہوتا۔ اگر میرے ایک دوست بہت ہی مخلصانہ اور رازدارانہ طور سے اس کا نام مجھ تک نہ لے جاتے۔ خالو صاحب پرسوں آئے تو دوران گفتگو میں کہنے لگے کچھ "سنا" جیسے وہ کوئی بہت بڑا راز بتانے والے ہیں۔

"کیا" میں نے متعجب ہو کر کہا۔

"ایک لڑکی آئی ہے"۔

"تو"

"دوشیزہ ہے"

"آخر آپ کا مطلب کیا ہے"۔

"بہت ہی خوبصورت ہے"۔

"دماغ تو صحیح ہے"۔ میں نے جھنجھلا کر کہا۔

"ریشماں نام ہے بہت ہی مناسب۔ اس کے آنے سے ایک ہلچل مچ گئی ہے۔ ہر نوجوان جس نے اسے دیکھا ہے، اب پتنگے کی طرح اس کا طواف کر رہا ہے۔ اور جس نے اسے نہیں دیکھا دیکھنے کی آرزو رکھتا ہے"۔

"حسین لڑکیاں تو کتنی قصبے میں ہیں۔ پھر اس کے آنے سے کیا ہوا۔ نوجوانوں کو اس کام سے روکو۔ وہ جوان ہے۔ بقول آپ کے حسین بھی۔ اسے برا راستہ نہ دکھاؤ۔ ورنہ یہ پھول اس راستے میں پاؤں کے نیچے مسل جائے گا۔ تو اس وقت کون ذمہ دار ہوگا۔ زندگی برباد ہو جائے گی۔ ایک جان کی بے عزتی ہو جائے گی۔ اور عورت اس وقت تک عورت ہے جب تک عصمت کا موتی اس کے پاس ہے"۔

"اس وعظ کو رہنے دو۔ ایک نظر اسے دیکھ لو۔ پھر آپ خود اس کے حسن کی داد دیں گے"۔

"خالو۔ ہر حسین چیز سے لطف اٹھانا چاہئے۔ لیکن اس کے برباد کرنے کے درپے تو نہیں ہونا چاہئے۔ حسین چیز اسی وقت تک حسین رہتی ہے جب تک اسے بیجا استعمال نہ کیا جائے"۔

"لیکن حسن کو بھی زوال حاصل ہے۔ اور حسین چیز کچھ عرصہ بعد اپنا حُسن کھو بیٹھتی ہے"۔

"صحیح ہے۔ لیکن اس حسن کو اس کی خاص مدت تک تو رہنے دینا چاہئے۔ دنیا کی تمام چیزوں کو فنا ہونا ہے۔ اس لئے تمام چیزوں کو قبل از وقت فنا کر دینا کہاں کی عقلمندی ہے جس کی قدر کرو کیونکہ اس سے ایک پیاس تو بجھتی ہے۔ اور اس کے فنا ہونے تک شاید کوئی اور کنول گلستان میں کھل جائے"۔

"یار۔ رہنے دو" محمود فاضل نے کہا "کیا خشک باتیں شروع کر دی ہیں"۔ اور ادھر ان کی خوش قسمتی سے ایک ایسے بزرگ آ گئے۔ یہ مسئلہ یونہی رہنے دینا پڑا۔

ایک دفعہ۔ انہی دنوں میں۔ [illegible]

توانہوں نے ایک لڑکی کو جو پنکھا کھینچ رہی تھی، مخاطب کیا۔ ریشماں اوپر کمرے میں میز پر پھنکی رکھی ہے وہ لے آؤ۔"

آج پہلی مرتبہ میں نے اسے دیکھا ــــ وہ گئی اور پھنکی لے آئی ــــ اور پھر بدستور مریض کو پنکھا کرنے لگی۔ ڈوری ود خاص انداز سے کھینچ رہی تھی ــــ نظریں جھکائے ــــ پنکھا دو تین مرتبہ دیوار سے لگا جس سے مٹی گری۔ دیوار پر مٹی کا پلستر تھا۔ وہاں اس کا عام رواج ہے۔ "ذرا دھیرے دھیرے پنکھا کھینچو۔ بھابی نے کہا۔ دیکھتی نہیں ان کی ٹوپی خراب ہوگئی۔"

"پنکھا ہی ایسا ہے۔ ڈوری خراب ڈالی گئی ہے۔" اس نے منہ ایک طرف کرکے جواب دیا۔

ریشماں نے اس دن بالیوں میں سفید سفید چمیلی کے پھول ڈال رکھے تھے۔ اور کچھ پھول مریض کے سرہانے پڑے تھے ــــ پھول دونوں تھے اور شاید ایک ہی بوٹے کے ــــ چند ریشماں کے کانوں کی زینت تھے۔ جن کی خوبصورتی و دلکشی اس کی وجہ سے اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اور بالیوں کے حرکت کرنے سے وہ کانوں کے نزدیکی حصے سے بھی مس کر جاتے ــــ اور چند پھول مریض کے سرہانے پڑے تھے۔ خاموش اور کچھ زردی مائل۔ بالکل مریض کی طرح ــــ پھول دونوں تھے ــــ رو سو نے کیا خوب کہا ہے۔ "پھول تو شہزادی کے گلے کی زینت بھی ہے۔ اور بوسیدہ قبروں پر بھی انھیں ڈال دیا جاتا ہے۔"

ریشماں بدستور اپنے کام میں منہمک تھی ــــ نگاہ جھکی ہوئی۔ شرم و حیا اس کے چہرے پر کھیل رہی تھی ــــ میں گھر چلا آیا۔

چند نوجوان ریشماں کے پیچھے لگے رہتے جہاں وہ بازار یا کہیں اِدھر اُدھر کام کے لئے نکلی وہ ساتھ ہوگئے۔ مگر ان طواف کرنے والوں کی تعداد بس تین چار رہی تھی۔ یہ اسے تنگ کرتے۔ کہیں ایک آدھ جملہ کس دیا۔ کوئی فوراً تیز تیز قدم بڑھاتا۔ اس کے سامنے سے اتنے قریب ہوکر نکلتا کہ ٹکر ہوتے ہوتے رہ جاتی۔ اور وہ اس کی طرف کچھ اس طرح دیکھتا گویا کچھ چاہتا ہے۔

غرض غلام ملک کے، ان تین چار نوجوان بے فکروں کا کام ہی یہ تھا کہ ہمیشہ اس تاک میں رہیں کہ وہ کب گھر سے نکلتی ہے۔

ریشماں بھی ان کی ان حرکتوں سے تنگ آگئی تھی۔ آخر عورت تھی۔ کئی دفعہ تو اس نے دو چار سنائی بھی۔ مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اب وہ ایک عجیب پریشانی میں مبتلا ہوگئی ــــ اس کی زندگی اب نیکی اور بدی کے دوراہے پر ٹھٹکنے لگی۔ کیا وہ اپنے کو ان بدمعاشوں کے حوالے کردے۔ تاکہ وہ اسے تنگ کرنے سے باز آجائیں۔ اور اس کا نام اس طرح زبان زد نہ رہے۔ یا وہ یہ قصبہ چھوڑ دے ــــ مگر جائے کہاں ــــ وہ گھر سے اس لئے بھاگ آئی تھی کہ اس کے والدین چند سکوں کے عوض اس کی شادی ایک نابالغ لڑکے سے کرنا چاہتے تھے۔ اور وہ اسے پسند نہیں کرتی تھی ــــ دوسرا گاؤں اس نے اس لئے چھوڑ دیا کہ وہاں کے نوجوان پٹھان اس کی آبرو ریزی کے درپے تھے۔ یہ قصبہ اس نے اس لئے پسند کیا کیونکہ یہاں شریف بستے ہیں۔ تاجروں کی بڑی بستی ہے۔ اور شاید اسے کہیں سر چھپانے کو جگہ مل جائے۔ تاکہ وہ زندگی شانتی سے گزار سکے۔ پہلا قدم تو اچھا تھا۔ اسے ایک شریف اور اچھے گھر میں کام مل گیا تھا۔ اور اس نے آرام کا سانس لیا۔ مگر تصویر کا دوسرا رُخ اس کے برعکس تھا ــــ اب وہ کیا کرے۔ کیا وہ ان طواف کرنے والوں میں سے کسی سے شادی کرکے گھریلو زندگی گذارے۔ اسے اب یہ تیسری راہ بھی نظر آئی۔ لیکن یہ فیصلہ کرنا کہ وہ کونسی راہ اختیار کرے۔ اس کے لئے بڑا مشکل کام تھا۔ وہ کسی سے مشورہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اور پھر ایسے معاملے میں لوگ کتنا بُرا کہیں گے۔ اس پر انگلیاں اٹھیں گی۔ اس خیال سے وہ کانپ اٹھی۔ یہاں اس کی کوئی سہیلی بھی نہ تھی۔ اسے آئے ہوئے ہفتہ بھی مشکل سے گذرا تھا۔ دو چار عورتوں سے اس کی رسمی جان پہچان تو ہوگئی تھی۔ مگر ایک دوسری کی راز دار تو نہیں تھیں ــــ وہ بڑی مشکل میں تھی ــــ شادی وہ کیسے کرے۔ وہ خود کسی سے کیسے اس کا اظہار کر سکتی ہے ــــ کسی نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ اگر کبھی کسی نے شادی کرنے کا پیغام دیا ہوتا تو وہ اس پر سوچتی ــــ وہ صرف

بھر کے کتوں کی طرح دیکھتے ہیں۔ وہ بڑی الجھن میں تھی۔

ریشماں گرمیوں کی ان رومان انگیز راتوں کو سوچا کرتی۔ جب چاند ستاروں کے ساتھ دنیا کو جگمگا رہا ہوتا۔ وہ چھت پر اپنے بستر پر سوچا کرتی ——— اپنا مستقبل ——— کبھی وہ اسے روشن باقی دن کی طرح۔ اور کبھی مزدور کی زندگی کی طرح تاریک ——— وہ اپنے تاریک مستقبل کا خیال کرتے ہی لرز جاتی۔ اور اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے اسے کسی نے چھت پر سے نیچے سب سے نیچے والے صحن میں پھینک دیا ہے۔ تاریک مستقبل اپنی بھیانک شکل کے ساتھ اس وقت اس کے تصور میں آتا۔ جب وہ اپنی زندگی کو بدی کی راہ ڈالنے کا خیال کرتی اسے معلوم ہوتا کہ وہ زندگی کو اسی راہ پر ڈالنے پر مجبور رہے۔ لیکن روشن مستقبل سے اس کا چہرہ چمک اٹھتا چاند کی طرح ——— وہ اڑی جا رہی ہے چاند کی طرف تاروں سے آنکھ مچولی کھیلنے۔ وہ بہت خوش ہوتی۔ جب وہ زندگی کو نیکی کی راہ پر لگتا دیکھتی ——— لیکن جب وہ قصبہ چھوڑ دینے کا خیال کرتی تو اس کا چہرہ اداس اور غمگین ہو جاتا۔ اسے اس کا انجام بھی لرزہ خیز معلوم ہوتا ——— وہ کیا کرے۔ وہ فیصلہ نہ کر سکی ——— عورت بڑے کمزور دل کی ہوتی ہے۔ اسے فیصلہ کرنے میں وقت ہوتی ہے اور دیر جاتی ہے ——— ریشماں انہی قسم کے خیالات میں تاروں بھری رات گزار دیتی۔ جب وہ جاگتی تو مشرق کی طرف روشنی میٹھی اور دلفریب روشنی نمودار ہو چکی ہوتی۔ اور وہ اپنے کام میں مشغول ہو جاتی۔

ان طواف کرنے والوں میں ایک جمّوں بھی تھا ——— وہی ملیار کا لونڈا ——— بھرا سا جسم ——— درمیانہ قد ——— بڑی بڑی آنکھیں ——— ملتان سے اب کما کر آیا تھا۔

جمّو بہت پریشان تھا۔ جب سے اس نے ریشماں کو دیکھا تھا ——— اسے محسوس ہونے لگا جیسے وہ کچھ نہ کچھ کرنے والا ہے۔ اسے معلوم ہوتا جیسے سچ مچ وہ اس پر آمادہ ہو چکا ہے۔ وہ اس پر اب ہاتھ ڈال دیگا۔ لوگ دیکھ لیں گے۔ اس نے ٹھنڈے دل سے کہا۔ جیسے اس کا یہ فعل کسی نے دیکھ لیا ہے۔ اور پھر ——— پھر وہ کیا سے کیا سوچنے لگا۔ اور پھر جیل یا پنچایتی فیصلہ کے مطابق پچیس روپے اور ایک بھیڑ۔ وہ جیل جانے سے نہیں ڈرتا تھا۔ اس نے ملتان میں دیکھا تھا کہ بڑے بڑے آدمی جیل جاتے ہیں۔ اس حکومت میں جیل جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ لیکن یہ پنچایت کا معاملہ بڑا ٹیڑھا ہے۔ بڑی سُبکی ہوگی۔ لوگ انگلیاں اٹھائیں گے۔ اس نے سر کھجلاتے ہوئے کہا تو پھر کیا کیا جائے۔ بڑی مشکل ہے۔ ایسی مشکل تو پہلے کبھی نہیں پیش آئی تھی ——— اور وہ سوچنے لگا۔ سوچتا رہا ——— کچھ دیر بعد وہ اٹھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس نے کچھ سوچ لیا ہے۔ وہ بڑبڑایا۔ اس وقت وہاں کوئی نہ تھا۔ مگر ماں! ——— آہ ماں مان جائیگی۔ روپے میں دوں گا۔ اس نے ایک دفعہ اپنے آس پاس دیکھا۔ اور پھر چلا گیا۔

کچھ روز بعد میں نے سنا کہ جمّو نے اظہارِ عشق کر دیا۔ اور شادی کا پیام بھی دے دیا۔ ریشماں بہت لال پیلی ہوئی ——— اور چلی گئی ——— دوبارہ پھر جمّو نے مطلب کو بیان کیا تو اب کی وہ صرف چپ ہو گئی۔ مگر تیسری بار جب وہ دونوں اتفاقی طور سے ایک گلی میں مل گئے تو جمّو نے ہمت کر کے وہی بات دُہرائی تو وہ مسکرا دی۔ اب کیا تھا۔ جمّو بہت خوش تھا۔ جیسے اس نے قلعہ فتح کر لیا۔ جمّو نے ماں کو رشتہ کے لئے تیار کر لیا کیونکہ اس نے دھمکی بھی دی تھی کہ میں زہر کھا لوں گا۔ آخر اس کی ماں اور بہن ریشماں کی مالک کے پاس گئیں۔ اور مطلب بیان کیا۔ مالک نے کسی وقت ریشماں سے پُوچھا مگر وہ خاموش رہی۔ اور ایسی جیسے وہ اس پر تیار ہے ——— جمو کی ماں اور بہن کو بتا دیا گیا ——— بات ہوتی نظر آ گئی۔ اور پھر ——— پھر رہی۔ ریشماں کے من کی بات پوری ہوئی۔ اور جمّو کو اس کی بیوی ملی۔

از

عطا محمد براچہ

ہندوستان میں فلم سازی کی فراوانی

معیاری اعتبار سے ہندوستان کی فلم سازی کا درجہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن تعداد کے لحاظ سے فلم سازی کے معاملہ میں امریکہ کے بعد ہندوستان کا دوسرا درجہ ہے۔ یعنی امریکہ کو چھوڑ کر ہندوستان تمام دنیا کے دوسرے ممالک سے زیادہ فلمیں تیار کرتا ہے۔ چنانچہ جنگ سے قبل کے اعداد شمار دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ امریکہ میں ہر سال ساڑھے چار سو فلمیں تیار ہوتی رہی ہیں۔ جرمنی ہر سال سوا سو فلمیں تیار کرتا رہا ہے۔ فرانس کی سالانہ تعداد بھی تقریباً سوا سو رہی ہے۔ انگلستان کا اوسط ایک سو فلمیں سالانہ ہے۔ جبکہ ہندوستان کا اوسط تقریباً دو سو فلمیں سالانہ ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان امریکہ کو چھوڑ کر بقیہ تمام ملکوں سے فلم سازی کی دوڑ میں سب سے آگے ہے۔ گذشتہ سال کے اندر ہندوستان کی فلم سازی کی رفتار اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے۔ چنانچہ اندازہ یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان میں کسی صورت میں بھی ہر سال تین سو سے کم فلمیں تیار نہیں ہو رہی ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان فلمسازی کی دوڑ میں اس قدر تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا جا رہا ہے کہ کوئی تعجب نہیں کہ وہ تعداد کے لحاظ سے چند سال کے اندر امریکہ کو بھی پیچھے چھوڑ دے۔

ہندوستان میں فلمسازی کی یہ رفتار اس حالت میں ہے جبکہ جنگ کی وجہ سے نہ صرف کچے مال کے ملنے میں دقتیں پیدا ہو گئی ہیں بلکہ دوسرا سامان بھی بہت زیادہ گراں ہو گیا ہے۔ اگر جنگ کی دشواریاں ہندوستان کے فلم سازوں کے راستہ میں رکاوٹ نہ ثابت ہوتیں تو کوئی تعجب نہیں کہ آج ہندوستان میں امریکہ سے لگ بھگ تصویریں تیار ہو رہی ہوتیں۔ جنگ نے ہندوستان کی صنعت فلم سازی کی ترقی میں بلاشبہ بہت بڑی رکاوٹ پیدا کر دی ہے۔ لیکن اس رکاوٹ کے باوجود بھی ہندوستان کے فلمسازوں کے حوصلے بہت زیادہ بڑھے ہوئے ہیں۔

فلمسازوں کے حوصلے بڑھنے کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے باشندے دن بدن فلموں کے دلدادہ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان کے اکثر لوگوں کی یہ حالت ہے کہ سینما یعنی ان کی ضروریات زندگی میں شامل ہو چکی ہے۔ یعنی جس طرح لوگ کھانا پینا اور پہننا ضروری خیال کرتے ہیں اسی طرح تفریح کو بھی انہوں نے اپنی زندگی کا جزو بنا لیا ہے۔ عوام کی فلموں سے اس غیر معمولی دلچسپی ہی کا نتیجہ یہ ہے کہ فلموں کی آمدنی پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اور آمدنی کی بڑھنے کی وجہ فلمسازوں کے نفع میں خلاف توقع بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے اور اگر عوام کی فلموں سے دلچسپی اسی رفتار کے ساتھ بڑھتی رہی تو وہ وقت دور نہیں ہے جب صنعت فلمسازی کاروباری لحاظ سے ہندوستان کی صف اول کی صنعت بن جائے گی۔

ہندوستان میں فلمسازی کی اس غیر معمولی ترقی اور فلموں کی مقبولیت کا ایک تاریک پہلو بھی ہے۔ اور وہ تاریک پہلو یہ ہے کہ ہندوستان کے فلمساز یہ سمجھتے ہوئے کہ بُری سے بُری فلم سے بھی لاگت ضرور نکل آتی ہے۔ اس چیز کی بھی بہت کم کوشش کر رہے ہیں کہ فلموں کے معیار کو بھی فلموں کی مقبولیت کے ساتھ بڑھایا جائے۔

فلموں کے معیار کی جانب سے ہندوستان کے فلمسازوں کی بے توجہی ممکن ہے۔ کہ کچھ مدت تک نبھ جائے لیکن اس کا ردعمل یہ ہوگا کہ عوام کی دلچسپی فلموں کے ساتھ کم ہوتی چلی جائے گی۔ اور عوام فرسودہ اور بے معنی تصویریں دیکھتے دیکھتے اس قدر تھک جائیں گے کہ ان کو فلموں کو چھوڑ کر اپنی تفریح کے لئے دوسرے ذرائع تلاش کرنے پڑیں گے۔ ہندوستان کے فلمسازوں کو چاہئے قبل اسکے کہ عوام فلموں کی جانب سے بدظن ہوں، وہ فلموں کے معیار کو سنبھالنے کی کوشش کریں۔ اور فلموں میں ایسی ایسی جدتیں پیدا کرتے چلے جائیں کہ عوام کی دلچسپی میں کمی نہ آنے پائے۔ فلمسازوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ اگر عوام ایک مرتبہ فلموں کی جانب سے ہٹ گئے تو پھر ان کو فلموں کی جانب متوجہ کرنے کیلئے کافی وقت اور محنت صرف کرنا ہوگا۔ (ماخوذ صداقت)

JAD[illegible] URDU

قواعد وضوابط

(۱) رسالہ ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوا کرے گا۔ خریداروں کو چاہیے کہ رسالہ ۱۵ تاریخ تک نہ ملنے پر دفتر سے طلب کریں۔

(۲) اہل قلم حضرات سے درخواست ہے کہ وہ مضامین مہینے کی ۱۵ تاریخ تک اڈیٹر کے نام بھیجدیں

(۳) مضامین صاف اور شستہ تحریر ہوں

(۴) وہی مضمون پرچہ میں شائع ہو سکتا ہے جو معیار ادب و اخلاق سے گرا نہ ہو۔

(۵) دل آزار و فرقہ وارانہ مضامین نیز سیاسی مضامین شائع کرنا پرچہ کی پالیسی کیخلاف ہے۔

(۶) نمونہ کا پرچہ مفت نہیں بلکہ ۳۰؍ کا ٹکٹ آنے پر بھیجا جائیگا۔

(۷) جواب کے لیے جوابی کارڈ یا اسٹامپ کا آنا ضروری ہے۔

(۸) خط وکتابت و ترسیل زر کا پتہ: منیجر جدید اردو [illegible] مارسڈن اسٹریٹ کلکتہ

(۹) کاروباری حضرات اشتہار کیلئے منیجر سے خط وکتابت کریں

(۱۰) سالانہ چندہ صرف دس روپیہ [illegible] ممالک کیلئے ۵ شلنگ

اے جلیل منیجر جدید اردو [illegible] مارسڈن اسٹریٹ کلکتہ

مدیر مسئول
پرویز شاہدی
مدیر اعزازی
ایم ظہور احسن قاضی

جدید اردو کلکتہ

اپریل سنہ ۱۹۴۳ء

چندہ سالانہ دو روپیہ
ششماہی ایک روپیہ ۸ آنہ
فی پرچہ ۴ر

جلد ۶ | نمبر ۴

فہرست مضامین

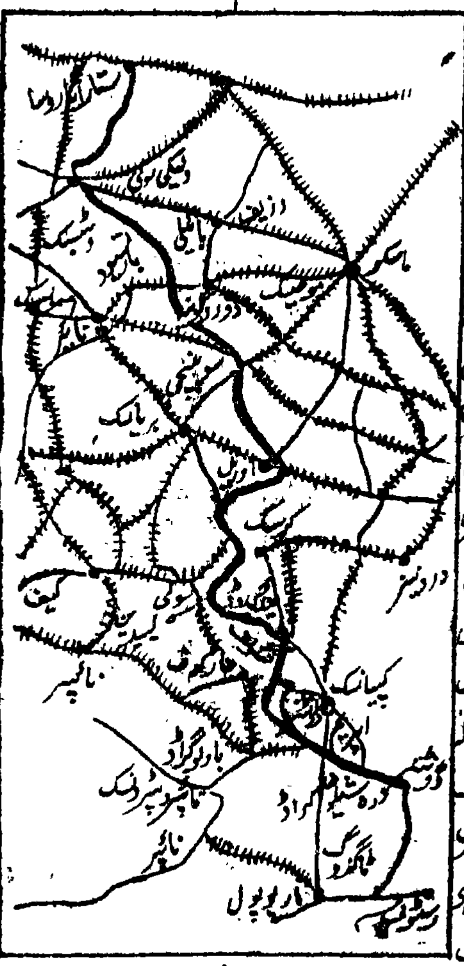
رفتار وقت

ابھی موسم بہار پورے طور پر شروع بھی نہ ہونے پایا تھا کہ جرمن فوجوں نے پلٹ کر پھر شدت کے ساتھ روس پر ہلّہ بول دیا۔ اور پہلے ہی حملے میں جرمنوں نے روسیوں سے خارکوف اور اس کے اطراف کے آٹھ مقامات چھین لئے۔ لیکن روسی بھی اپنی بہادری میں کم نہیں ہیں وہ اس نقصان سے ذرہ برابر بھی گھبرائے نہیں اور باقی مورچوں کو ڈٹ کر مقابلہ کر رہے ہیں۔ جرمن فوجوں کو خارکوف میں کامیابی کی وجہ صرف انکی فوجی برتری ہے۔ سنا جاتا ہے کہ انہوں نے وہاں پر اپنی پچیس ڈویزن فوجیں لا کھڑی کردی ہیں اس وقت لڑائی بیلگورود سے ورو شیلو گراڈ تک پھیلی ہوئی ہے۔ بیلگورود خارکوف کے شمال میں واقع ہے۔ اس پر جرمن فوجوں کا قبضہ ہوجانے کی وجہ کر روسی فوجوں کے لئے کرسک میں خطرہ لاحق ہوگیا ہے اور خارکوف میں جرمن فوجوں کے جنوب کا بازو مضبوط ہوگیا ہے پھر جرمن فوجوں نے کرسک سے اسّی میل شمال مغرب میں روسیوں کے آگے بڑھتے ہوئے مورچہ پر سخت حملہ کیا لیکن ان کا حملہ ناکام رہا۔ اسوقت ایک زبردست لڑائی خارکوف سے جنوب مشرق میں شگوف اور "ازیم" کے لئے بھی ہورہی ہے اور یہاں پر جرمن فوجیں جان توڑ کوشش کررہی ہیں کہ دریائے ڈونز کو عبور کر جائیں اور بیلگورود سے لیسی چانسک" جانیوالی ریلوے لائن پر قبضہ کرلیں تاکہ اسکے ذریعہ ورشیلو گراڈ اور روستوف پر آسانی سے حملہ کرسکیں۔ اسوقت ان دونوں شہروں کے مضافات میں جرمن فوجیں شمال کی طرف سے جارحانہ حملے بھی کررہی ہیں جرمنوں کا دعویٰ ہے کہ ہم نے دریائے ڈونز کو عبور کرلیا ہے۔ لیکن روسی کہتے ہیں کہ نہیں بلکہ بہت کم تعداد میں جرمن فوجیں آئی تھیں جن کو انہوں نے سب کو ختم کردیا۔ مارچ کے آخر ہفتہ میں شیلو کے اکثر مورچوں سے روسی فوجیں پیچھے کی طرف ہٹ آئی ہیں اسلئے کہ یہاں پر جرمن فوجیں بہت زیادہ دباؤ ڈال رہی ہیں اور بہت زیادہ کمک بھی پہنچا رہے ہیں۔ اس وقت روسی محاذ پر لینن گراڈ سے روستوف تک جرمنی پھر سخت جوابی حملے کررہے ہیں۔ اور جہاں جہاں بھی کمک پہنچ رہی ہے پہنچا رہے ہیں۔

مشرق بعید امریکن بحری بیڑے نے جاپانی بیڑے کو ابھی حال میں بحرالکاہل میں سخت نقصان پہنچایا ہے۔ اسکے باوجود جاپانیوں کا زور ابھی کم نہیں ہوا ہے۔ اور وہ برابر جزائر شرق الہند میں فوجیں لا رہا ہے۔ یہ بھی خبر ہے کہ جزیرہ امبوئنا میں بہت زیادہ ہوائی اڈے بنا رہا ہے۔ یہ مقام آسٹریلیا سے شمال مغرب میں "ڈارون" سے ۵۰۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ ممکن ہے اسکا مقصد آسٹریلیا پر شمال مغرب کی طرف سے حملہ کرنیکا ہو۔ اس وقت طرفین کے ہوائی جہاز ایک دوسرے پر بمباری کر رہے ہیں یعنی اتحادیوں کے ہوائی جہاز جاپانی مقبوضات پر بم گرا رہے ہیں اور جاپانی ہوائی جہاز اتحادی مقبوضات پر کبھی کبھی مقابلے سے بحری جنگ بھی ہوجاتی ہے۔

افریقہ جبکہ برطانوی اور امریکن فوجوں نے ملکر الجیریا پر یورش کی اسوقت برطانیہ کی آٹھویں فوج نے بنغازی اور طرابلس فتح کرلیا۔ اسکے بعد بڑھتی ہوئی ٹیونس کی سرحد تک پہنچ گئی جسے امید تھی کہ ایک دو ہفتے کے اندر اب پورا افریقہ سے اخراج ہوجائیگا۔ اور یہ ایک نہایت شاندار کامیابی ہوئی لیکن جنرل وادل نے نہ جانے کونسی چال چلی ہے کہ اب تک اتحادی فوجیں ٹیونس میں قدم جمائے ہوئی ہیں۔ بلکہ ایک خطرہ یہ بھی پیدا ہوسکتا ہے کہ عجب نہیں محوری فوجیں اسپین سے گزر کر شمالی افریقہ کو خوفناک ترین جنگ کا میدان بنا ڈالیں۔ فرانکو سے کیا امید ہوسکتی ہے محوری طاقتوں کے آگے جھک جانا اسکے لئے محال اگر ایسا نہیں تو پھر بھی اسپین کی اتنی طاقت کہاں ہے کہ وہ محوری طاقت کو روک سکیں

——— عبدالجلیل۔



نعت

خسرو سرمد، تختِ نہ مسند، فخرابِ وجد یعنی محمد — نورِ مجرد، روحِ معنبر صلی اللہ علیہ وسلم

گوہرِ وحدت، آیۂ رحمت، کانِ فتوت، بحرِ نبوت — عاشقِ امت، شافعِ محشر صلی اللہ علیہ وسلم

جانِ دو عالم، حق کے مکرم، اپنے رب کی شانِ معظم — لطفِ مجسم، خاصۂ داور صلی اللہ علیہ وسلم

نور سے جن کے طور ہوں سینے، بغض ہو دل میں اور نہ کینے — جاؤ مدینے گر نہیں باور صلی اللہ علیہ وسلم

یادِ نبی ہے یُمن سے مملو، روزِ شفاعت ثقل ترازو — جسم کی خوشبو عطر سے بڑھکر صلی اللہ علیہ وسلم

مجد شمائل، وصف میں کامل، اقصیٰ جنکی پہلی منزل — سیدِ عادل، فقر کے یاور صلی اللہ علیہ وسلم

نیرِ بطحیٰ، النجم طٰہٰ، ماہِ دنیٰ اور مہرِ تدلیٰ — زینتِ کعبہ، رونقِ منبر صلی اللہ علیہ وسلم

مامنِ ایماں، ملجاءِ عرفاں، سایۂ یزداں، رکنِ عزیزاں — حسن کے ارماں، عشق کے دلجو صلی اللہ علیہ وسلم

ہیبتِ حق، نکبتِ باطل، شوکتِ عظمیٰ، قدرتِ کامل — حکمتِ فاضل، حرکتِ ابرو صلی اللہ علیہ وسلم

جلوۂ عارض شکلِ احد میں، صبحِ ازل میں نورِ صمد میں — شامِ ابد میں ظلمتِ گیسو صلی اللہ علیہ وسلم

جاہِ سکندر، حشمتِ کسریٰ، گردِ سواری اللہ اللہ — عرش پہ تکیہ، فرش پہ قابو صلی اللہ علیہ وسلم

نقشِ کفِ پا ماہِ مبیں ہیں، خاک قدم ہی مشکِ ختن میں — درجِ دہن میں دنداں لولو صلی اللہ علیہ وسلم

اہلِ صفا ہیں ناسوتِ احمد، اہلِ فنا ہیں ملکوتِ احمد — جبروتِ احمد آگے ہو ہو صلی اللہ علیہ وسلم

ہونٹوں پہ شیدا حسنِ تکلم، کیف کی جنت وجدِ تبسم — جزوِ ترنم آبروئے دیں صلی اللہ علیہ وسلم

حسن سے روشن کعبۂ یزداں، رشک سے گلشن معبدِ یزداں
لطف سے شاداں جبریلِ امیں۔ صلی اللہ علیہ وسلم

اردو شاعری کدھر جا رہی ہے؟

آج سے پچاس برس کے بعد ادب اردو کی جو تاریخ لکھی جائے گی اس میں ہمارے دور کی شاعری کچھ اچھے لفظوں میں یاد نہیں کی جائے گی۔ نقاد لکھیں گے کہ شاعر بہت سے تھے اور بعض انہیں قدرت کی طرف سے شاعرانہ لگاؤ لے کر آئے تھے لیکن ان کی کوششیں کوششیں ہی رہ گئیں۔ ان لوگوں نے اردو شاعری میں بہت سی جدتیں پیدا کیں لیکن ان میں سے اکثر کی شاعری کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی قسمت میں بقا تھی۔ گذشتہ جنگ عظیم کے بعد لوگوں نے یہ خیال کیا کہ اب ایک دور تعمیر شروع ہوگا لیکن وہ غلطی پر تھے۔ کیونکہ جو دور شروع ہوا وہ تعمیر کا نہیں بلکہ تخریب کا تھا۔ ہر وہ چیز جس سے قدامت کی بو آتی تھی فرسودہ سمجھ کر بے دردی سے مٹا دی گئی۔ چنانچہ شاعری کا بھی یہی حال ہوا۔ ہمیں یہاں اس سے بحث نہیں ہے کہ دنیا کے دوسرے لٹریچر میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اردو لٹریچر اور خاص کر اردو شاعری کا کیا حال ہوا۔

نظم کا لکھنا اردو شاعری میں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے نظمیں لکھیں اور نہایت خوب لکھیں۔ ان کی بیانیہ نظمیں انگریزی کی بہترین نظموں سے زور بیان میں کسی طرح کم نہیں۔ لیکن نظیر اکبر آبادی کی مثال اردو ادب میں واحد [illegible] ہے۔ اس کے معنے ہرگز یہ نہیں ہیں کہ دوسرے پرانے شعرا کے یہاں ہم نیچر شاعری (Nature Poetry) نہیں پاتے۔ اردو، فارسی ادب کی مثنویاں اور قصیدے نیچر کے بیان سے بھرے پڑے ہیں۔ نسیم لکھنوی کی "گلزار نسیم" اور میر حسن کی "سحر البیان" میں جابجا نیچر اور اس کے حسن کا ذکر ہے۔ قصیدے کا پہلا حصہ جسے تشبیب کہتے ہیں عموماً نیچر اور اس کی دلفریبیوں کے بیان کے لیے وقف ہوتا ہے۔ چنانچہ سودا اور غالب کے قصیدوں میں ہمیں نہایت ہی اعلیٰ نیچر شاعری ملتی ہے۔ اس لیے جدید اردو شاعری کا دعویٰ کہ اس نے اردو ادب کا نیچر شاعری سے پہلی بار تعارف کرایا ہے غلط اور بے بنیاد ہے۔

نیچر شاعری اور رومانی شاعری (Romantic poetry) کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ انگریزی ادب میں جس سے کہ رومانوی شاعری ماخوذ ہوئی ہے رومانیت کا زمانہ مدت ہوئی ختم ہو چکا۔ ۱۷۹۸ء میں ورڈزورتھ (Wordsworth) اور کولرج (Coleridge) نے مل کر لیریکل بیلڈز (Lyrical Ballads) لکھا اور رومانیت کے دور کا آغاز کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے اپنے ادب کی بڑی خدمت کی۔ لیکن اردو شاعری میں رومانیت کو زبردستی گھسیٹ لانا اردو ادب پر ظلم کرنا ہے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ رومانیت انگریزی ادب میں ہمیشہ سے تھی۔ ملکہ الیزبیتھ کے عہد کے شعرا سب رومانی تھے لیکن اس کے بعد پوپ (Pope) اور ڈرائڈن (Dryden) کے زمانے میں رومانیات (جو نفسیات اور محسوسات کی شاعری ہے) کی جگہ کلاسیکی (Classical) یا عقلانہ شاعری نے لی۔ اس دور میں عقلانی شاعری اور خاص کر فن شعر کو بہت ترقی ہوئی۔ اس کے بعد ہی ورڈزورتھ اور کولرج نے رومانیت کو جو کہ کلاسیکی دور میں بھی کہیں کہیں نظر آتی تھی زندگی بخشی۔ ورڈزورتھ اور کولرج کے بعد کیٹس (Keats) بائرن (Byron) اور شیلے (Shelley) جیسے شاعروں نے رومانی شاعری کو چار چاند لگا دیے لیکن ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں رومانیت کا زوال شروع ہوا۔ اور دور حاضرہ میں کلاسیکی شاعری نے پھر رومانی شاعری کی جگہ لے لی ہے۔ رومانی شاعری جس کا کہ زندگی اور اس کی حقیقتوں سے بہت کم ہے عہد حاضر کے لیے غیر ضروری سمجھی گئی۔ اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ (T. S. Eliot) جیسے شاعر نے رومانیت کی خامیوں کو لوگوں پر واضح کر کے ایسی شاعری شروع کی جس کی بنیاد حقیقت پر رکھی گئی ہے۔ اب سورج کے غروب ہونے کا منظر، یا بلبل کا چہکنا، یا کوہسار کی ٹھنڈی ہوا — ایسی [illegible]

ایک سرسری نظر ڈالنا اس لیے ضروری سمجھا گیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہاں رومانیت کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اب زمانہ اتنا چین و سکون کا نہیں رہا۔ زندگی اب اس اطمینان سے نہیں گذرتی جس طرح عہد ماضی میں گذرتی تھی۔ یہ زمانہ کشمکش کا ہے۔ دور اس لمحے تجربے میں ایسی شاعری کی ضرورت ہے جو حقیقت کا آئینہ ہو۔ نہ کہ خیالی جذبات کی ترجمانی یا نیچر کا حسن بیان کرے۔ بغرض رومانیت کا اردو شاعری میں داخل کرنا نہ صرف ایک ایسی چیز کا لانا ہے جو اردو شاعری کی اسپرٹ (Spirit) کے خلاف ہے بلکہ وقت کے لحاظ سے بیکار بھی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اختر شیرانی نے رومانی نظمیں بہت خوب لکھی ہیں لیکن دور حاضرہ کے افراد کیلیے یہ کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتیں۔ اس سلسلے میں حفیظ جالندھری اور ساغر نظامی کا ذکر کرنا غیر ضروری نہیں ہوگا۔ حفیظ نے کچھ اچھی نظمیں ضرور لکھی ہیں خاص کر وہ نظم "ابھی تو میں جوان ہوں" جو ایک خاص جاذبیت رکھتی ہے۔ لیکن ساغر کی نظمیں ایک دو کے سوا صرف خوبصورت لفظوں کا مجموعہ ہوتی ہیں جنہیں معنی سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ اس کمی کو ساغر صاحب گا کر پورا کر لیتے ہیں۔

کچھ منچلے اور دلیر شاعروں نے یورپی شاعری کی تقلید میں اب ایسی نظمیں بھی لکھنا شروع کی ہیں جن کی بنیاد حقیقت کے احساس پر ہوتی ہے۔ معاشرتی، سیاسی اور مذہبی مسئلوں پر نظمیں لکھی جا رہی ہیں جن میں کسانوں سے ہمدردی، وطن سے محبت اور مذہب کی ضرورت یا بیکاری پُر زور لفظوں میں دکھائی جاتی ہیں۔ لیکن یہ نظمیں تقلیدی ہیں اور تقلیدی شاعری کبھی دل کی گہرائیوں سے نمایاں نہیں ہوتی اور صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ کہاں شاعر نے اثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس قسم کی نظمیں ہمیشہ "اے" سے شروع ہوا کرتی ہیں اور بڑے بڑے فارسی اور عربی لفظوں کے الٹ پھیر سے بجاتی ہیں۔ سیماب اکبرآبادی کا شعر ہے

اے قوم بد اندیش، بد اندیشی چھوڑ — کر جہد بقا، رسم فنا کیشی چھوڑ

اس شعر میں جیسا کہ صاف ظاہر ہے، زبردستی جوش پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اقبال کے بعد جو وطنی یا قومی نظمیں لکھی گئیں وہ زبردستی کے جوش اور خواہ مخواہ کی چیخ و پکار سے بھری ہوئی ہیں۔ ساغر نظامی کی نظم "ترانہ وطن" کے شروع کا ایک بند درج ہے جو آجکل کی وطنی شاعری کا نمونہ ہے:

اے وطن ، اے وطن، اے وطن
جان من ، جان من ، جان من
ذرے ذرے میں محفل سجا دینگے ہم — تیرے دیوار و در جگمگا دینگے ہم
تجھ کو ہستی کا گلشن بنا دینگے ہم — آسمانوں پہ تجھ کو بٹھا دینگے ہم
بن کے دشمن ترا جو اٹھے گا یہاں
اس کو تحت الثریٰ میں گرا دینگے ہم

"اور تحت الثریٰ کو فنا کے سمندر میں ارتھی بنا کر بہا دینگے ہم"۔ ساغر صاحب نے دشمن وطن کے بجائے اردو شاعری کو تحت الثریٰ میں گرا دیا ہے اور آخری مصرعہ تو فنا کا سمندر ہے جس میں تحت الثریٰ کی ارتھی بہی چلی جا رہی ہے۔ چونکہ سپنسر (Spenser) کے یہاں آخری سطر باقی سطروں سے لمبی ہوتی ہے تو آپ پر بھی فرض ہو گیا کہ ایک شیطان کی آنت کی طرح لمبا مصرعہ لگا دیں واقعی اجتہاد اسی کو کہتے ہیں!

جس قسم کے شاعروں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ان میں کچھ عقل پائی جاتی ہے لیکن اب ایک ایسا "خبطی شاعروں" کا اسکول ظہور میں آیا ہے جو وزن اور قافیہ اور ردیف سے پاک ہو کر بلینک ورس (Blank Verse) لکھتا ہے یہ خبطی اسکول بڑے زوروں پر ہے اور ہمارے ماہنامے ان کی "شاعری" سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ شاعر جو غالباً موزوں طبیعت نہیں رکھتے ہیں نظم معرا کی فرضی آڑ میں پناہ لینا چاہتے ہیں۔ لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اچھا بلینک ورس

انگریزی میں بھی بہت کم لکھا ہے۔ اسی صنف سخن میں ملٹن (MILTON) ورڈز ورتھ اور دو تین بڑے شاعروں کے سوا کوئی بھی کامیاب نہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک معمولی شاعر کے ہاتھ نظم معرا نثر بن کر رہ جاتی ہے۔ یہی حال ہمارے یہاں ہوا۔ نظم معرا میں جتنی نظمیں آجکل لکھی جاتی ہیں وہ نہ صرف قافیہ اور ردیف سے معرا ہوتی ہیں بلکہ معنی اور شعریت سے بھی۔ ملٹن اور ورڈز ورتھ جیسے شاعر صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں یہ دوسری بات ہے کہ ہر شاعر اپنے کو ملٹن یا ورڈز ورتھ تصور کرے

ہمارا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اُسی روش پر چلیں جس پر متقدمین چلے تھے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ اندھی اور غلامانہ تقلید سے اجتناب ضروری ہے۔ صرف اس لیے کہ انگریزی میں لوگ سانیٹ (SONET) لکھتے ہیں کیا فرض ہے کہ ہم بھی سانیٹ لکھیں۔ چونکہ انگریزی میں نائیٹ اینگل" (NIGHTINGALE) اور "کوکو" (CUCKOO) پر نظمیں لکھی گئیں ہیں۔ ہم پر واجب آتا ہے کہ ہم بھی بلبل اور کوئل پر نظمیں لکھیں۔ ٹی ایس۔ ایلیٹ کا قول ہے کہ اچھی شاعری کا گذشتہ شاعری سے ہمیشہ گہرا لگاؤ رہتا ہے۔ ہم اردو میں اچھی شاعری صرف اس وقت کر سکتے ہیں جب ہماری شاعری اور ماضی کی شاعری میں کوئی تعلق ہو۔ ہمیں چاہیئے کہ جو چیزیں ہمیں ورثہ میں ملی ہیں انہیں ترقی دیں۔ نہ کہ انگریزی فرانسیسی یا روسی شاعری کے خزانے سے کچھ چمکتے ہوئے پتھر اٹھا لائیں جن کی قدر و قیمت سے ہم خود اچھی طرح واقف نہیں۔ تس مشہور ہے۔ کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی چال بھول گیا

علی حسن (اسلامیہ کالج)

غزل

سکون کیوں نہ میسر ہو اضطراب کے بعد
زمانہ راہ پر آتا ہے انقلاب کے بعد

کشش بڑھیگی محبت کی انقلاب کے بعد
قریب اور کوئی ہوگا اجتناب کے بعد

صلاح عقل کی اپنی جگہ مسلّم ہے
مگر یہ بار اٹھاؤں گا میں شباب کے بعد

بغیر دھوپ کے سائے کی قدر کیا ہوتی
کرم کی شان دوبالا ہوئی عتاب کے بعد

نہ پوچھ کیفیت لذت شباب نہ پوچھ
کوئی شراب نہ پی میں نے اس شراب کے بعد

نکل ہی آئینگی اے قصدِ ہمکلامی شوق
سوال کرنے کی گنجائشیں جواب کے بعد

تمہیں بتاؤں تو شاید سمجھ میں آجائے
غم حساب ہے کیوں لطف بے حساب کے بعد

ہماری راہ لگا جو وہ کامیاب ہوا
چراغ جلتے رہے دورِ آفتاب کے بعد

ابھی تو جرم ہی کہہ کر نوازتے ہیں مجھے
نہ جانے کیا وہ بنائیں گے اس خطاب کے بعد

جرم محمد آبادی

مسلمانوں سے خطاب[1]

زمیں کا ذرّہ ذرّہ تھا تمہارے مدح خوانوں میں ‖ کہ تم سرچشمہ تہذیب تھے اگلے زمانوں میں
مسلمانو! تمہیں تھے غایتِ تخلیق انسانی ‖ تمہیں دینِ الٰہی کے تھے سچے پاسبانوں میں
تمدن میں تھے تم یکتا جہانبانی میں لاثانی ‖ رموزِ ملتِ بیضا کے تم تھے نکتہ دانوں میں

مسلمانو! تمہاری مفلسی میں درسِ عبرت ہے ‖ کہ تم تھے گوہرِ نایاب دنیا کے خزانوں میں
تمہاری کس مپرسی خون کے آنسو رلاتی ہے ‖ زمین و آسماں سب ہیں تمہارے نوحہ خوانوں میں
حکومت جا چکی، مذہب گیا، لیکن ڈر اب یہ ہے ‖ جگہ دے گا زمانہ تم کو ماضی کے فسانوں میں
نہ تم میں جذبۂ ایثار ہے باقی نہ خودداری ‖ مدد کو آئیں کیوں وہ رہتے جو ہیں آسمانوں میں
اگر اب بھی مدد اپنی نہ کی تم نے تو یہ سن لو ‖ گریں گی بجلیاں ہر دم تمہارے آشیانوں میں

مسلمانو! کھڑے ہو جاؤ اپنے پائے ہمت پر ‖ زمیں کیا ہے، فلک ہوگا تمہارے مہربانوں میں
دکھا دو زندگی کی کشمکش میں جوشِ اسلامی ‖ ہے مشکل گو تمہارا امتحاں سب امتحانوں میں
خدا کے نام پر آجاؤ میدانِ عمل میں تم ‖ جھکیں گی گردنیں ان کی جو ہیں نامہربانوں میں

مظفر کی نصیحت حرزِ جاں کر لو مسلمانو!
کہ مخلص ہے سراپا، گو نہیں ہے خوش بیانوں میں

مظفر الدین ندوی

---

[1] اورنگ آباد (ضلع گیا) میں مسٹر قدرت اللہ شہاب آئی سی ایس۔ ایس ڈی او اورنگ آباد) سب ڈویژنل آفیسر کے زیرِ صدارت ایک مشاعرہ ۸۔ مارچ ۱۹۴۳ء کو منعقد ہوا جس کا مصرعِ طرح یہ تھا۔ "تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں" ڈاکٹر سید مظفر الدین ندوی کی قومی نظم بہت زیادہ مقبول ہوئی۔ اس لیے قارئینِ کرام کی ضیافتِ طبع کے لیے "جدید اردو" میں شائع کی جاتی ہے۔

انگریزی شاہکار

ہاں — وہی

باغ کے وسیع گلاب زاروں پر شام کی شفقی روشنی چھائی ہوئی تھی۔ سکوت اور خاموشی کا یہ عالم تھا کہ موجوں کے ٹکرانے کی آواز بھی مدھم پڑ گئی تھی اس وقت باغ کے ایک کونہ میں اختری حزن و ملال کے عالم میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ہوا دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ ہوا کے ساتھ ساتھ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ رنج و غم کا سیاہ ناگ اختری کے چہرے پر ناچ رہا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کسی کو نہیں معلوم۔ شاید اس وقت قبر کا ایک گوشہ کھل گیا تھا

اختری آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے اٹھی اور سبزہ زار پر گشت کرنے لگی۔ گھاس بھیگی ہوئی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں کہنا شروع کیا "اس وقت چلنے کے لیے ہر شخص کو جوتے کی ضرورت پڑتی ہوگی کیونکہ جسم میں سردی کے سرایت کر جانے کا احتمال ہے۔"

پھر وہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ جونہی وہ بیٹھی اُس نے وہاں ایک پتھر دیکھا حالانکہ اس سے قبل اس کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ اختری اس پر غور کرنے لگی۔ آخر بات کیا ہے؟ یکایک اس کے دماغ میں ایک خیال آیا "ضرور کوئی مجھے خوفزدہ کرنے کے لیے یہاں پتھر رکھ گیا ہے" اس کے شبہات میں اضافہ ہونے لگا۔ یہاں تک کہ اُس نے چھونے تک کی ہمت نہ کی۔ اُس کا جسم تھر تھر کانپنے لگا اور اسی کیفیت میں وہ بھاگ گئی۔ گھر پہنچ کر اُس نے تمام کھڑکیوں کو بند کر دیا۔ اُس کا دل دھڑکنے لگا، آنکھیں جھپکنے لگیں، جسم لرزنے لگا۔ آخرکار دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہ سو گئی۔ خواب میں بھی وہی پتھر وہی ہیبتناک پتھر نظر آنے لگا۔ اب پتھر کی لمبائی بڑھ گئی تھی۔ پتھر پہاڑ معلوم ہونے لگا جس کے اندر بڑے بڑے غار ہوتے ہیں۔

جب صبح ہوتی ہے اور آفتاب کی قرمزی لمعہ افشانی تاریکی کو اپنے دامن میں چھپا لیتی ہے اس وقت ہم رات کی خوفناک باتوں پر ہنستے ہیں قہقہہ لگاتے ہیں۔ یہ انسان کی فطرت ہے۔ کیونکہ ہم رات کی تاریکی کو ایک سیاہ ناگن اور خوفناک بھوت کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ یہی حالت اختری کی بھی تھی۔ صبح کو لباس تبدیل کر کے اختری پھر باغ کے اسی گوشہ میں گئی جہاں اُسے پتھر نظر آیا تھا۔ دیکھا کہ اب تک پتھر موجود ہے۔

اُس نے پتھر کو اٹھایا۔ اب اُسے خوف معلوم نہیں ہو رہا تھا وہی چیز دن کے وقت ہاتھ میں تھی۔

"اسے دیکھنا چاہیئے۔ آخر یہ ہے کیا؟" وہ بولی۔ اُس نے پھر پتھر اٹھایا جو اچھا خاصہ بڑا تھا۔ جونہی اُس نے پتھر ہاتھ پر رکھا زمین پر ایک کاغذ پڑا دیکھا —— "اوہ! یہ تو خط کا لفافہ ہے۔ بالکل سفید" اختری نے لفافہ تھرکتے ہوئے ہاتھ سے اٹھایا، چاک کیا۔ دیکھا کہ بڑی اچھی تحریر میں کچھ لکھا ہوا ہے —— "آخر یہاں رکھا کس نے؟ اس کا نام نہیں ہے اور نہ دستخط" وہ پریشان سی ہو گئی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ خط کے مضمون کو پڑھنا چاہیئے۔ اس نے اس طرح پڑھنا شروع کیا:۔

وہ محبوب، جو ایک دوسرے سے جدا رہتے ہیں ان کے قلوب حقیقت سے ہٹ کر مجاز کی طرف بڑی تیزگامی کے ساتھ بڑھنے لگتے ہیں۔ نہ تو ان کی نظریں چار ہوتی ہیں اور نہ اُن سے خط و کتابت ہو سکتی ہے۔ وہ خط و کتابت کرنے کے لیے عجیب و غریب بہانے تلاش کرتے ہیں۔ اور وہ پپیہوں کے مقدس نغموں میں، پھولوں کی جانفزا خوشبو میں، بچوں کی سنہری مسکراہٹ میں، آفتاب کی تیز کرنوں میں ہوا کی تند رفتار آہوں میں، تاروں کی سرد روشنی میں غرض دنیا کی تمام چیزوں میں "محبت" کو ڈھونڈھتے ہیں۔ کیوں نہ ڈھونڈیں جبکہ خدا کی تمام مخلوق کا خمیر محبت سے اٹھایا گیا ہے۔ محبت ایک طاقتور حکومت ہے جیسے دنیا کی مخلوق اپنا اپنا پیغام پہنچایا کرتی ہے —— اے موسم بہار کی شگفتہ کلی! میں تمہیں یہ خط لکھنے کی جرأت کرتا ہوں۔"

خط پڑھ کر اختری دل ہی دل میں کہنے لگی۔ "محبت کرنا کتنی اچھی بات ہے؟ اور محبت کی جا لگتی کتنی حسین ہے؟ دل غیظ و غضب سے بہادر بن جاتا ہے۔ محبت ہی کسی چیز کا خیر نہیں مرف کسی کی مقدس روح رقص کناں ہوتی ہے۔ محبت کا کہیں سکن نہیں وہ تو کسی کے ہونٹوں کے تبسم میں پلتی ہے۔ بخشش اور برے خیالات محبت کی آغوش میں قائم نہیں رہ سکتے۔ بےشک اسی طرح جس طرح برف کے تودوں میں درخت کا اگنا غیر ممکن ہے۔ مقدس ...

نفسانی خواہشات پر غالب آجاتی ہے یہ آسمان کے تھرکتے ہوئے بادل، دنیا کے متحرک سایے، انسانوں کی نادانی، تعصب، فخر، غم و اندوہ سے بھی بالاتر ہے۔ محبت ہماری قسمت پر اس طرح ہلچل ڈالتی جس طرح زمین کی لرزش سے پہاڑ کی چوٹی کانپنے لگتی ہے

اگر دنیا میں محبت کا وجود نہ ہوتا تو یہ آفتاب جس کی کرنیں تمام دنیا کو روشن کرتی ہیں ماند پڑ جاتا" پریشان حال اختری کے دماغ میں الوہیت سے بھرے خیالات آنے لگے۔ وہ اس معمے کو بار بار سلجھاتی لیکن ہر مرتبہ ناکام ہو جاتی۔ رفتہ رفتہ اس کے دل میں ایک عجیب روشنی پیدا ہوئی جو کبھی اس نے تعلیم حاصل کی تھی اس میں محبت کا عنصر نہیں تھا۔ صرف روحانیت ہی پر اس کی تعلیم ختم ہوئی تھی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص جلتی ہوئی لکڑی کا تو ذکر کرتا ہے لیکن شعلے کا ذکر بالکل بھول جاتا ہے۔ خط کی اُن سطور کو جو کاغذ پر ستاروں کی طرح چمکتی ہوئی تھیں گر قطرہائے روح کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ لیکن آخر یہ خط کس کی طرف سے آیا تھا؟ راقم کون ہو سکتا تھا؟ جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔

یکایک اُس کے دماغ میں ایک خیال آیا ——— "ہاں وہی! اُس کے سوا کون ہو سکتا ہے۔ وہ شخص! ہاں وہ .... وہی!"

وہ بھاگتی ہوئی اپنے کمرہ میں گئی۔ کمرہ کی تمام کھڑکیوں کو اُس نے بند کر دیا۔ دوبارہ اس خط کو پڑھنے لگی۔ وہ از بر کرنے کی کوشش کر رہی تھی تاکہ عالم خیال میں اُسے گنگنا سکے۔ جب وہ اچھی طرح پڑھ چکی تو اُسے بوسہ دیا اور اپنے سینہ سے چمٹا لیا

اب اختری کے دل میں محبت مور کی طرح رقص کرنے لگی۔ اُس کے کان میں موسیقی کی روح پرور تانیں جھنکار پیدا کرنے لگیں۔ اسی جنون محبت کا اثر تھا کہ دن بھر اس پر بیہوشی کا عالم طاری رہا۔ وہ اپنے خیالات کو ایک جگہ مجتمع کرنے کی کوشش کرتی لیکن وہ پرواز کر جاتے وہ اب تک کانپ رہی تھی۔ معلوم نہیں کیوں؟ اُس کی حسین و جمیل صورت پر دھندلی سی پرچھائیں دوڑ رہی تھیں۔ آنکھوں کے پپوٹوں پر کوئی ساغر بکف لڑکھڑا رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر زردی سی چھا گئی اور جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ خیالات کے بحر ذخار میں غوطہ زن ہے۔ بالآخر وہ خود سے اس طرح گویا ہوئی ——— "کیا یہ حقیقت ہے؟" یہ کہکر اُس نے نامہ محبت کو جو سینہ پر رکھا ہوا تھا لرزتی ہوئی انگلیوں سے مس کیا۔ اپنے دھڑکتے ہوئے دل کے قریب لے گئی ——— "اگر ایسے موقعہ میں وہ آجائے ——— ہاں وہی میرا محبوب تو" وہ سوچنے لگی "جس نے مجھے نامۂ محبت ارسال کیا ہے۔ آہ وہی میرا پیارا ارشد!"

شام کے جھٹپٹے میں پھر وہ باغ میں گئی ——— اُس کے دماغ میں خیالات کی گنگا بہہ رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کے عقب میں کھڑا ہے مگر دیکھنے کی ہمت نہیں پڑتی کیونکہ ہمارے ساتھ اکثر مواقع اس طرح کے پیش آتے رہتے ہیں۔

چار و ناچار وہ مڑی۔ دیکھا وہی ——— ہاں وہی جس کی یاد میں اس کا جسم کانپتا تھا۔ روح خوش ہوتی تھی۔ وہ کھڑا تھا نظر کے سامنے۔ ننگے سر۔ اُس کے چہرے پر زردی کھنڈر رہی تھی۔ وہ سیاہ لباس زیب تن کیے تھا لیکن دیکھتے ہی اختری ڈر سی گئی۔ اور گرد کی تمام چیزیں سیاہ اور خوفناک معلوم ہو رہی تھیں جیسے موت رقص کر رہی ہو۔ اُس کی شکل الوداعی دن کی مدھم روشنی سے چمک اٹھی اور جسم روح کی جدائی سے کانپ سا گیا

وہ ہڈی کا ایک ڈھانچہ معلوم ہو رہا تھا انسانی شکل سے الگ بالکل عجیب۔ اس کی ٹوپی باغ کی روش پر رکھی ہوئی تھی۔

اختری کے سینہ میں سوزش تھی۔ ایک چنگاری سلگ رہی تھی۔ اس کی زبان پر مہر سکوت لگ گئی۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی کیونکہ سامنے کی کشش بڑھ رہی تھی۔ وہ بھی ایک قدم نہیں ہٹا۔

اختری نے ایک درخت کا سہارا لیا اور وہیں بیٹھ گئی۔ یکایک فضائے خاموش میں ایک آواز گونج اٹھی۔ نہایت شیریں آواز ——— جسے اختری نے کبھی نہ سنی تھی۔

"مجھے معاف کر دو۔ میں یہاں موجود ہوں۔ دیکھو میرا دل دھڑک رہا ہے۔ اب میں زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ کیا تم نے میرا خط پڑھا جسے میں نے یہاں رکھ چھوڑا تھا؟ کیا تمہاری آنکھیں مجھے پہچان سکتی ہیں؟ ڈر نہیں محبوبہ! مجھے معاف کر دو۔ میری زبان سے الفاظ نکل رہے ہیں لیکن مجھے معلوم نہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میری آمد تم پر بار گذر رہی ہو۔ کیا یہ سچ ہے؟"

"اوہ خدا!" وہ یکا یک چلا اٹھی۔

یہ کہہ کر زمین پر دھڑام سے گر پڑی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اُس کی روح پرواز کر گئی ہے لیکن اُس نے پکڑ لیا اور اپنے بازو کی گرفت میں لے لیا۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اس کا دماغ نامعلوم بوجھ سے دبا جا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے روشنی یکلخت غائب ہو گئی۔ خیالات کی پرچھائیں مٹ گئیں ——— اس کے سامنے گناہ کا سیاہ دیو قہقہے لگا رہا تھا اور باواز بلند کہہ رہا تھا ——— محبت کا پجاری محبت میں اندھا ہو جاوے اسی میں حقیقی راحت ہے

اختری کو کچھ ہوش آیا اور راشد کی انگلی اپنے دل کے اوپر لے گئی۔ راشد نے محسوس کیا ——— وہاں ایک کاغذ ہے۔ وہ متحیر ہو گیا۔

"کیا تم مجھ سے اب تک محبت کرتی ہو؟"

"تمہیں تو سب کچھ معلوم ہے میری روح" اختری نے اتنی دھیمی آواز سے جواب دیا کہ سانس کی رفتار میں مل کر غائب ہو گئی۔ جواب دیکر شرم و حجاب میں چور اختری نے اپنے سر کو راشد کے سینے پر رکھ دیا۔ دونوں میں ایک عجیب کشمکش جاری تھی۔ ستارے آسمان کی چھاتی پر مسکرا رہے تھے۔ آہ! کس طرح دونوں کے لبہائے شیریں ایکدوسرے سے چار ہوئے۔ کون کہہ سکتا ہے ———!

طائر خوش الحان اپنا الاہوتی نغمہ فضائے قدس میں کیوں چھیڑا کرتا ہے؟ برف کیوں حرارت سے پگھل جاتی ہے؟ گلاب کے غنچوں کے منھ کیوں پھوٹ جاتے ہیں؟ صبح کی صاف و شفاف لطافت پہاڑ کی چوٹی کے عقب والے درخت کو کیوں روشن کر دیتی ہے؟

جب دونوں نے اپنا اپنا پیام محبت ایک دوسرے کو کہہ سنایا تو اختری نے اپنے سر کو راشد کی آغوش سے اٹھا کر کہا ——— "پیارے!"

یہ کہہ کر دونوں محبت کی پاک فضا میں مدغم ہو گئے ———!

محمد یونس اختر۔ کلکتہ

غزل

موت وہ مانگے جو لذت کشِ بیداد نہیں
ناخنِ غم کا بدل تیشۂ فرہاد نہیں

عشق کی خانہ خرابی کا اثر ہے ہر سو
کون ویرانہ ہے ایسا کہ جو آباد نہیں

رفتہ رفتہ جو ہوا خوگرِ بیداد کوئی
ہائے بیداد کوئی مائلِ بیداد نہیں

آپنے وعدہ جو فرمایا یہی کیا کم تھا
اب نہ شرما کے یہ کہیئے کہ مجھے یاد نہیں

خانقہ بھی مگر آئی ہے نگہ کی زد میں
آج مرشد کے بھی لب پر کوئی ارشاد نہیں

گل گراں گوش چمن میں تھے تو گلچیں بیزار
شکر ہے مجھ سے گراں خاطرِ صیاد نہیں

ایک بلبل ہی نہیں گل کی محبت میں اسیر
سرو بھی باغ میں پابند ہے آزاد نہیں

تیرے وحشی کیلئے ہے یہی اک جائے پناہ
خوش ہوں ویرانے میں ہر چند کہ آباد نہیں

یوں ہوئی بعد مرے انکی جفا کی تکمیل
وہ مجھے بھول گیے میری وفا یاد نہیں

دیکھئے کیا ہو کہ بیخودؔ ہے بڑی مشکل میں
طاقتِ ضبط نہیں عادتِ فریاد نہیں

عباس علی خاں بیخود

ہماری شاعری

بہت لوگ ہمارے تخئیل و انداز غزل پر معترض ہیں۔ ہم جواب نہ دیتے مگر مجبور ہو گئے۔ دل کے سوئے ہوئے جذبات کو باد بہاری جگاتی ہے۔ تو گل و بلبل کی محبت کا طعنہ دینے لگتے ہیں۔ سبزۂ بیگانہ سے ارتباط قلب۔ صبح قفس کی اداسی اور شام اسیری کی داستان الم پر نہیں معلوم کتنے مضامین ہمارے خلاف لکھے گیے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حقیقت کی طرف ہمیں براہ راست دعوت دیتے ہیں مگر میں ان سے کہتا ہوں کہ کائنات کے ہر ذرے میں حقیقت کی جلوہ گاہیں ملتی ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ تم انہیں سے بچا کے ہمیں تصوف کی طرف بلاتے ہو۔ بتاؤ ہم کدھر سے آئیں۔ مجازہی کے رنگ محل میں حقیقت کا عکس اترتا ہے۔ نفسیات کے جنگل میں مجاز کے آثار ملتے ہیں۔ حقیقت کی جستجو میں ادھر ہی سے ہمیں جانا ہے۔ ہمارا وجود خود واجب الوجود کی دلیل ہے۔ ہماری خاطر آئے دن کے حوادث روز کے مصائب خزاں کا موسم بہار کا زمانہ۔ بیداری کے دن۔ نیند بھری راتیں۔ رات کی ظلمت۔ صبح کا اجالا۔ زندگی کے مزے۔ موت کی تلخی۔ پھولوں کا تبسم۔ شبنم کے آنسو۔ گورغریباں کی شام اور گلشن ہستی کے قدرتی مناظر اسی ایک کا پتا دیتے ہیں اپنے ہی پاس ہمیں آپ کے حقیقت کا کھوج لگانا ہے۔ ایسی طلب کیا کہ خود ہی کھوئے جائیں تو گم ہو جانے والا ڈھونڈھ کے کیا پائیگا۔

ہماری متاع تغزل میں بقول دوست پُرانا پن آگیا۔ ٹھیک ہے و لکل جدید لذۃ۔ مگر پھر خزاں باعث پریشانی کیوں ہے اور جب چھاؤں کے دن آتے ہیں ہزار دفعہ کے روندے ہوئے باغ میں کیوں جاتے ہو۔

یہ بلبلوں کا صہامشہد مقدس ہے ۔۔۔ قدم سنبھال کے رکھئیو یہ ترا باغ نہیں

تمہارے پاس کونسا اتنا سرمایہ ہے جو ہماری اسباب گرانمایہ پر ہنسی آتی ہے۔ ہمیں تو نصیب سے باغ کے پھول ملے۔ پھولوں کا رکھوالا تم کو چند غیر موضوع و معنی نامعلوم خود ساختہ ترکیبوں کے سوا کیا ملا ہے۔ وہی فطرت کی لے۔ نوا ہائے راز سوز و ساز مسئلہ ہمہ اوست و لطافت مانع دید یہی ناہ جن پر تم اترائے جاتے ہو۔ مگر ان کا مفہوم تم آپ نہیں سمجھتے سمجھاؤ گے کیا۔ ہم تو اپنے پھولوں کو اچھی طرح پہچانتے ہیں۔

ہمارا غلو تخئیل بادلوں تک جاتا ہے اور کبھی اُن سے بھی اوپر۔ یہ اوپر اوپر جانے والے تمہاری صراحیوں میں بھی شراب ٹپکاتے ہیں تمہیں دھیان رہے تم ہمہ اوست کے پجاری ہو۔ ہم نے مانا لیکن یہ تو بتاؤ جب دنیا کی ہر چیز میں قدرت کی تجلی ہے تو ہماری باغ میں کاہیکو بجلیاں گراتے ہو۔ عالم تصوف میں سے کوئی آنے والے تو ایسا نہیں کرتے۔

تمہیں اپنی بصیرت پر ناز ہے اور ہمارے کانوں میں ابھی تک ساز فنا کی حق معرفت کی صدا آرہی ہے۔ بڑے خوش نصیب ہو کہ تصوف کی گہرائیوں میں ہم سامان کے اتر آئے۔ ایسی ہماری بھی قسمت ہوتی تو ہم کہہ سکتے کہ اولیت کا سہرا ہمارے سر تم نے ہمارا انکار کیا ہے۔

تم مشرقی ہوا میں پلے۔ اسکول اور کالجوں میں پڑھے۔ مغرب کی صحبتوں میں بڑھے۔ اونچی جگہ پر جگہ ملی۔ مگر آسمان اُس سے بھی اونچا ہے۔ تمہاری جلوہ گاہ ساقی مست نگاہ مغربی صدقے میں۔ اور سے تمہیں کیا واسطہ۔ تمہاری محفل نشاط و بزم سرور اور تجلی گاہ وحدت کی سیر کہاں کی باتیں کرتے ہو۔ خدا سے نہیں ذرے چمن کی ایک ایک پکاری میں قدرت کے جلوے ہیں۔ پھر کسی روز ہی آفتاب میں سما جائینگے۔ سب جگہ خاک اڑنے لگیگی تم دیکھا کروگے۔ یہ سیدھی سادی باتیں ہیں۔ غزل کیلئے انہیں مشکل سے آزاد کرو۔ غزل بھی یہی چاہتی ہے۔ تصوف کے مسائل کی اُسے ضرورت نہیں اور نہ فلسفہ کی حاجت ہے کہ بیکار گرا ہیا ڈال سکے مذاق سلیم رکھنے والی طبیعتوں کو منتقص کرے اور نہ لاحول لا طائل مضامین کی ہے جو لکھنؤ کے پرانے کلام میں بیشتر جگہ پائے جاتے ہیں اور ایسی خانہ ترکیبوں سے بھی احتراز چاہئے کہ سننے اور نہ سمجھنے والے پر حیرت سی طاری ہو اور ڈھونڈنے والیکو ان کے دامن میں کچھ نہ ملے۔ غزل کہنے کیلئے دیوان حضرت ثاقب جو پیش لکھنوی کا مطالعہ کرو۔ اگر زمانے کی طبیعت اور حوادث روزگار سے تمہیں روشناس اور دل کے جذبات کی صورت کشی نہ کرے تو ہم ہیں مگر حضرت ۔۔۔ تو پھر دل بھی اب ہو رہے گئے میں ثاقب نہ ہے مولی کو جو لایا ہیں تو زمانہ نہ تھا

ابو الخیر لکھنوی

شریف ڈاکو

پہلا اور دوسرا منظر

پہلا، دوسرا، تیسرا شخص .... تماشائی
بڈھا فقیر .... رستم زماں مشہور ڈاکو
قاضی شہر .... گماشتہ شاہ فیروز
اکرام خاں .... رستم زماں کا ساتھی
شہسوار .... امیر سکندر
مریم .... رستم زماں کی عاشق زار محبوبہ
جمیلہ .... مریم کی سہیلی
بوڑھی عورت .... اکرام خاں کی بیوہ ماں
شاہ فیروز .... امیر شاہ سکندر کا بھائی
محافظ .... شاہ فیروز کا آدمی
بابا فریدوں .... رستم زماں کا ساتھی بہت ہی حلیم حکیم، فقیر منش
چندو .... رستم کا ساتھی
جمال .... رستم زماں کا باورچی

پہلا منظر

(جشن نوروز کا دن ہے۔ ایک بہت ہی وسیع وکشادہ میدان میں لوگ اکرام خاں کی پھانسی کا دردناک منظر دیکھنے کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔)

پہلا شخص:- اب جشن نوروز کی خوشیاں کہاں؟ آہ! آج کا دن کس قدر غم والم کا آئینہ دار ہے! وہ دیکھو! سامنے پھانسی کا تختہ صاف دکھائی دے رہا ہے۔ کاش! آج بھی وہاں نوروز کے نقرئی زرد جھنڈے فضا میں رقص کرتے ہوتے!!

دوسرا شخص:- ہاں بھائی! آج وہاں کی فضا بھی خاموش اور اداس ہے حسین لڑکیوں کے دلکش گیتوں کی ایک لہر بھی کانوں سے نہیں ٹکراتی۔ آہ! آج اس روح پرور سبزہ زار میں ایک پری پیکر رقاصہ بھی نہیں!!

(رستم زماں ایک بڈھا فقیر کے بھیس میں مجمع میں داخل ہو جاتا ہے۔ ایک آنکھ پر سبز کپڑے کی پٹی بندھی ہے)

بڈھا فقیر:- (پہلے شخص سے) جناب! کیا یہ وہی جگہ ہے جہاں بدقسمت اکرام خاں کو پھانسی دی جائیگی؟

پہلا شخص:- ہاں بابا! وہ روح فرسا سانحہ جلد ہی منظر عام پر آنیوالا ہے

بڈھا فقیر:- اونہہ! ایسا خیال مت کیجئے۔ خدا کارساز ہے ممکن ہے کہ اس ظلم کی تکمیل کے قبل ہی کوئی خونریز جنگ بپا ہو جائے یا بیکس اور مجبوروں کی امداد کے لیے فرشتے آسمان سے کود پڑیں

پہلا شخص:- بابا! تمہیں کیا معلوم کہ اس وقت کتنی تلواریں قاضی شہر کے آدمیوں کے سروں پر چمکنے کے لیے نیام میں بے قرار ہیں! کاش! اس وقت یہاں رستم زماں موجود ہوتا۔

تیسرا شخص:- ارے! کچھ اور بھی سنا؟ لوگ کہتے ہیں کہ غاصب شاہ فیروز آج مریم (محبوبہ رستم زماں) کی تلاش میں جنگلوں کی طرف نکل گیا ہے

بڈھا فقیر:- (پریشان ہو کر) کیا یہ خبر صحیح ہے؟

تیسرا شخص:- ہاں بابا! لوگ کہتے ہیں کہ مریم کو رستم زماں کے عشق نے جنگل پہنچا دیا۔ اب وہ [illegible] ساتھ رہتی ہے

دوسرا شخص:۔ خدا بدطینت شاہ فیروز کے چنگل سے حسین مریم کو محفوظ رکھے! ایک گھنٹہ ہوتا ہے کہ میں نے شاہ فیروز کو جنگل کی طرف جاتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

بڈھا فقیر:۔ (زیادہ پریشان ہو کر) حضور کو دھوکا تو نہیں ہوا ہے؟

دوسرا شخص:۔ نہیں بابا! بلکہ شاہ فیروز کے ساتھ تین محافظ بھی تھے

پہلا شخص:۔ صرف تین محافظ؟ شاید اسے معلوم ہو گیا ہو کہ آج رستم زماں کے آدمی جنگل کے باہر گھوم رہے ہونگے۔ بھائی! مجھے یقین ہے کہ اکرام خاں کے تختہ پر چڑھنے کے قبل ہی شاہ فیروز کے تخت کی بازی نہ لگ جائے۔

بڈھا فقیر:۔ ہاں جناب! شاید ایسا ہی ہو۔ مجمع میں ہر شخص کے کان میں یہ بات ڈال دیجئے۔ (آہستہ آہستہ بڑبڑاتا ہے) شاہ فیروز کو مریم کی تلاش میں کافی دیر لگے گی۔ لیکن خدا میری پیاری مریم کو اس درندے کے چنگل سے بچائے! مجھے جلد واپس ہونا چاہئے۔ بیشک مجھے جلدی جنگل واپس چلنا چاہئے۔ آہ اے میرے خدا! تو میری حسین مریم کو ہر آفت ومصیبت سے محفوظ رکھنا۔

دوسرا شخص:۔ بابا! کسی کا گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ تمہارے جھریوں والے جسم کے اندر ہاتھی کا کلیجہ اور شیر کا دل چھپا ہے۔

پہلا شخص:۔ ارے وہ دیکھو! قاضی شہر اپنے آدمیوں کے ساتھ آ رہا ہے۔ اُف! ان لوگوں کے بیچ میں اکرام خاں بھی رسن بستہ ہے

(اکرام خاں کے آنے سے مجمع میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ آہ اگرچہ بیچارے اکرم خاں کا چہرہ سفید پڑ گیا ہے لیکن اب بھی اس کی ہر حرکت سے بہادری کی شان نمایاں ہے)

دوسرا شخص:۔ بیشک! اکرم خاں رستم زماں کا ساتھی ہے۔ ایک بہادر کا دوست بہادر ہی ہوگا۔

قاضی شہر:۔ محافظ! مجمع کو پیچھے ہٹا دو۔ اور دیکھو! اکرام خاں کو پھانسی دینے میں دیر مت کرو۔

چند عورتیں:۔ (مجمع میں چلا کر) آہ! آہ! ...... حسین .... نوجوان ...... نوخیز کلی ....

بڈھا فقیر:۔ (مضطرب ہو کر) حضور! اب کیا ہو رہا ہے؟ ضعف بصارت [illegible]

پہلا شخص:۔ معلوم نہیں کہ قاضی شہر غصہ میں لال پیلا کیوں ہو رہا ہے

دوسرا شخص:۔ ہاں، ہاں! لوگوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں کہ اب تک جلاد نہیں آیا

تیسرا شخص:۔ قاضی شہر کا حکم ہے کہ دیر نہ کی جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اکرام خاں کو پھانسی پر کون لٹکائیگا؟

بڈھا فقیر (دھکا دیکر) مجھے قاضی شہر کے پاس جانے دو۔ مجھے اس سے کچھ کہنا ہے

تماشہ بین:۔ بابا دھکا کیوں دیتے ہو؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟

بڈھا فقیر:۔ میں کہتا ہوں کہ مجھے قاضی شہر کے پاس جانے دو اس کو میری بڑی ضرورت ہے

قاضی شہر:۔ کیا ہے؟ کیا ہے؟ تمہیں کیا کام ہے؟

بڈھا فقیر:۔ جناب عالی! مجھے اکرام خاں سے بہت ہی دیرینہ عداوت ہے، اجازت دیجئے کہ میں اس مردود کو قعر جہنم میں بھیجدوں

آواز:۔ آہ، آہ! بڈھا خبیث بھیڑیا۔

قاضی شہر:۔ اچھا! آؤ۔ جلدی کرو

بڈھا فقیر:۔ حضور والا! میں پھانسی نہیں دیتا۔ لیکن میں اپنے تیر سے ساٹھ گز کے فاصلے پر سے ایک پتلی رسی تک کو بآسانی کاٹ سکتا ہوں

قاضی شہر:۔ اچھا! تو پھر تیر ہی سے اس کا جلد خاتمہ کر دو۔ ہاں دیکھ پہلے اپنا راستہ صاف کر لو۔

(لوگ راستہ چھوڑ کر دو قطار کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بڈھا فقیر تیر اور کمان لے کر دور کھڑا ہو جاتا ہے)

آواز:۔ آہ، آہ: خونی بھیڑیا۔

بڈھا فقیر:۔ جناب من! میں یکے بعد دیگرے دو تیر مار کر اس کے ہاتھ میں بندھی ہوئی رسی کو کاٹ دونگا۔ پھر تیسرا تیر اس کے سینہ ہی میں پیوست ہوگا۔

(بڈھا فقیر تیر چلاتا ہے۔ تیر ٹھیک نشانہ پر پڑتا ہے اور گرہ کٹ جاتی ہے)

قاضی شہر:۔ (غصہ ہو کر۔ دیکھو دیکھو! تم نے ایک طرف کی رسی کاٹ ڈالی

بڈھا فقیر:۔ [illegible] اب ہوشیار رہوں گا۔ دیکھئے: [illegible]

جہاد پر چلے جانے کے بعد اس کے بھائی شاہ فیروز نے بغیر انتخاب عام کے تخت غصب کر لیا۔ لوگوں نے صدائے احتجاج بلند کرنی چاہی۔ لیکن اس کے پنجہ استبداد نے ان آوازوں کو لوگوں کے گلے ہی میں گھونٹ کر رکھ دیا۔ میں نے چند لوگوں کے ساتھ علم بغاوت بلند کر کے جنگل میں بود و باش اختیار کر لی ہے اب صرف ملک کے غریبوں اور ناداروں کی خوراک کی بہم رسانی کو مقصد حیات تصور کرتا ہوں۔ اور اب رستم زماں کے نام سے یاد کیا جاتا ہوں۔

شہسوار :۔ اگر میں تمہیں اپنا گھوڑا نہیں دوں تو؟

رستم زماں :۔ میرے محسن! تو پھر میں مجبور ہو جاؤں گا کہ گھوڑے کو زبردستی حاصل کروں۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ میں آزاد انسان ہوں۔ میرے نزدیک انسانی قوانین کی اہمیت ایک مکڑی کے جالے سے زیادہ نہیں۔ لیکن میں انسان ہوں۔ انسانیت کے دائرہ سے کسی طرح آزاد نہیں۔ جناب مجھے معاف فرمائیں چونکہ اس وقت ایک شریف خاتون کی حیات و موت کا سوال ہے اس لیے میں اپنے محسن تک کے ساتھ اتنی رذالت پر اتر آیا ہوں۔

شہسوار :۔ (ہنس کر) اچھا! میرا گھوڑا لے لو۔ میں تمہارے ساتھیوں کے ہمراہ آتا ہوں۔ جاؤ خدا کی امداد تمہارے شامل حال ہو۔

(رستم زماں گھوڑے پر سوار ہو کر فوراً نظروں سے غائب ہو جاتا ہے)

دوسرا منظر

(ایک بہت ہی گھنے جنگل میں گھاس، پھوس کا ایک جھونپڑا ہے۔ باہر کے سائبان میں ایک بوڑھی عورت اور دو پری پیکر دوشیزہ لڑکیاں ہیں)

مریم :۔ (انگڑائی لے کر) آہ! یہ جاں گسل انتظار! کسی کے انتظار کی گھڑیاں موت سے بھی زیادہ کٹھن ہیں۔ (بوڑھی عورت سے) دیکھو اماں! محبت میں تمہاری طرح میں بھی خود غرض ہونے لگی ہوں تمہیں صرف اپنے بیٹے کا خیال ہے۔ اور مجھے صرف ان کا دھیان رہ گیا ہے۔ (ہنس کر) بوڑھی ماں! گھبراؤ نہیں۔ میرے ...... وہ تمہارے پیارے بیٹے اکرام خاں کو موت کے منہ سے نکال کر اپنے ساتھ لا رہے ہوں گے۔ پیاری جمیلہ! تمہارا کیا حال ہے؟ وہ کتنی دیر باہر رہیں گے؟ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ بس وہ آتے ہی ہوں گے۔ دیکھو نا! آفتاب آسمان کی کافی بلندی پر چڑھ چکا ہے۔ اب تو درخت کے کسی پتے پر شبنم کا ایک قطرہ بھی نہیں۔

جمیلہ :۔ ہاں بہن! دل چھوٹا مت کرو۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ رستم زماں اور اکرام خاں جلدی ہی آ جائیں گے۔ دیکھو! اس ڈال پر کوا بول رہا ہے (کوا بولتا ہے) کیوں بے کوا! اِدھر کے وہ آ رہے ہیں نا؟ اکرام خاں بھی؟ کیا تو ان ہی کا پیغام سنا رہا ہے؟ ...... ہاں ...... (بوڑھی عورت بدستور خاموش رہتی ہے۔ مریم جمیلہ کے حسین رخسارے پر ایک طمانچہ رسید کر دیتی ہے) بوڑھی ماں اتم گھبرا کر ہم لوگوں کو بھی گھبرائے دیتی ہو۔ آؤ! میرے ساتھ چلو۔ تم میرے بستر پر تھوڑی دیر سو رہو تمہارے بیدار ہونے کے قبل ہی اکرام خاں پہنچ جائیگا۔

(جمیلہ بوڑھی عورت کو جو ہر وقت اپنے بیٹے ہی کے لیے دعائیں مانگتی ہے۔ جھونپڑی کے اندر لیجا کر بند کر دیتا ہے۔ پھر خود بخود بڑبڑاتی ہے)

بیوقوف سٹھیا گئی ہے۔ ہر وقت صرف اپنے بیٹے ہی کی واپسی کیلئے دعائیں مانگتی رہتی۔ جیسے دوسروں کی جانوں کو کوئی خطرہ نہیں۔ (یک بیک چیخ اٹھتی ہے)۔ اوئی میرے اللہ! ...... وہ ...... وہ ...... کیا ہے؟

(جمیلہ ایک جھاڑی کی طرف غور سے دیکھنے لگتی ہے)

مریم :۔ دیکھو جمیلہ! مجھے یہ بات اچھی نہیں لگتی۔ تم نے مجھے کیا ڈرا دیا۔ اب تک میرا کلیجہ دھک دھک کر رہا ہے۔

جمیلہ :۔ نہیں بہن! مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے جھاڑی میں سے کوئی جھانک رہا ہو۔ دیکھو نا! وہ سامنے والی جھاڑی ابتک ہل رہی ہے۔

(شاہ فیروز اپنے ایک ساتھی کے ساتھ جھاڑی سے نمودار ہوتا ہے۔ مریم اور جمیلہ چیخ مار کر ایک دوسرے سے لپٹ جاتی ہیں)

جہاد پر چلے جانے کے بعد اس کے بھائی شاہ فیروز نے بغیر انتخاب عام کے تخت غصب کر لیا۔ لوگوں نے صدائے احتجاج بلند کرنی چاہی۔ لیکن اس کے پنجۂ استبداد نے ان آوازوں کو لوگوں کے گلے ہی میں گھونٹ کر رکھدیا۔ میں نے چند لوگوں کے ساتھ علم بغاوت بلند کر کے جنگل میں بود و باش اختیار کر لی ہے اب غریب ملک کے غریبوں اور ناداروں کی خوراک کی بہم رسانی کو مقصد حیات تصور کرتا ہوں۔ اور اب رستم زماں کے نام سے یاد کیا جاتا ہوں۔

شہسوار :۔ اگر میں تمہیں اپنا گھوڑا نہیں دوں تو؟

رستم زماں :۔ میرے محسن! تو پھر میں مجبور ہو جاؤنگا کہ گھوڑے کو زبردستی حاصل کروں۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ میں آزاد انسان ہوں۔ میرے نزدیک انسانی قوانین کی اہمیت ایک مکڑی کے جالے سے زیادہ نہیں۔ لیکن میں انسان ہوں۔ انسانیت کے دائرہ سے کسی طرح آزاد نہیں۔ جناب مجھے معاف فرمائیں چونکہ اس وقت ایک شریف خاتون کی حیات و موت کا سوال ہے اس لیے میں اپنے محسن تک کے ساتھ اتنی رذالت پر اتر آیا ہوں۔

شہسوار :۔ (ہنسکر) اچھا! میرا گھوڑا لے لو۔ میں تمہارے ساتھیوں کے ہمراہ آتا ہوں۔ جاؤ خدا کی امداد تمہارے شامل حال ہو۔

(رستم زماں گھوڑے پر سوار ہو کر فوراً نظروں سے غائب ہو جاتا ہے)

دوسرا منظر

(ایک بہت ہی بڑے جنگل میں گھاس، پھوس کا ایک جھونپڑا ہے۔ باہر کے سائبان میں ایک بوڑھی عورت اور دو پری پیکر دوشیزہ لڑکیاں ہیں)

مریم :۔ (انگڑائی لے کر) آہ! یہ جاں گسل انتظار! کسی کے انتظار کی گھڑیاں موت سے بھی زیادہ کٹھن ہیں۔ (بوڑھی عورت سے) دیکھو اماں! محبت میں تمہاری طرح میں بھی خود غرض ہونے لگی ہوں۔ تمہیں صرف اپنے بیٹے کا خیال ہے۔ اور مجھے صرف ان کا دھیان رہ گیا ہے۔ (ہنسکر) بوڑھی ماں! گھبراؤ نہیں۔ میرے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ تمہارے پیارے بیٹے اکرام خاں کو موت کے منہ سے نکال کر اپنے ساتھ لا رہے ہونگے۔ پیاری جمیلہ! تمہارا کیا حال ہے؟ وہ کتنی دیر باہر رہیں گے؟ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ بس وہ آتے ہی ہونگے۔ دیکھو نا! آفتاب آسمان کی کافی بلندی پر چڑھ چکا ہے۔ اب تو درخت کے کسی پتے پر شبنم کا ایک قطرہ بھی نہیں۔

جمیلہ :۔ ہاں بہن! دل چھوٹا مت کرو۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ رستم زماں اور اکرام خاں جلد ہی آجائیں گے۔ دیکھو! اس ڈال پر کوا بول رہا ہے (کوّا سے) کیوں بے کوّا! اڑ کے وہ آرہے ہیں نا؟ اکرام خاں بھی؟ کیا تو ان ہی کا پیغام سنا رہا ہے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں ۔ ۔ ۔ (بوڑھی عورت بدستور خاموش رہتی ہے۔ مریم جمیلہ کے حسین رخسارے پر ایک طمانچہ رسید کر دیتی ہے) بوڑھی ماں! تم گھبرا کر ہم لوگوں کو بھی گھبرا دیتی ہو۔ آؤ میرے ساتھ چلو۔ تم میرے بستر پر تھوڑی دیر سو رہو تمہارے بیدار ہونے کے قبل ہی اکرام خاں پہنچ جائیگا۔

(جمیلہ بوڑھی عورت کو جو ہر وقت اپنے بیٹے ہی کے لیے دعائیں مانگتی ہے۔ جھونپڑی کے اندر لیجا کر بند کر دیتی ہے۔ پھر خود بخود بڑبڑاتی ہے)

بیوقوف سٹھیا چکی ہے۔ ہر وقت صرف اپنے بیٹے ہی کی واپسی کیلئے دعائیں مانگتی رہتی۔ جیسے دوسروں کی جانوں کو کوئی خطرہ نہیں۔ (یک بیک چیخ اٹھتی ہے)۔ اوئی میرے اللہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا ہے؟

(جمیلہ ایک جھاڑی کی طرف غور سے دیکھنے لگتی ہے)

مریم :۔ دیکھو جمیلہ! مجھے یہ بات اچھی نہیں لگتی۔ تم نے مجھے کیا ڈرا دیا۔ دیکھ تک میرا کلیجہ دھک دھک کر رہا ہے۔

جمیلہ :۔ نہیں بہن! مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے جھاڑی میں سے کوئی جھانک رہا ہو۔ دیکھو نا! وہ سامنے والی جھاڑی اب تک ہل رہی ہے۔

(شاہ فیروز اپنے ایک ساتھی کے ساتھ جھاڑی سے نمودار ہوتا ہے۔ مریم و جمیلہ چیخ مار کر ایک دوسرے سے لپٹ جاتی ہیں)

پہلا شخص :۔ (ساتھیوں سے) بھائی! مجھے یقین ہے کہ اس شخص
کا تیر اکرام خاں کے سینہ ہی میں اپنی جگہ بنا کر رہیگا
(بڈھا فقیر تیر پھینکتا ہے۔ مجمع میں ایک شور مچ جاتا ہے)

قاضی شہر :۔ ہوشیار! ہوشیار!! تم نے پھر باقی رسیوں
کو بھی کاٹ ڈالا۔

بڈھا فقیر :۔ جناب! ذرا صبر سے کام لیجئے۔ میں تو ابھی اس کو صرف
کھلا رہا ہوں۔ لیجئے یہ رہا تیسرا تیر۔
(بڈھا فقیر تیزی سے تیر مارتا ہے۔ ایک زخمی کے کراہنے
کی آواز آتی ہے۔ مجمع میں شور و غوغا بپا ہو جاتا ہے)

پہلا شخص :۔ اب اس تیر انداز نے کیا کیا؟

دوسرا شخص :۔ ارے اس نے تو قاضی شہر ہی کے آدمی کو مار ڈالا

قاضی شہر :۔ (دانت پیسکر) اف! کتنا بڑا فریب ہے!! یہ کیسی
غداری ہے!!! (مجمع سے) خبردار! اگر کوئی شخص ذرا
بھی اپنی جگہ سے ہلیگا تو میں اس کے سینے میں اپنا خنجر
توڑ دوں گا۔

بڈھا فقیر :۔ اکرام خاں! اکرام خاں!! جلد مقتول کا خنجر اٹھالو۔

قاضی شہر :۔ میرے محافظو! جلد آؤ۔ اُف! خدا اس غدار کو غارت کرے
(بڈھا فقیر تن کر کھڑا ہو جاتا ہے اور قاضی شہر کے آدمیوں
کو دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیتا ہے۔ اس کشمکش میں فقیر
کا لبادہ اس کے جسم پر سے گر پڑتا ہے)

پہلا شخص :۔ (چلا کر) اوہ! جنگل کا بادشاہ، ڈاکوؤں کا سردار
رستم زماں!!
(بگل بجتا ہے۔ بہت سے تماشا بین اپنا اپنا دھقانی
لبادہ پھینک کر رستم زماں سے جا ملتے ہیں۔ رستم زماں
اور اس کے کچھ ساتھی اکرام خاں کو تلواروں کی چھاؤں
میں لے لیتے ہیں۔ اور بہت سے آدمی قاضی شہر کے
آدمیوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

قاضی شہر :۔ (متحیر ہو کر) معاذ اللہ! یہ تو وہی رستم زماں ہے جس کی
رہزنی کا قصہ سن کر دور دور ملک کے لوگ کانپ اٹھتے
ہیں۔ ... سے ... جو ... اس ڈاکو کا سر کاٹ کر لائیگا

اسے شاہی خزانے سے بہت ہی انعام ملیگا۔ ہاں بہادرو!
جلدی کرو۔ اپنی اپنی تلوارے سونت لو۔ دیکھو خزانے
کا منہ کھل چکا ہے
(قاضی شہر کے آدمی رستم زماں کی چھوٹی سی جماعت
کو گھیر کر ہر طرف سے تلواریں چلاتے ہیں۔ اسی وقت ایک
نقاب پوش شہسوار ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے
ہاتھ میں ڈھال لیے نمودار ہوتا ہے)

نقاب پوش شہسوار :۔ (غضبناک ہو کر) ایسی بے غیرتی! اتنی نامردی!! تم
لوگوں کو ذرا بھی شرم نہیں آتی کہ ہزاروں کی تعداد میں
ایک مٹھی بھر انسان پر اس بے رحمی سے حملہ کر رہے ہو۔
خبردار کمینو! اگر تم لوگوں نے ذرا بھی اپنی تلواروں کو حرکت
دی تو تم سبھوں کے سر خاک و خون میں غلطاں ہونگے
(رستم زماں کے آدمیوں سے) جنگل کے شیرو آؤ! ان
خونی ناپاک بھیڑیوں کو ان کے مسکن تک ہنکا دیں۔
(رستم زماں کے ساتھی پوری بہادری سے حملہ آور ہوتے
ہیں۔ قاضی شہر کے آدمیوں کے پاؤں میدان سے اکھڑ
جاتے ہیں اور وہ سب کے سب بھاگ کھڑے ہوتے ہیں)

رستم زماں :۔ (اپنے آدمیوں سے) دوستو! ہم لوگوں کو بہت ہی جلد
جنگل واپس چلنا چاہئے۔
(رستم زماں کی نظر نقاب پوش شہسوار پر پڑتی
ہے جو مسلح اپنے گھوڑے کے پاس کھڑا ہے۔

رستم زماں :۔ جناب عالی! میں آپ کے اس احسان کے بارگراں
سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ صرف شکریہ کے
چند رسمی جملے آپ کے احسان عظیم کا معاوضہ نہیں ہو سکتے
لیکن ابھی اور آپ کو اپنی بہادری اور انسانی ہمدردی
کا ثبوت دینا ہے۔ حضور مجھے اپنا گھوڑا عاریتاً عنایت
فرمائیں۔ میرے آدمی جناب کو جنگل میں غریب خانہ
پر لے آئیں گے۔ مجھے شاید وہاں کچھ خدمت کرنے
کا موقع نصیب ہو جائے۔

شہسوار :۔ تمہارا نام؟

رستم زماں :۔ پہلے میرا نام نوزاب سکندر تھا۔ شاہ سکندر کے

جہاد پر چلے جانے کے بعد اس کے بھائی شاہ فیروز نے
بغیر انتخاب عام کے تخت غصب کر لیا۔ لوگوں نے صدائے
احتجاج بلند کرنی چاہی۔ لیکن اس کے پنجۂ استبداد نے
ان آوازوں کو لوگوں کے گلے ہی میں گھونٹ کر رکھ دیا۔
میں نے چند لوگوں کے ساتھ علم بغاوت بلند کر کے جنگل میں
بود و باش اختیار کر لی ہے اب صرف ملک کے غریبوں
اور ناداروں کی خوراک کی بہم رسانی کو مقصد حیات تصور
کرتا ہوں۔ اور اب رستم زماں کے نام سے یاد کیا جاتا ہوں۔

شہسوار:۔ اگر میں تمہیں اپنا گھوڑا نہیں دوں تو؟

رستم زماں:۔ میرے محسن: تو پھر میں مجبور ہو جاؤنگا کہ گھوڑے کو زبردستی
حاصل کروں۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ میں آزاد انسان ہوں۔ میرے
نزدیک انسانی قوانین کی اہمیت ایک مکڑی کے جالے
سے زیادہ نہیں۔ لیکن میں انسان ہوں۔ انسانیت کے
دائرہ سے کسی طرح آزاد نہیں۔ جناب مجھے معاف فرمائیں
چونکہ اس وقت ایک شریف خاتون کی حیات و موت
کا سوال ہے اس لیے میں اپنے محسن تک کے ساتھ اتنی
رذالت پر اتر آیا ہوں۔

شہسوار:۔ (ہنسکر) اچھا! میرا گھوڑا لے لو۔ میں تمہارے ساتھیوں
کے ہمراہ آتا ہوں۔ جاؤ خدا کی امداد تمہارے شامل حال ہو۔
(رستم زماں گھوڑے پر سوار ہو کر فوراً نظروں سے غائب
ہو جاتا ہے)

دوسرا منظر

(ایک بہت ہی بڑے جنگل میں گھاس، پھوس کا ایک
جھونپڑا ہے۔ باہر کے سائبان میں ایک بوڑھی عورت
اور دو پری پیکر دوشیزہ لڑکیاں ہیں)

مریم:۔ (انگڑائی لے کر) آہ! یہ جاں گسل انتظار!! کسی کے انتظار
کی گھڑیاں موت سے بھی زیادہ کٹھن ہیں۔ (بوڑھی عورت
سے) دیکھو اماں! محبت میں تمہاری طرح میں بھی خود غرض
ہونے لگی ہوں۔ تمہیں صرف اپنے بیٹے کا خیال ہے۔ اور
مجھے صرف ان کا دھیان رہ گیا ہے۔ (ہنسکر) بوڑھی ماں:
گھبراؤ نہیں۔ میرے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ تمہارے پیارے
بیٹے اکرام خاں کو موت کے منہ سے نکال کر اپنے ساتھ لارہے
ہونگے۔ پیاری جمیلہ! تمہارا کیا حال ہے؟ وہ کتنی دیر باہر
رہیں گے؟ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ بس وہ آتے ہی ہونگے۔
دیکھو نا! آفتاب آسمان کی کافی بلندی پر چڑھ چکا ہے۔ اب
تو درخت کے کسی پتے پر شبنم کا ایک قطرہ بھی نہیں۔

جمیلہ:۔ ہاں بہن! دل چھوٹا مت کرو۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔
رستم زماں اور اکرام خاں جلد ہی آجائیں گے۔ دیکھو!
اس ڈال پر کوا بول رہا ہے (کوا سے) کیوں بے کوا! اِنّہ
کے وہ آرہے ہیں نا؟ اکرام خاں بھی؟ کیا تو انہی کا پیغام
سنا رہا ہے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں ۔ ۔ ۔ (بوڑھی عورت بدستور
خاموش رہتی ہے۔ مریم جمیلہ کے حسین رخسارے پر ایک
طمانچہ رسید کر دیتی ہے) بوڑھی ماں! تم گھبرا کر ہم لوگوں کو
بھی گھبرائے دیتی ہو۔ آؤ! میرے ساتھ چلو۔ تم میرے بستر
پر تھوڑی دیر سو رہو تمہارے بیدار ہونے کے قبل ہی اکرام
خاں پہنچ جائیگا۔
(جمیلہ بوڑھی عورت کو جو ہر وقت اپنے بیٹے ہی کے لیے
دعائیں مانگتی ہے۔ جھونپڑی کے اندر لیجا کر بند کر دیتی ہے۔ پھر
خود بخود بڑبڑاتی ہے)
بیوقوف سٹھیا چکی ہے۔ ہر وقت صرف اپنے بیٹے ہی کی
واپسی کیلئے دعائیں مانگتی رہتی۔ جیسے دوسروں کی جانوں
کو کوئی خطرہ نہیں۔ (یک بیک چیخ اٹھتی ہے)۔ اوئی میرے اللہ!
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا ہے؟
(جمیلہ ایک جھاڑی کی طرف غور سے دیکھنے لگتی ہے)

مریم:۔ دیکھو جمیلہ! مجھے یہ بات اچھی نہیں لگتی۔ تم نے مجھے کیا
ڈرا دیا۔ اب تک میرا کلیجہ دھک دھک کر رہا ہے۔

جمیلہ:۔ نہیں بہن! مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے جھاڑی میں سے کوئی
جھانک رہا ہو۔ دیکھو نا! وہ سامنے والی جھاڑی اب تک
ہل رہی ہے۔
(شاہ فیروز اپنے ایک ساتھی کے ساتھ جھاڑی سے
نمودار ہوتا ہے۔ مریم اور جمیلہ چیخ مار کر ایک دوسرے
سے لپٹ جاتی ہیں)

شاہ فیروز :۔ آہا! یہاں میری خوبصورت شیرنی اپنے غار میں چھپی ہے
(مریم جمیلہ کو اشارہ کرتی ہے۔ جمیلہ اس کو چھوڑ کر
فوراً جھونپڑی میں چلی جاتی ہے)
میری جان! تم نے بہت اچھا کیا کہ اپنی سہیلی کو ہٹا دیا
میں تو تم سے تخلیہ ہی میں کچھ کہنا چاہتا تھا (ساتھی سے)
اچھا محافظ! تم بھی ہٹ جاؤ۔ (محافظ ہٹ جاتا ہے)
آہ! یہ عالم بیداری ہے یا دنیائے خواب؟ میں کیا دیکھ
رہا ہوں؟ کیا محسوس کر رہا ہوں؟ کیا یہ حقیقت ہے کہ
کہ میری جفا کار ستم شعار سنگدل محبوبہ کچھ کچھ محبت
سے آشنا ہو رہی ہے؟ میری روح رواں! دیکھو
جنگل کے باہر برق رفتار گھوڑا تمہارے لیے موجود ہے۔
ہاں! اس کی رکاب بہت دیر سے تمہارے حسین
وجمیل پاؤں کی قدم بوسی کے لیے بیقرار ہے۔

مریم :۔ ٹہرو، ٹہرو! مجھے سوچنے دو۔ آہ مجھے سوچ لینے دو۔

شاہ فیروز :۔ اچھا! مجھے اپنا خوبصورت حنائی ہاتھ دو تاکہ میں
اس کو چوموں، اپنے سینہ سے لگاؤں۔ آہ! تم اپنے
عاشق، اپنے پوجنے والے سے خون کھاتی ہو؟ دیکھو!
میری جبین نیاز اپنے تمام جذبۂ عبودیت کے ساتھ تمہارے
آستانہ حسن پر سجدہ ریز ہے۔ اے سرمایۂ عشق!
کاش تمہیں معلوم ہوتا کہ تمہارے عشق کی آگ کس طرح
دن اور رات میری ہڈیوں تک کو سلگائے رہتی ہے!!

مریم :۔ تمہیں جنون ہو گیا ہے۔ خبردار! مجھے ہاتھ مت لگاؤ

شاہ فیروز :۔ واللہ پیاری! تم نے سچ کہا۔ میں کب کا ہوش و خرد سے
بیگانہ ہو چکا ہوں۔ تمہیں کیا معلوم کہ تمہارے عشق ہی نے
مجھے پاگل بنا کر صحرا نوردی سکھا دی ہے۔ اب تو تمہیں
زنجیروں کی فکر کرنی ہوگی۔
(جمیلہ تیر اور کمان لا کر مریم کو دے دیتی ہے۔ مریم
چشم زدن میں دور جا کر کھڑی ہو جاتی ہے اور کمان
تان کر شاہ فیروز کی طرف نشانہ کرتی ہے)

مریم :۔ خبردار! تم اپنے دل میں یہ خیال مت کر لینا کہ مجھ میں بھی
ایک عورت کی فطری کمزوری موجود ہے۔ میں ایسی بہادر
ہوں جیسے کوئی لڑکی درندے جانوروں کا دودھ پی
کر جنگل ہی میں جوان ہوئی ہو۔ مجھے تیر اندازی میں بھی
کافی مہارت ہے اور میں اپنے دشمن کے ساتھ بہت ہی
سفاک ہوں۔ خبردار ناپاک کتے! اگر تم نے ایک قدم
بھی آگے بڑھایا تو خدا کی قسم میں تیر مار کر تمہیں وہیں پر ڈھیر
کر دوں گی۔

شاہ فیروز :۔ مریم! پیاری مریم!! مجھ سے ہوش کی باتیں مت کرو
میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکا ہوں۔ آہ! میں تو تمہاری
محبت میں خود کھو گیا ہوں۔

مریم :۔ بدنامی و رسوائی کے پتلے! اپنی زبان سنبھال۔ میں اب
زیادہ ناپاک جملے نہیں سن سکتی۔ دیکھ اپنا خنجر دور
پھینک دے۔

شاہ فیروز :۔ میری جان! دیکھ۔ میں اپنی جان کی قسم کھاتا ہوں،
کہ مجھے تجھ سے عشق ہے

مریم :۔ ذلیل کتے! معلوم ہوتا ہے کہ تیری شامت آئی ہے۔
اچھا! سامنے والے درخت کی اس شاخ کو دیکھ۔
(مریم تیر چلاتی ہے۔ شاخ فوراً کٹ کر نیچے آ جاتی
ہے)
تم نے میرا نشانہ دیکھ لیا؟ اب اپنے خنجر کو دور پھینک دو
(شاہ فیروز اپنے خنجر کو پھینک دیتا ہے لیکن اس کا
ساتھی چھپ کر مریم کی پشت کی جانب پہنچ جاتا ہے)

جمیلہ :۔ (چلا کر) مریم! مریم!! دیکھو تمہارے پیچھے ایک آدمی ہے
(وہ شخص تیزی سے بڑھ کر مریم کے دونوں بازوؤں کو
پکڑ لیتا ہے۔ پھر شاہ فیروز آ کر اسے اپنی گرفت میں
لے لیتا ہے)

شاہ فیروز :۔ اب بولو میری پیاری حسین شیرنی! پھندے میں
بری طرح پھنس گئی نا؟ اچھا! اب ہم لوگوں کو وقت
برباد نہیں کرنا چاہئے۔ میں تم سے شاہی محل ہی میں اس
معاملے پر بحث کروں۔ تم روٹھو گی۔ میں مناؤں گا
تم بگڑو گی۔ میں معافی چاہوں گا۔ سمجھیں؟ (محافظ سے)
او محافظ! ذرا ان کی چہیتی سہیلی کو پکڑ لے جانا

میں اس "حسن شعلہ زن" کے لیے کافی ہوں! واللہ آج مجھ سا خوش نصیب روئے زمین پر کوئی نہیں۔

(تعجب سے) ارے مریم! یہ تم کیا کر رہی ہو؟

(مریم آہستہ سے اپنا خنجر نکال لیتی ہے۔ پھر شاہ فیروز کو معمولی سا زخم لگا کر اپنا ہاتھ چھڑانے میں کامیاب ہو جاتی ہے)

مریم :۔ خونی بھیڑیے! میں متنبہ کرتی ہوں کہ تم واپس چلے جاؤ تمہیں شرم نہیں آتی کہ ایک کمزور و بے بس عورت سے قوت آزمائی کرتے ہو؟

شاہ فیروز :۔ لو پیاری! اگر تمہیں یہی منظور ہے تو میری یہ ناچیز جان حاضر ہے۔ کیا تمہیں پسند ہے کہ تمہاری نازک ہتھیلیوں پر رنگِ حنا کے بدلے تمہارے عاشق کا خون جمے؟ اچھا! اگر تمہاری خوشی اسی میں ہے تو میں تمہارے خنجر کو اپنے سینہ میں جگہ دینے کے لیے تیار ہوں۔ لو! جلدی کرو!

(رستم زماں اس کی پشت کی جانب سے ایک جھاڑی سے ظاہر ہوتا ہے)

نہیں، پیاری نہیں! تم ایسا نہیں کر سکتی ہو۔ تمہارا نازک دل کبھی تمہیں اس کی اجازت نہیں دے گا۔

رستم زماں :۔ (آہستہ سے) شاہ فیروز!

شاہ فیروز :۔ (گھبرا کر) محافظ! محافظ!! جلد اپنی تلوار نیام سے باہر کر لو

(رستم زماں اپنی تلوار کھینچ لیتا ہے اور ایک درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ شاہ فیروز کے اور دو محافظ جنگل سے نکل پڑتے ہیں)

رستم زماں :۔ آ جاؤ! میں تم چاروں کے لیے تنہا کافی ہوں لاحول ولا قوۃ! ایک کمزور لڑکی ہی سے لڑنے میں ہانپنے لگے۔ اچھا اپنے سروں کی حفاظت کرو ورنہ وہ حشرات الارض کے لیے سامان خوراک بن جائیں گے۔

(رستم زماں شاہ فیروز کے ایک آدمی کو نہتا کر دیتا ہے)

شاہ فیروز :۔ میرے بہادر محافظو! تینوں مل کر اس پہ ٹوٹ پڑو اور اس کو اپنی جگہ سے ہٹا دو۔ ہاں دیکھو! درخت کی آڑ مت لینے دو۔

رستم زماں :۔ آخاہ! جناب کی صرف زبان ہی میں قوت ہے بس! حکم نادری؟ اگر ذرا ہمت ہے تو خود مقابلہ میں کیوں نہیں چلے آتے؟

(رستم زماں ہوشیاری سے وار کرتا ہے۔ شاہ فیروز کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ جاتی ہے۔ پھر وہ پلٹ کر دوسرے محافظین کا مقابلہ کرتا ہے۔ شاہ فیروز جلد اپنا خنجر اٹھا کر اس کی پیٹھ میں بھونک دینا چاہتا ہے۔ اسی وقت دور سے بگل بجنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ نقاب پوش شہسوار بجلی کی سرعت سے پہنچ کر شاہ فیروز کے بازو کو اپنے آہنی پنجے میں دبا لیتا ہے اور اس کا اسلحہ چھین کر رستم زماں کی مدد کے لیے پہنچ جاتا ہے)

شہسوار :۔ (گرج کر) بے شرم کتو! اس ایک کے مقابلہ کیلئے تم چار! خبردار! اپنی اپنی تلوار نیام میں کر لو۔

(تینوں محافظ ڈر کر بھاگ جاتے ہیں۔ شاہ فیروز حیران و ششدر رہ جاتا ہے اور وہ حیرت سے نووارد کے چہرہ کو تکتا ہے۔ اس کو چاروں طرف سے رستم زماں کے آدمی گھیر لیتے ہیں۔)

شاہ فیروز :۔ (خود بخود بڑبڑاتا ہے) کون ہے؟ ... کون؟ ... تم ہو؟ یا تمہاری روح؟ نہیں نہیں یہ تمہاری روح نہیں۔

رستم زماں :۔ (ساتھیوں سے) ان کتوں کو بھاگنے دو۔ لیکن اس کمینے کو لیجا کر جھونپڑی میں قید کر دو۔

(رستم زماں کے آدمی شاہ فیروز کو باندھ کر ایک جھونپڑی کی طرف لے چلتے ہیں)

شاہ فیروز :۔ (ایک شخص سے) بھائی خدا کے لیے مجھے ایک بات بتا دو۔ وہ نقاب پوش کون ہے؟

شخص :۔ بھائی! مجھے معلوم نہیں۔ جو کوئی بھی ہو وہ تمہارا دشمن ہی ہو گا

(رستم زماں سے) میں اس شخص کا نام قصداً دریافت

شہسوار :۔ کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ ممکن ہے کہ میرے دل کو اس سے کچھ صدمہ پہنچے۔

رستم زماں:۔ مجھے آپ کی شرافت اور بہادری پر نہایت ہی حیرت ہے آپ اپنے دشمن تک کا نام اس حالت میں معلوم کرنا نہیں چاہتے؟ آہ! میرے پاس الفاظ نہیں جو میرے جذبۂ تشکر کی صحیح ترجمانی کر سکیں

شہسوار:۔ اگر ایسا ہے تو اس قیدی کو مجھے دے ڈالو میرا خیال ہے کہ اس کی جان کا جائز حقدار میں ہی ہو سکتا ہوں

رستم زماں:۔ بدل وجان منظور، حضور نے تو مجھے بھی پنجۂ موت سے چھڑایا اس سے بڑھ کر ایک ایسے شخص کی جان بچائی جس کے بغیر میری زندگی سنسان ہو جاتی یا ایک پریشان خواب میں ہمیشہ کے لیے تبدیل ہو جاتی لیکن یاد رکھئے! حضور ایسے شخص کو مانگ رہے ہیں جو صرف میرے ہی سفر زندگی میں سنگ گراں نہیں بلکہ شاہ سکندر کے تخت کے لیے مستقل خطرہ ہے۔

شہسوار:۔ غیر! دوسروں کی بہ نسبت میرے معلومات اس معاملے میں زیادہ وسیع ہیں۔

رستم زماں:۔ شاید ایسا ہی ہو۔ اچھا محافظو! اس قیدی کو جلد واپس لے آؤ۔

(شاہ فیروز حاضر کیا جاتا ہے۔ نقاب پوش شہسوار کو دیکھتے ہی اس پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے)

رستم زماں:۔ جناب قیدی حاضر ہے۔ اب اس کے معاملہ میں آپ کو پورا پورا اختیار ہے

شہسوار:۔ اچھا اس کو جانے دو۔

محافظین:۔ (متحیر ہو کر) ایں یہ کیا؟ حضور ایسے شخص کو آزاد کر رہے ہیں۔

رستم زماں:۔ خبردار! خاموش! تعمیل حکم!!!

(محافظین شاہ فیروز کو کھول دیتے ہیں)

شہسوار:۔ (خشمگیں ہو کر) جاؤ! جاؤ!! جلد میری نظر سے دور ہو جاؤ!!!

شاہ فیروز:۔ (حیرت سے)۔ اُف! یہ کون شخص ہے؟

شہسوار:۔ جلد چلے جاؤ میں نہیں چاہتا کہ زیادہ دیر تک تمہارا ناپاک سایہ [illegible]

(شاہ فیروز وہاں سے لرزہ براندام چلا جاتا ہے)

رستم زماں:۔ چھوڑیئے! ہم لوگوں کو ان ناخوشگوار واقعات کے ساتھ اس شخص کو بھی بھول جانا چاہیے۔ ہاں جناب یہاں کا یہ دستور ہے کہ اس جنگل میں جو شخص بھی مل جاتا ہے اس کو ہم لوگوں کا مہمان بننا پڑتا ہے۔ کیا جناب ہم لوگوں کی دعوت کو شرف قبولیت نہیں بخشیں گے؟

شہسوار:۔ ہاں، ہاں! یہ بہت ہی اچھا خیال ہے۔ آج دن بھر مجھے ایک دانہ بھی نصیب نہیں ہوا ہے۔

رستم زماں:۔ اگر حضور ذرا اپنے نقاب کو الٹ دیتے تو بہت ہی اچھا ہوتا۔ ہم لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ یہ شریف بہادر کون ہے

شہسوار:۔ بھائی! ابھی مجھے نقاب پوش ہی رہنے دو۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم وہی رستم زماں ہو جو اس ملک کے امیروں کو لوٹتا ہے اور قانونی ممانعت کے باوجود شاہی شکارگاہ میں جانوروں کو مارتا ہے۔

رستم زماں:۔ ہاں جناب! بے شک میں وہی ہوں لیکن یہ سب غریبوں کی امداد کے لیے کرتا ہوں۔ ہم لوگوں کا یہ اعتقاد ہے کہ خداوند تعالیٰ نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے اس نے تمام نوع انسان کے لیے یہ فلک نیلگوں، یہ فرش زمردیں، یہ سمندر، اور ہوا سے بھری ہوئی یہ فضائے بسیط پیدا کیا ہے۔ خدا کا قانون عالمگیر ہے اس کی رحمت کے لیے بلند و پست کا امتیاز نہیں یہ ہمارا پیدائشی حق ہے کہ ہم کھلی فضا میں آزادی سے سانس لیں۔ اس کی زمین پر بغیر کسی قانونی بندشوں کے ہم آزادانہ پھریں، اس کے نعمتوں سے بغیر کسی رکاوٹ کے متمتع و بہرہ اندوز ہوں۔ اگر کسی بادشاہ کی حیثیت صرف امین کی ہو تو اس کے قانون کی پابندی میں چنداں مضائقہ نہیں۔ کیونکہ یہ اسی عالمگیر قانون کی ایک کڑی ہے۔ لیکن ایسے شخص کو [illegible] کے لیے کوئی جگہ [illegible]

غاصبانہ قبضہ کرکے رعایا کی گردن کو اپنے پاؤں کے نیچے رکھنا چاہتا ہو۔ جو یہ چاہتا ہو کہ مزدوروں کا خون، اور یتیموں کے آنسو پانی بنیں اور اس ظلم کی بنیاد پر اس کا قصر شاہی تیار ہو۔ جو انسان کو اس کے جائز حقوق سے محروم کرکے، خدا کی عام نعمتوں کو صرف اپنی عیش پرستی کا سامان بنائے۔ پھوس کی بے سقف جھونپڑیوں اور مٹی کی شکستہ چہار دیواریوں سے بے کس و بیواؤں کے دردناک نالے تو فضا میں بلند ہوں لیکن ان کے عالیشان فلک بوس محلوں میں بدمستیوں کے رنگین قہقہے گونجیں۔

شہسوار: ۔ بے شک، بے شک، تمہارا کہنا بہت بجا و درست ہے

رستم زماں: ۔ تو پھر آپ کو ایسے غاصب بادشاہ کے جنگل میں شکار کیے ہوئے ہرن کو کھانے میں کچھ پس و پیش تو نہ ہوگا؟

شہسوار: ۔ پس و پیش؟ آہا... ہا... ہا... ارے بھائی! میں تو اس کو اپنی بوا چیز کھوں گا۔

(چند آدمی ایک سایہ دار درخت کے نیچے کو بلند چبوترے پر کھانا تیار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مریم اور جمیلہ جھونپڑی کے دروازہ پر ظاہر ہوتی ہیں۔ جمیلہ کھانا تیار کرنے میں ہاتھ بٹانے کے لیے چلی جاتی ہے)

رستم زماں: ۔ میں نے جناب کا ابھی مریم سے تعارف ہی نہیں کرایا چلئے! تھوڑی دیر مریم سے باتیں کریں۔

(شہسوار رستم زماں کے ساتھ مریم سے گفتگو کرنے کے لیے چلا جاتا ہے)

جمال: ۔ (چبوترے کے پاس بڑبڑاتا ہے) میں نے طشت میں قورمہ، پلاؤ، بالائی، دھی، میٹھا چاول، مرغ کباب ہرن کا کوفتہ سجا دیا ہے۔ اب بہترین چائے بھی بنانی چاہیے۔

(بابا فریدوں اکرام خاں کو لے کر چند آدمیوں کے ساتھ داخل ہوتا ہے)

رستم زماں: ۔ آہا! سب بڑے ہی وقت پر پہنچے۔ اکرام خاں جلد اپنی ماں کے پاس جاؤ۔ وہ تمہارے لیے بہت ہی بیقرار ہے۔

(اکرام خاں امی جان امی جان چلاتے ہوئے جھونپڑی میں چلا جاتا ہے۔)

بابا فریدوں: ۔ (رستم سے) بیٹا! کیا یہ خیال کرتے ہو کہ یہ چھوکرا (اکرام خاں) دوڑ کر آیا ہوگا؟ ارے جس وقت پھانسی کی رسی گردن میں محسوس ہوتی ہے تو بڑے بڑے بہادر کا خون ان کے اعضا ہی میں خشک ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور ابھی تو یہ ایک کمسن بچہ ہی ہے۔

رستم زماں: ۔ (مذاق سے) بابا! ہر شخص کو اپنے ہی وزن سے تولتے ہو۔ اچھا! اگر تم دوڑتے دوڑتے بہت تھک گئے ہو تو پہلے بیٹھ کر خوب ہانپ لو۔

بابا فریدوں: ۔ (ہنس کر) بیٹا! مجھے اس سے انکار نہیں کہ تھک گیا ہوں لیکن کیا تم میرے تن و توش کی وجہ سے مجھے کھوکھلا سمجھتے ہو؟ ارے! میرے کل اعضا بہت ہی ٹھوس ہیں ٹھوس۔ میں ایسا مضبوط ہوں جیسے کسی خانقاہ کی عمارت پتھر سے تیار کی گئی ہو۔

(بابا فریدوں اپنے عریض و طویل توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بیٹھ کر ہانپنے لگتا ہے۔)

رستم زماں: ۔ (ہنس کر) ہاں بابا! اس سے بڑھ کر کہ خانقاہ کے پیر مرشد کے ایمان کی طرح ٹھوس۔ (شہسوار سے) جناب! ان کی ساری موٹائی اور ان کی گنبد نما توند بکرے کے گوشت ہی کی رہین منت ہے جس وقت یہ کھانا کھاتے ہیں تو گوشت کے ساتھ ان کی اچھی خاصی کشتی قابل دید ہوتی ہے جس وقت بابا کے سامنے پیالے میں خوب مارتی ہوئی چائے آ جاتی ہے تو ان کی خوشنودی و مسرت کے سامنے بیچاری برہا کی ماری پپیہا اپنے پیا کی رٹ بھول جاتی ہے۔ اس وقت بابا حد درجہ خوش الحانی سے عاشقانہ غزل گانے لگتے ہیں کہ اگر بدقسمتی سے کوئی ناکام محبت سن پائے تو پھر تڑپ تڑپ ہی کر اپنی جان دیتا ہے

(قہقہہ)

جمیلہ :۔ (وہاں آکر) جناب! کھانا تیار ہے۔

بابا فریدون :۔ (تو ند پہ ہاتھ پھیر کر) جمیلہ ... جمیلہ ... جمیلہ ... جمیلہ! اس وقت تم نے کتنی اچھی خوشخبری سنائی اف! "کھانے" کا لفظ کانوں کو کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے!

(سب لوگ چبوترہ کے گرد بیٹھ جاتے ہیں۔ اکرام خاں بھی اپنی ماں کے ساتھ آجاتا ہے)

جیند ہو :۔ (بیوقوف کی صورت بنا کر) کیا میرے لیے کوئی جگہ نہیں؟

ایک شخص :۔ ہاں، ہاں آؤ۔ ادھر آجاؤ!

بابا فریدون رستم بیٹا! دعا مانگنا مت بھولو۔

رستم زماں :۔ (کھڑا ہو کر شہسوار سے) جناب! ہم لوگوں کا یہ بھی معمول ہے کہ امیر شاہ سکندر کی واپسی کیلئے سب مل کر دعا مانگتے ہیں۔ اور اس کی یاد میں کھانے کے قبل ایک پیالی چائے پیتے ہیں۔ بابا فریدون اسی کو یاد دلا رہے ہیں

(شہسوار کے سوا سب کھڑے ہو جاتے ہیں)

آواز :۔ خدا جہاد سے امیر شاہ سکندر کو جلد وطن واپس لائے!

(سب پیالی خالی کر کے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں)

رستم زماں :۔ (حیرت سے) سخت تعجب ہے کہ جناب اس دعا میں شریک نہیں ہوئے؟ میرا تو گمان تھا کہ آپ ہمارے امیر کے حامی و طرفدار ہیں۔

شہسوار :۔ آپ میرے لیے پریشان ہیں۔ مجھے اس امیر سے دلی ہمدردی ہے چونکہ میں اس وقت زرہ بکتر میں بند ہوں اس لیے دعا میں شرکت نہ کر سکا۔ (مریم سے) اچھا مریم! یہ تو بتاؤ کہ رستم زماں سے تمہاری شادی کے لیے کون سا مبارک دن مقرر ہوا ہے

مریم :۔ (شرما کر) جب امیر جہاد سے وطن واپس آئے۔

شہسوار :۔ جب امیر وطن واپس آئے؟ آہ! یہ کتنا شیریں نغمہ ہے جو اس ہرے بھرے جنگل میں طائر بہار کی طرح ہر شخص گا رہا ہے: "امیر وطن واپس آئے!" اس جملہ سے قلب کو کتنی خوشی و راحت حاصل ہوتی ہے۔

مریم :۔ یہ بہت ہی خوشی کی بات ہے کہ جناب کو بھی ہمارے امیر سے کافی محبت ہے

رستم زماں :۔ لیکن حضور اب تک نقاب پوش ہیں۔ اور کچھ کھاتے ہی نہیں۔ کیا جناب اب بھی اپنا نقاب نہیں اٹھائیں گے؟

شہسوار :۔ آہ رستم! بھوک اور پیاس انسان کو بے نقاب ہی کر کے رہتی ہے

(شہسوار کھڑا ہو کر اپنا مغفر اور نقاب اتار دیتا ہے اور امیر سکندر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے)

رستم زماں :۔ (حیرت سے) شاہ سکندر!

(سب آدمی اچھل کر تعظیم سے کھڑے ہو جاتے ہیں)

سب لوگ :۔ (خوشی میں چلا کر) کون؟ ہمارا امیر، غریبوں کا سہارا سلطنت کا امین

رستم زماں :۔ جناب! میرا گمان اسی وقت ہوا کہ یہ نقاب پوش شہسوار ہمارا امیر ہی ہو سکتا ہے جبکہ ہم لوگوں کی زندگیاں یاس و ناامیدی کے پردہ ظلمت میں چھپ رہی تھیں اور اکرام خاں کی شمع زندگی موت کے تیز و تند جھونکے میں تھرتھرا رہی تھی۔ لیکن اس وقت آپ تیرہ و تلوار کی کرنوں کے جلو میں خاور مشرق کی طرح، سکون و مسرت کا پیام لے کر ہمارے افق حیات پر نمودار ہوئے۔

امیر شاہ سکندر :۔ (ہنس کر) رستم! سچ کہتے ہو۔ بیشک! عام انسانوں سے ایک عاشق کی ہستی جداگانہ ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کے حساس دل پر خدائی الہام ہوا کرتا ہے۔ اور اکثر سارے واقعات وقوع پذیر ہونے کے قبل ہی اس کی نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔ اچھا سنو! آج سے پھر سکندر پور کی نظام مملکت تمہارے سپرد ہوتی ہے۔ اور کل دربار میں شاہی اہتمام سے مریم کے ساتھ تمہارا نکاح ہوگا۔

(سب لوگ امیر سکندر کو اس طرح تلواروں کے سائے میں لے لیتے ہیں۔ گویا اس کو پھر سے امیر منتخب کرتے ہیں)

(انگریزی سے آزاد ترجمہ)

مترجمہ شاہ خلیل الرحمٰن لکھنوی۔

غزل

چارہ گر مشکل مریض غم کا درماں ہوگیا
دور ہو کر دردِ دل ازیبِ رگ جاں ہوگیا

اُن کے رخ پر منتشر گیسوئے پیچاں ہوگیا
دل کی اُلجھن بڑھ گئی بے حد پریشاں ہوگیا

رحمت باری کو سنکر غرق عصیاں ہوگیا
زاہد و نذرِ بتاں کیا یوں ہی ایماں ہوگیا

وہ جنوں افزا بہار آئی دیار عشق میں
مسکن دیوانگاں کوہ و بیاباں ہوگیا

بادۂ عشق و محبت سے بڑھیں وہ مستیاں
شیشہ و پیمانہ وقف طاق نسیاں ہوگیا

پھر پرسش آیا جب تیر نگاہ ناز ادھر
دیدۂ زخم جگر خونابہ افشاں ہوگیا

داغ دل اک اک مرا صبح وطن کی یاد میں
اِن دنوں روشن کن شام غریباں ہوگیا

حشر عالم میں ہو نالوں سے بلا جانے میری
ضبط ہونا تھا جو کچھ تا حد امکاں ہوگیا

بیٹھا رہتا ہے وہیں کیا جانے کیوں شام و سحر
تیرا دیوانہ تو وقف باب زنداں ہوگیا

راہ بتلائی ہے انگلی کے اشارے سے مجھے
خضر جادہ آج ہر خار مغیلاں ہوگیا

تشنہ کامی سے ہوا ہوں میں سکندر کا حریف
بوسۂ لب میری خاطر آب حیواں ہوگیا

عشق نے کامل بنایا ہستی ناچیز کو
دیکھو مسجود ملائک ایک انساں ہوگیا

ناز سے پیدا تلوّن ہے نیاز عشق میں
گاہ خنداں ہوگیا میں گاہ گریاں ہوگیا

امتیاز شوق جانبازاں تھا مقتل میں نہیں
کوئی بسمل رہ گیا تو کوئی بے جاں ہوگیا

بندگی اس صاحب لولاک کی کرتا ہوں میں
ہر شہنشاہ زماں جس کا مگس راں ہوگیا

دل سے باہر یہ نکل سکتا نہیں اے چارہ گر
درد پر ذوق اپنا اب امیدوار ماں ہوگیا

پھر سنور لینا کبھی آ جاؤ دم بھر کے لیے
اب مریض ہجر کا کچھ اور ساماں ہوگیا

الحذر الحذر اس قدر جوشش جنوں میں ہے اثر
ہاتھ ابھی پہنچا نہیں پرزے گریباں ہوگیا

فتح پائی ہے سخن کی رزم گہ میں اے سلیم
بارک اللہ رستم سام و نریماں ہوگیا

سلیم فہمی

آپا

وہ بڑی استانی تھی، گورنمنٹ گرلس اسکول کی، وہ نہایت متین اور سنجیدہ عورت تھی اور تہذیب و شائستگی اس کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی۔ اس کا طرز تمدن اور استانیوں سے بالکل علٰحدہ تھا۔ وہ اکثر کسی سے نہیں بولتی وہ حد درجہ کم سخن اور شائستہ مزاج عورت تھی اور کسی سے زیادہ راہ و رسم نہ رکھتی تھی، وہ بھلی اور اس کا کام بھلا تھا لیکن اس طرز تمدن سے اس کی ماتحت استانیاں اس سے قدرے بدظن ہوگئی تھیں، وہ سمجھتی تھیں کہ یہ بہت مغرور اور خود دار عورت ہے اور اپنے تئیں بڑی قابل سمجھتی ہے، اور گاؤں والے خیال کرتے کہ یہ بالکل نااہل اور بودی ہے اور اپنی شباب انگیز عمر اور حسن کی رعنائیوں پر اترا رہی ہے لیکن حقیقتاً یہ بات نہ تھی، ان کی تمام قیاس آرائیاں بالکل فضول تھیں۔ بات دراصل یہ تھی کہ وہ تھی شہری تہذیب و تمدن کی علمبردار۔ اُسے ان دیہاتوں سے مطلق دلچسپی نہ تھی، ان کے طور طریقے اور مجلسیں سب اس کے لیے غیر دلچسپ تھیں۔ وہ چاہتی تھی نئی روشنی کی پروردہ، بلند خیال لڑکیاں جیسی شہر میں ہوتی ہیں، اور سوشیل، کلب سینما، تھیٹر وغیرہ۔ لیکن یہ بند بے کیف دیہاتی فضا اسے سوئیاں اور کانٹوں کی طرح محسوس ہوتی تھی۔ سچ ہے اگر سمندری مچھلی کو کنویں میں چھوڑ دیا جائے تو اُسے وہ لطف ہرگز نہیں آسکتا۔ مگر کرتی کیا گورنمنٹی ملازمت تھی۔ اپنے کوئی بس کی بات نہ تھی جو طبیعت کے مطابق کرتی لیکن جب سے وہ یہاں آئی اس کی شہری لطف آفریں مجلسیں اور کیف انگیز ماحول سب عنقا بن گئے اس میں شائبہ نہیں کہ اس کی زندگی اب ایک مقید بلبل کی طرح تھی۔ ایک تو تمام دن اسکول میں مغز پچی کرنا پھر شام کو فرض کی ادائیگی سے فرصت ملی تو امور خانہ داری میں ہمہ تن مصروف ہو جانا۔ واقعی ایک شہری ماحول میں نشو و نما پائی ہوئی لڑکی کے لیے یہ ناقابل برداشت دن تھے۔

آفتاب کی لرزہ براندام آخری شعاعیں اور افق کی تاریکیوں میں تھکے ماندے مسافروں کی طرح بیٹھی جا رہی تھیں اور مشرق سے سرمئی دھندلکے کہر پھیلاتے ہوئے ابھر رہے تھے۔ آج وہ اسکول سے قبل از وقت چلی آئی۔ امور خانہ داری سے فارغ ہو کر ایک انگریزی کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی کہ کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔ دو برقع پوش عورتیں پچھلے دروازے سے آ رہی تھیں قریب آتے ہی انھوں نے سلام کیا اور پاس کی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ اس نے پوچھا

"کیسے چلی آئیں آپ لوگ، کہئے میرے لائق کوئی خدمت؟"

"تکلف نہ کیجئے استانی صاحبہ، یونہی ہم دونوں ملاقات کے لیے چلی آئیں" اُن میں سے ایک نے کہا اور دوسری جذبات میں سرملاتے ہوئے مسکرا رہی تھی "پکوان سے فارغ ہو چکیں آپ؟"

"جی ہاں پکوان ختم کر لیا" اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا "لیکن آج تمام دن طبیعت کچھ مضمحل سی رہی اس لیے اسکول سے بھی پیشتر چلی آئی"

"خیر تو ہے؟" ایک نے حیران کن لہجہ میں کہا۔

"سردی کے دن ہیں" دوسری نے ذرا متانت سے کہا

"جی ہاں، لیکن میں جب سے یہاں آئی ہوں مجھے کسی دن مکمل سکون نہیں ملا" وہ کہا لینے لگی پھر بولی "کیا عرض کروں شگوفہ ذرا فرصت نہیں ملتی ہر وقت ایک نہ ایک کام لگا رہتا ہے۔ اس اضطرابی میں میرا مطالعہ بھی خراب ہوتا جا رہا ہے"

"آپ کسی کو نوکر کیوں نہیں رکھ لیتیں؟"

"کیا کہوں شگوفہ" اس نے انتہائی مضمحل لہجہ میں کہا "کسی سے اتنی شناسائی بھی تو نہیں"

"کہئے تو بندوبست کر دوں، دور کیوں جائیے میرے پڑوس ہی میں ایک غریب کی لڑکی ہے، تمام اوپری کام کر لیا کرے گی"

"بہت شکریہ آپ کا" اس کے چہرے پر ایک جذباتی مسکراہٹ کھیل گئی "کل شام کو اُسے بھیج دیجئے"

"جی ہاں آپ اطمینان رکھئے" شگوفہ متسلی لہجہ میں بولی "کل اسے ضرور بھیج دوں گی"

"بہت اچھا" وفورِ جذبات سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔

"ذرا تکلیف کیجئے ابھی حاضر ہوئی" یہ کہہ کر وہ جلدی سے باورچی خانے میں چلی گئی اور چائے تیار کرنے لگی۔ آن کی آن میں چائے تیار ہو گئی تینوں نے چائے پی پھر کچھ گپ شپ کے بعد دونوں چلی گئیں۔

آج اتوار کا دن تھا سرکاری تعطیل کا دن، وہ دیوان خانے میں آرام کرسی پر بیٹھی ایک رسالہ کا مطالعہ کر رہی تھی۔ مد مقابل ایک چھوٹی سی میز پر چائے اور چند بسکٹ رکھے ہوئے تھے۔ رسالہ پڑھتے پڑھتے غیر شعوری طور پر اس کی نظریں دیوار پر پڑیں جہاں اندر ایک تصویر آویزاں تھی، تصویر کیا تھی ایک سبق آمیز مرقع تھا۔ یعنی ایک لڑکا جو اونچے گھر کا معلوم ہوتا تھا امیرانہ استغناء سے کھڑا دوسرے لڑکے کو گھورا دیکھ رہا تھا جو مظلوم کی طرح ملتجیانہ انداز میں اس سے کچھ مانگ رہا تھا تصویر دیکھتے دیکھتے وہ خیالات میں کھو گئی، سوچنے لگی واقعی گداگری دنیا میں ایک اہم ترین گناہ ہے جس سے انسان مجبور ہو کر زندگی کھو بیٹھتا ہے" وہ اسی عالم استغراق میں مستغرق تھی کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ وہ ایک دم چونک گئی۔ جیسے سوتے میں طوطا ایک ذرا سی آہٹ سے چونک اٹھتا ہے اور جھٹ جا کر دروازہ کھولا۔ دیکھا ایک لڑکا جس کے گرد آلود تن پر ثابت کپڑا تک نہیں لیکن شکل و شباہت سے اونچے گھر کا معلوم ہوتا تھا ایک بار اس کے قدموں پر گر کر بے اختیار رونے لگا۔ وہ ایکدم سراسیمہ ہو گئی کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ پوچھنے پر اس نے کہا

کیا عرض کروں بی بی، درحقیقت میں بھکاری نہیں ہوں لیکن گردشِ ایام کے ہاتھوں بھیک مانگنی پڑی ہے، گو مجھے ایسا کرتے شرم آتی ہے لیکن مرتا کیا نہ کرتا اس کے بغیر گذارا نہیں۔ پھر اس جگہ مزدوری بھی نہیں ملتی جو کسی طرح اس موذی پیٹ کو کاٹ لیتا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھل ڈھل گرنے لگے، پھر بدقت تمام بولا "کل سے مجھے ایک دانہ حرام ہے، زبان پر کانٹے پڑ رہے ہیں آخر بانی پی پی کر کتنا جئے انسان بی بی صبح سویرے آپ کے دروازے آیا ہوں خدارا میری جان بچا لیجئے" ایکدم اس کی گھگھی بندھ گئی۔ اگرچہ وہ بھکاریوں کی مطلق پرواہ نہیں کرتی تھی لیکن اس لڑکے کی فریاد و زاری میں کیا اثر تھا جو متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اس کا پیمانہ صبر چھلک پڑا اور رحم کے لیے دروازے کھل گئے۔ بولی "مت رو بابو ابھی تمہیں کھانا کھلاتی ہوں" یہ کہہ کر وہ پردہ اٹھا اٹھا کر غائب ہو گئی، بارے چندے توقف کے بعد ایک رکابی میں روٹیاں اور سالن کے ساتھ آئی۔ اور لڑکے کے سامنے رکھ دیا۔ لڑکا چبوترے پر بیٹھ کر روٹیاں کھانے لگا۔ وہ سوچنے لگی۔ یا اللہ یہ کون لڑکا ہے جو اس قدر صاف ستھری زبان بولتا ہے، ہو نہ ہو کوئی بڑے گھر کا لڑکا ہے پھر ناک نقشہ بھی غریبوں سا نہیں ہے۔ جب وہ کھا پی چکا تو پوچھا "بابو کیا تم اس بستی میں نئے آئے ہو؟"

جی ہاں کوئی چار دن ہو رہے ہیں، اس سے قبل میں گوپال پور میں تھا لیکن میری خستہ حالی پر وہاں کے تھانے دار مجھے چور سمجھ کر میرا تعاقب کرنے لگے۔ میں جان بچا کر یہاں بھاگ آیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" اس نے استفسار کیا۔

"میرا نام . . . . ." لڑکا ایک دبی گھٹی آواز میں بولا "مجھے لوگ فقیر پکارتے ہیں اور بس"

"تمہارا نام فقیر ہے!"

"جی نہیں" وہ چونک گیا جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہو "میرا نام نجمی ہے"

"نجمی! اچھا نجمی تم میرے ہاں کام کرو گے، تمہیں بھیک مانگنی نہیں پڑے گی"

"جی ہاں کام کروں گا" دفعتاً اس کی آواز میں ایک فطری شگفتگی عود کر آئی۔

"اچھا آج سے تم میرے یہاں رہو گے اور جو کچھ اوپری کام ہو کر لیا کرو گے سمجھے؟"

"جی ہاں" بجمی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا

دروازے کا منقش پردہ سرکا اور دونوں اندر داخل ہو گئے۔

ٹن ٹن ن ن ٹن، اسکول کی گھنٹی بجی، تمام لڑکیاں باخبر ہو گئیں، استانیاں درجوں میں جانے لگیں، گھنٹی بجنے کے قبل جس شور و شغب نے آسمان سر پر اٹھائے رکھا تھا قدرے تھما۔ پڑھائی شروع ہو گئی۔ لیکن ساتویں درجہ کی لڑکیاں اب تک اچھل کود رہی تھیں کیونکہ ان کے درجہ میں کوئی استانی نہیں آئی تھی۔ بڑی استانی اپنے دفتر میں بیٹھی کچھ لکھ رہی تھی، شاید کوئی سرکاری خط تھا۔ غیر متوقع طور پر جو اسکی نظریں ٹائم ٹیبل پر پڑیں تو جھٹ سنبھل کر اٹھی، شاید اسی کو ساتویں درجہ میں جانا تھا۔ وہ سیدھی ساتویں درجہ میں چلی گئی۔ اُسے دیکھتے ہی لڑکیوں کی تو نانی ہی مر گئی۔ اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ کس مضمون کا گھنٹہ ہے؟"

"تواریخ کا ہے استانی بی" کئی ایک لڑکیوں کی آوازیں کمرے میں گونج گئیں۔

"اُف... اچھا" وہ کچھ سنجیدہ سی ہو گئی، پھر بولی "آج میں ایک نئے مضمون پر تقریر کروں گی جس سے قدیمی تہذیب و تمدن اور عہد نو کی ترقی یافتہ تہذیب میں کیا فرق ہے معلوم ہوگا۔ اور ہمارے بزرگوں کی روک تھام جس نے ہماری ترقی پسند طبیعت کو مردہ کر رکھا ہے، اس کا بھی علاج اس میں مضمر ہوگا۔ پھر ان نقائص کی اصلاح کے لیے ہمیں کن کے نقش قدم پر گامزن ہونا چاہیے، یہ تمام عقدے وا ہو جائیں گے" وہ اپنے ریشمی رومال سے پیشانی کا پسینہ جذب کرتی ہوئی اٹھی "بہرحال مسلم تمدن میں پردہ ایک ایسی چیز ہے جس نے لڑکیوں کی ترقی کو بالکل مفقود کر دیا۔ لیکن اس کا یہ مقصد نہیں کہ پردہ ترک کر دیا جائے۔ پردہ قائم رہے لیکن کیسا پردہ چہار دیواری میں پوشیدہ رکھنے والا پردہ نہیں بلکہ آنکھوں کا پردہ جس سے ایک لڑکی اپنی عفت مآبی اور خوش اخلاقی کو برقرار رکھ سکتی ہے، لیکن وہ ایسا بھی کیا پردہ کہ چہار میں سے ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلا کرے اور دنیا کو بتائی رہے کہ بڑی حیا پرست اور پاکدامن ہے۔ دیکھو ہندو تمدن نے رسم پردہ قطعی اٹھا دیا۔ اب وہ دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہے ہیں۔ لیکن ہمارے بزرگ ہیں کہ ان کی آنکھوں پر سے ماضی پرستی کے سیاہ پردے اُٹھتے ہی نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں، ہماری لڑکیاں بے پردہ ہو گئیں تو ان کے ایک تو اخلاق بگڑ جائیں گے اور دوسرے خاندان کی ناک کٹ جائے گی قطعی غلط" یہ فقرہ اس کے منہ سے بڑے زور سے نکلا "اگر ہیرے کو سنگریزوں میں پھینک دیا جائے تو وہ ہیرا سنگریزہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ اخلاق کا بناؤ بگاڑ تو اپنے بس کی بات ہے عنان جس جانب کھینچو گے گھوڑا اس جانب مڑے گا۔ ہندوستان کی قدیمی تاریخ اٹھا کر دیکھو، اس وقت یہ نمائشی پردہ نہ تھا یہی ایک خاص وجہ ہے جو اگلے مسلمانوں نے ترقی کی تھی اور سرزمین ہندوستان پر حکمرانی بھی کی، کیا ہم میں یہ صلاحیت نہیں؟ ضرور ہے بشرطیکہ ہماری تعلیم و تربیت صحیح طریق سے ہو اور ہم دنیا کے نشیب و فراز کو مکمل سمجھ لیں ۔۔۔ بہرحال اب میں اپنے مضمون پر آتی ہوں شہنشاہ اکبر مغل بادشاہوں میں سب سے مشہور واقع ہوا ہے اس میں ایک لائق جنگجو اور حکمران کی تمام صفتیں موجود تھیں اور مصلحت اندیشی تو اس کی فطرت ثانیہ تھی۔ ہندوستان کے تمام راجے مہاراجے اس کا لوہا مانتے تھے۔ ہر طرف اس کے جاہ و جلال کے بادل منڈلا رہے تھے جس نے بھی اس کا مقابلہ کیا ہتھیار رکھ دیا۔ لیکن اُسے ایک ایسی عورت سے واسطہ پڑا جس نے اس کے دانت کھٹے کر دیئے۔ وہ احمد نگر کی رانی چاند بی بی تھی۔ وہ اس قدر بہادر اور ہوشیار تھی کہ مغلوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ آخر اکبر کو یہ تسلیم کر لینا پڑا کہ فی الحقیقت چاند بی بی ایک بہادر سپہ سالار ہے۔ جب مغلوں نے دیکھا کہ چاند بی بی کو شکست دینا کوئی منہ بولی بات نہیں ہے تو انھوں نے ایک چال چلی اور رانہ اندر سازش کر کے اس کے اپنے سپاہیوں سے اسے قتل کروا ڈالا۔ اور احمد نگر کا قلعہ اپنے قبضہ میں کر لیا" وہ اپنی پیشانی کا پسینہ خشک کرنے لگی پھر بولی "صرف چاند بی بی ہی ایک بہادر عورت نہیں تھی بلکہ ملکہ نور جہاں اور سلطانہ

رضیہ بیگم بھی شجاع اور دلیروں میں سے تھیں۔ شہنشاہ جہانگیر کو نور جہاں جیسی بیوی نہیں ملتی تو اغلب تھا کہ سلطنت مغلیہ کا زوال کبھی ہو جاتا نور جہاں نے جہانگیر کی بادشاہت کو سنبھالا۔ رضیہ بیگم سب سے پہلی عورت ہے جس نے دہلی کے تخت پر متمکن ہو کر پٹھان حکومت کی باگ ڈور کو سنبھالا۔ رضیہ بیگم اول قسم کی بہادر اور قابل جنگجو سلطانہ تھی لیکن اس کے نمک حرام درباریوں سے اس کی حشمت اور شجاعت دیکھی نہ گئی اور سازش کر کے اسے تلوار کی نذر کر ڈالا" وہ پریشان ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی کچھ توقف کے بعد پھر اٹھی اور کہنے لگی، "اب تک جو کچھ میں نے کہا ماضی پر کہا۔ اب زمانہ حال پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لو۔ تعجب نہیں تم نے مسز سروجنی نائیڈو کا نام سنا ہو۔ یہ قوم کی زبردست رہنما اور ملک کی بہترین سیاستدان عورت ہے۔ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی۔ اس نے کئی ایک درس آمیز کتابیں نظم و نثر کی انگریزی اور ہندوستانی میں لکھی ہیں۔ جو اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہیں" وہ خاموش ہو گئی، کمرے میں موت کی سی خاموشی پھیل گئی۔ صرف کپڑوں کی سرسراہٹوں کی آوازیں دھیمی دھیمی آرہی تھیں "اب میں اپنا مضمون ختم کرتی ہوں" اس نے تار سکوت کو توڑتے ہوئے کہا "بہرحال جن خواتین کی تم نے تاریخ سنی انھوں نے اپنے اخلاق و تمدن کو مکمل آزاد ماحول میں ہی سنوارے تھے تاکہ چہار دیواری میں قیدیوں کی طرح نظر بند ہو کر۔ عجب کیا کہ تم بھی اس طرح ایک دن ملک کے لیے ایک نمونہ بن جاؤ۔ بشرطیکہ تعلیم و تربیت صحیح طور پر ہو ورنہ خیالی محلات بے محل ہیں" یہ اسنے میں گھنٹی بجی، وہ کرسی سے بدقت تمام اٹھی گویا تکان سے چور چور تھی۔ لڑکیاں بھی تعظیماً کھڑی ہو گئیں۔ وہ چلی گئی۔ اس کے چلے جانے کے بعد لڑکیوں نے ایسا محسوس کیا جیسے کسی نے انہیں ایک تاریک غار میں سے ہاتھ پکڑ کر روشنی میں لا چھوڑا۔ اور آپس میں سرگوشیاں شروع ہو گئیں کہ "بڑی استانی نے جو کچھ کہا سو لہ آنے بجا کہا۔ ان کے مشورے پر عمل پیرا ہونا ہمارا فرض ہے"

وہ دفتر میں بیٹھی پانی پی رہی تھی، شگوفہ اور لطیفہ اجازت لیکر اندر داخل ہوئیں۔ شگوفہ نے عرض کی۔

استانی صاحبہ! آپ نے اس لڑکی کو واپس کر دیا جسے میں نے آپ کے کہے پر کام کرنے کے لیے بھیجا تھا

"جی ہاں" اس نے رومال سے ہونٹ خشک کرتے ہوئے کہا۔ میں نے واپس کر دیا۔ کیونکہ میرے شہر سے ایک لڑکا آگیا ہے اور حقیقت میں تو مجھے لڑکے ہی کی ضرورت تھی جو گھریلو کام کاج کے علاوہ بازار سے سودا سلف بھی لایا کرے"

"آپ کے شہر کا لڑکا!" لطیفہ نے کچھ تعجب سے کہا۔

"جی ہاں بیچارہ بہت غریب ہے" میرا دل تو بھر آیا۔

"خیر" شگوفہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی

"اچھا — مجھے اب کچھ کام کرنا ہے"

"جی" یہ کہہ کر دونوں دفتر سے چلی آئیں۔ لیکن اُن کے چہروں پر ناراضگی کے آثار نمایاں تھے، شاید اپنی بات رد ہو جانے کے باعث بڑی استانی سے خفا ہو گئیں۔

اسکول کا وقت ہو چکا تھا۔ بڑی استانی عجلت میں دودھ گرم کر رہی تھی کہ کچھ نہیں تو صرف دودھ ہی پی کر چلی جاؤں، شومئ قسمت کہ دودھ کا برتن جس میں دودھ کھول رہا تھا شتابی میں ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا اور تمام دودھ اس کے پاؤں پر بہہ گیا۔ ایکدم وہ چیخ اٹھی، میرے اللہ۔ نجی جو دالان میں بیٹھا سبق یاد کر رہا تھا دوڑ کر آیا۔ یہ منظر دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے اور جلدی سے دودھ کا برتن ایک طرف پھینک کر استانی کا پاؤں ہوے ہوے خشک کرنے لگا۔ استانی شدت درد سے بیہوش سی ہوئی جا رہی تھی۔ اس نے اپنا سہارا دیکر اسے پلنگ پر لٹا دیا۔ استانی درد و سوزش سے بیتاب ہو کر کراہ رہی تھی۔ نجی اس وقت دلگیر نظارے کی تاب نہ لا سکا۔ دفعتاً اس کی ننھی سی عقل میں آیا کہ زخم پر سیاہی لگانے سے قدرے تھم جاتی ہے اسے اس کا عملی تجربہ تھا۔ یہ سوچ کر اس نے دوڑ کر میز پر سے دوات لے آیا اور استانی کے زخم رسیدہ پاؤں پر سیاہی ملنے لگا

اگرچہ وہ کہہ رہی تھی کہ بجی یہ تم کیا کر رہے ہو، کیا زخم پر نمک چھڑک رہے ہو، جلن سے جان جا رہی ہے، لیکن بجی تھا کہ استقلال سے اپنا فرض بجد دانہ ادا کیے جا رہا تھا۔ بالآخر جب اس سے برداشت نہ ہو سکا تو جھنجھلا کر بولی "چھوڑو بھی اس سیاہی واہی سے کچھ نہیں ہونے کا" اور پاؤں کھینچ لیا۔

بجی نے کہا "ابھی سوزش ختم ہو جائیگی آپا، ذرا صبر سے کام لو"

لیکن استانی تھی کہ کٹی ہوئی چھپکلی کی دم کی طرح تڑپ رہی تھی۔ اب بجی کا پیمانۂ استوار ی چھلکنے ہی کو تھا کہ معاً اس کے چھوٹے سے دماغ میں آیا کہ ڈاکٹر کو بلا لاؤں۔ یہ سوچ کر اس نے کہا "آپا تم ذرا صبر سے کام لو میں ابھی ڈاکٹر کو بلا لاتا ہوں"

یہ کہہ کر وہ اسپتال کی جانب نکل پڑا۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر آیا اور معائنہ کرنے کے بعد حسب مناسب مرہم پٹی کر کے چلا گیا اور جاتے جاتے یہ بھی کہہ گیا کہ شام کو طبیعت جیسی رہے اطلاع دیجئے گا۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد ایک نصف گھنٹے میں زخم کی سوزش کچھ کم ہو گئی۔ استانی نے آرام و سکون کا سانس لیا۔ بجی بولا۔

"آپا میں اسکول جا کر تمہاری ماتحت استانی سے کہہ آؤں کہ بڑی استانی کی طبیعت کچھ ناساز ہے، وہ نہ آسکیں گی"

"بجی تم کتنے عقلمند ہو" استانی شفقت آمیز لہجہ میں بولی "نہیں معلوم خدا نے کس عمر کی روح تمہارے جسم میں پھونک دی ہے۔ اللہ پاک تمہاری عمر دراز کرے، اچھا جاؤ کہہ آؤ، میں اب اچھی ہوں"

بجی اسکول گیا اور اطلاع کر آیا۔ استانی کو اب کافی سکون تھا، بجی آہستہ آہستہ پنکھا جھل رہا تھا۔ استانی نے متبسم انداز میں کہا "بجی واقعی تم میرے سگے بھائی سے کہیں زیادہ ہو، میں تمہارے یہ احسانات کبھی فراموش کروں گی۔ تم نے مجھے میرے مرحوم بھائی کی یاد تازہ کرا دی، جو میری خاطر ملیامیٹ ہو جاتا تھا"

"کیا میں تمہارا بھائی نہیں میری آپا؟" بجی نے معصومانہ انداز میں کہا۔

استانی اس بھولے انداز سے مسحور ہو کر بے تاب ہو گئی۔ اس کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں بولی "بے شک تم میرے بھائی ہو بجی"

"آپا صبح سے تم نے کچھ کھایا بھی نہیں ہوٹل سے دودھ لا دوں؟" بجی پنکھا جھلتے ہوئے بولا۔

"اچھا جاؤ لیکن جلد آؤ گے"

"بہت اچھا" بجی کیتلی لیے دوڑ کر ہوٹل چلا گیا۔

استانی ہفتہ عشرہ میں مکمل شفایاب ہو گئی۔ بجی نے اس کی تیمارداری اس جانفشانی سے کی کہ استانی کو اپنے والدین کی بھولی بسری یاد تازہ ہو گئی۔

ابھی ابھی بارش تھمی تھی، سورج کی نارنجی گداز کرنیں ہری ہری متزلزل پتیوں پر قدرت کی کرشمہ سازی کا نظارہ پیش کر رہی تھی۔ دور کہیں آم کی شاخ پر نالاں کوئل اپنی جگر خراش کوک سے وطن سے دور، ہمجولیوں کے فراق زدہ مسافروں کا خیال پریشاد کر رہی تھی، گویا وہ بھی اپنوں سے بچھڑی ہوئی رو رہی تھی۔ استانی پچھلی دریچی کے پاس بیٹھی باغ کی طرف دیکھ رہی اور کوئل کی درد ناک گریہ و زاری کو بغور سن رہی تھی اس کے دل و دماغ میں خیالات کا طوفان برپا تھا۔ اس کے ذہن میں وطن کے تمام کیف نور دہ واقعات تازہ ہونے لگے۔ وہ مضطرب ہو کر اٹھی اور بادل ناخواستہ رسالہ جدید اردو کی ورق گردانی کرنے لگی۔ بجی پردہ سرکا کر دیکھنے لگا کہ آپا کیا کر رہی ہے

"یاد کر لیا تم نے سبق؟"

"سبق کیا سبق سے آگے بڑھ گیا ہیں" نجی ذرا تن کر بولا۔

"خود سے"

"جی ہاں The bird reached her nest تک"

"شاباش: اب تم میرے بھائی کہلانے کے مستحق ہو"

"نجی کا ننھا سا سینہ فرط خوشی سے چوڑا ہو گیا۔ لیکن آناً فاناً آپا کی فسردہ شکل دیکھ کر اس کا دل بیٹھ گیا۔ اس کے جوش انگیز ولولے خاموش ہو گئے۔ پوچھا

"آپا نہ جانے کیوں، خلاف توقع آج تم غمگین معلوم ہوتی ہو؟"

"میں نے تبادلہ کے لیے عرضی بھیجی ہے نجی، بہت جلد میں یہاں سے چلی جاؤں گی"

"میں بھی چلوں گا تمہارے ساتھ"

استانی کی نظریں فرش پر منجمد ہو کر رہ گئیں

"کیوں اب تم نہیں بولتیں؟"

"نجی!" اس کی آواز بھر آگئی "میری جگہ پر جو نئی استانی آئیگی اس کے یہاں میں رکھادوں گی"

نجی نے ایسا محسوس کیا کہ اس کا دل کسی نے سینے میں سے نکال کر آگ پر رکھ دیا۔ پھر سسکتے ہوئے بولا

"نہیں میں تمہارے ہی پاس رہوں گا آپا"

"مصر نہ ہو نجی بات سمجھو"

"جی ہاں میں نے اپنا مستقبل سمجھ لیا ہے۔ تمہارے بغیر میں نہیں رہ سکتا۔

"چھوڑ اس بحث کو، اچھا مغرب کا وقت ہو گیا چراغ روشن کرو"

نجی مضمحل سا دل لیکر چراغ جلانے چلا گیا اور استانی روٹی پکانے میں مصروف ہو گئی۔ نجی کی دنیا میں انقلاب انگیز تغیر آگیا۔ اسے ہر چیز میں بے لطفی سی معلوم ہوتی۔ وہ ایسا محسوس کرتا جیسے کسی نے اسے عمیق ترین غار میں دھکیل دیا ہو۔

استانی کا تبادلہ ہو گیا، آج وہ رسلکنڈہ کو خیرباد کہہ کر برہم پور جا رہی تھی۔ نجی بڑے کمرے میں مرجھایا ہوا رخت سفر باندھ رہا تھا اس کے دل پر گویا آسمان ٹوٹ پڑا تھا، بجلیاں کوند رہی تھیں۔ وہ ایسا محسوس کر رہا تھا کہ زمین اسے نگل رہی ہے۔ اس کی خوشی کے لمحے غم انگیز قہقہوں میں بدل رہے ہیں۔ نحوست کی تاریکی فزوں تر ہو رہی ہے، جسم کے قلعہ میں آگ لگ رہی ہے جیسے نفس کی ہوا اور بھڑکا رہی ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور سن ہوئے جا رہے تھے گویا اس کی روح اب غائب ہوا چاہتی ہے

استانی باہر برآمدے میں گھوڑا موٹر کا انتظار کر رہی تھی کہ اس کی نظریں غیر متوقع طور پر عین مقابل کی پھلواری پر پڑیں۔ اس نے دیکھا۔ ایک تتلی جو مردہ معلوم ہوتی تھی ایک پتی پر پڑی ہے اور ایک دوسری تتلی اس کے گرد اگرد دوڑ رہی اور گھڑی گھڑی آ سے لپٹ

جدائی کا صدمہ اس قدر شاق گزرتا ہے تو انسانی دل پر کیا نہ گزرے گا۔ ضرور بجی میری فرقت میں خود کو کھو دے گا۔ اسے اپنے ہمراہ لے چلنا چاہئے۔

"آپا ———" بجی کی دبی گھٹی آواز تھی

استانی جلدی سے اندر آئی دیکھا بجی بمزیدہ بستر باندھ رہا ہے

"تم روتے ہو کیوں؟"

کیا روؤں نہیں۔ کیا میں اپنا مکان جلتا ہوا دیکھ کر ہنستا ہے؟ تم ہی بتاؤ" اس نے اپنا منہ دونوں ہاتھ سے ڈھک لیا

"کیا تمہیں تنہائی کا خوف ہے؟"

"تنہائی کا خوف نہیں آپا کی محبت"

"اچھا محبت تمہیں بلاتی ہے"

"آپا... !" کمرہ گونج گیا۔

"بجی"

بجی اپنی آپا کے پاؤں سے چمٹ گیا۔ پھر دونوں موٹر میں جاکر بیٹھ گئے۔

خواجہ عبدالرزاق کھڑگپور

نشاط روح

دل نہ جانے کیوں مرا اس بت پہ مائل ہوگیا
میں حقیقت آشنا ہو کر بھی غافل ہوگیا

جب تصور میں مرا دل ان سے واصل ہوگیا
کیف کا عالم یہ تھا احساس مشکل ہوگیا

شوق جب راہِ طلب میں رہبرِ دل ہوگیا
جو قدم اٹھا رہِ منزل میں، منزل ہوگیا

جس پتنگے کی نہ تھی وقعت نظر میں شمع کی
جان دیکر وہ فروغِ شام محفل ہوگیا

سازِ غم پر جب لگائی عشق نے مضرابِ شوق
درد کی لے میں غزلخواں مطربِ دل ہوگیا

حسن کے راز آشنا جلووں نے گھیرا اسطرح
مجھکو خود اپنا نظر آنا بھی مشکل ہوگیا

غرق ہوجاتا سفینہ عشق کا لیکن نشاط
جذبۂ اُمید بحرِ غم کا ساحل ہوگیا

فلمستان

جواب ـــــــ ایک "نقاد" کی نظر میں

"ایم پی پروڈکشن کلکتہ" نے یہ فلم مسٹر پی سی بروآ کی نگرانی میں تیار کی ہے ــــ بروا کو ہم ایک فلسفی عکاس کی حیثیت سے جانتے ہیں، اُس کے آرٹ میں زندگی کے کمزور پہلوؤں پر گہری اور تڑپا دینے والی چوٹیں پنہاں ہوتی ہیں۔ بظاہر یہ فلم اس خصوصیت سے عاری نظر آتی ہے۔ کیونکہ اس کے سارے کردار پاگل خانے میں بسنے والے نظر آتے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو یہ شک بھی ہونے لگتا ہے کہ پاگل خانے کے کسی حصے ہی کو تو نہیں فلمایا جا رہا ہے؟

لیکن جب ہم غور کرتے ہیں تو اِن "پاگلوں" کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ ہمیں سوچ میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔

کہانی کسی بنگالی مصنف کی ہے اور خوب ہے، اس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک نوجوان زمیندار کا دماغ کچھ خراب ہے اور وہ کوئی بات بھی یاد نہیں رکھ سکتا، وہ اپنے علاج کے لیے الہ آباد جا رہا ہے مگر راستے ہی میں گاڑی سے اتر پڑتا ہے وہاں ایک لڑکی سے اس کی ملاقات ہوتی ہے اور اس کا بھولا پن، خلوص اور محبت اس کے دل کو بے چین کر دیتی ہے، لڑکی بھی اسے چاہنے لگتی ہے لیکن آخر وہ اُسے چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ الہ آباد میں اس کی منگیتر ریوا، امیر باپ کی بیٹی اور نئی روشنی کی آزاد خیال لڑکی ہے، پرانے خیالات کے پجاری۔ پاگل نوجوان کو اس کی بہت سی باتیں پسند نہیں آتیں لیکن چونکہ اُس کے پتا کی مرضی یہی تھی کہ اُس کی شادی ریوا سے ہو اس لیے ایسا کرنا وہ اپنا فرض سمجھتا ہے ــــــ اس کے باوجود وہ اُس لڑکی کو بھلا نہیں سکتا جو اس کی زندگی میں ایک پرچھائیں کی طرح آئی اور غائب ہو گئی تھی۔ دوسری طرف اس کی منگیتر ریوا اُسے چاہنے لگتی ہے اور اُسے اپنانے کی کوشش میں وہ پابندیاں بھی قبول کر لیتی ہے جو اس کے ماحول کے یکسر منافی تھیں اور جنہیں قبول کرنے کا اس نے کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن آخر کار اُسے یقین ہو جاتا ہے کہ شادی کے بعد بھی وہ اسے خوش نہ رکھ سکے گی، چنانچہ اس کے دل میں اپنے لیے نفرت پیدا کرتی اور اُسی غریب لڑکی سے، جو اس کی محبت کی راہ میں حائل تھی اور جس کی محبت یا خدمت کے طفیل اس کا منگیتر تندرست بھی ہو گیا تھا، اُس کی شادی کرا دیتی ہے ــــــ یہ ہے اس فلم کا خلاصہ ــــــ اب اس کی فنی حیثیت پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے؟۔

بہت ممکن ہے اکثر لوگوں کو یہ فلم پسند نہ آئے اور وہ میری رائے سے اختلاف کریں لیکن مجھے معلوم ہے ہمارے ہاں اچھی فلمیں عموماً ناکام رہتی ہیں اِس لیے لوگوں کے اِس خیال پر مجھے حیرت نہیں ہو گی ــــــ خود میرا خیال یہ ہے کہ فلم بہت خوب ہے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایسے موقعے آتے رہتے ہیں کہ ہر سمجھدار اور حساس آدمی تڑپ اٹھتا ہے اور جتنی خامیاں بھی اُس نے نوٹ کی ہوں اُن کی تلافی ہو جاتی ہے ــــــ اور یہی بروآ کا آرٹ ہے جس پر سے ہزاروں اچھی فلمیں نچھاور کی جا سکتی ہیں!

اِس کے علاوہ فلم کا آخری سین عام روش سے بالکل الگ ہے اور ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو ایسے فلم کی خامی سمجھتے ہیں لیکن میرا خیال یہ ہے کہ اِس "نامکمل" پن نے فلم میں جو آرٹ اور زندگی پیدا کر رہی ہے اُسے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو حقائق کے پجاری ہوں۔

اب آئیے فلم کی بعض خامیوں پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے:۔

(۱) مکالمے اچھے نہیں ہیں، زبان بھی شستہ نہیں ہے، اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اداکار بنگالی ہیں اور ایک اجنبی زبان کو وہ اس سے اچھی طرح نبھا نہیں سکتے تھے۔ لیکن بعض جگہ زبان میں بھی خامیاں ہیں۔

ایک گیت، میں زبان کی خامی، حماقت کی حد سے بھی آگے نکل گئی ہے، ہیرو کے دوبارہ واپس آنے پر ہیروئن "دور دیس کا رہنے والا . . . . . " گاتی ہے جس کا آخری مصرعہ ہے "تم آئے ہم گائے" اور گیت نویس اس مصرعے کے معنوں پر غور کرنا ضروری نہیں سمجھتا، ستم ظریفی دیکھئے کہ ہیرو (جو ڈائرکٹر بھی ہے) بھی قدرے ترمیم کے بعد یہی مصرعہ اس طرح دہراتا ہے "ہم آئے تم گائے"!

——— اور بے اختیار گیت نویس سے یہ پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ یہ گائے دودھ بھی دیتی ہے یا نہیں؟

(۲) کئی اداکاروں نے "اوور ایکٹنگ" کا ریکارڈ قائم کر دیا ہے، تاڑی خانے میں بھیکو جس انداز سے گاتا ہے اور جو حرکتیں کرتا ہے اُن میں تصنع کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ بارن بابو (بابر گنگولی) کی اداکاری سنجیدگی کی حدوں کو بہت پیچھے چھوڑ گئی ہے، حالانکہ اس کا کردار، مزاحیہ نہیں ہے ——— اور اس قدر اہم کردار مزاحیہ ہو بھی نہیں سکتا!

(۳) برؔوا، خود ہی ڈائرکٹر ہے، خود ہی کیمرا مین اور خود ہی ہیرو ——— اول تو یہ تینوں کام ایک آدمی کو کرنا ہی نہیں چاہئے اور اگر کوئی ایسی ہی مجبوری ہو تو دوسری پیش بندیاں ضروری ہیں۔ دیکھئے اس اجتماع ضدین سے کیا صورت حال پیدا ہو گئی ہے ہیرو جب گاتا ہے "ملا میں لوں میں اُس دل کی" تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ خود نہیں گا رہا ہے، بلکہ "بیک گراؤنڈ" ہے کیونکہ ہیرو اور گانے والے کی آواز میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس کے علاوہ جب گانا شروع ہوتا ہے تو خود ہیرو اس طرح چونک پڑتا ہے جیسے اچانک کہیں سے گانے کی آواز آنے لگی ہو اور پھر وہ بھی منہ ہلانا شروع کر دیتا ہے، مگر ساتھ ساتھ چاروں طرف اس طرح دیکھتا جاتا ہے جیسے کسی کے اشاروں کا منتظر ہو ——— یہ اس فلم کی خاص خامی ہے۔

(۴) گانے، شاعری اور فن کے لحاظ سے ناقص ہیں، زبان کی خامیاں بھی موجود ہیں لیکن اچھی میوزک نے انہیں سنبھال لیا ہے اور خامیاں موسیقی کی تانوں میں دب کر رہ گئی ہیں۔ اور غالباً عوام میں "جواب" کی مقبولیت کا باعث اس کی موسیقی ہے لیکن فنی خامیاں بہرحال افسوسناک ہیں۔

(۵) ایک جگہ غالباً "ایڈیٹنگ" میں غلطی ہو گئی ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک صبح ہیرو اور ہیروئن تالاب کے کنارے بیٹھے ہیں اور ہیرو کہہ رہا ہے "میں آج جا رہا ہوں، تم مجھے بھولو گی تو نہیں؟" ——— لیکن اس کے بعد کے سین میں وہ کہتا ہے "تم نے تار کیوں دیا کہ میں کل جاؤں گا" ——— کل اور آج کا یہ تضاد غالباً ایڈیٹنگ کے اُلٹ پھیر کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ اول الذکر سین سے پہلے ہی تار دیا جا چکا تھا!!!

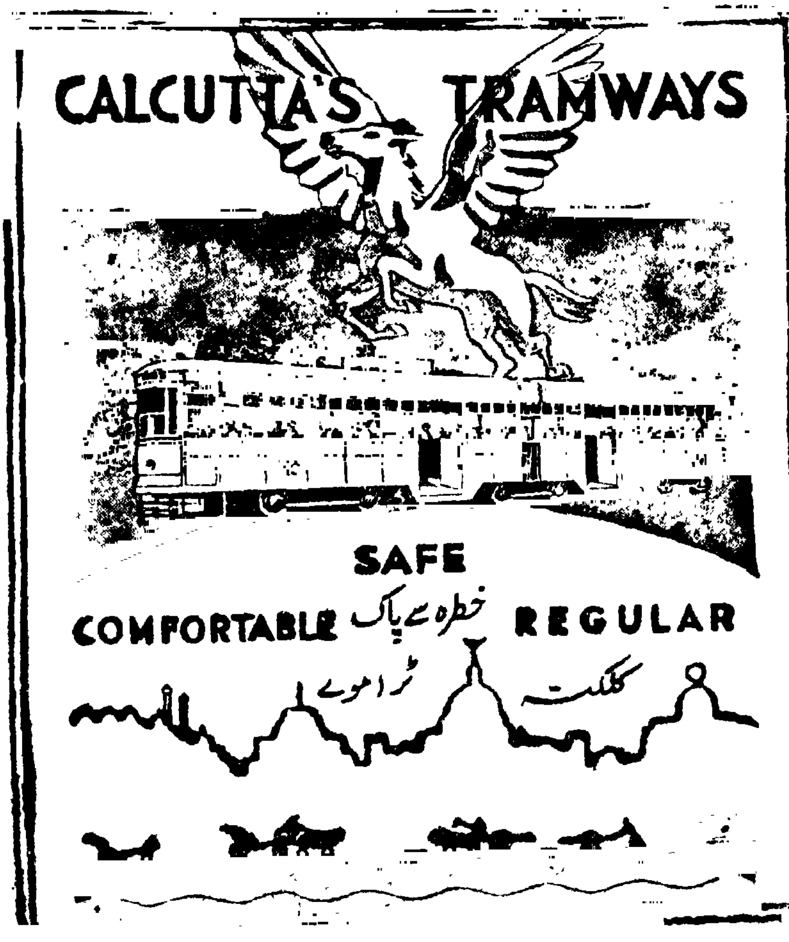
اداکاروں میں کانن، برؔوا اور جمنا کا کام بے عیب ہے، دوسرے اداکاروں کی زبان سے اجنبیت نے انہیں کامیاب نہیں ہونے دیا۔

آخر میں مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ یہ فلم عام تفریحی فلموں کی سطح سے بہت بلند اور ایک گہرے نفسیاتی مطالعے کی حامل ہے۔ ہر چند کہ ملک کے طول و عرض سے اس کی کامیابی کی خبریں آ رہی ہیں لیکن اگر یہ فلم ناکام ہو جاتی تو بھی کم سے کم مجھے حیرت نہ ہوتی کیونکہ ہماری تصنع بھری اور خیالات میں سانس لیتی ہوئی زندگی ابھی اس قابل نہیں ہوئی کہ حقائق کی اتنی سخت ٹھوکریں برداشت کر سکے۔

مشرقی ہند کا ادبی و علمی ماہنامہ

اردو جدید

سالانہ چندہ
دو روپے
فی پرچہ تین آنے


CALCUTTA'S TRAMWAYS
SAFE
COMFORTABLE
خطرہ سے پاک
REGULAR
کلکتہ ٹرامویز



مدیر مسئول
پرویز شاہدی

مدیر اعزازی
ایم ظہور احسن قاضی

چندہ سالانہ دو روپیہ
ششماہی ایک روپیہ چار آنہ
فی پرچہ ۳/

جدید اردو کلکتہ

ستمبر سنہ ۱۹۴۳ء

جلد ۶ — نمبر ۹

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر عبد الجلیل نے مطبع سند پریس میں چھپوا کر دفتر جدید اردو ۳۶ مارسڈن اسٹریٹ سے شائع کیا

رفتار وقت

۳ ستمبر ۱۹۴۳ء سے جنگ کا چوتھا سال ختم اور پانچواں سال شروع ہوگیا۔ جس وقت جنگ شروع ہوئی تھی اُس وقت کیا گمان ہو سکتا تھا کہ یہ جنگ اتنی مدت طول کھینچے گی، پھر بھی اب تک اس کی انتہا معلوم نہیں، شروع شروع تو محوری طاقتوں نے اتنا زور دکھایا کہ فتح پر فتح حاصل کرتے ہوئے طوفان اور سیلاب کی طرح بڑھتے اور پھیلتے چلے جا رہے تھے جس سے کہ اندیشہ ہو چلا تھا کہ اگر ان کی یہی رفتار رہی تو قرینہ ہے کہ بہت جلد یہ ساری دنیا سے اپنی طاقت منوا کر چھوڑیں گے، لیکن رفتہ رفتہ حالت نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ اب محوری طاقتوں کے لیے مشکل وقت آن پڑا ہے اور اب ان کی حالت نازک دکھائی دے رہی ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ محوری طاقتیں ہر روز نئی خبریں اپنی فتح کی سناتے تھے اور اب وہ وقت بھی آن پہنچا ہے کہ ہر روز ان کے پیچھے ہٹنے اور شکست کی خبریں سننے میں آرہی ہیں۔

زمانہ پلٹ چکا ہے اس وقت حالات کچھ اس کے خلاف ہو رہے ہیں اور اس کو بیک وقت تین محاذ پر لڑائی لڑنی پڑ رہی ہے سب سے بڑا محاذ تو اس کے لیے روس کا ہے، اور روسی محاذ نے اس کے لیے ایک ایسی شکل اختیار کرلی ہے جس کی توقع جرمنوں کو ہرگز نہیں تھی، ابھی حال میں جرمنی نے پھر روس سے زبردست دھوکا کھایا ہے۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ گذشتہ سال کے معرکوں میں یقینی روس کمزور ہوگیا ہوگا اس لیے اب ایک اور کاری ضرب لگا کر ہمیشہ کے لیے اسے مغلوب کرلینا چاہیے، تاکہ ایک سب سے بڑا خدشہ مٹ جائے اور یورپ پر اتحادی حملہ سے قبل اس کی کمر توڑ دیں، لیکن حالات کچھ اس کے برعکس نکلے اور اُلٹے ہی جرمنی کو لینے کی دینی پڑ گئی۔ یعنی روس نے جرمنی کے زبردست جارحانہ حملہ کو روک کر خود روس نے اس پر اس طرح یورش شروع کردی ہے کہ اب تک جرمنی برابر شکست پر شکست کھاتا چلا جا رہا ہے۔ دوسرا محاذ اتحادیوں کی ہوائی طاقت کا ہے۔ آئے دن جرمنی کے بڑے بڑے شہروں پر اتحادیوں کے ہوائی حملے نے اسے بالکل بدحواس بنا دیا ہے، اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہوگا کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ تیسرا محاذ اٹلی کا ہے یہ تو ظاہر ہو چکا ہے کہ اب اٹلی میں دم خم باقی نہیں رہا۔ بیمار اٹلی اب اتحادیوں کے مقابلے میں لڑ بھی نہیں سکتا ہے اس کی جنگی طاقت پاش پاش ہو چکی ہے۔ باشندے گھبرا گئے ہیں اور جنگ کے خلاف نعرے لگانے شروع کر دیئے ہیں، لیکن موجودہ وزیر اعظم مارشل بدوگلیو ہتھیار ڈالنے سے انکار کر رہا ہے اس لیے نہیں انکار کر رہا ہے کہ اس کے پاس طاقت ہے، بلکہ وہ ہٹلر کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا ہے۔ سسلی کا معرکہ پورے ۳۸ دنوں کے بعد ختم ہوگیا اور اتحادی فوجوں نے پورے طور پر سسلی میں اپنے قدم جما لیے ہیں اب قرینہ غالب ہے کہ بہت جلد اتحادی فوجیں اٹلی پر بھی چڑھائی شروع کر دیں گی لہذا اس محاذ پر بھی پورے سامان کے ساتھ جرمنی ہی کو مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ پھر اتحادیوں کی روز افزوں پیداوار اور جنگی سامان کی ترقی نے جرمنی کو اور بدحواس کیے ہوئے ہے۔ مسٹر چرچل اور صدر روزویلٹ میں جو آئندہ یورپ پر چڑھائی کے سلسلہ میں بات چیت کیوبک کانفرنس میں ہوئی ہے، جس کی وجہ کر وہ خود خوف زدہ ہو کر اعتراف کرتا ہے کہ ہمارے مشکلات میں اور بھی اضافہ ہونے والا ہے۔ ادھر مسٹر چرچل بھی للکار کر کہہ رہے ہیں کہ اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی ـــــ دیکھئے وہ ان تمام مشکلات کی بچاؤ کے لیے کون سا پہلو اختیار کرتا ہے، کیا وہ بادشاہ ہتھیار ڈال کر اطاعت کی

کوشش کرے گا، ابھی قرینہ تو ایسا نہیں ہے۔

ابھی حال میں "کیوبک" کانفرنس میں اتحادیوں نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ بہت جلد جاپانیوں کے خلاف جارحانہ کاروائی شروع کر دی جائے۔ قبل اِس کے مسٹر چرچل وزیر اعظم نے اعلان کیا تھا کہ جرمنی کو ٹھکانا لگانے کے بعد جاپان پر بھی حملہ شروع کر دیا جائے گا۔ اس سے قطعاً گمان یہ ہوتا تھا کہ اتحادی برما ختم کرنے کے بعد چین کا راستہ صاف کر کے چین کی طرف سے جاپان پر ہوائی یورش کریں گے۔ اور دوسری طرف سے سمندری راستہ سے جزائر جاپان کی طرف بڑھیں گے، لیکن تازہ اطلاعات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بہت ممکن ہے یورپ پر حملہ کے ساتھ ساتھ جاپان پر بھی اتحادی ہلہ بول دیں۔ اس صورت سے کہ روس بھی جاپان کے خلاف اعلان جنگ شروع کر دے اور ہو سکتا ہے کہ روس "کامچاٹکا" کے ہوائی اڈے فوراً امریکی ہوائی بیڑے کے حوالے کر دے پھر روس اور امریکہ مل کر برّی اور بحری کارروائی بھی جاپان کے خلاف کر دے اگر ایسا ہوا تو پھر جاپان کے لیے مدافعت کرنی بھی مشکل ہوگی اور اس کی جنگی صنعت بہت جلد زوال پذیر ہو جائیگی اور اس کے بڑے بڑے صنعتی علاقے بہت جلد تباہ ہو جائیں گے

خبر ہے کہ یکم اگست سنہ ۱۹۴۳ء سے جاپان نے برما کی آزادی تسلیم کر لی ہے اور اب جاپان اور برما کے تعلقات اسی قسم کی نوعیت کے ہیں جس نوعیت کے تعلقات جاپان اور منچوریا کے مابین قائم ہیں۔ با ماسنے اپنے حامیوں کی ایک کونسل بنائی ہے اور نئی اسٹیٹ اسمبلی کا جلسہ طلب کر کے اتحادیوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے

حج :۔ حکومت ہند نے اس سال مسلمانان ہند کو حج کی برکت سے محروم کر دیا ہے جس کی وجہ سرکاری اعلان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اب تک ہندستان سے عرب تک سمندری راستہ خطرناک ہے، تھوڑی دیر کے لیے اگر ہم اس کو تسلیم بھی کر لیں تو اس کا کیا جواب ہے جو کہ حکومت ہند ہی کی اطلاع کے مطابق ہمیں یہ بھی خبر معلوم ہوئی ہے کہ شام اور لبنان سے ہندستان میں تجارت کا سلسلہ بھی قائم ہو گیا ہے عقل حیران ہے کہ آخر یہ کون سا راستہ اس کے لیے نکل آیا ہے جس کے ذریعہ تجارت شام اور ہندوستان کے مابین شروع ہو گئی ہے۔ اور وہ راستہ نہیں نکل سکتا ہے تو صرف مسلمانان ہند کے لیے حج جیسے متبرک فریضہ کو ادا کرنے کے لیے۔ ہم سمجھتے ہیں حکومت ہند کو چاہیئے کہ وہ اس پر دوبارہ غور و فکر سے کام لے۔ اس لیے کہ ادائے فرض حج مسلمانوں کا مذہبی رکن اسی طرح ہے جیسے تقریباً روزہ، نماز، زکوٰۃ وغیرہ

ہندستان :۔ اس کی حالت روز بروز ابتر ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے زبوں حالی کی مثال صرف صوبہ بنگال کے ان خبروں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بوڑھے، بچے جوان، مرد عورتیں فاقہ سے روزمرہ سیکڑوں کی تعداد میں جان دے رہے ہیں بعض جگہ تو حالت یہ ہے کہ ان کی لاشوں کو بھی اٹھانے والا کوئی نہیں ہے اور گور و کفن تو ان مرنے والوں کو کہاں تک نصیب ہوگا۔ بعض خبریں ایسی بھی سننے میں آئی ہیں کہ گدھ، کوّے، چیل اور گیدڑ لاشوں کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا جاتے ہیں یا لاشیں پڑی سڑتی رہتی ہیں، اس دور ترقی میں انسانی زبوں حالی کی اس سے بدترین مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ کلکتہ جیسے خوش حال شہر کی اندرونی حالت یہ ہے کہ لاکھوں انسان جن کو نہ کھانے کا ٹھکانا اور نہ رہنے کا سہارا ہے بھوک کی شدت سے فٹ پاتھ، سڑک، گلی، کوچوں میں مارے مارے پھر رہے ہیں، ان کے چہرے کی طرف کوئی نظر اٹھا کر دیکھے تو سخت سے سخت انسان بھی ان فاقہ زدہ چہرے کو دیکھ کر تڑپ جائیگا۔ اس وقت کلکتہ میں رہنے والوں کیلئے زندگی کا مسئلہ بہت سخت ہوتا جا رہا ہے۔ اس وقت زندگی قائم رکھنے کیلئے انسان کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ فکر معاش کی جستجو کرے یا غلہ کی تلاش، اس کے بعد کوئلہ اور لکڑی کی تمام چیزیں قسمت سے حاصل ہو گئیں تو پھر جیب میں روپیہ نہیں۔ ۔ ۔ ۔

۱۶۔ اگست کی خبر ہے کہ گذشتہ صرف پانچ دنوں کے اندر سڑکوں سے ۱۲۰۰ مردہ لاشیں اٹھائی گئیں اور صرف ایک ہفتہ کے اندر ۲۰۰ جان بلب جاں فاقہ کش سڑکوں پر پڑے پائے گئے۔ گر یہی گردش لیل ونہار رہے تو عجب نہیں کہ ایک دن ہم جیسے کم پونجی کے انسانوں کی جان بھی بھوک کی شدت سے تڑپ تڑپ کر نکل جائے

سانحہ

مسلمانان بنگال کی ایک واجب التعظیم شخصیت مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم نے ۲۰ ماہ اگست کی شب کو بمقام مدھوپور ایک مختصر علالت کے بعد داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون کئی ماہ سے وہ مرض فالج میں گرفتار تھے۔ لیکن حال ہی میں متعدد دیگر امراض بھی پیدا ہو گئے تھے اور بعد میں یہی مہلک ثابت ہوئے

مرحوم ۲۰۔ اگست ۱۸۶۳ء کو بمقام سلہٹ پیدا ہوئے۔ آپ بڑے مخلص اور قوم پرور تھے۔ آپ حضرت شاہ جلال مجرد کی اولاد میں سے تھے جو ایک مشہور قریشی خاندان ہے۔ آپ کی تعلیم کلکتہ میں ہوئی تھی اور آپ کی شادی حافظ شاہ عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو بنگال کے ایک مشہور صوفی بزرگ تھے کے خاندان میں ہوئی تھی۔ آپ نے ۱۸۸۵ء میں ایک اردو اخبار "دار السلطنت" کلکتہ سے جاری کیا تھا جو کہ چند سال تک آپ کی سرپرستی اور ادارت میں قائم رہا اس کے بعد ۱۸۹۰ء میں آپ انسپکٹر آف اسکولز برائے تعلیم مسلمانان مقرر کیے گئے۔ آپ نے اس میں بڑا نام پیدا کیا اور بنگال بہار اڑیسہ میں مسلمانوں کی توجہ اور معاشرتی تنظیم کے لیے بہت سے مفید کام کیے اس کے بعد چاٹگام پھر ڈھاکہ ڈویژن میں انسپکٹر آف اسکولز مقرر ہوئے اور ۱۹۱۲ء میں ملازمت سے سبکدوشی حاصل کر کے پنشن لے لی

آپ انگریزی، بنگلا اور اردو زبان میں متعدد تعلیمی و معاشرتی و سیاسی کتب کے مصنف بھی تھے اور کلکتہ یونیورسٹی کے دائمی فیلو۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد آپ مرکزی کونسل آف اسٹیٹ کے ممبر بھی ہوئے اور بعد میں بنگال مجلس مقننہ (اسمبلی) سے متعلق ہو گئے۔ جہاں آپ نے اپنی آزاد خیالی اور مسلم قوم کی خدمات کے سبب خاص شہرت حاصل کر لی تھی۔ آپ متعدد تعلیمی و سیاسی مجلسوں نیز بنگال مسلم لیگ اور اسلامیہ مشن سوسائٹی کے صدر تھے آپ نے چار لڑکے اور ایک لڑکی اپنی یادگار چھوڑی ہے۔ آپ کے بڑے صاحبزادے پروفیسر عبدالرحیم ایم اے ہیں جو سابق ڈپلومیٹ افسر حکومت بہار و اڑیسہ ممبر آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور مسلم لیگ بھی ہیں۔ آپ کے سب سے چھوٹے بھائی مسٹر اے رسول ہیں جو تجارتی کاروبار میں مشغول ہیں اور اپنے مکان واقع ۱۳ ویلسلی اسکوائر کلکتہ میں رہتے ہیں۔ آپ کے منجھلے بھائی پروفیسر عبدالحکیم ایم اے پرنسپل اسلامیہ کالج ڈھاکہ بھی ہیں اور سنجھلے بھائی کلکتہ ہائی کورٹ میں ملازم ہیں جہاں آپ کے داماد اکرم حسین جج ہیں۔ آپ کے نسبتی بھائی خان بہادر محمد حامد ہیں جو مرکزی سپلائی محکمہ میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز ہیں۔ قبل اس کے حکومت بہار کے سابق سکرٹری اور ممبر پبلک سروس کمیشن تھے

مولوی عبدالکریم مرحوم نے ایک جائداد وقف کی ہے جس کی قیمت تقریباً ایک لاکھ روپیہ کی ہے اور تعلیمی و مذہبی کاموں کے لیے اس کی آمدنی خرچ ہوتی ہے۔ لیکن قابل افسوس بات یہ ہے کہ دیگر ارباب دول نے ان کی توقع اوقاف سے گریز کیا جن کو ملا کر یہ ایک بہت بڑی جائداد موقوفہ ہو جاتی تاکہ مسلمانوں کی تعلیمی و معاشرتی خدمات اس سے بوجوہ احسن انجام پاتیں۔ مرحوم غیر معمولی دل و دماغ کے آدمی تھے اور چھہتر سال کی عمر میں بھی آپ نے تصنیف و تالیف کا مشغلہ قائم رکھا، آپ نے اسلام اور سیرت النبی کے متعلق متعدد کتابیں لکھیں اور ان کی تالیف و توصیف کے نام مشاہیر علم و ادب مثلاً ڈاکٹر ٹیگور، سر پی سی رائے، مسٹر عبدالقادر، جسٹس سلیمان مرحوم نے کی تھی۔ آپ کی سب سے بڑی یادگار تاریخ ہند ہے جو کہ صرف اردو زبان میں سترہ مرتبہ شائع ہو چکی ہے اور باقی زبانوں میں اس سے زیادہ۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے پسماندوں کو صبر جمیل عطا کرے اور مرحوم کے قبر پر رحمتوں کی بارش

عبدالجلیل

قطرات اشک

یوسف ما باز کنعاں می رود — چوں نسیم صبح خنداں می رود
آہ دل بر چرخ گرداں می رود — چوں شمیم گل پریشاں می رود
مصریاں را در غمش انداختہ — حیف اینک ماہ کنعاں می رود
یک نمط ہرگز نہ ماند ایں جہاں — گاہ زنیساں گاہ ز انساں می رود
آنکہ بودہ مدرسہ را میزباں — ہم در انجا بیں کہ مہماں می رود
جامع اوصاف و ذو علم و عمل — حیف ہمچوں فخر دوراں می رود
خُلق او خُلق ولی را آئینہ — حیف خلقش دور گیہاں می رود
کشت ما را آب دادہ سال سی — حیف آں ابر بہاراں می رود
می روی آقا و لے دالی کہ چوں — بر من بیدل ز ہجراں می رود
بیتے می خواہم ز خسرو گوش کن — تا کہ شرح کیف حرماں می رود
"می روی و گریہ می آید مرا — سائتے بنشیں کہ باراں می رود"

شادماں و شاد کام و شاد زی
ایں دعا از ما مریداں می رود

سید محمود

منظوم بالا نظم عالیجناب خان بہادر الحاج مولوی محمد یوسف صاحب کے جلسہ الوداعی میں پڑھی گئی۔ خان بہادر ممدوح مدرسہ عالیہ میں ہیڈ ماسٹر اور پرنسپل کے عہدہ جلیلہ پر تقریباً تیس سال تک فائز رہے اور اس دوران میں اپنے کارہائے نمایاں اور خلق عظیم اور دیگر شخصی محاسن کی بنا پر وہ بنگال کے حلقہ میں علماً اور اہل کلکتہ کے دلوں میں [illegible] خصوصاً ایسی جگہ پیدا کر لی ہے کہ آپ کی یاد دلوں سے محو نہیں ہو سکتی جس وقت خان بہادر موصوف کا الوداعی جلسہ ہوا [illegible] عام طور پر دل متاثر تھا۔ اس موقع پر مولانا حافظ سید محمود صاحب کی [illegible] پُر اثر نظم نے ایک خاص سماں باندھ دیا [illegible]

زندگی

چند دوست بیٹھے ہوئے افسانہ نویسی پر بحث کر رہے تھے۔ غفار نے باآوازِ بلند کہنا شروع کیا "ہندوستان میں ہمارے افسانہ نگاروں کو اتنا کافی مواد مہیا ہو سکتا ہے کہ اُن کو من گھڑت افسانے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری روزمرہ زندگی میں نت نئے ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں کہ جن سے حقیقت بیں نگاہیں افسانہ در افسانہ پیدا کر سکتی ہیں۔ شہر میں جاؤ تو معاشرتی، سیاسی اور اصلاحی خوبیوں اور برائیوں کا کافی سرمایہ پاؤ گے۔ دیہات جاؤ تو وہاں کاشتکار کی مظلومی اور سرمایہ دار کی درندگی۔ عوام کی جہالت اور لکیر کے فقیروں کی ذاتیاتی تمہارے افسانے کے لیے اتنا سامان فراہم کر دیں گی کہ صلاحیت رکھنے والے دماغ کو میکسم گورکی، ٹالسٹائی اور پریم چند بننا کوئی بڑی بات نہیں۔ گاؤں کے خاموش جھونپڑے اور سرد چولھے اپنے اندر ہنگامۂ حیات کی بے چینیاں اور انقلاب کی چنگاریاں چھپائے ہوتے ہیں۔ خواب بھی تشنۂ بیداری ہیں۔ جب ہمارے یہاں ایسی حقیقتیں موجود ہیں تو پھر کیا ضرورت ہے کہ "مجاز" کے لیے دردِ سر مول لیں . . . "

لیکن میرے دوست "مجاز" "حقیقت" سے زیادہ دلچسپ ہے۔ انیس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "ہاں" میں سمجھا۔ غفار نے جواب دیتے ہوئے کہا "تمہارا یہ جملہ کیٹس کی شاعری کا رہینِ منت ہے۔ کہتے تو ٹھیک ہو۔ لیکن یہ جملے اسی جگہ کارآمد اور مفید ہو سکتے ہیں، جہاں لوگ حقیقت کو پہچان اور پا گئے ہوں یا پہچاننا نہیں چاہتے ہوں۔ جہاں لوگ بہت زیادہ جاگ چکے ہوں اور سو جانا چاہتے ہوں، ہندوستان کے لیے، ہندوستان کے افسانہ نویسوں کے لیے یہ معیار کسی طرح بھی مفید نہیں۔ کیا تمہارا خیال ہے خواب بیداری سے اچھی چیز ہے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ ہندوستان جو کروٹ لے کر جاگنے ہی والا ہے اُسے ایسے شاعرانہ خیالات کی افیون پلا کر پھر تھپک کر سلا دیا جائے؟ اس وقت ہندوستان کی حقیقتوں سے روشناس کرنے کا وقت ہے۔ اس وقت ہمارے افسانہ نگاروں کا فرض ہے کہ ان کے افسانے ان کی شہری زندگی بالخصوص دیہات کی معاشرت کا آئینہ ہوں۔ ہندوستان گاؤں اور دیہات میں بستا ہے۔ انھیں چاہئے کہ خود دیہات دیہات پھریں۔ دیہاتوں کی زندگی کا مطالعہ کریں اور اپنی تحریر میں واقعیت کا پہلو روشن رکھیں۔ لٹریچر کی سچائی دلوں کو گرماتی اور برماتی ہے۔ فضائیں اور گرد کے حالات ہیں، ذہنیت میں ہر جگہ ایک خوشگوار انقلاب پیدا کرتی ہے۔ صدہا ایسے واقعات گاؤں کی گونگی دنیا میں محو ہو جاتے ہیں، جو منظرِ عام پر آنے کے بعد بالکل طبع زاد افسانے معلوم ہوتے ہیں۔"

خیر اپنا فلسفہ چھوڑو۔" انیس نے بات مختصر کرتے ہوئے کہا "کوئی مؤثر واقعہ سنا سکتے ہو تو سناؤ۔"

کوئی کیا ہزاروں ہیں ابھی حال کا واقعہ سنو۔

ایک مہینہ ہوتا ہے کہ میں کلکتہ کی ہماہمی اور چہل پہل چھوڑ کر اپنے گاؤں کی خاموش فضا میں پہنچ گیا۔ یہ لگان کی وصولی کا زمانہ تھا۔ تحصیلدار کا مکان بھی ہمارے ہی مکان کے پاس تھا۔ ان سے پہلے کی بھی تھوڑی بہت ملاقات تھی۔ یوں تو آدمی معقول ہیں۔ لیکن لگان وصول کرنے میں بڑی سختی برتتے ہیں۔ ان کا مقولہ ہے کہ تحصیلداری کا مقصد ہی یہ ہے کہ کسانوں پر جبر اور سختی کیا جائے۔ ایسی نوکری کے امیدوار بہت دیکھے دیا ہی بنتا چاہئے۔ انہیں وصولی کے وقت دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ سخت قسم کا مہاجن اپنے قرضداروں سے روپیہ وصول کر رہا ہے۔ یوں فرصت کے وقت ملو تو بڑے خوش اخلاق، بڑے ہی ملنسار۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس اجتماعِ ضدین کی کیا وجہ تھی۔

ایک دن دس بجے کے قریب میں نے دیکھا کہ ان کے دروازے پر کسانوں کا ایک جمگھٹا لگا ہوا ہے۔ افلاس کی ماری ہوئی جوانیاں جھڑوں میں لپٹی ہوئی زندگیاں۔ دھوپ کے جھلسے ہوئے چہرے، دھنسی ہوئی آنکھیں کسی کے بدن پر ثابت کپڑے تک نہ تھے۔ میں سوچنے لگا کیا یہی وہ طبقہ ہے جسے "ارتقا کا پیشوا" اور "تہذیب کا پروردگار" کہا جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ جس کی ارتقا کا یہ عالم ہے کہ ایک وقت چین سے کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا اور تہذیب کی پروردگاری کا یہ عالم ہے کہ تن پر ایک چیتھڑے اور رہنے کو ایک چھپر کے سوا کچھ بھی نہیں۔ میں تحصیلدار صاحب کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ بڑی خوش اخلاقی سے ملے۔ ایک کسان کو آواز دی۔ ارے رموا ذرا حقہ بھر لا۔ حکم کی دیر تھی کہ حاضر ہو گیا۔ انھوں نے مجھ سے کہا تھوڑی دیر ٹھہریئے چند کسانوں سے نپٹ لوں۔ پھر گفتگو ہو۔ میں "جدید اردو" دیکھنے لگا۔ وہ اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ دیکھنے کو تو میں رسالہ پڑھ رہا تھا لیکن دزدیدہ نظروں سے یہ دیکھ رہا تھا کہ تحصیلدار صاحب کسانوں سے کس طرح پیش آتے ہیں اور بیچارے کسان انہیں کیا سمجھتے ہیں۔ سوچ رہا تھا کہ وہ مجھ سے اس خوش اخلاقی سے پیش کیوں آتے ہیں، حالانکہ انہیں مجھ سے کوئی فائدہ نہیں۔ لیکن کسانوں سے اس رکھائی اور سرد مہری سے پیش آتے ہیں کہ سب بات کرتے ڈرتے ہیں۔ حالانکہ ان کی یہ ساری اکڑفوں کسانوں ہی کے بل بوتے پر ہے۔ دماغ میں یہ بات چکر لگا رہی تھی کہ تحصیلدار صاحب کی ایک کڑک نے میرا دماغی نظام درہم برہم کر دیا۔

"دینا ہی پڑیگا" تحصیلدار صاحب نے کہا۔

"سرکاری لگان تو ہم دینے کے لیے تیار ہیں، پر اس بار نہیں۔ اب کی بار ذرا کرو، کیا کروں ساری فصل سوکھ گئی اور رہی سہی ٹلا جو کچھ باقی تھا سب ملیامیٹ کر دیا" ایک کسان نے کہا۔

"ہم یہ سب نہیں جانتے، لاؤ، کہیں سے لاؤ، ہمیں لگان چاہئے"

"سرکار کہاں سے لاؤں، بیوی کا سارا گہنا پتا تو آپ ہی لوگوں کے بھرنے میں ساہوکار کے پاس چلا گیا۔ گھر میں ایک پھوٹی کوڑی نہیں ہے اس مرتبہ دیا کیجئے بابو صاحب"

"بس بس مجھے بک بک جھک جھک پسند نہیں۔ دینا ہے کہ نہیں؟"

"اب تو دیا سرکار، اس بار مہلت دیجئے"

"ادھر آبے کلوا" تحصیلدار صاحب نے اپنے نوکر کو پکارا۔ اور کسانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "مارو اسے کوڑے سے"۔ سویا ایک گویا حکم کی دیر تھی، غریب پر بے بھاؤ پڑنے لگی۔ میں سوچنے لگا، آخر یہ کس جرم میں غریب نے کہاں چوری کی، کہاں ڈاکہ مارا، فطرت سے کون جنگ کر سکتا ہے۔ بارش نہیں ہوئی فصل ماری گئی، کیا اس کا قصور ہے۔ بھیا آئی سب ہی لے گئی کیا اس کے حکم سے ہوا؟ پھر کون سزا پائے۔ اچھی منطق ہے۔ ساری آفتیں غریب ہی کے سر۔

غریب لہولہان ہو گیا، سانسیں پھول رہی تھیں، دم نکلا جا رہا تھا، تحصیلدار صاحب بہت خوش تھے۔ گویا ہندوستان آزاد کر لیا، میں دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ عجیب شخص ہے اس سے تو ملنا نہیں چاہیئے۔ بلا کچھ کہے سنے اٹھ کر چلنے لگا، تحصیلدار صاحب دوسروں سے لگان وصول کرنے میں مصروف تھے، میری طرف دیکھا تو نہیں، تاڑ گئے اور عمداً خاموش رہے۔

بیس قدم بھی نہ گیا تھا کہ وہی کسان گرتا پڑتا میرے پاس چلا آ رہا تھا میں رک گیا آتے ہی میرے قدموں پر گر پڑا اور کہا "بابوجی! سرکار نے مارا یہ ان کا حق تھا، قصور میرا ہے، لگان نہ دینے کی یہی سزا ہے، مگر بابوجی میں سچ کہتا ہوں، گھر میں ایک آدمی تک نہیں کہ جس سے کرم

چکی کروں۔

میری آنکھوں میں بے ساختہ آنسو نکل آئے، غصہ میں دانت پیستا ہوا، اُسے لیکر تحصیلدار صاحب کے پاس گیا، وہ گھبرا سے گئے۔ میں نے تلخ لہجہ میں کہا، سرکار بہادر اسے جلدی کا پیسہ تو دیدو۔

سمجھ میں نہیں آیا کہ اُن کی ہمدردی تھی یا میرا خوف کہ انھوں نے جیب سے دو پیسے نکال کر کسان کی طرف پھینکدیئے۔ کسان جیسے کونین کی دولت پا گیا، بہت خوش ساری مار بھول گیا ہنستا ہوا واپس ہوا مجھے تو تحصیلدار صاحب سے نفرت سی ہونے لگی تھی، میں بھی نہ رکا۔ راستے میں کسان نے مجھ سے کہا:۔

"بابو جی! دیکھا نا! شریف پھر بھی شریف ہی ہوتا ہے۔ بڑے آدمی ہیں، غصہ آیا مار بیٹھے۔ لیکن بعد کو کتنا خیال کرتے ہیں۔ دیکھئے مجھے دیکھتے ہی دو پیسے دیدیئے۔ بڑے دیالو تحصیلدار صاحب آئے ہیں اب سے"

وہ چلا گیا، میں سوچتا ہی رہ گیا۔ اتنا کہہ کر غفار چپ ہوگیا۔ نظریں کہہ رہی تھیں جیسے کہیں دور پر کچھ دیکھ رہا ہو۔

اس واقعہ نے دوستوں پر ایک سکتہ سا طاری کردیا۔ سب اپنے اپنے جگہ پر خاموشی کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا ہر شخص اپنے اپنے دماغ میں ایک ایسا نظام حیات مرتب کر رہا ہے جو غربت، افلاس اور سرمایہ داری کی لعنتوں کو سیلاب بنا کر بہا لیجائے گا۔

کلیم اللہ

انسان میں روحانیت

مادام کوری نے ریڈیم دریافت کرکے نزادی کے اس نظریے کو غلط ثابت کردیا ہے کہ نہ کہیں بھی خالص طاقت کی ایسی تخلیق یا پیداوار نہیں ہے جس کے ساتھ ساتھ اس میں کمی کا عمل بھی نہ جاری رہتا ہو۔

ریڈیم کیا ہے؟ ریڈیم مادّے کی ایک قسم ہے جس میں غیر مرئی اثر یا بالفاظ صحیح تر "ریڈیائی لہروں" کی طاقت موجود ہے۔ اس میں سے مسلسل ایک طاقت روشنی کی شکل میں خارج ہوتی رہتی ہے، لیکن اس سے خود اس کی بناوٹ، حجم یا وزن میں کوئی فرق نہیں آتا۔

غیر مرئی لہروں کی عجیب و غریب صفات نے کیمیاوی عمل تحلیل و ترکیب کے نظریئے میں ایک تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ چنانچہ اب سائنسدان یہ تسلیم کرتے ہیں کہ نہ صرف ریڈیم بلکہ مادے کی بہت سی دیگر اقسام اور مرکبات میں سے بھی ریڈیائی لہریں نکلتی رہتی ہیں۔ لیکن یہ عمل ایسا نہیں ہے جو فی الحال موجودہ کیمیاوی تجربات کا جزو بن سکے، نہ صرف یہ بلکہ اب مادے کے متعلق جو تجھے تلے اصول اور نظریئے قائم کیے گئے ہیں، وہ بھی اس نئی دریافت پر چسپاں نہیں ہو سکتے ہیں۔ اصلیت یہ ہے کہ سائنس مادے اور طاقت کے سچے رشتے کو جاننے میں ناکام رہی ہے ———— مادہ طاقت کی جگہ اور طاقت مادے کی جگہ لیتی دیکھی گئی ہے۔ اس سے بہت پہلے گھوڑے کے نعل کی شکل کے مقناطیس سے یہ تجربہ کیا جا چکا ہے کہ اس میں سے ایک قسم کی غیر مرئی لہریں (نہ دکھائی دینے والی لہریں) نکل نکل کر عالم بسیط میں داخل ہوتی رہتی ہیں، مگر خود مقناطیس کی حالت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

روشنی ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تمام جانداروں کے نفسیاتی اور مادی جسم سے روشنی جیسی ایک شئے خارج ہوتی ہے پھر انسان اس قاعدہ کلیہ سے کیونکر بری ہو سکتا ہے؟ یقیناً انسان کے جسم میں سے بھی ایک خاص قسم کی روشنی کی لہریں پھوٹ پھوٹ کر نکلتی رہتی ہیں، ہر وہ شخص جو ریاضت کے ذریعے صفائی قلب حاصل ہو چکا ہو اُسے صاف دکھائی دے گا کہ ہر ایک جسم انسانی کے گرد روشنی کا ایک لمبوترا حلقہ موجود ہے، یہ روشنی انسان کے جسم، یا زیادہ وسیع معنٰی میں زندہ جسم سے کتنی خارج ہوتی ہے اس کا دارومدار ان اشیا پر ہے جن سے مل کر وہ جسم بنا ہے۔ ہیئت ترکیبی مولہ بالا "انسانی نفسیاتی حلقے" میں سرخی مائل رنگ کی ایک دھاری جسم سے قریباً آدھ انچ کے فاصلے پر نظر آتی ہے اس کے بعد چھ اور دھاریاں بھی ہیں جن کے رنگ ترتیب وار ———— نارنجی مائل، ہلکا زرد، ہلکا سبز، اودا اور ارغوانی جھلک لیے ہوتے ہیں۔

اس سے پہلے لکھا جا چکا ہے کہ سرخی مائل رنگ کی دھاری جسم سے آدھ انچ کی دوری پر ہوتی ہے پھر نارنجی مائل رنگ کی، ان دونوں دھاریوں کی لہروں میں چونکہ ارتعاش زیادہ پیدا ہوتا ہے اس لیے "نفسیاتی جسم" کی نسبتاً زیادہ لطیف روشنی سمجھنا چاہیے اور اسی لیے یہ دھاریاں بقیہ دھاریوں کے اوپر رہتی ہیں، اس کے بعد کی دھاریاں جن کی رنگت ہلکی زرد اور ہلکی سبز ہے، عادات و خصائل انسان کے نفسیاتی پہلو کو ظاہر کرتی ہیں اور یہی وہ لہریں ہیں جن سے انسان کے خیالات کردار، خواہشات اور احساسات کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ مختلف انسانوں کے نفسیاتی حلقے کا غور سے مشاہدہ کرکے ان کی صفات بتائی جا سکتی ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ [illegible]

نہیں ہیں اور صرف ایسے لوگوں کو دکھائی دے سکتے ہیں جن کو گذشتہ اور آئندہ واقعات کا عکس دیکھنے کے علم کی مہارت تامہ حاصل ہو۔ غور و فکر کی طرف رجحان ہو اور دل کی پاکیزگی سے دقیقہ رس اور باریکیوں کو دیکھنے والی طاقت ترقی کر چکی ہو

نفرت ——— مٹیالے کالے رنگ سے اعلیٰ نفسیاتی پاکیزگی کے لیے پیازی رنگ سے غصہ، گہرے سرخ رنگ سے خود غرضی ——— سیاہی مائل سرخ یا سرخی مائل مٹیالے رنگ سے۔ بیدار مغزی ——— ہلکے زرد رنگ سے مکاری ——— زیتونی سبز رنگ سے خالص مذہبی محسوسات ——— گہرے نیلے رنگ سے انسانیت سے ہمدردی ——— نیلے گلابی رنگ سے جس میں ارغوانی جھلک بھی ہو، شرافت و نجابت ——— نیلاہٹ مائل خاکستری رنگ سے خوف ——— خاکستری رنگ سے اور شہوانیت ——— نیلاہٹ مائل سرخ رنگ سے ظاہر ہوتی ہے

بقیہ حلقہ یہ نفسیاتی حلقے کا بقیہ حصہ جو نیلی، اودی اور ارغوانی دھاری پر مشتمل ہے یہی روحانی لہروں کے اثر کا حلقہ ہے اور صرف انہی انسانوں کے گرد پایا جاتا ہے جن کی روح کی طاقت کمال کو پہنچ چکی ہو۔

علم نجوم کے ماہرین ——— ستارہ شناس ——— بتاتے ہیں کہ سیارہ مشتری (برہسپت) کا جسم زردی مائل رنگ کا ہے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ نفسیاتی جسم سے ہلکے زرد رنگ کی روشنی یا روشنی کی مانند لہریں نکلتی رہتی ہیں اس لیے اگر کسی کے زائچے (جنم پتری) میں برہسپت کا اثر غالب ہو تو فوراً کہا جا سکتا ہے کہ یہ شخص ذکاوت ذہنی اور نفسیاتی ترقی کی صفات رکھتا ہے

زمانہ قدیم کے جسمانی معالجین مرضوں کی تشخیص، ان انگلیوں کے سروں اور کلائی سے نکلنے والی روشنی کی لہروں اور ان کی رنگت کو دیکھ کر کیا کرتے تھے۔ گذشتہ یا آئندہ کے واقعات جاننے کے اس قاعدے کا یہ فائدہ ہوتا تھا کہ علامات مرض معلوم کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اس طریقے میں علت اور معلول ——— سبب اور اثر ——— کا مطالعہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ صحیح ہدایت، غور و فکر اور ذکاوت ذہنی نیز قدرت کی ودیعت کی ہوئی طاقتوں کے بیدار ہونے پر "نفسیاتی حلقہ" دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے

فرض کیجئے یہ طاقت سب انسانوں کو حاصل ہو تو کتنے اس کا غلط استعمال نہیں کرینگے؟

قدرت کے پیش نظر ایک خاص مقصد ہے اسی لیے تو یہ مادر زاد پردہ ہے۔

نور محمد خاں مغربی

تاثرات لطیف

اختری خاتون

کیوں ترا انتظار ہے پیارے
دل بہت بےقرار ہے پیارے

مست آنکھیں تری معاذ اللہ
بے پیئے بھی خمار ہے پیارے

روز و شب لوٹتی ہوں کانٹوں پر
اُف! یہ کیسی بہار ہے پیارے!

کھیلنا تری یاد رنگیں سے
زندگی کا شعار ہے پیارے

اب تو خوابوں میں بھی نہیں آتے
مجھ سے کیوں اتنا عار ہے پیارے

پھول اس پر بھی کچھ چڑھا دینا
بیکسی کا مزار ہے پیارے

اختری کو تمہارے آنے کا
رات دن انتظار ہے پیارے

غزل

فنا جو شیوہ ہے رد کردۂ جفا ہوں میں
ہوا ہے دہر میں اک جنس ناروا ہوں میں

ہوائے بادہ پرستی میں اک بلا ہوں میں
نگاہ پھر بھی ساقی کی پی گیا ہوں میں

یہ اختیار۔ بتوں کو خدا بناتا ہوں
یہ جبر۔ آجتک اک بندۂ خدا ہوں میں

کبھی تو ذرہ نوازی کی شان دکھلا دے
کہ خاک ہوکے سرِ رہگزر پڑا ہوں میں

تری جفائیں بھی مایوس کرسکیں نہ مجھے
کوئی امید تو ہے جس پہ جی رہا ہوں میں

بگڑ رہا ہے جو واعظ اسے بگڑنے دو
ابھی غریب نہیں جانتا ہے کیا ہوں میں

کلام حضرت وحشت پسند ہے بیخود
کمالِ حضرت غالب کو مانتا ہوں میں

عباس علی خاں بیخود

غزل

نہ دیکھی راہ بھی فصلِ بہار کی میں نے
شراب دور میں تھی توبہ توڑ دی میں نے

جگہ سرورِ محبت کو دل میں دی میں نے
بنا یہ ڈالی ہے عیش و نشاط کی میں نے

ہمیشہ خاطرِ اہلِ وفا فسردہ رہی
کبھی کھلی ہوئی دیکھی نہ یہ کلی میں نے

لحاظ تیری حیا کا بھی ساری عمر کیا
اگرچہ شوق نظر کی بھی داد دی میں نے

نگاہ شوخ سے اس کی ملا کے اپنی نگاہ
دلِ حزیں کو بنایا شگفتنی میں نے

تو ہی خدا کے سمجھنے کا ایک ذریعہ تھا
نہ قدر کی تری اے جذبۂ خودی میں نے

بہار بھی مرے دل کی کلی کھلا نہ سکی
تو پھر خزاں کی شکایت فضول کی میں نے

طبیعت اپنی شراب اپنی آپ کون لے شیخ
نہیں بھی پی تھی تو کہتا ہوں اب کہ پی میں نے

وسیلہ بن نہ سکی تو بھی سربلندی کا
تجھے بھی دیکھ لیا اے فروتنی میں نے

اثر پذیر نہ تھا خود دلِ فسردہ مرا
تری نظر میں تو دیکھی تھی دلکشی میں نے

نگاہ ناز میں تاثیر کچھ تو تھی آصف
کہ آج شوق سے تجدید شوق کی میں نے

آصف

"اندھیرا"

اختر دوڑا دوڑا پریشان حال راشد کے پاس آیا اور کہنے لگا ـــــ "کچھ خبر بھی ہے آج کونسا دن ہے؟"

"جی ہاں ـــــ لیکن یہ تو بتاؤ آخر تم اتنے بوکھلائے کیوں ہو۔ کیا کوئی قیامت ٹوٹ پڑی ہے تم پر۔ بال اُلجھے ہوئے ہیں۔ صورت پاگلوں کی سی بنی ہے اور..."

باتیں پیچھے بنانا راشد! چلو یونیورسٹی چلیں نتیجہ نکل گیا ہوگا"

"نتیجہ ـــــ امتحان کا" راشد نے تمسخرانہ لہجے میں کہا "اس میں دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں فیل یا پاس۔ گھبرانے کی ضرورت ہی کیا ہے" "تم ان بھی تم کیوں گھبرانے لگے" اختر بدحواسی کے عالم میں کہہ رہا تھا "ماشاء اللہ محنتی ہو، ذہین ہو اسکالرشپ لاؤ گے۔ اور میں تو بس خدا ہی خیر کرے" "ابھی تو دس بجے ہیں" راشد نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "اتنی جلدی کیوں! مجھے تو نہایت ضروری کام ہے۔ تم جاؤ ساتھ ساتھ میرا نتیجہ بھی دیکھ لینا بڑی مہربانی ہوگی"

اختر یہ سن کر تیز قدم اٹھاتے ہوئے بھاگا اور راشد سوچنے لگا ـــــ "امتحان کا نتیجہ! آج کتنی آرزوئیں اور تمنائیں خاک و خون میں لت پت ہو جائیں گی۔ خیالات کے کتنے گھروندے آن واحد میں مسمار ہو جائیں گے۔ کتنی ماؤں کی بوڑھی خواہشیں دم توڑ دیں گی، کتنے بھائیوں کے ہوائی قلعے طوفان کے ایک ہی جھٹکے سے ریزے ریزے ہو جائیں گے۔ کوئی قسمت کو بدنام کرے گا، کوئی غصہ میں آکر خدا کو مورد الزام ٹھہرائیگا ـــــ اور جو کامیاب ہونگے ان کے مکان گھی کے چراغ سے جگمگا اٹھیں گے۔ مبارکبادیوں کے خوشنما الفاظ سنائی دیں گے۔ دعوتیں اڑینگی۔ لیکن آہ! کہ ان کامیاب شدہ نوجوانوں سے جاکر کوئی دریافت کرے کہ آئندہ تم نے زندگی کا کیا لائحہ عمل سوچا ہے آخر یہ کاغذی سند تمہیں کامیابی کی کس منزل میں لیجائیگی۔ ان کا جواب سوائے خاموشی کے اور کچھ نہیں ہوگا۔ اختر بھی کتنا احمق ہے کہ معمولی بات پر پاگل ہوگیا۔ یہ سچ ہے کہ آجکل سند دیکھی جاتی ہے۔ قابلیت کی کوئی قدر نہیں" راشد کی آنکھیں اوپر اٹھیں۔ دیوار میں لگے ہوئے فریم کو ایک ٹک دیکھنے لگا ـــــ پھر تخیل کی دھاراؤں میں بہہ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا "آج کامیابی میری زندگی کے مستقبل کو اُجالا کردیگی۔ پھر میں ہونگا اور ناہید کا مچلتا ہوا شباب! وہ میری کامیابی پر کتنا خوش ہوگی جیسے درحقیقت اُسی نے کامیابی حاصل کی ہے" اسی خیال سے راشد کے نس نس میں جوانی رقص کرنے لگی۔ اب وہ خود اپنا نتیجہ دیکھنے کے لیے گھبرا گیا۔ اس نے سائیکل لی اور یونیورسٹی کو روانہ ہوگیا۔ سائیکل کی رفتار اتنی تیز تھی کہ کئی دفعہ بسوں اور کاروں سے دھکا کھاتے کھاتے بچا۔ راہ میں ہزاروں طرح کی سنہری اُمیدوں کے قلعے تعمیر کیے۔ کتنے پروگرام بنے۔ یہاں تک کہ وہ یونیورسٹی کے گیٹ کے قریب تھا۔ یکایک راشد کی نگاہ اختر کے ہشاش بشاش چہرے پر پڑی۔ وہ لپکا تاکہ اُسے مبارکباد دے۔ لیکن جونہی اختر نے راشد کو دیکھا۔ اس کی نگاہوں تلے اندھیری گھٹائیں پھیل گئیں۔ اور قدم ڈھیلے پڑ گیے۔ اختر کی شکل میں یکایک تبدیلی دیکھ کر راشد گھبرایا۔ اس کی تمناؤں کی دنیا میں بگولے اڑنے لگے۔ اس کے دل میں کسی نے چچوکے دینا شروع کیے۔ راشد نے گھبرا کر آواز لگائی ـــــ "اختر! مبارک ہو۔ کہو کون سے سنیما کا پروگرام بنایا۔ مگر یہ کیا تم خاموش

یوں ہو؟ اُداس کیوں ہو گئے؟ بولو تو سہی کیا بات ہے؟"

اختر نے کہا "مجھے افسوس ہے کہ تمہارا نتیجہ ......"

"بس! اور آگے نہ بولو اختر" راشد نے غم کا گھونٹ پی کر کہا "میرا نتیجہ — مجھے معلوم تھا" یہ کہہ کر وہ اختر کو چھوڑ کر گھر روانہ ہو گیا۔ اب اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی ساری خوش آئند تمنائیں زرد پتوں کی طرح جھڑتی دکھائی دے رہی تھیں۔ مستقبل بھیانک نظر آ رہا تھا۔ اس کا دماغ ہزاروں قسم کے خیالات کا آماجگاہ بن گیا۔

خودکشی! زہر!! ریل کی پٹری!!! دریا کی موجیں!!!!

لیکن وہ سنبھلا اور سوچنے لگا — "زندگی کی حقیقی کامیابی دراصل ناکامی ہی میں ہے۔ یہ سچ ہے کہ دوست احباب مذاق اڑائیں گے کہ فیل ہو گیا۔ ماں کی آنکھیں آنسوؤں کا سمندر بن جائیں گی۔ بھائی کی ساری امیدیں راکھ کے ڈھیر میں بدل جائیں گی۔ عزیزو اقارب کے دلوں کو دھکا لگے گا اور اُف ناہید کا کیا حال ہوگا — ناہید — میری مستقبل کا آئینہ، میری زندگی کی روح!" ناہید کے خیال سے اس کے دو گوہر آبدار ڈھلک پڑے۔

راشد کی ناکامی کی خبر ہر جگہ پھیل گئی۔ جس نے بھی یہ خبر سنی پریشان ہو گئے۔ کسی کو یقین نہیں تھا کہ وہ بی اے میں فیل ہو سکتا ہے۔ لیکن امتحان — یہ تو ایک بہانہ ہے انسانیت کے وقار کو ٹھیس لگانے کا۔ یہ تو ایک شمشیر ہے جو کتنی سنہری امیدوں اور آرزوؤں کی تصویروں کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ امتحان — ڈگری! زندگی کی بیش بہا گھڑیاں ان ہی دو منازل کو طے کرنے کے لیے برباد ہو جاتی ہیں۔ یونیورسٹی نے ہمارے دلوں کا خون چوسنے کے لیے ڈگری کی قربانگاہ کھڑی کی ہے۔

راشد پھٹی پھٹی نگاہوں سے شیلف پر سجی ہوئی کورس کی کتابوں کو دیکھ رہا تھا — جن کتابوں کی ایک ایک سطر کو اس نے دو سال کی لگاتار محنت سے یاد کیا تھا۔ اس کی آنکھوں تلے اب بھی شکسپیر کے ڈرامے، بائرن اور کیٹس کی نظمیں شفاف چشمے کی موجوں کی مانند رقصاں تھیں۔ اب بھی ورڈسورتھ اور شیلے کی رومانی دنیا اس کے رگ رگ میں سمائی تھی — لیکن ان موٹی موٹی اور ضخیم کتابوں کا معاوضہ کیا ملا — ناکامی کا ایک داغ۔ شیلف سے ہٹ کر اب اس کی نگاہیں اسی فریم پر مرکوز ہو گئیں — جس فریم کے اندر اس کی ایک دنیا بسی ہے — ارمانوں اور آرزوؤں کی، جس کے اندر راشد کے مستقبل کا آئینہ ہے، ناہید! جس کی ہنسی اس کے لیے زہرہ کا رباب ہے، جس کا تبسم شفق کی سرخی ہے، جس کے ناز و نخرے میں تاروں کی حلاوت انگیز راگنیاں مدفون ہیں — لیکن آہ! آج وہ ناہید کے پاس کیا منہ لیکر جائے گا۔ اُس نے سوچنا شروع کیا "اس کو کتنا دکھ ہوگا جب وہ سنے گی کہ میں نے دو سال کی محنت کے بعد ناکامی کا سیاہ داغ پایا ہے۔ نہ جانے اُس نے بھی اپنے دل میں کتنی حسین دنیا آباد کی ہوگی ارمانوں کے کتنے خوبصورت محل تعمیر ہوئے ہونگے — نہیں میں اُسے خبر نہیں ہونے دونگا۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کے دل کو بھی ٹھوکر دوں۔ اُس کو بھی اپنے بے معنی اور مہمل غم میں شامل کر لوں" تخیلات کی ان ہی وادیوں میں گم تھا کہ اختر نے آکر کہا — "راشد! مجھے سخت افسوس ہے۔ میں نہیں سمجھ سکا آخر تم نے کون سا پرچہ خراب کیا ..."

"ان بیکار باتوں کو چھوڑو بھی" راشد نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم تھا کہ قدرت درست چالاک میرے شجر حیات کو بار آور ہونے نہیں دے گا۔ انسان جو سوچتا ہے وہ نہیں ہوتا اور جسے نہیں سوچتا ہے وہی ہو جاتا ہے۔ میں نے نتیجہ سے قبل اپنے شاندار مستقبل

کی عمارت کھڑی کر رکھی تھی جس کا انجام ظاہر ہے۔ اختر شاید تمہیں انگریزی ادب کا یہ جملہ یاد ہوگا

We and Nature are therefore one otherwise the illusionlike feast of reason and the flow of soul" to which we are invited is a mockery and a cruel insult. We do not go from a play till the last act is ended and the lights are to be extinguished

بیچ ہے ہماری آرزوئیں اور تمنائیں ستاروں کی ٹولیاں جنہیں ہمیشہ شہاب ثاقب بن جانے کا خوف رہتا ہے" یہ کہہ کر راشد کی آنکھیں پھر فریم کا طواف کرنے لگیں

اختر نے کہا "راشد ہمت نہ ہارو" یہ کہکر اس نے رسٹ واچ کی طرف نظر کی پھر بولا "اچھا اب اجازت ہو پھر ملوں گا"

شام ہو چکی تھی اور اندھیرا آہستہ آہستہ چاروں طرف مسلط ہوتا جارہا تھا۔ سورج کی کچی کچی شعاعیں ماتمی لباس پہن چکی تھیں۔ راشد ایسے سہانے وقت میں تنہا کسی نامعلوم دنیا کا گشت لگا رہا تھا۔ سر کے بال حد سے زیادہ بڑھ گئے تھے۔ کئی دنوں سے داڑھی میں سیفٹی ریزر نے اپنا کام نہیں کیا تھا۔ اس نے سوچنا شروع کیا ——— حسب معمول آسمان کی سفید چھاتی میں تاروں کی سیین۔ اگنیاں لہرائینگی اور فطرت کا ذرہ ذرہ محبت کا سبق پڑھیگا۔ لیکن آہ! کہ میں اپنے دل میں ایک خلا سا کیوں محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ تیرہ و تاریک گھاٹی میں پھینک دیا گیا ہوں جہاں صرف سناٹا ہے، خاموشی ہے۔ کیا میری زندگی کے آسمان میں چاند طلوع نہیں ہوگا؟ تارے نہیں کھیلیں گے؟ کیا ناکامی ہی میری زندگی کی اساس کھڑی کی گئی ہے" یہ خیال آتے ہی اُس نے ناہید کی تصویر دیکھی جہاں اُسے شعاع اُمید نظر آئی۔

ناہید! ایک شگفتہ پھول، زہرہ کا رباب!!

ناہید! راشد کی زندگی کا سرمایہ ہے۔ اس نے ناہید کو تعلیم دی ہے، عقل سکھائی ہے۔ زندگی کا نشیب و فراز سمجھایا ہے اس کا مستقبل، اس کی زندگی، اس کی روح بس وہی ہے۔ اُس نے ناہید کی تعلیم کے لیے اپنی تعلیم سے کوتاہ نظری کی۔ امتحان کی پروا نہیں کی، شب و روز بس ناہید ہے اور اس کی من موہ لینے والی شوخ ادائیں، اس کی محبت میں راشد کی عقل بالکل گم ہو گئی تھی۔ سر پر بی اے کا آخری امتحان، سامنے موٹی موٹی کورس کی کتابیں ——— لیکن آنکھیں ان سب سے موند دی گئی تھیں۔ بس ہر لمحہ ہر ساعت اس کے دل و دماغ میں ایک ہی خیال تھا ——— ناہید! ناہید!! جذبات کے رو میں زندگی کی تمام راہوں کو اس نے مسدود کر ڈالا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا دنیوی ترقی کے لیے ایک قدم آگے بڑھائے۔ بھائی بہنوں کی باتیں اس کے لیے تلخ تھیں۔ ماں کی التجائیں زہر ہلاہل تھیں اور ناہید کا غصہ بھی اس کی نگاہوں میں ستاروں کی جھلک تھا۔ لیکن راشد کو معلوم نہ تھا کہ جذبات کا طوفان آن واحد میں دل کی دنیا اجاڑ سکتا ہے اور ہوا بھی یہی کہ اسی تند جذبات میں غرق ہو کر اُس نے امتحان میں ناکامی کا سیاہ داغ حاصل کیا۔ لیکن اب بھی اس کی آنکھیں نہیں کھلی ہیں۔ عقل کا پردہ چاک نہیں ہوا ہے وہ سوچتا ہے امتحان کی ناکامی اس کے مستقبل کو اندھیرا نہیں کر سکتی۔ اس کی زندگی کی روشن شمع بجھ نہیں سکتی۔ اب بھی آرزوئیں اور اُمیدیں ناہید کی محبت میں شگفتہ ہیں۔ اب بھی اُس کے رگ رگ میں مضراب کے چھینٹے تیر رہے ہیں ———!

راشد نے گھڑی دیکھی، سات بجنے میں چند منٹ باقی تھے ——— وہ پریشان ہو گیا۔ اور بڑبڑانے لگا ——— "آج ناہید کو

رومیو جولیٹ کا آخری باب سمجھا تا ہے۔ اس کو یہ ڈرامہ کتنا بھایا ہے۔ کاش ہم بھی یہ ڈرامہ کھیل سکیں۔ لیکن کیا آج اس آخری باب کو میں پڑھا سکوں گا۔ اُف ناہید!" وہ چکرایا اور سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔

انسان بازیچہ ہے اور قدرت بازیگر۔ صدیوں سے قدرت اس بازیچہ سے کھیل رہی ہے لیکن اب تک کھیل کا ڈراپ سین نظر نہیں آیا۔ معلوم نہیں کب تک یہ کھیل ختم ہوگا ——— عورت ایکٹرس ہے، مرد ایکٹر، قدرت ڈیریکٹر اور یہ دنیا ایک پردہ ہے جس پر ڈیریکٹر اپنا ڈیرکشن کی خوبیاں دکھا رہا ہے!

رشید نے سر اٹھایا۔ دنیا اُس کی آنکھوں تلے بالکل اندھیری تھی۔ اُس نے سوچا ——— "جب ناہید کو معلوم ہوگا کہ اُس کے دل و جان کا مالک امتحان میں ناکام رہا تو نہ جانے اس کے شیشۂ دل کو کیسا دھکا لگیگا۔ میں اُس کے سامنے نہیں جاتا۔

لیکن چند دنوں کے بعد مجبوراً راشد، ناہید کے مکان پہنچا ——— جہاں رومیو جولیٹ کی داستان دہرائی جاتی ہے۔ جہاں آنکھوں ہی آنکھوں میں محبت کے ترانے الاپے جاتے ہیں — !

ناہید نے راشد کو دیکھتے ہی کہا "کل کیوں نہیں آئے آپ۔ طبیعت تو ناساز نہیں ہے؟"

راشد نے مناک نگاہوں سے ایکبار ناہید کو دیکھا اور نظر نیچی کر لی۔ یہ دیکھ کر ناہید پریشان سی ہوگئی اور بول اٹھی ——— "آنکھیں اشکبار کیوں ہیں؟ کیوں بولیے تو سہی!"

"ناہید!" راشد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہنا شروع کر دیا "قدرت نے مجھ سے زبردست انتقام لیا ہے، ہاں اس اندھی قدرت نے جس کی ظالمانہ ضربیں صرف ہم جیسے انسانوں کے لیے محفوظ ہیں۔ میری زندگی کے آسمان میں جو اُجالا ہو رہا تھا اندھیرے سے بدل گیا۔ میں ایک ایسا خلا محسوس کر رہا ہوں جو ناقابل تشریح ہے"

"میں نے نہیں سمجھا" ناہید نے گھبرا کر پوچھا "میں نے نہیں سمجھا آپ کا مطلب کیا ہے؟"

"نہ سمجھو تو اچھا ہے۔ سمجھ انسان کی زندگی کو اور ویران کر دیتی ہے لیکن آہ! تم سن لو ناہید کہ میں امتحان میں فیل ہوگیا!" یہ سن کر ناہید کے دل کو زبردست دھچکا لگا اور اس کا چہرہ زرد ہوگیا۔ کچھ دیر کمرہ میں خاموشی رہی۔ پھر ناہید اٹھ کر ساتھ کمرہ میں چلی آئی۔

راشد کی نگاہ اُٹھی ——— اُس نے دیکھا شکسپیر کا ڈرامہ رومیو جولیٹ سامنے ہی رکھا ہے۔ اُس نے اُسے اٹھا لیا ——— لیکن آہ! کہ اُس نے کیا دیکھا ——— اُس نے دیکھا، اختر کے ہاتھ کی تحریر۔ ایک خط ناہید کے نام۔ اُس نے اُسے پڑھنا شروع سے آخر تک۔ دل و جگر میں زلزلہ سا محسوس ہوا ——— آنکھوں تلے سیاہی کی لکیریں پھیل گئیں۔ اور دماغ میں جیسے کسی نے ہزاروں ہتھوڑے چلانا شروع کیے۔ اختر نے ناہید کو لکھا تھا ———

جانِ آرزو!

آج میں بہت خوش ہوں اتنا خوش جیسے دنیا کی ساری ترنگیں میرے نس نس میں جذب ہوگئی ہیں کیونکہ آج میں گریجویٹ بن گیا ہوں۔ نہ جانے تم اس خوشخبری کو سن کر کتنا خوش ہوگی، اور کچھ سنوگی ——— راشد کے بارے میں۔ وہ بیچارہ بدقسمت فیل ہوگیا۔ اس کے دل میں زبردست دھکا لگا ہے۔ لیکن میں خوش ہوں اور شاید تم بھی خوش ہوگی کہ اب وہ تمہارے سامنے نہیں آ سکتا۔ ناکامی انسان کے ہوش معطل کر دیتی ہے۔ ناہید! کاش اس وقت میں تمہارے سامنے ہوتا۔ اور ہم دونوں رومانی دنیا میں پرواز کر رہے ہوتے ———

"اچھا اب ملنے پر گفتگو ہوگی!"

تمہارا اختر

"محبت" راشد رات کی خاموشی میں تنہا سوچ رہا تھا — "اور وہ بھی ایک جوان لڑکی کی۔ جیسے ریگستان کی تپتی ہوئی سڑکوں میں سراب کا دھوکا۔ محبت بادی النظر میں کتنی پیاری اور حسین کیوں نہ ہو لیکن آہ! اس محبت نے میری رہی سہی زندگی کو شہاب ثاقب بنا دیا۔ میں نے ناہید سے محبت کی اپنی تمام تر ولولوں اور تمناؤں کے ساتھ۔ اس نے بھی میری محبت کا جواب محبت سے دیا۔ ایک دن جب میں نے اس سے پوچھا تھا۔ "ناہید! آج میں تم سے ایک بات کا اقرار کرانا چاہتا ہوں بولو گی؟" اور اس نے کہا تھا "کیوں نہیں کہئے" میں نے اس کی نازک انگلیوں سے کھیلتے ہوئے پوچھا تھا "ناہید! کیا تم میری بن سکتی ہو؟" میں نے اتنا ہی کہا کہ اس کی آنکھوں میں شراب کی بوندیں چھلک اٹھیں تھیں اور چہرہ کلیوں کی طرح شگفتہ ہوگیا تھا — لیکن جب میں آج وہ گئی گذری باتیں سوچتا ہوں تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں —" راشد دیوار کی ٹیک لگائے بدستور خیالات کے بحر ذخار میں غوطہ زن تھا۔

قدرت انسان کی بڑھتی ہوئی آرزوؤں کو کچل دینے کا نام ہے۔ ہم قدرت کے ہاتھوں کا کھلونا ہیں محض ایک کھلونا۔ وہ ہمارے ساتھ ازل سے کھیل رہی ہے اور تا ابد تک یہ سلسلہ جاری رہیگا۔ ناہید نے راشد کے ساتھ جو کچھ کیا تعجب انگیز نہیں ہے — اس نے محبت کی آڑ میں نفرت کا تخم بویا لیکن شاید اسے معلوم نہ تھا کہ نفرت ہی کا دوسرا نام محبت ہے۔ محبت کی توہین اس سے بڑھکر اور کیا ہوسکتی ہے کہ اس نے راشد کو برسوں بنام "محبت" کے دھوکے میں رکھا۔ ہم پھول کو اس لیے نہیں سونگھتے ہیں کہ کچھ دیر بعد مرجھا جائیگا — اس کی خوشبو تو مرجھانے کے بعد بھی دلوں کو شادکام کرتی رہے گی۔ محبت کا پھول بھی مرجھا جائے مگر خوشبو ہمیشہ احساس کی راہوں کو [illegible] باقی رہے گی۔

یونس احمر کلکتہ

اپیل

یتیم خانہ اسلامیہ کلکتہ کی خدمات باشندگان شہر سے مخفی نہیں ہیں۔ یہ اپنی نوعیت کا سب سے بڑا اسلامی ادارہ ہے۔ ہزاروں یتیم اور لاوارث بچے اس ادارہ میں پرورش پاکر برسر روزگار ہیں۔ سیکڑوں یتیم بچیوں کی پرورش و پرداخت اور شادیاں یہاں سے ہوئی ہیں۔ موجودہ جنگ کی فضا نے یتیم خانہ کی مالیات پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔ آمدنی کے وسائل کم ہوگئے اور ہوتے جارہے ہیں۔ اور اخراجات روز افزوں ترقی پر ہے۔ اشیاء خورد و نوش کی قیمت کئی چند بڑھ گئی ہے۔ یہی حال کپڑوں، ادویات اور دیگر ضروریات زندگی کا ہے جو رقم تین یتامی بچوں کی پرورش کیلئے کافی ہوتی تھی اب اس میں ایک یتیم کی پرورش محال ہے باوجود اس گرانی اور نازک صورت حال کے یتیم خانہ کے دائرہ عمل میں بجائے کمی کے اور وسعت دی گئی ہے۔ یتیم خانہ کے مڈل اسکول کو بضرورت اب ہائی اسکول کیا جارہا ہے اور ایک جماعت کا اضافہ اس سال ہو بھی گیا ہے۔ گرلس اسکول میں بھی استانیوں کی تعداد دوچند کردی گئی ہے۔ گذشتہ سال گورنمنٹ کے سرکلر کے ماتحت چونکہ تین سو یتیم بچوں اور بچیوں کیلئے جائے پناہ کا بندوبست ہونا محال تھا اسلیے یتامی کی بڑی تعداد کو مع ضروری اسٹاف اور اسکول کے بہار شریف میں منتقل کرنا پڑا مدرسہ منتقلی سے اخراجات میں اور بھی اضافہ ہوگیا ہے اور جملہ انتظامات دوہرے ہوگئے ہیں۔ گرانی کا اس ادارہ پر اس حد تک اثر پڑا ہے کہ سال رواں کے تخمینہ بجٹ میں بہ نسبت اخراجات کے آمدنی میں مبلغ [illegible] کا خسارہ یا کمی واقع ہوئی ہے جس رقم کا اس سال کے اندر فراہم ہو جانا بہت ضروری ہے۔ ورنہ خطرہ لاحق ہو سکتا ہے کہ اس عظیم ادارہ کو جو زیادہ از نصف صدی سے قوم کی اہم خدمات انجام دے رہا ہے اپنے دائرہ عمل کو کم کرنا اور اپنے مشاغل کو کچھ عرصہ کے لیے روک دینا پڑے اور خدانخواستہ اگر ایسا ہوا تو یہ بات مسلمانان بنگال کی اولوالعزمی، غیرت اور یتامی نوازی کے بالکل منافی ہوگی جو کہ تمام ہندوستان میں اپنے قومی درد اور اسلامی فیاضی کیلئے ضرب المثل ہیں۔ وقت نازک آن پڑا ہے۔ مگر اسلامی حمیت اس کا مقابلہ کرسکتی ہے۔ آئیے اور یتیموں کے بیڑے کو پار لگائیے۔ ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین۔

مبارک مہینے آپہنچے۔ زکوٰۃ۔ خیرات اور صدقہ نکال کر خدمات اپنا حساب چکتا کیجئے اور بیکس یتامی کیلئے پیٹ کی روٹی اور تن کا کپڑا بہم پہنچائیے۔ خدا آپ کے مال اور آمدنی میں برکت دے گا۔

جملہ ترسیل زر و اشیاء خورد و نوش وغیرہ بنام سکریٹری یتیم خانہ اسلامیہ کلکتہ واقع نمبر ۳ سید صالح لین کے پاس ہونی چاہئے۔ چھوٹی سے چھوٹی رقم بھی دعاؤں کے ساتھ قبول کی جائیگی۔ [illegible]

نئی زندگی

افراد

انجم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک مزدور دوشیزہ

مراد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک غریب تعلیم یافتہ نوجوان

ایک معمر شخص ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

منظر

ایک چھوٹے سے شہر کا دیہات نما حصہ جو آفتاب کے آخری شعلوں سے جھلس رہا ہے۔ انجم ان شعلوں میں گھری اپنے شکستہ دروازے پہ ٹیک لگائے اور سر کو اپنے بازوؤں میں لیے بیٹھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سو رہی ہے اور غنیمت ہے کہ گرم گرم آفتابی طمانچوں سے بھی متاثر نہیں ہوتی۔ اتنے میں ایک ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی وہ چونک اٹھی جیسے کہ آسمان پر سے اسے گرا دیا گیا ہے اور یکا یک اٹھ کر چاروں طرف بغور دیکھنے لگی ــــ ہر طرف مایوسیاں ہی مایوسیاں تھیں وس کا دل بھر آیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

انجم (زیر لب) شام ہو رہی ہے۔ کتنی برق رفتار ہے یہ اور انکی یاد کتنی برقدم۔ آہ، دل کو چاٹے جاتی ہے۔ مگر ــــ مگر انہیں کیا معلوم کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ، وہ تو صرف تیر چلانا جانتے ہیں، نشتر چبھونا! ــــ خدایا، خدایا، میں کیسے ــــ کیسے جی سکونگی۔ (نڈھال ہو کر بیٹھ جاتی ہے اور منہ ڈھانپ کر رو دیتی ہے، دھیرے دھیرے)

(وقفہ)

(سرسراہٹ کی مدہم آواز)

انجم (ادھر ادھر بغور دیکھ کر) آہ، اتنی خوش قسمت کہاں!

(سرسراہٹ کی تیز آواز۔ ایک معمر شخص قریب آتا ہے)

انجم ۔ (اچانک) مراد! ــــ اوہ، تم کون؟

معمر شخص ۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ میرا مطلب ــــ مجھے ۔ ۔ ۔ ۔

انجم ۔ تم کیا چاہتے ہو؟

معمر شخص ۔ کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔

انجم بھوکے ہو؟

معمر شخص ۔ نہیں نہیں۔ صرف صرف ــــ تمہاری یہ حالت دیکھی نہیں جاتی، انجم!

انجم ٹُ، ٹُ ۔ ۔ ۔ (حیرت سے اس کی طرف دیکھتی ہے)

معمر شخص ۔ متحیر مت ہو۔ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ انجم! یہ مکان یہ کمرہ، یہ دروازہ، یہ سب کچھ مسکراتے رہتے تھے مگر جب سے تم نے مسکرانا چھوڑا اس وقت سے یہ سب اداس ہو گئے۔ انجم تم رو رہی تھیں؟

انجم ۔ شاید!

معمر شخص کیوں رو رہی تھیں انجم؟

انجم ۔ جب انسان کچھ نہیں کر سکتا، تدبیریں کام نہیں آتیں جب امیدیں مردہ ہو جاتی ہیں تو آنسو بن بن کر ــــ آہ ــــ ٹپکنے لگتی ہیں

معمر شخص ۔ یہ درد بھری آہ، یہ سوگ بھرے الفاظ۔ ظالم، ظالم مراد نے تمہارا کیا حال کر دیا۔

انجم۔ (متحیر ہوکر) مراد کو بھی جانتے ہو؟

معمر شخص۔ خوب اچھی طرح — اسے مجسٹریٹ کی لڑکی سے محبت ہے تا

انجم۔ محبت؟ وہ محبت کر سکتے ہیں؟ یہ غلط ہے۔ بالکل غلط

معمر شخص۔ تم مجھے جھوٹا سمجھتی ہو۔

انجم۔ ایسا ہوسکتا ہے؟ کیا ایسا ہوسکتا ہے؟

معمر شخص۔ کم ازکم مراد خود غرض مراد ضرور ایسا کر سکتا ہے۔ جانتی ہو وہ تمہارے سامنے سے کیوں بھاگتا ہے؟ — اس لیے کہ وہ مجسٹریٹ کی لڑکی کو اپنی محبت کا حسین اور اچھوتا خواب دکھا کر اپنی مضبوط گرفت میں کر سکے۔ وہ تم سے نفرت کرتا ہے اس لیے کہ تمہاری ذات اس کی ہونیوالی فردوسی دنیا کو ناپید کر دیگی اور پھر ایک رئیس کی لڑکی کو چھوڑ کر جس کا حسن ہیرے اور جواہرات کے جھرمٹ میں چاند سے زیادہ دلکش نظر آتا ہے وہ تم سے — ایک غریب مزدور سے کیوں محبت کرنے لگا (انجم سسکیاں بھرتی ہے)

معمر شخص پھر رونے لگیں انجم (خفیف سا وقفہ) اف ظالم نے کیا بنا ڈالا ہے تمہیں۔ ظالم۔ جابر۔ تمہاری محبت کو کچل ڈالا — انجم! سب جانتے ہوئے بھی تم اس سے محبت کرتی ہو۔ بولو کیوں محبت کرتی ہو؟

انجم۔ آہ، تم نہیں جانتے۔

معمر شخص میں سب کچھ جانتا ہوں انجم۔ مگر کیا ایک ظالم، جابر خود غرض انسان محبت کا مستحق ہوسکتا ہے؟ کیا کسی کی مورت کے پاس رونا چاہیے؟ اس پر یہ انمول گوہر نچھاور کرنے چاہئیں؟

انجم میں نہیں جانتی۔

معمر شخص تو پھر کیوں رو رہی ہو؟

انجم (جھلا کر) اف، تم تو پیچھے پڑ گئے۔

معمر شخص۔ کاش اپوچھنے کی بجائے تمہارے سارے غم اپنے سینے میں سمیٹ لیتا۔

انجم (پشیماں ہوکر) تم بڑے ہمدرد معلوم ہوتے ہو۔ مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں کرتا۔ وہ بھی نہیں جن پر میں اپنی جان چھڑکتی ہوں — آہ، آج، آج صبح تو انھوں نے مجھے اس طرح دھتکار دیا کہ کوئی کتے بلی کو بھی یوں نہیں دھتکارتا

معمر شخص (بات کاٹ کر) اتنی تذلیل تمہاری!! اتنا اتنا غیر انسانی برتاؤ۔

انجم (اپنے خیال میں گم ہوکر) اور جب سے ابھی تک وہ یہاں سے گذرے نہیں حالانکہ یہی ان کا راستہ ہے روزانہ یہاں سے بیسوں بار آتے جاتے ہیں۔ وہ، وہ ہے ان کا مکان اس ناریل کے درخت کے نیچے ......

معمر شخص (بات کاٹ کر) میں جانتا ہوں۔ لیکن انجم وہ تمہیں حقیر جانوروں سے بھی زیادہ ذلیل سمجھتا ہے۔ اسے تمہاری صورت تک گوارا نہیں اور تم ہو کہ اس کو دیکھنے کے لیے تڑپ رہی ہو۔ اس پیسے کے انسان کی خاطر اس آتشیں دھوپ میں اپنے حسین جسم کو جھلسا رہی ہو۔

انجم۔ آہ، کیا کروں، اتنی نفرت پر بھی دل ان ہی کو چاہتا ہے ان ہی کے خواب دیکھتا ہے

معمر شخص۔ انجم ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو کہ اگر تم یونہی روتی رہیں اس، اس وحشی انسان کے لیے تڑپتی رہیں تو تمہارا کیا حشر ہوگا۔

انجم۔ میں نہیں جانتی۔ میں کچھ نہیں سمجھتی۔ خدا مجھے موت بھی نہیں دیتا

معمر شخص۔ اتنا۔ اتنا مایوس نہ ہو۔ ایسے الفاظ نہ کہو ورنہ .....

انجم۔ اللہ! پھر میں کیا کروں! (سسکیاں بھرتی ہے)

معمر شخص۔ یہ آنسو، یہ آنسو "قطرہائے حیات" ہیں انجم۔ انہیں اس ظالم، وحشی، کمینے انسان، رذیل کتے ....

انجم۔ (بات کاٹ کر) یہ نہ کہو۔ وہ بڑے نیک انسان ہیں بڑے اچھے آدمی ہیں۔ کبھی تم نے انہیں مسکراتے دیکھا ہے؟

والدہ بڑی دلکش ہوتی ہے وہ مسکراہٹ، مگر آہ، مجھے
دیکھ کر اب وہ نہیں مسکراتے۔ میرے لیے اُن کے دل میں
محبت نہیں ہے۔ وہ تو ـــــ یہ یہ غلط ہے ـــــ وہ تو
محبت کرنا جانتے ہی نہیں۔ میرے انجان بدرحا انجان
محسن، وہ محبت کرنا کیسے سیکھ سکتے ہیں۔

شخص۔ محبت سکھائی نہیں جاتی ہے، انجم

انجم۔ سکھائی نہیں جاتی تو نفرت کی آگ کیسے بجھ سکتی ہے؟

شخص۔ محبت و نفرت دونوں بھوکی آگ ہیں۔ محبت کے شعلے
خود کو نیست و نابود کر دیتے ہیں اور نفرت کی لپٹ دوسروں
کو تباہ و برباد کر کے چین لیتی ہے۔ اسے تم سے نفرت ہے
وہ تمہیں ہر ممکن دکھ پہنچائیگا۔ اور مجسٹریٹ کی لڑکی سے
شادی کرنے کے لیے ـــ۔۔۔۔۔۔

انجم۔ وہ کبھی شادی نہیں کریں گے۔ میں جانتی ہوں۔ مجھے یقین ہے

شخص۔ مگر وہ رئیس کی لڑکی ہے۔ اس کا حسن جادو ہے وہ
اس رنگین مجسمہ کو ضرورت اپنی خلوت کی زینت بنائے گا
ـــــ تم اتنا بھی نہیں سمجھتیں انجم۔

انجم۔ تو پھر میں کیسے جی سکونگی، کیسے جی سکونگی؟ مجھ سے تو یہ
سب کچھ دیکھا نہیں جائیگا۔ میں میں اپنا گلا گھونٹ ڈالونگی
ـــــ کیا بک گئی! آج نہ جانے کیا کیا بک رہی ہوں
مگر دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے کہنا ہی پڑتا ہے، تم نے
میرے دکھتے ہوئے جذبات کو سہلایا۔ روتی ہوئی
دھڑکنوں کو سنبھالا، اس لیے جو دل میں آیا کہہ گئی۔

شخص۔ کاش تمہارے درد کو میں بالکل مٹا سکتا!

(بہت دور مراد دکھائی پڑتا ہے۔ انجم کی نگاہ
یکایک اس پر پڑتی ہے۔

انجم۔ (زیرِ لب) مراد ـــــ پیارے مراد!
(تیزی سے اٹھتی ہے)

شخص۔ انجم سنو، خدا کے لیے سنو، میں سچ کہتا ہوں وہ تم سے
نفرت کرتا ہے سخت نفرت

(قدرے تعجب اور قدرے غصے سے اس کی طرف
تاکتی ہے)

شخص (ہاتھ پکڑ کر) انجم نہ جاؤ۔ میری بات مانو، وہ پھر تمہیں
ٹھوکر سے اڑا دیگا ضرور۔۔۔

(غصہ و حقارت سے تاکتی ہے)

شخص۔ (متاثر ہو کر) آوہ! ۔۔۔۔۔۔۔۔

(بگولے کی طرح جاتی ہے۔ شخص قریب کے ایک
درخت کے نیچے بیٹھ کر اپنے تخیلات میں گم ہو جاتا ہے

انجم (چلا کر پیار بھرے لہجے میں) مراد! ـــــ مراد ـــ مراد!

مراد۔ (گھبرا کر) اف۔ خداوندا! کوئی ایسا جذبہ اس کے دل
میں پیدا کر دے کہ وہ پلٹ جائے۔ واپس چلی جائے
آہ، ہمدردی کا جواب تنفر، پیار کا جواب تُرش روئی سے دیتے
وقت کلیجہ منہ کو آجاتا ہے اس کے گرم گرم آنسو کو دیکھ کر
دل تڑپ اٹھتا ہے لیکن ـــــ خدایا! روک لے اسے
اپنے سینے سے چمٹا کر میں اس کی زندگی برباد نہیں کر سکتا
میرے پاس اس کے لیے کچھ نہیں۔۔۔۔ آہ۔ آہی گئی۔

(مراد کے کاندھے پر ہات رکھ دیتی ہے مگر وہ آگے
بڑھ جاتا ہے اور اس کا ہاتھ لڑھک پڑتا ہے)

انجم۔ (حسرت سے) مراد!

مراد۔ (آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بآوازِ) آخر اس طرح مجھے
تنگ کرنے میں تمہیں کیا حاصل۔ تم کیوں میرے۔۔۔ (پھر
تیز تیز چلنے لگتا ہے)

انجم۔ (قدم بقدم چلتے ہوئے) آہستہ بولو۔ مراد کوئی۔۔۔۔

مراد۔ (بات کاٹ کر) پہلے اس کا جواب دو کہ تمہیں یوں تنگ
کرنے کا کیا حق ہے؟ کیا میں نے تم سے کچھ زیادہ کبھی حسب

پورا نہ کرنے پر مجھے کسی زاہد کے ضمیر کی طرح تنگ کر رہی ہو

انجم۔ مراد، تم بڑے، بڑے جابر ہو

مراد۔ میں جابر؟ میں بڑا مجبور ہوں، بڑا مجبور، تم نہیں سمجھتیں تم نہیں سمجھ سکتیں۔

انجم۔ میں بھی تو مجبور ہوں ــــ مجبور ہو کر تمہارے قدموں پر گڑگڑاتی ہوں۔ تمہاری جھڑکیوں پر مسکراتی اور تمہاری ٹھوکروں پر ہنستی ہوں۔

مراد۔ تم پاگل ہو بالکل پاگل۔ میرے پاس تمہارے لیے کیا رکھا ہے۔ میں ایک مفلس، قلاش . . . . .

انجم۔ نشتر نہ چبھوؤ مراد۔ مجھے دولت کی پروا نہیں

مراد۔ میں یہ جانتا ہوں۔ لیکن تمہاری قربانی کی قدر نہیں کر سکتا میں اس دنیا کا مقابلہ کر کے اپنے لیے ایک نئی دنیا پیدا کرنے کے لیے پیدا ہوا ہوں۔ مجھے کسی سے محبت کرنے، کسی کو اپنی طرح حقیر بنانے کا کوئی حق نہیں۔ جاؤ۔ انجم، جاؤ میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں۔ میری دنیا میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں

انجم۔ مگر عورت مرد کی زندگی کا اسی قدر ضروری جز ہے جس قدر اس کی سانس۔ تم نے عورت کو سمجھا نہیں

مراد۔ عورت سکون کی دشمن ہے۔ مرد کے روحانی سکون کو تھکا دیتی ہے وہ۔ اگر یہ اس کی محبت ہے تو اس کی بےزاریوں سے زیادہ پریشان کن۔ تم مجھ سے محبت کرتی ہو تو اب نفرت کرو۔ مجھے محبت سے زیادہ تمہاری نفرت کی ضرورت ہے

انجم۔ محبت کی اس قدر توہین !

مراد۔ ہاں، ہاں۔ مجھے ایسی محبت نہیں چاہئے جو زندگی کے پھول کو ہنسانے کی بجائے مرجھا دے۔

انجم۔ مگر تم جانتے ہی نہیں کہ محبت کیا ہے۔ تم تو اس کی لذت اس کے کیف سے واقف ہی نہیں ہو۔ آؤ، میں تمہیں بتاؤں کہ محبت کیا ہے ــــ جس کی تلخی میں مٹھاس ہو جس کی موت میں بھی زندگی ہو وہ چیز کیسی انمول ہوگی . . .

مراد۔ میں یہ جاننا نہیں چاہتا۔ آخر میرے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گئی ہو؟

انجم۔ (مایوس ہو کر) بڑے سنگدل ہو گئے ہو مراد

مراد۔ سنگدل! (تلخ ہنسی ہنستا ہے) ــــ احمق، نادان میں تمہاری ہی خاطر کہہ رہا ہوں تاکہ تم اپنی زندگی، اپنی جوانی اپنے حسن کو برباد نہ کرو، جاؤ کسی اور پر محبت نچھاور کرو، جس پر دیوتاؤں کا سایہ ہے، دولت کی دیوی جس کے گھر کی لونڈی ہے۔ جاؤ اور عیش و عشرت کی زندگی گذارو

انجم مجھے ایسی زندگی نہیں چاہیئے مراد جو تمہارے تصور سے خالی ہو۔

مراد۔ میرا تصور کراہتی ہوئی، روتی اور چیختی ہوئی زندگی کا ساتھی ہے

انجم۔ نہیں مراد ہنستی ہوئی زندگی کا !

مراد۔ ہنستی ہوئی زندگی کے لیے روپے چاہئیں۔ روپے جو میں فراہم نہیں کر سکتا۔ اور اگرچہ میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں تاہم مجھے نوکری نہیں مل سکتی اور مجھ سے سخت کام بھی نہیں ہو سکتا چونکہ میں اس کا عادی نہیں ہوں۔ آخر ٹیوشن پر اکتفا کیا

انجم۔ مگر نوکری کے لیے تم نے کوشش کب کی

مراد۔ کوشش سے نوکری نہیں ملتی۔ اس کے لیے یا تو رشوت چاہئے یا بے پناہ خوشامد۔ ان میں سے میں ایک بھی نہیں کر سکتا۔

انجم۔ تو میں فاقہ کروں گی۔ میں فاقہ کی عادی ہوں اور آج تو صبح ہی سے میں فاقے سے ہوں۔

مراد۔ بڑی ضدی ہو۔ عورت بڑی ضدی ہوتی ہے۔ ناقص العقل!

(مزید تیز چلتا ہے)

انجم ۔ (ساتھ ساتھ چلتے ہوئے) مراد؛ مراد؛ مراد ــــ مراد!

مراد ۔ (جھلا کر) شیطان بھی انسان کے پیچھے یوں نہیں پڑتا

انجم (گھٹی ہوئی آواز میں) مراد

مراد ۔ میرا پیچھا چھوڑ دو ورنہ، ورنہ میں کچھ کر گزروں گا۔ کچھ کر گزروں گا۔

(انجم رک جاتی ہے مگر مراد تیز تیز چلتا رہتا ہے)

(وقفہ)

انجم ۔ (دوڑ کر مراد کو بازو سے پکڑ کر) مراد، مجھے تم سے محبت ہے محبت ہے مراد۔

(مراد رک جاتا ہے اور ایک بار پھر انجم کا ہاتھ ڈھلک پڑتا ہے اور انجم کی آنکھ تر ہو جاتی ہے)

(قدرے سکوت)

مراد ۔ (نرمی سے) جاؤ اور مجھ سے کام لو، انجم

انجم ۔ (قدرے سنجیدگی سے) وہ ۔ سچ کہتی ۔ سچ کہتا تھا وہ ہمدرد انسان۔

مراد ۔ (قدرے متعجب ہو کر) کون، کون انسان؟

انجم (کچھ کچھ کانپتی ہوئی آواز میں) وہی جو کہتا تھا کہ تم دولت کے بھوکے ہو۔ مجسٹریٹ کی لڑکی سے شادی کر کے اپنی اجڑی ہوئی دنیا سنوارنا چاہتے ہو۔

مراد ۔ (قدرے گھبرا کر) مجسٹریٹ کی لڑکی؟ کون لڑکی؟ میں اسے نہیں جانتا

انجم ۔ (مایوسی کے لہجے میں) تم کچھ بھی کہنا چاہو ۔ اچھا میں تمہارے راستے میں کانٹا نہیں بنوں گی ۔ جاؤ ۔ میں اس کھیل ہی کو ختم کر دوں گی

مراد ۔ سنو، ٹھہرو، انجم

انجم ....

(دوڑ کر نکل جاتی ہے ۔ ایک دو منٹ بعد مراد بھی اس کے پیچھے بھاگتا ہے)

شخص ۔ (انجم کو بے تحاشہ دوڑتے دیکھ کر بڑبڑاتا ہے) یہ یہ کیا۔ کہاں جا رہی ہے اس وحشت میں ــــ اس کا انجام کیا ہوگا (اس کے پیچھے بے تحاشا بھاگتا ہے)

شخص ۔ انجم ــــ انجم! ٹھہرو، ٹھہرو ــــ میں ہوں تمہارا محسن!

(انجم اور تیز دوڑتی ہے)

شخص ۔ (عاجزی سے) انجم ٹھہر جاؤ، بات مانو ــــ انجم!

(کچھ دیر کے بعد اس کا راستہ روک لیتا ہے) (دو سانس میں) آن ــ جم

انجم (مشکل سے سانس لیکر) جانے دو، جانے دو، مت روکو ــــ آہ، جانے دو

(بھاگنے کی کوشش کرتی ہے مگر وہ اس کے بازو پکڑ لیتا ہے)

شخص ہوش سنبھالو، ہوش سنبھالو انجم

انجم ۔ (ہانپتے ہوئے) میں یہ برداشت نہیں کر سکتی (بھاگنے کی کوشش کرتی ہے) جانے دو، جانے دو۔ آہ میں پاگل ہو جاؤں گی، پاگل ہو جاؤں گی

شخص (دل کی گہرائیوں سے) انجم۔

انجم ۔ مجھے ہوش میں مرنے دو۔

شخص ۔ (گرفت کو مضبوط کر کے) انجم۔ ذرا ــــ ذرا۔

انجم ۔ (پریشان ہو کر) اوہ، مرنے بھی نہیں دیتے، کیسے ہمدرد ہو ــــ تم سچ کہتے تھے۔ مجھے پھر ٹھکرا دیا، دھتکار دیا وہ مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ آہ سخت نفرت! ان کے دل میں مجسٹریٹ کی لڑکی کا قبضہ ہے، وہاں میرے لیے کوئی جگہ نہیں

(اپنے سر کو اس کے کاندھے پر ڈال دیتی ہے)

(وقفہ)

شخص ۔ ادھر آؤ، انجم۔ اس طرف۔ تم سے کچھ کہنا ہے۔ ایک راز

کی بات، ... آؤ — تالاب کے کنارے۔

(دونوں ایک درخت کے سائے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ مراد انجم کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے پہنچ جاتا ہے اور ان کی گفتگو چھپ کر سنتا ہے)

شخص۔ انجم میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں مگر تم مجھے مطلق نہیں جانتیں اس پر تم نے مجھ پر پورا بھروسہ کر لیا۔ یہ میری انتہائی خوش قسمتی ہے۔ یہ میری . .

انجم تم واقعی بڑے ہمدرد ہو

شخص۔ انجم میرے اور تمہارے دل میں ایک نامعلوم تڑپ ہے، ایک عجیب و غریب قربت۔ یہ کیوں انجم ؟

(انجم کوئی جواب نہیں دیتی ہے)

شخص۔ جب تم زندگی سے بیزار ہوگئیں تو میں نے تمہیں سنبھال لیا میں نہ معلوم کب سے اپنی زندگی سے بیزار ہوں لیکن کوئی نہیں سنبھالتا — کیا تم سنبھال لوگی انجم ؟

انجم۔ تمہاری ہمدردی میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ مگر — میں ہی

شخص۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھے نہیں چاہ سکیں مگر محض تمہاری جھوٹی محبت، مجھے نیا جنم، نئی زندگی بخش دیگی — انجم کیا مجھے جینے کی آس نہ دوگی ؟

انجم۔ میں تمہاری بڑی قدر کرتی ہوں۔ لیکن مجھے افسوس ہے میں تمہارے محبت بھرے الفاظ کا جواب محبت سے نہیں دے سکتی۔ یہ دل مراد، ظالم مراد کے لیے مخصوص ہے

شخص۔ انجم وہ تمہاری محبت کی قدر نہیں کرتا۔ اسے تمہارے جذبات کا احترام نہیں، وہ تمہیں بار بار ٹھکرا دیتا ہے، دھتکار دیتا ہے۔ اسے صرف دولت کی پروا ہے۔ وہ اس حقیر شے کیلئے ایک دوسری لڑکی کو سبز باغ دکھا رہا ہے لیکن اس پر بھی تم اسے چاہتی ہو۔ بھلا تم تمہیں اسے بھول جانا چاہئیے۔ اگر بھول نہیں سکتیں تو کم از کم میری زندگی میں داخل ہو کر اسے یقین دلاؤ کہ تم نے اسے بھلا دیا۔

انجم۔ آہ یہی تو نہیں ہو سکتا۔ میں جان دے سکتی ہوں لیکن مراد — مراد کو نہیں بھول سکتی

شخص۔ نہیں بھول سکتیں؟ — انجم وہ تمہارے نازک سے نازک جذبات کو اپنی بے دردی کا نشانہ بناتا ہے۔ وہ تم کو ایک دوسری لڑکی پر قربان کر رہا ہے (بازو پکڑ کر) نہیں، تم اسے نہیں بھول سکتیں۔ سنو انجم! اس سے انتقام لو انتقام اور محض تمہارے انتقام کی خاطر میں خود کو تمہارے قدموں میں گرا دونگا، تمہارا غلام بن جاؤنگا۔

انجم (بازو چھڑا کر اور علیحدہ ہو کر) میں، میں تمہاری ہمدردانہ رائے کی قدر کرتی ہوں۔ لیکن یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔

شخص۔ ضرور ہو سکتا ہے۔ تم صرف اپنی کمزوریوں کو بھول جاؤ — آخر، آخر اسے تمہارے دل و دماغ پر چھایا رہنے کا کیا حق ہے۔ تم سے وہ نفرت کرتا ہے تم اس سے نفرت کرو۔ جیسے کو تیسا۔ یہ دنیا کا زرین اصول ہے اسے کبھی نہ بھولو۔ نفرت کرنے والے کے ساتھ نفرت اور محبت کرنے والے کے ساتھ محبت سے پیش آؤ۔ اگر آج ساری دنیا اس گوہریں اصول پر چلنے لگے تو زمانے کی ساری برائیاں دور ہو جائیں۔ سوسائٹی میں گندگی پھیلانے والوں کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کرکے انھیں فریدگند گی پھیلانے کی دعوت دی جاتی ہے۔ جیسے ہم برداشت کرتا یا معاف کرتا کہتے ہیں اور انہیں "ترغیب گناہ" کہنا چاہئے سمجھیں؟ — کم از کم سوسائٹی ہی کی خاطر تم میری زندگی میں آجاؤ تم بھی مجسٹریٹ کی لڑکی کی طرح حسین بن جاؤگی۔ ہیروں اور موتیوں سے کھیلوگی — دیکھو دیکھو

(مراد غصہ سے لال ہو کر بڑی تیزی سے نکلتا ہے انجم دیکھتے ہی کھڑی ہو جاتی ہے)

مراد۔ (چیخ کر) ذلیل کتے۔ ہمدردی کی آڑ میں شکار کھیلنا چاہتا ہے۔ مردود! جھوٹ بول کر دوسرے کی محبت اور ہمدردی خریدنا چاہتا ہے۔ میں اگر ذلیل اور کمینہ ہوں تو تو مجھ سے بھی بڑھ کر ہے۔ بول بوڑھے کتے کیا سزا دوں تجھکو؟

معمر شخص:۔ سزا؟ —— مجھے ضرور سزا ملنی چاہئے۔ انجم تم میرے لیے سزا تجویز کرو

انجم۔ چلو مراد، چلو یہاں سے

مراد۔ نہیں۔ یہ نہیں، دھوکہ دیکر، جھوٹ بول کر، مجھے بدنام اور رسوا کرکے حاصل کرنا چاہتا تھا

معمر شخص۔ انجم، کیا سزا تجویز کی تم نے؟

انجم۔ چلو مراد۔ خدا کے لیے جلد چلو

مراد۔ ہاں، چلو، میں نے اسے موقع دیا تھا کہ میرے خلاف در غلا سکے۔ میں بزدل ہوں۔ کم حوصلہ۔ میں بوجھ برداشت کرنے سے ڈرتا ہوں۔ چلو انجم۔ میرے ساتھ چلو اور میرے غریب جھونپڑے میں محبت کی شمع جلا دو۔ شاید تمہاری محبت مجھے ہمت دے اور میں اپنے جھونپڑے کو تمہارے لیے تمہاری خاطر محل میں تبدیل کرسکوں

معمر شخص۔ ہا ہا ہا —— جو معمولی سی چال نہ سمجھ سکتا ہو وہ زندگی کیا پا سکیگا

(پردہ)

ضیا عاکف

بادِ کہن

از نتیجہ افکار پروفیسر شہباز مرحوم

مندرجہ ذیل غیر مطبوعہ غزل "حیات بے نظیر" والے مشہور شاعر پروفیسر شہباز مرحوم کا تبرک ہے۔ گذشتہ اشاعت میں مجموعہ نظم "تفریح الفکر" کا صفحہ ۱۳ پر تبصرہ شائع ہو چکا ہے امید ہے کہ جن شائقین علم ادب نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہوگا وہ ضرور محظوظ ہوئے ہونگے۔ ہم جناب سید اختر حسین انکم ٹکس آفیسر کے ممنون ہیں کہ آپ نے یہ غیر مطبوعہ غزل جدید اردو کو اشاعت کے لیے بھیجی ہے — ع۔ ج

وہ کیا جانے آنا، بھلا کیوں کر آئے ‖ دل آ کر بتا، دل رُبا کیوں کر آئے

جدھر جائیے پیچ و خم ہیں بلا کے ‖ قدم تک وہ زلفِ رسا کیوں کر آئے

وہ رنگنے کو ہیں خون سے ہاتھ اپنے ‖ قدم دیکھنے کو حنا کیوں کر آئے

طلب اُس سے بوسے کی صرف اس لیے ہے ‖ کہ گالوں پہ دیکھیں حیا کیوں کر آئے

مسلماں سمجھتا ہے اب بھی وہ کافر ‖ کروں کیا، وہ بت یا خدا کیوں کر آئے

لگا دیں نہ وہ چاٹ اگر گالیوں کی ‖ خوشی دل سے لب تک دعا کیوں کر آئے

تصوّر ترا دل سے کیوں کر جدا ہو ‖ اُتر عرش پر سے خدا کیوں کر آئے

گلہ ہے نصیبوں کا شہباز ناحق
ترے آشیاں میں ہما کیوں کر آئے

شہباز

وہم

ہارون کو میں بچپنے سے جانتا ہوں ۔ ہم دونوں ایک ہی محلے میں رہتے تھے ۔ اور ایک ہی اسکول میں ایک ہی جماعت میں پڑھتے تھے ۔ ہارون کی طرف جو چیز مجھے کھینچتی تھی وہ اس کی طبعی ذہانت اور ذکاوت تھی ۔ مشکل سے مشکل سوال اس کے لیے بچوں کا کھیل تھا ۔ کثرت مطالعہ نے اُس کے معلومات میں اس قدر اضافہ کر دیا تھا کہ اسکول کے استاد تک اُس کی ایک قسم کی تعظیم کرتے تھے ۔ جماعت میں وہ ہمیشہ اول رہا کرتا لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اُس کے مقابلے کا کوئی لڑکا جماعت بھر میں تھا ہی نہیں ۔

ان تمام اوصاف کے باوجود بھی ہارون کا حلقہ احباب بہت ہی محدود تھا ۔ ہارون کی دوستی کے بہت سے لڑکے خواہاں تھے لیکن اس کا مزاج کچھ ایسا واقع ہوا تھا کہ دوست اور دوستی کے نام سے وہ چڑتا تھا ۔ تنہائی کا وہ دلدادہ تھا ۔ دو ایک لڑکوں نے یہ کوشش بھی کی کہ اُس دیوار کو جو ہارون سے اُنہیں بہت دور رکھتی تھی ——— ڈھا دیں لیکن ناکام رہے ۔ ہارون بہت خندہ مزاجی سے ملتا لیکن آخر اس کی علمی قابلیت اس کی فطری اور طبعی وقار (جو اُسے مزاح اور چھل سے باز رکھتا تھا) نے ان لڑکوں کی گرم جوشی کو تھوڑے دنوں میں سرد کر دیا ۔ میں ہارون کا واحد دوست تھا اگر اس کا میری موجودگی کا برداشت کرنا دوستی کہا جا سکتا ہے ۔ جب کبھی میں اس کے یہاں جاتا اور وہ کتاب پڑھتا ہوتا تو وہ ایک مسکراہٹ کے ساتھ کتاب بند کر دیتا اور مجھ سے مخاطب ہوتا

روز کے ملنے جلنے سے مجھے یہ پتہ لگ گیا تھا کہ ہارون کو کوئی خیال اندر سے گھلا رہا ہے یوں اُس کے بُشرے سے اُس کے دل کے حالات کا اندازہ لگانا بو الہوس کے اصلی راز کو سمجھنے سے کم نہ تھا ۔ کیونکہ وہ اپنے پر پوری طرح قادر تھا ۔ رنج اور خوشی کا اظہار وہ عام لوگوں کی طرح آنسو بہا کر یا تالیاں بجا کر نہیں کرتا ۔ اگر اس کے دل کا حال کوئی چیز بتاتی تھی وہ اس کی غیر معمولی آنکھیں تھیں جو بحالت خوشی عجیب قسم سے چمکنے لگتیں اور غم کے موقع پر بالکل مرجھا جاتیں ۔ شاید مرجھانے کا لفظ آنکھ کے لیے موزوں نہیں ۔ لیکن رنج کی حالت میں اُس کی آنکھوں کو دیکھ کر ذہن کی وہی کیفیت ہوتی تھی ، جو ایک مرجھائے ہوئے گلاب کو دیکھ کر ہوتی ہے ۔ میں ہارون سے کئی ایک مرتبہ پوچھا بھی کہ آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے ۔ اس قدر اداس کیوں رہتے ہو ۔ لیکن ہارون جواب دینے کے بجائے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ خاموش ہو جاتا ۔

اب ہم کالج آ گئے تھے ۔ ہارون کو کالج کی زندگی کی دلچسپیاں اپنی طرف بالکل مائل نہ کر سکیں ۔ ہارون پڑھنے لکھنے میں اور زیادہ منہمک ہو گیا ۔ لیکن میں دیکھتا تھا کہ ہارون اب بہت بدل گیا ہے ۔ جو خیال کہ اُسے ہر وقت ستاتا رہتا تھا اب اُس نے ہارون پر پوری طرح قبضہ کر لیا ہے ۔ پہلے صرف اس کی آنکھوں سے پتہ چل سکتا تھا اور وہ بھی بہت غور کرنے کے بعد کہ ہارون کو کوئی غم اندر سے گھلا رہا ہے ۔ لیکن اب ہارون اُس خیال یا خبط یا غم (جو کچھ بھی ہو) کا غلام ہو چکا تھا ۔ ہر وقت متوحش نظر آتا تھا ۔ اس کا ذہین روشن چہرہ کسی اندرونی خوف کے زیر اثر بہت کچھ بگڑ چکا تھا ۔ اور وہ جوانی ہی میں بوڑھا نظر آتا تھا ۔ اس کی کشادہ پیشانی اب زیادہ غور و فکر کرنے کے سبب پرشکن نظر آتی تھی ۔ آنکھیں اندر کی طرف دھنس گئی تھیں ۔ اور آنکھوں کے چاروں طرف ایسا حلقہ ہو گیا تھا جو اس حلقے سے مشابہ تھا جو عید سے دیکھنے کے بعد چاند کے چاروں طرف نظر آتا ہے ۔ ہارون مجھے دیکھ کر اب بھی مسکرا دیتا تو اس مسکراہٹ اور اس کے بچپنے کی مسکراہٹ میں کتنا فرق تھا

میں ہارون کی بدلی ہوئی حالت کو افسوس سے دیکھتا اور کڑھتا لیکن کچھ کر نہیں سکتا۔ میں جانتا تھا کہ ہارون سے کچھ دریافت کرنا بے سود ثابت ہوگا۔ میں اُس وقت کا منتظر تھا جب ہارون مجھے خود اپنی حالت بتادیگا۔ میرا اندازہ صحیح نکلا ایک روز میں باہر سے واپس آیا تو ہارون کو اپنا منتظر پایا۔ آج ہارون معمول سے زیادہ پریشان معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آنکھیں اگر یہ ممکن تھا تو پہلے سے زیادہ اندر دھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن اس کی آنکھوں میں آج ایک غیر معمولی اور کچھ حد تک غیر فطرتی چمک تھی۔ ایک ایسی چمک جو کسی شخص کی آنکھوں میں آجاتی ہے جب وہ کوئی مستحکم ارادہ کرتا ہے۔

ہارون مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ کا آپ صحیح اندازہ صرف اس وقت لگا سکتے ہیں جب آپ کسی مردے کی کھوپڑی کو مسکراتے ہوئے دیکھ لیں۔

"ہارون!" میں نے ہارون سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "کیا بات ہے؟ تم اس قدر پریشان کیوں نظر آتے ہو؟" ہارون اٹھ کر جلد جلد ٹہلنے لگا اور پھر یکایک مڑ کر کہا "سنو عمر میں جانتا ہوں کہ تم سے میری بدلی ہوئی حالت پوشیدہ نہیں۔ تم مجھے بچپنے سے دیکھ رہے ہو۔ میری حالت میں جو غیر معمولی تبدیلی واقع ہوئی ہے اس کو تم اچھی طرح جانتے ہو۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ مجھے کونسا رنج کھائے جا رہا ہے کونسا غم گھلائے جا رہا ہے۔ عمر میں تمہیں بتادونگا۔ ہاں آج۔ ابھی بتادونگا۔ میری خودداری مجھے اجازت نہیں دیتی تھی کہ اپنی مصیبت کا حال کسی دوسرے سے بیان کروں۔ مجھے ڈر تھا کہ لوگ میرا مذاق اڑائیں گے۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ اگر میں نے کسی کو اپنا ہمدرد نہیں بنایا تو بہت جلد میں اپنے حواس کھو بیٹھونگا۔ میں پاگل ہوجاؤنگا۔ تم دنیا میں ایک شخص ہو جسے میں دوست کہہ سکتا ہوں اور جو میری ہمدردی کر سکتا ہے۔ مجھے اس کا احتمال نہیں کہ تم میرا مذاق اڑاؤ گے۔ کیونکہ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔" اتنا کہہ کر ہارون خاموش ہوگیا اور پاس کے کوچ پر بیٹھ گیا اور مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر تک کامل سکوت رہا۔ ہارون کے چہرے کا رنگ جلد جلد بدل رہا تھا۔ آخر ایک لمبا سانس لیکر اس نے کہنا شروع کیا "عمر تم عمومیت کے حامی ہو اور غالباً خاندان کی شرافت یا بزرگی کی تمہارے پاس کوئی وقعت نہیں۔ لیکن اگر تم نے "یوجنکس" (Eugenics) کا مطالعہ کیا ہے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ ذہین ماں باپ کے لڑکے ذہین ہوتے ہیں اور ایک مجرم کی اولاد اگر مجرم نہ بھی ہوئی تو مجرمانہ رجحانات سے خالی نہیں ہوتی۔ ہم اپنے والدین سے صرف ان کی جائداد ورثے میں نہیں پاتے بلکہ ان کی خصلتیں اچھی اور بری اور ان کے امراض میرے خاندان میں کوڑھ کا مرض نسلاً چلا آرہا ہے۔ میرے والد کے دادا کو کوڑھ تھا۔ لیکن میرے دادا اور ابا بچ رہے اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ مرض ہمارے خاندان سے جاتا رہا۔ مجھے ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ مرض اب مجھ پر حملہ کرے گا۔ مجھ سے یہ بات چھپانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی تھی۔ یہاں تک کہ کوڑھ کا نام ہمارے گھر میں لینا ممنوع تھا۔ میں ایک روز ——— اس وقت میں جماعت نہم میں تھا ——— گھر کی پرانی کتابوں کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے ایک پرانی ڈائری ملی جو کہ میرے دادا کی تھی۔ میرے دادا بہت بڑے ڈاکٹر تھے۔ اور انھوں نے کوڑھ کے مرض کا خاص مطالعہ کیا تھا۔ مجھے سب حال اسی ڈائری سے معلوم ہوا اور یہ بھی ——— یہ خوفناک یہ روح فرسا حقیقت ——— کہ کوڑھ کا مرض نسبی ہے۔ جس دن سے میں نے اس خوفناک حقیقت کو معلوم کیا۔ خوشی اور مسرت کیا چیز ہے میں جانتا نہیں۔ ہر وقت یہی خیال ستاتا رہتا ہے۔ ہر وقت یہی خبط رہتا ہے۔ تمہیں شاید یاد ہے کہ نویں جماعت میں ششماہی امتحان دے نہ سکا تھا۔ کچھ دنوں تک پڑھنا لکھنا بالکل ترک ہوگیا تھا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ کثرت مطالعہ ہی ایک ایسی چیز ہے جو

میرے دل کو اس خیال سے دور رکھ سکتی ہے۔ میں اب دن بھر کتابیں پڑھتا رہتا اور جہاں تک ہو سکتا اس خیال کو اپنے سے دور رکھتا۔ لیکن میری راتیں اُف اس قدر خوفناک گذرتی ہیں کہ ایک شخص کو تھوڑے دنوں میں بالکل پاگل بنا دینے کے لیے کافی ہیں۔ سونے کے خیال سے میری روح کانپ اٹھتی ہے۔ چھ سات سال سے برابر حالت خواب میں میں نے ایسی ذہنی اذیتیں اٹھائی ہیں جن کے مقابلے میں جہنم کے عذاب شاید راحت ہوں۔ کوئی رات ایسی نہیں گذری جس میں میں نے اپنے آپ کو کوڑھیوں میں کبھی گھرا نہ پایا تا۔ کبھی میں دیکھتا کہ ایک کوڑھی اپنے کوڑھ بھرے ہاتھوں سے مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے کبھی میں دیکھتا کہ میں خود کوڑھی ہو گیا ہوں۔ میرے جسم میں کوڑھ کے خوفناک داغ ہو گئے ہیں جسم میں زخم ہو گئے ہیں جن سے پیپ اور خون جاری ہے۔ میرے ہاتھ اور پاؤں کے گوشت گل گل کے گر رہے ہیں" اتنا کہہ کر ہارون خاموش ہو گیا۔ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا اور پیشانی سے پسینے کے بڑے بڑے ٹھنڈے قطرے گر رہے تھے۔ ہارون یکایک اٹھا اور باہر چلا گیا۔ میں وہیں بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔ ہارون کی حالت واقعی قابل رحم تھی۔ اس کے ذہنی عذاب ایک شخص کو پاگل بنا دینے کے لیے کافی تھے۔ مجھے تعجب تھا کہ ہارون اب تک پاگل کیوں نہیں ہو گیا۔

اب ہمارے کالج کی زندگی ختم ہو گئی تھی۔ ہارون کو ایک اچھی نوکری مل گئی تھی۔ اور میں تجارت میں لگ گیا تھا۔ ہم اب بھی فرصت کے موقع پر برابر ملتے۔ میں نے اسے شادی کی صلاح دی کہ شاید اس طرح اس کی پریشانی دور ہو جائے اور ازدواجی زندگی کی مسرتوں اور ذمہ داریوں میں وہ اپنے اس خبط سے نجات پائے۔

چھ مہینے کے بعد ہارون نے شادی کر لی۔ میں اس وقت بمبئی میں تھا۔ میں نے ہارون کی شادی کی خبر اخبار میں دیکھی تھی معلوم نہیں ہارون نے مجھے اس کی اطلاع کیوں نہیں بھیجی۔ شاید وہ میرے پتے سے ناواقف تھا۔ دو تین دن کے بعد اخبار میں ہارون کا نام پھر دیکھ کر میں چونک اٹھا، میں نے جلد جلد پڑھنا شروع کیا "کلکتہ مسٹر ہارون جن کی شادی کی خبر دو دن ہوئے چھپی تھی پاگل ہو گئے ہیں لوگوں نے انہیں اپنے گھر سے بے تحاشہ بھاگتے ہوئے دیکھا۔ مسٹر ہارون "اُف کوڑھ نکلی، کوڑھ نکلی" کہتے ہوئے بھاگ رہے تھے لوگوں نے اُن کا تعاقب کیا اور بڑی مشکلوں سے انہیں پکڑا۔ مسٹر ہارون اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھے ہیں، اور "کوڑھ نکلی، کوڑھ نکلی" کی رٹ لگائے رہتے ہیں"

اس خبر کو پڑھ کر مجھے وحشت اور افسوس ہوا۔ اس کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں۔ میں فوراً کلکتہ واپس آیا۔ ہارون کے یہاں گیا۔ ہارون کو میں نے ایک کمرے میں بند پایا۔ ہارون مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ اُف کس قدر خوفناک تھی، اُس کی یہ مسکراہٹ کس قدر وحشت زدہ میں کبھی نہ بھولونگا، ہارون بکا جا رہا تھا، کوڑھ نکلی، کوڑھ نکلی"۔

ہارون کو پاگل ہوئے چھ سال گذر گئے۔ میں ان دنوں تجارت کے سلسلے میں باہر رہا۔ جب واپس آیا تو ہارون کے عزیز و اقارب سے معلوم ہوا کہ ہارون تین سال پاگل رہنے کے بعد کوڑھ کے مرض میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اُسے کوڑھیوں کے ہسپتال میں بھیج دیا گیا اور وہیں اُس نے دم توڑا۔

مزید تفتیش پر معلوم ہوا کہ ہارون کی بیوی کو شادی کے وقت معمولی قسم کی کھجلی تھی!

علی حسن بی اے (آنرز)

مغربی اور مشرقی تہذیب

شمیم بہن میری سہیلی ہے، اور وہ مغربی تہذیب کی دلدادہ، اکثر وہ اس کی خوبیوں کو مجھ سے بیان کیا کرتیں، ایک دن ان کے حاشیوں پر مجھ سے یوں بحث کرنے لگیں کہ آپ لوگوں کو خبر بھی ہے کہ موجودہ دور کا ہر آئین و قانون نہایت ہی سلجھا ہوا اور گوناگوں دشواریوں سے خالی ہے علاوہ ازیں انگریزی تہذیب و تمدن کا دستور العمل نظام زندگی کی خوشگوار منزل ہے۔ وہ ہر کام وقت سے کرتے ہیں، انکے یہاں شادی بیاہوں میں ہم ہندیوں کے جیسے بیہودہ اور مہمل رسومات نہیں ہوتے، وہ اپنی بیویوں کو قید و پردہ میں رکھ کر امراض گوناگوں کا شکار نہیں ہونے دیتے ان کی لڑکیاں تعلیم سے بے بہرہ نہیں ہوتیں۔ وہ غربت کی زندگی پر نفرت سے نظر کرتے ہیں ان کے یہاں سوسائٹی ہے، وہ سوسائٹی کے بنائے ہوئے قاعدہ کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

وہ ہمارے ملک والوں کی طرح پرانے فرسودہ رسموں پر عمل کرنا معیار زندگی نہیں سمجھتے ہیں۔ ان کے یہاں شارع عام پر بے پردہ ہو کر سیر و تفریح کرنا برا نہیں خیال کیا جاتا وہ غیر لوگوں کے ساتھ اپنی لڑکیوں کو سوسائٹی کے ماتحت بٹھانا عیب نہیں خیال کرتے وہ زمانہ کے رفتار کے ساتھ ساتھ زندگی کی رفتار کو بدلنا نظام زندگی کا جزو لاینفک خیال کرتے ہیں۔ وہ قدرت کے پرانے اور فرسودہ نظام کے ماتحت عمل کرنا دستور زندگی میں لاحاصل شئے تصور کرتے ہیں۔

یہی اسباب ہیں جو انگریزی تہذیب و تمدن کو بام عروج تک پہنچائے ہوئے ہیں ابھی سلسلہ بحث یہیں تک پہنچا تھا کہ نسیم باجی سے نہ رہا گیا وہ بول اٹھیں کہ بہن آپ کے خیالوں سے پورا پورا اختلاف ہے۔ کیوں ذکیہ تمہارا کیا خیال ہے؟ میں بے ساختہ بول اٹھی باجی میں آپ کے خیال سے موافقت نہیں کروں گی۔ اس کے بعد میں نے مشرقی تہذیب پر روشنی ڈالتے ہوئے مغربی تہذیب سے موازنہ کیا اور کہا کہ آپ کو معلوم نہیں کہ ہمارے لیے سب سے بڑا مصلح قرآن پاک ہے۔ دنیا کی کونسی ضرورت اور دشواری ہے جو قرآن شریف کے قانون کی رو سے آسان نہیں ہوتی۔ کیا قرآن مجید نے ہمیں اور تمہیں زندگی کی روشن راہ نہیں دکھلائی ہیں کیا قرآن پاک ہم لوگوں کو غلط اور صحیح راستوں میں تمیز کرنے کی تعلیم نہیں دیتا۔ کیا قرآن پاک آئین زندگی کا شفاف آئینہ نہیں ہے۔ کیا یہ غلط ہے کہ ہم سے اگلی قوموں نے قرآن پاک پر کما حقہ عمل کر کے اپنی عاقبت نہیں روشن کی۔ کیا قرآن پاک میں ہمارے گوناگوں کامیابی کے ذرائع نہیں۔ ضرور ہیں مگر ہماری کور چشمی نے اس قدر بے اتفاقی سے کام لیا اور لے رہی ہے کہ ہم اس کے راز کو نہیں سمجھ سکتے۔ البتہ میں مانتی ہوں کہ اگلے بزرگوں نے جہالت کی بنا پر فرسودہ رسموں کو دستور زندگی بنا کر ضروریات زندگی میں کچھ بیہودہ رسم و رواج پیدا کر دیئے ہیں۔ جو ان دنوں رکن مذہب کیا جانے لگا مگر اس قدر نہیں جس قدر آپ کہنا چاہتی ہیں۔

جب آپ غور کریں گی تو آپ پر روز روشن کی طرح واضح ہو جائیگا کہ قرآن پاک کا دستور عمل بھی نظام زندگی کی خوشگوار منزل ہے وہ بھی آزادی اور پردہ دونوں کی تعلیم دیتا ہے، مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم نیم عریاں ہو کر سر بازار گردش کریں۔ آپ جانتی ہیں کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شیطان کے بہکانے پر انسان اپنے نفس سے مغلوب ہو جائے اس لیے قرآن پاک میں ازدواج

سے باہر نکلنے کے ساتھ ساتھ پردہ کی بھی تلقین کرتا ہے۔ چنانچہ اس کی ہزاروں مثالیں سرزمین عرب اور ہندوستان میں مل سکتی ہیں مگر چونکہ اندنوں ہرطرف فحش وعیوب کے بازار گرم ہیں اس لیے حفاظت خود اختیاری اور عزت نفس باقی رکھنے کے لیے طبقہ نسواں کو حدیث قدسی کے مطابق پردہ میں رکھنا ضروری ہے

شاید یہ آپ جانتی ہونگی کہ قرآن پاک ہمیں انسان کامل بننے کی تعلیم دیتا ہے تاکہ ایک دوسرے کے درددل کو باسانی سمجھ سکے کسی نے سچ کہا ہے ؎

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیان

قرآن پاک ہمیں یہ بھی تعلیم دیتا ہے کہ حقیقت انسانی کو سمجھ کر خدا کی خدائی کے رازدار بن جاؤ اور اپنی ہستی سے خدائی نظام کی بقا کو لوگوں کے دلوں میں بٹھا دو۔

قرآن پاک ہمیں اس کی تعلیم نہیں دیتا کہ ہمارے سامنے انسانوں کا ازدحام لگا رہے جو ہفتوں کے بھوکے پیاسے ہیں اور حالت یہ ہے کہ شدت بھوک سے ان کی آوازیں دبی جا رہی ہوں۔

مسلسل فاقوں کی وجہ سے ماؤں کے چھاتیوں کے دودھ خشک ہوگئے ہیں اور ان کے شیر خوار بچے شدت فاقہ سے جان بلب ہوکر حسرت بھری نگاہوں سے ماؤں کی طرف دیکھتے دیکھتے دم توڑ رہے ہوں۔ یتیم لاوارث بچے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر کسی غیبی امداد کے سہارے آسمان کی طرف ٹکٹکی لگائے بیٹھے ہوں مگر ان پر نظر عنایت کرنے والا کوئی نہیں کیا اسی کا نام سوسائٹی ہے۔ ایسی سوسائٹی میں آگ کیوں نہیں لگ جاتی کہ بھوکے پیاسے انسانوں کے سامنے ان کو ترسا ترسا کر کتوں کو دودھ پاؤ روٹیاں دی جائیں اور آرام گدوں پر سلایا جائے مگر انسان جس کتے سے بدرجہا کمتر ہے جو حیوان مطلق ہے۔ کیا اسی کا نام نظام زندگی ہے ... ہرگز نہیں اگر انسانیت کے یہی معنی ہیں تو میں بالاعلان کہوں گی کہ انسانی زندگی کے انجام کو منظم کرنے والے حضرت نااہل ہیں۔ اگر آپ کے دلدادہ اور اصلاح کن سوسائٹی کا یہی مفہوم ہے کہ ایک اشرف المخلوقات، کتے سے بھی زیادہ ذلیل ہے

انھوں نے اعتراف کرلیا کہ میں غلطی پر تھی۔ ... خدا کا شکر ہے کہ اب شمیم بہن ہماری ہم خیال ہیں۔

ذکیہ نسیم

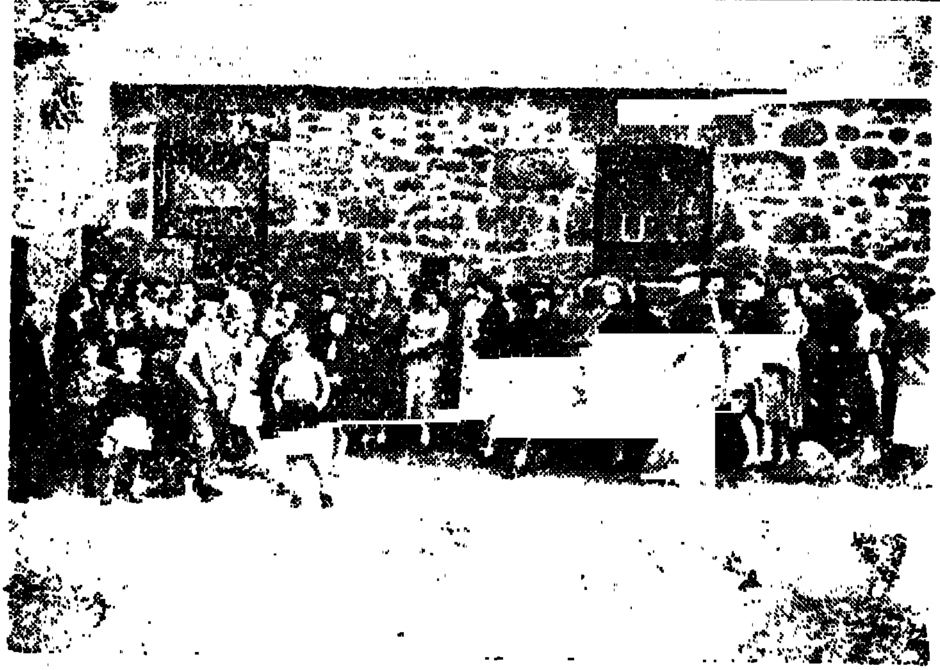
فلستان

انگلستان کے صوبہ جاتی تھیٹر

لڑائی کی وجہ سے انگلستان کے تھیٹر کو بہت سی نئی دقتوں کا سامنا ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے تھیٹر کو ایک ایسا وسیع تر اور زیادہ پرجوش حلقہ شائقین کو مل گیا ہے کہ جو اسے برسوں سے نصیب نہیں تھا۔

لڑائی سے پہلے انگلستان کے زیادہ تر تھیٹر لندن ہی میں جمع تھے۔ صوبہ جاتی مرکز بہت کم تھے۔ مثلاً برمنگھم اور لورپول وغیرہ۔ لیکن لندن کے باہر کے تھیٹر کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے

اس کی بہت سی وجوہ تھیں۔ مثلاً تھیٹروں کے منیجر کہا کرتے تھے کہ صوبوں میں پانچ چھ ہفتوں تک کامیاب دورہ کرنے کے لیے تھیٹر میں کم سے کم دو بڑے "ستارے" ہونے چاہئیں۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ سینما کا مقابلہ کرنا ہے تو سینما کی طرح تھیٹر میں بھی ستارے ہونا چاہئیں۔ لیکن بڑے بڑے اداکار کم تھے۔ اس لیے لندن کے باہر کی پبلک تھیٹر کو ترستی رہتی تھی۔ اس کے علاوہ خود اداکار



انگلستان میں صوبائی تھیٹر ...... دیہاتیوں کا شوق

لندن اور برمنگھم جیسے بڑے شہروں میں تھیٹروں کی اتنی قدر نہیں ہے جتنی کہ دیہات میں۔ اوپر کی تصویر میں کارنوال کے ایک دیہات کے عوام کا ہجوم تھیٹر میں داخلے کا منتظر ہے

بھی "دیہاتوں" میں جانا پسند نہیں کرتے تھے (اور لندن کے باہر کی جگہ کو وہ "دیہات" ہی سمجھتے تھے) انہیں ڈر تھا کہ اگر وہ باہر جاتے رہے تو لندن کی پبلک ان کو بھول جائیگی۔ چنانچہ صوبوں میں لوگ صرف "بڑے دن" کے ناٹکوں اور سینما سے ہی دل بہلا لیا کرتے تھے

لیکن لڑائی چھڑنے سے کچھ اچانک اور کچھ ناگزیر طور پر ہر تھیٹر کی چیز میں لوگوں کو پھر سے زیادہ دلچسپی ہونے لگی ہے

تھیٹر کی ہر شاخ نے خواہ وہ سرکاری طور پر شروع ہوئی ہو یا نجی طور پر قوم کی اس صدا پر لبیک کہی اور سیکڑوں دقتوں، اداکاروں کی کمی اسٹیج کے پردوں کی کمی بلکہ ڈراموں تک کی کمی کی مشکلات پر قابو پانے کی کوشش کی

لندن سے تھیٹر کے بہت سے شائقین باہر چلے گئے اور بہت سے ہوائی حملوں سے ختم ہوگئے چنانچہ اب اس سلسلہ میں لندن کے بجائے باہر کے صوبوں کو زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی۔ بہت سے چھوٹے قصبوں میں جہاں لڑائی سے پہلے زیادہ سے زیادہ ایک سینما تھا اور تھیٹر کا نام ونشان بھی نہ تھا وہاں دو ایک ہفتہ ہی میں گرد آلود کمرے اور بیکار عمارتیں بالکل بدل گئیں اور سینما کی پرچھائیوں کے بجائے جیتی جاگتی ہستیاں اسٹیج پر نظر آنے لگیں۔

شہروں سے بھاگتے ہوئے لوگوں نے خاص طور پر صوبوں میں تھیٹر کی مانگ بڑھائی خواہ پہلے وہ گھر کے سامنے کے تھیٹر میں بھی زیادہ نہ جاتے ہوں لیکن اب انہیں تھیٹر سے بڑی دلچسپی ہوگئی پہلے وہ لوگ آرام دہ سینما کو اس لیے زیادہ پسند کرتے تھے کہ جب چاہا داخل ہوگئے۔ اس میں تھیٹر کی طرح یہ پابندی نہ تھی کہ شروع وقت میں ہی جاکر بیٹھیں۔ مگر اب ان شہریوں نے صوبہ والوں میں بھی تھیٹر کا شوق پیدا کردیا۔ جگہ قصبوں اور دیہاتوں کے بڑے بڑے کمروں میں بہترین اداکار اچھے سے اچھے ڈرامے پیش کرنے لگے سفری کمپنیاں ہر رات کو ایک نئی جگہ پر وقتی اسٹیج بنا کر اپنے پروگرام پیش کرنے لگیں۔ اور "صوبے" جنہیں لڑائی سے پہلے یہ دلچسپیاں نصیب نہ تھیں اب تھیٹر کے بہت شائق ہوگئے۔

انگلستان میں تھیٹر کی اس مقبولیت کی وجہ صرف دلچسپی اور ہنسی کھیل ہی نہیں ہے۔ ہوائی حملہ کے … میں تاریک سڑکوں سے گذر کر تھیٹر جانا کوئی آسان کام نہیں ہے بلکہ لڑائی نے لوگوں کو احساس دلادیا ہے کہ وہ کس کس چیز کی قدر وقیمت کرتے ہیں۔ سب نے سمجھ لیا ہے کہ تمام سنجیدہ اور مزاحیہ باتوں کیلیے تھیٹر ایک بڑا اچھا ذریعہ ہے۔ تھیٹر کو نئی کامیابیاں نصیب ہو رہی ہیں۔ اور امن کے زمانہ میں تھیٹر کی اس نئی اہمیت کو پبلک نظرانداز نہیں کرسکتی۔ اس وقت بھی وہ دلچسپی کا باعث بنا رہے گا جیسا کہ آج ہے (بی بی سی)



انگلستان میں صوبائی تھیٹر ایکٹروں کی آمد۔ لندن اور برمنگھم سے باہر اگرچہ تھیٹروں کی تعداد بہت کم ہے۔ لیکن ان کا کاروبار بہت اچھا ہے۔ اوپر کی تصویر میں کاروان کا ایک گرجا گھر دکھایا گیا ہے جس کے بڑے کمرے میں قیام کیلئے ایکٹروں کی ایک جماعت پہنچی ہے۔

REGD.No C2535

JADIDURDU

36, MARSDEN ST. CALCUTTA

قواعد و ضوابط

(۱) رسالہ ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوا کرے گا۔ خریداروں کو چاہئے کہ رسالہ ۱۵ تاریخ تک نہ ملنے پر دفتر سے طلب کریں

(۲) اہل قلم حضرات سے درخواست ہے کہ وہ مضامین مہینے کی ۱۵ تاریخ تک ایڈیٹر کے نام بھیجدیں

(۳) مضامین صاف اور شستہ تحریر ہوں

(۴) وہی مضمون پرچہ میں شائع ہو سکتا ہے جو معیار ادب و اخلاق سے گرا نہ ہو۔

(۵) دل آزار و فرقہ دارانہ مضامین شائع کرنا پرچہ کی پالیسی کیخلاف ہے۔

(۶) نمونہ کا پرچہ مفت نہیں بلکہ ۳ کا ٹکٹ آنے پر بھیجا جائے گا۔

(۷) جواب کیلئے جوابی کارڈ یا اسٹامپ کا آنا ضروری ہے

(۸) خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:۔ مینجر جدید اردو ۳۶ مارسڈن اسٹریٹ۔ کلکتہ

(۹) کاروباری حضرات اشتہار کیلئے مینجر سے خط و کتابت کریں۔

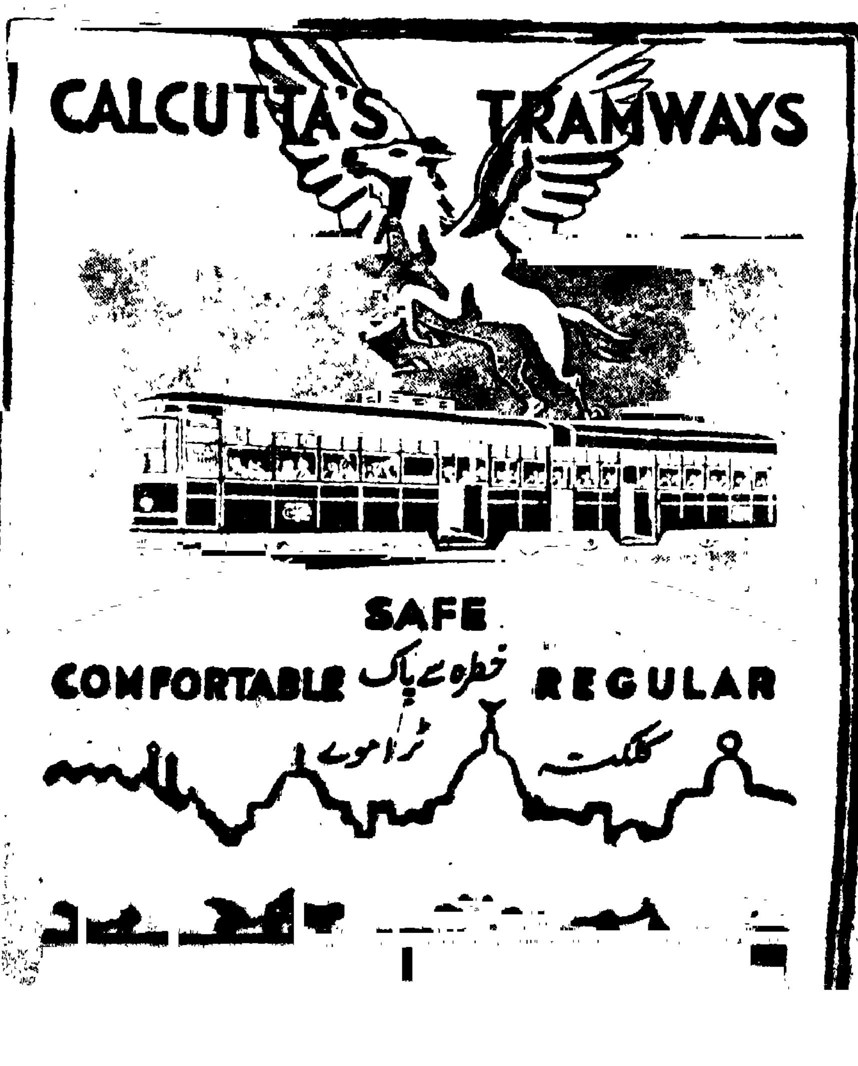
(۱۰) سالانہ چندہ صرف دو روپیہ (عہ) غیر ممالک کیلئے ۵ شلنگ

ا ے جلیل مینجر جدید اردو نمبر ۳۶۔ مارسڈن اسٹریٹ کلکتہ

مشرقی ہند ... نامہ

اردو جدید

سالانہ چندہ
دو روپے
فی پرچہ تین آنے



CALCUTTA'S TRAMWAYS
SAFE
COMFORTABLE
خطرہ سے پاک
REGULAR
ٹرامویز
کلکتہ

مدیر مسئول
پرویز شاہدی
مدیر اعزازی
ایم ظہور احسن قاضی

جدید اردو کلکتہ

ستمبر ۱۹۴۳ء

چندہ سالانہ دو روپیہ
ششماہی - ایک روپیہ چار آنہ
فی پرچہ ۳ ر

جلد ۶ | فہرست مضامین | نمبر ۱۰

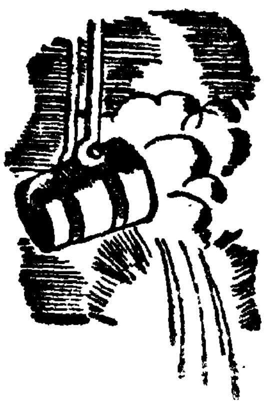
پرنٹر و پبلشر عبد الجلیل نے مطبع "سنہ پریس" میں چھپوا کر دفتر جدید اردو ۳۶ مارسڈن اسٹریٹ سے شائع کیا

لوہے کے نوجوان



"نوجوانی کے لغت میں جو کہ قسمت نے محفوظ رکھا ہے
شاندار مردانگی کے لیے ناکامیابی کا لفظ نہیں"

(مکاڈلے)



نوجوانی عالی ہمتی اور موقع لوہے کے نوجوانوں
کے لیے انعام لائے گی، وہ نوجوان واقعی خوش نصیب
ہے جو اپنی زندگی کی ابتدا میں ہندوستان کی صنعتی
ترقی میں اپنا مستقبل محفوظ کر لیتا ہے۔

TATA STEEL

ٹاٹا اسٹیل

دی ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی لمیٹڈ۔ ہیڈ سیل آفس نمبر ۱۰۲-اے، کلایو اسٹریٹ کلکتہ نے شائع کیا

شذرات

عید مبارک۔ لیجیے پھر عید آگئی۔ مسلمانوں کو یہ روز سعید مبارک ہو۔ مگر یہ تو ہیں رسمی الفاظ۔ ان میں سچی خوشی کے معنی کہاں؟ صدیاں گزریں کہ مسلمانوں کے نزول کے ساتھ ساتھ عید نے بھی ہندستان کو جلوہ گاہ بنایا۔ عرصہ تک عید اپنی تمام نشاط سامانیوں اور انبساط آفرینیوں کے ساتھ آتی اور آتی رہی۔ لوگوں کا ذوقِ نشاط اس کے معصوم جلووں پر جان دیتا اور یہ خود اس پر مٹی جاتی۔ لیکن وقت کی ایک نامساعد حرکت اور زمانے کی ناہمواریوں بلکہ ایک کروٹ نے ان دونوں کی محبت ہی کا خاتمہ کردیا۔ مسلمانوں کی سیاسی تیرہ بختی نے حقیقی عید کے چاند کو آسمان ہند سے باہر نکال دیا۔ جب قومی اعصاب مفلوج ہو چکے، دلوں میں دہکتی ہوئی خوشی کی آگ جبر کے ساتھ بجھا دی گئی، ملّی نظام میں پراگندگی آگئی تو پھر وہ آنکھیں بھی جو عید کے چاند کو پہچان لیا کرتی تھیں، اپنی روشنی کھو بیٹھیں۔ عید فدائی تھی سچی خوشی کی، خلوص نشاط ہی اس کی محبت کا مرکز تھا۔ جب یہی چیزیں باقی نہ رہیں، صدیوں کی غلامی نے جب قومی لطافتِ احساس ہی کو کچل ڈالا تو پھر عید کے خدوخال کو کون پہچانے؟ مسلمانوں کے زوال کو بھی ایک عرصہ گزر چکا اس مدت میں بھی عید آیا کی اور اب تک ہر سال اپنے وقت پر آرہی ہے لیکن یہ وہ عید نہیں جو پہلے آیا کرتی تھی۔ اس کے خدوخال سے تو بالکل اجنبیت ٹپکتی ہے۔ نہ وہ پہلا سا انداز دلربائی ہے نہ وہ اگلی سی شان آشنائی۔ مسلمانوں کا خلوص نشاط زندہ نہیں جو اپنی محبوبۂ دیرینہ کو ایک نظر میں پہچان لے۔ ہم لوگ تو محض تاریخ اور رویاتِ نگاہوں کی شہادت پر اعتماد کرکے اس غریب الدیار کو عید کے نام سے پکار لیتے ہیں لیکن اس پر بھی دل گواہی نہیں دیتا اور گواہی دے بھی تو کیسے ہر سال تو اس کا حسن کم ہی ہوتا جارہا ہے۔ چہرے پر بھیانک جھریاں بھی نمودار ہوگئی ہیں، قومی افلاس کی سیاہی اس کے گالوں میں کھپی جارہی ہے۔ سیاسی حالات کے آئینہ میں صرف اس کا بدصورت بڑھاپا ہی نظر آرہا ہے۔ عید کو حسن و شباب کا پیکر ہونا چاہیے تھا نہ کہ پیری اور زشت روی کا۔ عید سال کے کسی خاص دن یا تاریخ کا نام نہیں بلکہ نام ہے اس روز کا جب دن مسلمان بے ریا مسرت اور سچی خوشی کے ساتھ، ہر چند ایک ہی روز کے لیے کیوں نہ ہو، زندگی کو صرف جمالیتی خوشدلی اور باہمی شگفتگی کا پیکر تصور کریں۔ عید نام ہے اس لمحۂ مبارک کا جس وقت انسان کو قدرت کی نشاط آفرینیوں کا احساس مکمل طور پر ہونے لگے اور ایک دل دوسرے دل میں خلوص کے ساتھ جذب ہوجانے کے لیے بیتابی کا پیکر بن جائے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس وقت چھوٹے بڑے معاشرتی مساوات کا آئینہ دکھانے لگیں۔ ماہ شوال کی پہلی صبح کیا آجکل اس معیار پر پوری اتر سکتی ہے؟ اگر پوری نہیں اتر سکتی تو پھر اس صبح کو صبح عید کہنے کا بھی کوئی حق نہیں۔ اب یہی سمجھ لینا چاہیے کہ مسلمانوں کی ملّی تقویم میں پہلے مسرت و انبساط کا ایک دن تھا جس کو منجمانِ وقت نے آسمان کی نئی گردش اور ستاروں کی نئی چالوں کی بنا پر اپنے زائچے سے ہمیشہ کے لیے الگ کردیا ہے۔

یہ تو ہوا ہمیشہ کا رونا۔ اس پر بھی مسلمان ہر سال تصنّع ہی سے سہی عید منا لیا کرتے تھے لیکن قربان جائیے ارباب حل وعقد کی خوش نظمی کے، اب اس کا بھی موقع باقی نہ رہا۔ جنگ تو چار برسوں سے آفت آسمانی کی صورت تباہ کر ہی رہی تھی جو کمی باقی تھی وہ صاحبان اختیار کے حسن انتظام نے پوری کردی۔ سارا ہندستان بھوک اور پیاس کی منڈی بنا ہوا ہے۔ بنگال کا حال تو پوچھنا ہی فضول ہے جدھر جائیے ننگے بھوکے سسک سسک کر جان دے رہے ہیں جس طرف نظر اٹھائیے صرف ہڈیوں کے ڈھانچے اپنی آخری سانسوں سے

تمدن و تہذیب پر تنقید کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ موت ہر طرف ناچ رہی ہے۔ بھوکے، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کا ایک سمندر ہے جو ہر طرف لہریں مار رہا ہے۔ زندگیاں چھوٹے چھوٹے حبابوں کی طرح مٹتی چلی جا رہی ہیں۔ آئے دن روزناموں میں بھوک کی تباہ کاریوں کی تفصیل شائع ہو رہی ہے۔ اکثر خوش حال افراد انفرادی حُبِّ انسانی سے کام لے کر بھوکوں کی مدد بھی کر رہے ہیں، صوبائی حکومت بھی اپنی خامیوں کے باوجود ہر ممکن کوشش سے کام لے رہی ہے لیکن یہ سب چیزیں سمندر میں ایک قطرے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ تباہی بڑھ رہی ہے اور اس وقت تک بڑھتی ہی جائیگی جس وقت تک سلطنت برطانیہ اور حکومت امریکہ کم سے کم بنگال کی حربی اہمیت ہی کے خیال سے سہی، اس کی پوری مدد کرنے پر تیار نہ ہو جائیں۔ وزیر ہند مسٹر ایمری کی تقریر سے تو کوئی درخشاں مستقبل مترشح نہیں ہوتا ان حالات میں کیا یہ ممکن ہے کہ عید کا سچی خوشی نہ سہی جھوٹی ہی خوشی سے کام لیا جائے۔ جب بھوک، پیاس اور موت انسانی زندگیوں سے جبری ہم آغوشی پر تُلی ہوئی ہیں تو ایسے میں کس کو فرصت ہے کہ گلے ملے اور عید کی روایت کو قائم رکھنے کی کوشش کرے۔ پھر بھی عید کی تہنیت ان تاجروں کی خدمت میں پیش کی جا سکتی ہے جو ملکی حالات کی خرابی سے اپنی تجارت کو فروغ دے رہے ہیں۔ مبارکباد کے وہ بھی مستحق ہیں جو کاروباری بددیانتی سے بھوکوں پیاسوں کی تعداد بڑھا کر اپنے صندوق بھرنے جا رہے ہیں۔ رہے ادنیٰ اور متوسط طبقے کے لوگ تو ان کے لیے حافظ کا یہ مصرعہ حاضر ہے

ہیہات کہ دردِ تو ز قانونِ شفا رفت

پرویز شاہدی

غزل

دیکھا ہوا سا خواب ہے دنیا کہیں جسے
تعبیرِ فتح باب ہے عقبیٰ کہیں جسے

تجدیدِ ذوقِ بادہ ہے توبہ کہیں جسے
رندانِ پاکباز کا تقویٰ کہیں جسے

سب میں اسی کا جلوہ ہے یکتا کہیں جسے
وہ صدرِ بزمِ ناز ہے تنہا کہیں جسے

آنکھوں میں اس کا نور اسی کے پیام پر
یعنی سنا بتائیں، نہ دیکھا کہیں جسے

جاگے بھی تو شباب حیا ہو گی اور شوخ
حسن تمیزِ عرضِ تمنا کہیں جسے

تو بادۂ شباب ہے دوشیزۂ بہار
تصویرِ کیفِ خلوتِ مینا کہیں جسے

"لیلیٰ" پکار اٹھتے ہیں مجنوں کو دیکھ کر
اتنا تو محو ہو کہ تماشا کہیں جسے

جب مسکراتے چہرے پر ایسی پڑی ہے چھوٹ
روشن سوادِ وادیِ سینا کہیں جسے

ہر بام پر تو حسنِ نظر کو ہیں دعوتیں
جا ہے کلیمِ طورِ تجلی کہیں جسے

جینا وبال ہو گیا کیسا میرے خدا
مرتے ہیں سب اسی پہ مسیحا کہیں جسے

یکتا تجھے نہ جانے وہ کہاں سے لائیں
تجھ سا اگر نہیں ہو تو تجھ سا کہیں جسے

آبادیِ جنونِ تمنا ہے کائنات
ویرانیِ خیال ہے صحرا کہیں جسے

ہر شب وہ انتظارِ قیامت کہ اے حسن
ہر روز وہ کہ حاصلِ فردا کہیں جسے

سید حسن امام

نوائے وحشت

فسانہ حسرت وصل و غم جدائی کا
چراغ کشتہ ہوں میں بزم آشنائی کا

جہاں میں گرم ہے بازار بیوفائی کا
رواج اب ہے مروت کی ناروائی کا

امید وصل ہے اندیشۂ فراق نہیں
فریب خوردہ ہوں اندازِ دلربائی کا

ادائے حقِ محبت کی دے خدا توفیق
مجھے خیال نہیں تیری بیوفائی کا

دل غیور کا اپنے خدا ہی حافظ ہے
ہوا ہے شوق تجھے عالم آشنائی کا

ہوئی جو چشم ہوس کامیاب نظارہ
کرم ہے یہ بھی ترے شوقِ خودنمائی کا

اُس آفتِ دل و جاں کو کوئی خبر کر دے
جنابِ شیخ کو دعویٰ ہے پارسائی کا

ہلاکِ شیوۂ بیگانگی ہوں اور وہ شوخ
نہالِ تازہ ہے گلزارِ آشنائی کا

نہ چھیڑ اے ہوسِ وصل ہاں نہ چھیڑ مجھے
کہ میں ستم زدہ ہوں محنتِ جدائی کا

نظر بھی ڈالی نہیں اور اُڑا لیا دل کو
کہیں جواب ہے اس طرزِ دلربائی کا

جو مجھکو ڈر ہے تو یہ ڈر ہے طیِ منزل میں
شکستہ دل نکرے غم شکستہ پائی کا

تمہاری جنبش ابرو پہ میری جان نثار
مجھے یقین ہے دل کی گرہ کشائی کا

اگرچہ کچھ نہیں ممکن، زہے فریب اُمید
ہنوز حوصلہ ہے قسمت آزمائی کا

ملا ہے خاک میں دل چشم سرمہ آگیں سے
جگر بھی خون شدہ ہے پنجۂ حنائی کا

عزیز ہے مرے دل کو مرے جگر کا داغ
چراغ ہے یہ مری شام بینوائی کا

مجھے بلا سے اسیری کا رنج کیا کم ہے
کہ پھر اسیر ہوں بندِ غمِ رہائی کا

ہوں میں تو اُس خم ابرو کا سایہ پروردہ
مجال ہے جو کروں شکوہ کج ادائی کا

ترانہ ہائے محبت سناؤ نگا وحشت
کبھی خیال اگر آ گیا غزل سرائی کا

رضا علی وحشت

اسلامی تاریخ

۱۹۴۰ء میں سر عزیز الحق نے جو اب وائسرائے کی اکزیکٹیو کونسل کے کامرس ممبر ہیں، کلکتہ یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ کا ایک شعبہ جاری کیا جسے لوگوں نے خوش آمدید کہا، ہندو اور مسلمان طلبا نے اس سے دلچسپی لی اور داخلے بھی لیے۔ وقت کی ایک اہم ضرورت پوری ہوئی اور کلکتہ یونیورسٹی نے جہاں اور معاملات میں راہیں دکھائی ہیں، یہاں بھی راہ نمائی کی۔

ہندوستان کی بعض یونیورسٹیوں، مثلاً علیگڑھ اور ڈھاکہ میں بھی "اسلامی تاریخ" کا شعبہ قائم ہے، لیکن کلکتہ یونیورسٹی کے شعبہ سے مختلف ہے، علیگڑھ اور ڈھاکہ میں ضروری ہے کہ طالب علم عربی زبان سے واقف ہو، یہاں اس قسم کی کوئی لسانی پابندی نہیں ہے اور یہ ایک پہلو سے بہتر ہے۔ اسلامی تاریخ پر انگریزی زبان میں بہت کافی مواد موجود ہے اور روز بروز بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ پھر اس مضمون کو مقبول عام بنانے کے لیے ضروری تھا کہ زبان کی قید ہٹا لی جائے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں اس مضمون سے دلچسپی لینے لگے ہیں اور بنگال میں یہ مضمون رفتہ رفتہ مقبول ہونے کی ساری صلاحیتیں رکھتا ہے۔

کلکتہ یونیورسٹی میں "تاریخ اسلام" کا انعقاد اس لیے بھی بہت اہم ہے کہ پہلے یہاں کوئی ایسا شعبہ نہ تھا۔ حالانکہ اسی یونیورسٹی میں موڈرن ہسٹری اور انشینٹ انڈین ہسٹری کے شعبے موجود ہیں۔ کمی صرف اسلامی تاریخ کی تھی، اس کا پورا ہونا لازمی تھا اور یہ سر عزیز الحق کے لیے بڑے فخر کی بات ہے کہ اُن کے مبارک ہاتھوں نے اس شعبہ کی بنیاد ڈالی ؎ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔

اسلامی تاریخ کے مطالعہ کی اہمیت پر زور دینا بیکار ہے۔ تاریخ ہر قوم اور ہر ملک کی اہم ہوتی ہے، ہر قوم اور ہر ملک کے تجربات ان کے اعمال و حرکات ہماری خضر راہی کیا کرتے ہیں اور پھر اُن قوموں اور اُن ملکوں کا پوچھنا ہی کیا جنھوں نے دنیا میں "ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما" کی سنتیں بھی پوری کردی ہوں، ہر پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے، نہ مانے یہ دوسری بات ہے کہ تاریخ اسلام ایشیا کی تاریخ کی وہ اہم کڑی ہے جس کے بغیر ایشیائی تہذیب و تمدن کو سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی غالب، انیس اور شاکر پڑھے ہوئے بغیر اردو دانی کا دعویٰ کر بیٹھے۔ ایشیا کو چھوڑیئے اور تاریخ عالم میں بھی، اسلامی تاریخ کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے، اس لیے نہیں کہ مسلمان خدا کی برگزیدہ امت ہے۔ بلکہ محض اس لیے کہ "اسلامی تاریخ" میں زندگی کے ایسے عملی پیغامات، تہذیب و معاشرت، تمدن و مجلس کے مختلف مسائل کے ایسے معقول حل موجود ہیں، جن سے ہماری یہ گھبرائی ہوئی دنیا، یہ بوکھلائی ہوئی دنیا، بہت کچھ استفادہ حاصل کر سکتی ہے۔

مسلمانوں نے اپنے دور حکومت میں جو کچھ کیا ہے وہ صرف ظلم و ستم ہی تک محدود نہ تھا۔ بلاشبہ ظالم بادشاہ بھی گذرے ہیں، مسلمانوں میں بھی پارٹی بندیاں ہوتی ہیں، انھوں نے بھی عیاریاں کی ہیں، اُنھوں نے بھی مذہب کے نام پر سیاسی مفاد حاصل کیے ہیں، خانقاہوں کا سہارا لیکر بعض آسودگیاں حاصل کی ہیں، لیکن با ایں ہمہ انسانیت کو ارتقا کی منزل پر لیجانے کے لیے اون کی خدمات ہیں۔ اس سلسلہ میں اُن کا ہی ایک دفتر ہے فلسفہ، منطق، سائنس، اور مختلف علم و فنون میں بھی اُن کا ایک خاص درجہ ہے۔ یہ حقیقت روشن ہے کہ مسلمانوں کی خدمات کا اعتراف

کرنے میں مورخین کا قلم اب بھی جھجکتا ہے۔ خاص کر انگریز مورخین نے تو اپنا یہ نظریہ ہی قائم کرلیا، کہ اسلام کو مسخ شدہ حالت میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے، سرولیم میور اسر بن لین پول ایچ جی ویلس، ویل ہاؤسن، ڈوزی، وغیرہ اس کی زندہ مثال ہیں۔ ہمارے متعصب ہم وطن بھائی بھی اس "کار خیر" میں انگریزوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ کبھی کبھی تو ان کا کوئی ثانی نہیں ملتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دنیا کی تاریخ میں مسلمانوں کی تاریخ کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ مورخ کا قلم اگر جھوٹ لکھتا ہے تو لکھے، یہ مورخ کی توہین ہے۔ لیکن ہماری آنکھیں، جواب بھی، افریقہ میں، اسپین میں، عراق میں، حجاز میں، ایران میں، افغانستان میں، کاشغر میں، ہندوستان میں، ہندوستان کے مختلف صوبوں میں، وہ کھنڈرات دیکھ رہی ہیں، جو اسلامی عظمت وجلال اور اُن کے کارہائے نمایاں کی، زبان حال سے شہادت دے رہی ہیں۔ مورخ یہ کہہ سکتا ہے کہ ہندوستان میں سلمانوں کی حکومت ظلم واستبداد کی حکومت تھی، لوٹ کھسوٹ والی حکومت تھی۔ مسلمان نرے جاہل اور تہذیب وتمدن سے بے بہرہ تھے، رموز مملکت سے قطعاً ناآشنا تھے، ملک میں مفلوک الحالی عام تھی، رعایا دانے دانے کو محتاج تھی آج تو خیر "عیش کانٹرول" سے کچھ نہ کچھ دال چاول ملجاتا ہے، وہاں تو یہ بھی نہ تھا۔ حرم تھا اور حرم میں تعیش اور راحت طلبی کا بازار گرم تھا۔ ممکن ہو سب صحیح ہو، ممکن ہو سب غلط ہو لیکن، ہم یہ دیکھ رہے کہ اب بھی بنگال میں گور اور پانڈوا کی اسلامی عمارتیں، دہلی میں قلعہ معلٰی اور جامع مسجد اور موتی مسجد، آگرہ میں تاج محل فتح پور میں بلند دروازہ، جونپور میں اٹالہ مسجد، جامع مسجد اور منعم خاں کا پل، کلکتہ سے دہلی تک شیر شاہ کا بنوایا ہوا گرینڈ ٹرنک روڈ، اسی طرح ملک کے ہر ہر صوبہ میں اور اضلاع میں لاکھوں ہزاروں عمارتیں اور یادگار ایسی موجود ہیں جو کچھ اور ہی افسانہ دہرا رہی ہیں۔ آواز بھی بلند آرہی ہیں، یہ نہیں کہ ہم سنتے نہیں۔ سنتے سب ہیں لیکن کچھ بولتے نہیں ہیں اور ہم یہ کہہ کر خاموش ہیں کہ۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم　　دیدہ آفتاب را چہ گناہ

ان حالات میں اسلامی تاریخ کا مطالعہ کم ازکم ہر ہندستانی کے لیے ضروری ہے۔ ہمیں ایسی ذہنیت جس کی جانب علامہ شبلیؒ نے اشارہ کیا ہے کہ

تمہیں لے دیکے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا　　کہ اورنگ زیب ہندوکش تھا ظالم تھا ستمگر تھا۔

دور کرنی ہی پڑے گی۔ اور یہ چیز "تاریخ اسلام" کے صحیح مطالعہ کے بعد ہی ممکن ہے۔

اسلامی تاریخ کے مطالعہ کی یہی ایک منطق نہیں ہے۔ اور بھی استدلال موجود ہیں، ہم دیکھ رہے کہ ہندوستان کی دو بڑی قوموں، یعنی ہندو اور مسلمانوں میں میل ملاپ پیدا کرنے کے لیے ہر ہندستانی پریشان ومضطرب نظر آرہا ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کا شور وغوغا، لیڈروں کی زبانوں سے پریس سے، پلیٹ فارم سے، اسمبلیوں اور کانسلوں سے برابر سنائی دے رہا ہے، گاندھی جی بھی "اشتراک عمل" کے لیے اتنے ہی بے چین ہیں جتنا مسٹر جناح۔ نتیجہ اب تک برآمد نہیں ہوا۔ جس دن سے سلطنت مغلیہ کا آخری چشم وچراغ خلیج بنگالہ کی موجوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بجھ کر رہ گیا اُس وقت سے اور آج تک "اتحاد" کی آوازیں برابر سنائی دے رہی ہیں لیکن جتنی کوششیں ہو رہی ہیں، اتنی ہی منافرت کی خلیج بڑھتی جاری ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ مرض کا علاج کرنے کے فکرمند سب ہیں لیکن مرض کی تشخیص کوئی نہیں کرتا۔ نتیجہ ظاہر ہے، مریض دوائیں پیتا ہے، مختلف نسخے استعمال کرتا ہے لیکن بے سود۔ فن معماری کا ایک معمولی اور سچا اصول ہے کہ۔

خشت اول چوں نہد معمار کج　　تا ثریا میرود دیوار کج

[illegible] ... اور ہم ملا حظہ فرمائیں تو ہم تاریخ کی روشنی میں لیڈر دل اور "اتحادی" ہی خواہوں سے یہ کہنے

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی   کیں راہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

ہم ہندو مسلم اتحاد" سیاسی مفاد کو مدنظر رکھ کر برطانی دوٹوں کے بل بوتے پر لڑنا چاہتے ہیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ دونوں سے کہیں بھی کسی ملک میں اتحاد ہو سکا ہے کہ ہندوستان ہی ہوگا۔ دونوں سے پارٹیاں بنتی ہیں، مقاصد ٹوٹتے ہیں۔ الکشن پارٹی اور کونسل نوازیاں دلوں کے تار نہیں جوڑا کرتیں، شک ہو تو ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے لے کر (جسے عرف عام میں "بغاوت" محض اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ تحریک ناکام رہی) آج تک کی تاریخ پڑھ ڈالیے آپ دیکھیں گے کہ اس "عہد مبارک" میں برطانی خداوند سیاست نے ہمیں رفتہ رفتہ اختیارات اور مراعات تو دیئے ہیں، لیکن آپ کو کوئی ایسا مبارک دن نہ ملیگا جب ہندو مسلمانوں نے اشتراک عمل کیا ہو، یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے، سچی اور پائیدار دوستی اسی وقت ممکن ہے جب ہم ایک دوسرے کی خوبیاں جانیں، ایک دوسرے کی کمزوریوں کو سمجھیں، ایک دوسرے کو اچھی طرح پرکھیں اور پھر یہ سمجھ کر کہ آپس میں جتنا بھی تضاد ہو، چونکہ رہنا ایک ہی جگہ ہے، زندگی ایک ہی ساتھ بسر کرنی ہے ایک ایسی ذہنیت پیدا کرنے کی کوشش کریں جس کی بنا مصالحت اور مفاہمت پر قائم ہو، مختصر یہ کہ افراد میں اشتراک عمل پیدا کرنے کے لیے سب سے پہلی ضروری چیز "ذہنی اتحاد" ہے اور ذہنی اتحاد پیدا کرنے کے لیے دماغ کو ایک ایسا ماحول نصیب ہو، جہاں طبیعتیں تو مختلف ہوں، لیکن زندگی کی گاڑی کو سب ایک ساتھ چلاتے ہوں، عادتیں جدا ہوں لیکن زندگی کا ایک عام اصول جس پر سب عمل پیرا ہوں ـــــــ اور یہ چیز اسی حالت میں ممکن ہے جب ایک فرد دوسرے فرد کی تاریخ جانے، یہی حال قوم کا ہے، قوموں میں اتحاد عمل پیدا کرنے کے لیے لازمی ہے کہ ایک قوم، دوسری قوم کی صحیح، سچی اور مفصل تاریخ جانے۔ اور تاریخ جاننے کا مفہوم یہ ہے کہ ایک دوسرے کو اچھی طرح پرکھ لیا جائے، جانچ لیا جائے، اور مصالحت کی صورتیں نکالی جائیں۔ ہندوستان میں "ہندو مسلم" اتحاد کا حل بھی یہ ایک صورت ممکن ہے۔ پریس، پلیٹ فارم اور لیڈر سب ناکام رہے "تاریخ" بلاشبہ کامیاب رہیگی۔

ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلامی تاریخ کا اجرا صوبہ بنگال کے لیے ایک فال نیک ہے۔ یہاں اس مضمون کی اور صوبوں سے زیادہ ضرورت تھی، اس کی وجہ یہ ہے کہ بنگالی ادب میں اسلامی لٹریچر کی بڑی کمی ہے۔ حالانکہ بنگالی ادب، باوجودیکہ اپنی مقامی زبان کی وجہ سے صرف ایک ہی صوبہ تک محدود ہے، کافی ترقی کر چکا ہے، ٹیگور، سرت بوس، بنکم چندر چٹرجی، نذر الاسلام، جسیم الدین وغیرہ نے اس زبان کو ملک کی ثقہ زبانوں کے مقابل لا کھڑا کر دیا ہے، بنگالی ادب میں زیادہ تر لکھنے والے ہندو ہیں، دوسرے اس زبان کا ماخذ ہی سنسکرت ہے، لہذا فطری طور پر اس میں رامائن اور مہابھارت کی روایتیں پھیلی ہوئی ہیں، کرشن کی بنسی ہر جگہ سنائی دیتی ہے لیکن صور اسرافیل کا نام و نشان ہی نہیں۔ اسلامی روایتوں، اسلامی استعارات، اشارات و تمثیلات سے بنگالی ادب کو دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے۔ دور حاضر میں "مسلمانی بنگلہ" میں اسلامی چیزیں آ رہی ہیں، لیکن یہ "اجتہاد" کل کی پیداوار ہے اور نتیجہ کے لحاظ سے صفر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں یہ دیکھ کر تعجب نہیں ہوتا ہے کہ اسلامیات سے متعلق کتابیں بنگلہ زبان میں بہت ہی کم ہیں، اور ہیں بھی تو غیر مستند نتیجہ یہ ہے کہ ہندو بنگالی تو خیر اسلامی تاریخ و روایات سے قطعاً بے بہرہ ہیں ہی، ہمارے مسلمان بنگالیوں کا بھی قریب قریب یہی حشر ہے۔

مجھے یاد ہے اور یہ چیز بھلانے سے بھی نہیں بھولتی، بی، اے کلاس میں میرے ہی ہم جماعت نے ایک بڑی معصومیت سے اپنے پروفیسر سے یہ پوچھنے کی جرات کی کہ "حضرت عمر کے چچا (عمر کون تھا)" یہ حرکت، صرف ایک بنگالی مسلمان ہی سے ہو سکتی تھی، جہاں اردو داں طبقہ

تو ایسی چیزوں کو اپنی عمر کے پانچویں یا چھٹے سال ہی خواہ وہ ماں کی زبان سے ہو، یا اردو کی دوسری اور پہلی سے ہو، معلوم کر لیتا ہے۔ بچوں کی کتابیں ہم اردو داں طبقہ کو وہ سکھلا دیتی ہیں، جو ہمارے مسلمان بنگالی بی اے میں آکر سیکھتے ہیں۔ بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔

اسی بنا پر بنگال میں اسلامی تاریخ کا انعقاد بہت ہی زیادہ ضروری تھا، اور ہے۔ بحمد اللہ ایک حد تک یہ کمی پوری ہوتی ہے

لیکن کسی شعبہ کا قیام ہی بذات خود کوئی بڑی بات نہیں، شعبہ کی پرورش نگہداشت، اس کا عروج اور اس کی ترقی بھی ضروری ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ کا شعبہ نہایت اہم شعبہ ہے۔ لہذا کوشش ہونی چاہیئے کہ اس "نوزائیدہ" کی اچھی طرح دیکھ بھال کیا جائے اچھے اچھے اساتذہ کا تقرر کیا جائے، طالبعلموں کو اس جانب مائل کرنے کے لیے اُنہیں وظائف دیئے جائیں، ان سب چیزوں سے زیادہ ضروری ایک کام اور ہے اور وہ یہ کہ ان طالبعلموں پر جو اسلامی تاریخ لیتے ہیں، یہ واضح کر دینا چاہیے کہ اُنہیں صرف ڈگری ہی نہ ملیگی بلکہ اچھے نتیجے کرنے والوں کے لیے آئندہ روٹی کمانے کا سلسلہ بھی بندھ سکتا ہے اور یہ اُسی صورت میں ممکن ہے جب جب حکومت تمام کالجوں میں اسلامی تاریخ کے شعبے کھول دے، اس سے بڑے فائدے ہونگے، پہلا یہ کہ وہ طالب علم تو کامیاب ہوں گے، اُن کی کھپت ہوگی، جب پیٹ کا سہارا ہوگا تو دماغ کی کلیں بھی کھلیں گی، علم کا مقصد علم کم از کم ہندوستان میں ممکن نہیں اور نہ ہونا چاہیے، بھوکے پیٹ بھگوان نہیں یاد آتے، سرسوتی کیا من میں سمائیگی، دوسرے اور طالبعلموں کو شوق بڑھیگا۔ تیسرے انٹرمیڈیٹ ہی سے اسلامی تاریخ کی پڑھائی شروع ہو جائیگی، اور لڑکے ام اے تک پہنچنے کے بعد سچ مچ ماسٹر آف آرٹس بن کر نکلیں گے۔ نہیں تو کم از کم اُنہیں تو اسلامیات سے تھوڑی بہت واقفیت تو ضرور ہی ہو جائیگی، جو انٹرمیڈیٹ، یا بی۔ اے کے بعد تعلیم ختم کر ڈالتے ہیں،

ہمیں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ بنگال کی موجودہ وزارت اس سلسلے میں بڑی تگ و دو کر رہی ہے۔ اور اسلامی تاریخ کو ہر ہر کالج میں نصابی حیثیت سے داخل کرنے کے لیے اسکیمیں مرتب کر چکی ہے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے، اس کام کو جلد از جلد ہو جانا چاہیئے۔ ہمیں یقین ہے کہ موجودہ مسلم وزارت کا یہ سب سے بڑا کارنامہ ہوگا، اور ہر وہ کتاب جو اسلامی تاریخ سے ریسرچ اسکالرس کے قلم سے نکلیگی اُن کی شکرگذار ہوگی۔ اسلام کی سچی حفاظت یونہی ممکن ہے "اسلام زندہ باد!" کہنے سے کچھ نہیں ہو سکتا، دنیا "نعروں" سے نہیں "کاموں" سے بدلتی ہے

کلیم اللہ، ایم اے

یہ کیا ہوا تمکو

یہ کیا ہوا مری عذرا ۔ یہ کیا ہوا تم کو
نظر اٹھاؤ خدارا ۔ یہ کیا ہوا تم کو
یہ کیوں بدل گئی دنیا ۔ یہ کیا ہوا تم کو
مری نظر سے اب آنے لگی حیا تمکو
یہ کیا ہوا تمکو

تمہاری آنکھ سے بیگانگی ٹپکتی ہے
نیاز و ناز سے اک بیدلی ٹپکتی ہے
رخ اس طرف ہے مگر بے رخی ٹپکتی ہے
وہ کیا کرے کہ جو پا کر نہ پا سکا تمکو
یہ کیا ہوا تمکو

کہے گا کچھ دلِ درد آشنا۔ ادھر دیکھو
یہ جام عشق و بجق وفا۔ ادھر دیکھو
نگاہ ناز کا صدقہ ذرا۔ ادھر دیکھو
پیام دیتی ہے کچھ چشم التجا تمکو
یہ کیا ہوا تمکو

مری نگاہ میں افسون سامری تو نہیں
نگاہ یاس محبت ہے کچھ چھری تو نہیں
دل و جگر میں تمہارے کبھی چبھی تو نہیں
نظر اٹھاؤ محبت کہیگی کیا تمکو
یہ کیا ہوا تمکو

وفا کے رنگ طبیعت سے کیا گلہ ہے تمہیں
ادائے رسم محبت سے کیا گلہ ہے تمہیں
نیاز عشق کی جرات سے کیا گلہ ہے تمہیں
نگاہ شوق نے کیا کر دیا خفا تمکو
یہ کیا ہوا تمکو

یہ سچ ہے بڑھ گئی حد سے ہماری بیتابی
بکھیرے جاتی ہے سجدے ہماری بیتابی
تمہارے ضبط پہ صدقے ہماری بیتابی
اسی نے کر دیا بیگانۂ ادا تمکو
یہ کیا ہوا تمکو

ان آنکھوں میں دلِ خود دار اب نہیں آتا
لبوں پہ خندۂ انکار اب نہیں آتا
مرے جنون پہ تمہیں پیار اب نہیں آتا
یہ کس نے پیکر سنگیں بنا دیا تمکو
یہ کیا ہوا تمکو

زبانِ شوق و لب مدّعا سے برہم ہو
مری نگاہ سے اپنی ادا سے برہم ہو
سرک گیا ہے جو آنچل ہوا سے برہم ہو
کسی نے یوں نہیں دیکھا کبھی خفا تمکو
یہ کیا ہوا تمکو

محبت ایک فریب ادا سے بھی محروم
تبسم نگہ آشنا سے بھی محروم
بقول غالب دانا جفا سے بھی محروم
یہی وفا ہے تو آتی نہیں وفا تمکو
یہ کیا ہوا تمکو

تمہیں بتاؤ کہ شوخی اگر حیا ہو جائے
روا جو بات تھی بے وجہ ناروا ہو جائے
جب اک ذرا سا تبسم بھی مدعا ہو جائے
تو کیا کہے دل مایوس مدعا تمکو
یہ کیا ہوا تمکو

یہ کیا عتاب ہے شکر جفا تو کرنے دو
خلوص عشق کے سجدے ادا تو کرنے دو
گنہگار وفا کو وفا تو کرنے دو
پرائے درد کا احساس دے خدا تمکو
یہ کیا ہوا تمکو

لبوں پہ مہر سہی ابروؤں سے کام تو لو
میں جا رہا ہوں مرا آخری سلام تو لو
ان آنسوؤں میں جو غلطاں ہے وہ پیام تو لو
مسافروں سے کدورت نہیں روا تمکو
یہ کیا ہوا تمکو

قدیم داستانوں کی یکسانیت

شاعری، موسیقی اور داستان گوئی دنیا کے پرانے مشغلے ہیں۔ شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو، جہاں داستان گوئی کا رواج نہ پایا جاتا ہو۔ سرزمین مشرق اس میں خاص طور پر ممتاز ہے۔ یہاں رات اور قصہ خوانی نے ایسا چولی دامن کا ساتھ پکڑا کہ فکر کے پردۂ سیمین پر جہاں ایک نے پرتو ڈالا وہیں دوسرے نے بھی اپنا جلوہ دکھایا ؎

فسانہ دراز است و شب کوتہ است (نظامی گنجوی)

شب دراز عدم کا فسانہ ہے دنیا (اقبال)

سایہ خواب آرد ترا ہمچو سمر[1] چوں بر آید شمس انشق القمر

تا خواب مرگ ذکر تھا ان کا زبان پر نیند آگئی ہمیں تو اسی داستان پر (راسخ عظیم آبادی)

مثالیں بے شمار ہیں۔ قصوں کی ابتدا کہاں اور کیونکر ہوئی؟ یہ کہنا مشکل ہے۔ قدیم ترین قوموں میں بھی داستان گوئی کا رواج عام تھا اور یونان کے ابتدائی دور کا ادب اڈیسی اور ناموران ٹرائے کی حکایتوں سے اسی طرح لبریز ہے، جس طرح روما کا ادب ہرکلیس کے کارناموں، قدیم برطانیا کا ادب اور آرتھر کا مافوق الفطرت داستانوں اور عرب کا ادب وامق و عذرا اور قیس و لیلیٰ کے عشقیہ افسانوں سے۔ ادھر ہندوستان بھی اپنے رامچندر کی معرکہ آرائیوں، ارجن و بھیم کی نبرد آزمائیوں، اور نل و دمنی کی دلگداز نغمہ سرائیوں میں یونان و روما سے پیچھے نہ تھا۔

برگساں کہتا ہے کہ ماضی فنا نہیں ہوتا۔ یہ نظریہ یہاں بھی صادق آتا ہے۔ داستان گوئی آج بھی ہے۔ فرق صرف یہ ہوگیا کہ تمدن کی رفتار اور زمانے کے انقلاب سے خرد سوز و گداز پر غالب آگئی۔ مافوق العادت پر یقین جاتا رہا اور مافوق الفطرت داستانوں کی جگہ فطری ناولوں اور افسانوں نے لے لی۔ آج بھی دیہات کے ان پڑھوں میں کنور کبھی، راجہ بھرتری، اور آلہا اودل کی حکایتوں کے گانے والے اور شہروں کے قدامت پسندوں میں طلسم ہوشربا کے متوالے مل ہی جائیں گے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ داستان گوئی انسانی زندگی کا لازمی جز ہے۔ جس نے مختلف ناموں اور پیرایوں سے تخئیل کی دنیا میں اہمیت حاصل کرلی ہے۔ مرا موضوع مافوق الفطرت داستان گوئی ہے۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان داستانوں کی خصوصیات تمام یکساں ہیں اور افسانے مختلف قوموں میں مختلف وقتوں میں یکساں طور پر ارتقا کی منزلیں طے کرتے ہیں۔ اس کے اسباب کیا ہیں؟:-

---

[1] سمر چاندنی کو کہتے ہیں۔ اہل عرب چاندنی راتوں میں قصہ خوانی کرتے تھے۔ اسی مناسبت سے قصہ خوانی کو سامر کہتے ہیں۔

اس مسئلے کے حل کرنے کے لیے داستانوں کی عام خصوصیات اور اس کے تدریجی ارتقا کا مطالعہ ضروری ہے۔

ہر ملک کی ادبی تاریخ اس کا ثبوت دیتی ہے کہ داستانوں کی خصوصیات تمام یکساں رہی ہیں۔ عشق، بہادری، مذہبیت، مافوق الفطرت عنصر، جنگ اس کی خصوصیات ہیں۔ کامیابی کے لیے جنگ کا ہونا بھی ضروری ہے۔ خاتمہ زیادہ تر ایک فیصلہ کن جنگ پر ہوتا ہے۔ جس میں انسان، دیو، جن، پری سبھی شریک ہوتے ہیں اور طلسمات، نقوش، سحر وغیرہ سے کام لیا جاتا ہے۔

جستجو داستان کا عنصر لازمی ہے۔ اس کے مختلف مقصد ہوتے ہیں۔ کسی محروم الارث وارث کو ترکہ دلانا۔ کسی مطلوبہ کی دلجوئی اور اُس کے دل میں گھر کرنا۔ کسی دوست کا پتا چلانا جو عجائبات میں پھنس کر گم ہوگیا ہو۔ کسی ظالم کو سزا دینی۔ کسی طلسم کو توڑنا۔ کسی نازنین کو مصیبت سے نجات دلانی۔ کسی دیو، شیطان، یا خبیث کو نیست و نابود کرنا۔ کسی بری رسم کو اُٹھوانا یا کسی راز سربستہ کی سراغ رسانی کرنی۔ کسی دوست یا اس کی محبوبہ کے سوالات کو پورا کرنا۔ حاتم طائی کے قصے میں قریب قریب تمام خصوصیات موجود ہیں۔ مثلاً کوہ ندا کی خبر لانا۔ کبوتر کے انڈے کے برابر الماس لانا وغیرہ وغیرہ۔ جستجو کے مقامات ایسے ہوتے ہیں جن سے ہیرو یا تو قطعاً ناواقف ہوتا ہے یا محض تھوڑی بہت واقفیت رکھتا ہے۔ اور جہاں پہنچ کر وہ بھٹک جاتا ہے

داستان کی صوری خصوصیت جو طرز بیان سے تعلق رکھتی ہے یہ ہے کہ اس میں مرکزی قصہ بہت مختصر ہوتا ہے۔ قصہ در قصہ پیدا ہو کر اس میں طوالت پیدا ہو جاتی ہے اور ضمنی قصے مرکزی قصے سے ارتقائی طور پر پیدا نہیں ہوتے بلکہ اضافہ کیے جاتے ہیں۔ جدید ناولوں کے برخلاف ان میں سیرت نگاری اور مکالمے کا عنصر نسبتاً کم ہوتا ہے۔

یہی خصوصیات تمام قدیم داستانوں میں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔ ہومر کی اوڈیسی۔ سکندر کے افسانے، والمیکی کی رامائن اور قدیم ایرانی۔ عربی اور مصری داستانیں انہیں خصوصیات کی حامل ہیں

یکساں ہونے کے اسباب: اس کا سبب سر آرتھر کوئیلر کوچ اپنے مقالہ کومرس آف تھوٹ Commerce of thought (تبادلہ خیال) میں یہ بیان کرتے ہیں کہ "جب تمدن کی روشنی دنیا میں نمودار ہوئی، اور اس کی پہلی کرن نے دنیا پر عکس ڈالا تو سب سے پہلے سڑکوں کی تعمیر ہوئی اور انسانوں نے حصول علم یا دوسرے اغراض سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا شروع کیا۔ یہی سبب ہے کہ تقریباً تمام ملکوں کے قصے کی ابتدا عشق سے ہوتی ہے اور یہی جذبہ شروع سے آخر تک غالب اور مرکزی قصے کی جان ہے۔ عشق کبھی معشوق، کبھی اس کی تصویر دیکھ کے کبھی سیاحوں اور پالتو جانوروں سے اُس کے حسن کی تعریف سن کے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے پیدا ہوتے ہی بہادری اور جستجو کے جذبے میں اشتعال ہوتا ہے۔ اسی کے ضمن میں دوسری خصوصیات ہیں۔ مثلاً عجائبات جس میں جادوگروں کے طلسم اور جن دیو و پری کی ملاقات اور ان کا میل جول بھی شامل ہے۔ عاشق جب معشوق کی تلاش میں نکلتا ہے تو اس کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ کبھی معشوق اور اس کے والدین ایسی شرطیں پیش کرتے ہیں جن کے پورا کرنے میں جان کی بازی لگانی ہوتی ہے۔ کبھی کوئی ایسا واقعہ پیش آتا ہے جس سے عاشق و معشوق جدا ہو جاتے ہیں اور عاشق سوختہ ساماں پریشاں و سرگرداں مارا مارا پھرتا ہے یا کسی طلسم یا تہ خانے میں قید ہو جاتا ہے جس سے نکلنا محال ہو جاتا ہے۔ کبھی کوئی پری اس کی محبوبہ کی شکل میں اس کے سامنے آتی ہے اور محبت کا اظہار کر کے اس کے دام فریب میں گرفتار ہو جاتا ہے، کبھی کوئی دیو اپنی خود اک بنانے کے لیے اس کو اسیر کر لیتا ہے۔ غرض طرح طرح کے عجائبات کی سیر اور قسم قسم کی مصیبتوں

کا سامنا ہوتا ہے۔ جن کو دور کرنا اس کو ضروری ہے۔ اس کے بغیر گوہر مراد ہاتھ نہیں آتا۔ ان سب مشکلوں کو دور کرنے کے لیے جب مادی وسیلے بے کار ہو جاتے ہیں تو وہ خدائے تعالیٰ کے دربار میں دعا کرتا ہے اور خدا کی طرف سے کبھی کوئی بزرگ اس کی مدد کرتا ہے یا کوئی نقش یا تعویذ، مہرہ یا لوح دے دیتا ہے جس سے دقتیں حل ہو جاتی ہیں۔ اس حل مشکلات میں جذبۂ عشق اس کی رہبری کرتا ہے، بہادری ہمت بڑھاتی ہے۔ اور جذبۂ مذہبی اس کو مایوسی سے بچاتا ہے

مرنا اس پن کہ جیتے رہنا   راسخ کہو کیا قرار پایا (راسخ)

To be or not to be   that is the question (Shakespeare)

ان دلیلوں سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ داستانوں کے یکساں ہونے کا اہم ترین سبب خود انسان کی قوت متخیلہ ہے۔ قوائے نفسانیہ تمام بنی آدم میں یکساں ہیں اور ان غیر متمدن اقوام میں یکساں رہتی ہے جن کو متمدن قوموں سے مس نہیں ہوتا۔ انسان کو ایک طاقت قدرت نے ودیعت کی ہے جس کی بدولت وہ اپنے طور پر اور یکساں طور پر منازل ارتقا کو طے کرتے ہیں۔ غیر متمدن قوموں کے قوائے ذہنیہ ارتقا یافتہ نہیں ہوتے۔ ان میں جذبات زیادہ نشو و نما پاتے ہیں اور تخیل پیدا اور زیادہ جاذب دل ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ داستانوں کی کثرت قرون وسطیٰ میں زیادہ ہوئی۔ خوف اور رجا۔ یہ دو جذبات ابتدائی ہیں۔ ابھی تک غیر متمدن قومیں مناظر قدرت کی پوجا کرتی ہیں۔ شمالیہ والے ابھی تک سایہ کو روح سمجھتے ہیں بیماری کا سبب ارواح کی ناراضی جانتے ہیں اور مریضوں کی شفا کے لیے ان روحوں اور دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہیں۔ مناظر قدرت میں بعض ایسے ہیں جو اپنے حسن کی وجہ سے کشش پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً۔ چاند اور بعض اپنی عظمت و جلالت کے باعث خوف اور ہیبت دلاتے ہیں۔ مثلاً۔ آفتاب، زلزلہ، اژدہا وغیرہ۔ خام دماغ ان کا سبب دریافت نہیں کر سکتا اسلیے ہر جذبے اور ہر منظر کا ایک دیوتا قائم ہو جاتا ہے۔ ان دیوتاؤں کی پھر دو قسمیں ہو جاتی ہیں (۱) خیر پیدا کرنے والے (۲) شر کے بانی۔ جن کے نام کہیں گوڈ۔ اور ڈیمن ہیں۔ اور کہیں دیوتا اور راکشش۔ یہی سبب ہے کہ وحشیوں میں ابھی تک چاند کے دیوتا یا دیوی کی پرستش کی جاتی ہے۔

انسانی فطرت جذبات کو مجسمہ کی صورت میں دیکھنا چاہتی ہے۔ اسی لیے کہیں لیلیٰ مجنوں، کہیں شیریں فرہاد۔ کہیں ہیلن و ہیلینا اور کہیں نل و دمن۔ حسن و عشق کی مورتیاں قرار دی گئیں۔ ورنہ کسی تاریخ سے یونان کی ہیلینا اور ہندوستان کی سیتا ایک ہی شخصیت نہیں ہو سکتیں۔ داستانیں اور عقاید بھی یکساں ہوئے۔ یہ داستانیں نہ صرف قوم آریا کی مختلف شاخوں میں یکساں ہیں بلکہ نام اور دوسرے جزوی اختلاف کے ساتھ بورنیو۔ نیوزی لینڈ۔ اسکیمو۔ جزائر بحرۂ جنوبی اور وحشیان امریکہ میں اصل قصہ ایک ہی ہے"

مجھے سر کوئیلر کوچ کی رائے سے اختلاف نہیں۔ تبادلۂ خیال دو قوموں کے درمیان ہوتا رہا ہے اور تمدن کی ترقی کے ساتھ ہوتا رہیگا۔ مگر داستانوں کی خصوصیات کے اشتراک کا واحد سبب یہی نہیں ہے۔ رسم و رواج۔ عقائد۔ صنعت و حرفت کا یکساں ہونا اس امر کی کوئی قوی دلیل نہیں۔ ازتیک (ساکنان میکسکو) بھی مصریوں کی طرح اہرامی قبریں بناتے تھے۔ حالانکہ ساکنان میکسکو اور مصریوں میں کسی قسم کی مراسلت یا آمد و رفت تاریخ سے ثابت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جب دو مختلف قوموں میں میل جول ہوتا ہے تو پہلا اثر ایک دوسرے کی زبان پر پڑتا ہے۔ اس کے بعد معاشرت اور تخیلات پر۔ مگر نیوزی لینڈ۔ شمالیہ بورنیو اور اسکیموؤں کی

فقاید ہیں جو قدیم یونانیوں یا قدیم ہندوستانیوں میں تھے۔ حالاں کہ ان کی زبانیں ہندوستان یا یونان کی قدیم زبان سے متاثر نہیں معلوم ہوتیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اکثر دو غیر ممالک کے شعرا کی تخئیل لڑ جاتی ہے ؎

خدا جانے یہ کس کی جلوہ گاہ ناز ہے دنیا ہزاروں اٹھ گیے رونق وہی باقی ہے محفل کی (اسیر)

Ten thonsond years have dawned and fled
And yet her magic is the same
Stopford. A. Brooke

مفہوم ایک ہی ہے مگر اسیر اس شاعر سے پہلے قفا کر چکے تھے، اور یہ اردو سے نا آشنا تھا۔

ہمیں میں رنج بھی ہے اور راحت بھی ہمیں میں ہے جہنم بھی ہمیں میں اور جنت بھی ہمیں میں ہے (ظفر)

The mind is its own place and in itself
can make a heven of hell and a hell of heaven
(Milton)

سید سیف الدین احمد بلخی ام اے

عید کو دعوتِ گریہ

چہرے سے غم کے پردہ اٹھانے کا حق نہیں
اے عید تجھ کو جلوہ دکھانے کا حق نہیں

شعلوں سے آفتابِ سپہرِ نشاط کے
جانِ تپاں میں آگ لگانے کا حق نہیں

اُکسا کے آگ پھر ہوسِ انبساط کی
جلتے دلوں کو اور جلانے کا حق نہیں

صبحِ نشاط، طنطنۂ ناؤ نوش سے
خوابیدہ حسرتوں کو جگانے کا حق نہیں

اب اونچی ڈالیوں میں کھلا کے طرب کے پھول
کانٹے رہِ ہوس میں بچھانے کا حق نہیں

کرنوں سے آفتابِ مسرت کی صبحدم
زخمی دلوں پہ تیر چلانے کا حق نہیں

یادِ ہلالِ شامِ مسرت کو، وقتِ صبح
فطرت کی تیغِ جور بنانے کا حق نہیں

دولت کدوں کی شمعِ طرب سے چُرا کے آگ
مفلس کے جھونپڑے کو جلانے کا حق نہیں

دے کر نویدِ دورِ ہم آغوشیِ مراد
ناکامیِ کنار بڑھانے کا حق نہیں

رِندانِ نامراد کی آنکھوں کے سامنے
بزمِ مے و رباب سجانے کا حق نہیں

اب کام لے کے شانِ تبسم سے صبحدم
بجلی تجھے دلوں پہ گرانے کا حق نہیں

مجروحِ آہ و نالہ و شیون ہے گوشِ عصر
خوشیوں کا گیت ایسے میں گانے کا حق نہیں

اب تختہ گاہِ گردشِ ایام ہے یہ ملک
تجھ کو دیارِ غیر میں آنے کا حق نہیں

انسانیت کے سوگ میں روتی ہے چشمِ وقت
ایسے میں ہم کو عید منانے کا حق نہیں

اے عید اشکِ وقت سے منہ دھو کے تو بھی جا
آہی چکی ہے جب تو ذرا رو کے تو بھی جا

معین شادی

بوڑھے کسان کی عید

موجودہ جنگ نے جو حال ساری دنیا کا کر رکھا ہے وہ اظہر من الشمس ہے خصوصاً بنگالہ کی حالت تو بالکل ہی ناگفتہ بہ ہے قحط سالی اور گرانی نے وہ سماں باندھا ہے کہ الاماں والحفیظ۔ ہزاروں اور لاکھوں فاقہ کشی کی نذر ہو رہے ہیں نفسی نفسی کا عالم ہے۔ مرگھٹوں اور قبرستانوں کے کارندوں کو مہلت نہیں کہ مردے جلائیں یا دفن کیے جائیں۔

ضلع مناپور کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک چھوٹا سا خاندان آباد تھا۔ یہ خاندان مشتمل تھا، انور، اس کے والد اور والدہ پر۔ انور کی شادی آج قریب تین سال ہوئے ہو چکی تھی۔ ذریعہ معاش ان کا زراعت تھا۔ انور کا کوئی بال بچہ نہ تھا۔ انور کی ازدواجی زندگی بہت مزے میں گذر رہی تھی۔ بہو، ساس سسر اور بیٹا نہایت خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ سیلاب اور غلہ کی مایوس کن پیداوار نے انکا نقشہ بدل دیا۔ وہ نانِ شبینہ کو محتاج ہو گیے۔

مفلوک الحال خاندان بدقت تمام کلکتہ پہنچا۔ کلکتہ جہاں اس وقت سیکڑوں نعشیں پڑی سڑا کرتی ہیں وہاں نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا۔ غریب انور اور اُس کی فیملی فٹ پاتھ، سڑک اور گلی کوچوں میں در بدر کھانے کی تلاش میں مارے پھر رہے تھے اگر کسی کو رحم آجاتا تو کھانے کو کچھ دیدیتا، ورنہ یوں ہی پیٹ کی آگ میں جلتے ہوئے راستہ میں پڑے رہتے۔ انور کے والد کی عمر قریباً ستر سال کی تھی اور والدہ کی عمر قریب ساٹھ سال۔ پرانی ہڈی ہونے کی وجہ سے وہ اتنی فاقہ کشی پر بھی کچھ توانائی رکھتے تھے۔ انور کی عمر ۲۵ سال کی اور اس کی شریک حیات کی عمر بیس سال کی تھی۔ وہ اس مصیبت کے متحمل نہ ہو سکے روز بروز کمزور ہوتے جا رہے تھے۔

آج رمضان المبارک کی تیس تاریخ ہے ہلال نمایاں ہے۔ لوگ کل آنیوالی عید کی زبردست تیاریاں کر رہے ہیں۔ امرا بزم عیش و طرب کو سجا رہے ہیں۔ ادھر انور اور اس کی شریک حیات بھوک کی تڑپ سے جاں بلب ہیں۔ بوڑھے والدین بیٹے اور بہو کو کلیجہ سے لگائے ہوئے بارگاہ حقیقی میں دست بدعا ہیں کہ خدا ماں باپ ہی کی مصیبت کو کچھ زیادہ کر کے اولاد کو اس سے نجات دیدے رازق العباد کہیں سے بھی غذا مہیا کر دے۔ مگر مشیت ایزدی کچھ اور ہی نظر آتی ہے۔ بھیانک رات، آہ و فریاد شور و فغاں کی رات ختم ہوتی ہے۔ ادھر صبح عید اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ نمودار ہوتی ہے۔ اُدھر انور اور اُس کی شریک حیات بھوک کی تاب نہ لاکر ایک ساتھ فٹ پاتھ پر اس دنیا کو خیرباد کہتے ہیں اور ہمیشہ کیلئے گہری نیند سو جاتے ہیں۔ بوڑھا کسان اور اس کی ضعیفہ ایکدوسرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں۔ یکایک موذن، صبح کی اذان دیتا ہے۔ بوڑھا کسان جو ابتک اپنے فرض سے غافل تھا چونک جاتا ہے دوگانہ کیلئے بارگاہ ایزدی میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور بعد نماز کے بارگاہ رب العزت میں شکریہ ادا کرتا ہے کہ اللہ نے ایسی عید دکھائی۔

ظہور احسن قاضی

نظام شمسی کے تین ارکان

ہمیں آسمان میں سورج اور چاند دو روشن گیند سے نظر آتے ہیں۔ ستارے چھوٹے چھوٹے چمکدار نقطوں کی مانند دکھائی دیتے ہیں لیکن دراصل وہ بہت بڑے ہیں اور ان میں بے اندازہ عجائبات ہیں۔ منجم یا ستارہ شناس صدیوں سے ان اجرام فلکی کا مطالعہ کرتے چلے آئے ہیں۔ ٹیلسکوپ (دوربین) اور اسپکٹروسکوپ کی امداد سے وہ اجرام سماوی کی عجیب و غریب باتیں معلوم کرتے ہیں۔ اسپکٹروسکوپ روشنی کے رنگوں کو جدا کرنے کی دوربین ہے۔ سائنس دان ان رنگوں کو دیکھ کر کسی جرم فلکی کی ہیئت ترکیبی معلوم کرتے ہیں۔ دوربین سے دیکھ کر منجم یہ بتاتے ہیں کہ فلاں ستارہ یا سیارہ کس شکل کا ہے۔ یا اس کی سطح پر کیا چیزیں پھیلی ہوئی ہیں، وہ گردش کس طرح کرتا ہے اور وہ ہم سے کتنی دور ہے۔

آفتاب جب پورب سے نکلتا ہے تو ہم کہتے ہیں، دن نکل آیا اور جب وہ مغرب میں غروب ہوتا ہے تو اندھیرا ہونا شروع ہو جاتا ہے اور پھر رات ہو جاتی ہے۔ رات کے خاتمہ پر دن نکلتا ہے ——— آسمان کے پار سورج کی گردش سے دن اور رات بنتے ہیں۔ سورج ہر شام کو ہماری نظروں سے اوجھل ہو کر ہر صبح پھر پورب سے نمودار ہوتا ہے۔

آپ کو تعجب ہوگا کہ دراصل سورج گردش نہیں کرتا۔ بلکہ زمین سورج کے گرد لٹو کی مانند گھومتی ہے اور اس کی گردش ہمیشہ مغرب سے مشرق کو ہوتی ہے۔ اگر زمین کسی وجہ سے مشرق سے مغرب کی طرف گردش کرنے لگے تو سورج مغرب سے طلوع ہو کر مشرق میں غروب ہوا کرے۔ چونکہ ہماری ساری زمین حرکت کرتی ہے اس لیے ہم یہ محسوس نہیں کرتے کہ سورج اپنی جگہ قائم ہے۔ بلکہ ہمیں زمین ساکت اور سورج حرکت کرتا معلوم ہوتا ہے۔ دراصل زمین کی دو گردشیں ہیں ——— ایک سورج کے گرد اور دوسرے اپنے محور پر لٹو کے مانند۔

اب آپ کو معلوم ہو گیا کہ ہماری زمین حرکت کرتی رہتی ہے تو پھر ضروری ہے کہ سورج کی مانند دیگر آسمانی ستارے بھی طلوع اور غروب ہوا کریں۔ ٹھیک یہی حالت چاند اور ستاروں کی ہے۔ شام کے وقت کچھ ستارے مشرق سے طلوع ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے برعکس کچھ ستارے مغرب میں چھپتے نظر آتے ہیں۔ چاند مشرق سے طلوع ہو کر مغرب میں ڈوبتا ہے۔ چاند اور ستارے مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرتے دکھائی دیتے ہیں

اگر آپ کسی خاص ستارے کا مطالعہ چند روز تک کریں، تو آپ دیکھیں گے کہ وہ قریباً ۲۴ گھنٹے (یا ۲۳ گھنٹے ۵۶ منٹ ۴ سکنڈ) کے وقفے سے نمودار ہوتا ہے اور اتنا ہی وقت زمین اپنے مرکز پر گھوم کر ایک چکر پورا کرنے میں لیتی ہے۔ زمین کو سورج کے گرد چکر پورا کرنے میں ایک سال لگتا ہے۔ پہلی گردش سے دن رات اور دوسری گردش سے موسم بنتے ہیں۔

سورج ہماری زمین سے کتنی دور ہے؟ اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے اگر ہم سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سورج کی طرف جائیں تو یہ سفر ایک سو چھ سال میں پورا ہوگا۔ ہماری زمین سورج سے اندازاً نو کروڑ بیس لاکھ میل دور ہے۔ سورج کی کرن زمین تک پہنچنے میں آٹھ منٹ لیتی ہے۔ حالانکہ روشنی کی رفتار ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سکنڈ ہوتی ہے۔

سورج ہمیں چھوٹی سی روشن گیند کی مانند دکھائی دیتا ہے لیکن یہ بہت بڑا ہے ——— سورج ہماری زمین سے جسامت میں تیرہ لاکھ

گنا بڑا ہے۔ سورج اور زمین میں وہی تناسب ہے جو ایک بڑی فٹ بال اور رائی کے ایک دانے میں ہوتا ہے۔

حقیر اور ناچیز انسان کی تو ہستی ہی کیا خود یہ ہماری زمین، جس پر اربوں انسان آباد ہیں، خدا کی بنائی ہوئی وسیع کائنات کا ایک بے حقیقت ذرہ ہے۔

سورج حقیقت میں ایک وسیع اور بے پایاں جسم ہے جو دہکتی ہوئی گیس جیسے مادے سے بنا ہے۔ اس کا درجہ حرارت قریباً چھ ہزار سنٹی گریڈ ہے۔ ہندوستان میں موسم گرما میں زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت ۴۵ سے ۵۰ درجہ سنٹی گریڈ ہوتا ہے۔ اس آتشی کرّے سے ہر وقت آگ کے ہزاروں میل لمبے شعلے نکلا کرتے ہیں جن کی رفتار ہزاروں میل فی سکنڈ ہوتی ہے۔

چاند سورج کی مانند دہکتا ہوا جسم نہیں بلکہ ٹھنڈا کرہ ہے۔ یہ زمین سے سورج کی نسبت زیادہ نزدیک ہے۔ اس کا فاصلہ ہماری زمین سے قریباً دو لاکھ ۳۹ ہزار میل ہے۔ یہ جسامت میں زمین سے چھوٹا ہے۔

اس کی سطح اونچے پہاڑوں، گہرے غاروں اور وادیوں سے پٹی پڑی ہے۔ چاند کی خوشگوار چاندنی دراصل سورج کی تیز روشنی کا عکس ہے۔ سورج کی روشنی چاند پر پڑتی ہے اور منعکس ہو کر ہم تک پہنچتی ہے۔ اگر دنیا کا کوئی شخص چاند میں پہنچ جائے تو شاید اسے یہ معلوم ہو کہ جس طرح سورج کی روشنی چاند پر منعکس ہو کر زمین والوں کے لئے ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی بن جاتی ہے۔ اسی طرح زمین سورج کی روشنی کو وصول کر کے چاند کی سطح پر پہنچتی ہے۔ اور وہاں [illegible] چاندنی کا سامان بہم پہونچاتی ہے

کاش کہ ہمارے پاس ایسی کوئی گاڑی ہوتی جو چاند تک پہنچ سکتی [illegible] جو چاند میں پہنچا دیتا۔ پھر ہم واپس آکر اس دنیا والوں کو بتا سکتے کہ چاند میں کیا عجائبات ہیں [illegible] زمین کی کیا شکل نظر آتی ہے۔

انسان کافی ترقی کر چکا ہے اور کر رہا ہے اور وہ دن دور نہیں جبکہ [illegible] کی مدد سے اس دنیا کے علاوہ دوسری دنیا پر بھی جا سکے گا اور واپس آسکے گا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ زمانہ ہماری زندگی ہی میں آ جاتا۔ ہماری آنکھیں بند ہونے پر یہ زمانہ آیا تو ہمارے کس کام کا۔

چاند مشرق سے مغرب کی طرف گردش کرتا ہے۔ چاند کی اس گردش کی [illegible] جیسے کہ زمین اپنے محور پر بھی گھومتی ہے۔ اگر آپ چاند کو دوسری شام پھر اسی وقت دیکھیں تو وہ اپنی سابق جگہ پر نظر نہیں آئے گا بلکہ [illegible] مشرق کی طرف [illegible] ستاروں کے ایک نئے جھرمٹ میں دکھائی دے گا۔ ایسی حالت میں چاند دراصل ستاروں کے بیچ میں نہیں ہوتا ہے۔ چاند کے پس منظر میں جو ستارے دکھائی دیتے ہیں وہ اس سے اتنے میلوں دور ہیں کہ ان کے اعداد ہماری اور آپ کی زبان سے ذرا مشکل کے ساتھ ہی ادا ہو سکیں گے۔ جوں جوں چاند مشرق سے مغرب کی طرف کرتا ہے اس کا پس منظر بھی تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اس کی [illegible] زمین کے گرد گردش کرتا ہے۔ قریباً اسی طرح جیسے کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ زمین سے اس کا فاصلہ ہمیشہ یکساں رہتا ہے۔ چاند کا ہمیشہ صرف ایک ہی رخ زمین کی طرف ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ دوربین سے دیکھنے پر چاند کی سطح پر ہمیشہ وہی داغ نظر آتے ہیں۔ ہم چاند کو چاروں طرف سے صرف اسی حالت میں دیکھ سکتے ہیں جبکہ ہم مدار (وہ راستہ جس پر زمین سورج کے گرد گھومتی ہے) سے ہٹ کر کسی اور مقام پر پہونچ سکیں۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ چاند فلا میں ایک ہی رخ پر زمین کے گرد پھرتا رہتا ہے

زمین اور سورج کے لحاظ سے چاند ہمیشہ اپنی جگہ بدلتا رہتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ سورج غروب ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا پورا گھیرا مشرق سے نمودار ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ پورا چاند (چودھویں رات کا چاند) کہلاتا ہے۔ اس [illegible]

اور سورج زمین کے مخالف اطراف میں ہوتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں ٹھیک ایک ہی خط مستقیم میں نہیں ہوتے۔ سورج چاند کا صرف نصف حصہ روشن کرتا ہے۔ اس لیے اگر وہ بخط مستقیم ہوتا تو چونکہ زمین درمیان میں حائل ہوتی اس لیے چاند کا پورا نصف نہیں بلکہ صرف ایک حصہ (اس روز) ہمیں روشن دکھائی دیتا۔

دوسرے روز چاند پورا روشن نظر نہیں آتا۔ اب چاند زمین کی اس سمت میں نہیں ہے جو کہ ٹھیک سورج کے بالمقابل ہے اب وہ سورج غروب کے وقت ٹھیک مشرق میں نہیں بلکہ افق سے کچھ نیچے نظر آتا ہے۔

حالت بدر کے قریباً آٹھ روز بعد سورج غروب کے وقت، چاند زمین کے منطقہ مخالف (بلحاظ حالت بدر کے) میں ہوتا ہے۔ اسے یوں سمجھنا چاہیئے کہ پہلے اگر چاند اس خط مستقیم کے قریب تھا جو زمین اور سورج کو ملاتا ہے تو اب وہ اس خط سے زاویہ قائمہ پر ہوتا ہے۔ کیونکہ اس روز چاند سورج چھپنے کے بارہ گھنٹے بعد ہمارے افق پر دکھائی دیتا ہے۔ ایسے سورج غروب کے وقت وہ (چاند) ہمارے پیروں کے نیچے تھا۔ ایسی حالت میں چاند کا نصف حصہ روشن نظر آئے گا۔

چاند یونہی آہستہ آہستہ گھٹتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ چار پانچ روز بعد بڑی رات گئے آسمان میں نمودار ہوتا ہے اور پہلی رات کے چاند (ہلال) کی مانند نظر آتا ہے۔

حالت بدر کے قریباً پندرہ روز بعد چاند اور سورج دونوں مغرب میں غروب ہوتے ہیں۔ اب وہ دونوں زمین کے ایک سمت میں ہوتے ہیں لیکن ٹھیک ایک ہی خط مستقیم میں نہیں۔ اس روز آپ چاند کا کوئی حصہ نہیں دیکھ سکتے۔ کیونکہ یہ اب سورج کی روشنی سے دور ہے ——— اس لیے اس میں اندھیرا ہے۔ آگے چل کر یہ ہلال بن کر دکھائی دیتا ہے

دو یا تین دن گزرنے پر سورج غروب کے بعد آسمان میں ہلال نظر آتا ہے۔ قریباً سات روز کے بعد وسط آسمان میں آدھا چاند نظر آتا ہے اور دس کے پندرہ روز بعد آپ پھر مشرق سے بدر (پورا چاند) طلوع ہوتے دیکھتے ہیں۔

بدر کی درمیانی حالت میں قریباً ½ ۲۹ دن صرف ہوتے ہیں اور یہ قمری مہینہ کہلاتا ہے۔ ہندو منجمین نے اس عرصے کو پورے تیس حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ بارہ قمری مہینوں (یا ۳۵۴ دن) کا ایک قمری سال ہوتا ہے

پوری کائنات اور اس کا ہر ایک ذرہ، بلکہ ہر ایک ذرے کا چھوٹا سا چھوٹا جزو "اس" کے حکم پر گردش میں ہے۔ کیا ضعیف انسان سچے دل سے "اس" کے احکام بجا لاتا ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہو تو ہم خاموش رہیں گے۔ لیکن اگر جواب نفی میں ہو اور یقیناً نفی ہی میں ہونا چاہیے تو کیا آپ بتا سکتے ہیں ایسا کیوں ہے؟

نور محمد خاں مخزنی

دو شعر

اس کا شکوہ کیا اگر دل مورد آلام ہے
زندگی تو در حقیقت کشمکش کا نام ہے

سلسلہ جاری ہے اب تک گردش ایام کا
مان لوں کیونکر کہ ہر آغاز کا انجام ہے

ابراہیم ہوش

آجکل

جل رہا ہے دامنِ تہذیب اٹھتا ہے دھواں
نذرِ طوفاں ہو رہا ہے زندگی کا کارواں

خون کی چھینٹوں سے لکھی جا رہی ہے داستاں
داستاں، ہاں، داستانِ انسانیت کی داستاں

بڑھ رہی ہے مفلسی بے چارگی، فاقہ کشی
بڑھ رہی ہیں دن بدن انسان کی مجبوریاں

سرسراہٹ گڑگڑاہٹ، یہ دھماکے زلزلے
مائلِ تخریب ہیں، سائنس کی ضوباریاں

صفحۂ ہستی پہ کب انسان کو چھوڑے گا یہ
اختراعات اور ایجادات کا سیلِ رواں

ارتقائے زندگی کو رو رہا ہے انحطاط
دامنِ امن و سکوں کی اڑ رہی ہیں دھجیاں

موت کا پیغام بن کر آ رہی ہیں پے بہ پے
ظلم و استبداد کی بڑھتی ہوئی تاریکیاں

بربریت گامزن ہے اپنی منزل کی طرف
وقت لکھتا جا رہا ہے ایک خونی داستاں

سُن رہے ہیں اک نئی دنیا بسائی جائیگی
ہو رہی ہیں چار سو انسان کی قربانیاں

قہقہہ بردوش مستقبل ہے دیکھو دیکھ کر
دامنِ انسانیت پہ خون کے گہرے نشاں

موت کے شعلوں میں جھونکی جا رہی ہے زندگی
بھوک سے انساں رگڑتے پھر رہے ہیں ایڑیاں

برکتِ تہذیب ہیں یا ہیں [illegible]
یہ مصائب، یہ ہلاکت اور یہ بربادیاں

سوچتا تھا میں انہیں بربادیوں پر ایک دن
مائلِ پرواز تھیں، تخئیل کی جولانیاں

ناگہاں آئی صدا اک [illegible] میں کانپ اٹھا
خوف سے دم سادھ کر چپ ہو گئی میری زباں

"رمزِ قدرت ہے یہ مخفی تو نہ سمجھے گا اسے"
"فہمِ ناقص سے ترے باہر ہے یہ رازِ نہاں"

"ایک ہیں، تعمیر اور تخریب دونوں ایک ہیں"
"اوٹ میں بربادیوں کی ہیں چھپی آبادیاں"

"ہر نئی تخریب، [illegible] تعمیرِ نو کی [illegible]"
"اوج دُنیا پر ہے قائم نظم و نسقِ دو جہاں"

"زندگی کا اک نیا پیغام لے کر آئیں گے"
"سرخ انگارے، دہکتی آگ یہ اٹھتا دھواں"

"دیکھتا ہوں میں جبینِ وقت پہ گہرے نقوش"
"لے رہا ہے انقلابِ زندگی انگڑائیاں"

حسن نجمی سکندرپوری

اسلامی کتب خانے

لفظ "عرب" کے معنی ہیں "خالص زبان" عرب دیگر اقوام عالم کو "عجمی" کہتے تھے یعنی "گونگی" اپنی طلاقت لسانی اور عذوبیت بیانی کے نزدیک وہ کسی دوسری قوم کو خاطر میں نہ لاتے۔ یہاں تک کہ اس خصوص میں اہل فارس کو بھی درخور اعتنا نہ سمجھتے تھے۔ اس امر سے یہ صاف مترشح ہو جاتا ہے کہ عرب لوگ اپنی زبان پر کس قدر نازاں و مفتخر تھے۔ سخن سنجی و شعرگوئی عربوں کی جبلت میں رسی بسی ہوئی تھی۔ چنانچہ قبل اسلام ہونے سے پیشتر بھی ان کی ادبی و شعری تصنیفات و منشآت معتدبہ تعداد و مقدار میں موجود تھیں۔ عبادت گاہیں اور بازار ان کی قصیدہ خوانی اور شعرگوئی کے عام مراکز تھے۔ وہ اپنی نظموں کو درختوں کے چھلکوں، چوڑی چوڑی ہڈیوں یا گھانسوں، ریشمی کپڑوں، ہرن کے چمڑوں اور اسی قسم کے دوسرے بیش قیمت پارچہ جات پر لکھتے تھے۔ انھوں نے کاغذ کا استعمال ملک چین سے براہ سمرقند سیکھا۔ کاغذ پر سب سے پہلی کتاب ابو عابد نے ۲۲۳ھ میں لکھی جس کا نام "غریب الحدیث" تھا۔ یہ کتاب لندن میں تا حال محفوظ ہے۔

اول اول عرب اپنی کتابوں کو چھوٹی چھوٹی خوبصورت چیزوں اور نوع بنوع پھولوں کی تصاویر سے مزین و مرصع کرتے تھے۔ پھر جانوروں کی تصویریں بھی بنانے لگے۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہونچی کہ پیکر انسانی کے نقوش بھی لوازمات ترصیع و تزئین میں شامل کر لیے۔ اس امر سے قطع نظر وہ فن خطاطی میں بھی اپنا بدل نہ رکھتے تھے۔ اس فن کے عروج و ترقی کی خاطر انھوں نے غیر معمولی دیدہ ریزی اور دماغ کاوی سے کام لیا اور خطاطی کی معراج کمال محض ان کی مساعی جمیلہ اور محنت شاقہ کی منت کش ہے۔ ابن مقلہ اور ابن البواب فقید المثال خطاطوں اور خوشنویسوں میں سے تھے۔ ان کی شہرت کا ڈنکا چہار دانگ عالم میں بجتا تھا۔ جلد بندی عربوں کی ایک محبوب تفریح تھی۔ ہر مذہب عرب اس سے دلچسپی لینا باعث مسرت اور تفنن طبع خیال کرتا تھا۔ ایک مجلد کتاب کا حصول ایک خزینۂ گراں بہا کی دستیابی سے کم تصور نہ کیا جاتا تھا۔ کتابوں کی جلدیں سیم و زر کے منقش اور اور حریر و پرنیہ کے ٹکڑوں سے باندھی جاتی تھیں۔ اسکاٹ اپنی کتاب "موروں کی حکومت یورپ میں" میں رقمطراز ہے کہ غرناطہ کا کتبخانہ جل کر خاکستر ہونے کے بعد فرڈی ننڈ کو مجلد کتابوں سے تین سو تیس پاؤنڈ سونا اور چاندی ملے تھے۔ ترکوں نے فن اشاعت کتب میں جو ترقیاں کیں، ان کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ ایف۔ آر مارٹن اپنی مشہور کتاب "ہندوستان[1] ایران اور ترکی کے مصور اور ان کی مصوری" میں خامہ فرسا ہے کہ بائسنقر نے کتابوں کے نشر و اشاعت کے لیے بہت سے ہمہ گیر اور جامع طریقے وضع کیے تھے اور بعض باہمی خصوصیات کی بنا پر اس کا مقابلہ فرانس کے ریشنے سے کیا جا سکتا ہے۔ ۲۱۰ کی مجلد کتابوں کے چمڑوں سے جنھیں قاہرہ میں حبشیوں نے برباد کر دیا تھا، بے شمار چپلیں بنائی گئیں۔

ان کتابوں کی عظمت و قعت کا اندازہ ان خطیر و کثیر رقموں سے لگایا جا سکتا ہے جو ان کی خرید پر ادا کی گئیں۔ یہ بہرہ ابن دریدؔ نامی کتاب جو اپنے نفس مضمون کے لحاظ سے کچھ زیادہ مبسوط و وقیع نہ تھی ۵۶۶ھ میں ساٹھ دینار[2] پر فروخت ہوئی۔ خلیل ابن احمد کی ایک کتاب پچاس دینار کو بکی۔ قرطبہ کے الحکم نے "کتاب الاغانی" کو ایک ہزار دینار کے عوض یعنی سات ہزار روپیہ میں خریدا تھا۔

---

[1] "ہندوستان، ایران اور ترکی کے مصور اور ان کی مصوری" مصنفہ ایف۔ آر مارٹن صفحہ ۹۸ [2] ایک دینار قریباً سات روپیہ کے برابر تھا

ممالک اسلامیہ میں مختلف قسم کے کتب خانے قائم تھے۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) شاہی کتب خانے (۲) تعلیمی کتب خانے (۳) ذاتی کتب خانے اور (۴) مسجدی کتب خانے۔

شاہی کتب خانے عموماً حکمرانِ وقت یا شاہی خاندان کی زیرِ سرپرستی رہتے اور ان کے جملہ اخراجات کی کفالت شاہی خزانے سے کی جاتی تھی۔ اس قبیل کے کتب خانوں میں بغداد میں عباسیوں کے شاہی کتب خانے، مصر میں فاطمی کتب خانے، اندلس میں امیہ کتب خانہ، سمرقند میں ابو سعید کا چغتائیہ کتب خانہ اور ہندوستان میں مغلوں کے شاہی کتب خانے عالمگیر شہرت کے مالک تھے۔

بغداد میں سب سے بلند مرتبہ اور شاندار کتب خانہ "بیت الحکمت" تھا جسے ہارون اور مامون نے قائم کیا تھا (۱۷۰ھ تا ۲۱۸ھ) "بیت الحکمت" معتصم کے وقت تک جاری رہا (۲۲۳ھ) "مدرسہ مستنصریہ کتبخانہ" کو ۶۳۱ھ میں خلیفہ مستنصر باللہ نے قائم کیا اور یہ کتبخانہ بھی کتبخانہائے اسلامیہ میں کافی اہم تھا۔

قاہرہ میں ایک مشہور کتبخانہ جامعہ ازہر سے ملحق تھا جسے العزیز فاطمی نے ۳۶۵ھ میں بنوایا تھا۔ مصر میں بھی ایک شاندار کتبخانہ تھا جو فاطمیوں کے زیرِ اہتمام نہایت سرگرمِ کار تھا۔ ۵۶۷ھ میں اسے صلاح الدین نے تباہ کر دیا۔

غزنی میں سلطان محمود نے اپنا عظیم الشان کتب خانہ "عروس الجنت" نہایت اعلیٰ پیمانے پر جاری کیا تھا جس سے البیرونی، فارابی، بیہقی اور عتبی جیسی مقتدر و محترم ہستیاں وابستہ تھیں۔ رَے اور اصفہان کے کتب خانوں کی بربادی دنیا ہی کے لیے سلطان محمود نے وہاں کی جملہ محفوظات اپنے کتب خانے میں منتقل کرا لیے۔

فرز (مراکش) میں سلطان یعقوب بن عبدالحق (۶۸۵ھ تا ...) نے ایک قابلِ قدر کتب خانہ "مدرسۃ الصفارین" کے نام سے قائم کیا تھا۔

شیراز میں عضدالدولہ ایک نہایت عمدہ کتب خانہ رکھتا تھا جو جدید طریقوں پر آراستہ و پیراستہ تھا۔

سلطان نوح بن منصور نے ایک نہایت جلیل المرتبت کتب خانہ قائم کیا تھا جس کا ناظم بوعلی سینا جیسا حکیم و فیلسوف تھا۔

قرطبہ (اندلس) میں الحکم اور المعزیز نے حیرت انگیز کتب خانے قائم کیے تھے جن میں بے شمار گرانقدر کتابیں موجود تھیں۔ اپنی وسعت و جامعیت کے اعتبار سے وہ کتب خانے بلادِ اسلامیہ میں اپنی مثال نہ رکھتے تھے (۳۲۹ھ تا ۳۹۶ھ)

ہندوستان میں فتح پور سیکری، آگرہ اور دہلی کے شاہی کتب خانے دنیا بھر میں مشہور و معروف تھے۔ گجرات میں اعتماد خاں کے کتب خانہ کے تذکرے سولہویں صدی کے کتب و کاغذات میں جا بجا پائے جاتے ہیں جس سے اس کی شہرت و اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر این این لاء نے اپنی کتاب "مسلم ہند میں ترقی تعلیم" میں دورِ مغلیہ کے کتب خانوں کی ایک طویل فہرست پیش کی ہے۔

بادشاہوں کی تقلید میں وزرا اور امرا بھی کتب خانوں سے کافی دلچسپی لیتے تھے۔ ان میں سے بہتوں نے اپنے ذاتی کتب خانے بھی قائم کیے کتابوں سے اس کی محبت بشیفتگی قابلِ رشک تھی۔ ایسے لوگوں میں ابوالفضل (وزیر صلاح الدین) صاحب ابن عباد (سامانیہ) ابوالقاسم ابن الامر (وزیر مجد الدولہ) نظام الملک (وزیر سلطان الپ ارسلان سلجوقی) عبدالرحیم خان (امیر دربار اکبر و جہانگیر) کے اسمائے گرامی خاص طور پر روشن اور نمایاں تھے۔

فتح ابن خاقان، قاضی اسمٰعیل بن اسحاق (بغداد) علی بن یحییٰ (کرخ نزد بغداد) قاضی اکرام (حلب) کے شخصی کتب خانے اسلامی

تمدن و ثقافت کی تاریخ میں ممتاز و ممیز مراتب کے حامل تھے ۔ ہر مورخ، شاعر اور ناقد حسب الاستطاعت اپنا ذاتی کتب خانہ رکھتا تھا ۔ قرطبہ کے قاضی ابو مطارف کے کتب خانہ کی مالیت کا اندازہ قریب قریب چالیس ہزار دینار کے لگ بھگ تھا ۔ اس کتب خانہ میں چھ محرر ہر وقت مصروف کار رہتے تھے ۔ حلب میں قریباً ہر معزز شخص اور خاندان اپنا ذاتی کتب خانہ رکھتا تھا ۔

تواریخ اسلام میں پبلک کتب خانوں کا ذکر بھی اکثر نظر سے گزرتا ہے ۔ صرف بغداد میں کم سے کم چھتیس کتب خانے ہلاکو خاں کے دستبرد کے شکار ہوئے ۔ بصرہ کے کتب خانہ "ابن السراج" کو جو ۳۸۳ھ میں بدوؤں کے ہاتھوں غارت ہوا، عوام نے قائم کیا تھا ۔

ہر مسجد میں ایک غیر سرکاری کتب خانہ ہوتا لازمی تھا جس کا نظم و نسق عام طور پر امام مسجد کے ذمہ ہوتا تھا ۔ بغیر کتب خانہ کے کوئی مسجد مکمل تصور نہ کی جاتی تھی ۔ ایسے کتب خانوں میں بالعموم [illegible] کتابیں رکھی جاتی تھیں ۔ قرآن، حدیث، تفسیر اور فقہ کے علاوہ مذہبیات سے متعلق دوسری ضروری کتابیں جو ہر وقت دستیاب ہو سکتی تھیں ۔

کتب خانہ کی ترتیب :۔ مرو [illegible] کے کتب خانہ کا بیان جسے عبدالحق (۵۰۳ھ تا ۵۶۲ھ) نے "مدرسۃ الصفا رئین" کے طرز پر قائم کیا تھا، یہاں خالی از دلچسپی نہ ہوگا ۔ کتب خانے میں مختلف موضوعات کے لیے مختلف کمرے تھے ۔ کتابیں الماریوں اور لکڑی کے خانوں میں رکھی جاتی تھیں ۔ طلبہ اور شائقین مطالعہ کے لیے علیحدہ علیحدہ کمرے تھے ۔ نقل نویسی، بزم مذاکرہ اور موسیقی کے کمرے بھی الگ الگ بنے ہوئے تھے ۔ موسیقی کا کمرہ خاص طور پر [illegible] رہتی تھی ۔ کھڑکیوں پر پردے لگے رہتے تھے ۔ میزیں استعمال نہ کی جاتی تھیں ۔ محرر کتابوں کی نقل یوں کرتے کہ بائیں ہاتھ [illegible] اور داہنے ہاتھ سے قلم چلاتے تھے ۔ کتب خانوں کے طول و عرض کی تفصیل ابوالحسن بن محمد الشاباشی کے بیان سے خوب واضح ہوتی ہے ۔ عام طور پر ایک ایک کتب خانہ میں چالیس چالیس کمرے ہوتے تھے ۔ اس سلسلہ میں مشہور مورخ مقدسی یوں تحریر کرتا ہے "شیراز میں عضد الدولہ کا کتب خانہ دیکھا ہے ۔ کتب خانہ کی عمارت نہایت شاندار ہے جس میں چھتیس کمرے ہیں ۔ کتب خانے کے گرد اگرد ایک خوبصورت نہر بہتی ہے ۔ چھتوں کی بلندیوں پر گنگورے آویزاں ہیں اور راستے اتنے خوشنما ہیں کہ کتب خانے کے قدرتی مناظر میں چار چاند لگ گئے ہیں ۔ کتب خانے میں ناظمین، کاتب اور دوسرے ضروری عملے موجود رہتے ہیں ۔ فہرس کتب میں کتابوں اور [illegible] نام باضابطہ درج ہیں ۔"

کتابوں کی ترتیب [illegible] سے کی جاتی تھی ۔ مصنفوں اور کتابوں کے نام سنہری حروف میں کندہ کیے جاتے تھے ۔

کسی کتب خانہ کا عملہ علی العموم حسب ذیل افراد پر مشتمل ہوا کرتا تھا ۔

(۱) ناظم کتب خانہ (۲) کاتب (۳) نگراں[۱] (۴) نقل نویس ۔

کتب خانوں کے افتتاحی جلسوں کی روئدادیں اکثر اوراق پارینہ میں ملتی ہیں ۔ بقول مقریزی قاہرہ کے کتب خانہ "دارالحکمت" کی افتتاحیہ تقریب میں کم و بیش دنیا کے ہر حصہ سے علماء و فضلاء نے شمولیت کی تھی ۔

کتب بینی کے لیے سہولتیں :۔ علی بن یحییٰ المؤذن نے ایک ذاتی کتب خانہ "خزانۃ الحکمت" بغداد کے نزدیک کرخ میں قائم کیا تھا جہاں طلبا کو غیر معمولی مراعات میسر تھے ۔ مطالعہ کی مدت تک طالبعلموں کے قیام و طعام کا انتظام کتب خانہ کے ذمہ ہوتا تھا ۔

---

[۱] ایک حبشی خاتون سمرقوینق بغداد کے "دار العلم" کے صیغۂ نقل نویسی کی نگراں تھی یہ رسالۃ الخطرانیہ از المصری صفحہ نمبر ۲ ہے ۔

علاوہ بریں "خزانۃ الحکمت" میں دوات قلم اور کاغذ وغیرہ مفت مہیا کیے جاتے تھے۔

"علماء و فضلا کے استفادہ کے لیے نایاب و نادر کتابیں شاہی خزانے سے خرید کر قاہرہ کے کتب خانہ "دار الحکمت" میں فراہم کی جاتی تھیں" یہ بیان نامور مورخ مقریزی کا ہے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

معمولی ضمانتوں پر کتب خانوں سے کتابیں عاریتاً بھی دی جاتی تھیں۔ مورخ یاقوت نے لکھا ہے کہ "میں نے بغیر کسی ضمانت کے تقریباً دو سو دینار کی کتابیں "الدماریہ" (مراقس) سے عاریتاً لی تھیں"

نادر الوجود کتابوں کی نقلیں اتارنے کی عام اجازت تھی۔ سنہ ۲۷۵ء میں بصرہ اور کوفہ سے اصحاب علم و فضل فتح ابن خاقان کے کتب خانہ میں کتب بینی اور نقل نویسی کی خاطر جایا کرتے تھے۔

کتابیں کیسے حاصل کی جاتی تھیں:۔ (۱) تقریباً تمام مصنفین کتابیں خود اپنے لیے لکھتے تھے۔ یہی حال شاعروں کا بھی تھا مصنفین اور مصورین اپنے کتب خانے آپ رکھتے تھے۔

۲۔ دوکانوں سے کتابیں خریدی جا سکتی تھیں۔ عرب میں کتابوں کی دوکانوں کا پتہ پہلی ہجری کے اوائل ہی سے لگتا ہے۔ المہلبی نے اپنے لڑکے کو ہدایت کی تھی کہ دوران سفر میں ان دوکانوں میں قیام کرے جہاں کتابیں فروخت ہوتی ہوں۔ سنہ ۳۷۳ھ میں صرف شہر بغداد میں کم و بیش کتابوں کی ایک سو دوکانیں تھیں جن میں سے اکثر مساجد سے متصل تھیں۔ شاعر الخطیری کی ایک بہت بڑی کتابوں کی دوکان تھی اور اسی وجہ سے اسے "داعی الکتب" کہا جاتا تھا۔

(۳) نیلام میں بھی کتابیں بیچی جاتی تھیں۔ یہ طریقہ عام طور پر مروج تھا۔ کتابوں کی قیمتیں معین نہ تھیں۔ کتابوں کی قیمتوں کا انحصار زیادہ تر مصنفین و مضامین کتب کی قدر و منزلت پر ہوتا۔ قیمتوں کے تعین میں اکثر و بیشتر حالات میں اٹکل سے کام لیا جاتا تھا۔ صلاح الدین نے جب مصر کے فاطمی کتبخانے کو تہس نہس کر دیا تو اس کی کتابوں کو ترک ہفتہ میں دو بار سر بازار نیلام کرتے تھے۔[1]

(۴) کتابیں بضمانت اور بلا ضمانت عام طور پر عاریتاً دی جاتی تھیں۔

(۵) فاتح کتابوں کو مال غنیمت کے طور پر لوٹا کرتے تھے۔ سلطان محمود غزنوی نے نیشاپور کے عظیم الشان کتبخانہ کو لوٹ کر ۱۰۲۲ء میں غزنی منتقل کر دیا۔ سلطان محمود نے متھرا کا ایک کتبخانہ بھی اسی طرح غزنی منتقل کیا تھا۔ گجرات کے تاراج ہونے کے بعد اعتماد خان کا مشہور کتب خانہ حکومت مغلیہ کے پایہ تخت میں لے جایا گیا۔

(۶) اہل ثروت کتب خانوں کو کتابیں بطور عطیہ کے دیتے تھے۔ الفاضل عبدالرحیم نے اپنی ساری کتابیں کے کتبخانہ "مدرسہ فاضلیہ" کو وقف کر دی تھیں۔

(۷) طرابلس کا حکمران خلیفہ الحکم نے نادر و نایاب کتابوں کی خریداری کی غرض سے اپنے ادیبوں کو تمام اکناف عالم میں روانہ کیا تھا۔

حکمار بطور ناظمین کتبخانہ:۔ کتابوں کی قیمت عہد عتیق کے حکما و فضلا کے نزدیک سیم و زر اور مسکوک و نقود سے زیادہ قدر و قیمت رکھتی تھی۔ جب حکومت ایران نے صاحب ابن عباد کو عہدہ وزیری پر مامور کرنے کی خواہش ظاہر کی تو انھوں نے اس شاہانہ پیشکش کو محض اس بنا پر قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ ان کے سامنے کتابیں شاہی خزانوں اور بھاری بھاری تجوریوں سے بہت زیادہ وزنی اور بیش بہا ہیں۔ انھوں نے صرف الہیات سے بحث کرنے والی کتابوں کا ایک اتنا زبردست ذخیرہ جمع کر لیا تھا کہ اس کا بوجھ چار سو اونٹوں کے بوجھ

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ جلد ۳۔ صفحہ ۴۷۵

سے کم نہ تھا۔

(۱) علی ابن محمد الشاسطی مصر کے خلیفہ فاطمیہ العزیز کا ناظم کتبخانہ تھا (۴۱۹ھ) (۲) ابن مسکاویہ بغداد کے ابو الفضل ابن العمید کے کتبخانہ کا ناظم تھا (۴۲۱ھ) (۳) بو علی سینا مشہور فلسفی، بخارا کے نوح بن منصور کا ناظم کتب خانہ تھا (۴۲۸ھ) (۴) ابن السعید بغداد کے مستنصریہ کتب خانہ کا ناظم تھا (۶۴۲ھ) (۵) بڑے بڑے حکما عصر مثلاً نظام الملک، سعدی، عمر خیام اور حسن بن صباح جیسی شہرہ آفاق ہستیاں نیشاپور کے سب سے بڑے کتب خانہ "جامعہ نظامیہ" سے ہمیشہ وابستہ و متعلق رہیں۔

عام موضوعات کتب:- (۱) مذہبیات۔ صرف طرابلس کے کتب خانہ میں قرآن مجید کی تیس ہزار اور تفاسیر کی اسی ہزار جلدیں موجود تھیں[۲] (۲) فلسفہ و فقہ (۳) تاریخ (۴) ریاضیات و فلکیات (۵) طب اور (۶) قدرتی سائنس۔

کتب خانوں میں کتابوں کے اعداد و شمار:- ازمنہ قدیم میں رسل و رسائل کی سہولتیں نہ تھیں۔ کاغذ بہت کمیاب اور بہت گراں تھا۔ کتابوں کی قیمتیں مقرر نہ تھیں۔ تمام کام ہاتھ سے کیے جاتے تھے۔ کلیں نہ تھیں۔ نتیجہ کے طور پر شروع شروع کتب خانوں میں کتابوں کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی۔ مگر جوں جوں وقت گذرتا گیا، تہذیب و تمدن میں بھی ترقی ہوتی گئی۔ تہذیب و ثقافت کے عروج کے ساتھ ساتھ شاعروں اور ادیبوں کی تعداد بھی روز بروز افزوں ہونے لگی۔ نیز حکمرانوں کی سرپرستی اور امرا کی علمی دلچسپی نے کتبخانوں کی تعداد بڑھانے میں ہر درجہ ممد و معاون ثابت ہوئی۔ بعض کتب خانوں میں کتابوں کی اتنی بھاری تعداد موجود تھی کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ "دار العلم" میں ایک لاکھ کتابیں موجود ہیں جو دنیا کے تمام موضوعات و مضامین کو محیط تھیں

قرطبہ میں العزیز کے کتب خانہ میں چار لاکھ کتابیں تھیں جن میں اٹھارہ ہزار کتابیں صرف فلسفہ سے متعلق تھیں۔ اس کتب خانہ کی تباہی کے بعد صلاح الدین نے اپنے وزیر ابو الفضل کو بارہ ہزار کتابیں بطور تحائف کے دی تھیں۔

طرابلس کا کتبخانہ اتنا بڑا تھا کہ بیک وقت ایک سو اسی محرروں کو کام کرنا پڑتا تھا۔ ان میں سے تیس ہمہ دم کتب خانہ میں موجود رہتے تھے

کتب خانے کیسے تباہ ہوئے؟:- کتب خانوں کی تباہی و بربادی کے حسب ذیل اسباب و علل ہیں۔

(۱) غفلت و عدم توجہی، (۲) فرد منت (۳) آتشزدگی (۴) جنگ (۵) لوٹ کھسوٹ اور (۶) مذہبی عصبیت۔

کتب خانوں کی تباہی کی اولین وجہ غفلت شعاری اور لاپرواہی تھی۔ علاوہ ازیں کتب خانوں کے قیام و ترقی کے باب میں تمام سلطان یکساں پرجوش و مستعد نہ تھے۔ مسلمانوں کے سیاسی تفوق و اقتدار کے انحطاط پذیر ہونے پر انہیں کتب خانوں کی فلاح و بہبود کی طرف توجہ مبذول کرنے کا موقعہ نہ ملا۔ خانہ جنگی اور تخت و تاج کے لیے باہمی مناقشے بھی کتب خانوں کے حق میں سم قاتل ثابت ہوئے۔ سیراز کا کتبخانہ محض تغافل شعاری اور بے توجہی کے باعث صفحۂ ہستی سے محو ہو گیا۔

الوولیش (وزیر حشام) نے محض اپنی مذہبی عصبیت سے اندھا ہو کر قرطبہ کے الحکم کے قائم کردہ کتبخانہ کی وہ کل کتابیں جو فلسفہ اور سائنس کے مضامین پر روشنی ڈالتی تھیں نذر آتش کرا دیں۔ ابن سعید اس حادثہ فاجعہ کی داستان "طبقات الامم" میں نہایت موثر اور درد انگیز پیرایہ میں بیان کی ہے

بنو عباس

کہ کتب خانے جو طرابلس میں تھے انہیں عیسائیوں نے تباہ کر دیئے۔

---

[۱] صلاح الدین نے جب نوح بن منصور کا کتب خانہ جلا دیا تو بو علی سینا نے تمام کتابیں اپنی یادداشت کی مدد سے دوبارہ لکھیں۔ خدا بہتر جانے۔

۱۹۲۲ء ... ۱۵۰

قرطبہ میں شاہ ہشام دوم کی کمزور حکومت کی دوران میں، اس کے وزیر منصور بن امر نے فلسفہ و منطق کی بہت سی کتابیں کنویں میں ڈلوا دیں۔ باقی ماندہ کتابوں کو آگ میں پھنکوا دیا۔ اندلس کے کتب خانے عیسائیوں نے برباد کیے۔

مصر کا فاطمی کتب خانہ متعدد بار غارت کیا گیا۔ آخر میں صلاح الدین نے اس پر حملہ کیا اور اس کی ساری کتابیں نیلام کروا دیں

قاہرہ کے شاہی کتب خانوں کو حبشی غلاموں نے نیست و نابود کر دیا۔

بغداد میں عباسیوں کے کتب خانے ترکوں کے ہاتھوں معدوم ہوگئے۔

بصرہ کے ابن السرات کے کتب خانہ کو بدوؤں نے غارت کر دیا۔

بغداد کے صابرین اردبشیر کے مشہور کتب خانہ کو تغرل سلجوقی نے آگ لگا دی۔ ہلاکو خاں نے بھی بغداد کے بہت سے کتب خانے جلا دیے۔ ۵۴۹ھ میں غز ترکوں نے نیشاپور کے کتب خانہ کو تباہ کر دیا۔

اب قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس زمانہ شور و ہنگام میں مسلمانوں کو اتنا سکون دماغ اور اطمینان قلب کیسے میسر ہوا کہ انھوں نے اتنی کتابیں تصنیف کیں۔ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ خانگی زندگی بھی سیاسی انتشار و خلفشار سے اپنا دامن نہ بچا سکی تو مسلمانوں کے بہت سے تعلیم یافتہ اور مہذب افراد آئے دن کے ہنگاموں اور مناقشوں سے عاجز آکر خانقاہوں میں عزلت نشیں ہوگئے اور اسی طبقہ میں بڑے بڑے صوفی اور درویش گزرے ہیں۔ گوشہ نشینی میں ان کا خاص شغل فلسفہ و تصوف کی ترقی و اشاعت تھا۔ یہ بات مسلمانوں کے حق میں ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ انھوں نے قرآن مجید کی تفاسیر و تاویلات کے ضمن میں مذہبی ادبیات کا ایک وافر ذخیرہ مہیا کر دیا۔ علاوہ اس کے مسلمانوں نے رومیوں، یہودیوں، اور یونانیوں کی تہذیب و ثقافت سے کافی فائدہ اٹھایا تھا۔ مکہ، مرکز کو کہتے ہیں چنانچہ مکہ قرب و جوار کے لوگوں کے اجتماع کا مرکز تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں نے آزادانہ طور پر ان لوگوں کی تہذیب و معاشرت سے وہ چیزیں اخذ کرلیں جو نفع بخش اور سودمند تھیں اور ان کو اپنے رنگ میں رنگ کر دنیا کے سامنے ایک نئے انداز میں پیش کیا۔

نوشتہ۔ ایم۔ ایل رائے۔ چودھری۔ ساشتری - ترجمہ افسر ماہ پوری

بادۂ کہن

ہنسی جو دے گُہرِ شاہوار کی تسبیح — پڑھے عقیق بھی پروردگار کی تسبیح
نہیں ہیں تاک پہ پھیلے یہ خوشہ انگور — ہے دستِ نامیہ میں بادہ خوار کی تسبیح
پڑھ رہی ہیں چمن میں ہرے مصلّوں پر — خدا کی یاد میں کلیاں بہار کی تسبیح
شباب آتے ہی حجرہ رہا نہ وہ خلوت — بکی شراب کے ہاتھوں انار کی تسبیح
عیاں ہے پُتلیوں کے دو سیاہ دانوں سے — کہ پھیرتی ہے نگہ انتظار کی تسبیح
ہزار بار یقیں ہے مَلَک درود پڑھیں — عطا کرے جو وہ گل باسی ہار کی تسبیح
لیے خیال میں اُس لب کے گن کے سو بوسے — پڑھی دل نے محبت سے پیار کی تسبیح
نہیں چمن میں گلوں پر یہ قطرۂ شبنم — بکھر پڑی ہے کسی گل عذار کی تسبیح
بچھا رہا ہے فلک کہکشاں کا سجادہ — نجوم پڑھنے کو ہیں روزگار کی تسبیح
نظر میں اس کی ہمیشہ چنے کے دانے ہیں — حقیقتہً ہے یہی روزہ دار کی تسبیح
فراق یار میں عاشق کا ڈھل چلا منکا — قریب ختم ہے اب جسم زار کی تسبیح
تمام ہوتے ہی انساں کو ہے ملا دیتی — خدا سے، زندگی مستعار کی تسبیح
اُٹھے بچھونوں سے سو سو جمائیاں لیتے — پڑھی رندوں نے ابھی خمار کی تسبیح

ہوا ہوں جب سے کہ اُس گل کا مبتلا شہباز
زباں پہ اپنی ہے ہر دم ہزار کی تسبیح

شہباز

ہماری موسیقی

موسیقی ہندوستان میں باقاعدہ طور پر تقریباً تین ہزار برس سے جاری ہے۔ مگر ہماری بدقسمتی سے جن لوگوں کے ہاتھ میں یہ فن ہے وہ تعلیم سے بے بہرہ ہونے کے علاوہ بخل اس درجہ رکھتے ہیں کہ برسوں کے تضیع اوقات کے بعد بھی طالب فن کو اصول نہیں معلوم ہوتے نتیجہ یہ ہے کہ ہماری تعلیم یافتہ جماعت اور خصوصاً شریف طبقہ کے طالبِ فن ایسے استادِ فن کے پاس جاتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ دوسرے یہ استاد کوئی عزت نہیں رکھتے کہ عالموں کی سوسائٹی میں دخل پائیں اور ان کی مدد سے یہ فن کو علمی حیثیت میں لائیں۔ مسلمان جب ہندوستان میں آئے تو ایک نئی تہذیب۔ اور نئی کلچر اپنے ساتھ لیتے آئے۔ موجودہ ارتقائے موسیقی بڑے حد تک مسلمانوں کی جدت طبیعت کی رہینِ منت ہے۔ گذشتہ پانچ سو سال میں ہمارے نظامِ موسیقی میں اس قدر تبدیلیاں ہوئیں کہ آجکل کے سات سُر بھی قدیم نہیں۔ پھر بھی آپ جب کبھی کسی استاد سے دریافت کریں گے تو وہ آپ کو سند کے لیے کسی پرانی تصنیف مثلاً "رتناکر" "چترڈندی پرکاشں" یا "سارامرت" کا حوالہ دیں گے۔ یہ سب کتابیں سنسکرت میں ہیں اور ہماری موجودہ نظام موسیقی ان میں سے کسی کتاب کے مطابق نہیں۔ میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ ہماری نظام موسیقی میں گذشتہ پانچ سو سال میں اس قدر تبدیلیاں ہوئیں کہ ہمارے آجکل کے سات سُر بھی قدیم نہیں۔ سب سے زیادہ مستند کتاب رتناکر سارنگ دیو پنڈت نے تصنیف کیا تھا۔ آج اگر آپ "رتناکر" کے اصول کے مطابق راگوں کی شکل بنائیں تو ہندوستان کی موسیقی کو بالکل ہی بدلنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ ٹپہ، ٹھمری ترانہ۔ غزل۔ قوالی۔ یہ سب مسلمانوں کے زمانہ کی ایجادیں ہیں۔ جن کا پرانی کتابوں میں کہیں پتہ نہیں ملتا۔ پھر آپ ہی بتائیں کہ ہماری موجودہ موسیقی کا پرانے کتابوں سے کہاں تک تعلق ہے۔ اسی سلسلے میں ایک بات اور قابلِ ذکر ہے کہ مدراس کی طرف ہمارے راگوں سے اختلاف ہے۔ بہت سے راگ جسے ہم ایک طرح گاتے ہیں وہ دوسرے اصول سے گاتے ہیں۔

صرف راگوں میں نہیں بلکہ ہمارے شدہ سُروں میں اور اُن کے شدہ سُروں میں بھی اختلاف ہے۔ ہماری کومل رکھب کو وہ شدہ رکھب مانتے ہیں۔ اور ہماری شدہ رکھب کو وہ شدھ گندھار مانتے ہیں۔ اسی طرح ہماری کومل دھیوت اُنکی شدہ دھیوت ہے اور ہماری شدہ دھیوت اُن کی شدہ نکھاد۔ کہیں گرنتھوں (یعنی پرانے تصانیف) کے لحاظ سے مدراس والے صحیح ہیں اور ہم غلطی پر ہیں۔ مدراسیوں کے شدہ سُر بہت سے گرنتھوں کے مطابق ہیں اور "رتناکر" جو سب سے پرانا گرنتھ اس وقت موجود ہے وہ ان ہی سُروں کو مانتا ہے۔ اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب مسلمانوں نے اس فن کی طرف توجہ کی تو ان کی جدت پسند طبیعت نے اسے روز نئے زیور اور نئے لباس میں آراستہ کرنا شروع کیا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی راگوں کی صورت بدل گئی۔ مدراس کی طرف مسلمانوں نے کم توجہ کی۔ یہاں تک کہ جس زمانے میں ہندوستان میں ہر فن کمال ترقی پر پہنچ چکا تھا۔ شہر دہلی ایک مرکز علم و فن بنا ہوا تھا۔ شاہان ہند کی کرم گستری اور قدرشناسی سے ہند کا ایک ایک چپہ فیضیاب ہو رہا تھا۔ مدراس کا نام کسی سلسلے میں بھی کتابوں میں نہیں ملتا۔ شاید یہی وجہ ہو کہ وہاں کی موسیقی میں تبدیلیاں نہیں ہوئیں۔ بہرحال

جو کچھ بھی ہو جو استادفن ہماری موجودہ موسیقی کو جو ہماری طرف رائج ہے بر اے گرنتھوں کے مطابق بتاتے ہیں وہ غلطی پر ہیں، اگر افکار زمانہ نے فرصت دی تو انشاءاللہ اس موضوع پر آئندہ مفصل بحث کروں گا۔ اس وقت میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ موجودہ نظام موسیقی کہاں تک مسلمانوں کی ممنون احسان ہے اور کس حد تک گرنتھوں کے مطابق ہے۔ پہلے آپ طرزوں کو لیجئے۔ دُھرپد، سادرا، خیال۔ ٹپہ۔ ٹھمری۔ غزل۔ ترانہ۔ قوالی۔ یہ مروجہ طرزیں ہیں۔ دھرپد اور سادرا کے علاوہ جتنی طرزیں ہیں سب مسلمانوں کے زمانہ کی ایجادیں اور ان کا گرنتھوں میں کہیں ذکر نہیں۔ دُھرپد اپنی جگہ سب سے اعلیٰ طریقہ گانے کا ہے۔ لیکن اس کا طرز اس قدر سادہ اور مردانہ ہے۔ اور اس میں گٹکری۔ زمزمہ۔ یا مُرکی کی اجازت نہیں کہ عام مجلسوں میں شاذ ونادر ہی گایا جاتا ہے۔ اس کے گانیوالے معدودے چند اور سننے والے مخصوصے چند۔ عام فہم نہ ہونیکی وجہ سے عام پسند نہیں۔ اس کے بعد "خیال" کا درجہ آتا ہے جو مسلمانوں کی ایجاد ہے اور نہایت دلپسند طریقہ ہے۔ خوبصورت تانوں اور ترکیبوں سے اس کی دلآویزی اور بھی ترقی کر جاتی ہے۔ مضمون عاشقانہ ہوتے ہیں لیکن سنجیدگی کے ساتھ۔ سلطان حسین شرقی اس طرز کا موجد تھا۔ محمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد میں نعمت خاں سدارنگ نے اُسے ترقی کے درجۂ کمال تک پہنچا دیا۔ اور اس کو اس قدر ترقی دی کہ دُھرپد کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ فی زمانہ بھی عام مجلسوں میں جو درجہ خیال کو حاصل ہے وہ اور کسی طرز موسیقی کو نصیب نہیں۔ ٹپہ کو جو وقعت حاصل ہے وہ بھی نواب آصف الدولہ کی بدولت۔ اولاً پنجابی ساربان اس طرز میں ہیر رانجھے کا قصہ گایا کرتے تھے۔ لیکن نواب آصف الدولہ کے دربار میں شوری گوئیے نے اسے اس قدر ترقی دی کہ یہ طرز تمام ہندوستان میں پھیل گیا۔ اب رہا غزل ترانہ قوالی تو یہ سب مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ نئے طرزوں کے ساتھ مسلمانوں سے نئی راگ راگنیاں بھی ایجاد کیں۔ سلطان حسین شرقی نے جونپوری۔ حسینی کانہڑہ، حسینی ٹوڈی ایجاد کی۔ میاں تان سین نے بہت سے نئے راگ بنائے جن میں درباری میاں کی ملار۔ میاں کی ٹوڈی وغیرہ اب تک رائج ہیں۔ امیر خسرو نے۔ غارا۔ سرپردا۔ زیلف کی بنیاد ڈالی۔ اس کے علاوہ لچمن کلیان۔ جنگلہ۔ ینیچ وغیرہ مسلمان اپنے ساتھ لائے۔ اب آپ غور فرمائیں کہ رتناکر آج سے سات سو برس قبل تصنیف ہوئی۔ اس سات سو سال کے عرصے میں کتنی تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔ نئی نئی طرزیں ایجاد ہوئیں اور نئے نئے راگ بنے۔ پھر بھی ہمارے استادفن موجودہ طرز موسیقی اور راگوں کی صحت اور [illegible] کیلئے رتناکر یا اُسی زمانے کی کسی تصنیف کی سند پیش کرتے ہیں۔ [illegible] بریں عقل ودانش بباید گریست۔ اسی سلسلے میں ایک دلچسپ بات یاد آگئی۔ آپ نے بھی شاید یہ سنا ہو گا کہ ہندوستانی موسیقی چھ راگ اور چھتیس راگنیوں پر مشتمل ہے۔ اور مقام افسوس ہے کہ ہمارے یہاں کے بہت سے استاد اب تک اس جہالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ "رتناکر" جس کے متعلق میں پہلے عرض کر چکا ہوں، سات سو برس پہلے تصنیف ہوئی اس میں ان قصے اور حکایات کا کہیں ذکر نہیں بلکہ علمی اصول پر راگوں کے استخراج بیان کیے گئے ہیں اس کے بعد بہت سے گرنتھ، سنسکرت اور فارسی زبان میں مختلف اوقات میں لکھے گئے۔ چترونڈی پرکاشں۔ سارامرت۔ اصول النغمات۔ یہ تمام کتابیں "رتناکر" کے بعد تصنیف ہوئے ہیں لیکن ان میں سے ایک نے بھی چھ راگ اور چھتیس راگنیوں کا قصہ نہیں لکھا۔ بلکہ ہر ایک نے باقاعدہ طور پر راگوں کے مخرج بیان کرنے کی کوشش کی۔ جو صاحب ہندوستانی موسیقی کو چھ راگ اور چھتیس راگنیوں پر تقسیم کرتے ہیں مجھے یہ بتائیں کہ یہ تقسیم کس اصول پر مبنی ہے۔ مضمون طویل ہو گیا اور ایک ضروری بات رہ گئی۔ ہارمونیم کے متعلق بہت سے لوگوں کا اعتراض ہے کہ اس کے بارہ سُر ہماری راگنیوں کے لیے کافی نہیں۔ لہٰذا یہ ساز ہماری موسیقی کے لیے

ناکافی ہے۔ ہمارے بنگال کے مایہ ناز شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کا بھی ایک مضمون اس سلسلے میں میری نظر سے گذرا۔ ٹیگور کی شاعری سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ دنیائے ادب ان کی شاعری کی داد دے رہی ہے۔ لیکن موسیقی کے متعلق اور خصوصاً سُروں کے متعلق جو اظہار خیال انھوں نے فرمایا ہے اسے میں ماننے سے مجبور ہوں۔ انھوں نے ہماری دائرہ موسیقی کو وسعت دینے کی بجائے اور بھی محدود کر دیا۔ شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ آل انڈیا ریڈیو نے بھی ہارمونیم کو بحیثیت ساز ناکافی سمجھ کر الگ کر دیا۔ یہ بحث تو میں بعد میں کرونگا کہ آیا ہارمونیم کے بارہ سُر ہماری موسیقی کے لیے کافی ہیں یا نہیں۔ لیکن آل انڈیا ریڈیو کے اس فیصلہ نے ہماری موسیقی کو سازندوں میں مخصوص کر دیا۔ اور اس طرح اس کے ترقی کے راہ میں بڑی رکاوٹ پیدا کر دی۔ خداوندان آل انڈیا ریڈیو سے میری استدعا ہے کہ وہ ہمارے اس مضمون کو پڑھیں اور غور فرمائیں کہ ان کا فیصلہ کہاں تک درست ہے ہماری مروجہ سپتک کے بارہ سر صدہا برس کے تغیر و تبدل کا نتیجہ ہیں۔ یہاں تک یورپ کی موسیقی میں بھی آج زمانہ میں بارہ سُر سپتک میں مانے جاتے اگلے پنڈتوں نے بائیس آوازوں کو سپتک میں مانا ہے۔ ان آوازوں کو گرنتھوں کی اصطلاح میں سُرتی یا شُرتی کہتے ہیں شرتیوں کے متعلق گرنتھوں میں لکھتے ہیں کہ سرتی ایسی آواز کا نام ہے جو موسیقی کی ضرورتوں کے لیے مفید ثابت ہو اور بآسانی شناخت بھی کی جاسکے۔ بہ آسانی شناخت کی شرط ضروری ہے۔ اب ان سرتیوں میں بعض آوازیں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں ایسی سات سرتیوں کے پنڈتوں نے علیحدہ نام رکھ دیئے، جنہیں سرگم کہتے ہیں، جو مخفف سا، رے، گا، ما کا مخفف ہے۔ ان سات سروں کو اگلے پنڈتوں نے اور آجکل کے عالموں نے شدھ سُر مانا ہے۔ شدھ کے معنے پاک اور خالص کے ہیں۔ علاوہ سات سروں کے پانچ سُر اور بھی سپتک میں مانے جاتے ہیں انہیں وکرت سُر کہتے ہیں۔ انہیں بارہ سروں پر ہماری موسیقی کا دارومدار ہے۔ اس کے علاوہ کسی سُر یا شرتی سے سروکار نہیں۔ ہم منسوخ شدہ راگوں کو نہیں گاتے پھر ہم کو منسوخ شدہ سروں کو استعمال کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آج کل کوئی بھی راگ یا راگنی ایسی نہیں جو ایک بھی سرتیوں پر بندی ہو۔ مینڈ اور سوت میں سرتیاں آجاتی ہیں لیکن راگ کی صحت کے لیے ضروری نہیں۔ اور ان کا استعمال زائد تصور کیا جائیگا۔ سرتیوں کا مصرف موجودہ راگ ودیا میں نہیں ہے اور کسی گرنتھ کے راگ سرتیوں پر بندھے ہوئے ہیں لیکن گانے والے راگ ودیا کے حسن ایسے راگ کہتے ہیں جو سرتیوں پر بندھے ہوئے ہیں یہ اگلی زمانہ منسوخ ہیں اور انہیں مروجہ راگ نہیں کہہ سکتے۔ لہذا جب مروجہ موسیقی میں صرف بارہ سروں کا چلن ہے اور بارہ سر ہماری ہارمونیم میں موجود ہیں اور ان کے علاوہ کوئی سرتی۔ راگ کی صحت کے لیے ضروری نہیں تو اب آپ ہی فرمائیں کہ ہارمونیم ہماری موجودہ موسیقی کے لیے کافی ہے یا نہیں۔ میں بہت شکرگذار ہونگا اگر کوئی صاحب جو بائیس سرتیوں کو موجودہ موسیقی کے راگوں کی صحت کے لیے ضروری سمجھتے ہیں مجھے مندرجہ ذیل سوالوں کا جواب دیں۔

(۱) موجودہ راگوں میں کون سے راگ سرتیوں پر بندھے ہوئے ہیں۔

(۲) بائیس سرتیوں کا مصرف کیا ہے اور کن کن مقام پر ان کے استعمال کی ہدایت ہے۔ اور کیا قاعدہ ان کا مقرر ہے۔

(۳) اگلے نظام موسیقی میں شدھ تان کا کیا مصرف تھا۔

مضمون کافی طویل ہوگیا۔ آئندہ اشاعت میں انشاءاللہ میں موسیقی کے دوسرے پہلوؤں پر روشنی ڈالونگا۔ لہذا اسے اس سلسلے کی پہلی کڑی سمجھئے۔

شہاب الدین خان

فلمستان

سینما اور جواز سینما

سینما کیا ہے؟ بزم دعوت تلقین باطل ہے
یہاں جو بات ہے افسانۂ رنگین باطل ہے

یہاں ہے جام وساقی، ساز ونغمہ، رندی ومستی
یہاں شیریں لبوں پر نغمۂ شیریں دباطل ہے

یہاں ہے شوخ رقاصہ، یہاں رعنا مغنیّہ
یہاں رقص وغنا سرمایۂ تسکین باطل ہے

جوانی سے عیاں عریاں جوانی چھیڑ کرتی ہے
یہاں زاہد بھی صید گیسوے مشکین باطل ہے

یہاں ہر سمت تقویٰ سوز ہی شعلے لپکتے ہیں
یہاں ہر شوخ آتش پارۂ سجین باطل ہے

یہاں طوفاں اُمنڈتے ہیں ہوس کی بیقراری کے
یہاں ہنگامہ آرا شوق بے تمکین باطل ہے

جھلک بھی جلوۂ حق کی یہاں دیکھی نہیں جاتی
یہاں پیش نظر وہ پردۂ سنگین باطل ہے

یہاں مطرب کی حمد ونعت، افسوں دلفریبی کا
یہاں عرفاں سرائی حیلۂ تزئین باطل ہے

جواز فلم کی اب دھن ہے اک رنگین مفتی کو
جو ماہر آشنائے حکمت آئین باطل ہے

پھرا ہے مدتوں وہ گلشن تہذیب مغرب میں
وہ بھونرے پھول کا رسیا ابھی گلچین باطل ہے

جو رہ کر مرے زاہد کی توبہ ٹوٹ جاتی ہے
یہ جو کچھ ہے خمار بادۂ دوشین باطل ہے

سمائی ہیں بہاریں حسن عریاں کی نگاہوں میں
زباں پر نعرۂ مستانۂ تحسین باطل ہے

ملامت کوش بن جانا، ملامت خواہ بن جانا
دورنگی کا یہ شیوہ، شیوہ پیشین باطل ہے

بُتان فلم کا ذوقِ زیارت، حسن نیت سے
الٰہی یہ بھی کیسا جادوئے رنگین باطل ہے

گنہ کے بیج بوئے، نیکیوں کی فصل پیدا ہو
یہ جادوگر کی کھیتی ہے جو سحر آگین باطل ہے

جوانان سعادتمند کو رخصت ہے رندی کی
کہ ناصح خود ہی مست بادۂ نوشین باطل ہے

فریبِ نفس نے پھانسا بڑے صوفی صافی کو
خوشی سے شعلہ زار اب چہرۂ غمگین باطل ہے

زبانِ صدق پر آتی ہیں کذب آمیز تفسیریں
یہی تو ابتدا سے شیوۂ پرکین باطل ہے

عصائے موسوی ردِّ فسوں، گویا تماشہ تھا
یہ تفسیر غلط، تحریف بے تخمین باطل ہے

حقیقت تک ہے مرغِ فکر کی پرواز ناممکن
اگر دل ہی شکار پنجۂ شاہین باطل ہے

مرے اس بے خبر سالک سے جا کر کوئی کہدینا
غلط مسلک پہ چلنا ہی سلوک دین باطل ہے

مری یہ صاف گوئی قابل شکوہ نہیں عارف
کہ ہر اصلاح باطل باعث توہین باطل ہے

(مدینہ)

عارف لکھنوی

REGD. C 2535

JADIDURDU

36, MARSDEN ST. CALCUTTA

قواعد و ضوابط

(۱) رسالہ ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوا کرے گا۔ خریداروں کو چاہئے کہ رسالہ ۱۵ تاریخ تک نہ ملنے پر دفتر سے طلب کریں

(۲) اہل قلم حضرات سے درخواست ہے کہ وہ مضامین مہینے کی ۱۵ تاریخ تک اڈیٹر کے نام بھیجدیں

(۳) مضامین صاف اور شستہ تحریر ہوں

(۴) وہی مضمون پرچہ میں شائع ہو سکتا ہے جو معیار ادب و اخلاق سے گرا نہ ہو۔

(۵) دل آزار و فرقہ دارانہ مضامین شائع کرنا پرچہ کی پالیسی کیخلاف ہے۔

(۶) نمونہ کا پرچہ مفت نہیں بلکہ ۳/ کا ٹکٹ آنے پر بھیجا جائے گا۔

(۷) جواب کیلئے جوابی کارڈ یا اسٹامپ کا آنا ضروری ہے

(۸) خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :- مینجر جدید اردو ۳۶ مارسڈن اسٹریٹ۔ کلکتہ

(۹) کاروباری حضرات اشتہار کیلئے مینجر سے خط و کتابت کریں۔

(۱۰) سالانہ چندہ صرف دو روپیہ (عہ) غیر ممالک کیلئے ۵ شلنگ

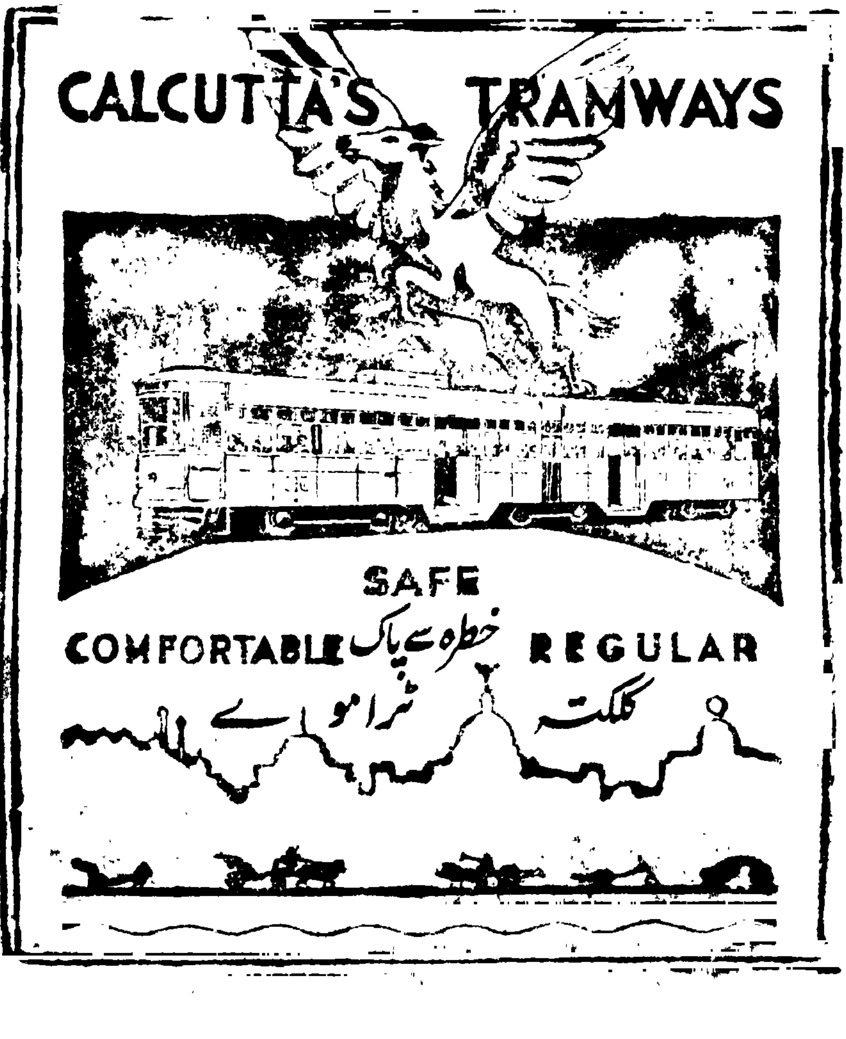
ا ے جلیل ۔ مینجر جدید اردو نمبر ۳۶ ۔ مارسڈن اسٹریٹ ۔ کلکتہ

مشرقی ہندوستان کا ادبی علمی ماہنامہ

جدید اُردو

قیمت فی پرچہ ۳؍

سالانہ چندہ ——— دو روپے


CALCUTTA'S TRAMWAYS
SAFE
COMFORTABLE
خطرہ سے پاک
REGULAR
کلکتہ ٹراموے

مدیر مسئول
پرویز شاہدی
مدیر اعزازی
ایم ظہور احسن قاضی

جدید اردو کلکتہ

نومبر ۱۹۴۳ء

چندہ سالانہ دو روپیہ
ششماہی ایک روپیہ چار آنہ
فی پرچہ ۳/

جلد ۶ | نمبر ۱۱

فہرست مضامین

سرود بیخود

نالہ جولب سے نکلتا ہے وہ اک پیغام ہے
مرکز امید ہے ہرچند دل ناکام ہے

شیخ راضی بررضا ہے برہمن بھی رام ہے
اس کے ابرو کا اشارہ صنعتِ ایہام ہے

کشمکش انگیز آزادی گئی، اچھا ہوا
مطمئن توصید ہے ہرچند زیر دام ہے

ہے شراب تلخ سے شیریں مرا کام ودھن
بس یہی تو اک دوائے تلخیٔ ایام ہے

لے رہا ہے خوب خوب آغاز الفت کے مزے
خوش نہ ہو کیونکر کہ دل ناواقف انجام ہے

تجربے جو تلخ گذرے ہیں وہ کیا بھولیں گے ہم
گو کہ دل خوش کن بہت امید کا پیغام ہے

عمر بھر کھایا کیے دھوکے وفا کے نام پر
بے وفا کہیے کسے دنیا اسی کا نام ہے

حسن کا عالم رہا کچھ اس قدر عالم فریب
عشق ہی سب کی نظر میں موردِ الزام ہے

درس مایوسی نہیں دیتا فریبِ زندگی
رنج اگر ہے چار دن تو ایک دن آرام ہے

اس کا حسنِ خودنما خود ہو گیا عاشق نواز
ہر سحر اک جلوہ ہے ہر شام اک پیغام ہے

اے نگاہِ مست ساقی الغیاث و المدد
آج بیخودؔ پھر شکارِ گردش ایام ہے

عباس علیخاں بیخودؔ

صوبہ بنگال کے مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کو کس طرح غارت کیا جا رہا ہے

مولوی ابوبکر صاحب کا یہ مقالہ ایک اہم ترین موضوع کو ظاہر کر رہا ہے، ان کا خیال درست ہے کہ جب تک ذمہ دار مسلمان اپنی توجہ اردو کی مبذول نہ کریں گے۔ یا کم از کم یہاں کے پرائمری ثانوی اور اعلیٰ تعلیمی نصاب کی کتابوں کو "مسلمانی بنگلہ" میں جو کہ عام طور پر مسلمان گھروں اور مجلسوں میں اب تک رائج اور بولی جاتی ہے، ترتیب نہ دیا جائیگا۔ اس وقت تک مسلمانان ہند سے بنگالی مسلمانوں کا اختلاط مشکل امر ہے اور نتیجہ ظاہر ہے کہ رفتہ رفتہ مسلمانان بنگالہ اپنی تہذیب اور تمدن کو مٹا کر مسلمانان ہند کے لیے ایک عضو معطل اور گونگی اقلیت تو [illegible] جائیں گے۔ موجودہ دور کے رہبران قوم بھی اپنے اپنے دلوں میں تصور کریں کہ اس وقت [illegible] ان کو کن الفاظ میں یاد کریگا اور مسلمانان بنگال کی [illegible] ذمہ دار کون ہوگا۔ ع۔ ج

ایک دن وہ بھی تھا جب سنسکرت داں پنڈت بنگلہ زبان کو پلیچ اور اسور کی زبان کہتے تھے۔ اور بنگلہ زبان میں ادبی پرچے کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ گو اور اور ہندوستانی زبانوں کی طرح بنگلہ بھی اصلاً پراکرت سے نکلی ہے۔ لیکن جس کو بلا شبہ مسلمان سلاطین اور صوبہ داروں کی حمایت و نیز مسلمان ادبا اور شعرا کی کوشش نے اس کی ابتدائی زندگی کو روح بخشی ہے اور اگرچہ موجودہ بنگلہ رسم خط جو دیوناگری سے کچھ علیحدہ ہے مسلمانوں کی آمد کے پہلے سے رائج تھا۔ لیکن مسلمانوں کے عہد حکومت میں بنگلہ تحریرات میں عربی خط کا استعمال زیادہ تر مقبول عام ہوا تھا۔ اب تک صوبہ بنگال کے بہت سے گھرانوں میں ایسی بہت سی تحریریں اور دستاویزیں ملینگی جو عربی خط میں لکھی ہوئی ہیں۔ بنگلہ ساہتیا پبلیشر نے بھی تسلیم کیا ہے کہ انگریزوں کی آمد کے پہلے عربی خط میں بھی بنگلہ لکھنے کا رواج تھا۔ عربی خط میں لکھی ہوئی دو چار بنگلہ نظم کی کتابیں بھی پائی گئی ہیں۔ اسلام آباد کے نامور شاعر "الاول" کا مشہور بنگلہ دیوان عربی خط میں لکھا ہوا ہے۔ اسلام آباد کے بہت سے باشندے اب تک عربی خط میں بنگلہ لکھنے کے عادی ہیں۔ کچھ دن ہوئے وہاں سے عربی خط میں لکھا ہوا ایک ہفتہ وار اخبار "القرآن" بھی شائع ہوا تھا۔ لیکن بنگلہ کے اکثر مسلمان ادبا اور زعما اس تحریک سے بھی بے خبر رہے اور ہیں۔ اسلامی عہد حکومت میں بنگلہ کے تعلیمیافتہ مسلمان اکثر عربی اور فارسی میں ادبی چرچا کیا کرتے تھے۔ اسی لیے ان میں مرزا غالب وغیرہ اردو شعرا و ادبا کی طرح کوئی مشہور مسلمان بنگلہ شاعر یا کوئی نامور مسلمان بنگلہ ادیب پیدا نہیں ہوئے۔ انیسویں صدی عیسوی کے تیسرے حصے تک کوئی تعلیمیافتہ دور اندیش مسلمان کا بنگلہ میں ادبی کارنامہ موجود نہیں ہے۔ اس وقت تک جتنی کتابیں بنگلہ زبان میں لکھی گئی تھیں، ہندو یا نیم تعلیمیافتہ مسلمانوں کی تھیں، اگر مسلمانوں کی عہد حکومت میں اس صوبے کے اکثر تعلیمیافتہ مسلمان بنگلے میں ادبی چرچا کرتے تو ضرور فارسی اور اردو کی طرح اس میں بھی عربی خط کا استعمال پایا جاتا۔ لیکن ملک بنگالہ کے تعلیمیافتہ مسلمانوں کی تنگ دلی و تنگ نظری اور بے توجہی کی وجہ سے ایسا نہیں ہوا۔

بنگلہ زبان کے لیے عربی خط نہ ہونے کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ سرامپور کے نصرانی مشن نے بنگال کے باشندوں میں جن میں عموماً موجودہ بنگلہ رسم خط کا استعمال پایا جاتا ہے۔ دینی اشاعت کے لیے بنگلہ (موجودہ) خط کا استعمال پسند کیا کرتے اس لیے شروع سے سرامپور نصرانی مشن اور انگریزی حکومت موجودہ بنگلہ خط کی حمایت کرتی رہی ہے۔ ٹائپ پرنٹنگ کی ایجاد کے ساتھ ساتھ سرامپور مشن نے بنگلہ خط میں ٹائپیں بنوائیں کتابیں لکھیں اور بہت سے رسالے بھی چھپوائے اس طرح ہم بنگال کی انیسویں صدی کی تاریخ سے معلوم کر سکتے ہیں کہ اسلامی تہذیب سے نکل کر جداگانہ قومی حیثیت اور ایک الگ ادبی رخ پیدا کرنے میں سرامپور مشن اور حکومت ہر طرح سے بنگالی ہندوؤں کی تائید کر رہی ہے۔ موجودہ

بنگالی قومیت اور بنگلہ ادب اور انگریزی حکومت اور نصرانی مشن کی بنائی ہوئی ہے۔ فارسی قواعد کے ساتھ ہر جہت سے مشابہت کے باوجود منتظمین فورٹ ولیم کالج نے سنسکرت داں پنڈتوں کو بلا کر سنسکرت کے سانچے میں بنگلہ قواعد کی کتابیں لکھوائیں۔ اصلی بنگلہ جس میں زیادہ تر ہندوؤں کی تصنیفات ہیں "مسلمانی بنگلہ" کہلانے لگی اور حکومت کی توجہ اور خوش نگاہی سے محروم رہی۔ ادھر اس نئی زبان کو جس کو اس وقت لوگ پنڈتی بنگلہ کہتے تھے حکومت سے ہر قسم کی تائید ملنے لگی اور یونیورسٹی کے درس میں بھی، سے شامل کر لیا گیا، سولین (معضلمہ) بنگلہ سمجھ کر اس کو ہی پڑھنے لگے۔ بہت سے حاتم دل انگریزی کی شخصی حمایت بھی اس نے پائی، اور چونکہ اس وقت ہندوؤں میں تعلیم بھی بڑھ گئی تھی اور حکومت کی پالیسی بھی اس وقت ہندوؤں کی ترقی کی حامی تھی۔ اس لیے اس نئی پنڈتی بنگلے کو ہر طرح سے پھولنے اور پھلنے کا موقع ملا۔ اس زبان میں بڑے بڑے ادیب اور شاعر نکلے۔ بنگالی ہندوؤں میں نئی قومیت کا احساس اس کی مقبولیت کا ضامن بنا۔ عام فہم نہ ہونے کی سبب سے پہلے پہل کچھ دن تک یہ لوگوں کے نزدیک ناپسند رہا۔ "ودیا ساگر" وغیرہ اس زبان کے بانی تھے۔ مگر چونکہ ایسی عارضی زبان کا مقبول عام ہونا دشوار تھا۔ اس لیے بنکم چندر وغیرہ ادبا متاخرین نے غیر معروف سنسکرت کی بجائے عام فہم سنسکرت اور پراکرت کے استعمال سے اس کو مقبول عام کرنے کی کوشش کی اور ان مشاہیر ادب کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ عربی اور فارسی کے الفاظ جہاں تک ممکن ہو سکے استعمال نہ ہونے پائے اور خود بھی اس سے احتراز کیا اسلیے ادبی بنگلے کو ہمیشہ کے لیے قومی بنگلے سے جدا رہنا پڑا۔ اصلی بنگلہ زبان، جو اس وقت مسلمانی بنگلہ کہلانے لگی ادبی کارنامے اس کے بند ہو گئے۔ نئے تعلیمیافتہ مسلمان اپنی مادر زبان کو چھوڑ کر پنڈتی بنگلے میں داد ادب دینے لگے اور ان کو اس بات کا بھی یقین ہو گیا کہ بنگلہ تحریر میں عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال بالکل نادرست ہے۔ اس سے بنگلہ بنگلہ نہیں رہتی۔ چنانچہ "بشاد سندھو" وغیرہ اس زمانہ کے مسلمانوں کی تمام تصنیفات میں عام فہم معمولی عربی، فارسی الفاظ سے تکلفی احتراز موجود ہے اور غیر معمولی سنسکرت الفاظ کی اکثریت بھی پائی جاتی ہے۔ اب تک بنگلہ زبان میں مسلمان ادیب اپنی تحریروں میں عربی فارسی الفاظ کے استعمال سے ڈرتے ہیں جن کو وہ ہمیشہ اپنے گھروں میں بولتے ہیں اس پر بھی یہ اثر ہوا کہ مسلمان اپنے کو ادبی میدان میں ہندوؤں سے کمتر سمجھنے لگے ہیں نئے الفاظ بنگلہ علمی اصطلاح کے لیے ان کو ہندو سنسکرت داں پنڈتوں کا محتاج رہنا پڑتا ہے۔ یونیورسٹی پریبھاشا کمیٹی (علمی اصطلاح کمیٹی) میں بھی صرف ہندو پنڈت جگہ پاتے ہیں۔ لیکن قاضی نذر الاسلام صاحب نے اس حالت کو کچھ بدل دیا ہے۔ اب ان کے پیرو معمولی عربی فارسی الفاظ کے استعمال سے نہیں ڈرتے۔ لیکن اب تک بنگال کے عام مسلمان ادیبوں میں ہندوؤں کی وہ غلامانہ اطاعت اور وہ سنسکرت پسندی جو میر مشرف حسین صاحب کے وقت سے شروع ہوئی تھی نہیں گئی۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ بنگال کے مسلمانوں کے خیالات ان کے تمدنی رجحان ہندویت کی طرف ہوتے جا رہے ہیں۔ اس طرح ہم نے اپنی زبان، اپنا رسم خط کو کھو یا اور اس نئی پنڈتی زبان کو اختیار کر کے اردو، فارسی اور عربی سیکھنے کے راستے کو بھی پرخار بنا دیا ہے۔

بنگلہ کی وضع ۔۔ بنگلہ زبان اپنی وضع اور طرز کے لحاظ سے فارسی اور اردو قواعد سے زیادہ موافقت رکھتی ہے لیکن بنگلہ قواعد کی کتابیں فورٹ ولیم کالج کے زمانہ سے آج تک سنسکرت قواعد کی کتابیں فورٹ ولیم کالج کے زمانہ سے آج تک سنسکرت کتابوں کی قواعد کی بنا پر لکھی جاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکے بنگلہ سیکھنے کے عوض ان کتابوں سے سنسکرت سیکھ لیتے ہیں، ایک تو بنگلہ درس کی کتابیں سنسکرت الفاظ سے بھرپور ہیں۔ اس پر بنگلہ قواعد کی یہ سب کتابیں سنسکرت پڑھنا آسان کر دیتی ہے اور مسلمان بچوں کو

بھی سنسکرت پڑھنے پر مائل کرتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ بنگلہ خواں لڑکے عربی اور اردو سے سنسکرت اور ہندی کو زیادہ آسان سمجھتے ہیں اس حالت کو دور کرنا ہمارا فرض ہے۔ ہمیں لازم ہے کہ بنگال کے مسلمانوں میں اردو فارسی وغیرہ قومی زبان کو زیادہ مانوس کرنے کے لیے ہم پرانی "مسلمانی بنگلہ" کو زندہ کرنے کی تحریک کی تائید کریں۔ بنگال کے مسلمان ادیب اور نامہ نگاروں سے ملیں۔ ان میں فی الحال جو سنسکرت پسندی ہے اس کو دور کر کے معمولی عربی و فارسی الفاظ کے استعمال کا شوق بڑھا دیں۔ اردو، فارسی قواعد کے سانچے پر بنگلہ قواعد بنانے کی تائید کریں اور اگر ممکن ہو تو بنگال کے مسلمانوں سے موجودہ بنگلہ رسم خط چھڑا کر عربی خط کے استعمال پر مائل کریں کیونکہ بنگال کے مسلمانوں کی تمدنی آزادی پر تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی ترقی منحصر ہے۔

مخالفت ہوگی:۔ بنگالی مسلمان ادبا کا ایک گروہ ضرور اس تحریک کو روکنے کی کوشش کرے گا اور بنگال کے ہندو مسلمانوں کے ادبی اور لسانی اتحاد پر زور دیں گے لیکن ہمیں ان کو سمجھانا پڑے گا کہ اتحاد کے لیے طرفین کا اشتیاق شرط ہے۔ ہندو ادبی بنگلہ کو دن بدن سنسکرت کی طرف لے جا رہا ہے۔ اس زبان سے مسلمانان بنگلہ کی قومی زبان کو کسی قسم کی مناسبت نہیں۔ اس عارضی زبان کو مان لینے کا یہ نتیجہ ہوگا کہ ہم اپنی زبان سے اپنی تہذیب کے وہ آثار جو اردو اور "قومی مسلمانی بنگلہ" میں پائے جاتے ہیں مٹا دیں گے اور ہمیشہ کے لیے ہم پر بنگالی ہندوؤں کا تمدنی تسلط رہ جائے گا۔ عربی، فارسی، اردو وغیرہ سیکھنا اور پڑھنا ہم پر اور بھی دشوار ہوگا اور ہم اور اور صوبوں اور ملکوں کے مسلمانوں سے تبادلۂ خیالات کے فائدے سے محروم رہیں گے اور اگر ہم بنگلہ لکھنے میں عربی خط کو رائج کریں تو ہمارے لیے عربی، فارسی اور اردو پڑھنا آسان ہوگا۔ ہم مسلمانی بنگلہ کو زندہ رکھ سکیں گے اور اردو کی طرح بنگلے میں بھی مسلمانوں کا تمدنی تسلط رہیگا۔ اور اور صوبوں اور ملکوں کے مسلمان بنگلے کو آسانی سے لکھ پڑھ سمجھ سکیں گے اور اردو کی طرح بنگلہ بھی دنیائے اسلام میں مقبول ہوگی۔ اسی طرح ہندوستان کی قومی زبان اردو سے ہماری صوبائی زبان بنگلہ کی دوری بھی کم ہو جائے گی اور سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی زبانوں میں عام طور پر ایک اتحاد پیدا ہوگا جو ہماری مستقل قومی زندگی کے لیے ضروری و اہم ہے۔ ہماری ایک جماعت اس خیال سے موجودہ بنگلہ خط اور موجودہ ادبی بنگلہ کو چھوڑنے سے ناراض ہے کہ اس سے ہم کو اس صوبے کے ہندوؤں کے خیالات اور ان کے علمی خزانے سے واقفیت کے بدلے میں ادب و تمدن میں دوسروں کے تسلط کو ہمیشہ کے لیے قبول کر سکتے ہیں؟ موجودہ بنگلہ خط اور موجودہ ادبی بنگلے میں ہندو پنڈتوں کا تسلط ماننا ہی پڑیگا۔ اب ہمیں جلد فیصلہ کرنا ہے کہ اس حالت میں ہم کیا کریں

ادبی بنگلہ کے اتحاد کا برا اثر:۔ ادبی بنگلہ کے اس عارضی اتحاد کی بنیاد پر گاندھی جی نے سنہ ۱۹۴۰ء اپریل کے "ہریجن" میں لاہور مسلم لیگ کی مشہور تجویز اور مسٹر محمد علی جناح کی مدلل تقریر کی تردید کی ہے۔ گاندھی جی نے دعویٰ کیا ہے کہ بنگال کے ہندو اور مسلمان کی زبان ان کی خوراک اور ان کا لباس ایک ہی ہے۔ خوراک و لباس کا اتحاد تو کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ادبی بنگلہ میں اس اتحاد کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں لیکن اس اتحاد پر یہاں کے ہندو بھی بھروسا نہیں کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہوا پر جو قلعہ انھوں نے بنایا ہے وہ آج نہیں تو کل ضرور گر پڑیگا اس لیے اگرچہ گاندھی جی نے سیاسی غرض کے لیے اس ادبی اتحاد پر زور دیا ہے لیکن یہاں اکثر ہندو "مسلمان بنگلہ" کے سر اٹھانے کا خوف رکھتے ہیں۔ دو برس پہلے جب "محمدی" اور "تکبیر" میں ادبی بنگلہ پر ہندو تسلط کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا گیا۔ اس وقت تمام تعلیم یافتہ ہندوؤں میں کھلبلی پڑ گئی وہ لکھنے لگے کہ بنگلہ زبان پر چھری چلانے کی تجویز ہو رہی ہے۔ فی الحال ہندو مہا سبھا منسٹری کے خلاف جتنے الزا

لائی ہے اس میں بنگلہ زبان کو عربی و فارسی الفاظ سے ناپاک کرنے کا بھی الزام ہے۔ لیکن حق بات یہ ہے کہ منسٹری نے اب تک موجودہ متروک مسلمانی بنگلہ کو زندہ کرنے اور اس کو بنگال کے اسکول اور کالجوں میں رائج کرنے کی کوشش بھی نہیں کی اب تک اور نہ انہیں کہ ہم آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ یہ اتحاد کیسا ہے؟ ایسا عارضی لسانی اتحاد جس میں ایک قوم کو گونگا بنا دیا گیا ہے جس کو قائم رکھنے کے لیے ہم کو اپنی روزمرہ کی بات چیت اور اپنی مادری زبان کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ ہمارے لیے سم قاتل ہے اور اس کو مٹا دینے ہی میں ہماری نجات ہے اور ہم ایک مستقل قوم ہیں اور ہم میں اور ہندوؤں میں زبان کا اتحاد ہم میں سے ایک کی تمدنی ہستی کو مٹا دینے سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ بنگال کے مشہور ہندو قصہ نگار ڈاکٹر سرت چندر چٹرجی نے بھی تسلیم کیا ہے کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں چنانچہ انہوں نے ستمبر سنہ ۱۹۲۶ء کے رسالہ "ہندو" میں لکھا ہے کہ "اسلام" ہندو نومسلم کی زبان اس کی صورت اس کے نام اُس کے لباس اور چہرہ سب کو بدل دیتا ہے۔ ہندو قومیت نے قدیم قوموں کو ہضم تو کر لیا لیکن مسلمانوں کو ہضم نہ کر سکی۔ اسلام نے مسلمانوں کو مستقل قوم بنا کر ہمیشہ کے لیے ہندویت کا حریف بنا رکھا ہے۔ اب آگے ہم اس مستقل قومیت کو نہ بچا سکیں تو ہم بھی قدیم قوموں کی طرح مٹ جائیں گے۔ اس لیے لازم ہے کہ ہم ادبی بنگلہ کے اس عارضی اتحاد کے برے انجام سے بنگال کے مسلمانوں کو بچا دیں، اور مسلمانی بنگلہ کے زندہ کرنے میں جو اردو سے موافقت رکھتی ہے بنگال کے مسلمان ادیبوں کو ترغیب دیں اور تائید کریں

لاطینی خط:— ہمارے لیڈروں اور تعلیمیافتہ نوجوانوں کا ایک گروہ لاطینی کا حامی ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم اردو ہندی اور تمام صوبائی زبان لاطینی خط میں لکھنا شروع کر دیں تو ہمیشہ کے لیے اردو ہندی کا جھگڑا مٹ جائیگا۔ ہندو اور مسلمانوں میں اتفاق بڑھے گا۔ متفرق صوبائی زبانیں ایک قومی زبان کی زیادہ مطابقت کریں گی۔ لیکن یہ ان کا خواب ہے۔ کیونکہ اگر یہ پنڈت جواہر لال، سوبھاش بوس وغیرہ چند ہندو لیڈر ہندی اور اردو کے جھگڑے سے تنگ آ کر لاطینی خط کی حمایت کر رہے ہیں۔ لیکن لاطینی خط سب سے زیادہ سائنٹفک ہونے کے باوجود اکثر ہندو لیڈر دیوناگری خط اٹھا دینے سے ناراض ہیں ان میں لاطینی خط رائج کرنے کی یہ تحریک صرف عربی خط سے مسلمانوں کی محبت چھڑانے کے لیے کی گئی ہے۔ ورنہ عام ہندوؤں میں قومیت کا ایسا احساس پیدا ہوا ہے کہ کمال پاشا جیسے ڈکٹیٹر کے سوا دیوناگری خط اٹھا دینا محال ہے۔ ترکی کے سوا بلاد اسلامیہ میں ہر جگہ عربی خط رائج ہے۔ لاطینی تہذیب سے زیادہ مانوس مصر نے بھی عربی خط کو نہیں چھوڑا۔ الغرض عربی رسم خط نے اسلامی دنیا میں تمدنی اتحاد قائم رکھا ہے۔ لاطینی خط نسبتاً زیادہ کارآمد اور سہل الاستعمال ضرور ہے لیکن عربی رسم خط سے ہمارے تمدن کا واسطہ ہے اور یہ دیوناگری خط سے زیادہ سہل الاستعمال بھی ہے۔ اب جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس ملک کے ہندو دیوناگری رسم خط کو چھوڑنے سے ناراض ہیں۔ بلاد اسلامیہ بھی عربی خط کو نہیں چھوڑتے تو کیا ہندوستان کی مسلمان اقلیت کو لاطینی خط کا سوال کو ترک کرنا لازم نہیں ہے؟ اب ہمارے خیال میں تمام نقص و نقائص کے باوجود ہمیں عربی خط استعمال کرنا چاہیئے (کیونکہ جب ہماری خودکشی کے بغیر ہندوستان میں رسم خط کا اتحاد ناممکن ہے تو بلاد اسلامیہ کے ساتھ ہمیں مرنا چاہیئے) ترکی یورپ کے دامن میں ہے۔ ان کے سیاسی تعلقات بھی یورپ کے لاطینی ملکوں کے ساتھ ہیں۔ لاطینی خط اختیار کرنے میں جو نفع ان کو ہے ہمیں وہ نہیں ہمارے تعلقات شمال و مغرب میں اُن اسلامی ملکوں کے ساتھ ہیں جہاں عربی خط رائج ہیں۔ ہمارے جنوبی حصے میں سمندر ہے اور مشرقی حصے میں چین و برما کی طرح ایسی آبادی ہے جس کی تہذیب سے ہم بالکل ناآشنا ہیں۔ ایسی حالت میں ہم ترک کی تقلید نہیں کر سکتے۔ ہمارے تمدنی ترقی کے لیے عربی خط کا استعمال ناگزیر ہے۔ اردو عربی خط۔ اردو عربی خط میں لکھی جاتی ہے۔ اب

اگر بنگال کے مسلمان پھر بنگال کے لیے عربی خط کا استعمال شروع کر دیں اور اس میں معمولی عربی فارسی الفاظ کے استعمال سے بیس برس تو پچیس برس کے اندر اردو اور بنگلہ میں تفاوت بالکل کم ہو جائے گا بلکہ اس وقت اردو کو بنگال کی ادبی زبان بھی کہا جائے گا۔ اس طرح سارے ہندوستان اور بلاد اسلامیہ میں لسانی اور تمدنی اتحاد پیدا ہوگا۔

بنگال میں بہت جلد لازمی ابتدائی تعلیم رائج ہونیوالی ہے۔ اب اگر تمام ہندوستان کے مسلمان خاص کر کے آل انڈیا مسلم لیگ موجودہ منسٹری سے یہ قانون بنوائے کہ بنگال کے مسلمان بچوں کے لیے جو کتابیں ہوں وہ اردو کی طرح عربی خط میں لکھی ہوئی ہوں اور متروک مسلمانی بنگلہ کی طرح اس میں عربی و فارسی کا استعمال بھی ہو اور ان کے لیے قواعد کی کتابیں بھی عربی فارسی اور اردو قواعد پر بنا کر کے لکھی جائیں تو ہمارا مقصد پورا ہو سکتا ہے ورنہ ہم بنگال کے مسلمانوں کو بنگالی ہندوؤں کے تمدنی تسلط سے نہیں بچا سکتے ہیں۔ جناب سر عزیز الحق صاحب کی زیر صدارت فری پرائمری ایکیٹ کی جو ترمیم ہوئی ہے اس میں مکتب کے لیے موجودہ جدا نصاب بھی اٹھا دیا گیا۔ اس سے مکتب لٹریچر کا جو مسلمانی بنگلہ میں تھا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ اس میں ہمیں دو نقصانات پہنچنے کا خوف ہے اول تو تعلیمی بہرہ کے ابتدائی درجے میں مسلمانی بنگلہ نے جو کچھ جگہ پائی تھی اور اس طرح بنگلہ زبان اور بنگلہ ادب پر جو کچھ اسلامی اثر تھا وہ مٹ جائے گا۔ دوسرا نقصان یہ ہوگا کہ مکتبوں کے لیے اس قسم کے خاص ٹکسٹ بک کی اشاعت سے مسلمان بنگلہ کتب فروشوں کو جو نفع پہنچتا تھا اب مکتب اور مسلمانی بنگلہ کے اٹھ جانے سے وہ اس سے محروم رہیں گے۔ موجودہ ادبی بنگلے میں جو درسی کتابیں ہوں گی ان میں مسلمانوں کی اشاعتیں ہندو کتب فروشوں کی اشاعتوں سے اعلیٰ نہیں ہو سکتی جس طرح کہ مسلمانی بنگلہ میں لکھی ہوئی ہندو اشاعتیں مسلمان اشاعتوں کے برابر نہیں ہو سکتیں۔ یعنی موجودہ ترمیم یافتہ پرائمری ایڈوکیشن ایکیٹ میں ہم کو مالی و تمدنی دونوں طور سے نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اس لیے اس کی دوبارہ تنظیم ضروری ہے۔ اس ترمیم کے وقت اگر اس تجویز کے موافق کام کیا جا دے تو ادبی دنیا میں ایک ایسا انقلاب پیدا ہوگا جس سے ہم ہمیشہ کے لیے دوسروں کی تمدنی غلامی سے بچ جائیں گے

ابوبکر

غزل

سوز و سازِ زندگی پہلو بہ پہلو دل میں ہے
عشق کی منزل وہی ہے حسن جس منزل میں ہے

مضمحل اس واسطے خنجر کفِ قاتل میں ہے
ایک حسرت خیز قصہ دیدۂ بسمل میں ہے

مبتلا ہوں میں کشاکش میں امید و بیم کی
زندگی مشکل میں ہے اور کس قدر مشکل میں ہے

وہ مسلتا ہے گلوں کو دل سمجھ کر پاؤں سے
کس قدر شوخی الٰہی اس کی آب و گل میں ہے

سب سے میں ناآشنا ہوں مجھ سے سب بیگانہ ہیں
لطف خلوت کا مجھے حاصل بھری محفل میں ہے

حال کی تعمیر میں مضمر ہے مستقبل کا راز
حال سے غافل ہے جو کب فکر [illegible]

اہلِ دل اہلِ نظر محسوس کرتے ہیں عطا
شعر کی پنہاں لطافت جو ہمارے دل میں ہے

عطا

غزل

دکھلا کے اک جھلک جو وہ روپوش ہوگیا
ہشیار جو بچا تھا تو وہ بے ہوش ہوگیا

تھی جام نرگسی میں وہ صہبائے تند و تیز
آنکھوں سے دیکھتا تھا کہ مدہوش ہوگیا

پایا جو مجھ کو خوگر آلام و صد ستم
پہلے سے اور بھی وہ جفاکوش ہوگیا

جل جل کے سوز ہجر میں دل مرا بجھ گیا
"ایسا جلا چراغ کہ خاموش ہوگیا

ایسی شراب تیز نگہ سے پلا گئی آج
آسودہ عمر بھر کو بلانوش ہوگیا

جلوہ تھا یا عتاب سمجھتا میں کس طرح
پہنچی نہ تھی نگاہ کہ بے ہوش ہوگیا

رطب اللسان حسن تھا کیا کیا نہ عشق میں
نظارگی ہوا میں تو خاموش ہوگیا

کی اس نے جس گھڑی نگہ التفات ادھر
ایک ایک جور اس کا فراموش ہوگیا

بے چینیاں نہ پوچھ مرے دل کی اے سلیم
گیسو بدوش آ کے جو ہم دوش ہوگیا

سلیم فہمی

محمد پیشوائے دیں ہے گمراہوں کا رہبر ہے

ہوا خلق خدا میں زور جب کفر و ضلالت کا — تو نکلا پردۂ ظلمت سے جلوہ اُس کی قدرت کا
سنوارا پھر نئے انداز سے انداز خلقت کا — ہوا کون و مکاں میں پر شرف عہدہ رسالت کا
حبیب کبریا دمساز نکلا اس فضیلت کا

دیار کفر میں چمکا یکایک نور وحدت کا — محمد لیکے نکلے ہاتھ میں مشعل ہدایت کا
دکھایا راستہ گم کردہ راہوں کو حقیقت کا — نظر آنے لگا آنکھوں کو جلوہ آدمیت کا
مٹایا صورت حرف غلط نقشہ جہالت کا

عرب کے گوشہ گوشہ میں تھا چرچہ کفر و بدعت کا — نہ تھا خوف خدا اُن کو نہ ڈر تھا کچھ قیامت کا
خدا کا ایک بندہ رجز خواں تھا جو حقیقت کا — نکل کر بت پرستوں سے کیا دعوی رسالت کا
جمایا منکروں کے لوح دل پر رنگ وحدت کا

خودی کو اپنی خود دل سے مٹایا بت پرستوں نے — بتوں کا پوجنا دل سے بھلایا بت پرستوں نے
خدا کے گھر کو پھر کعبہ بنایا بت پرستوں نے — پیام حق کے آگے سر جھکایا بت پرستوں نے
رہا باقی نہ پھر نام و نشاں تک شرک و بدعت کا

محمد پیشوا دین کا ہے گمراہوں کا رہبر ہے — محمد حق کا بندہ نور اعلیٰ سے منور ہے
محمد انبیا کا بادشاہ سرتاج و افسر ہے — محمد سب سے بہتر افضل و اعلیٰ پیمبر ہے
ہے افضل اس کی امت میں وہ عاصی اپنی امت کا

(افضل)

"کشمکش"

اگر گناہ کو گناہ کہا جائے یا لکھا جائے تو آخر اس میں کیا گناہ ہے ——؟

فرض زیادہ ضروری چیز ہے یا محبت؟ —— یہ ہر ایک کو خود اپنے متعلق حق ہے کہ وہ چاہے تو رومان کے طوفان میں بہتا چلا جائے یا فرض کی تلخیوں میں شیرینی پیدا کرے اپنے فرائض پورے کرنے کے لیے جذبات کی عارضی دنیا کو دل کے گہرے سمندر میں غرق کردے بھول جائے —— لیکن آہ! ہوتا کیا ہے؟ ہزاروں لہلہاتے ہوئے زندگی کے درخت رومان کی تند آندھیوں میں جڑ سے اکھڑ کر نیست و نابود ہو گئے —— فرض کا جذبہ صرف منہ تکتا رہ گیا!!

رعنا........ رعنا........ رعنا خاصا دلکش نام ہے اور حسین —— لیکن اس کے واقعات؟ اگر یہ کہا جائے تو بہتر ہے کہ دنیا میں بہت بدقسمت ہے جیتے جی سکون نہیں۔ رعنا کی شادی کو پندرہ سال گذر گئے شہر کے مشہور بیرسٹر اوز سے ہوئی تھی —— تین بچے اور تین بچیاں ہیں۔ نہایت ہونہار۔ تمیزدار۔ پیاری پیاری صورتیں —— ایک مثل ہے عشق اور مشک چھپائے سے نہیں چھپتا۔ ڈاکٹری اور طبی نکتہ نگاہ سے عشق ایک قسم کی بیماری یا دیوانگی کی علامت ہے۔ بھوکوں کے خیال میں "پیٹ بھرے" کی باتیں ہیں۔ پیٹ بھروں کے تخیل میں شاید ایک دلچسپ کھیل ہے۔ شاعروں کی حسین نگاہوں میں صرف "عشق بس باقی ہوس" فلاسفروں کی نظروں میں پاگل پن —— اور رعنا کے خیالات اس حد تک، محبت زندگی ہے اور زندگی محبت! ہاں تو رعنا کی بربادیاں یوں شروع ہوئیں کہ شادی کے بعد فرض کو چھوڑ دیا اور محبت کی آگ میں جلا کو دی۔ بیرسٹر اوز اس طبیعت کے تھے جو شادی کے بعد یہ سمجھ لیتے ہیں کہ "بیوی" اور "گھر" دونوں لازم ملزوم چیزیں ہیں۔ اپنے گھر خواہ صبح آئے۔ یا دوپہر۔ یا شام ہر حال میں وہ اپنا ہی گھر رہے گا۔ بیوی بقول کسی کے باقی پھرے گا ذن گاؤں جس کا ہاتھی اسی کا نام —— دن دن بھر گزر جاتا۔ بات کرنے کی فرصت نہ تھی۔ ادھر دو منزلہ پر بیٹھے مقدموں میں الجھے رہے۔ کھانے کی میز پر آئے بھی تو "جلدی جلدی" تو جیل میں آیا، کرتے ہوئے لقمہ اٹھائے۔ مسکرانا۔ ہنسنا۔ بولنا یہ سب باتیں تو صرف غیروں سے دوستوں سے ضروری نہیں۔ بیوی کو بھلا ان غیر ضروری باتوں کی کیا ضرورت؟

یہ روش تھی بربادی کی گویا ابتدا ——

روپیہ برستا تھا۔ جائیداد معقول۔ دنیا کی ہر چیز موجود لیکن دو مختلف خیال کی ہستیاں ایک جگہ جمع ہو گئی تھیں۔ ایک بے حس لاپرواہ۔ بے نیاز۔ غافل۔ کشش سے بیگانہ۔ عورت کے لطیف تخیل سے بے خبر۔

دوسری رنگین بیتری۔ باتوں میں کوئل کی طرح یا بلبل کی مانند۔ ناز انداز میں قیامت بپا کرنیوالی۔ ہر بات میں تعریف کی خواہشمند ہر حلیہ پر جھوم جانے کی تمنی۔ پھر بھلا بات بنتی تو کیسے؟ گھر کی یا دل کی بنیادیں اپنی جگہ سے ہل گئیں۔

بیرسٹر کے محرر نعیم احمد جو ہر اشارہ پر جی حضور، بہت اچھا، کہہ کر دوڑتے تھے وہ کمبخت غضب کا لسان۔ شاعرانہ انداز۔ گفتگو اس قدر دلچسپ کہ گھنٹوں سننے کو دل چاہے۔ صورت ایسی جسے معمولی کہا جائے۔

رعنا جب خوش ہوتی تو سب نوکروں کو اندر باہر انعام دیتی۔ عید بقر عید پر تحفے دیتی۔ سب تو دعائیں دے دے کر لے لیتے لیکن منشی نعیم خاص انداز سے سر جھکا کر قدم چھوتے پھر شکریہ سے لبریز نگاہیں اٹھا کر کہتے "آپ تو شہزادیوں کی طرح فیاض ہیں۔ خدا آپ کو رہتی دنیا تک کامیابیاں دیتا رہے وغیرہ وغیرہ"

رعنا کے دل میں نعیم کے الفاظ جیسے جادو بھرتے چلے جاتے ہیں۔ چند روز لبو اجنبیت کے تمام مدارج طے ہو گئے اور گھر بہت سے کام صرف نعیم کے ذمہ کر دیئے گئے۔ بزاز کے ہاں تھان وہی لائے۔ بچوں کو کبھی کبھی سیر وہ کرائیں۔ رعنا کے احکام ہر مہینہ نعیم پورے کریں اور سب نوکروں کو تمیز ہی نہ تھی۔ نعیم کی ہر چیز لائی ہوئی بہترین کہی اور سمجھی جاتی۔

مسٹر انور کسی مقدمے کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے۔ نعیم کوٹھی کے باہر رہتا تھا۔ اس لیے کہ پردیسی تھا، کھانا یہیں سے ملتا۔ رفتہ رفتہ گزارنے کو نوکروں کے کوارٹروں سے ہٹ کر ایک مختصر مکان ملا ہوا تھا جیسے اپنے ہاتھ سے سادگی سے، صفائی سے کچھ کچھ سنوار رکھا تھا۔ انور کی سخاوت سے نعیم ذرا انسان بن گئے تھے ورنہ جس وقت ملازمت کی تلاش میں شروع شروع شہر میں آئے تھے تو بدن پر شیروانی بھی ڈھنگ کی نہ تھی۔ اب تو جناب ہر وقت نفیس ترین لباس میں ملبوس رہتے تھے۔

رعنا رات کو دیر تک بجانے کن کن دماغی الجھنوں میں باغ کی روشوں پر ٹہلتی رہی۔ سردی انتہائی عروج پر تھی۔ ہلکی جارجٹ کی ساری تھی اور جالدار ریشمی بلاؤز ——— بہت ہی ہلکا سا شال کندھوں پر ——— صبح اٹھی تو سینہ میں درد اور تیز بخار۔ نعیم کو حکم دیا گیا ڈاکٹر کو بلاؤ۔ ڈاکٹر آیا دوائیں تجویز ہوئیں۔ سب سے زیادہ ذمہ دار سمجھ کر ڈاکٹر نے نعیم کو ہدایات دیں۔ ایک حسین مریض کی تیمارداری ——— بھلا نعیم کو کب انکار تھا؟ حسین رعنا بخار کی غفلت میں مدہوش پڑی رہی۔ سب نوکر چاکر رات گئے تک خدمت میں لگے رہے پھر سب جا جا کر سو رہے ——— اب کرسی پر مسہری کے عین مقابل نعیم بیٹھا گھڑی دیکھ رہا تھا۔ ہر دو گھنٹہ بعد نہایت ادب سے پکارتا "حضور بہو بیگم صاحب دوا پی لیں وقت ہو گیا!" رعنا آنکھیں کھول دیتی ——— ایک انداز سے گلاس لیکر پیتی پھر آنکھیں بند کر کے سوچتی "یہ کام تو شوہر کا تھا جو منشی کر رہا ہے کیا تار دلوا دوں؟ نہیں کیا ہوگا؟ وہ اگر یہاں موجود بھی ہوتے تو یہ خدمات صرف نوکری کرتے وہ تو شاید اپنی نیند خراب ہونے کے خیال سے یہاں سے اپنا بستر بھی باہر منگوا لیتے ——— آہ وہ کیا سمجھیں کہ عورت بیماری میں شوہر سے کس قدر محبت آمیز خدمت کی آرزومند ہوتی ہے۔ کیسے عجیب بے حس جانور ہیں" یہ خیال کہاں سے کہاں پہنچے کتنی دیر میں آنکھ لگی۔ کچھ خبر نہیں ——— بخار بہت تیز ہو گیا۔ گھڑی کی "ٹن ٹن" نے نعیم کو ہشیار کر دیا پھر اسی انداز سے دوا پلانے آگے بڑھا۔ رعنا نے آنکھیں کھول دیں۔ اٹھنا چاہا لیکن نہ اٹھ سکی ——— نعیم نے فوراً ایک ہاتھ سے سہارا دیکر دوا پلائی۔ رعنا کا تمام جسم تھر تھر کانپنے لگا۔ جیسے کہ اسے کسی نے تیز ہواؤں میں کھڑا کر دیا ہو ——— نہ نعیم سمجھ سکا کہ تیمارداری کرتے ہوئے زندگی کیسے پلٹ گئی؟ نہ رعنا سوچ سکی کہ میں کون ہوں؟ کہاں ہوں؟ کس غلط راستہ پر جا پہنچی ——— ؟ پیاسا دریا کے پاس پہنچ گیا ——— رومان پسند طبیعت عزالنفس کو قطعی بھول گئی ——— اسے صرف نعیم ہی نعیم دنیا میں نظر آنے لگا ——— انقلاب اور وہ بھی عورت کا، محبت کی تشنگی ——— پھر جنس لطیف کی طرف سے ——— دنیا کا تختہ لوٹ جائے۔ سورج اپنا رخ بدل دے۔ دریا اپنی روانی بدل دیں لیکن عورت؟ بس یہیں پر عورت کا عزم ایک خوفناک دیو سے زیادہ قیامت خیز ہو جاتا ہے۔

رعنا اب وہ رعنا نہ رہی تھی جو گھر، شوہر، بچوں میں دلچسپی لے سکتی۔ وہ اب نوکری سے زیادہ بیکار رہتی ——— دو دلوں سے ہولی کھیل رہی تھی ——— یہ خبر کسی کو نہ تھی کہ آخر کار کیا ہوگا؟

کبھی کبھی ضمیر اندر سے رعنا کو ملامت کرتا۔ کہتا کمبخت ایک لفظی محبت نہیں ملی تو نہ سہی۔ شہر میں شوہر کا رتبہ کیا ہے؟ جس طرف کو موٹر نکل جاتی ہے تو سیکڑوں ہاتھ سلام کو اُٹھ جاتے ہیں۔ بچوں کو دیکھ۔ گھر کو دیکھ۔ کس قدر عالیشان ہے؟ انور لاپرواہ سہی لیکن صورت دیکھ۔ کس قدر حسین ہے۔ مانا کہ جذبات سے بے نیاز ہے لیکن یہ سمجھ لے کہ قسمت میں بس یہی تھا۔ چند روز اگر انتہائی دُلار میں گزار دیئے تو کیا؟ اور اگر سادگی سے خاموشی سے زندگی کٹ گئی تو کیا؟ ہائے شرم۔ ایک بیوی ہو کر تو پاکبازی کو بہا رہی ہے۔ عزت کو لٹا رہی ہے۔ ہوش میں آ ہوش میں ——— جوانی فانی ہے۔ قانون نے جسے شوہر بنا دیا اُسے شوہر ہی سمجھ۔ محبت کو جہنم میں جھونک۔ فرائض پر جان دیدے۔"

لیکن یہ کچھ کے چند منٹ میں بے اثر ہو جاتے ——— وہ پھر نعیم کے خیال میں غرق ہو جاتی ——— وہ اندھی بن کر دیوانہ وار نعیم کیطرف مقناطیس کی طرح کھنچتی جا رہی تھی۔ شوہر سیدھا تھا۔ لاأبالی تھا سب کچھ تھا لیکن اُس کا دماغ صحیح تھا۔ محلہ میں ——— کنبہ میں رعنا اور نعیم کے نام ساتھ ساتھ لیے گئے ——— باتیں بنائی گئیں۔ انور کو ایسا معلوم ہوا گویا کسی نے پہاڑ کے کھڈ میں اُسے پھینک دیا ہے ——— پابندیاں عائد کیں تو رعنا شیرنی کی طرح اور بھی غرّا کر سر چڑھی۔ یہ کشمکش کئی مہینہ چلی۔ بچوں کا پیچ بری طرح حائل تھا۔ لیکن عزت ذلت بچوں سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ چند روز بعد جب رانا کی محبت اور زیادہ بدنام ہوئی تو انور نے تنگ آ کر بچوں کو الگ کر لیا تاکہ محبت ممتا ہی نہ کرے۔ بچوں کے بورڈنگ چلے جانے کے بعد رعنا اور بھی آزاد ہو گئی۔ انور ایک دن تھکا ہارا سو رہا تھا ——— رعنا دبے پاؤں اٹھی اور نعیم کے مکان پر چلی گئی ——— خدا جانے کب تک باتیں کرتی رہی۔ وہی شاعرانہ ——— محبت پر تخیل آفریں خیالات۔ گھڑی نے "دو، تین، چار" بجا دیئے ایکدم گھبراہٹ میں جو اٹھی تو جوتا غائب۔ یہ حرکت نعیم کے پالتو کتے کی تھی ——— خیر ویسے ہی جوں توں چمن میں ہوتی ہوئی کوٹھی کے برآمدے سے گذر کر کمرے میں آئی۔

انور کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا تھا ——— باغ ہے ایک بہت ہی حسین باغ ——— ہوا تیز چلتے چلتے آندھی بن گئی ——— پھر طوفان آیا بہت تیز۔ بارش۔ اولے۔ بارش اس قدر بے تحاشا ہو رہی ہے کہ سارے باغ کے پھول دور دور جا پڑے ——— پتیاں بکھر گئیں ——— سارے باغ کے پھول پتوں کا ناس ہو گیا ——— کروٹ لیکر خواب ہی میں بڑبڑایا ——— دیکھنا میرا باغ ——— خراب ہو گیا ——— طوفان کی نذر ہو گیا ——— کہاں کہاں سے شاخیں ——— بیج منگوائے تھے۔ سب محنت بیکار ہو گئی ——— مالی ادھر آؤ ——— دیکھو باغ خراب . . .

رعنا کا جیسے اِن خواب کے لفظوں کو سن کر دل گھٹنے لگا ——— گویا دھک دھک . . . . . لیکن تھوڑی دیر میں پھر سکون ———

صبح انور کی آنکھ کھلی تو دیکھا رعنا بے خبر پڑی سو رہی ہے ——— دیر تک وہ اپنی قسمت کی تبدیلی پر غور کرتا رہا ——— دل میں حیران سوچتا رہا" مجھ میں آخر کیا خامی تھی؟ دولتمند۔ معزز عہدہ۔ صورت میں خاصا شاندار ——— عادت ایسی رکھتا ہوں کہ کسی کو دُکھ نہیں پہنچاتا ——— پھر یہ انقلاب کیسے آیا؟ ایک ٹکڑ گدا نے آ کر میرے سکون کی دنیا لوٹ لی۔ جذبات حسد کو رقابت کی آگ نے مشتعل کر دیا " چلوں آج اس نمک حرام کا پتہ کاٹ دوں ——— یہاں بلا کر کہوں ——— نہیں میں خود اُس کے گھر جاتا ہوں اور ابھی اس وقت کہوں گا کہ میری کوٹھی سے نکل جاؤ۔ ورنہ اور زیادہ میری بدنامیاں بڑھتی چلی جائیں گی ——— وہ اِسی دھن میں ٹہلتا ہوا نعیم کے گھر جا پہنچا ——— نفرت کی نگاہ سے دیکھ کر کہا " نعیم! جس نے اپنے آقا کے ساتھ وفا نہیں کی ——— غداری کی وہ اس قابل نہیں کہ اُسکی صورت زیادہ دنوں تک سامنے رکھ سکوں بہتر یہ ہے کہ تم تشریف لے جاؤ ———

اچانک سامنے نظر پڑی تو رعنا کے جوتے پڑے تھے۔ اور بستر پر ریشمی مہکتا ہوا رومال ——— دیکھتے ہی آگ ہو گیا ——— بولا خیریت اسی میں ہے کہ صحیح واقعہ ابھی بتا دو ——— نعیم نے ڈرتے ہوئے کہدیا کہ ہاں حضور تشریف لائی تھیں۔ انور نے غصہ میں نعیم کے دو تین ٹھوکریں ماریں اور

کہا "ابھی نکلو ورنہ گولی سے اڑا دوں گا ——

ادھر آتے ہی سوتی ہوئی رعنا کو کھڑے کھڑے دو ٹھوکریں دیں ۔ اور چیخ پڑا ۔ مکار ۔ دغا باز ۔ ناگن ۔ اٹھ اور نکل جا میرے گھر سے ۔ میں مطمئن تھا کہ تو میری ہو چکی ۔ لیکن یہ میری بڑی بھول تھی تو عورت نہیں وبال ہے ۔ کلو پٹرا کا شاید جنم لیکر آئی تھی ۔ بس دور ہو جا ۔ میرے دل کی دنیا سونی بہتر " شاید محبت کرنا تو گناہ نہیں لیکن شوہر کی امانت محبت کو لٹانا حقیقت میں ایک ناقابل معافی جرم ہے ۔

رعنا کے اب سر سے اونچا پانی ہو چکا تھا ۔ وہ اب قطعی نعیم کے ساتھ بدنامی سے نہ ڈرتی تھی ۔ انتہائی بے حیائی سے سوال جواب کرتے ہوئے وہ گھر سے چلدی ۔۔ نعیم پھاٹک سے باہر نکل رہا تھا ۔ تانگہ پر تین چار ٹین کے بکس ۔ ایک مختصر بستر ۔ دس بارہ تصویریں ۔ یہ کل کائنات تھی ۔ رعنا شب خوابی کے لباس پر ڈریسنگ گون پہنے پیچھے سے آواز دے رہی تھی " نعیم ٹھہرو ۔ میں بھی چلتی ہوں ۔۔ دنیا کے جس کونہ میں تم جاؤ گے ۔ میں بھی ساتھ ہی رہونگی " نعیم کا تانگہ رک گیا ۔ رعنا بیٹھ گئی ۔ تانگہ پھر چل پڑا ۔ کہاں گئے ؟ یہ خبر نہیں ۔ دنیا بہت وسیع ہے ۔ خاص کر اندھی محبت کے دعوے داروں کے لیے ۔۔

انور ۔۔ بیچارہ انور رو پڑا ۔۔۔ اس ڈرامہ کے خاتمہ پر اُس کے دل کا بھی خاتمہ ہو گیا ۔ ایسے محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی معصوم بچہ ویرانہ میں کھڑا کر دیا گیا ۔ شہر کا مشہور بیرسٹر اپنی زندگی اور محبت کے مقدمہ میں کامیاب نہ ہو سکا ۔ انور کا سر کرسی پر تھا اور پیر زمین پر لاش کی طرح بے جان ۔۔۔ یوں پڑا تھا گویا برسوں کا بیمار تھا ، ہو ۔

آخر مرے ہوئے کو بھی تو صبر کر لیتے ہیں ۔۔۔ انور بھی پھر اسی دنیا میں رہنے لگا لیکن انتہائی بیزار ۔ حتیٰ کہ ملنے والوں کیلئے بھی نوکروں سے کہلوا دیتا " کہہ دو کہیں باہر گئے ہیں " ۔۔۔ صرف کتابیں تھیں اور وہ تھا یا بہترین مشغلہ یہ کہ پارسل بھی کر بچوں کو کالج بھیجتا رہتا ۔۔ وہ اب ماں کے بھی فرائض پورے کر رہا تھا ۔۔ بہترین باپ تو بن گیا لیکن شوہر بننا نہ آیا ۔۔۔

کوئی شادی کے بعد یا شادی سے پہلے یہ نہیں سمجھ سکتا کہ زیادہ صرف بہترین انسان ہے ۔۔۔ ؟ یا بہترین بیوی یا بہترین شوہر بھی ہو سکتا ہے ۔۔ ؟ یہ ایک مشکل ترین معمہ ہے ۔۔۔ !!

رعنا ۔۔ رعنا پر کیا گذری ہو گی ؟ کون جانے ؟

ایک بیمار ۔۔ فقیری حیثیت ۔۔ کنگال کیساتھ ۔۔۔ یقینی دنیا کی ہر تکلیف نے بڑھ کر استقبال کیا ہوگا ۔

قصور کس کا ؟ یہ کسی کی بلا جانے ۔۔ اس مکار فریبی دنیا میں ہر روز لاکھوں دل کے باغ مرجھا جاتے ہیں ۔۔ کوئی کہاں تک غم کرے ۔۔

رعنا اور انور کا قصہ برسوں لوگوں کی زبان پر افسانہ کیطرح رہا ۔ آخر کو نقش مٹتے مٹتے دھندلا ہو گیا ۔

فرائض ۔۔ احساس ۔۔ سر پیٹتے پیٹتے تھک گئے ۔۔ کیوپڈ ۔۔ اندھا کیوپڈ ۔ سنگدلی سے اپنے نشانہ پر مسکراتا رہا ۔ غلط ہو یا صحیح اُسے تو تیروں کی بوچھار سے کام ہے !!

شفیق بانو

اصلاح سخن کا ایک ورق

مطالعہ کے سلسلے میں اتفاقیہ طور پر "اصلاح سخن مرتبہ سید محمد عبدالعلی صاحب شوق سندیلی" میری نظر سے گذری یہ کتاب صحیح معنوں میں مشاہیر شعرائے عصر کی اصلاحوں کا آئینہ ہے۔ حضرت شوق نے اس کتاب میں اپنی دس غزلیں جن پر کم وبیش چالیس مشہور و معروف قادر الکلام سخنوروں کی اصلاحیں ہیں۔ اہل ذوق کے سامنے پیش کرنا چاہی ہیں لیکن ہر شعر کی اصلاح متعدد ناقدان سخن کے قلم سے جداگانہ نظر آتی ہے الفاظ و مضامین کی گوناگوں قطع و برید صاحب نظر کے سامنے کلام شوق کے محاسن اور خامیوں کے علاوہ خود مصلحان سخن کے متعلق ایک لطیف موازنہ و مقابلے کی صورت پیدا کرتی ہے لیکن اس ناگزیر نتیجے کا الزام حضرت شوق پر وارد نہیں ہوتا۔ کیونکہ انھوں نے نقوش اصلاح بجنسہٖ و بعینہٖ بلا کسی ذاتی رائے کے پیش کر دیئے ہیں۔

سب سے پہلے میں نے آسمائے اساتذہ کی فہرست پر نظر ڈالی۔ مشہور و غیر معروف شعراء کی تعداد کم وبیش چالیس افراد پر مشتمل ہے لیکن تعجب اور افسوس اس امر کا ہے کہ اساتذہ کی فہرست سے سیماب اکبرآبادی اور جگر مرادآبادی کا نام خارج ہے۔ بہت کچھ غور کرنے کے بعد مندرجہ ذیل امور ذہن میں آتے ہیں

۱۔ اصلاح سخن ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی اُس وقت تک شاید سیماب اکبرآبادی اور جگر مرادآبادی کا شمار اساتذہ میں نہیں تھا۔

۲۔ یا شوق صاحب نے خود کو شاگردی کا اہل نہ سمجھا ہو۔

لیکن یہ امر قابل تسلیم نہیں ہو سکتا کہ شوق صاحب نے ہندوستان کے گوشے گوشے کی تلاشی لی ہے۔ بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا استاد بھی اُن کی نکتہ رس نگاہ سے نہیں بچا۔ پھر یہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ مولانا سیماب اور جگر مرادآبادی چھوٹ جاتے بہر حال جو کچھ بھی ہو۔ ماسوا ان حضرات کے مشاہیر اور اساتذہ کو اگر ایک پلیٹ فارم پر دیکھنا چاہتے ہیں تو "اصلاح سخن" ملاحظہ فرمائیے۔

اصل شعر جناب شوق سندیلوی کا سہ — خواب میں اُن کا گلے مل کے جدا ہو جانا — دل کے ارمانوں میں اک حشر بپا ہو جانا

اصلاح حضرت احسن مارہروی — " " " " " " " — میرے حق میں ہے قیامت کا بپا ہو جانا

(نوٹ) پہلے مطلع دولخت تھا۔ احسن

اصلاح حضرت آرزو لکھنوی — " " " " " " " — دل کے ارمانوں میں پھر حشر بپا ہو جانا

اصلاح حضرت نوح ناروی — " " " " " " " — کیا تھا میرے لیے تھا حشر بپا ہو جانا

حضرت ناطق۔ حضرت دیاقن۔ حضرت وحشت نے کچھ نہیں بنایا

اصل شعر جناب شوق سندیلوی کا سے — آج پورا تھا مقدر کا لکھا ہو جانا — یوں ترے عشق میں انگشت نما ہو جانا

اصلاح حضرت احسن مارہروی — بزم اغیار میں اس بت کا خفا ہو جانا — جاں نثاروں کا ہے انگشت نما ہو جانا

" " آرزو لکھنوی — میری تقدیر کو چمکا کے بنا دے گا ہلال — یوں ترے عشق میں انگشت نما ہو جانا

" " نوح ناروی — کہہ رہا ہوں تم سے کہ ہنسی کھیل نہیں — اسطرح عشق میں انگشت نما ہو جانا

اصلاح حضرت ناطق کانپوری	شہرتِ عشق کی معراج ہے مانندِ ہلال	تیرے بدنام کا انگشت نما ہوجانا

اصلاح حضرت وحشت (نوٹ) مصرعہ اول ایک اور مطلب کا تقاضا کرتا ہے "آج پورا تھا مقدر کا لکھا ہوجانا" یعنی وہ بات ہوئی جو ہونا تھی اگرچہ اس کی خواہش نہ تھی کسی کے عشق میں انگشت نما ہوجانا۔ یہ عاشق کے لیئے کوئی بری بات نہیں ہے۔ یہ تو اس کے لیے باعثِ فخر ہے پھر آج کا لفظ تشریح طلب تھا۔ میں نے دونوں مصرعوں پر الگ الگ مصرعے لگا دیئے ہیں۔ وحشت

اصلاح حضرت وحشت کلکتوی سہ	آخر اس بت کے تغافل نے کیا کام تمام	آج پورا تھا مقدر کا لکھا ہوجانا
〃 〃 〃 〃	تیری تائید بھی تھی ورنہ کہاں ممکن تھا	یوں ترے عشق میں انگشت نما ہوجانا
اصلاح حضرت ریاض خیرآبادی سہ	مجھ کو ڈر ہے کہیں محشر میں نہ رسوا کردے	〃 〃 〃 〃 〃 〃
اصل شعر شوق سندیلوی	آج اُن کی نگہ ناز کا وہ اُٹھ کے اِدھر	دردمندانِ محبت کی دوا ہوجانا
اصلاح حضرت احسن مارہروی	ہائے اُن کی نگہ ناز کہ اُٹھ اُٹھ کے اسے	〃 〃 〃 〃 〃 〃
〃 〃 آرزو لکھنوی	ناامیدی میں وہ اس کی نگہ قہر کا زہر	〃 〃 〃 〃 〃 〃
〃 〃 نوح ناروی	آج اُن کی نگہ ناز کا اٹھنا، اُٹھ کر	〃 〃 〃 〃 〃 〃
〃 〃 ناطق کانپوری	زہر قاتل بھی اتار اگیا اس وعدے پر	〃 〃 〃 〃 〃 〃
〃 〃 ریاض خیرآبادی	تیرے صدقے نگہ ناز تو اٹھ کر سرِ بزم	〃 〃 〃 〃 〃 〃

حضرت وحشت نے کچھ ترمیم نہیں فرمائی

اصل شعر شوق سندیلوی	اُو ادا قہر کی اظہارِ وفا پر دم غیظ	بدنصیبوں کو نہ پیغام قضا ہوجانا
اصلاح حضرت احسن مارہروی	او ادائے ستم اظہارِ وفا پر دم غیظ	〃 〃 〃 〃 〃 〃
〃 〃 آرزو	جانفزا بن کے جو آیا ہے تو اے مژدۂ وصل	〃 〃 〃 〃 〃 〃
〃 〃 ریاض خیرآبادی	دم اظہار وفا! او نگہ قہر آلود	〃 〃 〃 〃 〃 〃

حضرت ناطق کانپوری۔ حضرت نوح ناروی۔ حضرت وحشت نے کوئی تبدیلی نہیں کی۔

اصل شعر شوق سندیلوی	دل بیمار یہ ہیں دشمنِ صحت آثار	اک خیال آتے ہی پھر درد سوا ہوجانا
اصلاح حضرت احسن مارہروی	دل بیمار یہ آثار تو صحت کے نہیں	〃 〃 〃 〃 〃 〃
〃 〃 آرزو لکھنوی	یہ مرض کون سا ہے اے دل بیمار بتا	کچھ خیال 〃 〃 〃 〃 〃
〃 〃 نوح ناروی	جب یہ صورت ہے تو مجھ کو نہیں امید شفا	اک خیال آتے ہی پھر درد سوا ہوجانا
〃 〃 ناطق کلکتوی	قلمزد	
〃 〃 ریاض خیرآبادی	دل بیمار یہ اچھا نہیں تیرے حق میں	مژدگاں کے تصور سے سوا ہوجانا۔

حضرت وحشت نے کوئی تبدیلی نہیں فرمائی۔

مندرجہ بالا اصلاحیں ہر شخص کے کمال کی خود آئینہ دار ہیں۔ بقول حضرت آرزو لکھنوی ع دل خود لکا رتا ہے میں کیا کہوں زبان سے

محمد اسحاق خاں نصیب کلکتوی

غزل

یہ کس کے چاند سے چہرے پہ برہمی آئی — نظامِ عالمِ ہستی میں ابتری آئی

کسی کے جبر سے مجبور۔ زندگی آئی — سکوتِ راز لیے قیدِ بندگی آئی

نہ جانے کتنی کھکیڑیں اُٹھائیں دنیا نے — مگر نہ جشنِ نمائش میں کچھ کمی آئی

نہ پا سکے تری دنیا میں ہم سکوں یا رب! — مصیبت ایک جو ٹالی تو دوسری آئی

فنا کا بھیس بھرے آئی ہے حیاتِ بشر — قضا بہانے کی صورت میں ساتھ ہی آئی

خدا کے واسطے سرخوش سنبھالیے دل کو
وہ رازِ عشق کھلا۔ آنکھ میں نمی آئی

آغا سرخوش قزلباش دہلوی

کام کی باتیں

مٹے کیسے جھگڑا، ہو کیونکر صفائی — طبیعت مکدر، دلوں میں برائی

بفحوائے "الحق مُرٌّ" اگر تم — کہو بات حق تو ہو ناحق لڑائی

رذیلوں پہ احسان کرنا بھی گویا — شریفوں کے حق میں ہے کرنی برائی

اگر تو ہے اپنے عقیدے کا پکا — کسی در کی ہرگز نہ کر جبہہ سائی

ہے بہتر کہ دل ہی میں رکھ بات دل کی — جہاں منہ سے نکلی ہوئی وہ پرائی

نظر اپنے عیبوں پہ رکھو اگر تم — کرو کیوں بیاں دوسروں کی برائی

عزیزِ جہاں تم کو بننا اگر ہے — نہ کرنا کبھی اپنے منہ سے بڑائی

ادب جس سے آئے نہ اخلاق سدھریں — ہے بیکار ایسی لکھائی پڑھائی

نہ اکھڑے قدم جادۂ حق سے اطہر
بلا سے جو دشمن ہے ساری خدائی

محمد شفیق اطہر

علم حیات

پودے اور جاندار حیات رکھتے ہیں وہ خوراک کھاتے، سانس لیتے اور اپنی نسل کو بڑھاتے ہیں۔ ان کو غیر جاندار چیزوں سے فوراً متمیز کیا جاسکتا ہے۔ مٹی، پتھر اور دریا حیات نہیں رکھتے۔

زندہ اجسام حرکت کرتے ہیں لیکن یہ قوت صرف انہی تک محدود نہیں ہے۔ روشنی جو بہت تیز رفتاری سے جاتی ہے۔ ریل کا انجن اور اسی نوع کی دیگر اشیا زندہ نہیں کہلاتیں۔

ایک زندہ شے خوراک کی تلاش میں حرکت کرتی ہے یا خود کو خطرات سے بچانے کے لیے محفوظ جگہ کی تلاش میں رہتی ہے۔ لیکن اس کی نقل و حرکت مادّی طاقتوں ـــ روشنی، کشش ثقل (زمین کی کھینچنے کی قوت) ـــ کے اثر سے باہر نہیں ہے۔ یہ طاقتیں جاندار چیزوں پر اثر ڈالتی ہیں۔ کیڑے مکوڑے روشنی کی طرف کھینچے چلے آتے ہیں۔ پودوں اور درختوں کی جڑیں زمین کی طرف مڑتی ہیں شاخیں روشنی کی طرف بڑھتی ہیں۔ سورج مکھی کا پھول سورج کے رخ پر رہتا ہے۔ چھونے سے چھوئی موئی (لاجونتی) کا پودا اپنے پتے سکیڑ لیتا ہے۔

پودے اور جانداروں کی بہت سی اقسام ایک جگہ پر قائم رہتی ہیں ان میں نقل و حرکت کے کوئی آثار نہیں ہوتے۔ سب جانتے ہیں پودوں کی جڑیں ایک جگہ گڑی رہتی ہیں۔ اسپنج اور مونگے غیر متحرک جانداروں کی ایک مثال ہیں۔ جانداروں کے افعال مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ اپنی خوراک خود حاصل کرتے ہیں لیکن ریل کا انجن اس سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ کام سے پہلے اس میں ایندھن یا پانی بھرنا ضروری ہے۔

جاندار جو غذا کھاتے ہیں، وہ نشاستہ، شکر اور چربی کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے اور یہی اشیا اس کے جسم کی نشو و نما کرتی ہیں اور پھر آخر کار جسم کا ایک حصہ بن جاتی ہیں۔ یہ طریقہ پرورش جسم کہلاتا ہے

درخت اور جاندار ہوا میں سے خاص خاص اقسام کی گیسیں حاصل کرتے ہیں۔ آکسیجن گیس جسم کے ریشوں کو جلاتی ہے اور نتیجۃً طاقت کی پیدائش ہوتا ہے۔ جلنے سے کاربن ڈائکسائڈ پیدا ہوتی ہے طبیعت اسے جسم سے خارج کر دیتی ہے۔ گیس کا یہ رد و بدل دن رات جاری رہتا ہے اور عمل تنفس (سانس لینا) کہلاتا ہے۔ جانداروں کی یہ ایک خصوصیت ہے۔ غیر جانداروں میں یہ صفت مطلق نہیں ہے ـــ پتھر یا شیشہ سانس نہیں لے سکتے۔

جسم میں حرارت کی پیدائش اور دیگر تبدیلیوں سے ریشے ٹوٹتے رہتے ہیں اور اس طرح غیر ضروری اشیا جسم کے اندر جمع ہو جاتی ہیں جو اس کے لیے نقصان دہ ہیں۔ اس کے لیے ان کا اخراج ضروری ہے۔ پیشاب اسی طریقے پر پیدا اور خارج ہوتا ہے۔

اگرچہ دودھ بھی جاندار جسم سے خارج ہوتا ہے لیکن اول الذکر سے اس کے اخراج کا اصول مختلف ہے اور اس کی حیثیت بھی جداگانہ ہے۔

جسم میں تعمیری اور تخریبی سرگرمیاں بروقت جاری رہتی ہیں۔ نشو و نما یا پرورش جسم نہ صرف اس کمی کو پورا کرتی ہے جو تخریبی سرگرمیوں کا نتیجہ ہے بلکہ یہ جسم کو بڑھاتی بھی ہے۔ کسی جاندار کا بڑھنا غیر جاندار چیزوں کے حجم اور وزن میں اضافے سے بالکل الگ چیز ہے۔ مثلاً قند کی ڈالی میں شکر کی آمیزش سے اس کی جسامت بڑھ جائیگی لیکن جاندار ایسی خوراک سے بڑھتا ہے جو اس کے جسم سے بالکل جداگانہ ہوتی ہے۔ پیدائش سے لیکر بڑھاپے تک جانداروں کی نشو و نما کے مختلف مراتب بھی ہوتے ہیں ان میں یہ تبدیلی ایک خاص حد تک ہوتی ہے اس کی تکمیل پر جسم پختہ

کہلاتا ہے۔

مکمل جاندار اپنے جیسے ہی دوسری چیز یا نسل پیدا کرتا ہے یہ عمل صرف جانداروں سے مخصوص ہے اور غیر جانداروں میں نہیں پایا جاتا۔ نسل کی افزائش دو طریقوں پر ہوتی ہے (۱) جنسی (۲) غیر جنسی

ایک پودے کی نسل کو قلم لگا کر بھی بڑھانا ممکن ہے۔ معمولی قسم کے جانداروں کا جسم ایک خاص عمر کے بعد دو برابر حصوں میں بٹ جاتا ہے یہ ہر ایک حصہ بذات خود اسی نسل کا ایک مکمل جاندار ہوتا ہے۔ بعض حالتوں میں جسم کا ایک حصہ بڑھ جاتا ہے اور پھر اس سے علٰحدہ ہو جاتا ہے۔ یہ مثالیں غیر جنسی طور پر نسل بڑھنے کی ہیں۔

جنسی طریقے سے نسل بڑھانے کے لیے خاص قسم کے ریشے، جن کو جاندار ریشے کہا جاتا ہے، پیدا کیے جاتے ہیں ـــ پودوں میں بیج اور خاص قسم کے جانداروں میں انڈے اسی طریقے پر پیدا ہوتے ہیں

پس معلوم ہوا کہ بیرونی اثر قبول کرنا، حرکت، نشوونما، عمل تنفس، جسم سے غیر ضروری اشیا، کا اخراج، بڑھنا اور افزائش نسل جانداروں کی خصوصیت ہے۔

ان تمام خصوصیات کا قیام ایک زندہ شے "مادۂ زندہ" پر منحصر ہے۔ یہ دیکھنے میں پتلی اور لیس دار شے ہے۔ اس میں، کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، فاسفورس اور دیگر کیمیاوی اشیا شامل ہوتی ہیں۔

لیکن انسانی ہاتھ ان اشیا کو خواہ کسی بھی تناسب سے ملادیں یہ "مادۂ زندہ" نہیں بن سکتا۔ یہ صرف جانداروں کے جسم سے پیدا ہوتا ہے۔ غیر جانداروں میں اسے پیدا کرنے کی قابلیت نہیں ہوتی۔

"مادۂ زندہ" کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک حصہ ایک داغ پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصہ اس کی خوراک یا ذریعہ بقا کا کام دیتا ہے۔ "مادۂ زندہ" کا چھوٹا حصہ جو ان دونوں چیزوں پر مشتمل ہو مکمل جاندار ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ خوراک، کھانا، سانس لینا، بڑھنا اور نسل کو بڑھاتا ہے۔ درختوں میں لکڑی اور جسم انسانی میں "پٹھے" اس کی ایک مثال ہیں۔ بہت سے ریشے مل کر جسم کا کوئی خاص حصہ بنتا ہے۔ اور اس کا کام ـــ خوراک کو قبول کرنا یا کسی مفید بائع کو جسم میں حرکت دینا یا سانس لینا ہوتا ہے یوں سمجھنا چاہئے کہ یہ ایک نوع پر تقسیم کار ہے کوئی حصہ جو کام سر انجام دے اسے اسی نسبت سے نام دیا جاتا ہے۔ مثلاً آلات انہضام، آلات تنفس وغیرہ، ہمارا پھیپھڑا آلۂ تنفس ہے درختوں میں یہ آلات جانداروں کے ایسے ہی آلات سے جدا گانہ ہوتے ہیں۔ بعض جانداروں میں کوئی آلہ نہیں ہوتا اس کا کام جسم کا کوئی دوسرا حصہ معلوم دیتا ہے۔ پودوں کے آنکھیں نہیں ہوتیں تاہم وہ روشنی سے متاثر ہوتے ہیں۔ کیچوے کے ہاتھ پاؤں، آنکھیں یا کان نہیں ہوتے اس پر بھی وہ بقاء زندگی کے لیے وہی کام کرتا ہے جو دوسرے ترقی یافتہ جاندار ـــ کیچوے بھی خوراک کھاتے، سانس لیتے اور اپنے مخصوص طریقے پر افزائش نسل کرتے ہیں۔

جراثیم (چھوٹے چھوٹے کیڑے جن کو ہم خوردبین کی مدد کے بغیر نہیں دیکھ سکتے) بھی زندگی کے ایک مثال ہیں۔ لیکن ان میں "مادۂ زندہ" مکمل نہیں ہوتا۔ ان کی نسل بہت تیزی سے بڑھتی ہے۔ بعض اقسام کے جراثیم انسانوں اور حیوانوں میں امراض کا باعث بنتے ہیں۔

جاندار مخلوق مٹی سے پیدا نہیں ہوسکتی۔ جان کو جان ہی پیدا کرسکتی ہے۔ جانداروں کا جسم اطراف یا سامنے کے رخ پر باقاعدہ (جو دو برابر حصوں میں بٹ جائے) ہوتا ہے۔ اطراف کے رخ پر جو اجسام باقاعدہ ہوتے ہیں وہ اپنے نصف قطر کی مناسبت سے

دو برابر حصوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں۔ گولا یا درخت کی شاخ اطراف کے رخ پر باقاعدہ ہوتی ہے۔ سامنے کے رخ پر جو جسم باقاعدہ ہوتے ہیں وہ صرف ایک ہی خط پر دو حصوں میں بانٹے جا سکتے ہیں پتہ، مینڈک اور انسان سامنے کے رخ پر باقاعدہ ہوتے ہیں۔

سطح زمین پر جدھر بھی نظر اٹھ جائے جاندار اور پودے نظر آتے ہیں۔ ان میں بعض ریتیلے علاقوں میں بعض میدانوں میں اور تھوڑی بہت تعداد برف سے ڈھکے ہوئے منطقوں میں پائی جاتی ہے۔ دنیا کے سمندر بھی جانداروں سے بھرے پڑے ہیں بعض جاندار سمندر کی اتھاہ میں رہتے ہیں جہاں روشنی کی کرنوں کا گزر نہیں ہے۔

ہر ایک جاندار خود اپنی غذا حاصل کرتا اور خود کو اور اپنے بچوں کو موسم کی سختی اور دشمن کی دست درازی سے بچانے کی جد و جہد کرتا ہے یہ سرگرمیاں اعلیٰ ترین درجے کے جانداروں میں بھی پائی جاتی ہیں جسے دیکھ کر واقعی حیرت اور تعجب ہوتا ہے۔

اگرچہ جانداروں کی اکثریت اپنا اپنا خود گزارہ کرتی ہیں۔ اور ہر ایک اپنی اپنی زندگی کو پالتا ہے۔ لیکن بہت سے جاندار اور پودے دوسرے جانداروں یا درختوں کے دست نگر یا ان کے جسموں پر رہ کر گزارہ کرتے ہیں سائنس کی اصطلاح میں ان کو مکفل اور جن کے جسموں پر یا جن کی بدولت ان کی زندگی بسر ہوتی ہے ان کو کفیل کہا جاتا ہے بعض اوقات مکفل اپنے کفیل کے لیے بڑا دشمن بن جاتا ہے۔

جاندار اور پودے گرد و پیش کے واقعات کے مطابق خود میں تبدیلی کرنے کی حیرت انگیز خصوصیت رکھتے ہیں ان کے عادات و اطوار ساخت جسمانی ان کے ماحول کے مطابق ہوا کرتے ہیں۔

* درختوں پر رہنے والے کیڑے مکوڑوں کا جسم سبز رنگ کا ہوتا ہے —————— اور وہ اس طرح دشمن سے بچے رہتے ہیں۔ آسام میں ایک تیتری پائی جاتی ہے اور دور سے اسی درخت کا جس پر وہ رہتی ہے، ایک پتہ معلوم ہوتی ہے قطبین میں رہنے والے ریچھ کا رنگ سفید ہوتا ہے۔ کیونکہ اسے برف سے ڈھکے ہوئے علاقوں میں رہنا پڑتا ہے۔

اندھیرے غاروں میں رہنے والے جانوروں کو آلات بصر کی ضرورت نہیں پڑتی اس لیے وہ اندھے ہوتے ہیں۔

چھوٹے چھوٹے مینڈک اور مچھلیاں جن کو زور سے بہنے والے پانی میں زندگی گزارنی پڑتی ہو ان کے جسم کے حصہ زیریں میں پیالی کی مانند پیر ہوتے ہیں [illegible] کی مدد سے وہ پتھروں سے چمٹ جاتے ہیں اور پانی کی تیز رفتار لہر یا دھارا ان کو بہا کر نہیں لے جا سکتا لیکن انہی کے بھائی بند جو [illegible] یا کم رفتار پانی میں رہتے ہیں وہ اس سے معرا [illegible] ہوتے ہیں

بعض جانوروں کے بعض بعض حصوں میں چھوٹے چھوٹے جانور اپنا گھر بنا لیتے ہیں۔ گائے کے تھنوں میں چیچڑیاں چمٹی رہتی ہیں اور انہی میں سے خوراک چوستی ہیں بعض اقسام کی بیلیں درختوں پر خوب پھلتی پھولتی ہیں۔ یہ اپنی غذا درخت سے حاصل کرتی ہیں بعض بیلیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ جس درخت پر چڑھتی ہیں وہ سوکھ جاتا ہے یا اس کی نشو و نما رک جاتی ہے۔ کیونکہ یہ اس کے جسم سے خوراک ہی اتنی زیادہ مقدار میں لیتی ہے

صحرائی اور خشک علاقوں میں درختوں کی چھال بہت موٹی ہوتی ہے تاکہ خوراک اور پانی سورج کی گرمی سے جلد خشک نہ ہو جائے انکے پتے بھی چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں اور خوراک زیادہ مقدار میں بخارات بن کر اڑ نہیں سکتی۔ ایسے علاقوں میں درختوں میں کانٹے بھی ہوتے ہیں زیادہ مرطوب اور کثرت باراں والے مقامات میں درختوں کے پتے چوڑے چوڑے ہوتے ہیں کیوں ان کو خوراک اور پانی کی کمی کا خوف نہیں ہوتا۔

فطرت نے کوئی چیز بغیر مصلحت اور حکمت نہیں بنائی۔ ہر ایک چیز کی آفرینش کا کچھ نہ کچھ مقصد ہے۔ ایک دانشمند کی نظر میں ذرہ ذرہ اور پتہ پتہ "کتاب عرفان" کے کھلے ہوئے اوراق ہیں۔

مغربی

ڈائری کے چند اوراق

۳۔ جولائی

سنا ہے کہ شہنا پھر پردیس سے واپس آگئی ہے۔ بہت خوش ہے وہ! مدت کی آرزوئیں پوری ہوگئیں۔ لیکن میرا دل کیوں اس خوشی میں شرکت کرنا چاہتا ہے؟ میں تو آج بھی وہی ہوں ــــ ایک مضمحل اور سرتاپا مغموم انسان! ایک قیدی جس کی تمام راہیں مسدود کردی گئی ہیں۔ جسے کہا جاتا ہے ــ "یہ کرو اور وہ نہ کرو!" جس کی ہنسی بھی تلخ استہزا روپوش ہے !!

کل شہنا نے کسی کی معرفت یہ لکھ کر بھیجا تھا "خدا نے ہماری دعائیں قبول کرلیں۔ اب ہمیشہ کے لیے وطن آگئی ہوں۔ رقعہ پاتے ہی آیئے" اور لفافہ کی پشت پر یہ شعر مرقوم تھا ؎

"پردیس سے آئی ہوں اب دیس کی باغوں میں
پھر ہونگی نگاہوں سے چھپ چھپ کے ملاقاتیں"

میں نے اس کے جواب میں یہ لکھ کر روانہ کر دیا "تم آگئیں میں خوش ہوں۔ لیکن تمہارے پاس جانا ذرا کٹھن ہے۔ ملاقات کروں اور چھپ چھپ کر۔ آخر محبت کی دنیا میں اتنی پابندیاں کیوں عائد کردی گئیں۔ محبت تو آزاد ہے۔ میں اتنی پابندیاں پسند نہیں کرتا ہرحال کوشش کرونگا کہ ایک بار بھی تم سے مل لوں"

لکھنے کو تو میں نے لکھ دیا۔ لیکن اب سوچتا ہوں اس سے ملوں کیسے۔ ہر ہر قدم پر کانٹے بچھے ہیں۔ سوسائٹی کی نظر میں اس سے بات کرنی گناہ ہے۔ میرا یہ احساس مجھے کسی دن پاگل بنا ڈالیگا اور ایک دن ایسا بھی آئیگا جب میری لاش سماج کی تنگ دلی پر قہقہے لگائیگی۔

۵۔ اگست

"دھڑکنوں سے دل کی یہ سمجھا ہوں میں۔ زندگی بے چینیوں کا نام ہے"

جس دن میں نے ایک فلمی اداکار کی زبان سے یہ درد انگیز راگ سنا تھا نہ جانے کیوں میری آنکھیں اشکبار ہوگئی تھیں اور دل بیٹھ گیا تھا۔ لیکن آہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ایک دن ایسا بھی آنے والا ہے جب یہ راگ میری زندگی پر صادق آئیگا اور میں بھی اسی کو گنگنانے لگونگا۔!

وہ دن آگیا ــــ آہ وہ دن!

مستقبل کی تمنائیں اور حسین منصوبے دھوپ کی پرچھائیں ہیں میں نے اساس مستقبل پر زندگی کی بڑی بڑی امیدیں تعبیر کی تھیں کتنے منصوبے باندھ رکھے تھے لیکن آج میں دیکھ رہا ہوں کہ میری دنیا میں اندھیرا چھا گیا ہے اور طوفان کے بگولے گلشن امید ویران کیے ہیں ــ میں نہیں سمجھ سکتا آخر انسان کی زندگی میں یہ الٹ پھیر یہ تبدیلی، یہ انقلاب کیوں ہوتا رہتا ہے؟ کیوں ہماری زندگی سے قدرت کھیلنا چاہتی ہے ــ؟

آج میں نے کیا سنا ــــ وہی جس کا ساہا نے فیصلہ کردیا شہنا کی شادی! وہ ایک غیر مرد کے ہاتھوں سونپی جارہی ہے یا دوسرے لفظوں میں اسے فروخت کیا جارہا ہے! اس کے جسم کی قیمت لگ چکی۔ خریدار خوش ہے۔ باپ پھولے نہیں سماتا پھولے سے جلا ہی۔ ایک بازگراں کا خاتمہ ہوا۔

لیکن میں ــــ! میں کیوں مغموم ہوں۔ میرا دل کیوں پاش پاش ہورہا ہے شہنا کے لیے! آہ! اس کے لیے جس کے ساتھ میرے دل نے کسی دن چپکے سے پیمانِ محبت باندھا تھا جس نے اپنی آنکھوں سے محبت کا راگ چھیڑا تھا۔ بہت اچھا ہے ہم ہندوستانی سماج

نے اپنی دیرینہ عزت برقرار رکھی

۷۔ اگست:-

بادلوں میں چھپ رہا ہے میرا چاند
"زندگی" کیوں "موت" سے ملنے گئی

آسمان کی لامتناہی بلندیوں میں بادل کے ٹکڑے اُڑ رہے ہیں اور میں احساس کی تاریکیوں میں کھویا ہوا ہوں "محبت — جسے دنیا محبت کہتی ہے کیا واقعی وہ میرے لیے بھی محبت ہے؟" آج میں اپنے دل سے یہ سوال کر رہا ہوں۔ زندگی کی الجھنوں میں الجھا ہوا قیدی آخر کس سے سوال کر سکتا ہے۔ لیکن دل — آہ دل بھی خاموش ہے!

چاروں طرف ساون کی ہریالی فطرت کی رنگینیاں "شباب" کو ساغر بنا کر بے پیے جھوم رہی ہے۔ میٹھے چاند کی میٹھی میٹھی روشنیاں بادلوں میں تیر رہی ہیں اور ایک "دنیا کا بدنصیب انسان" آنکھیں کھولے صرف ڈوبتے ہوئے تاروں کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ کتنا اتصال ہے ان ڈوبتے ہوئے تاروں اور ناکام انسانوں میں؟ دل چاہتا ہے کہ ان حسین تاروں کا صرف مشاہدہ کرتا رہوں۔ تمام رات۔ یہاں تک کہ زندگی کی نبض ڈوب جائے اور میں بھی "شہاب ثاقب" کی طرح قبرستان کے گوشے میں چھپ جاؤں۔

شہتاب — میری زندگی کا چاند! کیا اب میں اس کی نقرئی شعاعیں دیکھ سکوں گا؟ کیا اب زہرہ اپنا رباب لیکر مجھے دلکش گیت سنائے گی؟ نہیں نہیں! وہ — آہ وہ چاند تو بادلوں میں ڈوب رہا ہے۔ دوسری دنیا کو جلوہ گر کرنے کے لیے اس کی حسین راگنیاں دوسری روح کو شادکام کریں گی —!

---

۱۲ ستمبر۔

کبھی میں نے بھی تارے گن کے راتیں اپنی کاٹی ہیں
کسی کے قہقہوں میں چاندنی راتیں لٹائی ہیں

— لیکن اب؟

اب — اب میں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چاہتا ہوں۔ تنہائی، سکوت!! مجھے روشنی کی ضرورت نہیں۔ ان چاند، تارے اور سورج کو تحت الثریٰ میں پھینک دو — پھینک دو انہیں کہ دنیا کو سکون ہو۔ آفتاب کی گرم گرم لو دے جیسی کرنیں کب تک دنیا کو پگھلاتی رہیں گی! کب تک چاند کی سرد چھاؤں میں ہم ٹھنڈی آہیں بھرتے رہیں گے اور کب تک ان حسین تاروں کو گن گن کر راتیں کاٹیں گے۔ آخر ہم بھی تو انسان ہیں۔

کسی ہمدرد نے آج مجھ سے یہ سوال کیا "آخر مجھے روشنی سے نفرت سی کیوں ہو گئی ہے؟" میں نے انہیں فوراً جواب دیا "مجھے تم سے بھی نفرت ہے"۔ یہ سن کر وہ متحیر ہو گئے پھر بولے "کیوں بھئی رشید! میں نے تمہارا کیا بگاڑا؟" میں نے کہا "قبلہ! آپ بھی تو ہندوستانی سماج کے ایک فرد ہیں۔ کیوں؟" جب انہوں نے یہ سنا گویا ان کی زبان گنگ ہو گئی اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پھر گویا ہوئے "میری سمجھ میں نہیں آتا آخر تم دنیا اور خاص کر ہندوستانی سماج سے اتنے بدظن کیوں ہو گئے؟ چند روز قبل تو تم دنیا کی رنگینیوں پر بہت اتراتے تھے"۔

میں نے کہا — "جی ہاں" ؎

کبھی نرگس کی آنکھوں میں بہاریں میں نے دیکھی ہیں
ستاروں میں ہزاروں جلوہ گاہیں میں نے دیکھی ہیں

لیکن اب —

مگر اب آنسوؤں سے ترجمانی دل کی کرتا ہوں
خزاں کی زرد پتی سے میں دامن اپنا بھرتا ہوں

---

۱۵ ستمبر

میرے سینہ میں ایک دل تھا جس میں محبت کی جلوہ پاشیاں تھیں۔ لیکن آہ! وہ دل تو میں نے حسن کی قربان گاہ میں بھینٹ

چڑھادی۔ اب میں بھکاری ہوں۔ دیمک چشیدہ اوراق کی طرح میرا سینہ چھلنی ہوگیا ہے اور آنکھوں میں موت کی سی تاریکیاں چھائی جولی ہیں۔ میرے سامنے ایک دریا تھا جس میں زندگی کی لہریں دوڑ رہی تھیں ——— اور اب وہی دریا سوکھ کر گھائی کی شکل اختیار کرچکا ہے جہاں خوفناک سیاہ شکلیں ڈسنے کے لیے بڑھتی ہیں۔

ورڈسورتھ کو "فطرت" میں ہزاروں جلوہ سامانیاں نظر آئی تھیں اور بارڈی ان جلوہ سامانیوں کے اندر موت کی پرچھائیں دیکھتا تھا ——— لیکن میں ——— مجھے "فطرت" کے اندر کیا چیز نظر آئی؟ خلا، خلا ——— خلا۔ جو نظروں کا دھوکا ہے، سراسر فریب ہے بہت ممکن ہے لوگ ہماری کم عقلی کا جنازہ پڑھ لیں۔ یا نہیں تو سڑی، مجنون، پاگل یا جو جی میں آئے بک ڈالیں۔ جو بھی ہو مجھے کسی کی پروا نہیں۔ میں ہندستانی سماج کا باغی ہوں۔ میں نے اس کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا ہے، اور زندگی کی آخری سانس تک بغاوت کی آواز بلند کرتا رہوں گا۔

مگر آہ! سینے میں یہ جلن کیوں؟ دماغ میں سوزش کس لیے یہ کس کا تخیل ہے جو میرے خفتہ جذبات کو ابھار رہا ہے ———؟ شہنا کی یاد، اس کی بادہ گسار آنکھیں میرے جسم میں خون کے جو چند قطرے باقی رہ گئے ہیں اُنہیں بھی چوس لینا چاہتی ہو شہنا! اتنا ظلم نہ کرو ایک ستائے ہوئے انسان پر۔ مجھے بھول جاؤ۔ ہمیشہ کے لیے: ہندستانی سماج میں محبت کا یہی انجام ہوا کرتا ہوا ہے۔ کاش میں تمہیں نہیں جانتا!

محمد یونس۔ احمر۔ کلکتہ

انجام آرزو

ہاشم ایک غریب گھرانے کا لڑکا تھا۔ مگر قدرت نے اُسے اپنی دولت کے لیے چُن لیا تھا۔ وہ بڑا ذہین اور طباع تھا۔ بچپن ہی سے اُسے ادبیات اور فنون لطیفہ کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ مڈل اسکول ہی سے اُس نے اچھے اشعار کہنا شروع کر دیئے تھے۔ اور ہر روز اسکول سے آکر گاؤں کے "پنڈت جی" کے پاس جاتا۔ اور اُن کے ہارمونیم پر بیٹھ جاتا۔ اسی عمر میں وہ اکثر ندی کے کنارے آفتاب کے طلوع و غروب کا نظارہ کرتا۔ اور جب واپس آتا تو سنہری کرنوں اور شفق کی رنگینیوں کو اپنے دامن خیال میں اچھی طرح جمع کر لیتا۔ شوکت بھی اس کا ساتھ دیتا۔ مگر یہ ایک عجیب بات تھی کہ دونوں جگری دوست ہوتے ہوئے کبھی ایک گفتگو پر متفق نہیں ہوتے۔ اگر شوکت دن کہتا تو ہاشم یقیناً اس کی مخالفت کرتا اور اس کو رات ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتا۔ مگر جو دلیلیں پیش کرتا وہ بڑی پختہ اور دور کی ہوتیں۔ ہاشم کا طائر خیال ہمیشہ بلندی پر ہوتا۔

دونوں دوست ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ہاشم اکثر شوکت ہی کے گھر رہتا اور وہاں گھنٹوں دونوں میں مکالمہ ہوا کرتا۔

شوکت کے دکان سے متصل سرور علی صاحب کا مکان تھا۔ یہ گورنمنٹ کے "اوورسیر" تھے۔ آمدنی معقول تھی۔ حال ہی میں اُنھوں نے نئے طرز پر مکان بنوایا تھا۔ شوکت اُنہیں چچا کہہ کر پکارا کرتا۔ ان کی ایک ہی اولاد تھی —— ریحانہ ——، ریحانہ دنیائے دل کا واحد تارہ، باغ ہستی کی بھینی بھینی خوشبو، نسیم صبح کی طرح سبک رو، اور گلاب کی کلی کی طرح شگفتہ اور خنداں تھی۔ ریحانہ کی ہر ادا میں ایک دلفریبی، ہر ہنسی میں ایک کشش، اور ہر انداز میں اک تاثیر تھی —— ابھی چودھویں کا چاند بننے میں چار بہاریں باقی تھیں۔

جب ہاشم شوکت کے گھر باتیں کرتا ہوتا تو سرور علی ہاشم کو بغور دیکھا کرتے۔ غالباً اس کی ذہانت اور فطری استعداد کا مطالبہ کیا کرتے۔ اور دل ہی دل میں خوش ہوتے —— ریحانہ بھی وہاں کھڑی دونوں کی گفتگو دلچسپی سے سنتی۔ اور ہاشم کی فتح اور شوکت کی شکست کو نہایت حیرت سے تکتی۔

(۲)

یہاں تھا دام سخت قریب آشیاں کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

گاؤں میں ملیریا کا بڑا زور تھا۔ کوئی ڈاکٹر نہ ہونے کے سبب کتنے غریب اس موذی مرض کا شکار ہو چکے تھے۔ ایک "پنڈت جی" تھے وہ بھی اپنی ناتجربہ کاری سے کتنوں کو گور غریباں پہنچا چکے تھے۔ ایک میل پر سرکاری اسپتال تھا —— ایک دن میاں سرور علی جلدی جلدی دوپہر میں اپنے کام سے گھر آئے۔ تھوڑی ہی دیر میں اُنہیں زور کا جاڑا محسوس ہوا۔ سات سات کمبل اور لحاف اوڑھائے گئے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا کہ اُنہیں کوئی اٹھا اٹھا کر بستر پر پٹک رہا ہے۔ شوکت وہیں موجود تھا۔ بخار دیکھا تو ۱۰۵ ڈگری تھا۔ ساری کیفیت ایسی تھی کسی کے سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ چار بجے ہاشم آیا۔ معلوم ہوا "اوورسیر صاحب" بیمار ہیں۔ شوکت وہیں ہیں۔ وہ بھی گیا۔ اُس وقت جاڑا کم ہو گیا تھا۔ مگر ابھی تک ہذیان کی حالت باقی تھی۔ ایسی حالت دیکھ کر ہاشم بڑے زور سے بگڑا "تم لوگ کیسے آدمی ہو۔ ان کو سرسام ہو گیا ہے اور کچھ کر نہیں" ڈر سے بیٹھے ہو۔ اس نے جلدی سے ٹھنڈا پانی منگوایا۔ کپڑا بھگا بھگا کر ان کی پیشانی پر رکھنے لگا۔ پھر وہاں شوکت سے کہا کہ اسی طرح

کرسے - اور ریحانہ سے کہا۔ تم پیشانی کے پاس آہستہ آہستہ اِن کو پنکھا جھلتی رہو۔ جب تک ہوش نہ آئے۔ اور خود سائیکل لے کر کہا، "میں ڈاکٹر کو بلانے جاتا ہوں۔ تھوڑی دیر میں "اُورسیر" صاحب نے پانی مانگا۔ فوراً تازہ پانی دیا گیا۔ پھر اِدھر اُدھر نگاہ کی تو شوکت اور ریحانہ اُنکے سرہانے تھے۔ اور ریحانہ کی ماں اُن کا پاؤں پکڑے بیٹھی تھیں۔ اُنھوں نے کراہتے ہوئے کہا۔ میرا... سر... چکرا رہا ہے۔ اور چارپائی اُلٹی جا رہی ہے... پھر کہا "شوکت!... بیٹا... ڈاکٹر کو بلا دو" شوکت نے کہا "آپ گھبرائیں نہیں.. طبیعت اچھی ہو جائیگی.... ہاشم ڈاکٹر کو بلانے گئے ہیں.... آتے ہی ہوں گے" اورسیر صاحب — ایں!... ہاشم! بڑا اچھا لڑکا ہے وہ...،

آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ ہاشم پسینہ سے تر، ہانپتا ہوا پہنچا۔ قطرے موتیوں کیطرح اس کے رنگین اور چکنے رخساروں سے ڈھلک کر قمیص میں جذب ہو جاتے تھے۔ چہرہ گرمی سے تمتمایا ہوا تھا —— شوکت "ڈاکٹر آ رہا ہے؟"

ہاشم "ڈاکٹر دوسری جگہ کسی مریض کو دیکھنے گیا ہے۔ ابھی تک نہیں آیا۔ اور اس کے کمپونڈر نے کہا، ابھی آنے کی کم ہی اُمید ہے کیونکہ وہ مریض بہت زیادہ خطرناک حالت میں ہے۔ اگر اندیشہ ہوا تو ممکن ہے۔ آج رات کو ڈاکٹر صاحب وہیں رہ جائیں....... صبح پھر جاؤں گا ——

ریحانہ کی ماں —— اُوہ رات کس طرح بسر ہوگی، میری طبیعت گھبرا رہی ہے) (ہاشم سے) تمہارے جانے کے بعد کچھ ہوش آ گیا تھا۔ اِس وقت پھر بے ہوش ہیں۔ خدا ہی ہم پر رحم کرے۔

ہاشم —— آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ اچھے ہو جائیں گے۔ (ریحانہ سے پنکھا لیکر) لو شوکت تم پنکھا جھلو۔ میں جلدی جلدی پٹی بدلتا ہوں — (ریحانہ سے) اور تم ٹھنڈا پانی لاؤ.......... ہاشم جلد جلد پٹی بدلتا تھا اور ریحانہ پانی بدلتی جاتی تھی ——

آٹھ بجے "اُورسیر" صاحب نے پھر پانی مانگا۔ ریحانہ نے اُٹھ کر پانی پلا دیا۔

اُورسیر صاحب —— (تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد ہلکی آواز میں) ڈاکٹر نہیں آیا؟

ہاشم —— باہر کسی مریض کو دیکھنے گیا ہے۔ شاید آج واپس نہیں آئے گا۔ کل صبح جا کر اُسے بلاؤں گا.... کیا اس طرح پنکھا جھلنے سے آپ کو آرام ملتا ہے؟

اُورسیر صاحب — ہاں! کچھ کچھ، چھوڑ دینے سے سر گھومنے لگتا ہے... اُوہ... بڑی بے چینی ہے... آہ!!

ریحانہ کی ماں — (ہاشم سے) ... بھیا تم آج رات یہیں رہو۔ تمہارے رہنے سے ہمارے دل کو اطمینان معلوم ہوتا ہے۔

ہاشم — آپ اطمینان رکھیں... میں یہیں رہوں گا اور شوکت بھی... ایک آدمی کو رات بھر جاگنا یہاں ضروری ہے....

اُورسیر صاحب کا بخار صبح ۱۰۲ ڈگری تک کم ہوا۔ ہاشم صبح ہوتے ہی اسپتال چلا گیا اور بمشکل ۹ بجے ڈاکٹر کو ساتھ لایا۔

ڈاکٹر —— (آلہ اور تھرمامیٹر سے دیکھ کر) کب سے بخار آیا ہے۔ دست بھی ہوا ہے؟؟

..... کل سے۔ اور ہاں صبح سے تین دست ہوئے۔ "ڈاکٹر: رنگ کیا تھا؟" "زرد"

ڈاکٹر —— ایں! اتنی جلدی!... اچھا کوئی بات نہیں۔ اچھے ہو جائیں گے۔ (تین پڑیا دوا نکال کر) ایک ایک گھنٹہ کے بعد کھلا دیا جائے۔ اور کہا "ان کے لیے صرف دودھ کا پانی... باقی دوا اسپتال سے ملیگی.... اور ہاں! ان کو اُٹھنے بیٹھنے نہ دیا جائے —— (ڈاکٹر اور ہاشم باہر چلے گئے)۔

ڈاکٹر —— ان کو ٹائیفیڈ ہو گیا ہے۔ بہت احتیاط سے رکھنا ہوگا۔ اور اچھے بھی ہوئے تو پندرہ دن سے کم میں نہ ہوں گے..

اسپتال میں دوا تو ہے نہیں۔ ہمنے ذاتی طور پر رکھی ہے اس میں سے دیں گے۔ خدا نے چاہا تو اچھے ہو جائیں گے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔

ہاشم۔ ہم آپ کے بہت احسانمند ہوں گے۔ مہربانی فرماکر اچھی دوا دیجئے۔ . . . .

. . . . چودہویں دن اُوسیر کا بخار ۹۹ ڈگری پر آیا اور سیر صاحب لاغری اور کمزوری سے پہچانے نہیں جاتے تھے۔ مگر یہی کیا کم تھا کہ اُن کی جان بچ گئی۔ گھر میں تیمارداری کرتے کرتے تمام لوگوں کا حال خراب ہوگیا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ برا حال ہاشم کا تھا۔ وہ مسلسل کئی رات تک نہ سویا . . . . اب اور سیر صاحب کی صحت اچھی ہونے لگی۔ ہاشم دن کے بعض حصوں میں یہاں آتا اور تھوڑی دیر رہ کر گھر چلا جاتا۔ لیکن ہاشم جب یہاں آتا تو اُسے محسوس ہوتا کہ گھر کے تمام لوگ اس سے انتہائی پیار اور شفقت سے پیش آتے ہیں۔ اس لیے اُس نے آمد و رفت اور کم کردی۔ ایک ہفتہ کے بعد سیر صاحب اپنے کام پر جانے لگے۔

(۳)

ہاشم اور شوکت میٹرکولیشن امتحان کی تیاری میں ہمہ تن مصروف تھے۔ لیکن شام کو ندی اُس پار پہاڑ کی طرف نکل جاتے۔ کبھی پہاڑ کی چوٹی پر دونوں بیٹھتے اور گھنٹوں گفتگو کرتے ——— شوکت ایسے موقعہ پر محبت کی طرفداری کرتا اور ہاشم اس کی مخالفت ——— شوکت۔ اتنا تو سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ قیس ضرور کوئی مرد تھا اور اسیطرح لیلی بھی کوئی عورت تھی۔ اور دونوں میں محبت بھی تھی۔ اس کے علاوہ عقل بھی اس کو بعید نہیں سمجھتی۔ کیونکہ روزانہ بے شمار ایسی مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ ہم خود اپنے دل میں کبھی محبت کی کسک اور میٹھا میٹھا درد محسوس کرتے ہیں۔ کچھ اصلیت ہی تو ہے۔ اگر اس کا وجود نہ ہوتا تو نا ممکن تھا اتنے آدمی اپنی جانیں دیتے۔

ہاشم ——— ہم ایسی بے بنیاد باتیں تسلیم نہیں کرتے۔ رہے تم۔ تو تم اپنے متعلق جتنے جھوٹے دعوے ہوں اختیار کرسکتے ہو۔ اور جو لوگ اپنی جانیں دیتے ہیں وہ تمہارے جیسے جذباتی انسان ہوں گے۔ جھوٹے جذبات ہی انسان کو ہلاکت تک پہنچا دیتے ہیں۔

شوکت ——— تاریخ کی کتابوں میں بھی ہم محبت کی داستانیں پڑھتے ہیں۔ اور ان کی واقعیت سے ہم کو انکار نہیں ——— تاریخ انگلستان میں تم نے نہیں پڑھا۔ ہنری ہشتم اور ملکہ کیتھرائن آپس میں کس قدر محبت رکھتے تھے! بلکہ کیتھرائن نے تو اُس کی محبت میں اپنی جان تک دیدی۔

ہاشم ——— لیکن آخر تمہارے ہی کہنے کے مطابق، ہنری بھی تو ملکہ سے محبت کرتا تھا؟ پھر کیوں اس کو طلاق دیدی؟ کیا محبت کے یہی معنی ہیں؟ رہی کیتھرائن تو وہ ایک نیک عورت تھی اور اپنی موت سے مری

شوکت ——— الور ناول تم نے پڑھا ہے۔ کشور سلطانہ کس قدر الور سے سچی محبت کرتی تھی۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یقیناً وہ کسی دکھے ہوئے دل کی حقیقی اور واقعی آپ بیتی ہے۔

ہاشم ——— (فاتحانہ ہنسی کے ساتھ) اول تو ایک فرضی داستان ہے۔ اور اس کے سوا، وہ کس قدر جلد الور سے دل برداشتہ ہوگئی تھی۔ یہ بھی معلوم ہے؟ سچی محبت کبھی اپنے محبوب کی ادنیٰ سی تکلیف بھی نہیں دیکھ سکتی اور اس کا وجود دنیا میں ناممکن ہے۔ (لیکن ہاشم ریحانہ کی یاد سے اپنے دل میں کمزوری محسوس کررہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے) آفتاب غروب ہونیوالا تھا۔ دونوں دوست اٹھے اور گھر کی طرف چلے

(۴)

فروری کے آخر ہفتہ میں دونوں کا امتحان ختم ہوا۔ دونوں بے صبری سے نتیجہ کا انتظار کرنے لگے۔ پندرہ دن کے بعد نتیجہ نکلا۔ دونوں

فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئے۔ مگر ہاشم بعض بعض مضامین میں خصوصی امتیازی نمبر سے کامیاب ہوا تھا۔ خصوصاً ادب میں۔ اس لیے اسکو گورنمنٹ اسکولرشپ کا پورا یقین تھا۔ ہاشم نے آئندہ تعلیم جاری رکھنے کا ارادہ کرلیا۔ اور شوکت تجارت کی طرف متوجہ ہوا۔

(۵)

اس تین سال کے عرصہ میں، جب ریحانہ کے والد بیمار پڑے تھے، ہاشم اور ریحانہ کے دلمیں دبے ہوئے جذبات جاگ اٹھے تھے اور بیتابیاں بیدار ہوگئی تھیں۔ اس وقت ہاشم سترہ سال کا خوش قامت اور خوش رو نوجوان تھا۔ علم کی فطانت اس کی کشادہ جبیں اور شوخ آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔ اور ریحانہ ـــ ریحانہ پرچودھویں رات کا چاند کھلے ہوئے گلاب کا پھول۔ نرگس کی بیدار آنکھ اور نسیم صبح کی مستی قربان اور ہزار جان سے نثار ہورہی تھی۔

اس درمیان میں ریحانہ کئی مرتبہ اپنی بیقرار آرزوؤں سے مجبور ہوکر ہاشم سے ملی کبھی لفظ محبت ادا نہ ہوا۔ لیکن ایک دوسرے کی کیفیت سے بخوبی واقف ہوگئے

(۶)

ہاشم کلکتہ کے ایک کالج میں سائنس کی تعلیم حاصل کرنے لگا اور رفتہ رفتہ کامیابی حاصل کرتا جاتا تھا۔ رحیم ہاشم کا دوسرا دوست تھا۔ اور کالج کا کلاس فیلو۔ وہ سینما کا بہت شائق تھا۔ ہاشم کو بہت چاہتا تھا اسلیے اکثر اُسے سینما پکڑکرلے جاتا۔ اور رحیم ہرچند ہاشم کو دریا کے کنارے سینما اور میدان لے جاتا مگر وہ اُس کی اداس طبیعت کا علاج نہ کرسکا۔ ریحانہ اور شوکت کی جدائی ہاشم کےلیے بہت گراں تھی وہ بہت افسردہ اور نڈھال معلوم ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ریحانہ اور شوکت کا خط آجاتا تو دل کو کچھ تسکین ہوتی مگر پھر وہی جدائی اور قیامت کا نقشہ۔ ایک مرتبہ اُس نے شوکت کو اپنے خط میں یہ چند اشعار لکھ کر بھیجے۔

اکثر شب تنہائی کچھ دیر پہلے نیند سے
گذری ہوئی دلچسپیاں بیتے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمع زندگی
اور ڈالتے ہیں روشنی
میرے دل صد چاک پر

دل کا کنول جو روز و شب رہتا شگفتہ تھا سو اب
اُس کا یہ ابتر حال ہے اک سبزۂ پامال ہے
اک پھول کملایا ہوا
بکھرا ہوا پھیلا ہوا
روندا پڑا ہے خاک پر

ہاشم ان اشعار کو بہت لے کے ساتھ پڑھتا۔ اور نہایت آہستہ آہستہ، ہر لفظ، بلکہ ہر حرف الگ الگ کرکے اس سے ایک ایک اثر پرکیف نغمہ اور درد آفریں سوز پیدا ہوتا۔

ایک دن اس کے پاس ایک حیرت انگیز خط آیا۔ اور اس کی دنیا یک بیک روشن ہوگئی:-

غالباً تم حیران ہوگے کہ کسی نے اس طرح خطاب کیا اور پہلی مرتبہ ـــ جو میں لکھ رہی ہوں اس کا تم کو یقین نہیں ہوسکتا۔ اور تعجب ہے مجھے خود اس پر یقین کہ ایسا ہوگا ـــ ایک دن ابا اماں سے اکیلے میں کہہ رہے تھے اور میں پیچھے دیوار سے لگی سن رہی تھی ـــ ابا۔ ہاشم کتنا اچھا لڑکا ہے۔ دیکھو نہ ہمیشہ کامیاب ہورہا ہے اور اس کے اخلاق کتنے پاکیزہ ہیں؟۔ اماں۔ ہاں مجھکو بھی بہت پسند ہے ـــ ابا۔ مگر خیال ہے کہ شاید اُس کے والدین راضی نہ ہوں۔ اور خود ہاشم کے خیال کا اندیشہ ہے۔ مگر خیر ایک مہینہ کے اندر معلوم ہوجائیگا۔ .... یہ جو خواب ہم اور تم چند سال سے دیکھ رہے تھے، اس کی تعبیر معلوم ہوتی ہے اور کچھ کچھ صحیح ہوتی نظر آرہی ہے، خدا کرے

جیسا ہی ہو۔ دیکھو اگر تمہارے ابا تمہارے پاس خط لکھیں تو ضرور ضرور اقرار کرلینا۔ تم کو میری محبت کی قسم۔ . . . ضرور اقرار کرلو . . . » ریحانہ

ہاشم حیران تھا سمجھ نہیں سکتا کہ خواب ہے یا بیداری۔ کبھی کبھی کمرہ میں ٹہلنے لگتا کبھی دھوکا سمجھ کر پھر خط پڑھنے لگتا۔ اتنے میں رحیم آگیا

رحیم ـــ آج تو تمہارا چہرہ گلاب کی طرح کھلا معلوم ہو رہا ہے اور آنکھوں میں نور چمک رہا ہے۔ بات کیا ہے؟

ہاشم۔ دیکھو نہ، یہ خط آیا ہے، مجھے تو یقین ہی نہیں آتا۔

رحیم (خط پڑھ کر) مبارکباد، مبارکباد! چلو آج سینما چلیں۔ بڑا اچھا کھیل ہے۔ اس میں بھی محبت کی داستان ہی دیکھو گے دیکھنا دو سچے محبوب کس طرح ملتے ہیں۔ تم کو تجربہ بھی ہو جائیگا۔

ہاشم۔ امتحان تو بہت نزدیک ہے . . . . . خیر چلو . . . .

(۷)

ہاشم امتحان کی تیاری میں جان و دل سے منہمک تھا۔ نہ اس کے کھانے پینے کا ٹھکانا تھا نہ سونے کا اس لیے اس کی صحت آدھی ہو چکی تھی۔ ایسی حالت میں اک دن شوکت کی خبر آئی۔ اس کا سر چکرا گیا۔ جب ہوش ہوا تو رحیم سے کہہ رہا تھا . . . . " دنیا میں خوشی بھی ہے رنج بھی۔ ابھی چند دن قبل میں انتہائی خوش تھا۔ آج مجھے انتہائی غم ہے . . . آہ اب میں کہاں جاؤں؟ وہ میرا بھائی تھا اور بھائی سے بڑھکر پیارا . . . اُف رنج و غم کا کوئی ٹھکانا نہیں!"

ہاشم بہت حساس طبیعت کا آدمی تھا، رنج ہو یا خوشی فوراً اس کے دماغ پر اس کا اثر چھا جاتا۔ صحت تو کمزور تھی ہی۔ شوکت کی بے وقت موت سے اس کی صحت کو اور بھی صدمہ پہنچا۔ اب اس کا دماغ اور بھی ماؤف ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر نے اُسے مکمل آرام لینے کی تاکید کردی تھی مگر اُسے پھر امتحان کا خیال ہوا، شور مچاتا باہر کی طرف بھاگا۔ وہ انگریزی کا کوئی شعر پڑھتا بڑی تیزی سے بھاگتا جاتا تھا۔ جب ہوسٹل کے دوسرے ساتھی دوڑے تو وہ سڑک پر تھا۔ بڑی مشکلوں سے پکڑ کر لایا گیا۔ اس کے کپڑے تار تار تھے۔ پھر اسکو میڈیکل کالج پہنچا یا گیا۔ جہاں وہ مکمل ڈیڑھ ماہ رہا۔

(۸)

ریحانہ کے والدین کو جب یہ خبر معلوم ہوئی تو وہ سخت حیرت میں پڑ گئے۔ ریحانہ کی ماں چاہتی تھی کہ اب ریحانہ کی شادی کسی دوسرے لڑکے سے کردی جائے اور بہت جلد۔ سرور علی کا خیال کچھ ہاشم سے کرنے کا تھا۔ مگر وہ اپنے بیوی سے مجبور تھے۔ وہ کہتی کہ میں اپنی زندگی میں اپنی بیٹی کی زندگی کسی طرح خراب کرنا نہیں چاہتی۔ اور نہ اس کو جیتے جی موت کے منہ میں ڈھکیلنا چاہتی ہوں۔ اور یہ کسی طرح نہیں ہو سکتا ـــ جب ریحانہ کو ہاشم کا حال معلوم ہوا تو اس کے خرمن امید پر بجلی سی گر پڑی۔ وہ بہت روئی اور کئی دن تک روتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ آخر وہ سنبھلی اور دل میں کہا "ہاشم! میں تمہاری ہوں اور ہمیشہ تمہاری رہونگی۔ اس کے لیے والدین کتنے ہی خلاف نہ ہو جائیں۔ اور چاہے مجھے جان کی بازی کیوں نہ لگانی پڑے . . . . ." اُس نے ہاشم کو خط لکھا کہ جلدی آئے . . . مگر ہاشم تو اسپتال میں تھا

(۹)

" سرور علی صاحب ـــ ایک پچیس سال کا لڑکا، انگریزی تعلیم یافتہ۔ گھر کا خوشحال، موضع احمد نگر میں رہتا ہے۔ اسی سال ایم اے کا امتحان دیا ہے۔ مگر ذرا رنگ سانولا اور بدن بھاری ہے۔

ریحانہ کی ماں ـــ کوئی حرج نہیں۔ اس کا جلد انتظام ہونا چاہیئے۔ اور ہاں، ہاشم کے والد کو صاف صاف جواب دیدیجئے۔

.... ریحانہ کی شادی کا انتظام ہو رہا تھا۔ ریحانہ انتظار کر رہی تھی کہ اب ہاشم آتا ہے۔ بارات آگئی اور عقد پڑھا دیا گیا۔ ابھی تک ہاشم نہیں پہنچا۔ صبح میں جب ریحانہ رخصت ہونے لگی تو ایک گلاس پانی منگوایا اور لوگوں کی نظر بچا کر کچھ نکالا اور کھا کر پالکی پر بیٹھ رہی۔ اور یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئی، اگر ہاشم آئے تو سلام کہہ دینا۔......

ہاشم جب ہوسٹل آیا تو ریحانہ کا خط پڑھا اور سیدھا گھر روانہ ہوا۔..... کیا ناظرین اِن کا انجام سننے کے منتظر ہیں؟..

انجام

اک شاخ پر کھلا تھا — اک پھول — تیرا پیماں
اور اُس پہ ایک تتلی — وہ میرا شوخ — ارماں

کچھ خشک پتیاں ہیں — اب خاک پر پریشاں
اور اُن کے پاس دو پَر — بے حس، شکستہ، بے جاں

محمد امین الحق

عربوں کی موسیقی

مغربی اور مشرقی موسیقی کا موازنہ کرتے وقت ہم کسی حال سے اب یقین نہیں کر سکتے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی تعلق بھی ہے، حتیٰ کہ عربی موسیقی کے بارے میں بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے کچھ میراث مغربی مورو ثی کے لیے چھوڑا ہوگا، یوں تو عربی اور اسلامی تہذیب و تمدن نے بہت کچھ اہل یورپ کو دے ڈالا جس کو اگرچہ وہ اس وقت ماننے سے انکار کرتے ہیں، تاہم تحقیق شاہد ہے کہ انھوں نے کیا کیا ہم سے لیے اور ان پر کس کس طرح کی رنگ آمیزی کر کے دنیا کے سامنے پیش کیے، خود انصاف پسند مصنفین یورپ اعتراف کرتے ہیں۔ "آرنالڈ" کی "لیگیسی آف اسلام" کو پڑھ کر عبرت ہوتی ہے کہ ہم نے کتنے احسانات یورپ والوں پر کیے اور اب ان میں سے وہ ایک کو بھی ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

بہرحال بادی النظر میں تو عربی اور یورپی موسیقی میں کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ دونوں کے سُر اور وزن باہم اتنا ہی تفاوت رکھتے ہیں جتنا کہ ایک پڑی لکیر اور ایک کھڑی، لیکن تاریخ موسیقی کو پڑھنے اور غور کرنے پر ہم اس نتیجے پر تو ضرور پہنچتے ہیں کہ کم از کم سُر، قافیہ اور راگ میں رس پیدا کرنے کا طریقہ ہم دونوں میں بہت کچھ ایک ہی ہے۔ اب سے بہت پہلے دسویں صدی میں تو ان دونوں کے درمیان کوئی فرق کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ ان دونوں مقامات کے گانوں کے وزن قریب قریب ایک ایک ہی تھے، اور دونوں نے برابر حصہ یونانی اور آشوری موسیقی سے پایا۔ سُروں کے برابر اور متوازن ہونے سے جو آجکل ہم مراد لیتے ہیں وہ ان میں بالکل نہ تھا۔ اُس وقت اگر باریک بینی سے کوئی فرق ان میں قائم کیا جا سکتا تھا تو صرف یہ کہ عربوں کے گانے مقفیٰ اور مسجع ہونے کے ساتھ مخصوص اوزان میں سختی کے ساتھ کسے ہوتے تھے اور گانوں میں سریلا پن اور رس پیدا کر کے گانوں کو دلکش بنانے کا طریقہ ان میں اتنا اچھا تھا کہ یورپ والوں پر بغیر اثر ہوئے نہ رہ سکا۔

عربی موسیقی کا منبع و مخرج پرانی سیمیا طیقی موسیقی کے اصول اور طرز قرار دیئے جاتے ہیں۔ دلیل میں پیش کی جاتی ہے کہ اسلام سے قبل حیرہ اور غسان کی عرب حکومتیں ایران اور یونان سے اس قدر وابستہ تھیں کہ انھوں نے ان دونوں ممالک کی بہت سی باتیں اپنے میں جذب کر لیں۔ چنانچہ ایرانی اور بازنطینی موسیقی سے بھی ان لوگوں نے بہت کچھ استفادہ کیا۔ اور چونکہ ایران اور بازنطینی موسیقی میں سیمیا طیقی کا اصول وزن بدرجہ اتم موجود تھا اس لیے یہ چیز بعد میں عربی گانوں میں بھی شدت سے رواج پا گئی۔ عربی قواعد عروض کا مطالعہ کرنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کے اندر وزن بالکل فیساغورثی اوزان کے وزن پر ہے۔

اسلام کے ابتدائی زمانے ہی میں حجاز میں ایک نئے طرز کی ایجاد ہوئی جس کو "ایقاع" کہتے ہیں، یہ طرز اتنا مشہور تھا کہ اس کے وزن پر عام طور سے لوگ گانے تیار کرتے اور گاتے تھے۔ ٹھیک ان ہی وقتوں میں عربوں نے ایک نیا موصول موسیقی ابن مسجح (۷۰۵ - ۷۱۴) سے سیکھا۔ کہتے ہیں کہ اس کا ایجاد کردہ یہ اصول ایرانی اور بازنطینی طرزوں سے ممتزج تھا۔ لیکن ڈاکٹر جی۔ پی۔ ڈین لنڈ کا مقولہ ہے کہ ایرانی اور بازنطینی اصولوں نے عربوں کی ملکی اور دیرینہ طرز موسیقی پر کوئی گہرا اثر نہیں ڈالا بلکہ ان کے یہ اصول بذات خود عربوں کے ماڈوں کے حساب سے معرّب کر لیے گئے۔" عرب جس چیز کو غیروں سے حاصل کرتے تھے اس کو اپنی آسانی کے لیے ہمیشہ اپنے سانچے میں ڈھال لیا کرتے تھے۔ ابن مسجح کا یہ طرز بغداد کی خلافت کے زوال تک قائم رہا۔

اس دوران میں جب کہ حجاز اور بغداد میں مذکورہ بالا طرز جاری رہا، عربی موسیقی کے اندر کچھ نہ کچھ تبدیلی برابر ہوتی رہی اور اس میں نئی باتوں کا اضافہ ہوتا گیا۔ آخرکار ۸۵۰ء میں ایک مشہور مغنی اسحٰق الموصلی نے پرانے طرز پر کچھ نئی چیزیں کہنی شروع کیں اور تھوڑے عرصہ کے بعد پرانے قالب پر ایک نیا غلاف چڑھا کر اس نے اپنے نام سے ایک طرز کی ایجاد کی۔ یہ اتنا مقبول ہوا کہ الاصفہانی کے وقت (۹۶۷ء) تک اہل عرب کا یہ ایک خاص طرز رہا۔ لوگوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ انھوں نے اب اس کا بھی ڈھانچا بدلنا چاہا اور مروجہ راگ کے پہلے جو راگ تھی اس میں تجدید کر کے اس کے وزن پر ایک نئی چیز تیار کی اور اس کا نام "زلزولی" اور "خراسانی" رکھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ عربوں میں اس طرز کی تحریک یوں شروع ہوئی کہ چند ممتاز یونانی عروض دانوں نے اپنے ملک کے پرانے طرز کو واپس لانے کی فکر میں چند اہم تصنیفیں کیں جن کا اثر عربوں پر بھی پڑا۔ لیکن اس بیان کے خلاف عرب کے ممتاز مصنفین کا قول بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کندی (۸۷۴ء) الاصفہانی اور اخوان الصفا کی تحریروں سے معلوم پڑتا ہے کہ باوجود بہرہ اندوز ہونے کے عربی ایرانی اور بازنطینی موسیقی میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اگیارہویں صدی میں زیادہ تر ایرانی اور خراسانی طرز موسیقی کا رواج تھا لیکن بعد میں چل کر صفی الدین عبدالمومن (۱۲۹۴ء) نے ایک دوسرا نیا طرز ایجاد کیا اور اس کے بعد پھر دور متوسط کے ختم پر ایک دوسرے وزن نے جگہ لی جو آج تک عربوں میں رہی ہے۔ بہر حال یہ تو عرب خود مانتے ہیں کہ انھوں نے ایرانی اور بازنطینی موسیقی سے بہت کچھ استفادہ کیا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ماننا پڑیگا کہ ایرانی اور بازنطینی بھی عربوں کے طرز اور اصول موسیقی کا احسان لیے بغیر نہ رہ سکے۔

عربوں کا موسیقی سے تعلق :۔ اس بات کا اندازہ لگانے کے لیے کہ عرب کے باشندے موسیقی سے کس درجہ وابستہ تھے اور ان کو اس فن سے کتنی رغبت تھی، ہم کو چند ان کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑے گا جن میں کثرت سے ان کی موسیقی کے کارنامے درج ہیں۔ ایسی کتابیں "الف لیلے" ابن عبدالعد کی "عقد الفرید" الاصفہانی کی "کتاب الاغانی" وغیرہ ہیں جو عموماً دسویں صدی کی تصنیفیں ہیں ایک اور کتاب النوری کی ہے جو تیرہویں صدی کی لکھی ہوئی ہے ان کتابوں کے پڑھنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ عربوں کا تعلق موسیقی کے ساتھ گہوارے سے لے کر گوشۂ قبر (من المھد الی اللحد) تک ہے زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جس میں ان کے زبان سے کوئی راگ نہ نکلتا ہو۔ غم ہو یا خوشی، جنگ ہو یا صلح، کام ہو یا کھیل ہر وقت کے لیے ان کے گانے مخصوص ہیں۔ ان کی روح، ان کا جسم بلکہ ان کا ہر ہر رونگٹا تار رہتا ہے۔ ارض و سما کی تمام چیزیں ان کے لیے نغمہ سنج ہیں اور ادنیٰ سے ادنیٰ آہٹ بھی ان کے قلب کے تاروں کو حرکت دے سکتی ہے۔ پہاڑ، میدان، درخت، طیور، بہائم غرض کہ ہر چیز کی آواز میں اجزاء موسیقی کو وہ شامل پاتے ہیں۔ اصول عروض کی ایجاد سے پہلے، جیسا کہ روایات سے منقول ہے، وہ راہ چلتے اشعار موزوں کیا کرتے تھے اور راونٹوں کے پیروں کی تھاپ پر مصرعوں کا وزن بیٹھاتے چلے جاتے تھے۔ اف! کس قدر موسیقیت ان کی رگ و پے میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ لیکن ادھر ایک زمانہ ہے کہ ان پر بد ذوقی، رکھو پن اور بے کیفی کا الزام لگانے کے لیے تیار ہے، بالخصوص ہندستانی نیم عالم کہ کسی حال سے ماننے کو تیار ہی نہیں کہ ان ریگستانوں اور نخلستانوں کے رہنے والوں میں بھی سرود اور کیف کے اجزا موجود ہو سکتے ہیں۔

ایام جاہلیت میں کوئی بھی صاحب حیثیت عرب ایسا نہ ہوتا تھا جس کے یہاں ایک گانے والی چھوکری ملازم نہ ہوتی۔ گھر کے دیگر کاموں کے علاوہ ان لڑکیوں کے ذمے یہ خاص کام تھا کہ وہ اپنے مالک کو موقع و محل کے مطابق فرصت کے وقت گانے سناتی رہیں اسی سے عرب قوم کے انتہائی ذوق و شوق کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس فن میں انہیں کہاں تک ملکہ تھا اس کے لیے کسی دلیل کی چنداں ضرورت نہیں اس لیے کہ بقول ابن خلدون "کسی فن کی ابتدا اسی وقت ہو سکتی ہے جب وقت اس فن کے کرنے والے پیدا ہو جائیں۔ موسیقی نواز نے والے عرب ایک مدت سے تھے علاوہ ان کے یہاں اس کی ترقی نہ ہوتی تو پھر کہاں ہو سکتی تھی۔

عربوں کا یہ ذوق اسلام کے بعد اسی جوش و خروش کے ساتھ برقرار ہے۔ باوجود بیشتر اسلامی قانون کی بندشوں کے گانے والے عربوں میں ایک ممتاز جگہ رکھتے ہیں۔ بعد میں چند صدی پہلے ایک دور ایسا بھی گذرا ہے کہ اس میں عربی موسیقی کو وہ فروغ حاصل ہوا کہ اس کے سامنے یورپ و دیگر ممالک کی موسیقی کے دلدادے دب گئے عرب گلے بازی کو ساز کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے یہاں برجستہ اشعار کہنا اور ان کو ترنم کے ساتھ گانے کا عام رواج ہمیشہ سے ہی چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں کا ہر شاعر کثرت سے اشعار کہتا تھا اور راوی جو ان اشعار کو ذہن میں محفوظ رکھتے تھے، مجمع کے سامنے ان کو گا کر سنایا کرتا تھا۔ گانوں میں علاوہ قصیدے کے غزل، قطعے اور موال وغیرہ بھی گائے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ مغربی ممالک کے عرب باشندوں نے اصناف سخن میں دو کا اور اضافہ کیا اور ان کا نام "زجل" اور "موشح" رکھا گیا یہ عموماً مشرقی اور مغربی خیالات اور طرز بیان سے مل کر بنے اور گانے کے طور پر گائے جاتے تھے گانے وقت مغنیان عرب عروض اور قافیہ کا لحاظ کم رکھتے تھے۔ البتہ ان کے یہاں کلام میں لطافت اور آواز میں اتار اور چڑھاؤ کے ساتھ سریلا پن اور رس پیدا کرنے کا عام رواج تھا۔ گاتے وقت عموماً دو چار گویئے مل ہی کر گاتے ہیں۔ گانوں کے ضمن میں ساز ندے تاروں کو لگاتار چھیڑتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی ان میں سے کسی کو تیزی سے چھیڑ دیتے ہیں جس سے سر میں بیداری سی پیدا ہو جاتی ہے اور اس کو حسن موسیقی تصور کرتے ہیں۔ عموماً جو ساز استعمال کرتے ہیں وہ یہ ہیں:-

عود، تنبور، قانون، قصبہ، نے، طبل، دف اور قطیب وغیرہ۔ ان کے علاوہ اور بھی ساز ہیں جن کو وقت وقت سے استعمال کیا جاتا ہے سب سے زیادہ مشہور چیز موسیقی میں "نوبت" تھی جس کو یورپ والوں نے بھی بہت پسند کیا۔

خاص خاص جشن کے موقعوں پر نغمہ و سرود کا ہونا لازم تھا۔ گانے والوں میں عورتیں زیادہ تر ہوتیں۔ مرد طبل اور شاہین بجاتے اور سروں کو ملاتے جاتے ان کے سروں پر ایک ٹوپی ہوتی جس میں چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں لگی ہوتیں۔ سروں کو جنبش دیتے وقت ان میں سے بھی آواز نکلتی اور گونجتی ہوئی آواز میں مل کر عجیب دلکشی پیدا کر دیتی۔

اب تک تو ہم ایسی موسیقی اور سازوں کا تذکرہ کرتے رہے جو مخصوص نشست گاہوں اور مجلسوں میں عام تھیں۔ ان کے علاوہ فوجوں اور لشکروں کے ساتھ جن سازوں کا استعمال ہوتا تھا وہ یہ ہیں:-

زمبیر، سرنائی، بوق، نفیر، طبل، نقارہ، دمامہ اور کاسہ وغیرہ مسلمانی لشکروں میں فوجی باجے بہت ضروری سمجھے جاتے تھے۔ ان کا وجود سپاہیوں کو ابھارنے اور جوش میں لانے کے لیے ضروری تھا۔ ہر بڑے فوجی افسر کے ساتھ ایک دستہ سازندوں کا ضرور ہوتا، جتنا ہی بڑے عہدے کا افسر ہوتا اتنا ہی بڑا دستہ سازندوں کا اس کے ہمراہ ہوتا۔

بہر حال اسلام لانے کے بعد بھی عرب اپنے پرانے ہر دلعزیز ذوق کو نہ چھوڑ سکے۔ یہی چیز ہے جس نے جہالت کے دور سے ان کا ساتھ اب تک نہ چھوڑا کیا۔ صوفی کیا ملا ہر ایک میں تھوڑا بہت ذوق موسیقی ضرور رہا۔ صوفیوں کے یہاں تو قوالی جزو خاص بن گئی ہے۔ امام غزالی نے تو موسیقی اور اور کیف پر بہت کچھ لکھ مارا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ نغمہ و سرود سے انسان میں ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے اور اس وجدانی حالت میں وہ مشاہدۂ لذات کرتے ہیں یہاں ہمیں کسی فرقہ و جماعت کے اعتقاد سے کوئی تعلق نہیں کہنا تو یہ ہے کہ موسیقی کس درجہ عرب اور عربوں سے متاثر اقوام کی ذات سے وابستہ ہو گئی ہے۔ یہی کافی دلیل ہے اس بات کی کہ اس قوم کے اندر کس درجہ ترنم اور کیف موجود ہے۔ انہی چند باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بعض عیسائی مصنفین اسلام پر بڑے بڑے اتہام لگائیں۔ کسی یوروپین مصنفین کا قول ہے کہ نغمہ و سرود یا قوالی سے مسلمان جتنا مسرور ہوتے ہیں۔ غالباً قرآن کی قرأت سے بھی نہ ہوتے ہوں گے۔ لیکن اس کا یہ کہنا غلط ہے نغمہ و سرود اور قرأت قرآن دو مختلف چیزیں ہیں۔ قرآن احکام کی کتاب ہے۔ اس لیے نہیں ہے کہ اس کے پڑھنے سے وجدانی کیفیت طاری ہو۔ وہاں تو اس کو سننا اور سن کر اس کے احکام کی پیروی کرنے کی ضرورت ہے

نہ کہ ایک تو دی کی خوش گلوئی پر وجدانی کیفیت قائم کرنے کی۔ احکام کو سمجھنے کے لیے ہوشمندی اور بیدار مغزی کی ضرورت ہے نہ کہ بیخودی اور بے ہوشی کی۔ اس کے برخلاف موسیقی یا قوالی میں حیات انسانی کے متعلق کوئی قانون نہیں درج ہوتا۔ قرآن کا تعلق حیات انسانی کی تنظیم اور تنسیق سے ہے اور گانے یا قوالی کا لگاؤ روحانی اور نفسانی مسرتوں سے، وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے۔ غیر اس قسم کی بیجا تراشیں تو مصنفین یورپ اکثر نکالتے رہتے ہیں۔ غالباً انھوں نے بھی اپنا مذہبی فرض سمجھ لیا ہے کہ کچھ نہ کچھ برائی کے سوسے اسلام میں نکالتے رہیں۔

مختصر یہ کہ عربوں میں کافی جذبہ موسیقی ہمیشہ سے موجود ہے اور ان کے اس فن سے ایک عالم نے استفادہ کیا۔ سمرقند سے لیکر غرناطہ تک کے تمام ممالک اس کسب کردہ ہنر کے کمالات کو دکھاتے رہتے ہیں اور ان سے اپنے اوپر عربوں کے احسانات کو ظاہر کرتے رہتے ہیں۔

(مولوی) احد العبد ایم اے

لوہے ۔ نوجوان



نوجوان کی تعلیم اور تربیت کی
جائے۔ اس سے بڑھ کر حکومت
کیلئے اور کیا عطیہ ہوسکتا ہے؟

(سیسرو)

صنعت وحرفت کو ترقی دینا اور اس کا جاری رکھنا
ہمارے منتظمین کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ عملی تجربہ کار
لوگ جمشید پور میں نوجوانوں کی علم کی راہ میں رہنمائی کرتے
ہیں۔ ہندوستان کی صنعتی فوج میں بھرتی ہونیوالوں کی بہتات
کا ہونا ایک یقینی امر ہے

TATA STEEL

ٹاٹا اسٹیل

دی ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی لمیٹڈ۔ ہیڈ سیل آفس نمبر ۱۰۲ اولڈ کلایو اسٹریٹ کلکتہ نے شائع کیا

نقالوں سے ہشیار

REGISTERED TRADE MARK

زردہ کے انتخاب میں غلطی نہ کرنا

جب تم میرے لیے زردہ خرید و تو اصلی نکٹائی مارکہ زردہ نہ بھولو، اسلیے
کہ آجکل بازار میں لوگ جعلی مال بنا کر دھوکہ دینے لگے ہیں ان کے دھوکے میں نہ
آنا۔ نکٹائی مارکہ زردہ نکٹائی مارکہ کیسر بلاس، نکٹائی مارکہ قوام اور الائچی دانہ
خریدتے وقت محمد مصطفٰے حسین کا نام اور نکٹائی مارکہ ضرور دیکھ لیا کریں

مالک کارخانہ

محمد مصطفٰے حسین نکٹائی مارکہ زردہ فیکٹری ہورہ روڈ۔ ہوڑہ۔ کلکتہ

شاخیں

۵/۷ کلایوا اسٹریٹ کلکتہ۔ ۱۱/۲ آرسکن روڈ بمبئی۔ ۵/۷ کیٹنگ اسٹریٹ۔ کلکتہ

REGD. No. C 2535

JADIDURDU

36 MARSDEN ST. CALCUTTA

قواعد وضوابط

(۱) رسالہ ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوا کریگا۔ خریداروں کو چاہیے کہ رسالہ ۱۵۔ تاریخ تک نہ ملنے پر دفتر سے طلب کریں۔

(۲) اہل قلم حضرات سے درخواست ہے کہ وہ مضامین مہینے کی ۱۵ تاریخ تک اڈیٹر کے نام بھیجدیں

(۳) مضامین صاف اور شستہ تحریر ہوں

(۴) وہی مضمون پرچہ میں شائع ہوسکتا ہے جو معیار ادب و اخلاق سے گرا نہ ہو۔

(۵) دل آزار و فرقہ دارانہ مضامین شائع کرنا پرچہ کی پالیسی کے خلاف ہے۔

(۶) نمونہ کا پرچہ مفت نہیں بلکہ ۲؍ کا ٹکٹ آنے پر بھیجا جائے گا۔

(۷) جواب کے لیے جوابی کارڈ یا اسٹامپ کا آنا ضروری ہے۔

(۸) خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:۔ مینجر جدید اردو ۳۶ مارسڈن اسٹریٹ۔ کلکتہ

(۹) کاروباری حضرات اشتہار کیلئے مینجر سے خط و کتابت کریں۔

(۱۰) سالانہ چندہ صرف دو روپیہ (عہ) غیر ممالک کے لیے ۵ شلنگ

اے جلیل مینجر جدید اردو نمبر ۳۶۔ مارسڈن اسٹریٹ کلکتہ

مشرقی ہندوستان کا ادبی علمی ماہنامہ

جدید اردو

قیمت فی پرچہ ۳؍

سالانہ چندہ ——— دو روپے

مدیر مسئول
پرویز شاہدی
مدیر اعزازی
ایم ظہور احسن قاضی

جدید اردو کلکتہ
ستمبر ۴۳ء

چندہ سالانہ دو روپیہ
ششماہی ایک روپیہ چار آنہ
فی پرچہ ۳/

جلد ۶ — نمبر ۱۲

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر عبدالجلیل نے مطبع ہند پریس میں چھپوا کر دفتر جدید اردو ۳۶ - مارسڈن اسٹریٹ کلکتہ سے شائع کیا

اسلامیہ کالج کا تیرہواں سالانہ مشاعرہ

موجودہ دور، جدت اجتہاد اور انقلاب کا ہے۔ اسلیے اکثر ترقی پسند نوجوانوں کی نگاہوں میں تمام قدیم روایتیں اور پابندیاں جہالت کا کرشمہ بن کر نظر آتی ہیں۔ چنانچہ شاعری بھی ان سے نہیں بچ سکی۔ قدیم شعراء نے جو صحبت شعر و شاعری کے لیے وضع کی ہے ان کو آج کل کے بعض ترقی پسند نوجوان مہمل اور لایعنی سمجھنے لگے ہیں، لیکن ان کو غور کرنا چاہئے کہ یہ اصول بڑے بڑے اہل الرائے اور عالی دماغ شعراء کی ایک مدت کے تجربے کا نتیجہ ہے۔

مشاعرہ زبان کی ترقی، اصلاح سخن، اور فروغ ادب کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس کو مٹانا مناسب نہیں۔ جن شہروں اور علاقوں میں مشاعرے زیادہ منعقد ہوئے اسی قدر وہاں اردو زبان کو فروغ نصیب ہوا۔ مشاعروں کو بند کرنا گویا اردو کے ساتھ دشمنی کرنا ہے اور زبان کی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکانا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ دنیا کی ترقی کے لیے بہت سی نئی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے جدت خیال ضرور چاہئے، جس کا ضرورت وقت مقتضی ہے کہ شعرا اپنے تخیلات کے جوہر ایسے موضوعات پر دکھائیں جو نوجوانوں کے جمود کو دور کرے، اور ان کے دلوں میں عام انسانی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو۔ ان کے خیال کو علم و حکمت کی طرف مائل کرے، ان کو امداد باہمی اور خوش اخلاقی کا سبق ملے۔ لیکن اس کا بھی لحاظ رہے کہ جو شاعری ماحول اور وقت کے لحاظ سے ہوتی ہے وہ بہت دنوں زندہ نہیں رہتی بلکہ ماحول اور فضا کے بدلتے ہی مٹ بھی جاتی ہے۔

اکثر مخالفین مشاعرہ، اس کو عملی نقطہ سے زیادہ وقعت نہیں دیتے، ان کا خیال ہے کہ یہ ایک لایعنی اور مہمل چیز ہے۔ چند گھنٹوں کی صحبت اور واہ واہ سے زبان کی کوئی خدمت نہیں ہو سکتی، اور ادب کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا ہے، کوئی سنجیدہ انسان اس پر غور کرے کہ یہ کتنا مہمل خیال ہے، جبکہ آج دنیا کے اہل الرائے اس پر متفق ہیں کہ ارتقا اردو میں مشاعرے کی جگہ ممتاز رہی ہے۔ اور مشاعرہ ہی اردو زبان کی ترقی کا اولین زینہ ہے اور آج بھی مشاعروں کی جاذبیت نوجوانوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے، مشاعرہ اس عہد ترقی میں بھی ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ اور اسی ہنگامہ نشاط کے پردہ میں جذبات محبت و فطرت کی سچی تصویریں بھی دکھائی دیتی ہیں۔

اگر مشاعروں سے زبان کی ترقی نہ ہوتی تو ہندوستان کی اردو کش جماعتیں بھی اپنی زبان کی ترقی کے لیے اردو کی تقلید میں اپنے یہاں مشاعرے نہ قائم کرتیں۔ علاوہ بریں مشاعرہ ادب مجلس کا کتنا بڑا معیار ہے۔ یہاں اگر انسان شدت وارفتگی میں بھی سنجیدگی اور آداب مجلس کی پاسداری کو ملحوظ خاطر رکھتا ہے۔

باوجودیکہ صوبہ بنگال میں اردو کے ساتھ ستم ہو رہا ہے اور اس صوبہ میں اردو بستر مرگ پر پڑی ایک ہچکی کی منتظر آخری سانس لے رہی ہے، پھر بھی غنیمت ہے کہ اس قدر ناتواں ہونے پر بھی کلکتہ جیسے شہر میں چند اولوالعزم جاں نثاران اردو اس شکستہ کشتی کا پتوار تھامے ہوئے ہلاکت خیز طوفان اور موج کا مقابلہ کر رہے ہیں، ان کے سالار اعظم نا خدائے سخن خان بہادر مولانا رضا علی وحشت کا نام نامی کسی تعارف کا محتاج نہیں، اسی سلسلہ میں حکیم ناطق لکھنوی نے موصوف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے ؎

اس شمع کے قربان ہوا ہے پروانو یہ جوہر قابل ہے اسے پہچانو
اس رنگ کے سرمست نہ پاؤگے کہیں وحشت کی کرو قدر ارے دیوانو

سچ ہے اس رباعی سے حقیقت کی جھلک دکھائی دے رہی ہے، اس وقت آپ کی عمر غالباً ساٹھ برس سے زیادہ ہو چکی ہے۔ اور ابتدائی عمر سے سرفروشانہ خدمت ترقی اردو کے لیے انجام دے رہے ہیں، اسلامیہ کالج کا مشاعرہ بھی آپ ہی کی بناڈالی ہوئی یادگار ہے، اور یہ آپ ہی کی کوشش اور جاں فشانی کا نتیجہ ہے کہ آج طلبا میں اردو مقبول نظر آتی ہے اور کلکتہ کا معیار شاعری بھی ہندوستان میں اعلیٰ اور ارفع مانا جاتا ہے۔ سب سے خوشی کی بات یہ ہے کہ آپ کے چند لائق شاگرد رشید بھی آپ کے نقش قدم پر معاندانہ روش اختیار کیے ہوئے ہیں، ان میں حضرت آصف، حضرت جمیل مظہری جناب قمر صدیقی قابل ذکر ہیں۔ حضرت مولانا وحشت کے اسلامیہ کالج سے چلے جانے کے بعد اس وقت حضرت بیخود اپنے استاد کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ کالج میں ان کی ہر دلعزیزی کا ہر شخص قائل ہے۔ اور آج نو سال سے ان کی سرپرستی میں اردو کے پرجوش طلبا ایک سالانہ شاندار مشاعرہ کرتے ہیں جس کی بنیاد حضرت مولانا وحشت نے تیرہ سال قبل رکھی تھی چنانچہ ۲۔ نومبر ۱۹۴۳ء کو اس کا سالانہ مشاعرہ تھا جس کی روداد درج ذیل ہے۔

مصرعہ طرح:۔ بہتر یہ ہے کہ حال دل اپنا بیاں نہ ہو

مشاعرہ زیر صدارت خان بہادر حضرت مولانا رضا علی وحشت ٹھیک ۹ بجے شب کو شروع ہوا، سامعین کی کافی تعداد شریک بزم تھی ہال اور برآمدہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا چونکہ لاؤڈ اسپیکر کا انتظام تھا اس لیے بہت سے لوگ جگہ نہ ملنے پر بھی باہر ہی کھڑے ہوئے مشاعرہ کا لطف اٹھا رہے تھے، سب سے پہلے صدر محترم نے اپنی غیر طرحی غزل سے مشاعرہ کا افتتاح فرمایا۔ اس کے بعد چند مبتدی شعرا نے اپنی اپنی غزلیں سنائیں تقریباً ہر غزل میں کچھ نہ کچھ اشعار بڑے اچھے تھے۔ جن سے پورا ہال صدائے تحسین اور واہ واہ کے شور سے گونج اٹھتا تھا، اس کے بعد کالج کے طلبا کا دور شروع ہوا، ان میں اکثر غزلیں بڑی کامیاب رہیں۔ حاضرین مشاعرہ خوب خوب لطف اندوز ہوئے اور بڑی فیاضی سے داد دی، لیکن اثنا میں ضرور عرض کروں گا کہ بعض حضرات نے ترنم کے ساتھ پڑھنے کی کوشش میں اپنی کامیاب غزلوں کے اشعار کی شعریت اور زبان کی بے تکلفی کو ختم کر دیا، آجکل کچھ ایسی وبا مشاعروں میں پھیلی ہوئی ہے کہ ہر شخص مترنم حضرات کی تقلید میں غزل پڑھنے کی کوشش کرتا ہے اس سے بحث نہیں ہوتی کہ وہ کوشش کامیاب ہے بھی یا نہیں۔ ایک بجے ایک گھنٹہ کے لیے مشاعرہ ملتوی رہا، اس درمیان میں چائے اور ناشتہ کا دور شروع ہوا۔ کالج کے طلبا نے نہایت حسن انتظام سے اپنے مہمانوں کی ضیافت چائے اور ناشتہ سے کی، اتنے بڑے مجمع کو سنبھالنا انہیں کا کام تھا، جو وہ ہر سال نہایت جانفشانی اور کوشش سے انجام دیتے ہیں اور اس کے لیے قابل مبارک باد ہیں۔

ایک گھنٹہ کے وقفہ کے بعد مشاعرہ پھر شروع ہوا اور مشاق کہنہ مشق شاعر و اساتذہ نے غزلیں پڑھیں۔ واہ واہ سبحان اللہ کی صدا سے ہال گونج رہا تھا، جس طرح رات بھیگتی جا رہی تھی۔ سامعین شعر و سخن کی مستی میں بیخود ہو رہے تھے۔ صدائے تحسین و ستائش کا تلاطم بپا تھا، کیسے کیسے نکتہ دان فن اپنی شیریں کلامی، جدت خیال اور حسن بیان کا نمونہ پیش کر رہے تھے۔ مرحبا و سبحان اللہ۔ آخر میں صبح کو پانچ بجے جناب صدر نے اپنی طرحی غزل ارشاد فرمائی اس کے بعد مزاحیہ دور شروع ہوا اور تقریباً ساڑھے پانچ بجے صبح مشاعرہ ختم ہوا ہم اپنے قارئین کی تفریح طبع کے لیے اس مشاعرہ کی چند منتخب غزلیں جو دستیاب ہو سکیں پیش کر رہے ہیں

عبدالجلیل

غزل

(عالیجناب خان بہادر رضا علی صاحب وحشت مدظلہ العالی نے یہ طرحی غزل، اسلامیہ کالج کے تیرہویں سالانہ مشاعرہ کی صدارت فرماتے ہوئے ارشاد فرمائی۔)

یہ کیوں کہوں کہ سوزِ دل اپنا عیاں نہو
ہاں التزامِ نالہ و آہ و فغاں نہو

لازم ہے کارواں کو رہے آپ مستعد
شرمندۂ صدائے جرسِ کارواں نہو

دردآشنا دلوں کے نہیں قابلِ قبول
جبتک کہ کوئی درد بھری داستاں نہو

پاسِ ادب ضرور ہے اربابِ شوق کو
آلودۂ سجود ترا آستاں نہو

ڈرہے کہ کھل نہ جائے کسی کی جفا کا راز
اے دل شکایتِ ستمِ آسماں نہو

ہوں تیرے مدعائے تغافل سے باخبر
کیا بات ہے کہ راز ہو اور پھر نہاں نہو

جب نامرادیوں میں گذاری ہے زندگی
بہتر یہ ہے کہ مجھ پہ تو اب مہرباں نہو

ہمدرد و ہمنوا جو چمن میں نہو کوئی
کیا ہے اگر چمن میں مرا آشیاں نہو

مجبور ہو کے میں نے لگا دی لبوں پہ مہر
کیا لطفِ گفتگو جو کوئی ہمزباں نہو

وحشت مری نظر میں مکمل نہیں وہ شعر
جس میں کہ حسنِ معنی و لطفِ زباں نہو

وحشت

غزل

رسوائے دہر ضبط سے دردِ نہاں نہو
پیدا لبِ خموش سے خود داستاں نہو

یوں بھی زباں رکھ کے کوئی بے زباں نہو
پوچھیں وہ حال دل کا تو مجھ سے بیاں نہو

آنکھوں میں گھومتا ہے قفس جی اُداس ہے
صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہو

ہے ذرہ ذرہ تیری تمنا لیے ہوئے
ظالم ہماری خاک سے دامن کشاں نہو

ہم بھی ضرور ہونگے تری بزم عیش میں
ممکن نہیں کہ ذکر ہمارا وہاں نہو

کیونکر وہاں نہ زرق و تملق کو ہو عروج
جنسِ وفا کا کوئی جہاں قدرداں نہو

وہ اسلیے نظر سے ملاتے نہیں نظر
میری نگاہ دلکی کہیں ترجماں نہو

میں کر رہا تھا شوخیٔ تقدیر کا گلہ
تجھکو مرے یقین کی قسم بدگماں نہو

وہ مرغِ پر بریدہ ہوں جس کا یہ حال ہو
صیاد تاک میں ہو قریب آشیاں نہو

تجھکو اگر ہے مد نظر راحت و سکون
ایسا مقام ڈھونڈھ تمنا جہاں نہو

اختر ہے خامشی ہی تری عین مصلحت
جب کوئی ہم صفیر نہو ہم زباں نہو

اختر حسن اختر

غزل

ڈرتا ہوں ان کو میری خموشی گراں نہو
بڑھ کر کہیں سکوت ہی ثابت فغاں نہو

بہتر ہے راز عشق کسی پر عیاں نہو
جز داستانِ حسن کوئی داستاں نہو

ایسا نہیں کوئی جو مرا رازداں بنے
ایسا نہیں کوئی جو ترا ہمزباں نہو

ان کی جفائیں باعث یادِ خدا ہوئیں
لازم ہے لب پہ شکوۂ جورِ بتاں نہو

انکار ہے انہیں مگر اس دلکو کیا کہوں
ابتک گماں ہے اسکو نہیں پر کہ ہاں نہو

وہ مہرباں نہیں تو کوئی مہرباں نہیں
کیا کم ہے یہ زمیں بھی اگر آسماں نہو

قدرِ متاعِ دل نظر انتخاب ہے
سودائے عشق میں غمِ سود و زیاں نہو

ان کا غرورِ حسن پشیماں نہو کہیں
پلہ کبھی وفا کا جفا سے گراں نہو

انصاف کی تو یہ ہے کہ لو دے اگر نہ شمع
پروانہ بھول کر بھی پرافشاں نہو

مجنوں کا حال خود ہے بیان زبان حال
ایسا بھی مہرباں کوئی بے مہر یاں نہو

مجنوں

غزل

ان کے لبوں پہ بار تبسم گراں نہو
کاش اپنے زخم دل کی خلش رائیگاں نہو

رکھے گا ذوق سجدہ مجھے وقف آستاں
جبتک جبیں پہ تیرے قدم کا نشاں نہو

ہے اسکی چشم ناز روادار عرض حال
بہ شرط ہے کہ پائے سخن درمیاں نہو

بجلی گرا کرے گی چمن پر اسیطرح
جبتک قفس فروز مرا آشیاں نہو

دل کی ترپ ہے جذبۂ بے اختیار عشق
اسوقت تک کہ بڑھ کے غم جاوداں نہو

کیا فرض ہے کہ شوق کا ہو یاس ہی مآل
اتنا بھی بے دلی اے دل حسرت نشاں نہو

کچھ کم نہیں ہے بیت حرم سے حریم دل
کیوں اس کی جلوہ گاہ وہاں ہو یہاں نہو

دلچسپیاں یہاں کی عجیب ہیں اگر
یہ کائنات عرصہ گہہ امتحاں نہو

بلبل کا نغمہ قصۂ منظوم ہے مرا
غنچے کی خامشی میں تری داستاں نہو

دل کو ہے التفات کا تیرے یقیں بھی
یہ دغدغہ بھی ہے کہ فریب گماں نہو

ہے زندگی ہی جی کا وبال اے تلاش امن
آ اسجگہ چلیں یہ مصیبت جہاں نہو

ذوق نیاز تیری جبیں سے ہے آشکار
سجدے کی آرزو میں ترا آستاں نہو

آصف خیال ہے یہ ہر اہل کمال کا
اچھی کٹے زمیں پہ اگر آسماں نہو

آصف بنارسی

غزل

ڈرتا ہوں میں وہ شوخ کہیں بدگماں نہو
اس پر بھی درد دل جو نہاں ہے عیاں نہو

کیا لاؤں تاب جلوۂ نظارہ سوز کی
عکس جمال یار اگر درمیاں نہو

جو بے نشاں ہے اس کا نشاں ڈھونڈھنا عبث
اور وہ نشاں نہ پائے جو خود بے نشاں نہو

سننے پہ بھی تم آؤ تو ہرگز نہ سن سکو
میں درد دل بیاں بھی کردوں تو بیاں نہو

وہ جلوہ کیا [illegible] جو نہو چشم شوق سے
وہ عشق کیا جو خانۂ دل میں نہاں نہو

احساس لطف اتنا بڑھا چپ سی لگ گئی
چاہوں بھی میں تو راز محبت بیاں نہو

ہے ساتھ ساتھ درد کے اک کیف درد بھی
سر دھن رہے ہیں جس پہ مری داستاں نہو

طرز جفا میں رنگ وفا کی بھی ہو جھلک
مدنظر جو تم کو مرا امتحاں نہو

کیا پوچھتے ہو واصف آزردہ کا پتہ
آوارۂ وطن ہے کہاں ہو کہاں نہو

واصف

غزل

دل پر کبھی بھی بارِ غم اتنا گراں نہو
غم بھی اگر خوشی کی طرح جاوداں نہو

یا میرے دل میں آنے سے روک اپنی یاد کو
یا وہ جگہ بتا دے مجھے تو جہاں نہو

بڑھ جائیں حوصلے نہ ہم اہلِ نیاز کے
یوں کیجئے وفا کہ وفا کا گماں نہو

ٹکڑے کسی کے دل کے جو ہوں تو ہوا کریں
منہ سے نہیں نکل جو گئی ہے تو ہاں نہو

اک مستقل بہار سے گھبرا نہ جائے دم
رہ رہ کے گر عنایتِ فصلِ خزاں نہو

رہتی ہے ضبطِ راز سے اک کشمکش میں جاں
سب کچھ ہو پر کسی کا کوئی رازداں نہو

رہ رہ کے دیکھ لیتے ہیں آنکھیں اٹھا کے وہ
مطلب یہ ہے کہ ختم میری داستاں نہو

بخشی ہے ذوقِ سجدہ نے پتھر کو زندگی
میری جبیں نہ ہو تو ترا آستاں نہو

چشمِ بتاں کو حق ہے کہ ہو بے نیازِ دل
دل بے نیازِ عشوۂ چشمِ بتاں نہو

ابتک انہیں کے پیچھے بھٹکتا رہا ہوں میں
منزل ملے اگر کرمِ رہبراں نہو

کبتک رضا کوئی ترے طعنے سہا کرے
کبتک شکایتوں سے کوئی سرگراں نہو

رضا مظہری

غزل

حسرت وہ سر کہ جس کا کوئی آستاں نہو
آوارہ جہان ہے کہاں ہو کہاں نہو

پائے وہی ترے کرمِ بے سبب کا لطف
وجہِ الم جسے ستمِ ناگہاں نہو

اپنی ہوائے شوق میں ہو جائے آپ گم
جس کو دماغِ پیرویِ کارواں نہو

اس کی نگاہ تاڑ لے یہ اور بات ہے
اپنی زباں سے اپنی تمنا بیاں نہو

اے خوگرِ سجود مزاجِ آستاں کو دیکھ
یہ جذبۂ نیاز تیرا رائگاں نہو

سنکر وہ کچھ خفا سے ہیں کچھ منفعل سے ہیں
مجنوں کی داستاں مری داستاں نہو

سمجھو نہ تم کہ فکرِ رہائی نہیں اسے
کنجِ قفس میں صید اگر پرفشاں نہو

دیکھے قفس میں پھر کوئی کیوں خوابِ گلستاں
جب آنکھوں ہی میں کیفیتِ گلستاں نہو

کس کس ادا سے اس نے بڑھایا نظر کا ذوق
مطلب یہ تھا کہ کوئی ادا رائگاں نہو

حسرت ہم اس زمیں کو سمجھتے ہیں شعبدہ زار
اظہارِ رنگِ حضرتِ وحشت جہاں نہو

حسرت نعمانی

غزل

ذرہ حریفِ جلوۂ برق تپاں نہو
گردش بدل کے دل کی زمیں آسماں نہو

رکھتے تو ہیں نظر میں مجھے برق و باغباں
پوچھے نہ کوئی بات اگر آشیاں نہو

مظلومیت اسی میں ہے انساں کیواسطے
گر ہوسکے زمیں بنے آسماں نہو

اشک رواں پہ ہوتا ہے اکثر مجھے گماں
جس میں لٹا ہے دل یہ وہی کارواں نہو

دنیا نہ باخبر ہو کبھی جبر و صبر سے
راہِ وفا میں دل کا اگر امتحاں نہو

سب جانتا ہوں اذنِ تکلم نہیں مگر
منہ میں زبان رکھ کے کوئی بے زباں نہو

دل ہو کہ آنکھ ہے وہی دونوں میں پارسا
افشائے رازِ عشق کا جس پر گماں نہو

اے جرم دل کی ضد یہ جھکاتے تو ہیں جبیں
یہ بات بڑھتے بڑھتے کہیں داستاں نہو

جرم محمد آبادی

غزل

جبتک مری زباں سے غمِ دل بیاں نہو
اے اشک مرے حال کا تو ترجماں نہو

شرط وفا نے ایسی لگائی ہے لب پہ مہر
چاہوں بیان کرنا تو مجھ سے بیاں نہو

در پردہ حسن و عشق میں رہتا ہے ارتباط
ممکن نہیں کہ درمیاں ہو وہاں نہو

آتی ہیں دمبدم جو دمِ نزع ہچکیاں
بے ربط ہو کے ختم کہیں داستاں نہو

آیا ہوں سوئے گورِ غریباں یہ سوچ کر
بچھڑا ہوں جس سے میں یہ وہی کارواں نہو

ہاں انکی بات غیر کے منہ سے بھی سن تو لی
دل تو یہ چاہتا تھا کوئی درمیاں نہو

یارب فنا کے بعد تو آرام ہو نصیب
ایسی زمیں بنا کے جہاں آسماں نہو

ناوک کہیں حجاب سے رکتی ہے برقِ حسن
ممکن نہیں ہے یہ کہ وہ جلوہ عیاں نہو

ناوک لکھنوی

سوانح نگاری

اے۔ سی۔ بنسن صاحب (۱۸۶۲ء تا ۱۹۲۵ء) ایک باکمال مدرس تھے۔ شعر و ادب کا نہایت شستہ و پاکیزہ مذاق رکھتے تھے۔ خود بھی ایک خوش فکر شاعر اور بلند پایہ ادیب تھے۔ آپ کی نگارشات عالیہ مقبول و مطبوع خاص و عام تھیں اور بہت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ ادبیات میں فن سوانح نگاری سے خاص دلچسپی لیتے تھے اور اس موضوع پر آپ کے خیالات و نظریات صدر درجہ اہم و تیغ سمجھے جاتے ہیں۔ روسیٹی فزگرالڈ اور پیٹرس کی سوانح عمریاں آپ کے رشحات قلم کی رہین منت ہیں

افسر ماہ پوری

یہ دو افتتاحیہ بند جنہیں میں ابھی درج ذیل کر رہا ہوں، وسیٹھ کی ایک حسین، جمیل نظم سے ماخوذ ہیں، جس کو اس نے اپنے مخصوص دلآویز و موثر پیرایہ میں قلمبند کیا تھا۔ میرے خیال میں نظم موصوفہ جتنی لطیف و شیریں ہے، اتنی مشہور و معروف نہیں۔ یہ دونوں بند ایک مفارقت زدہ عاشق کے جذبات دلی و تاثرات قلبی کا ایک دلکش مرقع ہے۔ عاشق اپنی محبوبہ کی اس شبیہ کے سامنے کھڑا، جو خود اس کی خیال آفرینیوں اور قلمکاریوں کی مرہون احسان ہے، کسی غیر مرئی دنیا کے نظاروں میں گم ہے۔ وہ تصویر کے نازک و رنگین خد و خال کو جوں جوں بہ امعان نظر دیکھتا ہے، اُس کے دل و دماغ کی کیفیت متغیر ہونے لگتی ہے —— اس کی محبوبہ اس سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ چکی ہے۔ اسے وہ قیامت تک نہ دیکھ سکیگا۔ . . . . . احساسات و جذبات کے سمندر میں ہیجان و تلاطم پیدا ہو جاتا ہے۔ صبر و شکیب کی دیواریں ٹوٹ پھوٹ کر خس و خاشاک کی مانند بہہ جاتی ہیں۔ . . . . . اور بے ساختہ اس کی زبان سے یہ سوز و گداز اور درد و غم سے معمور و مملو ادبیات تراوش کرنے لگتی ہیں۔

یہ تصویر ہو بہو اس کی طرح ہے —— یہ ایک ایسی چیز معلوم ہوتی ہے جس پر اظہار استعجاب کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔
یوں جیسے میں بذات خود موجود تو نہ رہوں، اگر میرا عکس آئینہ میں پیوست رہے میں اسے دیکھتا ہوں اور مسلسل دیکھتا ہوں حتیٰ کہ اس میں لرزش و ارتعاش کی ہلکی ہلکی لہریں نمودار ہو جاتی ہیں اور
میری آنکھیں گویا بول اٹھتی ہیں کہ ابھی ابھی
اس کے رسیلے ہونٹ نغمہ ریز ہونگے . . . . کہنے کے لیے۔
محبوبہ کی دل کی میٹھی میٹھی باتیں۔ افسوس!
اس کے باوصف وہ مٹی کے انبار تلے دبی پڑی ہے!
حیف! یہ مہین مہین کرنیں بھی
اس کی قبر کی گہرائیوں کو ہیبت ناک بنا دیتی ہیں۔
اور رات دن بارش کی بوندیں گرد و پیش کے سکوت و جمود کو
اپنی کھنکھناہٹ سے درہم برہم کرتی رہتی ہیں . . . . . . تب دل و جگر کیوں نہ مضطرب ہو!

۱

میرے لیے محبت کے تمام تحائف میں سے صرف یہ ایک تحفہ بچ گیا ہے۔ لیکن
اس میں وہ روح مفقود ہے جو غم و اضطراب کے وقت مرے دل کو سکون و تسکین دیتی اور راز و نیاز کی باتیں کیا کرتی تھی اور
جو مستور ہے
زمینوں کے نیچے اور آسمانوں کے اوپر!

یہ روح پرور اور خوش آئند اشعار بیک وقت سوانح نگار کے عقدہ و اُمید کے حامل ہیں۔ امید اس لیے کہ ایک حسین، لطیف اور محبوب چیز کی یاد کو کس انداز سے حیطۂ تحریر میں محبوس کیا جائے کہ وہ حسن و حیات پر ایک جیتی جاگتی شہادت کا حکم رکھے۔ عقدہ اس لیے کہ اس سے عہدہ برآ ہونا کیوں کر ممکن ہے؟ ایک مطبوعہ کتاب کے چند محدود صفحات میں ایک عدیم المثال اور دلفریب چیز کے صحیح و حقیقی تاثرات کو کس طرز سے مدوّن کرنا چاہیے —— پھر اس میں اکثر اوقات ایسے دلچسپ، نمایاں اور جاذب توجہ پہلو بھی موجود رہتے ہیں، جن سے اغماض برتنا محال ہے۔ اب لازمی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسے خلوص و خوبصورتی کے ساتھ بر سر عمل لانا ممکنات میں سے ہے، کیونکہ معاملہ کسی واحد نمایاں پہلو سے مختص نہیں بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک سیرت و کردار کے تمام تاریک و تاباں مناظر کو منصۂ شہود پر لایا جائے۔ نیز ہمیں ایک شخص کی زندگی سے ایسے اجزا و عناصر کو بھی منتخب کرنا ہے، جن کا کسی نہ کسی خصوصیت و اہمیت کے باعث اظہار کر دینا ناگزیر ہے۔ فرض کیجیے کہ ہم کو ایسی شخصیت کی سوانح عمری مرتب کرنی ہے جس نے اپنی ساری زندگی دنیا کی ہنگامہ آرائیوں اور حشر انگیزیوں میں بسر کی ہے . . . . . اب ہم اس کی زندگی کے کسی پہلو کو بھی اپنے تحلیل و تجزیہ کے قلم انداز نہیں کر سکتے۔ ہمیں دیکھنا پڑیگا کہ وہ کس نوعیت کی مصروفیات میں غلطاں رہا، اس کی ملاقاتیں اور اس کی گفتگوئیں کس قسم کی تھیں اور کیا اہمیت رکھتی تھیں، وہ کن ہستیوں سے متاثر ہوا اور کن ہستیوں کو متاثر کیا، وہ مراسلات جو اس نے ارقام کیے یا اسکو موصول ہوئے . . . . . الغرض تذکرہ نویس کو ان کل باتوں پر، اگر یہ اس سے ممکن ہو، ایک اجمالی روشنی ڈالنی پڑیگی اور ساتھ ہی اسے اس بات کا بھی لحاظ رکھنا پڑے گا کہیں اس کے ہاتھ سے حقیقی "تناسب و توازن" کا وہ دھاگا نہ چھوٹ جائے جس کے توسل سے نہ صرف اسے اپنے ہیرو کو لمحات کامرانی و شادمانی کی روشن جھلکیوں ہی میں پیش کرنا ہے، بلکہ اس کی عکاسی ان وقتوں میں بھی کرنی ہے جب وہ مصائب و شدائد میں مقصود و محصور تھا جب یہی خستگی سے اس کا دل و دماغ ملتہب و شعلہ زن تھا، جب اس کے سر پر آلام و تکالیف کی گھٹائیں جھوم رہی تھیں اور جب اس کا عضو عضو خستگی و برشتگی کی شدت سے مضمحل اور نڈھال ہوگیا تھا۔ مگر یہ کٹھن کام ایک معمولی سی "قابلیت" کے ساتھ ہم انجام نہیں پا سکتا۔ اس کا تکملہ بجز انتخاب و توازن کے معجزہ کے کسی اور چیز سے ممکن نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ فن فنون لطیفہ کی تمام اصناف سے سب سے زیادہ جانکاہ، روح فرسا اور دشوار ہے۔ علاوہ اس کے مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ سوانح نگاری اس قبیل کے دیگر فنون کے مقابلہ میں ابھی بالکل ابتدائی منزل میں ہے

اس امر کا بغیر کسی قیل و قال کے اعتراف کرنا پڑے گا کہ سوانح نگاری کی اولین اور سب سے جانگسل دشواری اس نقطۂ نظر میں مضمر ہے جس نقطۂ نظر سے فی الحال انسانیت "موت" کا تصور قائم کرتی ہے۔ ہمیں اپنے آپ سے یہ حسن ظن ہے کہ ہمارا "اعتقاد و عقیدہ" "دوامیت" میں کامل اور راسخ ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دائرۂ فعل و عمل میں اس کی ایک رمق بھی دکھائی نہیں دیتی۔ روح کا مفروضہ خلود مستقبلہ ہمارے اذہان میں زندگی کے ٹھوس اور حقیقی تسلسل کا تصور پیدا کرنے سے عاجز ہے۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ روح کبھی زوال پذیر نہیں ہوتی تو ہمارے دل میں یہ سوال لازمی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ تخیل کے تار و پود بکھر جانے کے بعد یادداشت کا برقرار رہنا ممکن ہے۔ میرے ایک دوست جو ایک علامہ

میں ان کا سر بری طرح مجروح ہوگیا تھا۔ اب بیچارے وہ لاکھ اپنے ذہن پر زور ڈالتے ہیں، لیکن انہیں یہ یاد نہیں پڑتا کہ واقعہ مذکور کے وقوع ہونے کے قبل کون سا مہینہ گذرا تھا۔ اب جبکہ یادداشت قائم نہیں ہے تو "شناخت" کو کسی نام سے موسوم کرنا عبث ہے۔ ایک معروف و مشغول شخص کی طبعی موت کی ناگہانی آمد اس کے قریب ترین، حلقۂ احباب کے لیے اتنی تحیر خیز اور انتشار انگیز ہوتی ہے کہ مرحوم کے متعلق تمام خیالات و تصورات یکلخت زیر و زبر ہو جاتے ہیں۔ وہ گھر جہاں اب اس کی آواز فضا میں نہیں گھلتی، فرشوں پر اس کے قدموں کے چاپ نہیں سنائی دیتی، مطالعہ سے محروم کتابیں، سرنگوں قلم، خالی کرسی .... یہ سب باتیں ہجور رنجور دلوں پر نشتر چلاتی ہیں اس قسم کی حسیات و کیفیات کا اکثر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مرحوم کا کردار ہمیشہ تقدیسی و پاکیزگی کے جامہ میں ملبوس آنکھوں کے سامنے رقص کرتا ہے اور یہ بات ہم کو شرافت و انسانیت کے منافی معلوم ہوتی ہے کہ ہم اس کے بارے میں کوئی ایسا واقعہ یاد کریں جو اس کی زندگی کے کسی بھونڈے اور مضحکہ انگیز پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہو۔ اس کی زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی غم و الم کی آگ میں ایندھن کا کام کرتی ہے۔ اس وقت سوانح نگار اپنا کام شروع کرتا ہے اور جوں ہی اس کے قلم کے نوک اس کے محاسن و معائب، یا حماقت یا فراست، یا محرومالدماغی یا خوش مزاجی، یا سب سے بڑھ کر خامیوں اور کمزوریوں کی نقاب کشائی آزادی و بیباکی سے کرنے لگتی ہے کہ اس کے ذہن میں "یہ نہیں وہ نہیں" کی روح فرسا کشمکش رونما ہو جاتی ہے۔ عزیز و اقارب کا حزن و ملال جو واقعی ایک فطری چیز ہے جس کی تحریم و تکریم سے اعراض نہیں کیا جا سکتا، محض اس تصور سے دوچند افزوں ہو جاتا ہے کہ "ہیرو" کی عکاسی غلط یا مسخ شدہ یا غیر حقیقی یا بے انصافی کی روشنی میں پیش کی جائیگی۔ اس کے بعد رومان کی شہابی و ملکوتی شعاعیں اس کی تعریف انگیز و ارادت مند یادوں پر نور پاشیاں کرتی نظر آتی ہیں۔ پھر اس امر کی پسند یا عدم پسند کا فیصلہ کرنا پڑیگا کہ آیا سوانح نویس کو اپنی ذمہ داری سے اسی وقت سبکدوش ہونا چاہیئے جبکہ یادیں تازہ تاباں اور دلچسپ ہیں، یا اُسے کسی ایسی مناسب تاریخ تک معرض تعویق میں رکھ چھوڑنا چاہیئے جبکہ جگمگاتی ہوئی تصویر مرور دہور کے ہاتھوں یوں دھندلی اور مدھم ہو جائے کہ اس سے کوئی مبہم اور پر ملال چیز نمو کرتی ہوئی معلوم ہو۔ یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ اس نوع کی کشمکش اس کام کے جلد از جلد سر انجام پا جانے کے حق میں، وزنی ثابت ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ظاہری و خارجی حالات و کوائف کا بول بالا، توازن و تناسب کا خون اور تقابلی عناصر کی قربانی۔ تذکرہ نگاری کی سب سے زیادہ دشوار، صبر آزما اور ابتدائی مشکل یہ ہے کہ سوانح نویس کا دل قدرتی طور پر اپنے ذاتی تاثرات اور عقیدت کیشوں کا آماجگاہ ہوتا ہے۔ رومانیت اور واقعیت میں یہ تنازعہ بہت قدیم ہے۔ بہت سے لوگ محض رومان پرست ہوتے ہیں۔ اور ان کا خاصہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز کو رومان و حسن کی عینک سے دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ جب کسی شخص کی زندگی کی تصویر کشی کا وقت آتا ہے تو ان کی یہ دلی خواہش ہوتی ہے کہ اسے انہی کے رنگ و روپ میں پیش کیا جائے جب تک عامۃ الناس کو اس بات کا احساس پیدا نہ ہو جائے کہ اگر کوئی آدمی دراصل اتنا بڑا ہے کہ اس کے حالات زندگی کی قلمبندگی نفع بخش اور سود مند ہو سکتی ہے تو لازماً اس کی سوانح حیات اسی صحت و صفائی اور تقدس و احترام سے ضبط تحریر کرنے چاہئیں جو اس کی عظمت و شہرت کے شایان شان ہو اس وقت تک فن تذکرہ نویسی ایک پالتو، گونگا، جذباتی اور گمراہ کن فن کی حیثیت سے دائر و سائر رہیگا۔ جہاں تک مجھے اپنے مرضی و خواہش کا تعلق ہے۔ میں ہرگز یہ پسند نہیں کرونگا کہ میری زندگی کی نقاشی یا مصوری رومانی رنگ و روغن سے کی جائے۔ اگر شاید میرے کوائف حیات کے قلمبند ہونے کی نوبت تک پہنچ جائے تو میں اس امر کا اعلان اسی وقت کر دینا مناسب کرتا ہوں کہ میرے نقائص و مناقب اور محاسن و معائب بے کم و کاست من و عن درج کیے جائیں اور

ایسا کرنے میں کسی طرح کی رعایت و مروت، اور بغض و عناد کو راہ نہ دی جائے۔ عام طور پر اس حقیقت کا مشاہدہ ہوا ہے کہ جذباتی مداح کبھی یہ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرتے کہ ان کے ہیرو کی خواہشات کا لحاظ و احترام کرنا بھی کچھ ضروری ہے۔ وہ اسے قطعی بے بس و بیکس سمجھتے ہیں۔ نہ تو انہیں صداقت ایک آنکھ بھاتی ہے اور نہ توازن۔ ان کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ ان کی نظروں کے سامنے ایک ایسی درخشاں اور کامیاب ہستی محو خرام ہو جس کے حضور میں شہرت و عزت اور کامرانی و رفعت ہاتھ باندھے کھڑی ہو۔ حالانکہ طاقت و نقاہت کا تصادم اور "حسن جواں" اور "حسن کہن" کا موازنہ ایک انسانی زندگی کا سب سے زیادہ دلچسپ اور مرکزی نقطہ ہے۔

ان باتوں سے ایک لمحہ کے لیے بھی میرا یہ مقصد نہیں ہو سکتا ہے کہ میں کسی کی ایسی تضحیک آمیز تصویر دیکھنا چاہتا ہوں جس کے لازمے فرسودگی و بے کیفی اور تکدر و انقباض ہیں۔ میں جس بات کا خواہاں اور جویاں ہوں، وہ توازن، تناسب اور تقابل ہے۔

مزید براں سوانح نگاری اپنے اندر ایک اور پریشان کن مسئلہ رکھتی ہے جس سے بہمہ وجوہ عہدہ برآ ہونے کی بہت کم لوگوں نے سعی و کاوش کی ہے۔ علی العموم سوانح عمریوں کی تشکیل و تعمیر کی بنیاد ان ہی معدودے چند نفوس کی زندگیوں پر رکھی جاتی ہے۔ جن کے کارنامے بادی النظر میں دور رس اور روشن معلوم ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ ایک بالکل غیر فنکارانہ سی بات ہے۔ دنیا میں ایسے لوگوں کا فقدان نہیں ہے جنہوں نے اپنی زندگیوں کو کسی فریضہ کی ادائیگی کی خاطر بے دریغ قربان کر دیا ہے، اپنے کاموں کی تکمیل کے لیے اپنی ساری طاقتوں اور ہمتوں کو اندھا دھند صرف کر دیا ہے، چاہے کاموں کی نوعیت کچھ بھی ہو اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی پیہم اور انتھک کاہشوں اور کاوشوں کے نہایت تابناک اور ہمہ گیر نتائج بھی غیر محسوس طور پر ظہور پذیر ہوئے ہیں، لیکن آخر میں ان کے پاس کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہی جس سے وہ اپنی زندگیوں میں چمک دمک پیدا کر سکتے۔ فی الحقیقت ایسی زندگیاں تاریخی اور روایتی وقعت و اہمیت کی مستحق ہیں اور ان سے تاریخ کی نسبت تذکرہ نویسی کو زیادہ مستفاد و متمتع ہونا چاہیے۔ قطع نظر اس سے بہت سی نمایاں اور دلکش ہستیاں بھی موجود ہیں جو کارخانۂ عالم کے مختلف اور متنوع شعبوں میں کافی دسترس رکھتی ہیں، مگر کسی خاص شعبہ میں انھوں نے کوئی ایسی فنکارانہ "کاملیت" کا ثبوت پیش نہیں کیا ہے جس کے ذریعہ سے ان کی گہرائیوں کا سراغ لگے۔ ایسے مرد و زن نے لایب جذبات عمیق میں اشتعال پیدا کیا ہے، دیوانہ وار عشق و محبت کے خم لنڈھائے ہیں، زندگیوں کے ایک وسیع دائرہ پر ضیا ریزی کی ہے، بے شمار نازک و لطیف، ہمدردانہ و غمگسارانہ اور توجہ انگیز و بصیرت افروز باتیں کہی ہیں۔ زندگی کو مسرت و بہجت اور معانی و مفاہیم سے ہمکنار کیا ہے اور اس کی سحر کاریوں اور جلوہ طرازیوں کو دوبالا کیا ہے، مگر ایسی باتیں شاذ ہی کبھی حروف و سطور میں مقید کی جاتی ہیں۔ وہ بھی محض اس وجہ سے کہ اس کام کی انجام دہی بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ چنانچہ ان کی گفتگو میں اپنی تمام برق رفتاری و سریع الاثری کے ساتھ کبھی لکھی نہیں گئی، ان کی پر معنی نگاہیں اور دماغ افروز تصورات، جو وقتی اس قدر حسین و جمیل تھے، الفاظ و معانی کا جامہ کبھی پہن نہیں سکتے تاہم میں یہ ضروری اور یقینی سمجھتا ہوں کہ ایسے لوگ سب سے زیادہ دیکھے جانے کے سزاوار ہیں کیونکہ انھوں نے ہمیں بتایا ہے کہ زندگی میں سب سے زیادہ جس چیز کو محسوس کرنے کی ضرورت ہے ...... وہ زندگی حلاوت و لطافت ہے۔ محض کسی محیر العقول اور تعجب انگیز کارنامہ میں ہمارا ایقان ایک غیر مہذبانہ فعل ہے اور کسی چیز کے محض جمال و مسرت سے ہماری تنفر خیز چشم پوشی ایک بھدی اور وحشیانہ حرکت ہے

ایک ماہر فن سوانح نگار کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے موضوع کو صاف روشن اور نمایاں طور پر دیکھے۔ اس کا کام ان تاثرات کی نقالی نہیں ہے جو کسی چیز کے دیکھنے سے لوح ذہن پر مرتسم ہوتے ہیں بلکہ اسے صرف اس چیز کو بعینہٖ بیان کر دینا ہے، جیسے وہ

دیکھتا ہے۔ میں اس نکتہ کی مزید وضاحت کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ گزشتہ دنوں میرے ایک مصور دوست نے مجھ سے کہا کہ دنیائے مصوری میں ایک شوقیہ اور ایک پیشہ ور مصور میں یہ فرق ہے کہ شوقیہ مصور ذہنی طور پر اس امر کا احساس رکھتا ہے کہ اس کا قلم کیوں اور کس چیز کی رنگ آمیزی کر رہا ہے مثلاً ایک درخت، ایک گھر یا ایک انسانی چہرہ۔ وہ ان باتوں کے متعلق غور و فکر کرتا ہے اور بعض حالات میں تو وہ ان کی تاویل و تفسیر سے بھی گریز نہیں کرتا۔ برعکس اس کے ایک پیشہ ور اور حقیقی مصور میرے دوست کے قول کے مطابق، جو کچھ دیکھتا ہے سر سے پاؤں تک اس کی نقاشی کر دیتا ہے۔ وہ اس کے متعلق کچھ نہیں سوچتا۔ وہ اس کی کوئی توضیح و تشریح نہیں کرتا۔ وہ بعض نقوش و خطوط، رنگ و روغن اور صفحہ قرطاس کے عرض و طول کی کمی بیشی سے سروکار رکھتا ہے۔ تشریح و تفسیر وہ ان لوگوں پر چھوڑ دیتا ہے، جو اس کی تصویر دیکھیں گے۔ . . . توجیہ و تاویل اور وضاحت و صراحت سے مصور کا کوئی علاقہ نہیں

اس کے بعد سوانح نگار کے اصل کام کا آغاز ہوتا ہے۔ . . . . . اس میں خوردبین کی طرح عمیق مشاہدہ کی لیاقت و صلاحیت ہونی چاہئے اسے صبر و تحمل، جوش و ولولہ اور تفحص و تجسس کی دولت سے مالامال ہونا چاہئے۔ علاوہ اس کے اس میں انتخاب و استرداد میں مدامتیاز قائم کرنے کی بھی قوت لازمی ہے۔ . . . سب سے آخر میں اسے ایک نہایت غائت درجہ کی یکسوئی و یکجہتی اپنے جذبات و خیالات میں برقرار رکھنا ضروری ہے۔ تاکہ رجحانات و میلانات کا التفات محض رومان یا وجاہت یا جذبات یا کسی دوسری چیز کی طرف نہ ہو جائے۔ اسے کسی کی ذاتیات پر حملے کرنے کی ضرورت نہیں اسے صرف مصور ہونا چاہئے۔ کہ برہنہ و عریاں اشیاء کی نقاشی کرتے ہوئے بھی عریانیت و برہنگی ظاہر نہ ہو۔ لیکن اسے اپنے دل کی شخصیت پرستی کے جذبات سے بھی خالی و عاری کر لینا چاہئے اس کے بعد ایک آدم، کا خاکہ حقیقی معنوں میں صاف و شفاف اور روشن و فروزاں "کاملیت" کے ساتھ جلوہ گر ہو جائیگا اور وہ ہر قسمی نقص سے پاک و منزہ رہیگا۔ توازن بنیادی دشوار ہے۔ یعنی بلند اشرلیف اور بصیرت افروز چیزوں اور جامد احمقانہ اور مسخر انگیز چیزوں میں کیسے حد فاصل قائم کی جائے۔ اس بات سے بھی جسے رسکن نے نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے "وہ جو مستور ہے زمینوں کے نیچے اور آسمانوں کے اوپر" بہت سے نتیجے اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ ارفع و اعلیٰ روحیں وہ سب کچھ نہیں کہتیں جو وہ محسوس کرتی ہیں۔ ان کی خاموشی کبھی زبان حال سے ان کی تقریر سے زیادہ کہہ جاتی ہے اور تذکرہ نویس میں اس بات کی اہلیت ہونی چاہئے کہ وہ ان کی پرجلال اور ہیبت ناک خاموشیوں کی طرف اشارہ کر دے۔ ہمیں ہمیشہ اس حقیقت کا احساس نہیں ہوتا کہ ہم دوسروں کو کس بنا پر عزیز رکھتے ہیں۔ جو کچھ وہ لوگ کرتے ہیں فی الواقعہ وہ جو کچھ کہ ہیں، اس کا ایک حقیر حصہ ثابت ہوتا ہے۔ تاہم ہم ہزاروں خاموش اور لطیف اشاروں، کنایوں سے یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ وہ کیا ہیں حالانکہ ہماری سچی اور گہری محبت ان لوگوں کی جانب ہرگز رخ نہیں کرتی جو قطعی طور پر گمنام، ناقابل اعتبار اور بے جان ہوتے ہیں۔ ہم مردوں اور عورتوں کو ان کے محاسن و تاریخ و شیون و صفات کے باوجود پیار نہیں کرتے، بلکہ دراصل انہی کے باعث۔ کیونکہ وہ سب انہی چیزوں کے مظہر محض ہیں جو کچھ کہ وہ ہیں۔ اسی لیے سوانح نگار کو اپنی فطری ذہانت و ذکاوت سے یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ کس عنصر کا اظہار لازمی و لابدی ہے۔ اسے والہانہ محبت نہیں کرنی چاہئے بلکہ مخلصانہ۔ اس کے بعد وہ اپنے کام کا آغاز فنکارانہ اور حقیقی طور پر کرے تو شاید اس بات کے انجام دینے میں وہ آسانی سے کامیاب ہو سکتا ہے، جسے سب سے بڑی اور اہم باشان خدمت کے نام سے منسوب کیا جا سکتا ہے جو ایک انسان سے ابنائے جنس کے لیے ممکن ہے۔ اسے انہیں ترغیب و تلقین کرنی چاہئے کہ وہ زندگی میں اعتقاد و ایقان رکھیں۔ نیز اسے ان پر یہ امر بھی منکشف کر دینا چاہئے کہ اگر ایک زندگی (بلا لحاظ ناکامیوں اور کامرانیوں کے) مجموعی طور پر پیش کی جائے تو وہ ایک ایسی حسین اور دلکش چیز ثابت ہوگی جس کا مقابلہ زندگی کی تخیلی اور رومانی ہونے کا ہرگز نہیں کر سکتا۔

نوشتہ :- اے۔ سی۔ بنسن

ترجمہ :- افسر ماہ پوری

بھوکا بنگال

اُٹھ دیس کی تر آنکھوں سے سیلاب رواں دیکھ
ہر گوشۂ بنگال میں محشر کا سماں دیکھ

تو دیکھ چکا شمع شب بزم طرب ریز
اب تیرگیٔ شام غم فاقہ کشاں دیکھ

تو دیکھ چکا فصل بہاری کے گل تر
اب باغِ وطن میں روشِ دور خزاں دیکھ

تو دیکھ چکا دولت و ثروت کے تماشے
اب بیکس و مجبور کی تصویرِ فغاں دیکھ

تو دیکھ چکا نقشۂ دنیائے مسرت
اب آہ و الم نالہ و شیون کا جہاں دیکھ

جو خواب میں دیکھا نہ تھا ان آنکھوں نے تیری
بنگال میں جا کر وہ قیامت کا سماں دیکھ

یہ قحط ہے یا موت کی چلتی ہوئی تلوار
ہیں نذر اجل مرد و زن و پیر و جواں دیکھ

دم توڑتی ہیں بھوک سے آفت زدہ مائیں
آغوش میں سوکھی ہوئی بچوں کی زباں دیکھ

وہ جن کو جوانی نے دیا تھا قد بالا
خم ہوکے ہوئے جاتے ہیں اب شکل کماں دیکھ

بے گور و کفن لاشوں پہ لاشیں ہیں سر راہ
آ۔ بھول سے گالوں پہ ہجوم مگساں دیکھ

ایک جان ہے انسان کی جو ارزاں ہے جہاں میں
مٹی بھی ہے بازار میں یک جنس گراں دیکھ

اے اہل وطن دیر نہ کر چارہ گری میں
آئی ہے لبوں پر وطنِ ہند کی جاں دیکھ

ڈر ہے کہ مخل ہو نہ تری الفت دولت
روکے نہ تجھے فکر و غم سود و زیاں دیکھ

ایسا نہ ہو پھر جائے ترے قصر کی جانب
پاداشِ عمل کی نگہ شعلہ فشاں دیکھ

عبدالحفیظ

"دلہن کے آنسو"

"سلور کنگ" کے افضل
"خواب ہستی" کے صولت
"دل کی پیاس" کے مدن بابو
"ترکی حور" کے عارف
کو

کارزار حیات اور تماشہ گاہِ ہستی میں دعوت غور و فکر

ایک حشر انگیز ڈرامہ کا ایک انقلاب آفریں منظر

(جمیل ایک آوارہ منش نوجوان اپنی بیوی زیبا سے انتہائی بدسلوکی کرتا ہے۔ اس کا چھوٹا بھائی انور اپنی بھاوج سے دلی ہمدردی کا اظہار کرنے کو آتا ہے لیکن بھائی کی غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے۔

ذیل کے منظر میں زیبا اپنے کمرہ میں غمزدہ اور اندوہگیں بیٹھی ہے)

زیبا:۔ "فضا خاموش ہے۔ چاندنی کی دوشیزہ نے ابھی تک تاریکی کا برقعہ اوڑھ رکھا ہے۔ میرے ڈوبتے ہوئے دل کی مایوس امیدوں کی طرح آج ان کو بھی منہ دکھانے کا حوصلہ نہیں ہوتا ——— خداوندا! اگر زندگی شمع کی طرح جلنے چنگاری کی مانند سلگنے اور بجلی کے طور پر تڑپنے ہی کا نام تھا تو تو نے ہمیں یہ زندگی کیوں بخشی۔ کیوں۔ تجھے بھی اپنے بندوں کو ستانے میں مزا آتا ہے؟"

(خاموش ہو جاتی ہے)

(جمیل آتا ہے۔ الماری کھول کر کچھ نکالنا چاہتا ہے پھر زیبا کو دیکھتا ہے)

جمیل:۔ "جب بھی اس گھر میں قدم رکھو در و دیوار کے ہونٹوں سے ماتم کی صدائیں استقبال کو آتی ہیں۔ دنیا کو تم سے کس قدر ہمدردی ہے زیبا!"

زیبا:۔ "میں بڑی نادم ہوں میرے سرتاج! مگر میں در و دیوار کو کس طرح سمجھاؤں کہ یہ مجھ سے ہمدردی نہ کریں مجھے ان کی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔"

جمیل:۔ "زیبا، میں تیری آنکھوں میں آنسوؤں کے بہتے ہوئے سیلاب، تیرے ہونٹوں پر آہ و بکا کے منجمد طوفان تیرے چہرے پر مردوں کے بگڑے ہوئے چہروں کی بے حسی دیکھتے دیکھتے تنگ آگیا ہوں۔ اگر اس گھر میں رہنا چاہتی ہے تو اپنی روبہ کو بدل۔ اپنی آنکھوں کو ہنسنا، اپنے ہونٹوں کو مسکرانا، اور اپنے چہرے کو دلی مسرت اور حقیقی شادمانی کا اظہار کرنا سکھا ورنہ اس گھر میں تیرے لیے پناہ کی صورت نہیں ہوگی۔"

زیبا:۔ "میں بھی تو یہی چاہتی ہوں میرے آقا! مگر مجبور ہوں۔

یہ آنکھیں، یہ ہونٹ، یہ چہرہ میرے حکم کے نہیں بلکہ آپ کے
اشاروں کے منتظر ہیں۔ یہ تو آپ ہی ہیں جو انہیں ہنسنے،
مسکرانے، دلی مسرت اور حقیقی شادمانی کے اظہار کی
اجازت نہیں دیتے۔"

جمیل:۔ "یہ کس طرح؟ میں نے تیری آسائش کے سب سامان
مہیا کر رکھے ہیں۔ اس گھر کا ہر کونہ آرام و آسائش کا جھولا
ہے۔ سونے اور جواہرات سے بھرے ہوئے صندوقچے
تیرے قبضہ میں ہیں۔ ریشم اور مخمل کے فرشوں پر تو چلتی
پھرتی اور آرام کرتی ہے۔ نوکر خدمت کو، لونڈیاں دل
بہلانے کو حاضر ہیں۔ پھر تو ہی بتا کہ ایک شوہر اپنی بیوی
کی خوشی اور اطمینان کی خاطر اور کیا کر سکتا ہے؟"

زیبا:۔ "جسم کی آرائش سے روح کی تسکین نہیں ہوتی۔ سونے
کے پنجرے میں مقید اور پیاسی بلبل خوشی کے گیت نہیں
گا سکتی۔ آپ کے عشرتکدہ میں تو میرا دم گھٹتا ہے۔ میرے
سرتاج اس نوریں کاشانے کے اندر تو میری روح تاریکی
کے گہرے غار میں بھٹکتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ کیوں ہے؟"

جمیل:۔ "کیوں ہے؟"

زیبا:۔ "اس لیے کہ آپ نے محبت کی شمع کو گل کر دیا ہے۔ اس
چراغ کو بجھا دیا ہے جس کی روشنی میں میں اپنی ہستی
کی منزل پر پہنچ سکتی تھی۔ یہ زریں کائنات آفتاب
کی کرنوں سے خالی ہے، میرے سرتاج! اس نورانی
دنیا میں چاند اور ستارے نہیں جگمگاتے ...."

جمیل:۔ (قہقہہ) "زیبا! تو شاعری کر رہی ہے۔ سمجھی! شاعری
تو چاہتی ہے کہ میں تیری صورت کا دیوانہ اور زلفوں کا
اسیر بن جاؤں۔ زندگی کے بے شمار اور لاتعداد دلچسپیوں
کو تیری ذات تک محدود کر دوں! سب کو بھول جاؤں!
صرف تجھی کو یاد رکھوں! مرد کی ذات سے اس قربانی کی
توقع رکھنا اگر شاعری نہیں تو ناتجربہ کاری اور حماقت
کی دلیل ہے"

زیبا:۔ "شاید آپ بھول گئے کہ آپ نے اس کا وعدہ
کیا تھا"

جمیل:۔ "وہ وعدہ چونکہ میری فطرت کے خلاف تھا اس لیے
جھوٹا تھا"

زیبا:۔ "آپ نے اس وعدہ کو نبھانے کی قسم کھائی تھی"

جمیل:۔ "محض ایک رسم پورا کرنے کے لیے!"

زیبا:۔ "آپ زبان دیکر اس سے پھر جانا چاہتے ہیں"

جمیل:۔ "یہ مرد کا دستور ہے"

زیبا:۔ "نہیں مرد کا دستور نہیں! یہ کہیے کہ آپ کا دستور ہے"

جمیل:۔ "اچھا تو یہی سہی! اگر اپنی زندگی کے پھول کو غم کے
کانٹے سے پاک دیکھنا چاہتی ہے۔ اگر اپنی ہستی کے
باغ کو خزاں کے جھونکوں سے ناآشنا رکھنا چاہتی ہے
تو اپنی مرضی کو میری مرضی کے سامنے جھکنا سکھا دے، اپنی
خواہش کو میری خواہش کے مطابق ڈھل جانے کی عادت
ڈال۔ سن! اپنی امیدوں کو اس قدر محدود کر دے
کہ جو میں دوں تو اسے شکریہ کے ساتھ قبول کر سکے
اور جو میں نہ دوں اس کی توقع رکھ کر خود کو پریشانی
اور مجھ کو مصیبت میں نہ ڈالے"

زیبا:۔ "کاش یہ ممکن ہوتا، میرے سرتاج! کاش میرے
پہلو میں ایک عورت کے دل کی بجائے پتھر کا ایک چٹان ہوتا"

جمیل:۔ "اچھا تو جا کسی کنوئیں میں پھاند پڑ، سر پھوڑ، خنجر
لے کر سینے میں بھونک لے لیکن خدا کے لیے اس گھر
کو جہنم اور میری زندگی کو مسلسل عذاب بنانے کا
ارادہ نہ کر"

زیبا:۔ "میں سوچتی ہوں کہ اگر خدا نے مجھے زندگی کے ساز پر

قسمت کی نارسائی کا ماتم ہی کرنے کے لیے پیدا کیا تھا
تو آپ کی محفلِ عشرت کو سرد کر دینے کے لیے کیوں بھیج دیا
لاکھ کوشش کرتی ہوں۔ ان آنسوؤں کو بڑا سمجھاتی ہوں
انہیں ضبط کی قسمیں دیتی ہوں۔ ان سے وعدے لیتی ہوں
کہ یہ نادان ہمدرد، معصوم دوست مجھے اپنی صورت نہ
دکھایا کریں۔ مگر یہ میری سنتے ہی نہیں، مانتے ہی نہیں۔"

(آنسو اُمڈ آتے ہیں)

جمیل:۔" اوہ! تو نے پھر رونا شروع کر دیا۔ بدنصیب عورت!
کیا تو صرف رونے اور دنیا بھر کو رُلانے کے لیے پیدا کی گئی
تھی؟ اگر میں کچھ دیر تیری موجودگی میں اور رہا تو یقیناً پاگل
ہو جاؤں گا۔"

(جھلا کر چلا جاتا ہے۔ دوسرے دروازہ سے انور داخل ہوتا ہے)

انور:۔" فلک کے شکار! اس نامراد پودے کی طرح جو جوانی
ہی کی عالم میں بجلی کی نذر ہو جاتا ہے، قسمت کی نارسائی
کا ماتم کر رہی ہے۔ نہیں جانتی کہ تقدیر کے لکھے اب اگر
کاتبِ تقدیر بھی چاہے تو بدل نہیں سکتا۔

زیبا:۔" انور، انور، تم پھر آ گئے! آخر تم کیوں میرے ضبط کے
دشمن ہو گئے ہو؟ کیا مجھے رسوا اور ذلیل کرنا چاہتے ہو
کہ دنیا کی لعنتوں سے بچنے کے لیے خودکشی کروں؟

انور:۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو زیبا؟ تم میری بہن ہو اور میں اپنی
بہن کو درد و الم میں تڑپتا ہوا دیکھ کر کس طرح خاموش
رہ سکتا ہوں۔

زیبا:۔ میں جانتی ہوں انور۔ مگر میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہاری
محبت اور ہمدردی میرے شوہر کے غصہ اور نفرت سے
زیادہ مہلک ہے۔ خدا کے لیے یہاں سے چلے جاؤ۔ وہ
تمہیں یہاں دیکھ لیں گے تو ایک آفت آ جائے گی۔"

(جمیل الماری سے کچھ نکالنے کو پھر آتا ہے)

انور:۔" وہ! کون؟ تمہارے شوہر یعنی میرا بھائی؟ ایک پاگل
شرابی، بیوقوف، دیوانہ جو جھوٹے اور سچے موتی میں
تمیز نہیں کر سکتا۔ سچ کہتا ہوں، زیبا! اگر اس نے
عنقریب اپنے رویہ میں کوئی تبدیلی نہ کی تو میں اسے
جان سے مار دونگا۔ اس کی گردن گھونٹ دوں گا
اس کا گمراہی کا پرورش کرنے والا دماغ اپنے بوٹ
کی ٹھوکروں سے کچل ڈالوں گا۔"

جمیل:۔ (قہقہہ) بیوقوف انور! عشق و محبت کی دنیا میں تم
بھی ایک نا سمجھ بچے ہو۔ نادان! ایسے ارادوں کو الفاظ
کی بجائے ہمیشہ عمل کا جامہ پہنایا کرتے ہیں۔ اگر بہادر
ہو، حوصلہ اور جرأت رکھتے ہو تو خنجر نکالو اور میرے
سینے میں بھونک دو۔ تمہاری دلنواز محبوبہ تو نہ جانے
کتنے عرصے سے اس دن کا انتظار کر رہی ہوگی۔"

زیبا:۔" خداوندا! خداوندا! یہ میں کیا سن رہی ہوں؟"

جمیل:۔" میری پیاری زیبا! گھبرا کیوں گئیں؟ محبت کرنا گناہ
نہیں خواہ وہ اپنے شوہر کے چھوٹے بھائی سے ہی کیوں
نہ ہو۔ آؤ، جرأت کا ثبوت دو؟ آنکھوں میں چمک
چہرہ پر تازگی اور ان کانپتے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ
پیدا کرو۔ تمہارے یہی شایانِ شان ہے۔"

زیبا:۔" میرے ..... میرے سرتاج! خدا کے لیے ایسے
الفاظ منہ سے نہ نکالو۔ تم گنہگار بن رہے ہو۔"

جمیل:۔ میں گنہگار بن رہا ہوں؟ ـــــ میں؟ ـــــ میں
یا تم؟ ذلیل، بے حیا عورت ...."

زیبا:۔ خاموش! ـــ میں کہتی ہوں کہ خاموش رہو! شراب
نے تمہارے ہوش و حواس کا خون کر دیا ہے۔ تم
انسانیت اور شرافت کو بھول گئے ہو۔ تم نہیں جانتے
نہیں سمجھتے کہ کیا کہہ رہے ہو اور کس سے کہہ رہے ہو۔"

جمیل: "کس سے کہہ رہا ہوں؟ (قہقہہ) صاف صاف سننا چاہتی ہو؟ ۔۔۔ سنو! ایک طوائف سے ایک خود فروش آوارہ، بدکار رنڈی سے ۔۔۔ ایک ۔۔۔"

زیبا: (بگڑ جاتی ہے) "مرد! میں کہتی ہوں ایک شرابی عیاش، بدمعاش، بدکردار انسان کی بیوی اگر خود فروش آوارہ، بدکار، رنڈی نہیں ہوگی تو اور کون ہوگی؟ تم کہاں کے شریف ہو جو اپنی بیوی سے شرافت کی توقع رکھتے ہو۔ کیا بھول گئے کہ رات کے اندھیرے میں ڈوبتے ہوئے تاروں کے سایہ میں جب تمہاری بیوی کا غم کے ساز پر آنسوؤں کا گیت گایا کرتی ہے تو تم کسی اور کی محفل میں عیش اور خوشی کے راگ گاتے ہو۔ تمہاری یاد کا دیپک "آہ" کے شعلوں سے جب اس کے سکون اور اطمینان کے دامن میں آگ لگا دیتا ہے تو تم کسی اور کی گود میں چین سے سو رہے ہوتے ہو ۔۔۔ آہ!

"تمہارے منہ کے جہنم سے شراب کے بھبکیوں نے میری معصومیت کو جلا کر راکھ کر دیا لیکن میں خاموش رہی۔ تمہاری گناہ کی گندگی سے آلودہ ہونٹوں نے میری روح تک کو ناپاک کر دیا لیکن میں نے کچھ نہیں کیا تمہاری لڑکھڑاتی ہوئی ٹانگوں نے اور بہکتے ہوئے جملوں نے جسم اور روح کی ناپاکی کی گواہی دی لیکن میں نے کان اور آنکھ بند کر لیں۔ میرے پیارے شوہر! وفا کے معاملہ میں تو تم تقدیر سے آگے بڑھ گئے۔ پھر آج کس بھروسے پر، کس توقع پر اپنی کس محبت کے صلہ میں مجھ سے عصمت اور شرافت کا مطالبہ کر رہے ہو اپنے ۔۔۔ سلوک کے معاوضہ میں مجھ سے حیا اور غیرت کی تمنا رکھتے ہو؟"

انور: ۔۔۔ زیبا! ۔۔۔ یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟

زیبا: "میں نے تمہاری نفرت کے باوجود تمہاری خدمت کی۔ روتی ہوئی آنکھوں کو ہنسنا اور تڑپتے ہوئے دل کو پرستش کرنا سکھایا۔ تمہیں اپنی زندگی کا دیوتا سمجھا لیکن تمہاری بے شرمی نے اس پر بھی کروٹ نہ لی۔ تمہارے دل میں مروت کا خیال تک نہ آیا۔ ظالم! تم سے تو یہ بھی نہ ہوا کہ اگر میری محبت کی نہیں تو میری خدمت ہی کی قیمت ادا کرتے۔

جمیل: "اوہ! ۔۔۔ یہ میرا قصور نہیں۔ مجھے تجھ سے محبت نہ تھی۔"

زیبا: "محبت! ۔۔۔ بس رہنے دو۔ تم کیا جانو کہ محبت کس جذبہ کا نام ہے۔ کتابوں، ناولوں، فلموں اور یورپ کے حیا سوز جلوؤں نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے۔ تم مشرق کی عورت سے مغربی تہذیب کی توقع رکھتے ہو۔ تم یمن کے لال پر شیشے کے ایک حقیر ٹکڑے کو ترجیح دیتے ہو۔ بتاؤ! ایک بیوی، تمہاری اطاعت اور خدمت کے علاوہ اور کیا کر سکتی ہے تمہیں مجھ سے محبت نہ تھی، کیوں؟ اسی لیے کہ مجھے تمہارے ساتھ شراب پینا، ہوٹلوں میں اپنی صورت اور جوانی کا سودا کرنا، تمہارے دوستوں سے بے حجابانہ آنکھیں لڑانا نہیں آتا، اس لیے کہ مجھے زلفوں کے پھندے بنانا، پاؤڈر اور سرخی کی چھیڑ چھاڑ سے حسن کو چمکانا تبسم کی شوخی سے لوگوں کے شوق میں آگ لگانا نہیں آتا تھا، جنہیں میں تمہیں اب سیکھ کر دکھاؤں گی میرے وفا شعار، محبت نواز شوہر! دیکھ لینا کوئی دن میں اب میں تمہاری پیرس کی پریوں کو شرماؤں گی

جمیل: "یہ یہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

زیبا: "یہ کیا کہہ رہی ہوں؟ نہیں سمجھ سکے؟ میرے جمیل! میرے

ستا رہی! میں تمہارا پڑھایا ہوا سبق دہرا رہی ہوں
میں تمہیں تمہاری حالت آئینہ بن کر دکھا رہی ہوں۔ میں
ایک بیکار عورت ہوں۔ ظاہر ہے کہ تمہیں ایسی عورت کی
ضرورت نہیں ہو سکتی۔ میں ایک خود فروش آوارہ رنڈی
ہوں۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ ایسی عورت تمہاری بیوی کہلانے کا
کوئی حق نہیں رکھتی۔

جمیل: ایسی ...... ایسی شرمناک گفتگو! زیبا، اپنی زبان
بند کرو؟"

زیبا: کیوں؟ اس لیے کہ تم مرد ہو۔ دنیا کی نگاہوں میں گنہگار
ہونے کے باوجود قابل معافی ٹھہرائے جاؤ گے اور میں ایک
عورت ہوں۔ ایک ناچیز، حقیر لونڈی۔ قسمت نے جسے تمہارے
ارادے کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے کو پیدا کیا ہے
تم اپنے غم اور غصہ کو شراب کی بوتلوں اور بازاری عورتوں
کے بوسوں میں غرق کرنے کا حق رکھتے ہو لیکن میں اپنے
دل کی ناکامیوں، قسمت کی نارسائیوں، ہچکیوں اور
آنسوؤں کو گھر کی چار دیواری اور اپنی عزت کے دامن
میں چھپانے پر مجبور ہوں۔ لیکن اب میں یہ قانون نہیں
مانوں گی، اس فیصلہ کے سامنے سر نہیں جھکاؤں گی۔ میں
جانتی ہوں کہ یہ تعصب کے شعلوں سے لکھا ہوا قانون
عدل اور انصاف کو جلا کر راکھ کر دینے والا فیصلہ۔ خدا
کا بنایا ہوا قانون اور فیصلہ نہیں [illegible]
مرد کا بنایا ہوا فیصلہ ہے

جمیل: تو تم میری بیوی ہو۔ میرے ہر حکم کی غلامی پر مجبور ہو!

زیبا: ہاں بیشک! لیکن تم میرے شوہر کب بنے۔ تم نے آج
تک کون سا قول نبھایا جو آج مجھ سے اپنے حکم کی غلامی
کی امید رکھتے ہو۔ جاؤ، جاؤ، اس شراب خوار رنڈی سے
اپنے حکم کی غلامی کا مطالبہ کرو جس کی گود میں سر رکھ کر
تم اپنی بیوی اپنے گھر اور اپنی عزت کو بھول جاتے ہو۔
وہ تمہارے حکم کی غلامی بھی کرے گی اور تمہیں سچی محبت کا
تحفہ بھی دے گی۔

انور: زیبا! زیبا! یہ تو کیا غضب کر رہی ہے۔ خدا کے لیے
اپنی زبان بند کر"

زیبا: انور! کیا تم بھی بڑے بھائی کی طرح شرافت کو ٹھکرانے،
شراب کے نشے میں اندھے ہو کر بیوی اور خاندان کی عزت
کو بھول جانے پر آمادہ ہو۔ اگر تم بھی اس قدر بیباک ہو
تو تو زوج سے میں تمہاری ہوں اور قسم کھاتی ہوں کہ دنیا
کے روز خدا کے سامنے بھی تمہاری ہی ہونے کا اقرار کروں گی"

انور: زیبا! زیبا! بھابھی، بہن!! یہ معصومیت کے دامن میں
آگ لگا دینے والے، یہ عورت کی عزت اور اس کی عصمت
کی دھجیاں اڑا دینے والے الفاظ واپس لے! واپس لے!
میں مطالبہ کرتا ہوں کہ انہیں واپس لے!!

زیبا: کیوں؟ جب تمہارے تعلیم یافتہ، لائق اور مہذب بھائی
کی نظروں میں مجھ میں اور ایک طوائف میں کوئی تمیز نہیں کر سکیں
تو مجھ ایک خود فروش، بدکار، آوارہ رنڈی کی نگاہیں تم
میں اور تمہارے بھائی میں کوئی فرق کیوں دیکھیں"

جمیل: آہ! ــــ بے شرم! بے غیرت! تو ــــ تو مجھے
مجبور کر رہی ہے کہ میں تجھے جان سے مار ڈالوں۔ تیری گردن
گھونٹ دوں۔ یہ ــــ یہ سانس کا چلتا ہوا کارخانہ ہمیشہ ہمیشہ
کے لیے بند کر دوں۔

زیبا: اچھا تو کیا مجھے قتل کرو گے؟ باتوں سے، اشاروں سے غفلت
کے تیروں اور بے یقینیوں کی برچھیوں سے قتل کر چکے۔ جواب خنجر یا پستول
سنبھالو گے، یا ہاتھ کے فولادی پنجے سے کام لو گے؟ میرے پیارے جمیل!
میں تب بھی زندہ رہی اور اب بھی زندہ رہوں گی۔ یاد رکھو! جب تک تمہاری
اس عزت کو جس کے احترام میں میں نے اپنی ہستی کو قربان کر دیا، اپنی آرزوؤں
اور تمناؤں کو مٹا دیا۔ خاک میں ملا کر بدلہ نہ لیلوں زندہ رہوں گی ــ
زندہ اور سلامت۔ ہا! ہا! زندہ کیوں ہو گئے؟ تم کانپ کیا رہے ہو؟
کیا ــ کیا میری قسمت [illegible] تم مجھ سے روٹھ گئے [illegible]

قبل اس کے کہ ادارہ نوابزادہ جاوید قمری کی مرسلہ نظم کا شکریہ ادا کرے یہ معلوم کرکے بنہایت افسوس کے ساتھ دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے کہ آپ کی ہمشیرہ جو کہ آپ سے صرف ایک سال بڑی تھیں ۲۶ سال کی عمر میں صرف چار گھنٹہ کی علالت میں راہی ملک بقا ہوئیں۔ اناللہ...... اس حادثہ جانکاہ پر ادارہ جدید اردو، قمری صاحب کا دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے اور صمیم قلب سے دعا کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ مرحومہ کی روح کو گلشن فردوس میں جگہ دے اور ان کے متعلقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ ادارہ

عہد رفتہ

وہی چند دن تھے ہماری خوشی کے
بچی ہیں جو تسکیں غم زندگی کے
گرفتار تھے ہم خود اپنی خودی کے
تمہارے سوا جب نہ تھے ہم کسی کے
الٰہی وہ دن کیا ہوئے عاشقی کے

فروغ جہاں رونق انجمن تھے
ہمارے گلستاں ہمارے چمن تھے
ہر اک بزم میں تاجدار سخن تھے
تمہارے سوا جب نہ تھے ہم کسی کے
الٰہی وہ دن کیا ہوئے عاشقی کے

تم ہی تم تھیں اپنی نگاہوں میں رقصاں
ہر اک سانس تھی بائے جنت بداماں
تخیل میں دن رات تھیں تم خراماں
تمہارے سوا جب نہ تھے ہم کسی کے
الٰہی وہ دن کیا ہوئے عاشقی کے

ہر اک بات پر ناچتا تھا تبسم
ہمارے لیے ہی بنا تھا ترنم
محبت کی پرپیچ راہوں میں تھے گم
تمہارے سوا جب نہ تھے ہم کسی کے
الٰہی وہ دن کیا ہوئے عاشقی کے

پڑی تھیں جوانی کی بانہوں میں بانہیں
محبت سے تھیں والہانہ ادائیں
لبوں تک نہ پہنچی تھیں ولدوز آہیں
تمہارے سوا جب نہ تھے ہم کسی کے
الٰہی وہ دن کیا ہوئے عاشقی کے

چھلکتی تھی مینا، کھنکتے تھے ساغر
قدم در قدم تھے شرابی سے محشر
نچھاور تھے ہم پر سے پروین و اختر
تمہارے سوا جب نہ تھے ہم کسی کے
الٰہی وہ دن کیا ہوئے عاشقی کے

زمانے تھے اور گنگناتی زمانے
فسانوں سے پُر تھے ہمارے فسانے
زبانوں کے لب پر تھے رنگیں ترانے
تمہارے سوا جب نہ تھے ہم کسی کے
الٰہی وہ دن کیا ہوئے عاشقی کے

محبت کی منزل میں ہم گامزن تھے
قریب محبت سے ہم نغمہ زن تھے
بہ شان دیگر جلوہ انجمن تھے
تمہارے سوا جب نہ تھے ہم کسی کے
الٰہی وہ دن کیا ہوئے عاشقی کے

— آوسل قصوری

شرارے

کامریڈ!

تمہارے بے شمار خطوط میرے پاس آچکے اور نہ جانے کتنے آتے رہیں گے۔ ہر خط میں تم نے صرف شکایت ہی شکایت لکھی ہے۔ ٹھیک ہے تمہاری سر آنکھوں پر۔ لیکن تمہیں معلوم کہ میں کتنا عدیم الفرصت ہوں۔

آج روس کی چھبیسویں سالگرہ منائی گئی ——— سالگرہ! درازیٔ عمر کی نہیں، محبت کی نہیں ——— انقلاب کی، آزادی کی، قومیت کی!!! سالگرہ کی یہ مبارک ساعت ہمیں برابر چونکاتی ہے، یخ بستہ جسم کو جھنجھوڑتی ہے اور کہتی ہے ——— غلامی کی زنجیریں انقلاب کے ہتھوڑے سے کچل ڈالو۔ کیونکہ غلامی موت ہے اور آزادی زندگی! لیکن جب میرے کان ان شعلہ ریز الفاظ سے آشنا ہوتے ہیں تو میں کانپ اٹھتا ہوں اور خیال پیدا ہوتا ہے ہم ہندستانی کتنے بزدل، کتنے سرد اور کتنے احمق ہیں۔ ہم غلامی کی متعفن اور سڑی ہوئی ہڈیوں کے لیے کس طرح آپس میں سنگ و خشت کر رہے ہیں۔ ہم ایک ایسی جگہ سانس لے رہے ہیں جہاں انقلاب اور آزادی بے معنی شئے ہے ——— جہاں غیرت اور خودداری پانی کی طرح ارزاں ہے۔

اچھا کامریڈ! آج یہیں تک۔ باقی پھر!

کامریڈ!

تم اتنا جلد باز مت بنو۔ پانی میں یکایک آگ کی گرم گرم چنگاری دیکھنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ انقلاب طوفان نہیں ہے جو آن کی آن میں درخت اکھڑ دے۔ صدیوں سے ہم کچلے ہوئے ہیں۔ ہماری اولوالعزمی، بلند حوصلگی اور خودداری مر چکی ہے۔ سب سے پہلے ہمیں اپنی سوسائٹی بدلنا ہوگی، خیالات تبدیل کرنی ہونگے، ویسی فضا پیدا کرنی ہوگی۔

آج میں نے "تان سین" دیکھا۔ ہندستان کے سب سے بڑے گویا کی سوانح حیات! لیکن میں اس کا اثر دماغ میں کیا لے کر آیا ——— بیخودی، نشہ، جمود، بس! بھلا بتاؤ آخر ہندستان کو اس طرح کب تک لوٹا جائیگا۔ میں پوچھتا ہوں ایسی فلم بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے جن کے اندر محبت، عشق اور چند رومان پرور گانے ٹھونس دیئے جائیں۔ کیوں نہیں "زرد تی" جیسی فلم بنتی ہے۔ جو ہمارے رگ رگ میں آزادی کی تڑپ پیدا کرے۔ جو ہمارے خفتہ جذبات کو ابھارے۔ جو غریبوں اور سرمایہ داروں کا امتیاز مٹاتے۔

تم نے پوچھا ہے نذر الاسلام کیسے ہیں؟ آہ! نذر الاسلام، ہندستان کا سب سے زیادہ بدنصیب شاعر! اب تک وہ شمع کشتہ موت کی آہٹ کا منتظر ہے۔ لیکن ہندستانی نے اس کے لیے کیا کیا؟ اس شاعر کے لیے کتنی مسجدوں میں دعائیں مانگی گئیں۔ کتنے بندگانِ خدا کے ہاتھ اٹھے؟ اور کیوں اٹھنے لگے۔ یہ بھی کسی جماعت کا "بڑا آدمی" ہوجب نا!

کامریڈ!

اسوقت جبکہ میں قلم کی تیز دھار تب سے کاغذ کا سینہ چیر رہا ہوں ہر طرف قبرستان کی سی خاموشی مسلط ہے۔ صرف گھڑی کی ٹک ٹک اور دل کی دھڑکن سن رہا ہوں۔ میرا سینہ پھنکا ہوا ہے اور دماغ ہندستانی سماج کی فرسودہ روایات سے بغاوت کرنے کے لیے بیتاب

ہے۔ ساری دنیا کی سماجی زندگی ترقی کے مختلف مدارج طے کر چکی لیکن ہندوستانی سماج تحت الثریٰ کے بھیانک اندھیرے غار میں اب تک منہ لٹکائے خواب کی میٹھی لوریاں سن رہی ہے۔

ایک ایسا شخص جس کی ساری زندگی بداخلاقی اور گناہ سے گھناؤنی ہو چکی ہو جس نے انسانیت کے بھیس میں انسانیت کا خون کیا ہو اسے کیا حق ہے کہ ایک "معصوم عورت" کو آوارہ اور بدکار کہے محض اس لیے کہ اس کے احبابوں میں چند "آدم کے بیٹے" بھی شامل ہیں۔ مرد ـــ عورتوں کے ساتھ راہ و رسم پیدا کر سکتا ہے۔ اس کی محبت اپنے لیے باعث فخر سمجھ سکتا ہے۔ لیکن عورت کو یہ حق حاصل نہیں، اگر اس نے ایسا کیا تو "آدم کے بیٹے" کے بقول وہ فاحشہ ہے، بدچلن ہے، بدکار ہے۔ لیکن مرد کا ہر فعل حسن و خوبی کا دشن ستارہ ہے۔

کامریڈ آج میرا خون کھولا ہوا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ ان مکار مردوں کا گلا گھونٹ دیا جائے جن کا وجود سماج کی تخریب کا باعث ہے۔ جو آزادی اور مساوات کی راہ میں چٹان بنکر کھڑے ہیں۔

کامریڈ!

اس وقت میرے پیش نظر مختلف زبانوں کی کتابیں منتشر ہیں۔ ٹھیک اس طرح جیسے آسمان کی لطیف گود میں تاروں کی بے شمار لڑیاں۔ لیکن ان کتابوں میں دو کتابیں نہایت اہم ہیں ایک نذر الاسلام کی شعلہ پرور اور انقلابی نظموں کا مجموعہ "اگنی بینا" اور دوسری آنجہانی ٹیگور کی نوبل پرائیز یافتہ "گیتا نجلی"۔ میں نے دونوں کتابوں کا بغور مطالعہ کیا۔ شروع سے آخر تک۔ لیکن دونوں میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ ایک کتاب ہماری سرد کھوپڑیوں میں آزادی کی گرم گرم لاوے جیسی چنگاریاں ڈھالتی ہے اور دوسری ہماری تھکے ہوئے دماغ کو اپنی لطیف موسیقی اور خواب آور راگنی سے سکون اور شانتی کے جزیرے میں بہا لیجاتی ہے۔ بتاؤ میں تم سے پوچھتا ہوں غلام ہندوستان کے لیے کون کتاب موزوں ہے ـــ؟ ہندوستان کو کس ادیب اور شاعر کی ضرورت ہے؟ ہندوستان کیسا ادب چاہتا ہے؟ صدیاں بیت گئیں ان میٹھے نغموں کو سنتے سنتے! ان حسین سپنوں میں جسم کا رگ رگ اینٹھ گیا۔ اس وقت جبکہ ساری دنیا ایک عالمگیر جنگ کی بھٹی میں برسرپیکار ہے ہمیں ان حسین سپنوں اور شیریں راگنیوں سے الگ ہونا ہوگا۔ اس وقت ہمیں ضرورت ہے ایسے شاعر کی، ایسے ادیب کی جو ہمارے صدیوں کے جمود اور پرانی بے حسی میں آگ لگا دے جس کے الفاظ میں شعلے تڑپتے ہوں، جس کے بول میں انقلاب کا کوہ آتش فشاں ہو!

میری ان باتوں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں "گیتا نجلی" کی مذمت کر رہا ہوں۔ میں تو تمہیں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ ادب اور شاعری کو وقت کا ساتھ دینا ہوگا۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ انقلاب روس ۱۹۱۷ء میں روسی ادب کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اگر میں کہوں کہ ادب ہی نے روس میں انقلاب برپا کیا تو شاید بیجا نہ ہوگا کیونکہ ادب، ذہنی اور فکری آزادی میں ممد و مددگار ہوتا ہے۔

کامریڈ! بہت ممکن ہے کہ میں آئندہ خط میں ہندوستانی نظام معاشرت کے متعلق کچھ لکھونگا۔ کیونکہ ہماری معاشرت اس قدر پست ہے، اتنی ذلیل ہے کہ دیکھ دیکھ کر دل کے ٹکڑے ہوتے ہیں۔ اچھا خدا حافظ!

محمد یونس احمر کلکتہ

قیدی

یہ ایک تلخ حقیقت ہے جو صفحۂ قرطاس پر افسانے کی شکل میں پیش ہو رہی ہے۔ میں اس افسانہ کو مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی کے نام نامی سے معنون کرتا ہوں ـــــ خلیل۔

"آپ میرے پاس آنے سے گھبراتے کیوں ہیں؟"

نہیں صادقہ! خدا کی قسم یہ بات نہیں۔ چونکہ مشغولیت بہت زیادہ ہے اس لیے تمہارے پاس بیٹھنے کا موقع بہت کم ملتا ہے دیکھو نا! صبح سے شام تک تو دفتر میں اپنی ہڈیاں پیلتا ہوں، تب کہیں مشکل سے دو وقت کی روٹی اور ایک چلو پانی نصیب ہوتا ہے اگر گھر بیٹھوں تو پھر کھانے کو کہاں سے آئے؟"

"نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ آپ ان دنوں سخت ذہنی کشمکش میں گرفتار ہیں، اور مجھ سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاید آپ کو یہ سوچ کر رنج ہوتا ہوگا کہ میں، ایک معمولی کلرک کی شریک زندگی بن کر دکھی ہوں۔ لیکن خدا شاہد ہے کہ میرے نزدیک کونین کی ساری دولت بھی آپ کی ذرا سی محبت کی قیمت نہیں ہو سکتی۔ میں تو اس کو اپنی انتہائی خوش قسمتی تصور کروں گی کہ اگر آپ کے قدموں پر میرا دم نکلے۔"

صادقہ کی اس بے لوث محبت کے اظہار پر سہیل کا دل تڑپ اٹھا۔ اس نے سیفٹی ریزر کو الگ رکھ دیا۔ اگال زنگ آلود بلیڈ سے داڑھی بنانے کی ناکام کوشش میں بالکل سرخ ہو گیا تھا۔ وہ اٹھا اور اپنی تین سال بچی شاہدہ کو گود میں لے کر صادقہ کے سرہانے آ بیٹھا۔ اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا "پیاری صادقہ! تمہیں اس معصوم بچی کی قسم، تم ایسے بُرے الفاظ اپنے منہ سے نکالو دل مضبوط کرو۔ خدا جلد تمہیں صحت دے گا۔"

صادقہ نے بڑی مشکل سے کروٹ بدلی، اور بچی کی بلائیں لینے لگی۔ بچی بھی حسرت بھری نگاہوں سے اپنی بیمار ماں کا منہ تکنے لگی اس کی آنکھوں میں ابھی سے یاس کی تصویریں جھلک رہی تھیں۔ ننھی سی جان، بھوک پیاس کی تکلیف برداشت کرتے کرتے بالکل نڈھال ہو چکی تھی۔ بچی کا سوکھا ہوا منہ دیکھ کر صادقہ کے نازک دل میں سخت چوٹ لگی۔ لیکن وہ سہیل کی نیچی نگاہیں دیکھ کر خاموشی سے اپنے امنڈتے ہوئے آنسو کو پی گئی۔ اس نے سوچا کہ آجکل کئی کئی وقت بیچارے سہیل کو بھی فاقہ کرنا پڑتا ہے۔ گھر میں جو کچھ اثاثہ تھا وہ تو میری طویل بیماری کی نذر ہو گیا۔ اب اتنا نہیں جو علاج معالجے میں خرچ کیا جائے۔ بہتر ہے کہ اس کا خیال دلا کر سہیل کے زخمی دل کو صدمہ نہیں پہنچایا جائے۔ سہیل اپنی نیچی نگاہیں کیے کسی خیال میں مستغرق تھا۔ اس کے سارے خیالات ایک تلخ حقیقت کے محور پر گردش کرنے لگے۔ وہ سوچنے لگا کیا دنیا امیدوں کے لیے بھی قید خانہ ہے؟ غریبوں کو اس قید خانے کے تیسرے درجے میں جگہ ملتی ہے؟ کیا دنیا کے اقوام زمانہ کمزوروں کے لیے آسمانی صحیفے ہیں یا انسانی سوسائٹی کے تحفے؟ وہ اپنے دل کے اس آخری سوال پر گھبرا اٹھا اسی کا [illegible] اس کا جواب دینے سے بالکل قاصر تھا۔ اسی وقت صادقہ اپنی سوکھی ہوئی انگلیوں سے اس کے

کو سلجھاتی ہوئی بولی "آپ اب تک دفتر نہیں گئے؟" دفتر کا نام سنتے ہی سہیل چونک پڑا۔ اس کا دماغ پریشان ہوگیا۔ وہ چاہتا تھا کہ سچ مچ آج دفتر نہیں جائے اور سارا وقت صادقہ کے پاس بیٹھ کر گذار دے۔ معاً اسے کل کا درد فرسا واقعہ یاد آگیا اس کی آنکھوں میں اکاؤنٹنٹ کی فرعونی تصویر پھر گئی۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ "نقلی صاحب بہادر" اپنے کیبن میں آرام دہ کرسی پر پوری فرعونیت کے ساتھ رونق افروز ہیں۔ سہیل کیبن کے دروازے پر کھڑا ہے اور گڑگڑا کر کہہ رہا ہے "صاحب مجھے معاف کردو دیر ہوگئی۔ بیوی سخت بیمار ہے۔ اس کو دیکھنے والا کوئی نہیں۔" اکاؤنٹنٹ صاحب کی گردن کو کچھ جنبش ہوئی نگاہ اوپر اٹھائی، اور سہیل کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیتے ہوئے بولے "اگر گھر میں کوئی تیماردار نہیں تو پھر کسی نرس کو مقرر کیوں نہیں کر لیتے"

"صاحب! میں تو ایک معمولی کلرک ہوں۔ صرف تیس چالیس روپے پاتا ہوں۔ بنک سے جو راشن ملتا ہے وہ محض ناکافی ہے ہم تین جان ہوں۔ لیکن اس ماہ صرف بیس سیر چاول ملا ہے۔ نہ تیل، نہ دال، نہ آٹا اور نہ کوئلہ۔ پیسہ نہیں کہ بیوی کا علاج کراؤں۔ بچی کو دودھ نصیب نہیں۔ کئی مہینے کا گھر کا کرایہ باقی رہ گیا ہے اب گھر والے نے نوٹس دے رکھی ہے۔ میری یہ حیثیت کہاں کہ بیوی کی دیکھ بھال کے لیے نرس رکھوں"

"بنک یہ نہیں جانتا کہ بیوی بیمار ہے یا بچے بھوکے ہیں۔ وہ تمہیں واجب مزدوری دیتا ہے۔ اس لیے وقت پر پورا کام چاہتا ہے۔ اگر تمہارا پیٹ نہیں بھرتا تو خدا کا ملک تنگ نہیں ہے"

صادقہ کے کراہنے کی آواز نے سہیل کے طلسم خیال کو توڑ ڈالا۔ اس نے دیکھا کہ وہ اکاؤنٹنٹ کے کیبن کے پاس کھڑا نہیں بلکہ صادقہ کے سرہانے بیٹھا ہے اس کی معصوم بچی بھوک سے بلک رہی ہے۔ وہ اٹھا اور دودھ تلاش کرنے لگا۔ اسے معاً خیال آیا کہ میرے گھر میں دودھ کہاں ہے اس خیال سے ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے اس کے سر پر ہتھوڑا دے مارا۔ سہیل صادقہ سے نظر بچا کر بچی کو ایک کونے میں لے گیا۔ اور سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا دے کر اسے بہلانے لگا۔ غریب بچی بھوکی تھی۔ وہ اسی کو دولت غیر مترقبہ سمجھ کر بہل گئی۔ سہیل اٹھا اور اپنی پھٹی چٹی شیروانی کو زیب تن کیا۔ اس نے جوتے پر نگاہ کی تو معلوم ہوا کہ اس پر مصیبتوں کی بارش پڑ چکی ہے۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا "آہ یہ زندگی" اور وہ اسی ہیئت کذائی کے ساتھ دفتر کو روانہ ہوگیا۔

سہیل لمبے لمبے قدم بڑھاتا ہوا دفتر کی جانب جا رہا تھا۔ لیکن اس کا دماغ ایک طوفانی سمندر بنا ہوا تھا۔ اس میں خیالات کی پرشور موجیں اٹھتیں، اور سہیل تھپیڑے کھاتا ہوا تند و تیز دھارے پر بہہ نکلتا۔ کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ موجوں کی کشمکش سے بالکل تھک چکا ہے اور وہ تھوڑی دیر سکون کے لیے کسی ساحل کا کنارہ چاہتا ہے۔ اس کے پردہ دماغ پر گذشتہ واقعات کی تصویریں ابھرتیں اور پھر غائب ہو جاتیں۔ اسے خیال آیا کہ جب وہ بی۔ اے میں پڑھتا تھا تو کس طرح وہ اپنے عالم تصور میں خیالی محلیں تعمیر کرتا تھا۔ اسے توقع تھی کہ وہ بی۔ اے ہو کر دنیا میں پوزیشن حاصل کرے گا۔ پھر صادقہ کے ساتھ عیش و آرام کی زندگی گذارے گا۔ وہ طرح طرح کے منصوبے باندھتا تھا لیکن فلک کج رفتار اسے برباد کرنے کی فکر میں لگا تھا۔ وہ امتحان میں ناکام رہا اور چند ہی ماہ میں اس کی ساری جائداد پر اس کا چچا قابض ہوگیا۔ اب وہ روٹی کے ٹکڑوں تک کا محتاج ہوگیا تھا۔ اس نے مجبوراً بنک کی ملازمت اختیار کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ بنک میں کچھ تو سکون اور آرام ملے گا۔ لیکن اس کا خیال غلط نکلا۔ اسے معلوم ہوا کہ یہاں سرمایہ داروں کے پاؤں تلے مجبور انسانوں کی

روح آزادی اور احساس خودی پژمردہ ہو رہی ہے۔ یہاں ملک کے قوانین کی اہمیت تارِ عنکبوت سے زیادہ نہیں۔ وہ ان ہی خیالات میں کھویا ہوا اپنی گردن نیچی کیے چلا جا رہا تھا۔ دفعتاً اس کی نگاہ گرینڈ ہوٹل کے پاس فقیروں کے ایک ہجوم پر پڑی ــ ایک ہجوم ــ مظلوم ہندوستانیوں کا ایک گروہ ــ بیکس و ناچار انسانی جماعت۔ ان غریبوں کے زیادہ تر جسم کپڑے سے بے نیاز تھے۔ بعض عورتوں کی گود میں ان کے نحیف و لاغر بچے تھے جو اپنی غریب ماں کی سوکھی ہوئی چھاتیوں کو منہ میں لیکر دودھ حاصل کرنے کی ناکام کوشش میں تھک کر بیہوش ہو چکے تھے۔ بعض بچوں کے سر ماں کے شانے پر ڈھلک کر رہ گئے تھے۔ دھنسی دھنسی آنکھیں کھلی تھیں۔ لیکن پتلیاں اُوپر چڑھی تھیں اور اُن میں موت کی پرچھائیاں ناچ رہی تھیں۔ مسلسل فاقوں کی وجہ سے سب ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ بن کر رہ گئے تھے گرینڈ ہوٹل کے اندر محفل نشاط گرم تھی۔ خوشحال طبقہ کا ایک گروہ جا بجا گھیرا ڈال کر مخملیں کرسیوں پر جلوہ افروز تھے۔ ٹیبل پر مرغن اور لذیذ غذائیں چنی تھیں۔ دلکش مینا ؤں سے حسین آبگینوں میں شراب ارغوانی انڈیلی جا رہی تھی۔ ہر شخص اپنے محبوب کی گردن میں باہیں ڈالے پوری دادِ عیش دے رہا تھا۔ باہر کے بھوکے زور نا داروں کے منہ سے نکلی ہوئی چیخ اندر پہنچنے کی کوشش کرتی لیکن یہاں کی بدمستیوں کے رنگین قہقہے میں دب کر رہ جاتی۔ سہیل کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ بھی ان بھوکوں کی جماعت میں کھڑا ہے۔ صادقہ اس کی بغل میں کھڑی شدت ضعف سے لڑکھڑا رہی ہے۔ اس کی معصوم بچی بھوک سے نڈھال ہو چکی ہے۔ اس کی حسرت بھری نیم باز آنکھوں میں رحم کی ایک التجا ہے ــ مدد کی ایک درخواست ہے ــ لیکن اس کے جواب میں؟ . . . . انسانیت سوز برتاؤ ــ ایک قہر آلود نگاہ ــ تحقیر آمیز گھڑکی . . . . .

وہ سوچنے لگا۔ شاید اب اِس رب العالمین کی خدائی باقی نہیں رہی تھی۔ شیطان کا دور دورہ تھا۔ اس کے ذریات اپنی تمام جہنمی طاقتوں کے ساتھ انسان کی انسانیت اور ملکوتی صفات کو فنا کرنے کے لیے برسرِ پیکار تھے۔ فرعون کی غلامی کا پھندا بنی اسرائیل کی گردن میں پھانسی کی رسّی ثابت ہو رہا تھا۔ لیکن اب تک کسی کلیم کی آمد کے آثار ظاہر ہوئے تھے۔ خدائے بزرگ و برتر کی عظمت و جبروت کو ٹھیس لگ رہی تھی لیکن اب تک عرش عظیم کے پائے کو کوئی جنبش نہ تھی۔ مظلوموں اور بیکسوں کی کمزور نگاہیں آفات سماوی کے انتظار میں تھک کر رہ گئی تھیں لیکن معلوم نہیں خدا کا قہر کس کروٹ سو گیا تھا۔ سہیل ان خیالات کے دھارے بہا جا رہا تھا کہ سامنے "وائٹ وے لڈلا" کے گھڑیال نے دس بجائے۔ وہ چونک پڑا۔ دوڑتا ہوا دفتر پہنچا اور دماغ سوز اوراق میں کھو گیا۔

اگر کلکتہ کے ایک رخ کو عالیشان و فلک بوس عمارتیں دلکش بناتی ہیں۔ تو تصویر کے دوسرے رخ میں مٹی کی شکستہ چہار دیواریاں اور پھوس کی بے سقف جھونپڑیاں حسرت و یاس کا رنگ بھرتی ہیں۔ اگر امیروں کے محلے برقی قمقموں سے بقعہ نور بنے رہتے ہیں تو اُجڑے نصیب کی جھونپڑیوں میں ٹمٹماتے دیا کی آخری لو دم توڑتی رہتی ہے۔ رات کے دو بجے کا عمل تھا۔ ہر طرف خاموشی چھائی تھی۔ آسمان پر ستاروں کی شمعیں جھلملا رہی تھیں۔ سہیل صادقہ کے سامنے ٹوٹی چارپائی پر بیٹھا اپنی مظلومیت اور ہم جنسوں کی حیوانیت پر آنسو بہا رہا تھا۔ بنک کے ڈاکٹر نے ازراہ نوازش صادقہ کی حالت سن کر اس کے لیے ایک پیٹنٹ دوا تشخیص کی تھی۔ مہینہ کا آخر تھا۔ بیچارے سہیل کے پاس اتنی رقم کہاں کہ دوا خریدے۔ اب صرف ایک صورت باقی تھی کہ وہ صادقہ کے آویزے کو گرو رکھا اور اسے قیمت کی بہ نسبت صرف دس روپے کی معمولی رقم مل سکی۔ وہ دفتر سے سیدھا دوا فروش کے یہاں پہنچا۔ یہاں دوا کے پرانے ذخیرے موجود تھے۔ لیکن لڑائی کی وجہ سے دوکاندار زیادہ سے زیادہ نفع خوری پر تلا ہوا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ جو دوا پہلے تین چار روپے کو ملتی تھی اب بیس تیس روپے کو ملتی ہے۔ بیچارے سہیل

کے پاس تو صرف دس روپے تھے۔ اس نے دوا فروش کی بیحد منت وسماجت کی لیکن اس ظالم کے نزدیک دوا کی قیمت ایک انسان کی زندگی سے زیادہ تھی۔ سہیل کو ناکام لوٹنا پڑا۔ اور اب صرف دعا پر اکتفا کرنے کے دوسرا چارہ نہ تھا۔ اس کا دل اس سنگدلی پر پاش پاش ہوگیا۔ صادقہ ابتک بیہوش پڑی تھی، شاہدہ اس کی بغل میں نیند کے مزے لے رہی تھی۔ صادقہ یکایک ہوش میں آگئی۔ اور شاہدہ کی بلائیں لینے لگی۔ سہیل یہ دیکھ کر پھڑک اٹھا۔ اس نے خیال کیا کہ شاید اس کی دعا مستجاب ہوگئی۔ صادقہ نے اپنی کمزور آواز سے اسے مخاطب کیا "آپ میری بیماری کے اس افاقہ پر خوش نہ ہوں۔ آپ یقین جانیے کہ جب چراغ سحری میں تیل کا آخری قطرہ جلنے لگتا ہے۔ تو روشنی تیز ہوجاتی ہے"۔ سہیل نے صادقہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا "پیاری صادقہ خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ میں نے رحم کے لیے انسانی دلوں پر دستک دیے لیکن مجھے مایوسی اور ناکامی ہوئی، اب میں نے خدائے ذوالجلال کے دروازے کو کھٹکھٹایا ہے۔ جو ٹوٹے دلوں کا آسرا اور ٹوٹی ہوئی امیدوں کا سہارا ہے"۔ صادقہ نے کراہتے ہوئے جواب دیا "بیشک! خدا کی رحمت بے پایاں ہے۔ لیکن موت بھی برحق ہے۔ دیر نہ کیجئے۔ آئیے اور اپنی صادقہ کو جی بھر کر دیکھ لیجئے۔ اپنی رفیقۂ حیات —— آہ! وہ رفیقۂ حیات جو فرمانِ اجل سے مجبور ہوکر آپ کو زندگی کے سفر میں تنہا چھوڑ رہی ہے، دل کھول کر پیار کر لیجئے۔ کیونکہ اب اس دنیا میں آپ مجھے پھر نہ پائیں گے۔ میری یہ صورت کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔ بیشک آپ کو اس کا زندگی بھر قلق رہے گا کہ میں اس حالت میں دنیا سے جارہی ہوں جبکہ مجھے دوا بھی نصیب نہیں۔ خیر! میں آپ کو . . . . . . اور شاہدہ کو خدا کے سپرد . . . کرتی ہوں". . . . . . . یہ کہتے کہتے صادقہ کی آنکھیں پتھرا گئیں ... —— سہیل نے جلدی سے اس کی نبض پر اپنی انگلیاں رکھ دیں۔ لیکن صادقہ کی مظلوم روح قفس عنصری سے پرواز کرچکی تھی۔ سہیل دیوانہ وار کمرے میں ٹہلنے لگا۔ موم بتی بالکل جل چکی تھی۔ صرف پگھلے ہوئے موم کے دائرے میں ایک چھوٹا سا جلتا ہوا دھاگا پھڑک پھڑک کر آخری روشنی دے رہا تھا۔ اس کی مدھم روشنی کمرے کو اور وحشتناک بنا رہی تھی۔ سہیل چاہتا تھا کہ وہ بھی اس دنیا کے قید خانے سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہوجائے۔ وہ تیزی سے الماری کے پاس آیا اور زہر کی ایک شیشی نکال کر چاہتا تھا کہ پوری شیشی کو ایک ہی گھونٹ میں ختم کر جائے۔ اس وقت اس کی نظر صادقہ کی یادگار معصوم بچی پر پڑ گئی۔ وہ رکا اور کچھ سوچنے لگا۔ آخر اس نے زہر کی شیشی کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو کے قطرے تیرنے لگے۔ اس نے یہ کہتے ہوئے اپنی بچی کو سینے سے لگا لیا "میری بچی شاہدہ! میں تجھے دنیا میں تنہا چھوڑ نہیں سکتا۔ میں زندگی کے آلام و مصائب کو برداشت کرونگا۔ اور صرف تیرے لیے زندہ رہنے کی کوشش کروں گا"۔ شاہدہ نے نیند ہی میں ایک ٹھنڈی سانس لی، اور باپ کے سینے سے چمٹ گئی۔ اسی وقت ایک راہ گیر یہ شعر پڑھتا گذر رہا تھا ؎

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں :: موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

شاہ خلیل الرحمٰن لکھنوی

انگلستان میں کتب بینی کا بڑھتا ہوا شوق

جو مشہور برطانوی کتب فروشوں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور جن کے ادبی "پیخون" کی لندن کی زندگی میں ایک نمایاں حیثیت ہے۔

چندر۔ زہونے آرچ بشپ آف کنٹربری نے یہ رائے دی تھی کہ ہر مکان میں خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو اپنا ایک الگ چھوٹا سا کتب خانہ ہونا چاہیئے۔ اور یہی ہر اک کتب فروشوں کی بھی ہمیشہ سب سے بڑی آرزو رہی ہے۔ اور اب ایک عالمگیر جنگ اس کی تکمیل کرسکی ہے۔

لڑائی سے پہلے برطانیہ کے عوام کتابیں خریدنے کے عادی نہیں تھے۔ کتابوں پر کل صرف ۵ شلنگ فی کس پڑتا تھا اور ان کثیر رقموں کا خیال کیا جائے جو طلبا کالج اور اسکول کے درسی کتابوں کی خریداری پر لازمًا صرف کرتے ہیں تو یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ عوام کا ایک بہت بڑا حصہ کتابیں بالکل ہی نہ خریدتا تھا۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ برطانوی قوم کتب بینی کی عادی نہیں تھی۔ اس کے برخلاف کتب خانوں کی کتابیں پڑھنے والے لوگوں کی ایک زبردست تعداد موجود تھی اور ہے۔ یہ ملک کے اُن بہترین میونسپل اور تجارتی کتب خانوں سے کتابیں حاصل کرتے ہیں جو برطانیہ میں معمولی سے معمولی قصبہ میں بھی پائے جاتے ہیں۔

کتب فروشوں کو اپنا پیٹ بھرنا بھی مشکل ہوتا تھا۔ یہ لوگ رفتہ رفتہ اسٹیشنری اور سامان آرائش پر زیادہ زور دینے لگے۔ اور برطانیہ کے دیہاتوں میں واقعی ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا کہ ایک چھوٹا کتب فروش صرف کتابوں پر ہی اپنی توجہ محدود رکھتا ہو۔ کورس کے علاوہ جن کتابوں کی مانگ تھی۔ وہ مروجہ مقبول ترین کتب۔ ہیجان خیز ناول۔ رومانی تشقیہ افسانے اور سیاسی صورت حال پر تازہ ترین کتابیں ہوتی تھیں

لڑائی نے حلقہ وسیع کر دیا۔ ممکن ہے کہ یہ کتابوں کی تجارت کا تصور ہو۔ فلمی صنعت خیال رکھتی ہے کہ لوگوں کو سینما کی فلموں کے متعلق علم ہو جائے۔ اخبارات اور سینما کے اشتہاری بورڈ ان کا روزانہ پروپاگنڈا کرتے رہتے ہیں۔ کھیل کود اور مشروبات کی بھی اسی طرح نشر و اشاعت ہوتی رہتی ہے۔ لیکن کتابوں کو مشتہر کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا جاتا تھا۔ تجارتی ادارے کتابوں کی بکری کے سلسلے میں نئے خیالات پر اکثر و بیشتر ناک بھوں چڑھاتے رہتے تھے۔ خود کتابوں کی دوکانیں بہت ہی ثقہ اور بارعب بننے کی کوشش کرتی تھیں۔ اور بہت سے لوگ تو ان میں داخل ہوتے ہوئے واقعی جھجکتے تھے۔ کتابیں پڑھنے اور انہیں اپنی زندگی کا جزو بنا لینے کی صحیح خوشی جو جائے کی دعوتوں پر گفتگو کرنے کے لیے تازہ مقبول ترین کتاب پڑھ لینے سے بالکل جدا ہے اس سے برطانوی پبلک بالکل ناواقف تھی۔

لوگوں کو یہ احساس بھی نہیں تھا کہ ان کے محبوب شوق کی ترقی میں بلکہ ان کی زندگی میں کتابیں کتنی مدد پہنچا سکتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہر قسم کے موضوعات پر کتابوں کی بہت کافی تعداد ہمیشہ فروخت ہوئی ہے۔ لیکن یہ ایسے لوگوں کے ہاتھ بیچا فروخت ہوئیں جو کتابوں کو عادی طور پر مشیر کے طور پر استعمال کرنے کی تربیت پا چکے تھے۔ اس لڑائی کے سلسلے میں جہاں اور بہت سی بڑی بڑی باتیں ہوئی ہیں یا ان میں

سے ایک یہ ہے کہ ہزاروں نئے لوگ اس حلقہ میں داخل ہو گئے ہیں۔

لڑائی شروع ہونے کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ کتابوں کی تجارت میں کساد بازاری پیدا ہو گئی۔ لوگ اتنے پریشان تھے کہ کتابوں کی خریداری کے متعلق سوچنے کا موقع بھی نہیں تھا۔ مگر جیسے جیسے برطانیہ جنگی حالات کا عادی ہوتا گیا لوگ کتابیں پڑھنے لگے، اور آج وہ جتنی کتابیں پڑھ اور خرید رہے ہیں۔ اس کی مثال ان کی تاریخ میں پہلے کہیں نہیں ملتی۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں میری فرم نے تین لاکھ کتابیں فروخت کیں۔ اور اس سال اگست تک ہم نے بیس لاکھ کتابیں بیچی ہیں۔

لوگ اب جس قسم کی کتابیں چاہتے ہیں۔ اس سے بڑی ہمت افزائی ہوتی ہے۔ زبردست کلاسیکی کتابیں جو سالہا سال تک یا تو کاغذ کے کارخانوں میں بھیج دی جاتی تھیں یا چھ پنس کے بکسوں میں ڈال دی جاتی تھیں اب ان کی بکری سب سے زیادہ ہے۔ ہر کتب فروش کی یاد میں پہلی بار شیکسپیر کی کتابیں بازار میں نایاب ہوئی ہیں۔ پچھلے بڑے دن کے موقعہ پر ٹالسٹائی کی "جنگ و امن" خریدنے کے لیے لوگ کتاب کی دوکانوں پر قطاروں میں کھڑے رہتے تھے۔ ٹرولوپ جیسا مزہ دار اہل قلم اپنے عروج پر پہنچ گیا ہے۔ عمر خیام جو پچھلی لڑائی میں مقبول ترین تھا اس جنگ میں بھی بہت مقبول ہے۔ دوسری کلاسیکی کتابیں جن کی مانگ ہو رہی ہیں وہ یہ ہیں۔ پےپی کا روزنامچہ۔ باسول کی حیات جانسن۔ مارک ٹوین۔ آکسفورڈ کی کتاب اقتباسات۔ بیکن کے مضامین او ہنری۔ رڈیارڈ کپلنگ اور ڈکنس۔ پبلک کی ایک بہت بڑی تعداد ریڈیو پر کتابوں کے متعلق تقریریں سنتی ہے اور جیسے ہی کسی کتاب کی سفارش کی جاتی ہے کتب فروشوں کے یہاں آرڈروں کی بھرمار ہو جاتی ہے۔

نئی نئی باتوں کا علم۔ آج ہر شخص کتابیں خریدتا ہے۔ اس کا سبب تلاش کرنا مشکل نہیں ہے۔ غالباً پہلی بات تو یہ ہے کہ لوگ زیادہ کما رہے ہیں۔ پھر کتابوں کی تجارت کے ساتھ حکومت کا نہایت ہی نیا سنا اور دور اندیش سلوک جس کی وجہ سے وہ بندشوں سے قریب قریب آزاد ہیں اور اس طرح لوگ کمپنی خرید کر بلا ٹیکس کے خریداری کر سکتے ہیں۔ بہت سے نوجوان جو دور دراز مقامات پر پڑے ہیں اور جن کے پاس فرصت کے لمحات کے لیے کچھ نہیں ہے وہ دل بہلانے کے لیے کتابوں ہی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

ہر شخص کی زندگی میں جو زبردست انقلاب ہوا ہے اس نے ہر ایک کے لیے لازمی کر دیا ہے کہ وہ کوئی نئی چیز سیکھے چنانچہ نئی کتابوں کی مانگ بڑی زبردست ہے۔ علم پرواز۔ انجینیری۔ ریڈیو۔ بحری بیڑہ۔ شہری دفاع اور سائنس کی ہر شاخ کے متعلق کتابیں ہزاروں کی تعداد میں بک رہی ہے۔ سروسوں میں بہت سے لوگ جنگ کے بعد کی زندگی کے لیے مطالعہ کر رہے ہیں اور طب۔ علم دنداں۔ بنکنگ اور تجارت کے طریقوں کی کتابیں کثیر تعداد میں فروخت ہو رہی ہیں۔

"بلیک آوٹ" اور سفر کی دقتیں لوگوں کو گھر ہی پر پڑے رہنے کے لیے مجبور کرتی ہیں۔ اب ہر شخص کا ایک محبوب شوق ہے اور وہ اس کے متعلق علم حاصل کرنے کے لیے کتابیں خرید رہا ہے۔ ایسے موضوعات جیسے خرگوش یا شہد کی مکھیاں پالنا۔ بننا ٹکٹ جمع کرنا۔ کاڑھنا۔ باغبانی۔ علم مطبخ کے متعلق کتابوں کی مسلسل مانگ ہے

نایاب کتابوں کی تجارت میں بھی بڑی گرم بازاری ہے۔ لوگ روپیہ لگانے کے خیال سے قیمتی کتابیں خرید رہے ہیں۔ اور نایاب کتابوں کی قیمتیں بہت بڑھ رہی ہیں۔

بیرونی کتابوں کی زبردست مانگ:۔ برطانیہ میں غیر ملکیوں کی زبردست تعداد کی وجہ سے بیرونی کتابوں کی مانگ بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ سروسیں غیر ملکی زبانوں میں بہت کتابیں خرید رہی ہیں۔ سب سے زیادہ مانگ روسی اور ہسپانوی زبانوں کی

کیونکہ بعد از جنگ تعمیر کے سلسلے میں ان مسائل کو اہم سمجھا جا رہا ہے۔ بہت سے لوگ لڑائی کی خبروں میں تنوع پیدا کرنے کے خیال سے آرٹ اور سفر پر کتابیں خرید رہے ہیں۔ مذہب فلسفہ اور شاعری کی کتابیں بھی اچھی بک رہی ہیں جیسی کہ وہ ہر لڑائی میں بکتی ہیں ہیجان خیز قصے پڑھنے والی پبلک کے شوق کا اب تک وہی حال ہے۔ لیکن آرام طلبی کے ساتھ بیرونی سیاسیات میں دلچسپی لینے کی عادت کم ہو گئی ہے۔ اب لوگ لڑائی کی تلخ تر حقیقتوں اور بعد از جنگ تعمیر میں دلچسپی لے رہے ہیں۔

بچے ہمیشہ سے زیادہ پڑھ رہے ہیں اور ان کی کتابوں کی مانگ پوری ہی نہیں ہو پاتی۔ آئندہ بڑے دن کے موقع پر بچوں کی کتابوں کی زبردست مانگ پوری کرنے کے لیے کتب فروشوں نے مارچ سے تیاریاں شروع کر دی ہیں۔ اگرچہ کتب فروش کتابوں کی دریافت کی وجہ سے اس کے کاروبار میں جو ترقی ہوئی اس پر خوش ہیں مگر حقیقی خوشی یہ ہے کہ برطانیہ نے اس دولت و مسرت کو از سر نو دریافت کر لیا ہے۔ جو کتابیں زندگی کو بخش سکتی ہیں۔

کرسٹینا فوئل

ریویو

ادب لطیف لاہور کا افسانہ نمبر ۱۹۴۳ء

"ادب لطیف" کا افسانہ نمبر ۱۹۴۳ء ہمارے پیش نظر ہے جسے بیش بہا اور قیمتی خزانے کا منبع کہا جا سکتا ہے اس کے ہر افسانے میں زندگی کروٹ لیتی دکھائی دیتی ہے اور ہر افسانہ نگار زندگی کی شاہراہ میں متحرک نظر آتا ہے۔ اگر تنقیدی نگاہ سے دیکھا جائے تو ہر افسانہ بجائے خود مکمل افسانہ ہے Romanticism اور classicism نے چار چاند لگا دیے ہیں ان خوبیوں کو دیکھ کر ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ یہ نمبر الماریوں کی زینت بننے کے لائق ہے۔

کاغذ کی اس ہوشربا گرانی بلکہ نایابی میں اتنا اچھا، اتنا عمدہ نمبر کا جلوہ اشاعت پر آنا واقعی قابل تحسین ہے۔ ادب کی خدمت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ حوصلہ شکن مصائب اور دشواریوں پر حاوی ہو کر "ادب لطیف" کے کارکنان برابر اپنے مستحکم ارادے کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

اس نمبر کے تمام افسانہ نگاروں نے بلند پایہ افسانے لکھ کر ایک بار اور ثابت کر دیا ہے کہ اردو ادب کسی ادب سے پیچھے نہیں ہے۔ اگر یہی انداز رہا تو ہم ابھی سے پیشین گوئی کرتے ہیں کہ وہ دن دور نہیں جب ہمارا ادب چوٹی کے ادب میں شمار ہو گا۔

محمد یونس احمر کلکتہ

اظہارِ غم

ام الحلیمہ مریم جمیل

ظلمت تھی لبست ہفتم رمضاں کو سر بسر
میری فریدہ چھوڑ کے مجھ کو کہاں گئی
ارماں ہزاروں لے کے دل بیقرار میں
بیٹی یہ تیرے جی سے گذرنے کے دن نہ تھے
صورت میں لاجواب تھی سیرت میں انتخاب
نیکی کا تیری ہو سکے مجھ سے بیان کیا
ننھی سی جان اور ہزاروں تھیں خوبیاں
آرام و چین جو تھا وہ معدوم ہو گیا ہے
فرقت میں تیری قلب و جگر بیقرار ہیں
اب میں ہوں اور یاد تیری قلب زار میں

اک چاند آسماں پہ چھپا ایک زمین پر
میں جانتی ہوں تو سوئے باغ جناں گئی
پیاری فریدہ سوتی ہے کنج مزار میں
اے مرنے والی یہ تیرے مرنے کے دن نہ تھے
گویا کہ آسمان سے اُترا تھا ماہتاب
چاہت کا تیری مجھ کو ملے گا نشاں کیا
وہ خوبیاں کہ جن کی ہے ایک داستاں
ان نعمتوں سے دل میرا محروم ہو گیا ہے
والد بھی تیرے غم میں تیرے سوگوار ہیں
اور تو ہے محو خواب کنارِ مزار میں



لندن میں کیا ہو رہا ہے؟

یہ ایک عجیب بات معلوم ہوگی کہ اس زمانہ میں لندن میں سب سے بڑا ظریفہ فلم جس میں قتل و خونریزی کے قصے بھرے ہوئے ہیں۔ اہل لندن کی دلچسپیوں کا مرکز بنا ہوا ہے اس فلم کا نام "آرسینک اور لڈلیس" ہے جس میں عورتیں اپنے مہمانوں کو یکے بعد دیگرے شراب میں زہر ملا کر ہلاک کر دیتی ہیں۔ شہر بھر میں اسی فلم کا چرچا ہے۔ علی الخصوص جب سے مسٹر چرچل اس فلم کو دیکھنے گئے تھے تب سے لوگوں کی توجہ اس طرف اور بڑھ گئی ہے۔

نقالوں سے ہشیار

REGISTERED TRADE MARK

زردہ کے انتخاب میں غلطی نہ کرنا

جب تم میرے پیے زردہ خریدو تو اصلی نکٹائی مارکہ زردہ نہ بھولو، اسلیے کہ آجکل بازار میں لوگ جعلی مال بناکر دھوکہ دینے لگے ہیں ان کے دھوکے میں نہ آنا۔ نکٹائی مارکہ زردہ نکٹائی مارکہ کیسر بلاس، نکٹائی مارکہ قوام اور الائچی دانہ خریدتے وقت محمد مصطفٰے حسین کا نام اور نکٹائی مارکہ ضرور دیکھ لیا کریں

مالک کارخانہ

محمد مصطفٰے حسین نکٹائی مارکہ زردہ فیکٹری ہورہ روڈ۔ ہوڑہ۔ کلکتہ

شاخیں

۵/۷ کلایو اسٹریٹ کلکتہ ۱۱۱ آرسکن روڈ بمبئی۔ ۵/۷ کیننگ اسٹریٹ۔ کلکتہ

REGD.No C2535

JADIDURDU
36 MARSDEN ST. CALCUTTA

قواعد وضوابط

(۱) رسالہ ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوا کریگا۔ خریداروں کو چاہیئے کہ رسالہ ۱۵۔ تاریخ تک نہ ملنے پر دفتر سے طلب کریں۔

(۲) اہل قلم حضرات سے درخواست ہے کہ وہ مضامین مہینے کی ۱۵ تاریخ تک اڈیٹر کے نام بھیجدیں

(۳) مضامین صاف اور شستہ تحریر ہوں

(۴) وہی مضمون پرچہ میں شائع ہوسکتا ہے جو معیار ادب و اخلاق سے گرا نہ ہو۔

(۵) دل آزار و فرقہ وارانہ مضامین شائع کرنا پرچہ کی پالیسی کے خلاف ہے۔

(۶) نمونہ کا پرچہ مفت نہیں بلکہ ۲ر کا ٹکٹ آنے پر بھیجا جائے گا۔

(۷) جواب کے لیے جوابی کارڈ یا اسٹامپ کا آنا ضروری ہے۔

(۸) خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:۔ منیجر جدید اردو ۳۶ مارسڈن اسٹریٹ۔ کلکتہ

(۹) کاروباری حضرات اشتہار کیلئے منیجر سے خط و کتابت کریں۔

(۱۰) سالانہ چندہ صرف دو روپیہ (عہ/) غیر ممالک کے لیے ۵ شلنگ

اے جلیل منیجر جدید اردو نمبر ۳۶۔ مارسڈن اسٹریٹ کلکتہ